تفسیر موضوعی

جلد ہفتم

قرآن
کا دائمی منشور

نگارش

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

ترجمہ

مولانا سید ہادی حسن نقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ------------------ تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور
جلد --------------------- ہفتم ہشتم
مؤلف -------------------- آیۃ اللہ اُستاد جعفر سبحانی
مترجمین ---------- مولانا سید ہادی حسن نقوی، مولانا حبیب الحسن، مولانا حسنین گردیزی
ترتیب و تنظیم نو ---------------- قلب علی سیال
کمپوزنگ ------------------ فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)
طبع ثانی ------------------- مکتبہ جدید پریس لاہور
سال اشاعت ---------------- فروری 2012ء
ناشر --------------------- مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور
ہدیہ مکمل سیٹ --------------- 3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے الحاج شیخ وحید احمد نے تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام! ـــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ ـــــ عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لا کر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے، لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

تفسیر قرآن کا یہ طریقہ علماء ومحققین اور عام طالبانِ قرآنیات کے لیے بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ وہ اس کے ذریعے قرآن کی ہمہ گیر تعلیمات اور اسلام کے آفاقی ضوابط کو بہتر اور جامع طور پر سمجھنے سمجھانے کے علاوہ بالوقت استنباط احکام بھی کرسکتے ہیں۔ آیت اللہ جعفر سبحانی نے فارسی زبان میں یہ اولین تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کے نام سے ترتیب دی اور مولانا سید ہادی حسن نقوی، مولانا حبیب الحسن اور مولانا حسنین گردیزی نے اسے فارسی سے اردو میں منتقل فرمایا ہے۔

تفسیر موضوعی کی طباعت واشاعت میں حسب ذیل دو مقاصد ہمارے پیش نظر رہے ہیں:

۱: اردو خوان طالبان قرآنیات کو تفسیر قرآن کی ایک نئی روش سے روشناس کرانا۔

۲: علماء ومحققین کی خدمت میں اسلامی وقرآنی تعلیمات کا ایک ایسا مرقع پیش کرنا کہ جس میں ہر موضوع اپنی جگہ مکمل ہو۔

اس وقت تفسیر موضوعی کی جلد نمبر 7، 8 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر دو جلدوں کو یکجا کردیا گیا ہے۔تاکہ کتاب کی قیمت میں کمی کی جاسکے۔ کتاب تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور کی طباعت ثانی دس سال بعد پیش کی جارہی ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔ ـــــــــ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

تفسیر موضوعی: قرآن کا دائمی منشور جلد نمبر ہفتم، ہشتم کی فہرست تیار ہورہی ہے۔ تیار ہونے کے بعد "اَپ لوڈ" کردی جائے گی۔

شخصیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بزبان قرآن مجید

پیش لفظ

پندرہوں صدی ہجری کے شروع میں عالم اسلام میں کچھ ایسی ہمہ گیر بیداری پیدا ہوئی کہ دنیا بھر کے عیسائی اور یہودی لزرہ براندام ہو گئے۔ اس دوران ان کو دین مقدس اسلام کے انقلابی نظریات اور مسلمانوں کے کفر شک جوش وجذبہ کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ ''استشر ق'' کا مسئلہ ایک بار پھر استحصالی ہتھکنڈے کے طور پر زندہ ہو گیا۔ مٹھی بھر ضمیر فروش اور گھٹیا قسم کے مسلمانوں کی ملی بھگت سے خودغرض مستشرقین کے علم حرکت میں آ گئے۔ مسلمانوں پر سیاسی اور اقتصادی حملے تو جاری تھے ہی، اب ثقافتی میدان میں بھی ان پر ضرب کاری لگانے کی ٹھان لی گئی۔

اس سلسلے میں مستشرقین اور دیگر اسلام دشمن قلم نگاروں نے پچھلے دس سال میں جو تحریر پیش کیں، ان کی دو قسمیں ہیں ابھی تک ہر قلم نگار اپنے مخصوص مذموم مقاصد کے حصول کیلئے انہی تحریروں میں مگن ہے۔

(الف) دولت کے لالچ میں بعض مسلمان مصنفین اسلامی ممالک میں دقیانوسی مسائل کو موضوع بنا رہے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ سنی عقائد ونظریات کے تحفظ کے بہانہ شیعہ نظریات کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں اس طرح کی اکثر کتابیں سعودی عرب کے سرمائے سے کویت، ریاض، جدہ اور پاکستان میں شائع کی گئی ہیں ان کتابوں میں کوئی نئی بات نظر نہیں آتی۔ البتہ چودہ صدی پرانے گھسے پٹے مسائل دوہرائے گئے ہیں جو شیعہ حضرات کے خلاف سینکڑوں بارے لکھے جا چکے ہیں اوران کے مدلل جوابات بھی کئی مرتبہ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کابوں کا مطالعہ تضیع اوقات کے مترادف ہے جو نکات ان کتابوں میں اٹھائے گئے ان کے جواب قدیم شیعہ علماء کرام بڑے شائستہ طریقے سے دے چکے ہیں جن میں شیخ مفید، جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، جناب شیخ طوسی اور علامہ حلی اعلی اللہ مقامہم خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور جدید شیعہ علماء میں جناب شرف الدین عاملی اور محمد حسین کاشف العطاء پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اسلام دشمن عناصر کی طرف اس طرح کی کتابیں شائع کرنے کا مقصد شیعہ حضرات کے نظریات کو کمزور کرنا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ کئی بار تجربہ کر چکے ہیں کہ اس قسم کے ہتھکنڈوں سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ایسی مطبوعات سے اان کا مقصد صرف فرقہ واریت کو ہوا دینا ہے جس کا پچھلے چند سالوں میں پاکستان بھر میں کافی مظاہرہ ہو چکا ہے۔ ہم نے اخباروں رسالوں یا دیگر ذرائع ابلاغ میں دیکھا کہ ''انجمن سپاہ صحابہ'' فرزند رسول اور جگر گوشہ بتول، حضرت امام حسین علیہ السلام کی عزادار کے ایام میں کس طرح افراتفری پھیلاتی ہے اور شیعہ حضرات کے مقدسات ،امام بارگاہوں حتیٰ کہ دونوں کو نذر آتش کرتی ہیں۔

(ب) مطبوعات کی دوسری قسم ۔۔۔ بڑی خوبصورت، جاذب نظر اور دیدزیب کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ ان کتابوں میں دین

مقدس اسلام کے اصولوں اور قرآنی تعلیمات کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ان مطبوعات کا مقصد اسلامی رجحان کی تبلیغ اور اسلامی تعلیمات کی توسیع وترویج کو روکنا ہے مطبوعات کی یہ قسم استشراق کے پست پناہوں اور استحصالی طاقتوں کے گماشتوں کے سرمایہ سے شائع اور منتشر کی جاتی ہے۔ یہ کتابیں عربی، فارسی اور کئی ایک دیگر غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوتی ہیں۔غیر ملکی عیسائی اور یہودی مصنفین مٹھی بھر غدار مسلمانوں کی ملی بھگت سے ان کتابوں کو شائع کرتے ہیں اور دنیا کے کونے کونے میں پہنچاتے ہیں جن کو نفاذِ اسلام سے اپنے مفادات خطرے میں نظر آتے ہیں ان مطبوعات کی بعض کتابیں ہمارے ہاتھ بھی لگی ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں قسموں کی مطبوعات میں سے ہر ایک کی ردلکھنا محال ہے تاہم بعض مطبوعات جن میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور مجموعی طور پر دین مقدس اسلام کے بنیادی نظریات کے خلاف زہر افشانی کی گئی ہے، کے سلسلہ میں ہم نے مستند ترین ماخذ یعنی قرآن مجید سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے بعض اہم گوشے اپنی کتاب ''منشور جاوید'' کی جلدوں میں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔اس کتاب میں ہم نے اپنے موضوع پر محققانہ نگاہ ڈالی ہے۔

اس کتاب میں ہم نے مندرجہ ذیل عنادین پیش نظر رکھے ہیں:

(۱) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ حالات زندگی جن میں آنحضرت نے منافقین سے بحث ومباحثہ فرمایا ہے۔یہ بحث ''منشور جاوید'' کی چوتھی جلد میں کی گئی ہے۔

(۲) ''منشور جاوید'' کی چھٹی جلد میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت سے اعلان رسالت تک، ان اعلان رسالت سے ہجرت مسجد نبوی کی بنیاد رکھنے اور تبدیلی قبلہ تک کے واقعات رقم کئے ہیں۔

(۳) ''منشور جاوید'' کی ساتویں جلد تبدیلی قبلہ کے بعد حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال تک کی زندگی پر مشتمل ہے۔یہ زمانہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فعالیت کے حوالے سے دوامور میں زیادہ اہم ہے۔

(الف) اہل کتاب سے مناقشہ

(ب) مشرکین کے خلاف دفاعی سرگرمیاں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی میں اہل کتاب کے ساتھ مناقشہ کے کئی مراحل پائے جاتے ہیں۔ان میں علمی مباحثہ، نظریاتی تبادلہ خیال، لفظی تکرار، فروعی گفتگو اور ان کی طرف سے معاہدہ شکنی کی صورت میں تنبیہ وتہدید کے واقعات شامل ہیں۔

آنحضرت کی مدنی زندگی کی دوسری جہت مشرکین اور بت پرستوں کے خلاف مسلح جدوجہد ہے۔عام طور پر یہ سرگرمیاں دفاعی نوعیت کی ہوتی تھیں۔البتہ بعض اوقات جارح کی بیخ کنی اور دشمن کی دسیسہ کاریوں کی روک تھام کیلئے بھی ایسا اقدام کرنا پڑتا تھا۔دین مقدس اسلام کی ترویج وتوسیع کیلئے آپ کی مسلح کوششوں کو سمجھنے کیلئے ایک خاص پس منظر کا جاننا ضروری ہے اگرچہ منکرین اسلام کے خلاف جہاد کے متعلق قرآن مجید میں واضح احکامات موجود ہیں اور وقت کے تاریخی حالات بھی اس قسم کی جدوجہد کا تقاضا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔تاہم یہ باور کرلینا بالکل غلط ہوگا کہ دین مقدس اسلام میں جنگ وجدل سے پہلے گفت وشنید اور پندونصائح کے مراحل سے گزرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ سے پہلے مخالفین کو وعظ و نصیحت کرنا ایک فقہی ضرورت ہے۔مگر مدنی زندگی میں آپ کے متعدد غزوات اور لڑائیاں اس لئے تاریخ میں نظر آتی ہیں کہ اس وقت کے حالات کے مطابق پند و نصائح کا موقع نہ تھا۔مشرکین اور اہل کتاب مل کر اسلام کے خلاف مسلح کارروائیاں کررہے تھے اور اسلام کی تباہی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔چنانچہ آنحضرت نے اسلام کی نوخیز حکومت اور مخالفین کی ریشہ دوانیوں کی بیخ کنی کیلئے مسلح جدوجہد فرمائی۔

اس جلد میں ہم ماقبل مذکور دوعناوین کے علاوہ قرآنی نطقہ نظر کے پرتو میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی پر تحقیق کا تتمہ پیش کریں گے مزید آبراں اس میں ایک اور باب کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس کا عنوان یہ ہے۔

''اعلان رسالت سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرز زندگی اور دین مقدس اسلام میں بنی ہاشم علیہ السلام کی آئینی حیثیت''

ہمارے خیال میں مذکورہ بحث کے بعد ہی قرآنی نقطہ نظر کے اعتبار سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ سے مکمل طور پر آگاہی حاصل ہوسکتی ہے۔اُمید ہے کہ ہم نے ان تین جلدوں (پانچویں تا ساتویں) میں قرآن کے حوالے سے جو کچھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ سے متعلق رقم کیا ہے، وہ بالکل اچھوتے انداز کا مظہر ہوگا۔اگر بالفرض میں اس کام میں مکمل طور پر کامیاب نہ ہوسکا تو آئندہ آنے والے ہمارے دوست، اسلام پسند اور نوجوان علماء اس مقصد میں بطریق احسن کامیاب ہوں گے انشاء اللہ سبحانہُ

''منشور جاوید'' کی آٹھویں جلد جس میں قرآن مجید کے حوالے سے ''علم غیب'' اور ''نبوت کے خاتمیت'' جیسے عناوین پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے بالکل تیار ہے انشاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گی۔

جعفر سبحانی

قم میدان شہداء، مؤسسہ امام صادق علیہ السلام

۱۱۲ سفند ماہ سال ۱۳۶۶، مطابق

۱۳ رجب ۱۴۰۸ھ

توحید سے انحراف اور اہل کتاب سے مباحث

قرآن مجید کی لاتعداد جہات میں ایک جہت کافروں، مشرکوں اور اہل کتاب کے ساتھ بحث وتمحیص بھی ہے۔ان بحثوں میں اَنبیاء ماسلف کی وہ تمام بحثیں شامل ہیں جو وہ اپنے اپنے زمانے میں کافروں سے کرتے رہے۔قرآن مجید ان بحثوں کو ''انبیاء کے حالات'' کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔حضرت رسول اکرمؐ کے وہ تمام مذاکرات بھی اسی زمرے میں شامل ہیں جو آپ ؐ مشرکین مکہ اور یثرب کے یہود ونصاریٰ یا گرد ونواح کے کفار سے فرماتے رہے۔اس عنوان کی تمام آیات کا مجموعہ بذات خود ایک الگ جامع موضوع ہے جو ''تفسیر موضوعی'' میں دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بحث وتحقیق کے لائق ہے۔حال ہی میں لبنان کے ایک معاصر فاضل عالم دین نے اسی موضوع پر ''الحوار فی القرآن'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے اور ایک لحاظ سے انہوں نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔

مکہ مکرمہ میں اگرچہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے مشرکین سے کافی گفت وشنید اور بحث ومباحثہ فرمایا،مگر یثرب میں یہود ونصاریٰ سے ہونے والے مذاکرات اس سے کہیں بڑھ کر ہیں جو سب قرآن مجید کے پرتو میں انجام پائے۔

مکہ مشرکین اور شرک والحاد کا مرکز تھا۔اہل کتاب کی تعداد وہاں بہت کم تھی۔کبھی کبھار کوئی عیسائی یا یہودی دکھائی دیتا تھا، وہ بھی یا تو مسافر ہوتا جو کسی کام سے مکہ آیا ہوتا تھا، یا کسی قریش رئیس کی ملازمت میں مل جاتا تھا۔اسلام سے پہلے پورے قبیلہ قریش میں صرف دو آدمی عیسائی مذہب رکھتے تھے۔

۱۔ ورقہ بن نوفل

۲۔ عثمان بن حویرث

ان عیسائیوں کے علاوہ کوئی عرب یہودیت کی طرف مائل نہ تھا۔

ظہور اسلام کے بعد عبداللہ بن جحش حلقہ بگوشِ اسلام ہوا اور قریش کے مظالم کے خوف سے دوسرے مسلمانوں کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا مگر وہاں جا کر عیسائی ہو گیا اور تھوڑے دنوں بعد ہی چل بسا۔اس کے علاوہ قریش کی اکثریت مشرک تھی البتہ معدودے چند لوگ ''ملت ابراہیمی'' کے پیرو تھے جنہیں احناف کہا جاتا تھا۔[1]

اہل کتاب کے ساتھ مذاکرات سے متعلق آیات مدنی سورتوں میں پائی جاتی ہیں اور وہ بھی ''سورہ بقرہ'' و ''سورہ آل عمران'' جیسی لمبی سورتوں میں۔جب تک مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے موجود رہے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان ''سرد جنگ'' جاری رہی جو زیادہ تر مذاکرات اور گفت وشنید کی صورت میں تھی لیکن جب یہودیوں کو مدینہ منورہ سے نکال باہر کیا گیا تو پھر نجران کے عیسائیوں کے ساتھ بڑے پُر سکون ماحول میں بحث ومباحثہ ہوا

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۲۲ تا ۲۲۴

مشرکین مکہ سے گفتگو عام طور پر ''توحید یا دیگر اصولِ دین مثلاً قیامت وغیرہ کے عنوان سے ہوتی تھی جبکہ اہل کتاب سے توحید کے علاوہ انجیل میں موجود حضرت رسول اکرمؐ کی نبوت کی نشانیوں، پادریوں اور راہبوں کی کارستانیوں پر بھی بات ہوا کرتی تھی۔

ہمارا موضوع قرآن مجید کے مکالمے یا مباحثے نہیں ہیں کیونکہ یہ خود ایک الگ وسیع موضوع ہے جس پر ہم فی الحال قلم اٹھانا نہیں چاہتے۔ ہمارا موضوع بحث وہ مذاکرات یا بحثیں ہیں جو حضور اکرمؐ نے اللہ سبحانہ کے خاص حکم اور قرآن مجید کی آیات کے ذریعے یثرب کے بعض یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ فرمائے۔ ان مذاکرات کا ذکر تاریخ میں بڑے تیقن سے کیا گیا ہے۔ اگرچہ مفصل نہیں ہے۔ یہ مذاکرات اکثر جنگ بدر سے پہلے اور بعض بعد میں ہوئے۔ جنگ خندق کے ساتھ ہی جب یہودیوں کو مدینہ منورہ سے نکال دیا گیا تو کفار سے مذاکرات کا بیشتر سلسلہ اختتام پذیر ہو گیا البتہ اس طرح مسلمانوں کو اپنے مخالفین سے گفت وشنید کا ایک نیا سلیقہ ضرور ہاتھ آ گیا۔

مسلمانوں کے بارے میں یہودیوں کا سخت مگر عیسائیوں کا لچکدار موقف

قرآن مجید مسلمانوں کی طرف مشرکین اور یہودیوں کا سخت اور متشددانہ رویہ، لیکن عیسائیوں کا نرم اور منکسرانہ طرزِ عمل بیان کرتا ہے اور اسی ذیل میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔

سورہ مائدہ، آیۃ نمبر ۸۲، ۸۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨٣﴾

''(اے حبیبؐ) آپ تمام لوگوں میں مسلمانوں کے شدید دشمن یہودیوں اور مشرکین کو پائیں گے جبکہ عیسائیوں کو ان کے قریب ترین دیکھیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں میں منکسر المزاج پادری اور راہب موجود ہیں۔ جب انہیں کسی وحی کی آمد کی خبر ہوتی ہے تو شوق سماعت سے ان کے آنسو نکل آتے ہیں وہ اسلام کی حقانیت کو جان گئے ہیں، لہٰذا اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں، پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں یہ ہمارا نام بھی (اسلام کی سچائی کی گواہی دینے والوں) میں لکھ لے''

مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں یہودیوں کے شدید اور غیر لچکدار رویہ ہی کی وجہ سے حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں بہت کم

یہودی مسلمان ہوئے۔ مدینہ کے یہودیوں میں بعض اشخاص جو ایمان لے آئے تھے وہ بھی ایک مشکوک اور پُراسرار آدمی ''عبداللہ بن سلام'' اور مسلمان نما یہودی'' کعب الاحبار ہی کی طرح کے تھے جو کسی نہ کسی دنیوی مفاد کے طالب تھے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے ایمان لانے سے اسلام کو نقصان کے علاوہ بھلا کیا حاصل ہوسکتا تھا۔

اس کے مقابلہ میں جزیرہ نما عرب کے عیسائیوں کا معاملہ مختلف تھا۔ اسلام کی ابتدائی فتوحات کے نتیجہ میں ''شامات'' کے عیسائی اسلام پسند ہوگئے تھے، بلکہ تہِ دل سے اسلام قبول کر چکے تھے۔

مذکورہ بالا آیہ مجیدہ دونوں صورتوں کو کھول کر بیان کر رہی ہے۔ زاہد اور تارک الدنیا عیسائی دانشوروں کے بارے میں کہہ رہی ہے کہ دنیا کی رنگینیوں سے زہد و پرہیز کی خاطر انہوں نے حقیقت کو نہ چھپایا اور انجیل و تورات میں موجود حضور اکرمؐ کی نبوت کی نشانیوں کو بیان کر دیا ہے۔ درانحالیکہ دنیا طلب و حریص یہودی دانشوروں نے اپنی دنیا طلبی اور حرص و لالچ کی وجہ سے اپنی قوم سے حقائق کو چھپائے رکھا، نیز اپنی مذہبی کتابوں میں موجود حضور اکرمؐ کی نبوت کی نشانیوں کی بھی نشاندہی نہ کی۔

اس حقیقت کو مزید سمجھنے کے لیے سورہ بقرہ کی آیت ۹۶ کافی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾

''آپ ان کو (یہودیوں کو) دنیا میں زیادہ دیر زندہ رہنے کے لیے باقی لوگوں سے زیادہ حریص پائیں گے، حتیٰ کہ مشرکین سے بھی زیادہ۔ ان میں ہر ایک آدمی چاہتا ہے کہ ہزار سال عمر پائے حالانکہ اس کی عمر کی طوالت اس کو اللہ سبحانہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی اور اللہ سبحانہ ان کی سیاہ کاریوں سے پوری طرح باخبر ہے''

دنیا کے ساتھ بے حد وابستگی انسان کو حقیقت شناسی سے روک دیتی ہے اور اس کی عقل پر دبیز پردے ڈال دیتی ہے۔

مشترک نظریات کے تحفظ کی دعوت

قرآن مجید نے اہل کتاب سے مختلف موضوعات پر مذاکرات کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں قرآن مجید نے یہودیوں اور عیسائیوں کے نظریات کے پس منظر میں ان کی ثقافت اور اپنی منطق سے آگاہ کیا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان سے گفت و شنید میں سب سے پہلا مسئلہ جو چھیڑا گیا وہ ''توحید'' کا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے ہاں توحید کا تصور کچھ سے کچھ بنا دیا گیا۔ قرآن مجید اس کی توجیہہ فرماتا ہے۔

ابتدائی بات چیت میں قرآن مجید ان سے فرماتا ہے کہ اگر حضرت رسول اکرمؐ کی نبوت اور دین کو ماننا ان کے لیے مشکل ہے تو کم از کم

انبیاء کی تبلیغ کی پہلی قدر مشترک کا تحفظ تو کریں! اور وہ توحید پرستی ہے جبکہ آج کتب آسمانی کی پیروی کا دعویٰ کرنے والوں کی اکثریت مکمل طور پر توحید سے منحرف ہو چکی ہے۔

سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۝۶۴ (سورہ آل عمران: ۶۴)

''(اے حبیبؐ) اہل کتاب سے فرما دیجیے! آیئے ان مسائل پر بات کریں جو ہمارے درمیان مشترک ہیں، یعنی سوائے اللہ سبحانہ کے کسی کو بندگی کے لائق نہ سمجھیں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں۔ اللہ سبحانہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنی تقدیر کا مالک نہ سمجھیں۔ (اے حبیبؐ) اس پر اگر وہ نہ مانیں تو انہیں کہہ دیجیے ''گواہ رہنا ہم تو مسلمان ہیں''

اگرچہ ادیانِ آسمانی میں توحید بنیادی قدر مشترک ہے تاہم افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہودی، بلکہ ان سے زیادہ عیسائی، اس عقیدے سے منحرف ہو چکے ہیں اور انہوں نے اپنی جہالت و گمراہی سے اس خالص یگانہ مسئلے میں دوئی و شرک کا پیوند لگا رکھا ہے۔

توحید کے سیدھے راستے سے یہودیوں کا انحراف

یہودی دورِ حاضر کے ہوں یا ماضی کے، اپنے آپ کو بہت بڑے ''توحید پرست'' کہتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ ان پر ہونے والی زیادتیاں اسی لیے ہیں کہ وہ توحید پرست ہیں۔ یہ بات بالکل غلط اور جھوٹ ہے۔ قرآن مجید عہد رسالت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہودیوں کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ شرک سے پاک نہیں تھے بلکہ عیسائیوں کی طرح وہ حضرت عزیرؑ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے تھے۔

سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۝۳۰ (سورہ توبہ: ۳۰)

''یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا 'عیسیٰ' اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ باتیں وہ اپنے کافر اسلاف کی

پیروی میں کرتے ہیں۔اللہ ان کو غارت کرے۔یہ کیسی انہونی باتیں کرتے ہیں"

حضور اکرمؐ کے زمانے میں یہودیوں میں یقیناً مذکورہ بالا باطل عقیدہ کے بہت سے لوگ موجود تھے اور آج بھی تمام یہودی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔البتہ بعض یہودی اس عقیدے کی یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ وہ حضرت عزیر کو اللہ سبحانہ سے صرف منسوب کرنے کے لیے اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔جس طرح مسلمان مسجد کو 'خانہ خدا' کہتے ہیں۔مگر یہ بات آیۂ مجیدہ سے مطابقت نہیں رکھتی۔

توحید باری تعالیٰ کے بارے میں عیسائیوں کی غلطی

نزولِ قرآن مجید کے زمانہ میں عیسائیوں کے ساتھ قرآن مجید کی مختلف بحثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ توحید کے مسئلہ میں عیسائیوں کی غلط فہمی کئی جہات سے تھی:

۱۔ حضرت عیسیٰؑ خود خدا ہیں۔

۲۔ تثلیث کا نظریہ

۳۔ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں۔

قرآن مجید کی آیات کریمہ عیسائیوں میں مذکورہ بالا تین قسم کے شرک پر شاہد ہیں۔ممکن ہے تینوں قسم کے اس شرک کا مفہوم ایک ہی ہو۔البتہ عیسائیوں میں ان نظریات کے حامل الگ الگ فرقے موجود ہیں۔اس کیفیت کی تفصیل اس طرح ہے:

حضرت عیسیٰؑ خود خدا ہیں:

قرآن مجید عیسائیوں کے شرک کی پہلی قسم اور اس کے بطلان کے بارے میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۷۲

(سورہ مائدہ: ۷۲)

"جو لوگ عیسیٰ کو خدا کہتے ہیں وہ کفر کرتے ہیں، حالانکہ خود عیسیٰ یہ کہتے تھے کہ میرے اور اپنے پالنے والے اللہ سبحانہ کی عبادت کرو کیونکہ جس نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا اللہ سبحانہ نے اس پر جنت کو ممنوع قرار دیا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے بے شک ظالموں کا کوئی مددگار نہیں"

آیہ مجیدا اپنے اندر دو مفاہیم لیے ہوئے ہے، ایک یہ کہ:

لقد كفر الذين قالوا ان الله هو المسيح ابن مريم

یعنی

''جو لوگ عیسیٰ کو خدا کہتے ہیں وہ کفر بکتے ہیں''

دوسرا بالکل واضح الفاظ میں یہ ہے کہ جس کی خدائی کا تم ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو وہ تو اپنے آپ کو اللہ سبحانہ تعالیٰ کا بندہ جانتا ہے اور تمہیں بھی اسی کی عبادت کا حکم دے رہا ہے۔

واقعی حضرت عیسیٰؑ کی زندگی مذکورہ بالا مفہوم کی گواہی دیتی ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ جن عیسائیوں کا ذکر اس آیہ مجیدہ میں ہو رہا ہے اُن کو ''یعقوبیہ'' کہتے ہیں۔ جو خود حضرت عیسیٰؑ کو خدا مانتے ہیں وہ ان کو تثلیث میں سے ایک یا خدا کا بیٹا تسلیم نہیں کرتے۔ [1]

بعید نہیں کہ ان دونوں عیسائی فرقوں کا نظریہ یہی رہا ہو کہ خدا حضرت عیسیٰؑ میں حلول کر آیا ہے اور بعد میں یہی عقیدہ تثلیث کی صورت اختیار کر گیا ہو، یعنی خدا، عیسیٰ اور روح القدس تینوں مل کر خدا ہیں۔

اس نظریہ کو ''توحید میں تثلیث'' کہتے ہیں۔ ان دونوں عقائد شرک کی اصلیت اگر ایک ہی ہو تو ظاہر ہے کہ پہلے عقیدہ کو ''توحید در تثلیث'' اور دوسرے کو ''تثلیث در توحید'' کہنا ہوگا۔ اس طرح حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت پر اعتقاد، یعنی یہ کہ وہ خدا ہیں، کسی طرح تثلیث در توحید کے منافی قرار نہیں پاتا۔ اب شرک کی دوسری صورت کی تشریح پیش کی جاتی ہے۔

مقدس ثالوث یا توحید میں تثلیث

آج کے عیسائیوں کی طرح عہد پیغمبر اکرمؐ کے عیسائی بھی تثلیث کے اس طرح قائل تھے کہ ان میں سے ایک خدا ہے۔ اگر تثلیث کی تھوڑی سی تفصیل میں جائیں تو کئی ایک سوالات جنم لیتے ہیں مثلاً:

۱۔ کیا ان تینوں میں ہر ایک مقام ملوکیت کا مالک ہے؟ یا

۲۔ ان میں سے ہر کوئی خدائی میں حصہ رکھتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

اس سلسلہ میں ہم بعد میں تفصیلاً عرض کریں گے۔ فی الحال عرض یہ ہے کہ اس نظریہ کے لیے قرآن مجید کیا فرماتا ہے؟

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ ؕ وَقَالَ الۡمَسِيۡحُ يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبَّكُمۡ ؕ اِنَّهٗ مَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ الۡجَـنَّةَ وَمَاۡوٰهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ

---

[1] ان اللہ اتحد بالمسیح اتحاد الذات فصا رشئًا واحد و صار الناسوت لاھوتا۔ مجمع البیان ج ۲، ص ۲۲۸۔ شیخ طوسیٰ بتیانؒ میں مسیح کو خدا کہنے والوں کو اہل تثلیث کہتے ہیں۔ بتیان ج ۲، ص ۵۸۷

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(سورہ مائدہ: ۷۳، ۷۴)

''ان لوگوں نے یقیناً کفر کیا جنہوں نے یہ کہا کہ تینوں میں کا ایک خدا ہے۔ حالانکہ خدا تو صرف اور صرف ایک ہی ہے۔ اگر وہ اپنے اس عقیدہ سے باز نہ آئے (تو سن لیں) کہ کافروں کے لیے اذیت ناک عذاب ہے۔ (حیرت ہے کہ) وہ بارگاہ اللہ سبحانہ تعالیٰ میں توبہ کیوں نہیں کرتے اور اس سے معافی کیوں نہیں مانگتے جبکہ اللہ سبحانہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے''

عیسائیوں کے شرک کی پہلی قسم، اگر چہ بے بنیاد ہے، مگر بالکل واضح ہے جبکہ دوسری قسم مبہم اور غیر واضح ہے اور تصدیق کی منزل پر نہیں پہنچتی۔ انشاء اللہ اگلے باب میں ہم اس پر بحث کریں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کے تین پہلو

''توحید'' اعتدال اور میانہ روی کا اس قدر باریک راستہ ہے کہ اس سے ذرا سا دائیں بائیں ہوتے ہی انسان آسمانی اقدار مشترک سے خارج ہو جاتا ہے۔

عیسائیوں کا توحید سے انحراف اتنا اظہر من الشّمس ہے کہ ان کو کسی صورت میں بھی انبیاء کے نظریہ توحید کے پیرو نہیں کہا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان سے مذاکرات کے موقع پر اسلام نے ان کے سامنے سب سے پہلے بات یہی رکھی کہ انبیاء کی اس قدر مشترک کی پاسداری کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ

(سورہ آل عمران: ۶۴)

''(اے حبیبؐ) اہل کتاب سے فرما دیجیے کہ آؤ اس بنیادی مسئلے پر بات کریں جو ہمارے درمیان مشترک ہے یعنی سوائے اللہ سبحانہ کے کسی کی بندگی نہ کریں''

عیسائیوں نے توحید سے اپنے انحراف کو تین صورتوں میں پیش کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان تینوں کی بنیاد ایک ہی ہو۔

ا۔ عالم ماوراء مادہ والی حقیقت کو وہ مادی سطح پر لے آئے یعنی دعویٰ کر دیا کہ خود عیسیٰ ہی خدا ہیں۔ اس بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ (سورہ مائدہ: ۷۲)

''یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ عیسیٰ ابن مریم ہی خدا ہے''

۲۔ تثلیث کا مسئلہ یعنی خدا، عیسیٰ اور روح القدس تینوں مل کر خدا ہیں۔

۳۔ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے اور الوہیت تین عناصر پر مشتمل ہے، یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس

پچھلے صفات میں ہم نے توحید سے عیسائیوں کے پہلے انحراف پر روشنی ڈالی ہے۔ اب دوسرے انحراف کی وضاحت پیش کر رہے ہیں۔ اس مسئلے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ و ما من الٰہٍ الا الٰہ واحد

''یقیناً وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے یہ کہا کہ تین میں ایک خدا ہے۔ حالانکہ خدا تو صرف ایک ہی ہے''

عیسائیوں کا مسئلہ تثلیث ایک پیچیدہ و غیر واضح مسئلہ ہے جسے عام فہم اصولوں سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ عیسائیوں کی پہلی بات پر پہلی نظر میں قابل فہم معلوم ہوتی ہے، اگرچہ خلاف حقیقت اور بے معنی ہے کیونکہ ایک عین کمال و جمال اور مادیات سے ماوراٗ حقیقت مادی صورت میں کسی خاتون کے شکم سے کیسے جنم لے سکتی ہے۔

دوسری بات تو سراپا ابہام و اجمال پر مبنی ہے اور خود اپنے مفہوم ہی میں متضاد ہے کہ عقل اسے تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ ایک طرف عیسائی اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ توحید پرست ہیں اور کائنات کے خدا کو واحد و اَحد مانتے ہیں۔ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ وحدت حقیقی ہے جس میں مجاز کا شائبہ تک نہیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ساتھ ہی وہ یہ کہنا بھی شروع کر دیتے ہیں کہ تین عناصر مل کر خدا ہیں۔ یعنی وہ کثرت اور سہ گانگی کو یگانگی کہہ رہے ہیں جو بالکل قرین عقل نہیں۔

اگر وہ دو اجزا میں ایک کو حقیقی اور دوسرے کو مجازی مانتے یعنی وحدت کو حقیقی اور کثرت کو مجازی یا بالعکس، تو کوئی بات بھی تھی اور اس کا عقلاً تصور بھی کیا جا سکتا تھا۔ مگر کیا کیا جائے کہ وہ دونوں چیزوں کو حقیقی ماننے بلکہ منوانے پر اصرار کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تین کو ایک تسلیم کرو، اور یہ بات خدائے واحد کے بارے صحیح قرار دے رہے ہیں۔

ایک طرف تو عیسائی محققین دعویٰ کرتے ہیں کہ انبیاء کی تعلیمات کے مطابق توحید مذاہب آسمانی کی بنیادی قدر مشترک ہے، اس کائنات کا خالق، پالنے والا اور معبود خدائے واحد ہے اور اس نظریہ سے تھوڑا سا انحراف بھی دین سے خارج ہونے کے لیے کافی ہے۔ دوسری طرف وہ حضرت عیسیٰ کی ذات کے بارے میں غلو کرنے اور ہندوؤں کے ''نظریہ تثلیث''[1] سے متاثر ہو کر تثلیث کے قائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی کے ساتھ الوہیت مسیح اور ''روح القدس'' کے بھی قائل ہو چکے ہیں، اگرچہ یہ عقیدہ اپنانے کے بعد وہ ایسے مخمصے میں پھنس گئے ہیں کہ آج تک کسی عیسائی مذہبی شخصیت کی طرف سے اس مسئلے کا اطمینان بخش جواب نہیں دیا جا سکا۔

---

[1] ہندوں کا نظریہ تثلیث یہ ہے، ازلی و ابدی خدا کے تین مظاہر ہیں (۱) برہما (خالق کائنات) (۲) وشنو (کائنات کا محافظ) اور (۳) شیوا (کائنات کو فنا کرنے والا) مترجم

عیسائی مبلغین نے اس نظریاتی دلدل سے نکلنے کی ناکام کوشش کی ہے اور دو اٹکل پچو باتیں تلاش کی ہیں:

۱۔ مذہبی عقائد کو منطقی اصولوں پر نہیں پرکھنا چاہیے یہ صحیح ہے کہ علم ریاضی کے مطابق ۳=۱ نہیں ہوسکتا مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر مذہبی عقیدہ کی تائید علوم دیگر سے حاصل کی جائے بلکہ جو بات مذہب کہے اسے بغیر چون و چرا مان لینا چاہیے''

یہ بات تو عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوا۔ یعنی مذہبی شخصیتوں کی طرف سے ایسی ''منطق'' پیش کر کے گویا لادین عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنا ہوا تاکہ وہ اپنے اس دعویٰ کو سچ ثابت کریں کہ مذہب علم کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ لہٰذا علمی ترقی کے لیے مذہب کو خیرباد کہنا ہوگا۔ سچی بات بھی یہی ہے کہ وہ نظریات جو علم و عقل سے متصادم ہوں ان کے تحفظ کے لیے انسان اپنا سرمایہ اور جان کیوں گنوائے۔

۲۔ مساوات ۱=۳ صحیح ہے اور کائنات میں اس کی مثال موجود ہے۔ مثلاً سورج جو ایک ہوتے ہوئے بھی تین ہے۔ تین اس طرح کہ وہ ایک سیارہ ہے، ایک نور ہے اور حرارت ہے۔ تو اگر سورج ایک ہونے کے ساتھ ساتھ تین ہوسکتا ہے تو ہمارا تثلیث کا نظریہ صحیح کیوں نہیں ہوسکتا۔

سبحان اللہ! اس لفظی گورکھ دھندے سے بھلا ایک محال بدیہی کو کیسے ممکن ثابت کیا جاسکتا ہے؟ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کیا بات کی جارہی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے جو مثال پیش کی ہے اس کی رو بھی تین چیزیں ایک نہیں ہوسکتیں۔ ہر روز کے مشاہدے کی بات ہے کہ ایک نام کا اطلاق متعدد چیزوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً کارخانہ، فیکٹری وغیرہ جس کے لاتعداد اجزا ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح سورج ایک جرم فلکی کا نام ہے۔ اس سے نکلنے والی روشنی اور حرارت کچھ اور چیز ہے۔ سورج اس جرم فلکی کا نام ہے جس میں بے شمار ایٹم دھماکے سے پھٹتے رہتے اور روشنی اور حرارت میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مزید برآں روشنی اور حرارت بھی دو مختلف چیزیں ہیں جس کو علم طبیعات میں سات رنگ کا آمیزہ کہتے ہیں جبکہ دوسری شے اس سے ماوراء سمجھی جاتی ہے۔

ایک مذہبی محقق جو مذہبی اور نظریاتی مسائل جیسے نازک مسائل کی وضاحت کے لیے ایسی بے ہودہ مثال پیش کرے یقیناً اس کی علمی فرومائگی کی یہ بدترین مثال ہے۔ تشریح اور سلجھاؤ کے بجائے الجھاؤ پیدا کرنے والی لایعنی مثالوں کا سہارا ڈھونڈنے سے بہتر کیا یہ نہیں ہے کہ انسان حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کردے اور حق کا پیرو بن جائے؟

وحدت میں تثلیث سے کیا مراد ہے؟

اصولی طور پر ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ''تثلیث'' کے عنوان سے عیسائیوں کے ہاں ''سہ گانہ خداؤں'' سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں دو باتیں کہی جاتی ہیں اور دونوں ہی غلط اور عقلی طور پر ناقابل قبول ہیں:

(الف) ایک ہی صلاحیت وقابلیت کے تین افراد

اقانیم ثلاثہ سے تین ایسے افراد مراد ہیں جن میں ہر ایک فرد یا رکن اپنی مستقل ذات کا حامل ہو۔ اسی کا نام خدا ہے جن میں کا ہر

فرد اپنی شخصیت و استدلال کا مالک ہے جیسے لفظ ''انسان'' کا مفہوم وسیع و عریض ہے اور اس کے اربوں مصادیق دنیا میں موجود ہیں جو اپنے مستقل وجود اور ذات کے حامل ہیں اور ہر انسان مکمل طور پر ''انسان'' کا مصداق ہے نہ کہ اس کے کسی جزو کا۔ تثلیث کا یہ مفہوم عیسائیت کے بنیادی عقائد میں سے ہے جو جہالت پر مبنی ہے اور ''توحید'' کے ناقابل تردید دلائل اس نظریہ کو باطل کرتے ہیں جن کی رو سے اس کائنات کا خالق واجب الوجود وحدت عینی ہے یعنی اس کی ذات پاک کے لیے کسی طور پر بھی ثنویت یا کثرت کا تصور محال ہے۔

(ب) ایک ذات کے تین جزو

تثلیث سے مراد ایک موجود ہے جو تین مختلف چیزوں سے مل کر بنا ہے۔ اس کا نام خدا ہے۔ ان تین چیزوں میں کوئی ایک بھی الگ اپنی ذات میں خدا نہیں ہے بلکہ ان تین عناصر کا مرکب ''خدا'' ہے۔

''تثلیث'' کی اس تاویل میں یہ لازم آتا ہے کہ خدا اپنے وجود کے لیے اپنے تینوں اجزاء کا محتاج ہے۔ جب تک یہ تینوں اجزاء نہ ملیں وہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔

اس تعبیر پر بھی پہلی توجیہہ کی طرح بہت سے اعتراضات کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ وہ ''خدا'' جسے بے نیاز اور غنی ہونا چاہیے اس توجیہہ کے مطابق محتاج محض نظر آ رہا ہے جو اپنے وجود کے لیے بھی ان اجزاء کا محتاج ہے۔ اس مفروضہ کے مطابق خدا نے اپنی بے نیازی چھوڑ کر ایک فقیر و محتاج کی صورت اختیار کر لی ہے۔

۲۔ اگر ان اجزا میں کا ہر ایک جزو ''واجب الوجود'' یعنی اس کا وجود اس کی ذات ہی ہو تو پھر تین ''واجب الوجود'' ہو گئے جس کا بطلان اظہر من الشّمس ہے۔

اگر ان اجزاء میں کا ہر ایک جزو ''ممکن الوجود'' یعنی اپنے وجود کے لیے کسی غیر کا محتاج ہو تو پھر اپنے اور اپنے مرکب کے وجود کے لیے کسی اور خدا کا محتاج ہوگا جو ان کے مرکب کو ''وجود'' عطا کرے۔ اس حالت میں وہ 'خدا' جو اس مرکب کو وجود عطا کرے گا اسے خود ''بسیط'' ہونا چاہیے نہ کہ ''مرکب'' کیونکہ اس کے مرکب ہونے کی صورت میں یہی اعتراضات اس پر بھی عائد ہوں گے۔

مختصر یہ کہ 'خدائی' کے بارے میں 'تثلیث' کا عقیدہ مذکورہ بالا کسی مفہوم میں ہی کیوں نہ ہو، عقلی طور پر قابل تصور نہیں ہے۔

یہاں تک تو ہم نے فہم عامہ کی بنیاد پر حقائق رقم کیے اب دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اس بارے میں کیا ارشاد فرماتا ہے:

يَآَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ (سورہ نسا : ۱۷۱)

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو اور اللہ سبحانہ کے بارے میں صرف حق بات کہو! عیسیٰ ابن مریم اللہ سبحانہ کے پیغمبر اس کی (قدرت کی ایک) نشانی اور اس کی طرف سے (ایک خاص) روح ہیں۔ پس اللہ سبحانہ اور اس کے پیغمبروں کی تعلیمات کے مطابق اپنے عقائد بناؤ اور ''تثلیث'' والی بات نہ کہو۔ اگر تم اس سے باز آ گئے تو تمہارے ہی حق میں بہتر ہے۔ خدا تو صرف ایک ہے اور وہ اللہ سبحانہ ہے جو اس بات سے منزہ اور ماوراء ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور وہی ان کے لیے کافی ہے''

اس آیہ مجیدہ میں دل چسپ نکات ہیں جو ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ عیسیٰ کو خدا سمجھنا ان کی خود پسندی اور خود غرضی کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے اپنے قائد کے مقام و منصب میں اس لیے غلو کیا کہ اس کے پیرو ہونے کے ناطے وہ خود بھی بلند مرتبے سمجھے جائیں، ورنہ ایک انسان کو 'خدا' بنانے کی کیا دلیل ہو سکتی تھی۔ اسی سوچ کی رد کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللہ الا الحق

''اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو اور اللہ سبحانہ کے بارے میں صرف حق بات کہو'' (نساء:۱۷۱)

۲۔ اس آیہ مجیدہ میں حضرت عیسیٰ کی مندرجہ ذیل پانچ صفات گنوائی گئی ہیں:

(الف) عیسیٰ مریمؑ کے بیٹے ہیں۔

(ب) عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں۔

(ج) عیسیٰ اللہ سبحانہ کی نشانی ہیں۔

(د) اللہ سبحانہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو مریمؑ کے شکم میں اتارا

(ر) عیسیٰ اللہ سبحانہ کی طرف سے ایک خاص روح ہیں۔

ان صفات میں بعض تو حضرت عیسیٰ کے بندہ ہونے پر کھلم کھلا دلالت کرتی ہیں جبکہ دوسری صفات معقول تاویلات کے بعد قابل فہم ہو جاتی ہیں۔

(الف) قرآن مجید نے تقریباً سولہ مقامات پر حضرت عیسیٰ کو ''مریم کا بیٹا'' کہا ہے جو ان کے مخلوق ہونے کی ایک بین دلیل ہے۔

سورہ مریم میں قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ ؑ کی پیدائش سے متعلق ان کے مختلف مراحل اسی طرح گنوائے ہیں جس طرح ایک عام انسان کے ہوا کرتے ہیں مثلاً ان کا جنین ہونا، ان کا پیدا ہونا، شیر خوار بچے کی طرح پرورش پانا، ان کے گہوارے کا ذکر کرنا، وغیرہ وغیرہ یوں

قرآن مجید ان کے لیے خدائی اور الوہیت کی بانگ دہل تردید کر رہا ہے۔

(ب) عیسیٰ اللہ سبحانہ کے پیغمبر ہیں:

یعنی حضرت عیسیٰ اللہ سبحانہ کے پیغمبر اور اس کی طرف سے مامور ہیں۔ خود خدا یا اس کا جز نہیں ہیں۔

(ج) عیسیٰ اللہ سبحانہ کی نشانی ہیں:

قرآن حضرت عیسیٰؑ کو کلمہ قرار دیتا ہے جس طرح دوسری کئی آیات میں تمام موجودات کو "کلمات اللہ" فرماتا ہے۔ مثلاً

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ

(سورہ کہف:۱۰۹)

"(اے حبیبؐ) فرما دیجیے! اگر سمندر روشنائی بن جائے (اور اس روشنائی سے اللہ سبحانہ کے کلمات لکھنے شروع کریں) تو یہ روشنائی کا سمندر ختم ہو جائے گا مگر میرے پروردگار کے کلمات اب بھی باقی بچے رہیں گے"

اللہ سبحانہ نے کائنات کو کلمات اور حضرت عیسیٰ کو کلمہ فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات اور حضرت عیسیٰ میں ایک مماثلت پائی جاتی ہے وہ یہ کہ کائنات بھی اللہ سبحانہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی مظہر ہے اور حضرت عیسیٰ بھی اپنی معجزانہ ولادت کی وجہ سے اللہ سبحانہ کے خاص اختیار کی علامت ہیں۔ چنانچہ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچی کہ "قدرت کی نشانی" مخلوق ہوا کرتی ہے نہ کہ اولاد یا جزو!

(د) اللہ سبحانہ نے عیسیٰؑ کو حضرت مریمؑ کے شکم میں اُتارا:

عیسیٰؑ کا حضرت مریمؑ کے رحم مبارک میں اترنا ان کے مخلوق اور انسان ہونے پر دلالت کرتا ہے اور جیسا کہ پہلے بھی ہم نے بیان کیا ہے سورۂ مریم میں اللہ سبحانہ نے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے مختلف انسانی مراحل کا ذکر فرمایا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝۳۴

(سورہ مریم:۳۴)

"یہ ہیں مریمؑ کے بیٹے عیسیٰ اور ان کے صحیح حالات جن کے بارے میں تم شکوک وشبہات میں مبتلا ہو"

(ھ) اللہ سبحانہ کی طرف سے عیسیٰؑ ایک خاص روح ہیں:

یہ ایک مجمل اور غیر واضح بات ہے جس کی تاویل واضح آیات کی روشنی میں ہونی چاہیے، اگرچہ قدیم اور موجودہ عیسائی اس کی من مانی تاویل کرتے ہیں اور حضرت عیسیٰ کو اللہ سبحانہ کا جزو کہتے ہیں (معاذ اللہ) مگر جب قرآن مجید کی دیگر آیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو مطلب صاف واضح ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔

ا۔ اس آیۂ مجیدہ میں حضرت عیسیٰ کو اللہ سبحانہ کی روح کہتے ہوئے حرف "من" استعمال کیا گیا ہے۔ عیسائیوں کا کہنا ہے کہ یہ "من

تبعیضیه" ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ "من نشویہ"[i] ہے جس کی مثال یہ ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ (سورہ جاثیہ: ۱۳)

"آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے اور تمہارے لیے قابل تسخیر ہے"

عربی زبان سے تھوڑی شناسائی رکھنے والا بھی اس آیہ مجیدہ میں استعمال شدہ حرف من کو "من تبعیضیہ ماننے کو تیار نہیں ہوگا کیونکہ اس طرح یہ لازم آئے گا کہ آسمان و زمین اللہ سبحانہ کے اجزا ہیں ہر شخص اس جگہ پر استعمال شدہ حرف من کو "من نشویه" ہی کہتا رہا ہے اور کہتا ہے۔

۲۔ حرف "من" کے استعمال کی جس ترکیب کے بارے میں عیسائی حضرت عیسیٰ کو اللہ سبحانہ کا بیٹا کہہ رہے ہیں وہی ترکیب کئی گنا بہتر انداز میں حضرت آدم کے بارے میں بھی استعمال کی جا چکی ہے۔ سورہ حجر میں ارشاد ہوتا ہے۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ (سورہ حجر: ۲۹)

"جب میں اس کا ڈھانچہ تیار کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا"

اگر عیسائیوں کی بات مان لی جائے تو پھر حضرت عیسیٰ سے پہلے حضرت آدم اللہ سبحانہ کا جزو قرار پاتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس طرح کی استعمال شدہ ترا کیب کو سمجھنے کا انحصار قرآن مجید اور عربی زبان فہمی پر ہے۔ بعض اوقات کسی کو کسی ارفع و اعلیٰ ذات سے اس لیے منسوب کیا جاتا ہے کہ اس کا وقار بلند ہو جائے۔ مثلاً ہم مسجد کو خانہ خدا اور مجلس شوریٰ کو خانہ ملت کہتے ہیں۔ اسیطرح اگر حضرت عیسیٰ کو روح اللہ فرمایا گیا ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپؑ کا مقام و مرتبہ بلند ہو۔ مزید برآں حضرت عیسیٰ کی روح کو اللہ سبحانہ سے نسبت دینے کی وہی وجہ ہے جو حضرت آدمؑ کی روح کو اس سے نسبت دینے کی تھی۔ واقعی انسانی روح اس قابل ہے کہ مرتبہ وصلاحیت کی بنیاد پر عالم معنوی سے منسوب کی جائے نہ کہ عالم مادی سے چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی خلقت ایک اعجاز قدرت ہے، آپؑ کا مقام و مرتبہ بھی بلند ہے نیز سب سے بڑھ کر آپؑ ابھی تک زندہ ہیں۔ اس لیے آپؑ کی نسبت اللہ سبحانہ سے دی گئی ہے۔

زیر بحث آیہ مجیدہ میں حضرت عیسیٰؑ کی پانچ صفات جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، تمام آپؑ کے بندہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں، چنانچہ آخر میں نتیجہ نکالتے ہوئے آیہ مجیدہ کہتی ہیں:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ (نسا: ۱۷۱)

"پس اللہ سبحانہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور "تثلیث" کا نظریہ چھوڑ دو۔ اگر تم اس نظریہ سے باز آ گئے تو تمہارے ہی حق میں بہتر ہوگا"

---

[i] لغت عرب کے علم نحو کے تحت صرف "من" کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب حرف 'من اجزا کے معنی میں استعمال ہو تو اس کو "من تبعیضیہ" کہتے ہیں اور جب ایجاد اور خلق کے معنی میں استعمال ہو تو اس کو "من نشویہ" کہتے ہیں۔ (مترجم)

حضرت عیسیٰ ؑ کے بندہ ہونے کے دلائل

قرآن مجید حضرت عیسیٰؑ کے بندہ ہونے اور خدا نہ ہونے کے بارے میں تین دلائل پیش کرتا ہے:

حضرت عیسیٰ ؑ اور ان کی مادرِ گرامی کی خلقت

حضرت عیسیٰ ؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کی بود و باش

خود حضرت عیسیٰ کا اعتراف اور اعلانِ بندگی

پہلی دلیل کے بارے میں جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، سورہ مریم کی آیات ۱۶ تا ۳۴ کافی ہیں جن میں حضرت عیسیٰ کی ولادت کا مرحلہ وار بیان وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ ان آیات میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کی ولادت سے لے کر اُن کے مبعوث برسالت ہونے تک کے حالات تفصیلاً موجود ہیں، یہاں تک کہ جب ان کی والدہ گرامی حضرت مریمؑ کو دردِ زہ لاحق ہوا تو کیا صورت ہوئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ (سورہ مریم: ۲۳)

''دردزہ سے مجبور ہو کر ان کو کھجور کے ایک درخت کے نیچے پناہ لینا پڑی''

اس سلسلے میں اتنا مزید کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مریمؑ کی شادی کے بغیر حضرت عیسیٰؑ کا ان کے ہاں پیدا ہو جانا اللہ سبحانہ کی قدرت کاملہ کا مظاہرہ ہے، نہ یہ کہ حضرت عیسیٰ خدا ہیں۔ حضرت آدمؑ کی ولادت تو اس سے کہیں زیادہ تعجب انگیز ہے کہ ان کے تو نہ ماں ہے اور نہ باپ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۵۹ (سورہ آل عمران: ۵۹)

''عیسیٰ کی ولادت کا واقعہ اللہ سبحانہ کے ہاں آدم جیسا ہے جن کو اس نے مٹی سے بنایا، پھر حکم دیا ''ہو جا'' پس وہ ہو گئے'' (آدم بن گئے)

حضرت عیسیٰؑ کی بود و باش اُن کے بندہ ہونے کی دلیل

حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ گرامی کی بود و باش بالکل ایک عام انسان جیسی تھی۔ وہ دوسروں کی طرح کھاتے پیتے، سوتے جاگتے تھے اور ان کو بھی لوگوں کی طرح کئی قسم کی احتیاج رہتی تھی۔ کیا ایسے لوگ خدا یا جزو خدا ہو سکتے ہیں؟ ارشاد ہوتا ہے:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ

صِدِّيۡقَةٌ ؕ كَانَا يَاۡكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الۡاٰيٰتِ ثُمَّ انۡظُرۡ اَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ﴿۷۵﴾ (سورہ مائدہ:۷۵)

''مریم کے بیٹے عیسیٰ انبیاء ماسلف کی طرح محض ایک پیغمبر ہیں، ان کی والدہ گرامی صدیقہ ہیں۔ دونوں کھاتے پیتے تھے۔ (اے حبیبؐ) غور کرو۔ ہم (عیسیٰؑ کے بندہ ہونے کی) کیسی کیسی دلیلیں پیش کر رہے ہیں۔ (اے حبیبؐ) مزید غور کرو، (یہ لوگ) حق سے کیونکر برگشتہ ہو رہے ہیں''

خود حضرت عیسیٰ کا اعتراف بندگی

اللہ سبحانہ کا صرف ایک بندہ ہونے کے بارے میں خود حضرت عیسیٰ کا اپنا اعتراف قرآن مجید نے دو جگہوں پر بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَنۡ يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡمَلٰٓئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَمَنۡ يَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَيَسۡتَكۡبِرۡ فَسَيَحۡشُرُهُمۡ اِلَيۡهِ جَمِيۡعًا﴿۱۷۲﴾ (سورہ نسا: ۱۷۲)

''عیسیٰ اور مقربان بارگاہ الٰہی فرشتوں نے کبھی اللہ سبحانہ کا بندہ ہونے میں اپنی سبکی محسوس نہیں کی، جو بھی ایسا کرے گا اور کبر و نخوت کی وجہ سے اس کی عبادت سے منہ موڑے گا تو اللہ (اتنا طاقت ور ہے کہ) عنقریب ان سب کو اپنے دربار میں لا کھڑا کرے گا''

حضرت عیسیٰؑ کی عبادت اور تواضع سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ وہ خود اپنی عبادت تو نہیں کرتے تھے اور نہ ہی خود اپنے سامنے گڑگڑاتے تھے۔ وہ جس کے آگے بھی جھکتے تھے ان کے علاوہ کوئی اور تھا۔ بس وہی ان کا خدا تھا۔

آٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام نے معروف عیسائی عالم جاثلیق سے اس بارے میں ایک مناظرہ کے دوران بڑی دلچسپ بات ارشاد فرمائی۔ آپؑ نے فرمایا:

''عیسیٰؑ میں ساری خوبیاں تھیں، صرف ایک ہی عیب تھا کہ وہ عبادت کم کرتے تھے''

جاثلیق نے جھلا کے کہا: ''آپ کمال کرتے ہیں۔ عیسیٰؑ تو اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے''۔ امام نے فوراً پوچھا: ''عیسیٰؑ آخر کس کی عبادت کرتے تھے؟ خود اپنی یا اپنے غیر کی؟ یقیناً اپنے غیر کی عبادت کرتے تھے اور وہی ان کا خدا تھا۔ یہاں پہنچ کر جاثلیق کو

لاجواب ہونا پڑا اور وہ خاموش ہو گیا۔[1]

قرآن مجید نے ایک اچھوتے انداز میں زیر بحث سے مسئلے کو واضح فرمایا ہے۔ روزِ قیامت اللہ سبحانہ دوسروں پر حقیقت واضح کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ سے ایک سوال کرے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ (سورہ مائدہ: ۱۱۶)

''(اے حبیبؐ! اس وقت کو یاد کرو) جب اللہ سبحانہ تعالیٰ عیسیٰ سے دریافت فرمائے گا: کیا نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ سبحانہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو خدا مان لو؟ وہ عرض کریں گے پروردگار! میری کیا مجال کہ میں وہ بات کروں جس کا میں اہل نہیں ہوں اور اگر میں نے کہا ہوتا تو یہ تیرے علم میں ہوتا۔ تو میرے دل کی بات بھی جانتا ہے جبکہ میں تیری ذات کے بارے میں نہیں جانتا اور تو تمام غیوب سے واقف ہے''

پھر اگلی آیۂ مجیدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾ (سورہ مائدہ: ۱۱۷)

''میں نے لوگوں سے وہی کچھ کہا جس کا تو نے مجھے حکم فرمایا تھا، یعنی میرے اور اپنے پروردگار اللہ سبحانہ کی عبادت کرو! میں تو ان کا گواہ صرف اتنے ہی عرصے کے لیے تھا جب تک ان کے درمیان تھا جب تو نے مجھے اٹھا لیا پھر تو خود ان کا گواہ رہا اور تو ہر چیز کا گواہ ہے''

اس کے ساتھ عیسائیوں کے شرک یعنی نظریۂ تثلیث کے بارے میں ہماری بحث اختتام کو پہنچی۔ اب ہم ان کے اس مشرکانہ عقیدے کی طرف آتے ہیں کہ ''عیسیٰ اللہ سبحانہ کا بیٹا ہے''۔ یہ بتا دینا ضروری ہے اور ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ عیسائیوں کے ان مختلف عقائد شرک کا سرچشمہ ایک ہی، یعنی عیسیٰ کی خدائی''، گرچہ ظاہراً کبھی تثلیث کی بات کرتے ہیں اور کبھی اللہ سبحانہ کے بیٹے ہونے کی۔ اس سلسلے میں بھی قرآن مجید

---

[1] یہ واقعہ ''احتجاج طبرسی'' سے نقل کیا گیا ہے۔

نے بہت کچھ فرمایا ہے۔ انشاءاللہ آئندہ اوراق میں ہم اس پر بحث کریں گے۔

اللہ سبحانہ کا بیٹا قرار دینے میں شرک کی صورت

دنیا بھر کے موحدین کے لیے یہ بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ خدائے واحد پر یقین رکھیں، اسی کی عبادت کریں اور اس کے علاوہ ہر کسی کی عبادت سے انکار کریں۔ اس کے مقابلہ میں کچھ لوگ، جو توحید کے راستے سے بھٹک گئے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کی کوئی نہ کوئی اولاد ضروری ہے، لڑکی ہو یا لڑکا۔ قرآن مجید نے اس مسئلے پر مختلف انداز سے مشرکین سے مناظرہ کیا ہے۔ ذیل میں ہم اس کی بعض صورتیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ جنوں اور پریوں کو اللہ سبحانہ کو بیٹا کہنا

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ (سورہ صافات: ۱۵۸)

''انہوں نے اللہ سبحانہ اور جنوں میں رشتہ داری قرار دے رکھی ہے''

''قرآن مجید نے رشتہ داری کی وضاحت نہیں فرمائی کہ انہوں نے اللہ سبحانہ کے ساتھ جنوں کا کون سا رشتہ قائم کیا ہے۔ البتہ مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد اولاد کا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاہل عرب جنوں اور پریوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔

۲۔ فرشتوں کو اللہ سبحانہ کی بیٹیاں کہنا

زمانہ جاہلیت میں عرب فرشتوں کو اللہ سبحانہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور ان کی عبادت کیا کرتے تھے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ (سورہ اسرائیل: ۴۰)

''کیا اللہ سبحانہ نے تمہیں تو بیٹوں سے نوازا اور خود اپنے لیے لڑکیاں پسند کر لیں؟ یہ تم نے بہت بُری (ناجائز) بات کہہ دی''

زمانہ جاہلیت میں عرب اپنے جاہلانہ تصورات میں فرشتوں کو بہت خوبصورت سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کا عقیدہ تھا کہ فرشتے لڑکیاں ہیں۔ قرآن مجید ان کے اس عقیدے کو بیان فرماتا ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ (سورہ زخرف: ۱۹)

''فرشتوں کو جو اللہ سبحانہ کے بندہ ہیں، انہوں نے اس کی بیٹیاں بنا دیا''

۳۔ عیسیٰ کو اللہ سبحانہ کا بیٹا کہنا

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت میں غلو کرتے ہوئے ان کو اللہ سبحانہ کا بیٹا کہنا شروع کر دیا اور یوں وہ شرک کے مرتکب ہو گئے۔

قرآن مجید نے متعدد آیات میں اللہ سبحانہ کی اولاد کے عقیدہ کے خلاف بڑے واضح اور بلیغ انداز میں مناظرہ کیا ہے۔ اور اس باطل نظریہ کی پُرزور تردید کی ہے۔

اس مسئلے کے ذیل میں قرآنی موقف سے اپنے قارئین کرام کو مکمل طور پر آگاہ کرنے کے لیے ہم نے ترتیب وار قرآن مجید کی سورتوں سے حوالے جمع کیے ہیں جو پیش خدمت ہیں:

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ (سورہ بقرہ: ۱۱۶)

''(یہود و نصاریٰ) نے کہا اللہ سبحانہ نے اپنے لیے ایک فرزند منتخب فرما لیا ہے۔ وہ ان باتوں سے منزہ ہے، بلکہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا پیدا کردہ اور اسی کی بندگی اور اطاعت میں مصروف ہے''

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

(سورہ بقرہ: ۱۱۷)

''(اللہ سبحانہ) آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے ''ہوجا''، پس وہ ہو جاتی ہے''

اس آیۃ مجیدہ میں ''اللہ سبحانہ'' کے اولاد رکھنے کے مسئلے کی چار لحاظ سے تردید کی گئی ہے:

۱۔ سبحانہ

۲۔ بل لہ ما فی السموات والارض کل لہ قانتون

۳۔ بدیع السموات والارض

۴۔ و اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون

مذکورہ بالا چار نکات کی تشریح درج ذیل ہے:

(الف) لفظ ''سبحانہ'' منزہ ومبرہ کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی نقائص وعیوب سے منزہ اور کسی چیز کی ضرورت اور احتیاج سے بے نیاز۔ اس

آیۃ مجیدہ میں ضرورت واحتیاج سے بے نیازی کے معنی میں ہی آیا ہے۔مزید برآں دوسرے موقع پر لفظ سبحانہ کے بعد لفظ الغنی بھی آیا ہے۔ملاحظہ ہو:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ (سورہ یونس:٦٨)

''اورانہوں نے کہا: اللہ نے بیٹا بنا لیا وہ تو اس بات سے منزہ اور بے نیاز ہے (یعنی اسے کسی چیز کی حاجت نہیں''

گویا اللہ سبحانہ کسی کو اپنا بیٹا نہ بنانے کی یہ دلیل دے رہا ہے کہ وہ تو کوئی حاجت ہی نہیں رکھتا کیونکہ بیٹا تو اس کے لیے ہوتا ہے جسے جنسی تسکین کی حاجت ہو۔ یا پیرسالی میں بیٹے سے مدد کی ضرورت پڑے اور یا اس کو اپنی نسل کی بقا کی ضرورت ہو۔اللہ سبحانہ تو ان تمام باتوں سے پاک ہے۔

لفظ سبحانہ کا ایک اور مفہوم بھی ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ نسل کشی اور عیالداری مادی موجودات کا خاصہ ہے، یعنی باپ کا ایک جنرز وخاص حالات میں ماں کے رحم میں منتقل ہوتا ہے۔وہاں بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے، مگر اللہ سبحانہ اس سے کہیں بلند وارفع ہے کہ مادی قوانین اس پر حاوی ہوں۔

مختصر یہ کہ لفظ سبحانہ سے مراد ہر طرح کی ایسی مجبوری ونقائص سے بے نیاز ہونا ہے جن میں ایک عیالداری اور صاحب اولاد ہونا بھی ہے۔

بل لہ ما فی السموت والارض کل لہ قانتون

''البتہ آسمان اور زمین اسی کے ہیں اور (اُس کی مخلوق، اس کے زیرنگرانی اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں) اسی کی اطاعت وعبادت میں مصروف ہیں''

آیۃ مجیدہ کا یہ جملہ ایک اور دلیل پیش کررہا ہے۔عالم بالا (آسمان) اور عالم سفلی (زمین) میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ سبحانہ کے مقابلہ میں حقیر، متواضع، محکوم اور اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔بقول مشرکین اگر کوئی موجود اللہ سبحانہ کا بیٹا یا بیٹی ہو تو وہ یا تو آسمانوں میں ہوگا یا زمین پر۔وہ جہاں بھی ہوگا۔اللہ سبحانہ کے مقابلے میں ذلیل اور پست ہوگا۔پھر وہ بیٹا یا بیٹی کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ اولاد تو ماں باپ کی مانند ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر اللہ سبحانہ کی کوئی اولاد ہو تو پھر اس کو اللہ ہی کی طرح ''واجب الوجود'' یا خدائی کی صلاحیت کا حامل ہونا چاہیے۔''واجب الوجود'' کی اولاد ''مخلوق'' اور ذلیل وخاضع کیسے ہوسکتی ہے! مگر حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات، کیا آسمان اور کیا زمین، کہیں بھی اللہ سبحانہ کے علاوہ کوئی اور 'واجب الوجود' اور 'الٰہ' نہیں ہے۔پس ثابت ہوا کہ 'اللہ سبحانہ' کے کوئی اولاد نہیں ہے۔بلکہ خود اللہ سبحانہ کے علاوہ باقی ہر شے اس کی مخلوق اور مطیع ہے۔

ج۔بدیع السموت والارض

''اللہ سبحانہ'' آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔

اللہ سبحانہ نے کسی قسم کے نمونے، مادے اور شے کے بغیر یہ سارے آسمان اور زمین خلق فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کی قوتِ تخلیق ''ابداعی ہے یعنی خلقت مخلوق سے پہلے نہ تو کوئی مادہ موجود تھا اور نہ ہی کوئی نمونہ تھا جس کی مطابقت ہوتی۔ اسی طرح اخلاق عالم نے آسمانوں کو بھی بطورِ ابداعی خلق فرمایا جن کے لیے نہ تو پہلے سے کوئی مادہ موجود تھا اور نہ ہی کوئی نمونہ۔ لہٰذا اگر اس نے تمام آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اان کے درمیان ہے، بصورت ابداعی بغیر کسی پہلے سے موجود مادہ یا نمونہ کے خلق فرمایا ہے تو اس کی تمام مخلوق ابداعی ہی ہے اور یہ بات قطعی بے معنی ہے کہ ایک کو فرزند کے طور پر خلق فرمایا اور پھر اس کے متماثل بنائے۔ بقول معروف

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک زہم درو ند ہمچوں ارض و افلاک

ایک ابداعی موجود جو اپنی خلقت سے پہلے معدوم و نا پید تھا۔ اس خدا کا مثل کیسے ہوسکتا ہے جو ہمیشہ سے موجود تھا، اب بھی ہے اور رہمیشہ رہے گا۔ کبھی بھی اس پر 'عدم' کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

د۔و اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون

''جب وہ (اللہ سبحانہ) کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے اسے حکم دیتا ہے ہوجا! اور وہ ہوجاتی ہے''

یہ جملہ اس مفہوم کو واضح کررہا ہے کہ اللہ سبحانہ جب کوئی شے بناتا ہے تو مراحل اور مدارج کا پابند نہیں ہوتا۔ ادھر وہ ارادہ کرتا ہے، اُدھر وہ چیز ہوجاتی ہے جبکہ بیٹا یا اولاد باپ اور ماں کی آمیزش کے بعد بتدریج کئی مراحل کی محتاج ہوا کرتی ہے۔ پس مراحل و مدارج کا محتاج ان سے بے نیاز ذات کا کیسے ہوسکتا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (سورہ انعام: ۱۰۰)

''انہوں نے جنوں جیسی مخلوق کو اللہ سبحانہ کا شریک بنادیا، حالانکہ اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے۔ انہوں نے جہالت اور لاعلمی میں اللہ سبحانہ کے بیٹے بیٹیاں گھڑ لیں جبکہ وہ اس سے کہیں ارفع اور منزہ ہے، جس بات کی وہ اس سے نسبت دیتے ہیں''

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ

كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٠١﴾ (سورہ انعام: آیت ۱۰۱)

''(اللہ سبحانہ) آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والا ہے۔ کسی کو اس کی اولاد کیسے سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ سرے سے اس کی کوئی زوجہ ہی نہیں ہے اور کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی مخلوق ہے اور وہ ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے''

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾ (سورہ انعام: ۱۰۲)

''تمہارے پالنے والے ''اللہ سبحانہ'' کی یہ شان ہے، اس کے علاوہ کوئی اور خدا ہے ہی نہیں۔ کائنات کی ہر چیز کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ وہ ہر چیز کا سرپرست ہے''

مذکورہ بالا آیات میں مندرجہ ذیل نکات سے استدلال کیا گیا ہے:

(الف) سبحانہ و تعالیٰ عما یصفون

''تم جو کچھ اس کے بارے میں کہتے ہو وہ اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ اور منزہ ہے''

(ب) بدیع السموت والارض

''وہ آسمانوں اور زمین کو وجود عطا کرنے والا ہے''

(ج) انی یکون له ولد و لم تکن له صاحبة

''اس کے اولاد کیسے ہو سکتی ہے اس کی تو زوجہ ہی نہیں ہے''

(د) وخلق كل شيءٍ

''کائنات میں موجود ہر چیز اسی کی مخلوق ہے''

پہلے دو نکات کی تشریح پچھلے صفحات میں کی جا چکی ہے۔ البتہ تیسرا نکتہ ایک نئی بات بیان کر رہا ہے، وہ یہ کہ اگر کسی کے اولاد ہو تو لازم ہوگا کہ اس کی کوئی زوجہ بھی ہو مگر یہاں تو سرے سے زوجہ ہی نہیں اور اللہ سبحانہ اس سے ماورا ہے کہ شادی کرے۔ چنانچہ جب زوجہ کا امکان معدوم ہے تو بچہ کیسے ہو سکتا ہے!

چوتھے نکتہ میں بھی تمام اشیاء کا مخلوق خدا ہونا لازم قرار دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ جیسی مخلوق اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار نہیں دی جا سکتی کیونکہ اولاد کے لیے لازم ہے کہ وہ باپ سے متماثل ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے مثل ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ہستی واجب الوجود کا مثل قرار پائے گا۔ لیکن مخلوق کے لیے جو ممکن الوجود ہے کسی طرح قابل قبول نہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ (سورہ یونس: ۶۸)

''وہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے اپنے لیے اولاد کا انتخاب کر لیا جبکہ وہ ان چیزوں کا محتاج نہیں ہے البتہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے۔کیا تمہارے پاس اس جہان کی کوئی دلیل ہے''، تم جہالت میں جو جی میں آتا ہے کہے چلے جاتے ہو''

اس آیۃ مجیدہ میں بھی پچھلی آیات کی طرح مشرکین کی الزام تراشی کے خلاف قرآن مجید مدلل استدلال پیش کرتا ہے جبکہ فرماتا ہے:

(الف) سبحانہ ھو الغنی

وہ ارفع واعلیٰ اور بے نیاز ہے

اولاد کی خواہش احتیاج جنسی کے پورا کرنے کے لیے ہوتی ہے یا بڑھاپہ کے دوران جسمانی احتیاجات کے دور کرنے کے لیے اور خداوند عالم ان دونوں باتوں سے بے نیاز ہے۔

(ب) لہ ما فی السموت و ما فی الارض

''کائنات کی ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کے قبضہ قدرت واختیار میں ہے اور عزیر ومسیح وغیرہ جو ان کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اسی اعتبار سے کہ آسمان وزمین ہی میں موجود ہیں، اس کی مخلوق اور اس کے اختیار میں ہیں۔لہٰذا وہ ہرگز اس کے بیٹے (وہ فرد جو باپ کی مثل ہو) نہیں ہو سکتے۔

اس کی تشریح بھی سورہ بقرہ آیت ۱۱۶ میں پیش کی جا چکی ہے۔

(ج) ''ان عند کم من سلطانٍ بھذا اتقولون علی اللہ ما لا تعلمون''

''تمہارے پاس اللہ سبحانہ پر بہتان لگانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔کیوں جہالت میں غلط باتیں کرتے ہو؟''

البتہ سبحانہ پر صاحب اولاد ہونے کا بہتان خود تمہارے ضمیر کے خلاف ہے۔تم تہ دل سے خود اس بات کو نہیں مانتے۔

چنانچہ عقل مند آدمی کا یہ کام نہیں ہے کہ جس بات کو اس کا ضمیر نہ مانے وہ زبان سے کہنے لگے''

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾

(سورہ کھف: ۴۔۵)

''(اللہ سبحانہ) ان لوگوں کو تنبیہ کرتا ہے (انبیاء کے ذریعہ) جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے اپنے لیے ایک بیٹا چن لیا ہے۔ اس بات کا نہ انہیں احساس ہے نہ ان کے آباؤ اجداد کو کہ وہ کتنی بُری بات منہ سے نکال رہے ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ) وہ نرا جھوٹ بول رہے ہیں''

اس آیۃ مجیدہ میں بھی یہی بتایا گیا ہے کہ مشرکین کو اپنے دعویٰ پر نہ یقین ہے اور نہ ہی ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۳۵ (سورہ مریم: ۳۵)

''اللہ سبحانہ کی یہ شان نہیں ہے کہ کسی کو اپنی اولاد بنا لے۔ وہ ان امور سے ارفع اور منزہ ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو حکم دیتا ہے 'ہو جا' پس وہ وجود میں آ جاتی ہے''

یہ آیۃ مجیدہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کے بیان کے بعد کی ہے، اس میں بھی سورہ بقرہ کی آیات ۱۱۶ اور ۱۱۷ جیسا استدلال ہے اور اس میں بھی دو باتوں سے استدلال ہو رہا ہے۔

(الف) سبحانه: منزہ ہے۔

(ب) اذا قضى امر اًفا ًنما يقول له كن فيكون ۔ جب کسی چیز کے وجود کا حکم دیتا ہے تو کہتا ہے''، ہو جا اور وہ وجود میں آ جاتی ہے۔

۶۔ و قالوا اتخذ الرحمن ولداً (مریم: ۸۸ تا ۹۵)

''انہوں نے کہا کہ اللہ سبحانہ نے اپنے لیے بیٹا بنا لیا''

لقد جئتم شيئاً اداً

''یہ تم نے بہت بری اور گھٹیا بات کہہ دی''

"تكاد السموات يتفطرن منه و تنشق الارض و تخر الجبال هداً"

''قریب ہے (تمہاری اس ناحق بات سے) آسمان گر پڑے اور زمین پھٹ جائے اور سر بہ فلک پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں''

ان دعوا للرحمن ولداً

''اوہو! انہوں نے کیا کہہ دیا کہ اللہ سبحانہ کے بھی اولاد ہے؟''

و ما ینبغی للرحمن ان یتخذ ولداً

''اللہ سبحانہ اس سے کہیں بلند ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو''

ان کل من فی السموات والارض الا اتی الرحمن عبداً

''آسمانوں اور زمین میں ہر چیز خدائے رحمن کی عبادت گزار ہے''

لقد احصھم وعدھم عداً

''وہ ساری کائنات پر حاوی ہے اور ایک ایک چیز اس کے قبضہ میں ہے''

و کلھم اتیہ یوم القیامۃ فرداً

''روز قیامت ہر شخص اس کی بارگاہ میں تنہا آئے گا''

ان آیات کے اہم نکات پر ہم درج ذیل بحث کرتے ہیں:

(الف) وما ینغی للرحمن ان یتخذ ولداً

''اللہ سبحانہ کی یہ شان نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے''

یہ بالکل وہی مفہوم ہے جو ہم گذشتہ آیات میں لفظ ''سبحانہ'' اور ''ہوالغنی'' کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔

(ب) ان کل من فی السموت والارض الا اتی الرحمن عبداً

''آسمانوں میں اور زمین پر جو کچھ بھی ہے سب اس کے بندہ ہیں''

حضرت عیسیٰؑ یا حضرت عزیر اور فرشتے انہی آسمانوں اور زمین پر ہی تو رہتے ہیں، چنانچہ وہ بھی اللہ سبحانہ کی بندگی میں مصروف ہیں۔ لہٰذا وہ اللہ سبحانہ کی اولاد نہیں ہو سکتے کیونکہ اولاد تو باپ کی مثل ہوا کرتی ہے۔ اس لیے لازم ہوگا کہ وہ بھی ''الوہیت'' کے سلسلہ میں واجب الوجود باپ کی مثل ہوں۔ یہ آیۂ مجیدہ بھی اسی طرح کی ہے جو ہم اوپر پیش کر چکے ہیں۔

بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ (بقرہ: ١١٦)

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ﴿٢٦﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ (سورہ انبیاء: ٢٦، ٢٧)

''انہوں نے کہا کہ اللہ سبحانہ نے اپنے لیے ایک بیٹا منتخب کر لیا۔ جبکہ وہ تو بے نیاز مطلق ہے (وہ فرشتوں کو بھی اللہ سبحانہ کی اولاد کہتے ہیں) حالانکہ وہ تو اس کے برگزیدہ بندے ہیں اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی قدم

نہیں اٹھاتے بلکہ ہمیشہ اسی کی اطاعت میں رہتے ہیں"

اس آیۃ مجیدہ میں دو امور سے استدلال کیا گیا ہے۔

(الف) سبحانہ

کسی کو اپنی اولاد بنانے سے اللہ سبحانہ کی بے نیازی

(ب) بل عباد مکرمون

"یہ وضاحت کہ فرشتے تو اس کی مطیع محض مخلوق ہیں، واضح طور پر اولاد ہونے کی نفی ہے"

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنۡ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنۡ اِلٰهٍ (سورہ مومنون: ۹۱)

"اللہ سبحانہ نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا اور نہ ہی اس کا شریک کار کوئی اور خدا ہے"

اس آیہ مجیدہ نے صرف ایک جملے میں مشرکین کو دندان شکن جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

و ما کان معہ من الہ

"اس کے ساتھ تو کوئی اور خدا کبھی شریک کار نہیں رہا"

یعنی اگر کوئی فرد اس کی اولاد ہوتا تو اس کی طرح واجب الوجود اور 'خدا' ہوتا۔ یہ بات بالکل دلائل توحید کے منافی ہے۔

لَوۡ اَرَادَ اللّٰهُ اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصۡطَفٰى مِمَّا يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ۝۴ (سورہ زمر: ۴)

"اگر اللہ سبحانہ کسی کو اپنا بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مختلف مخلوقات میں سے جسے چاہتا بنا لیتا مگر اُسے تو کسی قسم کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اکیلا و تنہا ہے اور وہی اللہ قہار و جبار ہے"

اس آیۃ مجیدہ میں اللہ سبحانہ نے مشرکین کے اس بے بنیاد دعویٰ کو اپنی تین صفات کے ذریعے رد فرمایا ہے:

(الف) سبحانہ اللہ تعالیٰ پاک و منزہ ہے۔

(ب) الواحد وہ ایک ہے (یگانہ

(ج) القہار "وہ غالب و مسلط ہے

اللہ سبحانہ بے نیاز مطلق، یکتا و تنہا اور ہر چیز پر غالب اور مسلط ہے۔ اس کے علاوہ اس کائنات کی ہر چیز (ذوی العقول اور غیر ذوی العقول) سب اس کے سامنے ذلیل اور ہیچ ہیں۔ ایسی صورت میں اس کی اولاد کا تصور باطل اور محال ہے کیونکہ اگر اس کے کوئی اولاد ہوتی تو وہ بھی اپنے باپ کی طرح قہار و جبار ہوتی جبکہ وہ تو ایک اور صرف ایک قہار و جبار ہے۔ چنانچہ اولاد کا تصور قطعاً باطل ہے۔

یہ اُن آیات کا مجموعہ تھا جو واضح الفاظ میں مشرکین کے دعویٰ کی تردید کرتی ہیں۔

مشرکین کے جواب کے علاوہ ضمنی طور پر ان آیات سے ایک اور حقیقت آشکار ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ آیات حضور اکرمؐ پر مختلف اوقات اور حالات میں نازل ہوئی ہیں مگر ان میں تسلسل فکری پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے جو قرآن مجید کے من جانب اللہ سبحانہ ہونے کی بھی دلیل ہے۔ سورہ نساء میں بھی اسی حقیقت کو قرآن کے مبنی برحق ہونے کا ثبوت گردانا گیا ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿٨٢﴾ (سورہ نسا: ۸۲)

''اگر یہ (قرآن مجید) اللہ سبحانہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بلا کا اختلاف پایا جاتا''

قرآن مجید نے اللہ سبحانہ کی توحید، اولاد سے بے نیاز اور نسل کشی کی نفی کو مکی اور مدنی سورتوں، حالات جنگ و صلح اور پُرسکون و ہنگامی حالات میں یکساں طور پر پورے دلائل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

بے جا تقسیم

اللہ سبحانہ کی اولاد کا نظریہ ایک بے ہودہ اور لایعنی خیال ہے مگر اس سلسلے میں انہوں نے اولاد کی جو تقسیم کی ہے وہ اور بھی حیران کن بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ انہوں نے لڑکوں کو تو اپنے لیے قرار دیا مگر لڑکیوں کو جن سے وہ متنفر تھے، اللہ سبحانہ کی اولاد قرار دیا۔ قرآن مجید اس بے جا تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۭ

(سورہ اسرائیل: ۴۰)

''کیا تمہارے رب نے تمہیں تو لڑکوں سے نوازا اور خود اپنے لیے لڑکیاں اور فرشتے منتخب فرمائے؟''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿١٦﴾ (سورہ زخرف: ۱۶)

''کیا اللہ سبحانہ نے اپنی پیدا کردہ مخلوقات میں سے خود لڑکیاں اپنا لیں اور تمہیں لڑکے بخش دیے؟''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾ (سورہ نجم: ۲۱، ۲۲)

''کیا تمہارے لیے تو لڑکے ہوں اور خود اس کے لیے لڑکیاں؟ یہ تقسیم تو پھر بڑی بے تکی ہوئی''

(یعنی جو چیز تمہیں پسند ہے اس کو اپنے ساتھ نسبت دیتے اور جس چیز سے نفرت کرتے ہو۔ وہ اللہ کے لیے رکھتے ہو۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک دونوں یکساں اور اس کی مخلوق عزیز ہیں۔

اسی طرح سورہ زخرف میں ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾ (سورہ زخرف: ۱۹)

''انہوں نے فرشتوں کو لڑکیاں بنا دیا حالانکہ وہ اس کے اطاعت گزار بندے ہیں۔ کیا وہ ان کی خلقت کے چشم دید گواہ ہیں؟ ہم ان کی یہ بات لکھ لیں گے اور پھر ان سے باز و پرس کریں گے''

یہاں تک تو ہم نے قرآن مجید کی وہ آیات پیش کیں جن میں مشرکین یہود اور نصاریٰ سے اللہ سبحانہ کا کسی کو بیٹا بنانے کے بارے میں مناقشہ کیا گیا تھا۔ آگے ہم قرآن مجید کے وہ مناظرے پیش کریں گے جو اہل کتاب کے ساتھ مختلف عنادین کے تحت کیے گئے۔

آغاز ہجرت میں یہودیوں کی معاہدہ خلافی اور ہٹ دھرمی

جب حضرت رسول اکرمؐ مدینہ تشریف لے گئے تو آپؐ نے وہاں کے لوگوں کو ایک نیا طرز زندگی اور منشور عطا فرمایا۔ مدینہ کے اکثر عوام علی الخصوص قبیلہ اوس وخزرج کے جوان آپؐ کی طرف شدت سے مائل ہونے لگے۔ اس بات کو جزیرہ نما عرب خاص طور پر مدینہ منورہ اور اس کے گرد ونواح کے یہودیوں نے اپنے استحکام و بقا کے لیے خطرہ تصور کیا۔ اسلام کی توسیع وترقی سے انہیں اپنا اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی استقلال روبہ تنزل نظر آنے لگا۔

یہودی دوسروں پر اپنی برتری اس دعوے کی وجہ سے جتاتے تھے کہ وہ موحد ہیں اور آسمانی کتاب اور منشور رکھتے ہیں۔ مگر ظہور اسلام سے ان کی یہ خصوصیت ختم ہوگئی کیونکہ جس چیز کی موجودگی سے وہ اپنے اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ مسلمانوں کو اس سے کامل تر چیز مل گئی۔

سرمایہ داری جو یہودیوں کا نصب العین تھا، اسی صورت میں ممکن تھی کہ عوام میں تفرقہ واختلاف فروغ پائے اور معاشرے میں عدم استحکام ہو۔ مگر اسلامی اخوت و برداری کی برکت سے اوس وخزرج اور مہاجرین وانصار جسد واحد بن گئے۔ اسلام کی مقناطیسی کشش کی وجہ سے تمام مسلمانوں نے سرمایہ دار یہودیوں کے ناپاک عزائم کے سیل تندرو کے سامنے گویا ایک بند باندھ دیا تھا اور ان کو بے بس کر دیا تھا۔

ان حالت میں یہود کے سرغنوں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل صرف اس بات میں دیکھی کہ حضور اکرمؐ کی نبوت و رسالت کو لوگوں کی نظروں میں مشکوک بنا دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں سے کج بحثیاں، اٹکل پچو سوالات حتیٰ کہ ان کے خلاف اوچھے معاشری ہتھکنڈے آزمانے شروع کر دیئے۔ جب ان کو حسب توقع کامیابی نہ ہوئی تو پھر اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کو ختم کرنے کے لیے طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہ کیا۔ مگر بقول اللہ سبحانہ:

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا (مومن: ۵۱)

''ہم ہر حال میں اپنے نمائندوں کی مدد کرتے ہیں''

حضور اکرمؐ کی ہر قدم پر مدد کی گئی اور جزیرہ نما عرب میں موجود تمام یہودیوں پر ان کو غلبہ عطا کیا گیا۔

اس موقع پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قارئین کرام کے لیے یہودیوں کی بعض مذموم سرگرمیاں ظاہر کریں جو انہوں نے حضور اکرمؐ کی نبوت کو مشکوک بنانے اور آپؐ کی تبلیغ کو مسدود کرنے کے لیے روا رکھیں۔

ا۔ یہودیوں کا حضرت رسول اکرمؐ کی نبوت کی نشانیوں کو چھپانا

بعض دیانتدار یہودی جب مسلمانوں سے ملتے تو تورات میں مذکور حضور اکرمؐ کی نبوت کی نشانیوں کا ذکر کرتے اور آپؐ کے برحق ہونے کی تصدیق کرتے۔ اس طرح مسلمانوں کو بڑی تقویت ملتی اور یہودیوں کے موقف کا بطلان سب پر واضح ہو جاتا۔ اس صورت حال سے یہودیوں کے سرغنے بڑے پریشان ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پیروؤں کو اس بات سے سختی سے روک دیا، باقاعدہ ایک اعلامیہ تیار کیا گیا اور خفیہ طور پر تمام یہودیوں تک پہنچایا گیا۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں دو سے زیادہ مقامات پر مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ: ۷۶)

''(جب یہودی) مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ مگر جب آپس میں خفیہ نشست کرتے ہیں تو (دیانتدار یہودیوں سے یوں کہتے ہیں) تم مسلمانوں کو تورات میں موجود حضور اکرمؐ کی نشانیوں سے آگاہ کرتے رہتے ہو۔ تم کتنے بیوقوف ہو! اس طرح تو تمہارے خلاف بڑی محکم دلیل مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے گی۔ تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے''

اگلی آیہ مجیدہ میں یہودیوں کو اس رویے کے خلاف بڑی تنبیہ کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ (سورہ بقرہ: ۷۷)

''کیا یہ لوگ (یہودی) نہیں جانتے کہ اللہ سبحانہ، ان کی ظاہر و خفیہ سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ ہے؟

ارشاد ہوتا ہے:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (سورہ بقرہ: ۸۹)

''جب اللہ سبحانہ کی طرف سے خود ان یہودیوں کے نظریات کی تصدیق کرنے والی کتاب ان تک پہنچی، ماضی میں وہ خود جس کے حوالے سے اپنے مخالفین پر غلبہ پاتے رہے ہیں اور جس کی صداقت سے وہ بخوبی آگاہ تھے، اس کے منکر ہو گئے۔ بے شک منکرین پر اللہ سبحانہ کی لعنت ہے''

طلوع اسلام سے پہلے مدینہ منورہ اور اس کے گردونواح میں بسنے والے یہودی بت پرست مشرکین سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب وہ دن آئے گا جب عرب پیغمبرؐ کے ذریعے ہمارا آئین توحید تمہارے مشرکانہ نظریات پر غالب رہے گا۔

آیۃ مجیدہ:

و کانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا

''جس کے حوالے سے وہ خود مخالفین پر غلبہ پاتے تھے، اسی واقعے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

۲۔ یہودیوں کی حضرت جبرائیل امینؑ سے دشمنی

یہودی حضرت جبرائیل امینؑ کے شدید دشمن ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جبرائیل انبیاء و اولیاؑ کی تعظیم کرتا ہے جبکہ نافرمان اقوام کو نیست و نابود کرتا رہا ہے، بنی اسرائیل جن سے الگ نہیں۔

حضور نبی اکرمؐ کی علمی استعداد و صلاحیت کو پرکھنے اور جواب نہ دے سکنے کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تضحیک کے لیے یہودی اکثر آپ سے عجیب عجیب سوالات کرتے رہتے تھے۔ جن میں سے بعض قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں:

i۔ یہودی: بچہ چونکہ صرف باپ کے نطفے سے پیدا ہوتا ہے تو اس کا اپنی والدہ سے مشابہ ہونا کیونکر ہے؟

حضرت رسول اکرمؐ: بچہ صرف باپ کے نطفے سے نہیں بلکہ ماں باپ دونوں کے نطفوں کے ملنے سے جنم لیتا ہے۔ چنانچہ جس کا نطفہ اپنے اثر میں غالب رہتا ہے، بچہ اسی کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

ii۔ یہودی: آپؐ کی نیند کی کیفیت کیا ہے؟

حضرت رسول اکرمؐ: میری نیند کی بھی وہی کیفیت ہے جو تمام انبیاء کی نیند کی تھی۔ یعنی میری آنکھ سوتی ہے جبکہ میرا دل بیدار رہتا ہے۔

iii۔ یہودی: حضرت اسرائیلؑ نے اپنے اوپر کون سے کھانے حرام کر لیے تھے؟

حضرت رسول اکرمؐ: وہ اونٹ کا گوشت اور دودھ ہر غذا سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ اپنی بیماری سے صحت یابی کے لیے شکر گزاری کے طور پر انہوں نے ان دونوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

iv۔ یہودی: روح کیا ہے؟

حضرت رسول اکرمؐ: ''روح' جبرائیل امینؑ ہی کا نام ہے جو اللہ سبحانہ کی طرف سے وحی لے کر آتے ہیں۔

v۔ یہودی: جبرائیل تو ہمارا دشمن ہے اور وہ سفاک و ظالم ہے۔ اگر آپؐ پر اس کے علاوہ کوئی وحی لے کر آتا تو ہم آپؐ پر ایمان لے آتے۔

اس موقع پر وحی نازل ہوئی اور ان کے سوال کا یہ جواب آیا:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ (سورہ بقرہ: ٩٧)

''(اے حبیب) فرما دیجیے! جو شخص جبرائیل امینؑ کا دشمن ہے (دراصل وہ اللہ سبحانہ کا دشمن ہے کیونکہ جبرائیل ہی تو اللہ سبحانہ کے حکم سے قرآن مجید کو آپؐ کے قلب اطہر پر نازل کرتا ہے، وہ قرآن مجید جو سابقہ ادیان کا تصدیق کنندہ مومنین کے لیے وسیلہ ہدایت اور بشارت دہندہ ہے''

اگلی آیہ مبارک میں ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾ (سورہ بقرہ: ٩٨)

''جو شخص اللہ سبحانہ، اس کے فرشتوں، پیغمبروں، جبرائیل اور میکائیلؑ سے دشمنی رکھے گا (اللہ سبحانہ اس سے دشمنی رکھے گا) بے شک اللہ سبحانہ، کافروں کا دشمن ہے''

ا۔ یہودیوں کو بہانے بنانے اور خواہ مخواہ اعتراضات کرنے کی عادت تھی۔ حضور اکرمؐ پر ایمان نہ لانے کا بہانہ انہوں نے یہ تراشا کہ جبرائیل قوموں کو نابود کرنے والا ظالم فرشتہ ہے اور وہی ان پر وحی لاتا ہے۔ اس لیے وہ آپؐ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ انہوں نے یہ بات کہتے ہوئے بالکل نہ سوچا کہ فرشتے تو اللہ سبحانہ کے مطیع محض ہیں۔ اگر اعتراض کرنا ہو تو وہ اپنے خدا پر کریں نہ کہ اس کے مامورین پر۔ قرآن مجید ملائکہ کی اصلیت کو ایک چھوٹے سے جملہ میں ارشاد فرماتا ہے:

لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿٦﴾ (سورہ تحریم: ٦)

''(فرشتے) وہ ہرگز اللہ سبحانہ کی حکم عدولی نہیں کرتے بلکہ انہیں جو بھی حکم دیا جائے بلا چون و چرا ان بجا لاتے ہیں''

۲۔ سورہ بنی اسرائیل آیۃ ۸۵ میں ''ویسئلونک عن الروح یعنی (اے حبیبؐ) وہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے؟ یہودیوں ہی کے سوال کا ذکر کیا گیا کہ انہوں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوال کیا کہ اس روح سے مراد انسانی روح ہے اور نہ ہی وحی الٰہی۔ بلکہ اس سے مراد جبرائیل امین ہی ہیں۔ ابن ہشام اپنی کتاب میں یہودیوں کی طرف سے کیے جانے والے سوال کا متن یوں نقل کرتا ہے:

فاخبر نا عن الروح؟ قال انشد کم با الله و با یامه عند بنی اسرائیل تعلمونه جبرائیل و هو الذی یاتینی قالوا: اللهم نعم ولکنه یا محمد لنا عدو (ا)[1]

''آپؐ ہمیں روح کے بارے میں بتائیے'' آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اگر اللہ سبحانہ اور بنی اسرائیل کے ہاں اس کے احکامات کے احترام کی قسم روح، وہی جبرائیل امینؑ ہیں جو میرے پاس وحی لے کر آتے ہیں'' وہ بولے: ''اگر یہ ٹھیک ہے تو وہ ہمارا دشمن ہے''

اس روایت کی بنا پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''قل الروح من امر ربی'' یعنی (اے حبیبؐ) فرما دیجیے کہ ''روح میرے پروردگار کی طرف سے مامور ہے'' والے جملے میں وہ روح سے مراد حضرت جبرائیل امینؑ ہی ہیں۔ چنانچہ جبرائیلؑ کی طرف سے کسی قوم کو عذاب میں مبتلا کرنا یا کسی کا احترام کرنا اللہ سبحانہ کے حکم کے مطابق ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے مامورین کا کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ یہودیوں کا حضرت سلیمانؑ کی نبوت سے انکار

یہودی تورات میں تحریف کی وجہ سے حضرت سلیمانؑ کی نبوت کے منکر ہو گئے اور انہیں جادوگر اور شعبدہ باز سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے تھے حتیٰ کہ انتظار میں تھے کہ حضور اکرمؐ بھی ان کی نبوت سے انکار کر دیں گے۔ اس موقع پر اللہ سبحانہ کی طرف سے آنحضرتؐ کی مدد میں وحی نازل ہوئی جس میں یہودیوں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس طرح ذکر ہوا:

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ (سورہ بقرہ: ۱۰۲)

''یہودیوں نے ان وسوسوں کی پیروی کی جو حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں شیاطین نے لوگوں کے دلوں میں ڈالے۔ سلیمانؑ نے ہرگز اللہ سبحانہ کی اطاعت سے انکار نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا اور لوگوں کو جادو سکھایا۔ مزید برآں یہودیوں نے اس کی پیروی بھی کی جو بابل کے دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر نازل ہوا۔

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ا ص ۳۰۱، طبع حلبی

۴۔خیبر کے یہودیوں کے نام حضرت رسول اکرمؐ کا خط

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرمؐ نے خیبر کے یہودیوں کو خط تحریر فرمایا۔خط کا متن مندرجہ ذیل ہے:

موسیٰ کے بھائی اور اللہ سبحانہ کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے جو حضرت موسیٰؑ کی تصدیق وتائید کرنے والے ہیں۔کیا اللہ سبحانہ تعالیٰ نے تورات میں میری اور میرے ساتھیوں کی یوں مدح سرائی نہیں فرمائی؟

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ (سورہ فتح:۲۹)

''محمدؐ اللہ سبحانہ کے رسولؐ ہیں۔ان کے ساتھیوں کی پہچان یہ ہے کہ کافروں سے سخت رویہ رکھتے ہیں مگر آپس میں مہر ومحبت سے رہتے ہیں۔اکثر وہ رکوع اور سجود کرتے ہوئے (حالت نماز میں) نظر آتے ہیں۔صرف اللہ سبحانہ ہی کے فضل وکرم اور خوشنودی کے طالب ہیں۔اُن کے چہروں پر کثرت سجود کی نشانی نمایاں ہے۔اُن کی ان صفات کا ذکر تورات وانجیل میں بھی ہے۔اُن کی مثال اس پودے کی ہے جو پہلے اپنی ننھی کونپلیں نکالتا ہے پھر بڑا اور مضبوط ہوجاتا ہے حتیٰ کہ بالکل سیدھا ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجاتا ہے۔اس کی نمو اور وسعت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ خود کسان انگشت بہ نداں رہ جاتے ہیں۔یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ کافر اپنے آپ میں پیچ و تاب کھائیں۔جو لوگ ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے ہیں، اللہ سبحانہ نے ان سے بخشش اور بڑے اچھے بدلے کا وعدہ کر رکھا ہے''

اس کے بعد آپؐ نے خط میں مندرجہ ذیل اضافہ فرمایا:

''تمہیں اللہ سبحانہ کی قسم، جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس کی قسم، جس نے تمہاری 'من و سلویٰ '' [1] سے تواضع کی اس کی قسم! اس خدائے بزرگ و برتر کی قسم جس نے تمہارے بزرگوں کے گزرنے کے لیے دریائے نیل میں راستے بنا دیئے تھے، مجھے بتایئے تو سہی کیا تورات میں آپ اللہ سبحانہ کا یہ حکم نہیں پڑھتے کہ محمدؐ پر ایمان لاؤ؟ پس اگر تورات میں ایسا ہی ہے تو پھر حق واضح ہو گیا اور تمہاری ہدایت کا راستہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اگر تم پر کسی قسم کا طاغوتی دباؤ نہیں ہے تو ہم تمہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بلاتے ہیں۔ [2]

۵۔ یہودیوں کا دعویٰ کہ ان سے کسی قسم کا وعدہ نہیں لیا گیا

قرآنی آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ اللہ سبحانہ نے پہلی امتوں سے یہ وعدہ لیا تھا کہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ پر ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل (یہودیوں) سے خاص طور پر یہ وعدہ لیا گیا تھا مگر یہودی منکر ہو گئے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ انہیں تنبیہ فرما رہا ہے:

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝۱۰۰

(سورہ بقرہ: ۱۰۰)

''جب بھی انہوں نے (یہودیوں نے) اللہ سبحانہ سے کوئی وعدہ کیا ان میں سے ایک جماعت نے اس کی خلاف ورزی کی۔ دراصل ان میں اکثر ایمان نہ لائے''

جب ایک معروف یہودی ''ابوصلوبائی'' نے حضرت رسول اکرمؐ سے بڑے گستاخانہ انداز میں کہا: ''آپ کے پاس ہے کیا جسے ہم جانچیں یا پرکھیں اور آپ پر کیا نازل کیا گیا ہے جس کی ہم پیروی کریں؟''

تو اسی وقت وحی نازل ہوئی:

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۝۹۹ (سورہ بقرہ: ۹۹)

''(اے حبیبؐ) ہم نے آپ پر بڑی واضح آیات نازل کی ہیں۔ البتہ فاسق لوگ اُن کے منکر ہیں''

۶۔ یہودیوں کے نامعقول مطالبے

مدینہ منورہ کے ایک معروف ساہوکار یہودی ''وہب بن زید'' نے جو مدینہ کے یہودیوں میں دولت جمع کرنے میں مشہور تھا، حضرت

---

[1] من وسلویٰ: تیہ کے مقام پر اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل کی ضیافت کی۔ اس میں مخصوص قسم کے درخت کا مشروب اور ایک پرندہ کا بھنا ہوا گوشت تھا جو کبوتر جیسا ہوتا تھا۔

[2] سیرتِ ابن ہشام، ج ۱ ص ۵۴۵

رسول اکرمؐ سے مطالبہ کیا کہ معجزہ سے یہودیوں کے لیے ایک چشمہ جاری کر دیں تو وہ ایمان لے آئیں گے۔ اس بارے میں وحی نازل ہوئی:

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ (سورہ بقرہ: ۱۰۸)

"(اے یہودیو!) کیا تم رسول اللہؐ سے بھی وہی مطالبہ کرتے ہو جو موسیٰ سے کرتے تھے (یاد رکھو) جو شخص ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے گا وہ گمراہ ہوگا"

اسی طرح رافع ابن حریملہ نامی ایک یہودی نے حضرت رسولِ اکرمؐ سے مطالبہ کیا کہ اگر آپ اللہ سبحانہ کے پیغمبر ہیں تو اللہ سے کہیں کہ ہم سے باتیں کرے اور ہم سنیں۔

اس سلسلہ میں وحی نازل ہوئی:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ (سورہ بقرہ: ۱۱۸)

"جاہل لوگوں (یہودیوں) نے کہا خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا اور ہم پر آیتیں کیوں نہیں نازل ہوتیں؟ (اے حبیبؐ، آپ ان کی باتوں کا بُرا نہ مانیں) ان کے بڑے بھی اپنے زمانے میں ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے نظریات ایک جیسے ہی ہیں۔ بے شک (ہم نے واضح نشانیوں کے ذریعے ان پر اپنی حجت تمام کر دی ہے) ایمان لانے والے ان کو قبول بھی کرتے ہیں"

۷۔ حضرت رسول اکرمؐ کی موجودگی میں عیسائی اور یہودی سربراہوں کے درمیان تلخ کلامی

ہجرت کے اوائل ہی کی بات ہے کہ نجران کے کچھ عیسائی مدینہ آئے۔ یہودیوں کو بھی پتہ چل گیا اور وہ بھی پہنچ گئے۔ دونوں آپس میں اُلجھ پڑے۔ حضرت رسول اکرمؐ بھی اس محفل میں تشریف فرما تھے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت اور انجیل کو ماننے سے انکار کر دیا۔ عیسائیوں میں سے بھی چند آدمیوں نے غصہ میں آ کر حضرت موسیٰ کی نبوت اور تورات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر وحی نازل ہوئی جس میں دونوں کو تنبیہ کی گئی کہ ضد میں آ کر ایک دوسرے کو مت جھٹلائیں بلکہ اپنی اپنی مذہبی کتاب کا توجہ سے مطالعہ کریں تا کہ حقیقت واضح ہو:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَىْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(سورہ بقر: ۱۱۳)

''یہودیوں نے عیسائیوں سے کہا کہ اللہ سبحانہ کے ہاں تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ یہی بات عیسائیوں نے بھی یہودیوں سے کہہ ڈالی (دونوں نے ایک دوسرے کے نبی اور اس کی کتاب کا انکار کر دیا) حالانکہ دونوں ہی اپنی اپنی کتاب میں حقیقت کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ جاہل لوگ بھی انہی کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ روزِ قیامت ان کے درمیان فیصلہ فرمادے گا''

کبھی کبھی عیسائی اور یہودی مل کر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ خود حضرت رسول اکرمؐ سے کہتے کہ اگر آپ ہدایت چاہتے ہیں تو اسلام کو چھوڑ دیں اور عیسائیت یا یہودیت میں سے کسی دین کے پیرو بن جائیں۔

قرآن مجید ان کی یہ جسارت بیان فرماتا ہے:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ (سورہ بقرہ: ۱۳۵)

''(یہودیوں اور عیسائیوں) نے کہا! اگر ہدایت مطلوب ہے تو یا یہودی بن جاؤ یا عیسائی''

اس آیۃ کے دوسرے حصے میں ان کا جواب بھی موجود ہے۔

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ (سورہ بقرہ: ۱۳۵)

''(اے حبیبؐ) انہیں جواب دے دیجیے (ہدایت کے لیے ہرگز یہودی یا عیسائی مذہب اختیار کرنے کی ضرورت نہیں) کہ دین حضرت ابراہیمؑ کی سچی اور خالص پیروی لازم ہے کیونکہ وہ کسی حال میں بھی مشرک نہ تھے''

کبھی یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کو اصلی مذہب بیان کرتے۔ قرآن مجید ان کی اس بات کو اسی طرح بیان فرماتا ہے:

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (سورہ بقرہ: ۱۱۱)

''(یہودی اور عیسائی کہنے لگے) یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ کسی اور مذہب کا پیرو ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا''

قرآن مجید نے ان کے اس خیال کو ایک زعم باطل قرار دیا ہے اور واضح فرمایا ہے کہ جنت کسی کا نام نہیں، یا نام لینے سے یا اپنے آپ کو کسی سے منسوب کرنے سے نہیں ملتی بلکہ آئین توحید (دین مقدس اسلام کی سچی پیروی) سے ملا کرتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۱۱۱ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝۱۱۲ (سورہ بقرہ: ۱۱۱،۱۱۲)

''یہ (مذکورہ بالا قول) ان کا خیال خام ہے۔البتہ اپنے دعوے کی کوئی ٹھوس دلیل ان کے پاس ہے تو پیش کریں جو شخص بھی اللہ سبحانہ کے حکم پر اپنا سر تسلیم خم کرے گا اور اعمال خیر بجالائے گا، بے شک اس کے لیے اللہ سبحانہ کے ہاں بہترین جزا ہے۔اسے نہ خائف کیا جائے گا اور نہ ہی وہ پریشان ہوگا'

اس آیۃ مجیدہ کی روشنی میں موجودہ زمانے کے لوگوں کو بھی چاہیے کہ ناموں اور نسبتوں پر اکتفانہ کریں، بلکہ حقیقت کی طرف آئیں۔

۸۔یہودیوں کا ایک ذومعنی لفظ سے غلط مطلب نکالنا:

بعض اوقات جب حضرت رسول اکرمؐ دینی احکامات لوگوں کو بتاتے تو بعض مسلمان حضورؐ سے کچھ مہلت مانگتے تا کہ وہ احکامات کو خوب سمجھ لیں۔اس موقع پر وہ ایک لفظ ''راعنا'' استعمال کرتے۔عربی لغت میں یہ لفظ دو مصدروں سے مشتق ہوسکتا ہے۔

۱۔ رعی اس کے معنی مہلت دینے کے ہیں۔

۲۔ رعونۃ اس کے معنی کسی کو احمق کہنے کے ہیں۔

مسلمان تو اسے پہلے معنی میں استعمال کرتے تھے مگر یہودی ان کا مذاق اڑانے کے لیے دوسرے معنی مراد لیتے اور کہتے کہ آپ حضورؐ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو ''احمق'' کہیں۔چنانچہ قرآن مجید نے مسلمانوں کو اس لفظ کے استعمال سے ہی منع کر دیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا لفظ تجویز فرمایا، جس سے یہودیوں کے استہزاء کی روک تھام ہوگئی۔ملاحظہ ہو:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝۱۰۴ (سورہ بقرہ: ۱۰۴)

''ایمان والو! ''راعنا'' مت کہا کرو بلکہ ''انظرنا'' کہا کرو (اور دیکھو) اس پر سختی سے عمل کرنا۔البتہ کفار کے لیے دردناک عذاب ہے''

سورہ نساء آیت ۴۶ میں بھی یہی بات قدرے تفصیل کے ساتھ فرمائی گئی ہے۔

۹۔یہود کے سرغنوں کا حقائق کو چھپانا

قبیلہ ''بنی سلمہ'' کے معاذ بن جبل، قبیلہ ''بنی عبدالاشہل'' کے سعد بن معاذ اور قبیلہ 'حارث بن خزرج'' کے خارجہ، زمانۂ جاہلیت میں

مدینہ کے یہودیوں سے میل جھول رکھتے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کی مدینہ کو ہجرت کے بعد یہ تینوں افراد مسلمان ہو گئے اور یہودی علماء کے پاس گئے تا کہ تورات میں موجود حضور اکرمؐ کی نبوت کے شواہد حاصل کریں۔ مگر انہوں نے حقائق کو چھپالیا اور انہیں کچھ بھی نہ بتایا۔ یہودی علما کے اس رویہ کی مذمت میں وحی نازل ہوئی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ (سورہ بقرہ: ۱۵۹)

''لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح احکامات ہم نے ''کتاب'' میں نازل کیے ہیں۔ جو لوگ ہماری اس وضاحت کے باوجود حقائق کو چھپائیں ان پر اللہ سبحانہ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں''

اگر عیسائی علماء اور دانشور انجیل و تورات میں بیان شدہ حضرت رسول اکرمؐ کی نبوت کی نشانیاں لوگوں کو بتاتے تو سب لوگ دین مقدس اسلام پر ایمان لے آتے اور ساری دنیا میں ایک ہی مذہب ہوتا۔ مگر افسوس! خود پسندی، بے جا تعصب اور ہوس اقتدار آڑے آئی اور حقائق چھپا لیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے ناسخ دین کی پیروی کے آج دنیا کے اربوں افراد منسوخ دین کی پیروی کر رہے ہیں۔

۱۰۔ حضور اکرمؐ اور یہودیوں کے مدارس

جن جگہوں پر بچوں اور جوانوں کو یہودیت کی تعلیم دی جاتی تھی انہیں ''بیت المدارس'' یا ''بیت الدارس'' کہتے تھے۔ ایک دن حضرت رسول اکرمؐ ایک مدرسہ میں تشریف لے گئے اور وہاں پر موجود اساتذہ اور طلباء کو دعوت اسلام دی۔ نعمان اور حارث نامی دو یہودی علما نے آپؐ سے سوال کیا: ''آپ کس دین کی دعوت دے رہے ہیں؟''

آپؐ نے فرمایا: ''میں حضرت ابراہیمؑ کے دین اور سنت کا پیغام لے کر آیا ہوں''

انہوں نے بڑی دیدہ دلیری سے تاریخی حقائق کو جھٹلاتے ہوئے کہا: ہمارا دین آپ کے دین سے بہتر ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ بھی یہودی تھے''۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا: ''ذرا تورات تو لاؤ کہ اس میں دیکھ لیں کہ کس کی بات برحق ہے''

انہوں نے تورات لانے میں پس و پیش کی تو یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ (سورہ آل عمران: ۲۳)

''(اے حبیبؐ) ان لوگوں کے رویہ کو ملاحظہ تو کرو! جب انہیں اللہ سبحانہ کی کتاب سے فیصلہ کرانے کی دعوت دی

جاتی ہے تو ان کی ایک جماعت رخ موڑ لیتی ہے اور روگردانی کرتی ہے''

کمال کی بات یہ ہے کہ وہاں چند عیسائی علماء بھی موجود تھے۔ جب یہودیوں نے حضرت ابراہیم کو یہودی بتایا تو عیسائی علماء نے ان کی تردید کی اور کہا کہ حضرت ابراہیمؑ تو عیسائی تھے اس طرح خود ان میں تکرار ہونے لگی اور ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ حضرت ابراہیم کو اپنے مذہب کا پیرو بتائے۔ حالانکہ یہ بات تاریخی مسلمات کے سراسر خلاف ہے کیونکہ 'اسرائیل' حضرت یعقوبؑ کا نام ہے اور حضرت ابراہیم حضرت یعقوب کے دادا ہیں۔ اس صورت میں حضرت ابراہیمؑ اسرائیلیوں کے مذہب کے پیرو کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ یہ دونوں مذاہب حضرت ابراہیم کے بعد آئے ہیں۔

قرآن مجید اس حقیقت کی پردہ کشائی فرماتا ہے:

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝٦٥ (سورہ آل عمران: ٦٥)

''اے اہل کتاب (حضرت) ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں بیکار کی بحث کرتے ہو؟ تمہیں اتنا بھی شعور نہیں تورات وانجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں''

اسی سورہ مبارکہ میں اللہ سبحانہ بالکل واضح الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ کے یہودی یا عیسائی ہونے کی نفی فرما رہے ہے:

مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝٦٧ (سورہ آل عمران: ٦٧)

''ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ وہ مخلص موحد مسلمان تھے۔ ان کا تعلق ہرگز مشرکین سے نہ تھا''

نیز

اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَـلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝٦٨ (سورہ آل عمران: ٦٨)

''ابراہیمؑ سے اپنے آپ کو نسبت دینے کے مستحق ترین لوگ وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ ہیں (حضرت محمد مصطفیؐ) یا جو لوگ حضور اکرمؐ پر ایمان لائے۔ بے شک اللہ سبحانہ، صاحبان ایمان کا سرپرست ہے''

۱۱۔ یہودی صبح کو ایمان لاتے اور شام کو کافر ہو جاتے

یہودیوں اور عیسائیوں نے جب یہ دیکھا کہ جزیرہ نمائے عرب کے اکثر عوام دین مقدس اسلام کی طرف تیزی سے مائل ہو رہے ہیں تو انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا اور وہ اس تصور سے کانپنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے اسلام کی مقبولیت کو زک پہنچانے کے لیے ایک چال چلی۔ اپنے چند آدمیوں کو کہتے کہ جاؤ صبح کے وقت حضرت رسول اکرمؐ کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہو جاؤ۔ مگر شام کو اعلان کر دو کہ ہم نے اسلام میں کوئی صداقت نہیں دیکھی۔ لہٰذا ہم اپنے پرانے دین کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ چند روز انہوں نے یہی کھیل کھیلا اور اپنے تئیں نو مسلم عوام الناس کو یہ تاثر دیا کہ جس دین کو تم والہانہ اختیار کر رہے ہو وہ قابل اعتماد نہیں ہے۔ قرآن مجید ان کی اس چال کو بیان فرماتا ہے:

وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ (سورہ آل عمران: ۷۲)

''اہل کتاب کی ایک جماعت نے کہا کہ مسلمانوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح کے وقت ایمان لے آؤ اور شام کو اس کے منکر ہو جاؤ تاکہ وہ (مسلمان متزلزل ہو جائیں) اپنے دین سے روگردانی کر لیں''

۱۲۔ اہل کتاب کا حضور اکرمؐ پر اپنی عبادت کرانے کا الزام

ایک دن یہودی اور عیسائی علماء مل کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے دین مقدس اسلام پر گفتگو کی۔ باتوں باتوں میں انہوں نے حضور اکرمؐ پر الزام لگایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو خود اپنی عبادت کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ یہ انہوں نے اس لیے کہا کہ انسان جیسا خود ہوتا ہے دوسرے کو بھی ویسا ہی سمجھتا ہے۔ وہ خود اللہ سبحانہ کو چھوڑ کر حضرت عیسیٰ کی عبادت کرنے لگے تھے، اس لیے انہوں نے حضور اکرمؐ پر بھی بے دھڑک یہ الزام لگا دیا۔ حضور اکرمؐ نے جواباً فرمایا: ''اللہ کی پناہ کہ میں خود غیر اللہ کی عبادت کروں یا کسی کو غیر اللہ کی عبادت کے لیے کہوں! اللہ سبحانہ نے مجھے اس لیے مبعوث نہیں کیا۔ اس موقعہ پر آیۃ مبارکہ درج ذیل نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ (سورہ آل عمران: ۷۹)

''جس شخص کو اللہ سبحانہ نے کتاب، نبوت اور شریعت سے نوازا ہو اس کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ لوگوں کو اپنی عبادت کے لیے کہے اور اللہ سبحانہ کو نظر انداز کر دے۔ بلکہ اس کا کام تو یہ ہے کہ لوگوں سے کہے کہ کتاب میں جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کی روشنی میں اللہ سبحانہ کی عبادت اور بندگی کرو''

علی ہذا القیاس ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ (سورہ ال عمران: ۸۰)

''اور نہ (نبی یا رسول) کا یہ کام ہے کہ وہ لوگوں کو حکم دے کہ فرشتوں یا انبیاء کو اپنا خدا بنالو! کیا وہ تمہیں مسلمان ہو جانے کے بعد دوبارہ کفر والحاد کی دعوت دے گا؟''

۱۳۔ مسلمانوں میں تفرقہ اور اختلاف ڈالنے کی چالیں

مدینہ منورہ کے دو متحارب قبیلوں اوس وخزرج کے درمیان اسلام کی برکت سے صلح وآشتی یہودیوں کی نظر میں بری طرح کھٹکتی تھی۔ ہر وقت وہ اسی کوشش میں رہتے تھے کہ کس طرح ان میں پھر عداوت کی آگ بھڑک اٹھے۔ آخر کار شاس' نامی یہودی نے اس مذموم مقصد کی تکمیل کے لیے ایک یہودی کو مقرر کیا کہ وہ اوس وحزرج کے مختلف افراد کے پاس جائے اور ان کو زمانہ جاہلیت کی دشمنی، خون ریزی اور ایک دوسرے کے خلاف ہجو گوئی یاد دلائے۔

مدینہ کے عرب اس قدر سیدھے سادھے تھے کہ انہوں نے بالکل نہ سوچا کہ حضور اکرمؐ کی مساعی جمیلہ سے ان کے درمیان اتفاق و اتحاد برقرار ہو جانے کے بعد یہ یہودی نئے سرے سے 'بعاث' کی جنگوں اور ہجو گوئیوں کا تذکرہ کیوں کر رہا ہے؟ وہ اس کی باتیں بڑی دل چسپی سے سننے لگے۔ آخر ایک دن جبکہ مسجد نبوی کے باہر قبیلہ اوس وخزرج کے چند جوشیلے جوان جمع تھے، یہی یہودی ایک بلند جگہ پر کھڑا ہو گیا، ان کے بزرگوں کے درمیان ہونے والے لڑائیوں اور جارحیتوں کا بڑے جوش وخروش سے ذکر کرنے لگا اور ان کو غیرت دلانے کے لیے بدلہ چکانے کے اشارے بھی کرتا رہا۔ اس پر نوجوانوں کا جوشیلا خون کھولنے لگا۔ ان کے ہاتھ تلواروں کے قبضوں تک پہنچ گئے۔ قریب تھا کہ مدینہ کی گلیاں پھر عربوں کے خون سے رنگین ہو جاتیں کہ حضور اکرمؐ کو خبر ہو گئی۔ آپؐ فوراً جائے فتنہ پر تشریف لائے اور بزرگانہ متانت سے فرمانے لگے:

الله الله، ابدعوى الجاهيلة و انا بين اظهر كم بعد ان هدا كم للاسلام، و اكرمكم به و قطع به عنكم امر الجاهلية واستنقذ كم من الكفرو الف بين قلوبكم "[1]

''(اے جوانو!) اللہ کا نام لو! (ابھی سے) جاہلیت کی طرف پلٹ رہے ہو! میں تمہارے درمیان موجود ہوں (جس کے وسیلے سے) اللہ سبحانہ نے تمہیں اسلام جیسی نعمت سے نوازا، اس کی وجہ سے تمہیں عزت

---

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ا ص ۵۵۶

ملی، جاہلیت کے فتنے فرو ہوئے اور تم کفر کی غلاظت سے پاک صاف ہوئے۔ اسلام ہی کی وجہ سے تم میں محبت و الفت پیدا ہوئی''

اوس وخزرج کے جوانوں پر حضور اکرمؐ کے پر خلوص کلمات کا ایسا اثر ہوا کہ ان کے شیطانی جذبات ختم ہو گئے۔ وہ فوراً ہوش میں آ گئے، یہودی کی چال کو سمجھ گئے۔ شدت ندامت سے رونے لگے اور ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے اخوت و برادری کی تجدید کرنے لگے۔ اس واقعہ کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ۝۱۰۰ (سورہ آل عمران: ۱۰۰)

''(اے مسلمانو!) اگر اہل کتاب میں سے کسی کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف لے جائے گا''

۱۴۔ قرآن مجید میں ایماندار یہودیوں کی مدح

حضور اکرمؐ کی محنت شاقہ کے نتیجے میں عبداللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید اور اسید بن عبید جیسے چند یہودی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے جس سے یہودی سرغنے بڑے سیخ پا ہو گئے اور ان کو ''بدقماش'' کہنے لگے۔ سورہ آل عمران میں قرآن مجید نے انہی یہودیوں کی اس طرح مدح فرمائی ہے:

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ۝۱۱۳

(سورہ آل عمران: ۱۱۳)

''اہل کتاب میں سے وہ لوگ جوق جوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، راتوں کو اللہ سبحانہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے ہیں، یہ دوسروں کی طرح نہیں ہیں''

۱۵۔ یہودیوں کا مسلمانوں کو خیرات سے منع کرنا

اسلام کی توسیع وترقی عقلی ومنطقی برتری کے علاوہ مسلمانوں کی مالی اور جانی قربانی میں بھی مضمر تھی۔ مسلمانوں کا یہ جذبہ قربانی دیکھ کر یہودی بوکھلا گئے اور بعض یہودی انصار کے پاس آئے۔ ان کا سردار حی ابن اخطب تھے۔ یہ لوگ اُن سے کہنے لگے: ''اتنا مال خرچ نہ کیا کرو۔ ہمیں ڈر ہے کہ (تم راہِ خدا میں) اخراجات کرتے کرتے خود محتاج ہو جاؤ گے''

سورہ النساء میں اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ (سورہ نسا: آیت ۳۷)

''جولوگ اپنا مال اللہ سبحانہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے سے روکتے ہیں'' مزید برآں جو کچھ اللہ سبحانہ نے انہیں عطا کر رکھا ہے اُسے چھپاتے ہیں، (وہ کافر ہیں) بے شک ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے''

اسی آیۃ مجیدہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل کتاب نہ صرف راہ خدا میں مال خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے تھے۔ بلکہ تورات میں موجود دینی حقائق کو بھی چھپائے ہوئے تھے۔

۱۶۔ بعض یہودی سرغنوں کا کہنا تھا کہ ''بت پرستی'' اسلام سے بہتر ہے

بعض یہودی سرغنہ جو مدینہ سے خیبر منتقل ہو گئے تھے قریش مکہ سے ملے اور انہیں اس بات پر اکسایا کہ حضور اکرمؐ کے خلاف عربوں کے بڑے بڑے قبیلوں کو متحد کریں۔ یہ انہی یہودیوں کی کارستانی تھی جس کے نتیجہ میں ۶ ھ میں جنگ احزاب پیش آئی۔ اس سلسلے میں یہودی علماء کا مکہ بدستور آنا جانا رہا۔ مشرکین مکہ نے بڑے خلوص سے یہودی علماء سے دریافت کیا کہ تم اہل کتاب ہو اور انبیاء ماسلف کے نظریات سے ہم سے زیادہ آگاہ ہو۔ بھلا سچ سچ بتاؤ کہ ہمارا دین (بت پرستی) اچھا ہے یا محمدؐ کا دین؟

یہودی علماء نے سنجیدگی سے بڑے اعتماد سے کہا کہ تمہارا دین اس (حضرت محمد مصطفیؐ) کے دین سے کہیں بہتر ہے اور تم خود اس سے اور اس کے ساتھیوں سے کہیں زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔

خود یہودی مورخین جب تاریخ کے اس سیاہ ورق پر پہنچتے ہیں تو وہ بھی اپنے بد دیانت اسلاف کی توجیہہ نہیں کر پاتے۔ ایک یہودی مورخ ڈاکٹر اسرائیل عرب یہودیوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

''یہودی علمانے یہ بڑی گھٹیا حرکت کی تھی۔ اگر مشرکین مکہ ان کی بات نہ بھی مانتے تب بھی ان کا ایسا کہنا بالکل غلط تھا۔ یہ واضح طور پر ناجائز بات ہے کہ یہودی بت پرستوں کی پناہ حاصل کریں کیونکہ یہ تعلیماتِ تورات کے خلاف ہے''[1]

قرآن مجید بھی اس واقعہ کی نشاندہی فرما رہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ

[1] حیاتِ حضرت محمدؐ ص ۲۹۷ از ڈاکٹر اسرائیل

وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هٰؤُلَاءِ أَهْدٰى مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا سَبِيلًا ﴿۵۱﴾

(سورہ نسا: ۵۱)

''(اے حبیبؐ) دیکھو تو! جن لوگوں کو کتاب کا تھوڑا سا علم دیا گیا ہے وہ بت پرستوں کی صحت کی تصدیق کرتے ہوئے کہہ رہیں ہیں کہ وہ مسلمانوں سے زیادہ حق پر ہیں''

ایک اور آیہ مبارکہ حضور اکرمؐ کے بارے میں یہودیوں کے حسد، کینہ اور عداوت کو اس طرح بیان کرتی ہے۔

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَا اٰلَ إِبْرٰهِيمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿۵۴﴾ (سورہ نسا: آیت ۵۴)

''اللہ سبحانہ نے اپنے فضل و کرم خاص سے جو کچھ ان کو عطا کیا ہے، لوگ اس پر حسد کرتے ہیں (اُن کے حسد و بغض کے علی الرغم ہم نے آل ابراہیمؑ (محمدؐ و آل محمدؐ) کو کتاب شریعت اور مملکت عظیم عطا کی ہے''

۱۷۔ یہودی اور عیسائیوں کی طرف سے خدا کی اولاد ہونے کا دعویٰ

حضور اکرمؐ بعض یہودی اکابرین سے ملے۔ انہیں دین مقدس اسلام کی دعوت دی اور مسلمان نہ ہونے کی صورت میں اللہ سبحانہ کے عذاب سے آگاہ فرمایا۔ انہوں نے اپنی دیرینہ نخوت و خود پسندی کی بنیاد پر جواباً کہا کہ آپ ہمیں کیا ڈرا رہے ہیں۔ ہم تو خدا کی اولاد ہیں۔ ان کے دیکھا دیکھی عیسائیوں نے بھی یہی مشہور کر دیا کہ وہ بھی خدا کی اولاد ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ أَبْنٰؤُا اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهٗ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿۱۸﴾

(سورہ مائدہ: ۱۸)

''یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا کہ ہم خدا کی اولاد اور اس کے پسندیدہ ہیں (اے حبیبؐ) ان سے کہہ دیجیے (اگر ایسا ہی ہے تو) پھر تمہیں اپنی نافرمانی کرنے پر سزا کیوں دیتا ہے؟ (چنانچہ تم اس کی اولاد نہیں ہو) تم بھی دوسرے انسانوں کی طرح اس کی مخلوق ہو۔ اور وہ اپنی مشیت کے مطابق کسی کو سزا دیتا ہے اور کسی کو انعام سے نوازتا ہے۔ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، وہی ان پر حاکم ہے اور

سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے''

۱۸۔ یہودیوں کا دعویٰ کہ حضرت موسیٰ کے بعد کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے انصارِ مدینہ کے بعض اکابرین مثلاً جناب معاذ بن جبل، سعد بن معاذ اور عقبہ بن وہب حضورِ اکرمؐ کی مدینہ ہجرت سے پہلے یہودیوں سے میل جول رکھتے تھے۔ ہجرت کے بعد ایک دن حضرت رسولِ مقبول نے یہودی علماء کو دعوت دی اور دین مقدس اسلام کو ان کے سامنے پیش فرمایا۔ اتفاق سے مذکورہ بالا تینوں انصاری مسلمان بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ان یہودی علماء سے کہا کہ حضورؐ کی بعثت سے قبل آپ حضرات حضورؐ کی نبوت کی نشانیاں ہمیں بتایا کرتے تھے۔ اب جب حضورؐ نفسِ نفیس یہاں تشریف لے آئے ہیں تو آپ کے تیور بدل گئے ہیں۔ میں آپ کو اللہ سبحانہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضورؐ پیغمبرِ خدا ہیں۔ خدا خوفی سے کام لیں اور حضورؐ پر ایمان لے آئیں۔

یہ سن کر ان میں سے دو عالم یہودی بالکل مکر گئے اور بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد اللہ سبحانہ نے ہرگز نہ کوئی پیغمبر بھیجا ہے اور نہ ہی کوئی کتاب نازل کی ہے۔ ان کی تردید کرتی ہوئی یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی:

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ عَلٰى فَتۡرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ‌ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۹﴾ (سورہ: مائدہ۱۹)

''اے اہل کتاب، ہمارا یہ رسولؐ تمہارے پاس آیا ہے تاکہ تمہیں ہدایت کرے اور تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس تو نوید و وعید سنانے کوئی پہنچا ہی نہیں۔ یہی رسولؐ نوید و وعید سنانے آ گیا ہے۔ بے شک اللہ سبحانہ ہر چیز پر قادر ہے''

۱۹۔ شادی شدہ زانی یہودی کی سزا

ایک یہودی مرد اور عورت نے بدکاری کی۔ دونوں ہی شادی شدہ تھے۔ ان کی سزا کا مسئلہ درپیش ہوا۔ یہودی علماء ایک یہودی مدرسہ میں اکٹھے ہوئے اور فیصلہ کیا کہ ان کی سزا کے بارے میں حضرت محمدؐ سے پوچھا جائے۔ اگر وہ سنگساری کا حکم دیں تو سمجھ لیں کہ وہ اللہ سبحانہ کی طرف سے پیغمبرؐ ہیں۔ وہ سب مل کر حضورؐ کی خدمت میں آئے اور قضیہ پیش کیا۔ آپؐ ان سب کو لے کر واپس انہیں کے مدرسہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ اپنے علماء کو بلاؤ۔ سب نے بیک وقت کہا کہ جناب عبداللہ بن صوریا ہمارے سب سے بڑے عالم ہیں۔ آپؐ نے عبداللہ بن صوریا سے تخلیہ میں گفتگو فرمائی اور اسے خدا کی قسم دے کر فرمایا کہ تو جانتا ہے کہ تورات میں شادی شدہ زانی کی سزا سنگساری ہے۔ اس نے

اثبات میں جواب دیا، آپؐ کی نبوت کا قائل ہوا اور یہ اعتراف بھی کیا کہ سب یہودی علماء آپؐ کی نبوت کا یقین رکھتے ہیں مگر حسد کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ بہر حال آپؐ نے حکم دیا کہ اُس مرد اور عورت کو مسجد کے سامنے سنگسار کیا جائے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ یہودی کا سب سے بڑا عالم خود حضور اکرمؐ کی نبوت کا اقرار کرتا ہے مگر بعد میں منکر ہو جاتا ہے۔ بہر حال سورۂ مائدہ کی آیت ۴۱ حضورؐ کے اطمینان کے لیے نازل ہوتی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ لَا يَحْزُنكَ ٱلَّذِينَ يُسَٰرِعُونَ فِى ٱلْكُفْرِ مِنَ ٱلَّذِينَ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِأَفْوَٰهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِن قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ ٱلَّذِينَ هَادُوا۟ ۛ سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّٰعُونَ لِقَوْمٍ ءَاخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ مِنۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهِۦ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِن لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَٱحْذَرُوا۟ ۚ وَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ فِتْنَتَهُۥ فَلَن تَمْلِكَ لَهُۥ مِنَ ٱللَّهِ شَيْـًٔا ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ لَمْ يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا خِزْىٌ ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٤١﴾

(سورہ مائدہ: ۴۱)

''اے ہمارے رسولؐ! ان لوگوں سے جو زبان سے ایمان کا اعلان کرتے ہیں مگر ان کے دل بے ایمان ہیں اور کفر و الحاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، رنجیدہ خاطر مت ہو! اسی طرح یہودیوں کے رویہ سے بھی (رنجیدہ خاطر مت ہو) جو آپؐ کی باتوں کو اس لیے غور سے سنتے ہیں کہ کوئی کمزوری پکڑیں۔ وہ دراصل ان دشمنوں کے جاسوس ہیں جو آپؐ کے پاس نہیں آئے۔ وہ اللہ سبحانہ کے احکامات میں تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں اور (ان جاسوسوں) سے کہتے ہیں کہ اگر (حضرت محمدؐ) ہمارے مطابق فیصلہ دے دیں تو مان جانا ورنہ نہ ماننا۔ (اے حبیبؐ) آپؐ اس کو کیسے بچا سکتے ہیں جو اللہ سبحانہ کی سزا کا مستحق ٹھہر گیا ہو۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ اللہ سبحانہ ان کے دلوں کو پاک نہیں کرنا چاہتا۔ دنیا میں ان کے لیے ذلت و رسوائی اور آخرت میں شدید عذاب ہے''

اور اگلی ہی آیہ میں ارشاد ہوتا ہے:

سَمَّٰعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّٰلُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَإِن جَآءُوكَ فَٱحْكُم بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۖ وَإِن تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَن يَضُرُّوكَ شَيْـًٔا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ فَٱحْكُم

بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ (سورہ مائدہ: ۴۲)

''وہ آپ کی باتیں بڑے غور سے سنتے ہیں تاکہ جھٹلانے کا کوئی نکتہ تلاش کریں۔ مالِ حرام کھاتے ہیں۔ اگر آپؐ کی بارگاہ میں آئیں تو فیصلہ سنادیں یا (اگر مصلحت ہو تو ان کو) ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اگر آپؐ ان کو نظر انداز کردیں گے تو وہ آپ کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی حیثیت میں نہیں ہیں۔ اگر فیصلہ سنائیں تو انصاف کریں کیونکہ اللہ سبحانہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے''

ابن ہشام اپنی سیرت میں عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت نقل کرتا ہے کہ جب یہودیوں نے حضور اکرمؐ کو قاضی بنایا اور فیصلہ چاہا تو آپؐ نے تورات منگوائی اور انہی کے ایک عالم سے فرمایا کہ پڑھے۔ اس عالم نے پڑھنا شروع کیا مگر جس آیت میں سنگساری کا حکم تھا اس نے کمال چابکدستی سے اس پر اپنی انگلی رکھ دی اور آگے سے پڑھنا شروع کردیا۔ اس موقع پر عبداللہ بن سلامؓ جو یہودیت سے اسلام کی طرف آچکے تھے، پکار اُٹھے ''یا رسول اللہؐ اس نے سنگساری والی آیت پر انگلی رکھی ہوئی ہے اور جان بوجھ کر پڑھنے سے گریز کررہا ہے''۔ آپؐ نے باآواز بلند ارشاد فرمایا: ''یہودیو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ حکم خدا سے گریز کررہے ہو''

ایک عالم بولا کہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب ہم میں سے کوئی بااثر آدمی اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا اثر و رسوخ سزا دلوانے میں مانع ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کوئی عام آدمی یہ جرم کرتا ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے۔ آخر اس تفریق کے خلاف احتجاج ہوا اور یوں یہ سزا بالکل ترک ہی کردی گئی اور اس کی جگہ مجرم کو چند کوڑے یا منہ کالا کرنے کی سزا دی جانے لگی۔ [1]

۲۰۔ یہودیوں کا حضرت عیسیٰؑ کی نبوت سے انکار

عیسائیوں کے ساتھ یہودیوں کی دشمنی بہت پرانی ہے۔ آج اگر یہ دونوں متحد نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام کی توسیع و ترقی کو روکنے اور اپنی مذہبی کیفیت کو بچائے رکھنے کے لیے انہوں نے اس شیطانی منفی سیاست کا روپ دھار لیا ہے۔ حضور اکرمؐ کے زمانے میں بھی یہودی عیسائیوں کے سخت خلاف تھے، حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت ہی کے منکر تھے۔

ایک دن چند یہودی بزرگ حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھنے لگے کہ آپؐ کس کس نبیؑ پر ایمان رکھتے ہیں۔ آپؐ نے ان کے جواب کے لیے یہ آیۂ مجیدہ تلاوت فرمائی:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ
وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا

---

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ا ص ۵۶۶

نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝۸۴ (آل عمران: ۸۴)

''ہم اللہ سبحانہ، پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ اللہ سبحانہ کی طرف سے ہم پر، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوب اور اسباطؑ پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ مزید برآں موسیٰ اور عیسیٰؑ اور دیگر نبیوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم (نبی ہونے کی حیثیت میں) ان میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ہم تو اللہ سبحانہ کے مطیع محض ہیں''

حضرت عیسیٰؑ کا نام سن کر یہودی تو سیخ پا ہو گئے اور کہنے لگے: ''ہم عیسیٰؑ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ہی اس پر ایمان لائیں گے جو عیسیٰؑ پر ایمان رکھتا ہو''۔ اس موقع پر آیت نازل ہوئی:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ۝۵۹ (سورہ مائدہ: ۵۹)

''اے اہل کتاب ہم سے تم صرف اس لیے ناراض ہو رہے ہو کہ ہم اللہ سبحانہ اور اس کی طرف سے جو ہم پر یا ہم سے پہلے انبیاء پر نازل ہوا ہے، ایمان رکھتے ہیں۔ (بات دراصل یہ ہے کہ) تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں''

۲۱۔ یہودی ''توحید'' سے انحراف کر گئے

حضور اکرمؐ کی عداوت میں یہودیوں کی ہٹ دھرمی اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ اپنے مذہب کے بنیادی مسئلہ کو بھی بھول گئے اور حضورؐ کے نعرہ ''لا الہ الا اللہ'' کے مقابلے میں شریک خدا کے قائل ہو گئے۔ وہ علی الاعلان کہنے لگے کہ 'خدا' ایک نہیں ہے۔ بلکہ اس کا شریک بھی ہے۔

وَبَيْنَكُمْ ۫ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۝۱۹ (سورہ انعام: ۱۹)

''(اے حبیبؐ) فرما دیجیے کہ مجھ پر یہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ میں تمہیں اور اس شخص کو جس تک یہ قرآن مجید پہنچے یہ وعید سنا دوں کہ کیا تم یہ کہتے ہو کہ اللہ سبحانہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ (اے حبیبؐ) کہہ دیجیے کہ میں ہرگز یہ نہیں کہتا بلکہ گواہی دیتا ہوں کہ خدا بس ایک ہی ہے اور میں اس کا شریک ماننے والوں سے بیزار ہوں''

۲۲۔وقت قیامت کا تعین

اہل کتاب سے بعض لوگ حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر آپؐ نبی ہیں تو قیامت کے آنے کا تعین کیجیے!
قرآن مجید نے اس کا اس طرح جواب دیا ہے:

بَغۡتَةً ؕ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ كَاَنَّكَ حَفِىٌّ عَنۡهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۸۷ (سورہ اعراف: ۱۸۷)

''(اے حبیبؐ) آپؐ سے قیامت کے تعین کا سوال کرتے ہیں گویا کہ آپؐ کو اس کا علم ہے۔ انہیں کہہ دیجیے کہ اللہ سبحانہ کو اس کا علم ہے، اگرچہ اکثر لوگ بے خبر ہیں''

۲۳۔عزیرؑ خدا کے بیٹے ہیں

آج کے یہودیوں کے برعکس صدرِ اسلام کے یہودی حضرت عزیرؑ کو یقین کی حد تک خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ یہ وہی عزیرؑ ہیں جنہوں نے ''بخت نصر'' کی قید سے یہودیوں کے آزاد ہونے کے بعد جبکہ تورات کے تمام نسخے ناپید ہو گئے تھے۔ زبانی تورات پڑھی اور دوسروں نے اس کو سپردِ قلم کیا۔ اس اعتبار سے یہودی حضرت عزیرؑ کا خاص احترام کرتے تھے۔

یہودیوں کی ایک جماعت حضرت رسول اکرمؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور کہا کہ ہم آپؐ پر ایمان کیوں کر لائیں، آپؐ نے ہمارے قبلہ کو چھوڑ دیا اور آپؐ حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ اس موقع پر سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ عُزَيۡرُ ۨابۡنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ ؕ ذٰ لِكَ قَوۡلُهُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ ۚ يُضَاهِـُٔوۡنَ قَوۡلَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ۝۳۰ (سورہ توبہ: ۳۰)

''یہودیوں نے کہا عزیرؑ خدا کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے۔ یہ باتیں وہ سابقہ کافروں کی پیروی میں کرتے ہیں۔ ان کو اللہ غارت کرے۔ یہ کیسا کفر کرتے ہیں''

یہاں تک ہم نے قارئین کرام کی خدمت میں دورِ رسالت مآبؐ کے ابتدائی سالوں میں یہودیوں کے نظریات، گفت وشنید، ہٹ دھرمی اور معاہدہ خلافی وغیرہ کا ایک رُخ پیش کیا اور کسی حد تک ہم یہ بیان کر پائے کہ اس زمانہ میں کس طرح یہ لوگ اسلام کی ترویج میں سد راہ ہوئے اور حضرت رسول اکرمؐ کی سرگرمیوں میں کس کس طرح سے رکاوٹیں ڈالیں۔

اس کے بعد ہم یہ بیان کریں گے کہ حضور اکرمؐ نے سرزمین حجاز کو ان کے ناپاک وجود سے کس طرح پاک فرمایا۔ اس سلسلہ میں ان

کے ساتھ حضرت رسولِ اکرمؐ کا مسلح تصادم پیش کیا جائے گا۔

ا۔ مدینہ منورہ میں یہودیوں سے مسلح پیکار

ہجرت کے پہلے دو سال کے دوران اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یثرب کے یہودیوں کی سرگرمیاں، بحث مباحثہ، اعتراض و احتجاج، مسلمانوں کو اسلام کی طرف سے شکوک وشبہات میں ڈالنا اور کبھی کبھی استہزاء اور توہین واہانت کرنے تک ہی محدود رہیں۔ حضورِ اکرمؐ نے اس صورت حال کا مقابلہ نہایت صبر وتحمل سے فرمایا۔ مگر جس دن سے یہودیوں نے سرد جنگ سے آگے قدم بڑھایا اور انہوں نے دست درازی، مسلح مزاحمت، مسلمانوں کی خون ریزی، خود حضور اکرمؐ کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کی سعی اور حجاز میں مسلمانوں کے دیگر دشمنوں سے ساز باز شروع کی تو حضور اکرمؐ نے بھی اپنی روش پر نظر ثانی فرمائی اور ان کے ناپاک وجود سے سرزمین مدینہ منورہ کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

یثرب اور اس کے گرد ونواح میں یہودیوں کے تین نامور اور قوی قبیلے آباد تھے جو اس زمانہ کی اقتصادیات پر بھی حاوی تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

ا۔ بنی قینقاع ۲۔ بنی النضیر ۳۔ بنی قریظہ

بنی قینقاع کے افراد نے یثرب کے بھرے بازار میں دن دھاڑے ایک مسلمان کو مل کر صرف اس لیے تلوار کے گھاٹ اتار دیا کہ اس نے ایک مظلوم عورت کی طرف داری کی تھی۔ بنی النضیر کے افراد نے خود حضور اکرمؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور آپؐ کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کے لیے بالکل تیار تھے۔

بنی قریظہ نے حضور اکرمؐ کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مشرکین مکہ اور خیبر کے یہودیوں کا ساتھ دیا تھا۔ گویا مسلمانوں کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کے بعد اس کو توڑتے ہوئے دیدہ دلیری سے مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ مل گئے تھے۔

یہودیوں کی ان سازشی سرگرمیوں کی وجہ سے حضور اکرمؐ نے پہلے دو قبیلوں کو جلاوطن کردیا۔ جبکہ تیسرے قبیلہ کے، خود ان کے اپنے آدمیوں کی تجویز کردہ سزا کے مطابق مردوں کو قتل کروادیا تھا اور ان کے مال واسباب کو مسلمانوں میں تقسیم فرمادیا تھا۔ ان تینوں قبیلوں کے ساتھ حضور اکرمؐ کے طرزِ عمل کی قرآن مجید کی روشنی میں تفصیل اس طرح ہے:

(الف) بنی قینقاع کی جلاوطنی

اس سے پہلے کہ یہودیوں کے ساتھ حضور اکرمؐ کے برتاؤ پر بات کی جائے، بہتر یہ ہے کہ ہم قارئین کرام کے سامنے اس معاہدہ کا متن پیش کریں جو ہجرت کے شروع ہی میں حضور اکرمؐ اور یثرب کے ان تین یہودی قبیلوں کے درمیان طے پا گیا تھا۔

جب حضورِ اکرمؐ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے آپؐ نے ان یہودی قبیلوں کے اکابرین کو بلایا اور ان سے

مندرجہ ذیل شرائط پر معاہدہ ہوا:

i۔ یہودی قبیلے کسی صورت میں بھی حضور اکرمؐ اور ان کے پیروکاروں کے خلاف اقدام نہیں کریں گے۔

ii۔ مسلمان یہودیوں کے ہاتھ اور زبان سے ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

iii۔ یہودی اپنا اسلحہ اور سواریاں مسلمانوں کے دشمنوں کو نہیں دیں گے۔

iv۔ اگر یہودی مذکورہ بالا تین شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو حضوؐر اکرمؐ ان کے مردوں کو قتل کرنے اور ان کے مال و اسباب پر قبضہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

اس معاہدے پر بنی قینقاع کی طرف سے ''مخریق''، بنی النضیر کی طرف سے ''حیی ابن اخطب'' اور بنی قریظہ کی طرف سے ''کعب ابن اسد'' نے دستخط کیے۔

اس معاہدہ کی رو سے حضور اکرمؐ نے یہودیوں کے پہلے دو قبیلوں کے جرم پر جو سزا انہیں دی وہ ان کی اپنی تعیین شدہ سزا سے بہت کم تھی، جبکہ تیسرے قبیلے کی سزا اس معاہدہ کے عین مطابق تھی۔

جنگ بدر میں جب مسلمانوں کو اللہ سبحانہ نے شہرہ آفاق فتح سے سرفراز فرمایا اور مشرکین مکہ کو عبرتناک شکست ہوئی تو مدینہ کے یہودی بہت خوفزدہ ہوئے۔ ردِعمل کے طور پر بنی قینقاع کے افراد نے مسلمانوں پر توہین آمیز آوازے کسنے شروع کر دیئے، حتیٰ کہ حضور اکرمؐ کے خلاف ہتک آمیز گفتگو کرنے لگے۔ حضرت رسول اکرمؐ نے اتمام حجت اور معاہدہ یاد دلانے کے طور پر ان کے مجمع میں تقریر فرمائی جس میں آپؐ نے انہیں قریش کے ذلت آمیز انجام سے عبرت دلائی، ان کو ایسے انجام سے ڈرایا اور فرمایا کہ اپنے علماء سے پوچھ لیں کہ کیا آنحضرتؐ کی نبوت کی نشانیاں اور ذکر خود تورات میں ہے یا نہیں۔ اس موقع پر آپؐ پر وحی نازل ہوئی اور درج ذیل آیات مبارکہ کی آنحضرتؐ نے تلاوت فرمائی۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (سورہ آل عمران: ۱۲)

''(اے حبیبؐ) کافروں سے کہہ دیجیے کہ عنقریب وہ شکست کھا جائیں گے اور جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے''

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ (سورہ آل عمران: ۱۳)

''میدانِ کارزار میں دو گروہ جو مصروف پیکار ہوئے تمہارے لیے عبرت کا مقام ہیں۔ ایک جماعت اللہ سبحانہ،

کی خاطر جبکہ کافر کفر والحاد کے لیے لڑ رہے تھے۔ کافر اپنی کھلی آنکھوں سے مسلمانوں کو (تعداد میں) دوگناہ سمجھ رہے تھے۔ (حالانکہ ایسا نہیں تھا بلکہ) بے شک اللہ سبحانہ، اس کی مدد کرتا ہے جو اس کے قانون مشیت پر پورا اترتا ہے۔ یہ واقعہ صاحبانِ بصیرت کے لیے درس عبرت رکھتا ہے''

انہوں نے حضرت رسول اکرمؐ کی نصیحتوں کا کچھ اثر نہ لیا، بلکہ اپنی فوجی طاقت پر گھمنڈ کرتے ہوئے کہنے لگے: ''اگر آپؐ نے مشرکین مکہ پر فتح پالی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپؐ ہم پر بھی فتح یاب رہیں گے کیونکہ ہم قریش کے مقابلے میں فنون حرب سے زیادہ واقف ہیں''۔ حضور اکرمؐ نے ان کی ہٹ دھرمی کا کچھ جواب نہ دیا اور نہایت صبر وتحمل سے اتمام حجت کرنے کے بعد واپس تشریف لے آئے۔

اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد ایک عرب خاتون بنی قینقاع کے ایک سنار کی دکان پر کچھ خرید وفروخت کے لیے گئی۔ یہ خاتون پردہ دار تھی اور دکاندار کے اصرار کے باوجود اس نے اپنا نقاب نہ اٹھایا۔ اس یہودی نے چپکے سے خاتون کی چادر کو پیچھے سے گرہ دے دی۔ جب خاتون اپنا کام ختم کر کے اٹھی تو گرہ کی وجہ سے اس کی چادر چہرے اور سر سے کھسک گئی۔ اس پر دکاندار اور دیگر یہودی قہقہے لگانے لگے۔ اس طرح بنی قینقاع کے جوانوں نے ایک مسلمان خاتون کی پردہ داری کا سر بازار مذاق اڑایا۔ قریب ہی ایک مسلمان گزر رہا تھا۔ جب اس نے مسلمان خاتون کے خلاف کھلی غنڈہ گردی دیکھی تو اس کی غیرت بھڑک اٹھی۔ چنانچہ اس نے اس گستاخ سنار کا قتل کر دیا۔ اس پر تمام یہودی اس غیرت مند مسلمان پر ٹوٹ پڑے اور اس کو شہید کر دیا۔

خاتون کا دفاع کرتے ہوئے اس مسلمان کو قتل کر کے یہودی مسلمانوں سے خائف ہو گئے۔ انہوں نے دکانیں بند کر دیں بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور قلعہ بند ہو گئے۔ حضرت رسول اکرمؐ کے حکم سے مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور ہر قسم کی رسد یا آمد ورفت منقطع کر دی گئی۔ مسلمانوں میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جن کا بنی قینقاع کے ساتھ زمانۂ جاہلیت میں ''معاہدہ ولا'' ہو چکا تھا۔ ان میں ''عبادہ بن صامتؓ'' اور بد نام زمانہ منافق ''عبداللہ ابی'' شامل ہیں۔ اس معاہدہ کی رو سے قانون جاہلیت کے مطابق معاہدہ کرنے والے تمام فریقوں پر ایک دوسرے کا دفاع ضروری تھا خواہ وہ حق پر ہوں یا باطل پر۔

عبادہ بن صامتؓ چونکہ سچے مسلمان تھے اس لیے اسلام کے خلاف زمانۂ جاہلیت کے اس معاہدہ کو غلط سمجھتے تھے چنانچہ وہ بارگاہ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوئے اور اس معاہدہ کو کالعدم قرار دیتے ہوئے یہودیوں کی نصرت وحمایت سے دست کشی اختیار کی۔ مگر ''عبداللہ بن ابی'' جو دراصل منافقوں کا سرغنہ تھا، اسی معاہدہ کے بل بوتے پر حضور اکرمؐ سے الجھنے لگا۔ ابن ہشام اپنی کتاب ''سیرت ابن ہشام'' میں اس کی جسارت کو یوں نقل کرتے ہیں:

''اے محمدؐ (العیاذ باللہ کہ وہ حضور کو نام سے پکارتا تھا) بنی قینقاع میرے ہم معاہدہ ہیں۔ آپؐ ان سے رعایت کے ساتھ پیش آئیں''۔ اس نے یہ جملہ تین بار کہا۔ تینوں مرتبہ حضورؐ نے خاموشی اختیار فرمائی۔ آخر وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے حضورؐ کی زرہ مبارک کو پکڑ لیا۔ حضورؐ کے چہرہ مبارک سے غیظ وغضب کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ آپؐ نے ناراضی سے فرمایا: ''تیرا ستیاناز چھوڑ میری زرہ کو! مگر وہ ضدی کہنے لگا: ''نہیں خدا کی قسم، اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ میرے ساتھیوں سے نرمی نہیں برتیں گے۔ بنی قینقاع کے

آٹھ سو بہادروں نے میرے اچھے و برے دنوں میں میرا بھرپور ساتھ دیا ہے اور مستقبل میں بھی مجھے ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے، نہ معلوم مجھے کیسے حالات درپیش ہوں [1]"

چونکہ "عبد اللہ بن ابی" خزرجی مسلمانوں کے اکابرین میں سے تھا، لہٰذا اس کی بات کو نظر انداز کرنا اسلام کے مستقبل کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اس کی بات بادل ناخواستہ قبول کرتے ہوئے، "بنی قینقاع" کے لیے نرم ترین سزا تجویز فرمائی۔ فیصلہ ہوا کہ وہ تمام اسلحہ مسلمانوں کے حوالے کر کے مدینہ منورہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ وہ مدینہ سے نکل کر پہلے "وادی القریٰ" گئے اور وہاں سے شام کے علاقے "اذرعات" منتقل ہو گئے۔

قرآن مجید نے اس منافق کے رویہ کی مذمت کی ہے، مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے راہ و رسم رکھنے سے منع کیا ہے اور اس شخص کو یہودیوں اور عیسائیوں میں شمار کیا ہے جو نصاریٰ و یہود جیسے کافروں پر بھروسہ کرے۔ قرآن مجید نے یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو ظاہراً اسلام کا دم بھرتے ہیں مگر مقام عمل میں وہ اس کے خلاف کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئیں وہ مسلمانوں کو دوستی و روابط کا درس دیتی ہیں اور ان لوگوں کو تنبیہ کرتی ہیں جو یہود و نصاریٰ سے بہتر تعلقات کے خواہاں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ (سورہ مائدہ: ۵۱)

"مسلمانو! یہود و نصاریٰ کو قابل اعتماد مت جانو! وہ صرف ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں۔ تم میں سے جو کوئی بھی ان کو سرپرست بنائے گا اس کا شمار نہیں ہوگا! اللہ سبحانہ ظالموں کی راہنمائی نہیں فرماتا"

اگلی آیہ مجیدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ (سورہ مائدہ: ۵۲)

"(اے حبیبؐ) کیا تم ان لوگوں کو دیکھتے ہو جن کے دلوں میں مرض ہے کہ یہ اُن (یہود و نصاریٰ) سے دوستی

---

[1] عبد اللہ بن ابی کے الفاظ یہ ہیں "ان امرء اخشی الدوائر" یعنی مجھے ان لوگوں سے مستقبل میں خطرہ ہے"۔ قرآن مجید نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے جیسا کہ ابھی آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

کرنے میں ایک دورے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہیں ہمیں ان کی مدد کی ضرورت نہ پڑ جائے؟ لیکن اللہ سبحانہ مسلمانوں کو فتح یا کسی دوسری صورت سے دوچار کر سکتا ہے۔ (تب) یہ لوگ اپنی سوچ پر نادم ہوں گے"

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ (سورہ مائدہ: ۵۳)

"مسلمان کہتے ہیں کیا یہ لوگ (منافقین) وہی ہیں جو قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ہم تمہارے (مسلمانوں کے) ساتھ ہیں؟ ان کے اعمال اکارت گئے اور وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو گئے"

(ب) بنی نضیر کی جلاوطنی

یہودیوں کا دوسرا قبیلہ جو ۳ھ ہجری کے شروع میں مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تھا۔ "بنی نضیر" ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے ابو برا ابن عامر بن مالک کی سربراہی میں چالیس مسلمان معلمانِ قرآن مجید کو تبلیغ اسلام کے لیے نجد کی طرف روانہ فرمایا۔ راستے میں ایک شخص "عامر بن طفیل" نے قبیلہ "بنی سلیم" کی مدد سے ان اڑتیس مبلغین کو قتل کر دیا اور صرف دو مبلغین بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس آ سکے۔

اڑتیس مبلغین اسلام کا قتل کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مسلمانوں کا خون کھولنے لگا۔ "عمرو بن امیہ" نامی ایک مسلمان نے "بنی عامر" قبیلے کے دو آدمیوں کو مبلغین کے بدلہ میں قتل کر ڈالا۔ اس نے یہ سمجھا کہ مبلغین کا قتل "بنی عامر" نے کیا ہے حالانکہ اس قبیلے کا صرف ایک آدمی ان کے قتل میں شریک تھا، باقی آدمی "بنی سلیم" قبیلے کے تھے۔ جب حضرت رسول اکرمؐ کو "عمرو بن امیہ" کے انتقام لینے کی خبر ملی تو آپؐ نے فوراً بنی عامر کے دونوں آدمیوں کا خون بہا ادا کرنے کا وعدہ فرمایا، اگرچہ وہ مشرک تھے۔

یہودی قبیلے "بنی نضیر" اور 'بنی عامر' کے درمیان ایک معاہدہ موجود تھا۔ حضرت رسول اکرمؐ اس معاہدہ کی رو سے 'بنی نضیر' کے علاقے میں تشریف لے گئے تاکہ وہ دو بیگناہ 'بنی عامر' کے مقتولوں کی دیت کی ادائیگی کے سلسلے میں ان سے مدد لیں۔ ظاہری طور پر 'بنی نضیر' نے حضورؐ کی بڑی آؤ بھگت کی اور آپؐ کی ہاں میں ہاں ملائی مگر خفیہ طور پر ان کو سرگوشیاں کرتے اور ادھر ادھر جاتے ہوئے، مشکوک طریقہ پر ایک دوسرے کو اشارے کرتے دیکھا گیا۔ حضور اکرمؐ ایک دیوار کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے دیوار کے اوپر کی طرف خطرناک قسم کی نقل و حرکت کا احساس فرمایا۔ چنانچہ آپؐ نے اس مشکوک صورت حال کے پیش نظر وہاں ٹھہرنا مناسب نہ جانا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ بعض حضرات کا خیال یہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہ نے بذریعہ وحی حضور اکرمؐ کو یہودیوں کی سازش کہ دیوار کے اوپر سے ایک بڑا پتھر گرا کر آپؐ کو شہید کر دیا جائے، سے آگاہ فرما دیا تھا۔ مدینہ پہنچ کر آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو تیار کیا اور ام مکتومؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا جانشین مقرر فرما کر خود بنی نضیر کے قلعہ کے محاصرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ ماہِ ربیع الاول ۴ھ کا ہے۔

بنی نضیر کے نام رئیس المنافقین ''عبداللہ ابن ابی'' کا پیغام

رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی نے بنی نضیر کو پیغام بھجوایا کہ مسلمانوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں بلکہ ڈٹے رہیں، اگر جنگ ہوئی تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُن سے آن ملے گا نیز ان لوگوں کو مدینہ چھوڑنا پڑا تو وہ بھی مع اپنے ساتھیوں کے اُن کے ساتھ مدینہ سے نکل جائے گا۔ اس پیغام کے بعد بنی نضیر عبداللہ بن ابی پر بھروسہ کر کے اس کا انتظار کرنے لگے کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ مگر کئی دن گزر گئے اور اس کی طرف سے ان کے حق میں کوئی اقدام نہ ہوا۔ آخر کار وہ مایوس ہو گئے اور انہوں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے صلح کی پیش کش کی۔ حضور اکرمؐ نے ان کی درخواست کو اس شرط پر منظور فرمایا کہ تمام اسلحہ مسلمانوں کے حوالے کر دیں اور اپنے اہل و عیال اور منقولہ ساز و سامان کے ساتھ مدینہ سے نکل جائیں۔

چنانچہ انہوں نے اسلحہ مسلمانوں کے سپرد کیا۔ اپنا تمام منقولہ ساز و سامان حتیٰ کہ گھر کے دروازے اور کھڑکیاں بھی ساتھ لے گئے۔ ان میں سے صرف دو آدمی مسلمان ہوئے باقی سب کے سب پہلے خیبر اور پھر شام کی طرف چلے گئے۔ بنی نضیر کے جو مشہور سردار مدینہ سے نکلے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ سلام بن ابی الحقیق

۲۔ کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق

۳۔ حیی بن اخطب

اس موقع پر سورہ حشر میں آیت نازل ہوئی:

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ (سورہ حشر: ۲)

''(اللہ سبحانہ) وہ ذات ہے جس نے اہل کتاب کے تمام کفار کو پہلی مرتبہ ہی ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ (اے مسلمانو!) تم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ نکل جائیں گے اور نہ ہی ان کو گمان تھا کہ ان کے مضبوط قطعے ان کو اللہ سبحانہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ بے شک اللہ سبحانہ نے ان کی بیخ کنی بالکل غیر متوقع طریقہ پر کی، ان پر خوف و ہراس چھا گیا، مسلمانوں کے ساتھ مل کر وہ خود ہی اپنے گھروں کو ملیا میٹ کر رہے تھے۔ بے شک یہ موقع عقل رکھنے والوں کے لیے باعث عبرت ہے''

ہم اس آیہ مجیدہ میں نکات تشریح طلب ذیل میں پیش کرتے ہیں:

i۔ بعض اوقات مسلمانوں کو اللہ سبحانہ کی طرف سے اس طرح سے مدد پہنچتی ہے کہ نہ مسلمان اس کی توقع رکھتے ہیں اور نہ دشمن، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

ما ظننتم ان یخرجوا وظنوا انهم ما نعتهم حصونهم من الله

(اے مسلمانو!) تم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ بنی نضیر اتنی آسانی سے اپنے قلعوں سے نکل جانے پر آمادہ ہو جائیں گے اور نہ ہی یہودیوں کے تصور میں یہ بات تھی کہ ان کے مضبوط قلعے مسلمانوں کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوں گے''

۲۔ اگر چہ یہودی ایک مستحکم اور مضبوط قلعہ میں پناہ گزین تھے مگر وہ اس غیبی لشکر سے بے خبر تھے جو باہر محاصرہ کیے ہوئے مسلمانوں کے علاوہ تھے اور جو ان کے دل و دماغ میں خوف و ہراس پیدا کر رہا تھا۔ اللہ سبحانہ نے اس غیبی لشکر کے ذریعہ حضور اکرمؐ کی متعدد بار مدد فرمائی جیسا کہ آیۂ مجیدہ کے اس جملہ سے واضح ہو رہا ہے:

فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ

''اللہ سبحانہ نے ان کی بیخ کنی بالکل غیر متعارف طریقے پر کی اور ان پر خوف و ہراس چھا گیا''

حضرت رسول اکرمؐ کی نبوت کی علامتوں میں ایک علامت یہ بھی ہے کہ نبوت کی ہیبت و جلالت سے دشمنوں اور مخالفوں پر غلبہ حاصل فرماتے تھے۔ حضورؐ خود ارشاد فرماتے ہیں:

وَ نُصِرْتُ بِاالرّعْبِ یعنی رعب و جلالت رسالت کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے''

۳۔ یہودیوں نے عرصۂ دراز میں کثیر مال و دولت جمع کی تھی اور محنت شاقہ سے قلعہ اور اس کے اندر گھر تعمیر کیے تھے۔ مگر اب وہ خود ہی اس قلعہ اور گھروں کو توڑ پھوڑ رہے تھے تا کہ ان کے دروازے اور کھڑکیاں اپنے ساتھ لے جاسکیں اور مسلمانوں کے ہاتھ صحیح سالم مکانات نہ آئیں۔ مزید برآں صلح سے پہلے مسلمان محاصرہ کیے ہوئے تھے اور یہودیوں پر غلبہ پانے کے لیے اس قلعہ کو تباہ و برباد کرنے کو تیار تھے۔ یہ تمام صورت حال بجائے خود مقام عبرت ہے کہ انسان دشمن کی مدد سے اپنے مکان کو ویران کر دے جیسا کہ فرماتا ہے:

يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِى الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِى الْاَبْصَارِ

''(یہودی) مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے اپنے مکانات توڑ پھوڑ رہے تھے۔ عقل مندوں کے لیے یہ موقع باعث عبرت ہے''

یہودیوں کی اس سزا سے دوسرے لوگوں کو صحیح سبق ملتا ہے۔ حضور اکرمؐ کی طرف سے ان کی صلح کی درخواست منظور کر لینے کے بعد جلا وطنی کی جو سزا تجویز کی گئی ہے وہ در اصل نقص عہد کی نرم سزا تھی حالانکہ ان کو اس سے کہیں سخت سزا دی جاسکتی تھی۔ سورۂ حشر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

عَذَابُ النَّارِ ۝۳ (سورہ حشر: ۳)

''اگر اللہ سبحانہ، یہودیوں کے لیے جلاوطنی کی سزا مقرر نہ فرماتا تو اس دنیا ہی میں ان کو (مسلمانوں کے ذریعے) زیادہ سخت سزا دی جاتی۔ آخرت میں تو ہر حال میں آگ کا عذاب ان کا منتظر ہے''

سورۂ حشر کی اگلی آیت میں اللہ سبحانہ یہودیوں کی اس سزا کی وجہ بیان فرماتا ہے۔ بنی نضیر نے حضور اکرمؐ سے دشمنی کی اور آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی سازش کی، حالانکہ حضورؐ ان کے مہمان کی حیثیت رکھتے تھے؟ ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴ (سورہ حشر: ۴)

''(بنی نضیر کو مدینہ سے جلاوطنی کی سزا) اس لیے دی گئی کہ انہوں نے اللہ سبحانہ اور اس کے پیامبر سے دشمنی کی، جو کوئی بھی اللہ سبحانہ سے دشمنی کرتا ہے وہ اسے شدید سزا دیتا ہے''

منافقوں پر بھروسہ عقل مندی نہیں

منافق بہت مکار تھے۔ انہوں نے اپنے چہروں پر ''اسلام'' کی نقاب ڈال رکھی تھی اور اس کے پردہ میں دوستی کا اظہار کرتے تھے، حالانکہ وہ ہرگز ان کے دوست نہیں تھے۔ بنی نضیر کے واقعہ میں ہمیں بالکل یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ مدینہ کے منافقین نے جو دراصل پتھر مٹی اور لکڑی کے بت پوجا کرتے تھے۔ بنی نضیر کے یہودیوں کو پیغام بھجوایا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ڈٹے رہیں، وہ اُن کی ہر طرح مدد کریں گے۔ لیکن قرآن مجید نے پہلے ہی مسلمانوں کو بتا دیا تھا کہ منافقین کسی قسم کا اقدام کرنے کے قابل نہیں ہیں] وہ صرف ڈینگیں مار رہے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ منافقین مدینہ بنی نضیر کے عبرتناک انجام کو خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہ گئے اور ان کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۱ (سورہ حشر: ۱۱)

''(اے حبیبؐ) آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے کافر یہودی بھائیوں سے منافقت کی، ان سے کہا، اگر تمہیں جلاوطن کیا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے خلاف کسی کا ساتھ نہیں دیں گے اور اگر تم نے جنگ کی تو ہم تمہارے شانہ بشانہ لڑیں گے۔ اللہ سبحانہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹ بکتے ہیں''

لَئِنۡ اُخۡرِجُوۡا لَا يَخۡرُجُوۡنَ مَعَهُمۡ ۚ وَلَئِنۡ قُوۡتِلُوۡا لَا يَنۡصُرُوۡنَهُمۡ ۚ وَلَئِنۡ نَّصَرُوۡهُمۡ لَيُوَلُّنَّ الۡاَدۡبَارَ ثُمَّ لَا يُنۡصَرُوۡنَ﴿۱۲﴾ (سورہ حشر: ۱۲)

''اگر یہودیوں کو جلاوطن کیا گیا تو منافقین ہرگز ان کے ساتھ مدینہ سے نہیں نکلیں گے۔ اگر یہودی جنگ کریں گے تو منافقین ہرگز ان کی مدد کو نہیں آئیں گے اور اگر آ بھی گئے تو دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔ پھر ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔

قرآن مجید کی تمام پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں۔

کافر، اللہ سبحانہ، سے زیادہ مسلمانوں سے خائف رہتے ہیں

سورہ حشر میں آگے بیان کیا گیا ہے کہ کافر اپنے کفر و الحاد کی وجہ سے جتنا مسلمانوں سے خائف تھے۔ اتنا اللہ سبحانہ سے بھی نہیں ڈرتے۔ یہ ان کی عدم معرفت کی دلیل ہے۔

لَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ رَهۡبَةً فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ﴿۱۳﴾

(سورہ حشر: ۱۳)

''(اے مسلمانو!) کافر اللہ سبحانہ سے بڑھ کر تم سے ڈرتے ہیں کیونکہ انہیں اللہ سبحانہ کی طاقت و سطوت کا اندازہ نہیں ہے''

اس سلسلہ میں قرآن مجید کی پیشین گوئیاں

قرآن مجید نے مسلمانوں کی ہمت بندھانے اور ان کے حوصلے بلند کرنے کے لیے بڑے یقین کے ساتھ تین باتیں ان کو بتادیں۔

۱۔ یہودی زندگی سے اس قدر پیار کرتے ہیں کہ وہ کبھی تمہارے مقابل آ کر جنگ نہیں کریں گے۔ وہ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ قلعہ بند ہو جائیں اور وہاں سے سنگ باری کریں۔

۲۔ کافر ایک دوسرے کے لیے طاقت ور ہو سکتے ہیں مگر مومنین کے مقابلہ میں اپنی طاقت کھو بیٹھتے ہیں کیونکہ 'شہادت' پر ایمان سے مشکلات آسان ہوجاتی ہیں اور انسان بڑھ کر موت کو گلے لگا لیتا ہے۔

۳۔ کافر، جو بظاہر بڑے متحد و متفق نظر آتے ہیں، اندر سے سخت خلفشار کا شکار ہیں۔

قرآن مجید ان تینوں نکات کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

لَا يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ جَمِيۡعًا اِلَّا فِیۡ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاۡسُهُمۡ بَيۡنَهُمۡ

شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

(سورہ حشر : ۱۴)

''(اے مسلمانو!) یہودی تمہارے خلاف کبھی سامنے آ کر جنگ نہیں کریں گے بلکہ صرف قلعہ بند ہو کر مقابلہ کریں گے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے تو طاقتور ہو سکتے ہیں (مگر تمہارے مقابلے کا یارا نہیں رکھتے)۔ آپ انہیں متحد سمجھ رہے ہیں حالانکہ ان میں شدید خلفشار ہے۔ وہ ایک بے عقل قوم ہیں''۔

ان کے قلوب متفرق ہیں کیونکہ وہ بے وقوف ہیں۔

آیہ مبارکہ میں متذکرہ بالا نکات کا اس طرح ذکر ہوا ہے کہ جملہ ''لا یقا تلونکم جمیعاً'' پہلے نکتہ کی طرف جملہ باسُھم بینھم شدید دوسرے نکتہ کی طرف اور جملہ ''تحسبھم جمیعاً و قلوبھم تیسرے نکتہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

حادثہ ما قابل سے کیوں عبرت حاصل نہ کی؟

قرآن مجید یاددلاتا ہے کہ بنی نضیر کو بھی بنی قینقاع جیسے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر کیوں انہوں نے بنی قینقاع سے سبق نہ لیا؟ ارشاد ہوتا ہے:

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾ (سورہ حشر : ۱۵)

''(بنی نضیر کا انجام) بھی ان سے پہلی جماعت (بنی قینقاع) جیسا ہی ہوا۔ دونوں نے اپنے کیے کی سزا پائی۔ (آخرت میں) ان کے لیے دردناک عذاب ہے''

اس طرح مدینہ منورہ یہودیوں کے ان دو قبیلوں کے ناپاک وجود سے پاک ہو گیا۔ اب یہودیوں کا صرف ایک قبیلہ رہ گیا جس نے ابھی تک حضرت رسول اکرمؐ کے ساتھ معاہدہ کی پاسداری کو باقی رکھا اور وہ ''بنی قریظہ'' تھے۔ جب تک بنی قریظہ اپنے معاہدہ پر قائم رہے۔ مسلمانوں کی طرف سے ان کو بھلائی اور خیر خواہی کے سوا کچھ نہ ملا۔ مگر ایک وقت آیا کہ 'بنی قریظہ' کو مندرجہ بالا دو قبیلوں سے بھی سخت سزا دی گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟، ہم اس کو ابھی بیان کرتے ہیں۔

''بنی قریظہ'' کو عہد شکنی کی سزا

ہجرت کے دوسرے اور چوتھے سال میں ''بنی قینقاع'' اور ''بنی نضیر'' کے یہودی قبائل کو جو مدینہ اور اس کے نواح میں رہتے تھے، ان کی خیانت و عہد شکنی کی بنا پر یثرب سے نکال دیا گیا۔ پہلا قبیلہ ''اذرعات'' (شام) اور دوسرا خیبر و شام کے علاقوں میں چلا گیا۔ اب مدینہ میں

یہودیوں کا صرف ایک قبیلہ ''بنی قریظہ'' باقی رہ گیا جو ۵ ھ تک آنحضرتؐ کے ساتھ کیے گئے معاہدہ پر قائم رہا اور ان سے معاہدہ میں کوئی خیانت سامنے نہ آئی۔

۵ ھ ہجری میں جنگ خندق پیش آئی۔ مشرکین مکہ اور یہودیوں کی دس ہزار مشترکہ فوج خندق کے اس پار مدینہ کے مسلمانوں کا محاصرہ کیے رہی۔ ایک ماہ کی مدت محاصرہ حضرت رسول اکرمؐ اور تمام مسلمانوں نے بڑی تکلیف دہ کیفیت میں بسر کی۔ اس حساس موقع پر 'بنی قریظہ' جو اصل میں مسلمانوں کے حلیف تھے، عہد شکنی کر کے کفار کی اتحادی فوجوں سے مل گئے۔

ہوا یوں کہ بنی نضیر کا ایک سردار حیی بن اخطب جو جلا وطنی کے بعد خیبر میں آباد ہو گیا تھا اس جنگ میں خیبر کے دیگر یہودیوں کے ساتھ اتحادی فوجوں میں شریک تھا۔ اس نے وقت کو غنیمت جانا اور ایک رات وہ چھپتا چھپاتا بنی قریظہ کے قلعہ تک جا پہنچا جو مدینہ میں واقع تھا۔ اس نے قلعہ کے دروازے پر بڑے زوردار طریقہ پر دروازہ کھولنے کی درخواست کی۔ بنی قریظہ کے سردار ''کعب'' نے انکار کیا اور دروازہ کھولنے سے منع کر دیا۔ مگر حیی ابن اخطب نے ایک طرف تو کعب کو اتحادی فوجوں کی یقینی کامیابی کا مژدہ سنایا اور دوسری طرف طعنہ دیا کہ میری میزبانی سے گریز کر رہے ہو۔ پس کعب نے دروازہ کھلوا دیا۔ حیی ابن اخطب نے اپنی چرب زبانی اور جھوٹی جنگی برتری کے بیانات سے کعب کو آمادہ کر لیا کہ وہ حضور اکرمؐ سے کیا ہوا معاہدہ توڑ ڈالے اور اتحادی فوجوں سے مل جائے۔ کعب اس کے دھوکے میں آ گیا۔ بنی قریظہ کے بعض بزرگ اور تجربہ کار افراد کعب کو منع بھی کرتے رہے کہ حیی کی باتوں میں نہ آنا چاہیے، مگر اس نے ایک نہ سنی حضورؐ سے کیے گئے معاہدہ کا نسخہ منگوایا اور سب کے سامنے اس کو پُرزے پُرزے کر دیا اور اپنے قبیلے والوں سے کہا کہ معاہدہ ختم ہوا، اب جنگ کی تیاریاں کرو۔ [۱]

بنی قریظہ کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے مدینہ کے گھروں میں موجود خواتین بچوں اور بوڑھوں کو ڈرائیں دھمکائیں، پھر بنی قریظہ کے راستے دو ہزار مشرک فوجیوں کو مدینہ میں داخل کریں تا کہ خندق کی حفاظت پر مامور مسلمانوں کی توجہ خندق سے ہٹا کر شہر کی طرف مبذول کرا سکیں۔ یوں مسلمان ان دو ہزار فوجیوں سے برسرپیکار ہو جائیں گے۔ اتنی دیر میں اتحادیوں کی فوج خندق عبور کر کے ان کو پیچھے سے آئے گی اور مسلمانوں کے قتل عام سے یہ معرکہ ان کے حق میں ختم ہو جائے گا۔

حضرت رسول اکرمؐ نے ان کے پہلے منصوبہ کو ختم کرنے کے لیے حکم دیا کہ پانچ سو مجاہد میدان جنگ سے مدینہ واپس جائیں اور شہر کی حفاظت کریں۔ آپؐ نے یہ بھی حکم دیا کہ مجاہدین مدینہ کے گلی کوچوں میں نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے گشت کریں تا کہ خواتین اور بچے مطمئن رہیں۔ اس طرح آپؐ نے یہودیوں کی چال پہلے ہی مرحلے میں ناکام بنا دی۔ [۲]

قبل اس کے کہ بنی قریظہ اپنی غداری کے دوسرے مرحلے یعنی اتحادی فوجیوں کو اپنے قلعے کے راستے مدینہ میں داخل کرنے پر عمل پیرا ہوتے، ان میں اور اتحادی فوجوں میں کسی طرح پھوٹ پڑ گئی۔ اس کی ایک وجہ ایک یہودی نو مسلم ''نعیم بن مسعودؓ'' بنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۲، ص ۲۲۳

[۲] سیرتِ حلبی، جلد ۲، ص ۳۳۵

اتحادی فوجی ان کے قلعہ سے چلے گئے اور بنی قریظہ کو مسلمانوں کے رحم وکرم پر تنہا چھوڑ گئے۔ ایسے لوگوں کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا جو جس درخت تلے بیٹھیں اسی کی شاخیں کاٹیں۔ وہ مسلمانوں کے حسن سلوک کے باوجود عہد شکنی اور خیانت کے مرتکب ہوئے تھے۔

مدینے میں آخری فساد کی جڑ کو بھی اکھاڑ پھینکا گیا

جنگ خندق میں اتحادی فوجیوں کی ذلت آمیز شکست کے بعد حضور اکرمؐ بنی قریظہ کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ جنہوں نے جنگ میں ''پانچویں ستون'' کا کردار ادا کیا۔ ان سے بعید نہ تھا کہ پھر کسی موقع پر وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ سازش نہ کریں گے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے ''بنی قریظہ'' کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ بند یہودیوں نے درخواست کی کہ قبیلہ اوس کے ''ابولبابہ'' کو قلعہ کے اندر آنے کی اجازت دی جائے تا کہ وہ اس سے صلاح مشورہ کر سکیں۔ حضور اکرمؐ نے ابولبابہ کو قلعہ کے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ جونہی ابولبابہ قلعہ کے اندر گئے۔ یہودی خواتین اور مردان کے گرد جمع ہو گئے اور گریہ کناں اُن سے پوچھنے لگے:

''کیا ہمارے حق میں یہ اچھا ہوگا کہ ہم بلا شرط ہتھیار ڈال دیں؟''

ابولبابہ جو بڑے مخلص مسلمان تھے، یہودیوں کی رقت آمیز کیفیت سے متاثر ہو گئے اور جواباً اپنی انگلی گلے پر پھیرتے ہوئے کہا کہ ہتھیار ڈالنے سے مراد اپنی جان گنوانا ہے۔ لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کا راز فاش کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ بہت پشیمان ہوئے اور اس حالت میں قلعے سے باہر آ گئے کہ ان کا رنگ فق تھا اور ہر عضو بدن کانپ رہا تھا۔ باہر آتے ہی انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا اور قسم کھائی جب تک ان کی غلطی معاف نہیں کر دی جاتی وہ سوائے حوائج ضروریہ کے ساری عمر یونہی ستون کے ساتھ بندھے رہیں گے۔

خوش قسمتی سے اللہ سبحانہ نے بذریعہ وحی ابولبابہ کی معافی کی اسی طرح اطلاع دی جس طرح ان کی غلطی سے اپنے رسولؐ کو آگاہ فرمایا تھا: جیسا کہ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۲۷ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۝۲۸ (سورہ انفال: ۲۷،۲۸)

''مسلمانو! اللہ سبحانہ اور اس کے پیغمبرؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو اور نہ ہی اپنی امانات میں خیانت کرو، تم خوب جانتے ہو کہ تمہاری اولاد اور مال ومتاع تمہارے لیے آزمائش ہیں، جبکہ اللہ سبحانہ کے پاس بہترین اجر ہے''

بقول مفسرین اس آیہ مبارکہ میں ابولبابہ کی خیانت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ دوسری آیت میں ان کی توبہ کی قبولیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾ (سورہ توبہ: ۱۰۲)

''مسلمانوں میں) کچھ افراد ایسے ہیں جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کبھی نیک کام کرتے ہیں اور کبھی ساتھ ہی بُرے کام کر بیٹھتے ہیں۔ اللہ سبحانہ ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے، بے شک اللہ سبحانہ بخشنے والا اور رحیم و کریم ہے''

ابولبابہ کا قصہ ختم ہوا۔ بنی قریظہ نے دوسری پیش کش یہ کی کہ ''سعد بن معاذؓ'' کا فیصلہ انہیں منظور ہوگا اور وہ جو فیصلہ بھی کریں گے یہودی سرتسلیم ختم کر دیں گے۔ سعد بن معاذ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے مرد قتل کر دیئے جائیں، خواتین، بچے اور مال و اسباب مسلمانوں کی ملکیت قرار دیئے جائیں۔ انہوں نے یہ فیصلہ ماضی کے تلخ تجربوں کی بنا پر کیا کیونکہ جب بنی قینقاع کو معاف کیا گیا تو انہوں نے کعب بن اشرف کے ذریعے جنگ احد کے شعلے بھڑکائے، بنی نضیر کو معاف کیا گیا تو جنگ خندق کا فتنہ کھڑا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بنی قریظہ کی معافی مسلمانوں سے غداری کے مترادف سمجھی۔ انہیں خطرہ ہوا کہ یہودیوں کو اگر اب بھی معاف کر دیا گیا تو مسلمانوں کے خلاف ایک اور خطرناک ''جنگ'' تیار ہو جائے گی۔

قرآن مجید میں حضرت سعد بن معاذؓ کے فیصلہ کی تائید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾ (سورہ احزاب: ۲۵)

''اللہ سبحانہ نے اتحادیوں فوجوں کو پیچ و تاب کھاتے ہوئے ناکام واپس جانے پر مجبور کر دیا اور مسلمانوں کو جنگ سے آسودہ فرما دیا۔ بے شک اللہ سبحانہ بڑا قوی و غالب ہے''

پھر اگلی آیہ مجیدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾ (سورہ احزاب: ۲۶)

''(اللہ سبحانہ) اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو ان کے مضبوط قلعوں سے باہر نکال لایا اور ان پر خوف و ہراس مسلط کیا جنہوں نے مشرکوں کی پشت پناہی کی تھی۔ اب تم (اے مسلمانو!) ان کے مردوں کو قتل کر رہے ہو اور عورتوں کو قیدی بنا رہے ہو''۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وَاَوۡرَثَكُمۡ اَرۡضَهُمۡ وَدِيَارَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ وَاَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرًا ۝۲۷ (سورہ احزاب: ۲۷)

''(اللہ سبحانہ) نے تمہیں ان کی جاگیروں اور گھروں کا مالک قرار دیا۔ تم نے تو کبھی ایسی زمینوں پر قدم بھی نہیں رکھا۔ بے شک اللہ سبحانہ ہر کام پر قادر ہے''

اس طرح مدینہ اور اس کے نواح میں فساد کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکا گیا۔ البتہ یہودیوں کی قوت کا ایک اور مرکز 'خیبر' باقی رہ گیا تھا۔ وہاں کے بڑے مضبوط قلعے اور فوجی چھاؤنیاں ابھی باقی تھے۔ کیونکہ ان کا مضبوط ترین قلعہ خیبر میں تھا۔ اب دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید اس کے بارے میں کیا فرماتا ہے۔

خیبر کا قلعہ یا خطرات کا ایک اور مرکز

مدینہ منورہ اور اس کے گرد ونواح سے یہودیوں کے تینوں قبیلوں کا انخلا گرچہ وقتی طور پر مسلمانوں کے لیے امن وسکون کا ذریعہ بنا مگر مدینہ کے شمال میں یہودیوں کی ایک مضبوط فوجی چھاؤنی ''خیبر'' ابھی تک موجود تھی۔ خیبر کے یہودیوں کا فولادی قلعہ ان کے دشمنوں کی فتح و کامرانی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ اس بات کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ جنگ خندق میں قریش وغطفان زبردست ہزیمت اٹھانے کے بعد خیبر کے یہودیوں کے ایما اور مالی امداد سے پھر دوبارہ مدینہ پر چڑھ نہ دوڑیں۔

۶ ھ میں قریش مکہ کے ساتھ ''صلح حدیبیہ'' قرار پائی جس سے حضور اکرمؐ جنوب کی طرف سے کسی قدر مطمئن ہوگئے۔ چنانچہ آپؐ نے شمال میں خیبر کے یہودیوں کی گوشمالی کا ارادہ فرمایا۔ آپؐ کا منصوبہ یہ تھا کہ مجاہدین اسلام کی مدد سے مذکورہ بالا تینوں یہودی قبیلوں کی طرح ان کو بھی غیر مسلح کیا جائے۔ اور مدینہ سے صرف ایک سو نوے کلومیٹر دور قلعہ خیبر سے آسودہ ہوا جائے۔ چنانچہ آپ ایک ہزار چھ سو مجاہدوں پر مشتمل لشکر جرار لے کر شمال کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان سولہ سو مجاہدوں میں دو گھوڑ اسوار مجاہد تھے۔

آپؐ کے اس منصوبے سے صرف چند چیدہ چیدہ افراد ہی آگاہ تھے۔ اکثر مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید آپ ''غطفان'' اور ''خزارہ'' قبیلوں کی سرکوبی کے لیے تشریف لے جارہے ہیں۔ جنہوں نے 'جنگ خندق' کے دوران قریش مکہ کی مدد کی تھی۔ جب آپ صحرائے رجیع میں پہنچے تو آپؐ نے فوج کو ''خیبر'' کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ اس طرح آپؐ ان دونوں قبیلوں کو خیبر کے یہودیوں کی مدد سے باز رکھنے میں کامیاب رہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ کوئی پچیس دن قلعہ خیبر کا محاصرہ جاری رہا۔ اس کے باوجود حلیف قبیلے ایک دوسرے کی مدد نہ کرسکے۔

جب آپؐ ''خیبر'' کے پاس پہنچے تو آپؐ نے بارگاہِ رب العزت میں نہایت عاجزی، انکساری اور سوز وگداز سے یوں دعا فرمائی:

اللھم رب السموت و ما اظللن و رب الارضین و ما اقللن نسئلك خیر ھذہ القریة و خیر اھلھا و خیر ما فیھا و نعو ذبك من شرھا و شرا

هلها و شر ما فیها

''یا اللہ! اے آسمانوں اور ان کے زیر سایہ جو کچھ بھی ہے اس کے نگہبان! اے زمینوں اور جو کچھ انہوں نے اٹھا رکھا ہے اس کے نگہبان! میں اس علاقے، اس علاقے کے باسیوں اور جو کچھ اس علاقے میں ہے، کی خیر کا طالب ہوں اور ان کی، اس علاقے کی اور یہاں جو کچھ بھی ہے، اس کی برائی اور مضرت سے تیری پناہ چاہتا ہوں''۔[1]

بہت تھوڑی مدت میں خیبر کے ساتوں قلعے مجاہدین اسلام کے محاصرہ میں آ گئے۔ مسلمانوں نے قلعوں کی رسد و کمک کے تمام راستوں کی نگرانی شروع کر دی۔ خیبر کے یہودیوں کو جب احساس ہوا کہ وہ مسلمان افواج کے نرغہ میں آ چکے ہیں تو انہوں نے فوراً قلعوں کے دروازہ بند کر لیے، اپنی فوجی کونسل قائم کی اور دفاع کرنے لگے۔ مگر اللہ سبحانہ کے فضل و کرم، حضور اکرمؐ کی قائدانہ صلاحیتوں، مجاہد اعظم امیر المومنین حضرت علیؑ اور دیگر مسلمان مجاہدوں کی حربی مہارت کی وجہ سے صرف پچیس دن کی دست بدست لڑائی کے بعد سارے قلعے فتح ہو گئے اور اس طرح فساد کی یہ آخری جڑ بھی اکھاڑ پھینکی گئی۔

قرآن مجید نے حضوا کرمؐ کی خیبر کی طرف روانگی سے قبل ہی اس فتح کی نوید سنا دی تھی اور جب مجاہدین اسلام مدینہ سے نکل رہے تھے۔ اس وقت بھی بعض آیات نازل ہوئیں۔ ذیل میں ہم اس سلسلے کی تمام آیات نقل کرتے ہیں:

فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ (سورہ فتح: ۱۸)

''(اللہ سبحانہ) نے ان کے دلوں کو اطمینان بخشا اور جزاء کے طور پر ان کو اتنی جلد کامیابی سے ہمکنار فرمایا''

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾ (سورہ فتح: ۱۹)

''مسلمانوں کو کثیر مال غنیمت ہاتھ لگا اور اللہ سبحانہ غالب اور صاحب حکمت ہے''

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾

(سورہ فتح: ۲۰)

''اللہ سبحانہ نے تم سے وسعت رزق کا وعدہ کیا تھا چنانچہ تم کثیر مال غنیمت لے کر اس وعدہ کی وفا مشاہدہ کر رہے ہو۔ تمہیں یہ سب کچھ بہت جلد مل گیا۔ ایک (صلح حدیبیہ) اور دوسرے قریش مکہ کے شر کو تم سے دور رکھا تا کہ مومنین کے لیے نشانی رہے اور تمہیں راہ راست کی ہدایت کرے''۔

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲، ص ۱۴۷

یہ آیات ''صلح حدیبیہ'' کے دوران نازل ہوئیں جب حضرت رسول اکرمؐ اور مسلمان عمرہ اور خانہ خدا کی زیارت کیے بغیر راستے ہی سے واپس لوٹ آئے تھے۔ مسلمانوں کو دشمنوں پر غلبہ اور کثیر مال غنیمت کا مژدہ سنایا گیا تھا اور اس سے مراد خیبر کے یہودیوں پر فتح اور وہیں کا کثیر مال غنیمت ہے۔

آیہ مبارکہ میں ''فتح قریب'' سے مراد خیبر ہی کی فتح ہے جو تقریباً دو مہینے بعد ہی ساتویں ہجری کے اوائل میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔

''غنائم کثیرۃ'' سے مراد خیبر سے حاصل ہونے والا مال غنیمت اور زرخیز زمین ہے۔

آیہ مجیدہ میں ''فعجل لکم ھذہ'' یعنی تمہارے لیے فتح کو جلد امکان پذیر کیا۔ والا جملہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ''صلح حدیبیہ'' کے تھوڑے عرصہ بعد یہ بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ بعض مسلمان صلح حدیبیہ سے خوش نہیں تھے حالانکہ قرآن مجید نے اسے ''فتحا مبینا'' قرار دیا ہے۔ بعد کے واقعات بھی اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اگر صلح حدیبیہ انجام نہ پاتی تو حضور اکرمؐ قریش سے مطمئن ہو کر شمال میں یہودی ٹھکانوں اور فولادی قلعوں کی بیخ کنی نہ کر سکتے اور نہ ہی مسلمانوں کو اس قدر مال غنیمت ہاتھ لگتا۔

یہ آیات جو مستقبل قریب میں فتح و حصول غنیمت کی خبر دیتی ہیں، حدیبیہ سے واپسی پر نازل ہوئیں، بلکہ جن آیات کا اب ہم ذکر کریں گے، وہ ظاہراً اس وقت نازل ہوئیں جب لشکر اسلام خیبر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ان آیات میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اب تک بغیر شرعی جواز کے جہاد سے جی چراتے رہے تھے۔ ان کو اب جہاد میں شرکت سے منع کر دیا گیا۔ کیونکہ ان آیات میں فتح اور مال غنیمت کی ضمانت دے دی گئی تھی۔ چنانچہ ہمیشہ پیچھے رہنے والے اب آگے بڑھ بڑھ کر جہاد میں جانے کی اجازت چاہ رہے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ اب کے شرکت رضائے خدا کے لیے نہیں بلکہ مال غنیمت سمیٹنے کے لیے تھی۔ چنانچہ سورہ فتح میں ارشاد ہوتا ہے:

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُل لَّن تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥﴾

(سورہ فتح: ۱۵)

''(اے مسلمان مجاہدو!) جب تم مال و متاع والی زمینوں کی طرف جانے لگے تو اب تک جہاد سے منہ موڑنے والے کہنے لگے: ''ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے!'' وہ اللہ سبحانہ کی بات کو بدلنا چاہتے ہیں۔ (اے حبیبؐ) اُن سے کہہ دیجیے ہمارے ساتھ ہرگز نہ آئیں۔ اللہ سبحانہ پہلے بھی یہ حکم صادر فرما چکا ہے۔ البتہ وہ یہ کہیں گے کہ تم ہمیں اپنے حسد کا نشانہ بنا رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ وہ حقیقت کو بہت کم سمجھتے ہیں''

اس آیہ مجیدہ میں بہت سے نکات توضیح طلب ہیں:

۱۔ ''یریدون ان تبدلوا کلام اللہ'' یعنی اللہ سبحانہ کی بات کو بدلنا چاہتے ہیں، والے جملہ سے کیا مراد ہے؟

اس آیہ مجیدہ سے پہلے جو آیات ہم نے پیش کی ہیں ان کے مطابق خیبر کا کثیر مال غنیمت صرف ان لوگوں کے لیے اللہ سبحانہ نے قرار دیا جو صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور اکرمؐ کے ساتھ تھے۔ جو لوگ اب جہاد میں شرکت کی خواہش کر رہے تھے۔ وہاں موجود نہیں تھے کہ ان کو جانے کی اجازت دے دی جاتی۔ چنانچہ یہ لوگ خیبر کے مال غنیمت میں حصہ دار ہوتے تو یہ بات اللہ سبحانہ کی بات کو بدل دینا ہوتا۔

۲۔ قل لن تتبعو نا یعنی ہمارے ساتھ مت آنا، یا تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں جا سکو گے، والے جملے سے کیا مراد ہے؟

اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ممکن ہے یہ خیبر غیبی ہو اور آئندہ نگاہ حق بین اللہ سبحانہ دیکھ رہی ہو کہ انہیں کبھی جہاد میں شرکت کرنے کی توفیق ہی نصیب نہیں ہوگی۔

یا یہ کہ انہیں جہاد میں شرکت سے سختی سے منع کر دیا گیا ہو۔

۳۔ منع کیے جانے کے بعد انہوں نے مجاہدوں پر ''حسد'' کرنے کا الزام لگایا، بجائے اس کے کہ خود اپنی اصلاح کرتے۔

یہ حسد و بغض کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ انہیں اس جرم کی ایک قسم کی سزا دی گئی کہ اب تک وہ جہاد سے غیر حاضر رہے تھے۔

اب انعام ملنے کے وقت راہِ خدا میں جان قربان کرنے والوں اور آرام سے گھر میں بیٹھے رہنے والوں میں فرق ہونا چاہیے۔ یہ تو صریح ناانصافی ہے کہ آرام طلب لوگ بھی مال غنیمت میں اس شخص کے برابر حصہ پائیں جو اپنا مال اور جان راہ خدا میں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔

بہر حال خیبر کے یہودیوں کی شکست کے بعد جزیزہ نمائے عرب میں یہودی قوت کی کمر ٹوٹ گئی اور خیبر کے یہودی مسلمانوں کے محض کارندے بن کر رہ گئے۔ چونکہ وہ لوگ کاشتکاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے لہٰذا خیبر کی زمینیں انہیں کے پاس رہنے دی گئیں۔ البتہ حاصل ہونے والی فصلوں سے مسلمانوں کو خاصہ حصہ دلوایا گیا۔

ابن ہشام رقم طراز ہے کہ حضورِ اکرمؐ نے وصیت فرمائی:

الا یترل بجزیرۃ العرب دینان"

''خبردار! جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے علاوہ اور کوئی دین نہ رہے''[1]

شاید اسی حدیث شریف کی بنیاد پر حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر کے علاقے سے بالکل بے دخل کر دیا تھا۔ یہاں تک ہم نے قرآن مجید کے حوالے سے حضور اکرمؐ کے زمانہ کے یہودیوں کے واقعات بیان کیے۔ اب صرف ''نجران'' کے عیسائیوں کا واقعہ رہتا ہے۔ جو انشاء اللہ سن ہجری کی ترتیب کے مطابق آگے آ جائے گا۔

---

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۵۳

قرآن مجید میں حضور اکرمؐ کے غزوات کا ذکر

ا۔غزوۂ بدر

مشرکین اور بت پرستوں کے خلاف حضور اکرمؐ کو جنگ کی ترغیب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ہم نے بھی اس کتاب میں اب تک اسی موضوع پر اجمالی طور پر کافی کچھ بیان کیا ہے۔چنانچہ اس بات میں ہم مجموعی طور پر رسولِ اکرمؐ کو ترغیب جہاد کے موضوع پر کچھ نہیں لکھیں گے بلکہ جنگی ترغیبات، حربی واقعات اور اُن کے نتائج، جو قرآن مجید نے اشارۃً یا صریحاً بیان فرمائے ہیں، اسی پر اکتفا کریں گے۔البتہ اس بات میں ہم غزوات کا تجزیہ اور تحلیل ضرور کریں گے کیونکہ قرآن مجید ان کی بنیاد فراہم کرتا ہے، تاکہ قارئین کرام اس باب کے مطالعہ کے بعد غزوات کے اسباب اور ان کے نتائج قرآن مجید کے تناظر میں مشاہدہ کر سکیں۔

مشرکین کے خلاف حضور اکرمؐ کی پہلی جنگ:

ا۔غزوہ بدر اور اس کے اسباب

مدینہ منورہ کے جنوب مغرب میں کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر وادی الصفراء کے پاس ایک کنواں ہے جو ''بدر'' کے نام سے مشہور ہے۔یہ کنواں 'بدر' ابن نخیلہ بن نضر بن کنانہ سے منسوب ہے۔

حضور اکرمؐ[1] بارہ رمضان المبارک ۲ ھ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔مختلف منازل طے کرتے ہوئے آپؐ سرزمین ''زخران'' پر پہنچے اور قیام فرمایا۔وہیں آپؐ کو اطلاع ملی کہ مکہ سے قریش ایک لشکر لے کر اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے مدینہ کی طرف آ رہے ہیں اور اگر حضور تھوڑا سا آگے بڑھیں تو اس فوج سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔آپؐ نے فوراً اپنے ساتھیوں سے مشورہ فرمایا۔بنی ہاشم کے علاوہ دیگر مہاجر اکابرین نے اپنے قافلہ کی حفاظت کے لیے آنے والے مسلح لشکر سے جنگ کی مخالفت کی البتہ جناب مقدار بن عمرو اور سعد بن معاذ جیسے انصار اکابرین نے پُرزور تائید کی۔آپؐ نے انصار کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کوچ کا حکم دیا اور فرمایا:

''اللہ سبحانہ، کا نام لے کر قدم بڑھاؤ۔اللہ سبحانہ نے مجھے مژدہ فتح سنایا ہے۔دونوں میں سے ایک جماعت کے ساتھ ضرور ہماری مڈبھیڑ ہوگی۔گویا میں میدانِ جنگ میں دشمنوں کے تڑپتے لاشے دیکھ رہا ہوں''

غزوہ بدر سے متعلق آیات سورہ انفال میں ہیں۔ہم ان تمام آیات کے خاص خاص نکات کی توضیح پیش کرتے ہیں۔

---

[1] ابن ہشام کی طرح کئی مورخین نے بارہ کے بجائے آٹھ رمضان المبارک بروز پیر لکھا ہے۔

دشمن سے مقابلہ کے بارے میں بعض مسلمانوں کا خوف

درج ذیل دو آیات سے یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت مشرکین کے مسلح قافلہ سے شدید خائف تھی حتیٰ کہ وہ اس طرح چل رہے تھے گویا وادی موت کی طرف قدم بڑھا رہے ہوں۔ اس موقعہ پر حضور اکرمؐ نے جو کفار سے جنگ کا فیصلہ فرمایا تھا وہ دراصل اکثریتی فیصلہ تھا کیونکہ انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

كَمَآ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَقِّ ۖ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَـكٰرِهُوۡنَۙ‏ ﴿۵﴾ (سورہ انفال: ۵)

''(اے حبیبؐ) آپ کے پالنے والے نے آپؐ کو گھر (مدینہ) سے نکلنے کا برحق حکم دیا ہے، اگرچہ مسلمانوں کا ایک طبقہ اس پر خوش نہیں''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

يُجَادِلُوۡنَكَ فِى الۡحَـقِّ بَعۡدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوۡنَ اِلَى الۡمَوۡتِ وَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَؕ‏ ﴿۶﴾ (سورہ انفال: ٦)

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ حکم اللہ سبحانہ کی طرف سے ہے۔ (اے حبیبؐ) یہ لوگ آپ سے اُلجھ رہے ہیں، گویا یہ موت کی طرف جا رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے موت کو دیکھ رہے ہیں''

اس آیہ مبارکہ میں ''یجادلونك فی الحق'' سے مراد مقام ''زخران'' پر حضور اکرمؐ کا مسلمانوں کے ساتھ صلاح مشورہ ہے اور ''کانما یساقون الی الموت'' سے مراد ان کا بادل ناخواستہ حضورؐ کے ساتھ جہاد کے لیے نکلنا ہے۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس واقعہ میں جہاد کے مخالف افراد سے مکمل شناسائی ہو سکتی ہے اور قرآن مجید کے حوالہ سے ان کی حیثیت کا تعین ہو سکتا ہے۔[1]

دشمن سے مقابلہ کا حکم

حضور اکرمؐ نے جب کوچ کا حکم دیا تو ارشاد فرمایا:

---

[1] مغازی واقدی، جلد ۱، ص ۴۸ ۲ اور سیرت حلبی جلد ۲، ص ۱٦۰

احدی الطائفتین لکم اما العیر و اما النضیر

''مسلمانو! تمہاری ملاقات اور آمنا سامنا دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ضرور ہوگا یا قافلہ ''عیر'' سے یا ''لشکر مشرکین'' سے''۔

اس موقع پر مسلمانوں میں جہاد کے مخالف گروہ کی آرزو یہ تھی کہ وہ قافلہ کے مقابل آئیں کیونکہ ایک تو انہیں اپنی فوجی طاقت بہت کمزور معلوم دیتی تھی اور دوسری طرف انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ''جنگ بدر'' کی شاندار فتح کے بعد نہ صرف بہت سامالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگے گا بلکہ اس فتح سے مسلمانوں کے قدم مدینہ منورہ میں مستحکم ہوجائیں گے۔قرآن مجید ان لوگوں کے خیالات کے بارے میں مطلع فرماتا ہے کہ وہ دنیا کے خواہاں تھے جبکہ اللہ سبحانہ حق وصداقت اور کافروں کی بیخ کنی چاہتا ہے۔ چنانچہ ان کی خواہش قافلہ سے ملاقات کی تھی جبکہ اللہ سبحانہ کی رضا مشرکین کی فوج سے جنگ اور انہیں تہ تیغ کرنے میں تھی۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآٮِٕفَتَيۡنِ اَنَّهَا لَـكُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ الشَّوۡكَةِ تَكُوۡنُ لَـكُمۡ وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّحِقَّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡكٰفِرِيۡنَۙ‏ ﴿۷﴾ (سورہ انفال: ۷)

''مسلمانو! جب اللہ سبحانہ نے (حضرت رسول اکرمؐ کے ذریعہ) تم سے وعدہ فرمایا کہ دونوں میں سے کسی ایک سے تمہارا مقابلہ ضرور ہوگا (یا قافلہ سے اور یا لشکر مشرکین سے) تو تمہاری آرزو تو یہی تھی کہ تمہاری قافلہ سے ملاقات ہو۔مگر اللہ سبحانہ اپنی قدرت کاملہ سے حق کو برقرار رکھنا اور کافروں کی بیخ کنی چاہتا ہے''

اگلی آیہ مجیدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ‌ۚ‏ ﴿۸﴾ (سورہ انفال: ۸)

''تاکہ حق قائم ہو اور باطل نابود ہوجائے اگرچہ مجرم لوگ اسے ناپسند کریں''

اس آیہ مبارکہ میں دو جملے بڑے اہمیت کے حامل ہیں:

i- تو دون ان غیر ذات الشو کة تکون لهم ''یعنی تم چاہ رہے تھے کہ تمہاری ملاقات ان لوگوں سے ہو جو فوجی قوت میں کم ہوں۔۔۔اور

ii- ویرید الله ان یحق الحق یعنی ''حالانکہ اللہ سبحانہ احقاق حق چاہتا ہے''

اس طرح قیامت تک کے لیے مسلمانوں کو ایک سبق دیا جارہا ہے کہ آرام طلبی، تن آسانی، مال ومتاع کے لالچ اور دنیوی عیش وآرام

اللہ سبحانہ کے اہداف کے بالکل برعکس ہیں کیونکہ اس کا ہدف یہ ہے کہ حق وصداقت برقرار رہے اور باطل کی بیخ کنی ہو۔ یہ ہدف صرف دشمن سے آمنے سامنے ہونے اور میدانِ کارزار میں اس پر غلبہ پانے ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

آخر کار وہی ہوا جو منشاء قدرت تھا۔ قریش کو خبر ملی کہ حضوؐر اکرمؐ اپنے جانثاروں کے ساتھ بدر کے مقام پر فروکش ہیں۔ انہوں نے اپنے قافلہ کا رخ بدل دیا اور دو تین منزلیں بغیر پڑاؤ کیے چلتے رہے۔ انہوں نے اس قریشی لشکر کو بھی جو اُن کی حفاظت کے لیے مکہ سے آ رہا تھا۔ پیغام بھجوایا کہ واپس مکہ چلے جائیں اور مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔

مگر ابوجہل جو اس لشکر کا سپہ سالار تھا۔ ابوسفیان کے پیغام کے باوجود اس بات پر بضد تھا کہ بدر تک جایا جائے اور مسلمانوں کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ ضرور کیا جائے۔[1]

ابوجہل کی ترغیب پر وہ لشکر بدر کی طرف آنحضرتؐ کی فوج کے مقابل ہونے کے لیے چل پڑا اور شدید بارش کی وجہ سے مجبوراً صحرا کے کنارے ایک پہاڑی کو پشت پر رکھ کر خیمہ زن ہو گیا۔ مسلمان بھی اسی صحرا میں پہاڑی کے اس پار فروکش تھے۔ دونوں لشکروں کے درمیان صرف یہ پہاڑی ایک آڑ کا کام دے رہی تھی۔ قرآن مجید تینوں جماعتوں کا نقشہ اس طرح کھینچ رہا ہے:

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۬ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ (سورہ انفال: ۴۲)

''مسلمانو! اس وقت کو یاد کرو جب تم صحرا کے جنوب کی طرف تھے۔ اور (مشرکین مکہ کا مسلح لشکر) شمال کی طرف تھا اور (ابوسفیان والا) قافلہ مزید جنوب کی طرف تھا۔ گر تم (اس صورتِ حال میں) ایک دوسرے کے ساتھ کوئی وعدہ کرتے تو یقیناً اس کی خلاف ورزی کرتے۔ مگر اللہ سبحانہ جو کام کرنا چاہتا ہے کر کے رہتا ہے تاکہ جو ہلاک ہو (گمراہ رہے) اس پر اس کی حجت تمام ہو چکی ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل و برہان کے ساتھ ہدایت پائے اور اللہ سبحانہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے''۔

اگر آیہ مجیدہ کے الفاظ پر غور کریں تو دونوں فوجوں کے محل وقوع کو ابھارا گیا ہے۔ ''عدوۃ'' کے معنی آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ چونکہ لشکر قریش آدھے صحرا کو پار کر کے شمال کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ مسلمان جنوب کی طرف کے صحرا میں تھے تاہم دونوں ہی اس صحرا میں تھے۔ اسی صورت کو قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے۔ مزید برآں لشکر قریش نسبتاً بلندی پر تھا جو فوجی محل وقوع کے اعتبار سے ایک طرح کی فوقیت ہوتی ہے

---

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ۱ ص ۲۱۹

کیونکہ اس صورت میں مسلمان ان کی زد میں تھے اور ان کا مسلمانوں پر حملہ آور ہونا آسان تھا جبکہ مسلمانوں کے لیے حملہ کرنا مشکل تھا۔
ابوسفیان والا تجارتی قافلہ جو شام سے مکہ آ رہا تھا مسلمانوں کے لشکر کے جنوب میں تھا۔ وہ راستہ بدل کر بحیرۂ احمر کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا تھا تاکہ مسلمانوں کی زد سے بچ کر مکہ پہنچ جائے اور مسلمانوں کی گرفت سے محفوظ رہے۔ اس لیے قرآن مجید فرماتا ہے۔ **والرکب اسفل منکم** یعنی اور قافلہ تمہاری نسبت جنوب میں تھا''۔

تیسرا نکتہ جو اس آیہ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو کفار کی فوجی برتری کے ساتھ ساتھ ان کے لشکر کی جغرافیائی برتری بھی معلوم ہوتی تو کفار سے مقابلہ کے سوال پر مزید پریشانی کا شکار ہوتے اور دل جمعی سے کبھی نہ لڑ سکتے۔ اسی بات کو قرآن مجید اس جملے میں بیان فرما رہا ہے:

ولو تواعدتم لا ختلفتم فی المیعاد

''یعنی اگر تم ایک دوسرے سے کفار کے مقابلے میں صف آراء ہونے کا وعدہ کر بھی لیتے تو بھی پورا نہ کرتے''

علاوہ ازیں آیہ مجیدہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ کی مرضی یہ تھی کہ کفار اور مسلمانوں میں جنگ ہو اور مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیا گیا۔ جنگ ہوئی اور مسلمانوں کو شہرہ آفاق فتح و کامرانی ملی۔ یہی بات اس جملے میں بیان کی گئی ہے۔

ولکن لیقضی اللہ امراً کان مفعولاً

''یعنی جو کام اللہ سبحانہ کرنا چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے''

اللہ سبحانہ کی مشیت اس جنگ میں، جس کا نتیجہ توحید کی شرک پر فتح یہ تھی کہ حق و باطل میں فرق کھل کر سامنے آ جائے کیونکہ مسلمانوں کی میدانِ کارزار میں اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن کے مقابلہ میں کامیابی، جبکہ ان کے پاس نہ باقاعدہ تربیت یافتہ فوج تھی اور نہ ہی سامان و آلات جنگ، صرف ''حق'' کی فتح کی بین دلیل تھی۔ مسلمانوں کے پاس تو صرف ایمان، عشق خدا اور شوق شہادت کا اسلحہ تھا اور یہ صورت حال غیر مسلموں پر مکمل طور پر اتمام حجت کرتی ہے۔ اسی لیے آیہ مجیدہ میں یہ جملہ آتا ہے:

لیھلك من ھلك عن بینة و یحییٰ من حی عن بینة

''تاکہ جو بھی گمراہ ہو اس پر حجت تمام ہو چکی ہو اور جو ہدایت پانا چاہے اس کے پاس دلیل و ثبوت ہو''

دو غیر مساوی فوجوں کا آمنا سامنا

۱۷ رمضان المبارک ۲ ھ کی صبح کو قریش کی فوج بڑی تمکنت سے پہاڑی سے نیچے صحرائے بدر میں آ گئی۔ جب حضرت رسول اکرمؐ کی نگاہ ان پر پڑی تو آپؐ نے بارگاہ رب العزت میں دست دعا بلند فرمائے اور عرض کیا: ''پروردگار تو دیکھ رہا ہے کہ قریش کس تکبر و نخوت کے ساتھ تجھ سے برسر پیکار ہونے اور تیرے پیغمبرؐ کی تکذیب کے لیے میدان میں آ گئے ہیں۔ پروردگار! تو نے مجھ سے جس مدد کا وعدہ فرمایا ہے، اسے بھیج

دے اور آج ان کو نیست و نابود فرما!۔[1]

غزوہ بدر میں غیبی امداد

جنگ بدر کے بارے میں جو آیات ''سورہ آل عمران'' اور ''سورہ انفال'' میں نازل ہوئی ہیں، ان میں غیبی امداد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی اللہ سبحانہ کی اس خاص مدد اور کرم کی مرہون منت ہے۔ مجموعی طور پر غیبی امداد آٹھ قسم کی ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امداد نہ آتی تو مسلمانوں کو اس قسم کی فتح نصیب نہ ہوتی۔ چنانچہ فرماتا ہے۔

وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ۝۱۲۳

(سورہ آل عمران: ۱۲۳)

''جنگ بدر کے دوران (اے مسلمانو!) تم بہت کمزور تھے تو اللہ سبحانہ نے تمہاری مدد کی۔ اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم شکرگزار بندے بن پاؤ''

جس ذلت کا ذکر اس آیہ مبارکہ میں ہوا ہے اس عزت کے منافی نہیں جس کو قرآن مجید مومنین کے لیے قرار دیتا ہے۔ جہاں فرماتا ہے:

يَقُوۡلُوۡنَ لَئِنۡ رَّجَعۡنَاۤ اِلَى الۡمَدِيۡنَةِ لَيُخۡرِجَنَّ الۡاَعَزُّ مِنۡهَا الۡاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلٰكِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ۝۸

(سورہ منافقون: ۸)

''عزت تو خدا، اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے لیکن منافق نہیں جانتے''

اس آیت میں ذلت سے مراد عنایات پروردگار کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت میں عزت سے مراد الطافِ الٰہی کے سایہ میں ملنے والی عزت ہے۔ عزت و ذلت کی یہ دونوں اقسام ایک دوسری کے منافی نہیں ہیں کیونکہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت ملنے کے بغیر عزیز و گرامی نہیں ہوسکتا۔

غیبی امداد کی تفصیل

۱۔ دشمن کی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں کم تعداد نظر آنا۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۱۹، ص ۲۲۱

دشمن کے مقابلہ پر آنے سے پہلے حضرت رسول اکرمؐ نے انہیں خواب میں دیکھا۔ اللہ سبحانہ نے خواب میں دشمن کو اس کی اصل تعداد سے کہیں کم حضورؐ کو دکھلایا۔ اگر دشمن کی اصل تعداد دکھا دی جاتی تو اس کے دو اثرات ہو سکتے تھے جن کا آیہ مبارکہ درج ذیل ذکر فرماتی ہے:

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾

(سورہ انفال: ۴۳)

''(اے حبیبؐ) جب اللہ سبحانہ نے تمہیں خواب میں دشمن دکھائے تو ان کو کم دکھایا۔ اگر ان کی پوری تعداد دکھا دی جاتی تو مسلمان ڈر جاتے اور اختلافات کا شکار ہو جاتے۔ بے شک اللہ سبحانہ نے تمہیں (ان دونوں حالتوں) سے محفوظ رکھا۔ اللہ سبحانہ دلوں کے حال جاننے والا ہے''

آیہ مجیدہ ان دو اشکال کی طرف، جو دشمن کی تعداد کے کم دکھانے کا موجب تھے اور جس خوف سے مسلمانوں کو محفوظ کیا گیا، اس طرح بیان کرتی ہے:

(الف) لفشلتم یعنی تم سست پڑ جاتے۔

(ب) ولتنازعتم یعنی جنگ کی ابتدا میں ہی آپس میں اختلافات کرنے لگتے''

یہی دو صورتیں تھیں جن کی وجہ سے آنحضرتؐ نے دشمن کی تعداد کو اصلی تعداد سے کم ملاحظہ فرمایا۔

دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں کیفیتوں کی نسبت حضور اکرمؐ سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے دی جا رہی ہے کیونکہ دشمنوں کی کثرت یا قلت کا اثر حضور اکرمؐ پر تو کچھ نہیں تھا البتہ جب وہ اپنا خواب اپنے صحابہ کرامؓ سے بیان فرماتے ہیں اور انہیں دشمن کی اصل تعداد کا پتہ چل جاتا تو لازمی طور پر سامنا کرنے سے ڈرتے اور اس مسئلے میں باہم اختلاف کا شکار ہو جاتے۔ اسی لیے آیہ مجیدہ میں حضورؐ سے خطاب کے موقع پر جملہ شرطیہ ''اذیریکھم اللہ'' اور مسلمانوں کی کیفیت ظاہر کرنے کے لیے جزائے شرط ''لفشلتم والتنازعتم'' کو جمع کے صیغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ خواب میں حضورؐ کو دشمن کی کم تعداد دکھانے کا تعلق مسلمانوں سے متوقع سستی اور اختلاف سے تھا نہ کہ خود حضور اکرمؐ سے۔

پہلی نظر میں دونوں جماعتوں کو ایک دوسری سے کم تعداد میں دکھائی دینا

دوسری غیبی امداد یہ تھی کہ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں اور مشرکوں کے لشکر کو پہلی نگاہ میں دشمن کی اصلی تعداد سے کم دکھایا۔ یہاں تک کہ ابو جہل پکار اُٹھا:

انما اصحاب محمدٍ اکل جزورٍ

''یعنی محمدؐ کے ساتھی تو اونٹ کا صرف ایک نوالہ ہیں''

سوچنے کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو تو کافر کم دکھائے تاکہ وہ خائف نہ ہو جائیں اور ہمت نہ ہار بیٹھیں۔ مگر کافروں کو مسلمان مجاہد اس لیے کم دکھائے کہ وہ مسلمانوں کو کمزور جان کر جنگ میں سنجیدہ نہ ہوں، خوش فہمی میں مبتلا رہیں، زیادہ بے جگری اور دلیری سے نہ لڑیں اور اس جنگ سے جس کا انجام ان کی ذلت آمیز شکست تھی منہ نہ موڑ لیں:

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذۡ يُرِيۡكُمُوۡهُمۡ اِذِ الۡتَقَيۡتُمۡ فِىۡۤ اَعۡيُنِكُمۡ قَلِيۡلًا (سورہ انفال: ۴۴)

''(اے مسلمانو!) وہ وقت یاد کرو جب تمہارے دشمن کو تمہیں کم دکھایا اور تمہیں ان کو کم دکھایا''

یہ اس لیے تھا کہ اللہ سبحانہ چاہتا تھا کہ جنگ ہو اور کفار ذلیل و خوار ہوں۔ اس کا منطقی طریقہ یہ تھا کہ دونوں فوجیں ایک دوسرے کو کمزور اور کم سمجھیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو دونوں یا کوئی ایک فوج لڑے بغیر پلٹ جاتی اور مشیت الٰہی وقوع پذیر نہ ہوتی۔

۳۔ دورانِ جنگ مسلمانوں کو اصل تعداد سے دوگنا دکھایا جانا

جنگ شروع ہوئی۔ پہلے دست بدست لڑائی ہوئی۔ پھر جنگ مغلوبہ ہونے لگی۔ مسلمانوں نے اللہ سبحانہ کی غیبی امداد اور اپنی قوت ایمانی سے دشمن پر کاری وار کیے۔ کفار کی تمام فوج بالکل خائف ہوگئی۔ اس موقع پر ضروری تھا کہ اللہ سبحانہ کی طرف سے مسلمانوں پر اور لطف و کرم ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یکدم کفار محسوس کرنے لگے کہ مسلمان دگنے ہو گئے ہیں۔ اس طرح ان پر نفسیاتی دباؤ بڑھ گیا۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور مقتول و اسیر چھوڑ کر وہ پناہ گاہ ڈھونڈنے کے لیے پیچھے ہٹنے لگے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قَدۡ كَانَ لَكُمۡ اٰيَةٌ فِىۡ فِئَتَيۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَاُخۡرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوۡنَهُمۡ مِّثۡلَيۡهِمۡ رَاۡىَ الۡعَيۡنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّاُولِى الۡاَبۡصَارِ ۝۱۳ (سورہ آل عمران: ۱۳)

''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہونے والی دونوں جماعتوں میں نشانیاں ہیں، ایک فوج اللہ سبحانہ کے لیے لڑ رہی تھی جبکہ دوسری اللہ سبحانہ کے خلاف تھی اور وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو دوگنا دیکھ رہی تھی۔ بے شک اللہ سبحانہ جس کی چاہے مدد کرتا ہے۔ اس واقعہ میں عقل مندوں کے لیے درس عبرت ہے''

''غیبی امداد'' کی یہ قسم ''واخری کافرۃ یرونھم مثلیھم رای العین'' یعنی دوسری فوج کافر تھی اور اپنی کھلی آنکھ سے (مسلمانوں کو) دوگناہ دیکھ رہی تھی'' والے جملے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

یہاں تک ہم امداد غیبی کی ان تین اقسام سے آشنا ہوئے جو غزوہ بدر کے مختلف مراحل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ہم دیگر مراحل پر اقسام امداد الٰہی کا ذکر کرتے ہیں۔

۴۔ مسلمانوں کا استغاثہ اور فرشتوں کا نزول

چوتھی امداد غیبی یہ تھی کہ جنگ بدر کے دوران اچانک مسلمان گھبرا گئے اور کمال سوز و گداز سے بارگاہ رب العزت میں استغاثہ کرنے لگے۔ خود حضور اکرمؐ بھی اللہ تعالیٰ سے طلب نصرت میں ان کے ہم آواز ہوئے اور بارگاہ ایزدی میں اس طرح عرض کی:

اللھم انجزلی ماوعد تنی۔ اللھم ان تھلك ھذہ العصابة لا تعبد فی الارض

''خداوندا! تو نے جو وعدہ مجھ سے کیا ہے اسے پورا فرما۔ اگر یہ چھوٹی سی جماعت قتل ہوگئی تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا''

یہ استغاثہ اس قدر طولانی ہوا کہ آنحضرتؐ کی رواء دوش مبارک سے گر گئی۔ اس موقع پر اللہ سبحانہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ میں ایک ہزار ملائکہ کو تمہاری مدد کو بھیج رہا ہوں، جن کے پیچھے اور فرشتہ بھی آرہے ہیں۔

یہ خوشخبری مندرجہ ذیل آیہ مبارکہ میں آئی:

اِذۡ تَسۡتَغِيۡثُوۡنَ رَبَّكُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَكُمۡ اَنِّىۡ مُمِدُّكُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ مُرۡدِفِيۡنَ۝۹ (سورہ انفال: ۹)

''(مسلمانو!) اس وقت کو یاد کرو جب تم استغاثہ بلند کر رہے تھے تو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے تمہاری درخواست قبول کرتے ہوئے فرمایا میں اُن ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کر رہا ہوں جن کے پیچھے پیچھے اور فرشتہ آرہے ہیں''

اس آیہ مجیدہ میں فرشتوں کی تعداد ایک ہزار بتائی گئی ہے جبکہ سورہ آل عمران میں تین ہزار سے پانچ ہزار تک ہے۔ ملاحظہ ہو:

اِذۡ تَقُوۡلُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَلَنۡ يَّكۡفِيَكُمۡ اَنۡ يُّمِدَّكُمۡ رَبُّكُمۡ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ مُنۡزَلِيۡنَ۝۱۲۴ (سورہ آل عمران: ۱۲۴)

''(اے حبیبؐ!) اس وقت کو یاد کیجیے جب آپؐ مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں کہ اللہ سبحانہ آسمان سے آنے والے تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے''

اسی سورہ کی اگلی آیت میں فرشتوں کی تعداد پانچ ہزار تک بتائی گئی ہے۔

بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿١٢٥﴾ (سورہ آل عمران: ۱۲۵)

''ٹھیک ہے، اگر تم حملہ کے وقت ثابت قدم رہو اور متقی ہو جاؤ اور شکست خوردہ دشمن تیزی سے پیچھے ہٹے تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو مخصوص علامات رکھتے ہوں گے''

ان آیاتِ مبارکہ میں نہ صرف فرشتوں کی تعداد میں فرق بتایا گیا ہے بلکہ ان کی کیفیت میں بھی فرق بتایا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ انفال میں فرمایا گیا ہے۔ بالف من الملئکۃ مردفین یعنی ایک ہزار مردفین فرشتے اور سورہ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے۔ بثلاثہ من الملائکۃ منزلین' یعنی تین ہزار منزلین فرشتے۔ غور کرنے سے ظاہری الفاظ کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ لفظ مردفین مادہ روف سے ہے جس کا مفرد ''مردف'' ہے اور اس کے معنی ''فوری پیچھے آنے والا ہیں۔[1] اس معنی کو ذہن میں رکھ کر مطلب نکالیں تو یوں بنتا ہے کہ یہ ایک ہزار فرشتے جن کے فوراً بعد اور بھی آرہے ہیں۔ اب سورہ آل عمران کو جہاں تین ہزار فرشتوں کا ذکر ہے، اس سے ملا کر پڑھیں تو مطلب صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ایک ہزار پہلے آنے والے اور دو ہزار بعد میں آنے والے کل تین ہزار فرشتے ہو گئے۔

اس موقع پر ایک اور احتمال بھی ظاہری لفظوں کا اختلاف ختم کر دیتا ہے۔ وہ یہ کہ جس آیہ مجیدہ میں تین ہزار فرشتوں کا ذکر ہے وہ دراصل مسلمانوں کے ساتھ حضور اکرمؐ کی گفتگو ہے۔ خود آیہ مجیدہ بھی آپؐ کے اس قول کو نقل کر رہی ہے۔ اذ تقول للمو منین الن یکفیکم ان یمد کم ربکم بثلاثۃ الاف من الملائکۃ منزلین یعنی (اے حبیبؐ) یاد کیجیے جب آپؐ مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار آسمان سے اترنے والے تین ہزار فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے جبکہ پہلی آیہ مجیدہ خود اللہ سبحانہ کا قول بتا رہی ہے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے رسولؐ کی دعا قبول فرمالی ہے اور فوراً ایک ہزار فرشتے بھیج دیئے جبکہ باقی دو ہزار تیار کھڑے تھے۔

جہاں تک پانچ ہزار فرشتوں والی آیہ مجیدہ کا تعلق ہے یہ جنگ بدر کے بارے میں نہیں بلکہ یہ صرف مسلمانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ اگر دشمن کا مقابلہ ثابت قدمی اور صبر کے ساتھ کریں اور ساتھ ہی ساتھ متقی بھی رہیں تو پانچ ہزار تک مسلح فرشتے مدد کے لیے آسکتے ہیں۔

مدد کو آنے والے فرشتے میدان جنگ میں نہیں آئے

قرآن مجید نے دو سورتوں میں بیان فرمایا ہے کہ فرشتوں کا آنا صرف مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور اطمینان قلب کے لیے تھا، ورنہ فتح اور کافروں پر غلبہ تو اللہ سبحانہ کی طرف سے تھا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ

---

[1] مفرداتِ راغب، ماد، روف

اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ (سورہ انفال: ۱۰)

''اللہ سبحانہ نے (فرشتوں کے نزول کو) صرف مسلمانوں کے لیے بشارت اور اطمینان قلب قرار دیا تھا وگرنہ فتح و ظفر تو اللہ سبحانہ کی طرف سے ہے اور اللہ سبحانہ قوی و دانائے حال ہے''۔

تقریباً یہی مضمون سورہ آل عمران کی آیہ ۱۲۶ میں بھی ہے۔

۵۔ مسلمانوں کو گہری اور میٹھی نیند سلا دینا

جنگ بدر کی رات مسلمانوں کو ایک اور غیبی امداد یہ حاصل ہوئی کہ ان کو رات بھر خوب گہری اور میٹھی نیند آئی۔ یہ نیند ایک طرف تو دشمنوں اور ان کے درمیان ایک پردہ بن گئی، دوسری طرف جسمانی طور پر وہ ترو تازہ ہو گئے اور سفر کی تمام تھکن وغیرہ دور ہو گئی۔ یہ نیند بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت تھی جس نے ان کو قوت بخشی۔ یہ نیند ایسی نہ تھی کہ ان کو اگلے روز سست یا غافل کر دیتی۔

٦۔ بارانِ رحمت کا نزول

اسی رات بارانِ رحمت نازل ہوئی جس سے مسلمانوں کو یہ فوائد حاصل ہوئے:

۱۔ مسلمان بارش میں نہا کر صاف و پاک ہو گئے۔

۲۔ مسلمان غسل کر کے پاک و طاہر ہو گئے (بعض مسلمانوں کو غسل جنابت کی حاجت تھی جو پوری ہو گئی)

۳۔ نفسیاتی طور پر مسلمان بارش سے بلند حوصلہ ہو گئے۔

۴۔ ریگستان کی زمین ریت کی وجہ سے پختہ نہ تھی۔ بارش سے اس میں سختی آ گئی اور مسلمان اس پر پاؤں جما کر کھڑے ہو سکے۔

درج ذیل آیہ مبارکہ میں بارش اور نیند کی دونوں نعمتوں کا ان کے مفید نتائج کے ساتھ ذکر کرتی ہے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰي قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝۱۱ (سورہ انفال: ۱۱)

''(اے مسلمانو!) اس وقت کو یاد کرو جب تم گہری اور میٹھی نیند کی آغوش میں چلے گئے اور آسمان سے اللہ سبحانہ نے بارانِ رحمت نازل فرمائی تا کہ صاف ستھرے اور شیطانی پلیدی سے پاک و صاف ہو جاؤ، تمہارے دل بلند حوصلہ ہو جائیں اور تمہارے قدم جم جائیں''

اس آیۃ مجیدہ میں ''اذیغشیکم النعاس امنة منه یعنی جب تم پر گہری نیند چھا گئی'' والا جملہ پانچویں ''غیبی امداد'' کی

طرف اشارہ کر رہا ہے اور و ینزل علیکم من السمآء مآء یعنی اور آسمان سے بارانِ رحمت برسائی والا جملہ چھٹی امداد کی طرف بعد از اں بارش کے چہار گانہ نتائج کا بیان ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔	لیصھر کم	یعنی صفائی وطہارت
۲۔	و یذھب عنکم رجز الشیطن	یعنی شیطانی نجاست کا ازالہ
۳۔	ولیربط علی قلوبکم	یعنی سکون واطمینان قلب
۴۔	و یثبت بہ الاقدام	یعنی استقامت و پامردی

۷۔فرشتوں کے لیے مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے کا حکم

ساتویں غیبی امداد یہ تھی کہ فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ بدر کے میدان کارزار میں مسلمانوں کو ثابت قدم رکھا جائے اور ان کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لغزش نہ آنے پائے۔ شاید اس سے مراد یہ ہے کہ میدان جنگ میں جب کبھی ان کے قدم لڑکھڑانے لگیں تو ان کو استقامت دی جائے اور گرنے سے بچایا جائے یا یہ کہ ان کے حوصلے بلند رکھے جائیں۔ اسی امداد کا ایک حصہ ہم آٹھویں امداد میں پڑھیں گے۔

۸۔دشمنوں پر رعب کا طاری ہونا

دشمن تعداد میں مسلمانوں سے تقریباً تین گنا تھا اور سرتا پا جدید اسلحے سے لیس تھا۔ وہ اسلامی فوج سے اس قدر خائف ہوا کہ سپاہی ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے سنے گئے: ''یثرب والے ہمارے لیے موت کی سوغات لائے ہیں''

قرآن مجید اس امداد اور پہلی کمک کی طرف اس طرح اشارہ فرماتا ہے:

اِذۡ يُوۡحِىۡ رَبُّكَ اِلَى الۡمَلٰۤـئِكَةِ اَنِّىۡ مَعَكُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا‌ ؕ سَاُلۡقِىۡ فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا الرُّعۡبَ (سورہ انفال: ۱۲)

''(اے حبیبؐ) وہ موقع یاد کیجیے جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں کو حکم دیا کہ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو ثابت قدم رکھیں اور ہم عنقریب کافروں کو مرعوب اور خائف کر دیں گے''

اس آیہ مبارکہ میں ''فثبتوا الذین امنوا یعنی (اے فرشتو!) مسلمانوں کو ثابت قدم رکھو! والا جملہ ساتویں غیبی امداد اور ''سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب یعنی ہم عنقریب کافروں کو مرعوب اور خائف کر دیں گے والا جملہ آٹھویں امداد کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

مذکورہ آیہ مجیدہ کے اختتام پر فرشتوں کو باقاعدہ جنگی حکمت عملی کے تحت ایک خاص طریق کار کی جانب متوجہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر دشمن کے سر اور ہاتھوں پر کاری وار کریں تاکہ ان کی جوابی حملہ کی طاقت ختم ہو جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (انفال:۱۲)

''(اے فرشتو!) پس دشمن کا سر کچل دو اور اس کا ایک ایک جوڑ توڑ ڈالو''

اللہ سبحانہ کی طرف سے مذکورہ بالا امداد اور عنایات کی وجہ سے آدھے دن سے بھی کم وقت میں 'جنگ بدر' مسلمانوں کی شاندار فتح پر منتج ہوئی۔ بہتر مشرک مارے گئے اور اتنے ہی قید کر لیے گئے۔ باقی کفار نہایت ذلت و رسوائی کے ساتھ راہِ فرار اختیار کر کے مکہ کی طرف بھاگ گئے۔

قرآن مجید مشرکین کو اس ذلت آمیز شکست کا مستحق ٹھہراتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (سورہ انفال: ۱۳)

''(یہ رسوا کن شکست اس بات کا نتیجہ ہے کہ) مشرکین اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ دشمنی رکھتے تھے اور جو شخص بھی اللہ سبحانہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی کرے گا (ذلیل و رسوا ہوگا) کیونکہ اللہ سبحانہ ذلت آمیز سزا دینے کی پوری طاقت رکھتا ہے''

قرآن مجید مشرکین مکہ کی متکبرانہ کیفیت بیان فرماتا ہے جب وہ ''جنگ بدر'' کے لیے مکہ سے نکل رہے تھے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (سورہ انفال: ۴۷)

''(اے مسلمانو!) ان لوگوں کی طرح مت بنو جو اپنے وطن سے یہ ارادہ لیے ہوئے نکلے تھے کہ اپنی ہوا و ہوس کی تسکین کریں گے، (مسلمانوں پر) اپنی دھاک بٹھا دیں گے اور مسلمانوں کو اطاعت خدا سے روکیں گے۔ بے شک اللہ سبحانہ ہر شخص کے قول و کردار سے پوری طرح آگاہ ہے''۔

شاید یہ آیہ مجیدہ ابوجہل کی لاف زنی کا جواب ہے جس نے مکہ سے نکلتے ہوئے کہا تھا:

''آؤ 'بدر' کے مقام پر مسلمانوں کو گھیر کر ختم کر دیں پھر جشن فتح یوں منائیں، شراب پییں، ناچیں، گائیں اور جو جی میں آئے کریں۔ اس طرح ہماری طاقت کی ہر جگہ شہرت ہو جائے گی''

روز جنگ بدر، شیطانی وسوسے یا شیطان مجسم

اگر اللہ سبحانہ اپنے مطیع بندوں کی مدد کرتا ہے تو نافرمانوں کا مددگار شیطان اور اس کے چیلے ہوتے ہیں۔ جنگ بدر میں شیاطین نے مشرکین کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ مسلمانوں سے جنگ ان کے حق میں بہتر ہوگی اور یہ کہ دنیا بھر کے شیاطین مسلمانوں کے خلاف ان کی مدد

کریں گے۔قرآن مجید نے یہ واقعہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّىْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ (سورہ انفال: ۴۸)

''(اے حبیبؐ) ذرا وہ منظر تو یاد کرو جب شیطان نے (مشرکین مکہ کے) زعم باطل کو خوب سراہا اور کہا: آج کوئی ہے جو تم سے لڑ سکے جبکہ میں تمہارا مددگار ہوں۔مگر جب میدان کارزار گرم ہو (اور شیطان نے دیکھا کہ مسلمانوں کی مدد تو ملائکہ کر رہے ہیں) تو یہ کہتے ہوئے بھاگ گیا: میں تم سے بیزار ہوں، کیونکہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھتے۔میں اللہ سبحانہ سے ڈرتا ہوں۔بے شک وہ سخت سزا دینے والا ہے''

اب دیکھنا ہے کہ شیطان نے ان کی بداعمالیوں کو کس طرح خوشنما کر کے انہیں دکھایا۔شاید اس میں مندرجہ ذیل دو طریقوں میں سے ایک استعمال کیا گیا ہو:

(الف) ان کے دلوں میں وسوسے پیدا کر کے جنگ کا صرف روشن پہلو ہی ان کی نظروں کے سامنے لایا گیا ہو اور اس سلسلے میں ان کی نفسانی خواہشات کو اس نے ابھارا ہو۔

(ب) انسان کا روپ دھا کر ان میں آ گیا ہو اور ان کو اپنی حمایت کا یقین بھی دلایا ہو۔

آیہ مجیدہ کے ظاہری الفاظ کی دوسری صورت سے زیادہ مطابقت معلوم ہوتی ہے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ شیطان مشرکین سے کیوں الگ ہوا۔اس کی دو وجہیں بتائی گئی ہیں:

۱۔ انی اری مالا ترون یعنی جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ رہے۔

اس سے مراد فرشتے ہیں جو اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیجے تھے۔

۲۔ انی اخاف اللہ واللہ شدید العقاب یعنی میں اللہ سبحانہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ وہ سخت سزا دینے والا ہے۔

اس منزل پر ایک بات سمجھ آتی ہے کہ حق وصداقت کی جدوجہد میں اللہ سبحانہ اور ملائکہ آسمان حق پرستوں کا ساتھ دیتے ہیں جبکہ شیطان اور اس کے پیروار باب باطل کی مدد کرتے اور ان کی پشت پناہی کا وعدہ کرتے ہیں مگر کسی حساس موقع پر ان سے لاتعلق بھی ہو جاتے ہیں۔

مال غنیمت کی تقسیم پر اختلاف

''جنگ بدر'' نصف دن میں ہی ختم ہوگئی۔ جنگ کی آگ بھڑکانے والے ستر آدمی مقتول، ستر قیدی اور کثیر مال غنیمت چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ حضور اکرمؐ نے اپنے چودہ شہداء کو اکٹھا کیا اور بدر کے میدان کے ایک گوشتے میں ان کو دفن کر دیا۔ اس کے بعد نماز عصر ادا فرمائی۔

اللہ سبحانہ اور حضرت رسول اکرمؐ پر ایمان لانے کا تقاضا تو یہ تھ [1] ا کہ صحابہ کرامؓ مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں حضور اکرمؐ کے فیصلے کا احترام کرتے اور اپنے منہ سے کوئی بات نہ نکالتے مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض صحابی تقسیم غنیمت میں آنحضرتؐ کے حکم سے اختلاف کرنے لگے اور ہر جماعت اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ حق دار سمجھنے لگی۔

آنحضرتؐ یعنی قائد کی حفاظت پر مامور سپاہیوں کا کہنا تھا کہ چونکہ حضور اکرمؐ کی حفاظت ان کے ذمہ ہیں لہٰذا انہیں زیادہ حصہ ملنا چاہیے، جو لوگ مال غنیمت اکٹھا کر کے لا رہے تھے وہ بھی یہی دعویٰ کر رہے تھے اور جو بھاگتے ہوئے کفار کے تعاقب میں دور تک نکل گئے تھے، وہ اپنا استحقاق قائم کر رہے تھے۔

جناب طبرسی نے اپنی تفسیر میں عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرمؐ نے مجاہدین کی حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا: [2]

''جو مجاہد فلاں فلاں کام کرے گا یا کسی قیدی کو پکڑ کر لائے گا اس کو اس قدر انعام ملے گا''

یہ سن کر جوانوں میں ایک عجیب توانائی پیدا ہوگئی اور سب کے سب میدانِ کارزار میں کود پڑے۔ مگر بوڑھے حضرات وہیں پرچموں کے نیچے کھڑے رہے۔ جنگ ختم ہوگئی۔ اب جوان مجاہد اپنا اپنا انعام حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ ان کا مقرر کردہ حصہ دے دیا جائے۔ مگر بوڑھے صحابی کہنے لگے کہ وہ حضورؐ کی حفاظت کر رہے تھے جبکہ مال غنیمت جوانوں کو دے دیا گیا۔ اگر شکست ہو جاتی تو وہ ہی آنحضرتؐ کو بچاتے۔ اس موقع پر دو بزرگوں کے درمیان تلخی بھی ہوئی۔ اس صورت حال میں مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں یہ حکم آیا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

(سورہ انفال: ۱)

''(اے حبیبؐ) آپؐ سے غنیمت کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ ''انفال'' اللہ سبحانہ اور اس کے پیغمبرؐ کا حق ہے۔ اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے اپنا دامن بچاؤ، آپس میں صلح و آشتی قائم کرو اور اللہ سبحانہ اور اس

---

[1] جیسا کہ سورۂ حجرات آیہ ا میں ارشاد ہوتا ہے: یا یھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ و رسولہ، یعنی اے مسلمانو! اللہ ورسولؐ سے آگے نہ بڑھو!

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۲، ص ۵۱۸

کے رسولؐ کی اطاعت کرو، اگر تم صاحبان ایمان ہو"

آیہ مجیدہ میں لفظ 'انفال' کا مفہوم

"انفال" نفل کی جمع ہے اور اس کے معنی اضافی اور زائد کے ہیں۔ جب ہم بعض نمازیں واجبات کے علاوہ پڑھتے ہیں تو انہیں بھی "نافلہ" اسی مفہوم کے تحت کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ لفظ عطیہ اور خیرات کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے یہ لفظ دو موقعوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ "انفال" جیسا کہ مذکورہ بالا آیۂ مجیدہ میں آتا ہے، اس موقع پر استعمال ہوا ہے جب اسلامی فوج نے باقاعدہ جنگ کی، آلات جب استعمال کیے پھر جنگ جیتنے کی صورت میں مال و دولت ان کے ہاتھ لگا۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ لفظ "انفال" صرف اسی معنی میں ہی مستعمل نہیں ہوتا۔ جو ہم نے سطور بالا میں بیان کیے ہیں، کیونکہ لفظ "انفال' وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ یہ خاص مفہوم تو ہم نے اس پس منظر کی وجہ سے اخذ کیا ہے جس میں یہ آیۂ مجیدہ نازل ہوئی۔

۲۔ غنیمت کے لیے لفظ "فیئ' بھی استعمال ہوا ہے اور اس سے وہ مال غنیمت مراد ہے جو جنگ کے بغیر اسلامی حکومت کے ہاتھ لگے۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (سورہ حشر:٦)

"اللہ سبحانہ! نے اپنے پیغمبرؐ کو جو کچھ (بنی نضیر سے) عطا کیا اس کے لیے (اے مسلمانو!) نہ تم نے گھوڑے دوڑائے اور نہ ہی اونٹوں کی مہار کھینچی (مگر) اللہ سبحانہ جس کسی پر چاہے اپنے پیغمبروں کو غلبہ عطا فرماتا ہے کیونکہ وہ ہر ایک کام پر قادر ہے"

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا لفظ "انفال" صرف اول لذکر قسم کے لیے مختص نہیں ہے کیونکہ فقہی کتب میں 'انفال دونوں قسموں کے مال غنیمت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ذیل میں ہم امام جعفر صادق سے ایک روایت پیش کرتے ہیں۔

الا نفال ما لم يوجف عليه بخيل ولا ركاب اوقوم صالحوا اوقوم اعطوا بايديهم و كل ارض خربة و بطون الاودية فهو لرسول الله وللا مام من بعده يضعه حيث يشاء [1]

[1] وسائل الشیعہ جلد ٦، کتاب الخمس، باب از ابوابِ انفال حدیث ا، ص ٣٦٤

''انفال وہ علاقے ہیں جو جنگ اور فوج کشی کے بغیر اسلامی حکومت کے ہاتھ آئیں، یا وہ جو کسی ملک سے معاہدہ کے تحت ہاتھ لگیں، یا کوئی ملک انہیں اسلامی حکومت کے حوالے کر دے۔ اسی طرح تمام جنگلات اور بیابان بھی انفال میں شامل ہیں۔ انفال کی یہ تمام مذکورہ اقسام حضور اکرمؐ اور ان کے بعد آنے والے امام برحق کی ذاتی ملکیت ہیں اور وہ جس طرح چاہیں ان کو تصرف میں لائیں''

بہر حال ہم نے واضح کر دیا ہے کہ 'انفال' سے مراد صرف 'غنیمت کا مال' ہے جو اسلامی حکومت کے ہاتھ آئے۔ البتہ قرآئن سے اس کا تعین کبھی تو اس مال پر ہوتا ہے جو جنگ وجدل کے بعد ملے اور کبھی بغیر لڑائی کے۔ چنانچہ مفسرین اور محققین حضرات کو اس طرف توجہ رکھنا چاہیے۔

جنگ بدر کے مال غنیمت کی تقسیم

جنگ بدر کے مال غنیمت کے بارے میں جب مسلمانوں میں اختلاف بڑھنے لگے تو آپؐ نے معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے وقتی طور پر تمام مال غنیمت عبداللہ بن کعبؓ کی تحویل میں دے دیا اور واپسی کا حکم فرمایا۔ راستہ میں مذکورہ بالا آیہ انفال نازل ہوئی تو آپؐ نے اسی منزل میں قیام کے دوران تمام مال برابر برابر تقسیم فرما دیا۔

آپؐ نے مال غنیمت اس طرح تقسیم فرمایا کہ کل مال کا پانچواں حصہ یعنی خمس جو آپؐ اور آپؐ کے اقربا آپ کے خاندان کے یتیم وبینوا ومساکین کے لیے مخصوص تھا وہ بھی مسلمانوں میں تقسیم کر دیا کہ اُن کا حصہ بڑھ جائے۔ ہر پیدل سپاہی کو ایک حصہ سوار کو دو حصے اور آٹھ آدمی جنہوں نے جنگ میں شرکت نہ کی تھی اور جو فرائض کی ادائیگی کے لیے پیچھے چھوڑے گئے تھے ان کو ایک حصہ دیا گیا۔

جنگ میں فتح سے قبل قیدی بنانا

جب جنگ بدر شروع ہوئی تو بعض مسلمانوں نے کافروں کو قتل کرنے کے بجائے ان کو جلدی جلدی قیدی بنانا شروع کر دیا۔ تا کہ اس طرح ان کو جنگ کے بعد زیادہ دنیوی منفعت حاصل ہو کیونکہ ان دنوں قیدی گرانقدر 'فدیہ' دے کر آزاد ہوا کرتے تھے۔

مگر یہ تصویر کا ایک رخ تھا اور دوسرا رخ یہ تھا کہ ''زیادہ فدیہ'' کا لالچ کہیں مسلمانوں کو ان کے اصل مقصد سے غافل نہ کر دے اور غالب آتے ہوئے وہ مغلوب ہی نہ ہو جائیں کیونکہ عین ممکن تھا کہ کسی کافر کو قیدی بناتے، اس کے ہاتھ پاؤں باندھتے، اس کو پچھلی صفوں میں بھیجتے اور بعض فوجیوں کو ان پر نگران مقرر کرتے ہوئے دشمن کو اپنی منتشر قوت مجتمع کرنے کا موقع مل جائے اور جنگ کا پانسہ پلٹ جائے۔

ان حالات کے پیش نظر وحی نازل ہوئی کہ کسی پیغمبر کے لیے یہ درست نہیں کہ اپنے مقام کو مستحکم کرنے اور فتح کامل حاصل کرنے سے قبل دشمن کو قیدی بنانا شروع کر دے۔ تم میں جو مسلمان دشمن کو اسیر کر رہے ہیں وہ دنیوی ہدف کی پیروی کر رہے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آخرت کی سرفرازی چاہتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ

الدُّنۡیَا ۖ وَاللّٰہُ یُرِیۡدُ الۡاٰخِرَۃَ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶۷﴾ (سورہ انفال: ۶۷)

''کسی نبی کا یہ شیوہ نہیں رہا کہ علاقہ پر قابض ہونے سے قبل (دشمن پر مکمل فتح پانے سے قبل) مخالفین کو قیدی بنائے (اے مسلمانو!) تم مال دنیا سمیٹنے کی کوشش کررہے ہو جبکہ اللہ سبحانہ (تمہارے لیے) آخرت کی آسائش چاہتا ہے۔ بے شک اللہ سبحانہ غالب اور صاحب حکمت ہے''

آیۃ مجیدہ میں استعمال شدہ بعض الفاظ کی تشریح

یثخن، ثخن' کے مادہ سے ہے اور اس کے لغوی معنی سخت ہونے کے ہیں۔ عرب یہ لفظ اس مائع کے لیے استعمال کرتے ہیں جو اتنا گاڑھا ہو جائے کہ بہہ نہ سکے۔ اس بنا پر جب یہ لفظ ''فی الارض'' یعنی ''زمین پر'' کے قرینے سے آئے گا تو اس کا مفہوم صاف یہ ہوگا کہ اس علاقہ میں قدم جم جائیں اور دشمن پر مکمل غلبہ حاصل ہو جائے۔ استحکام کی اس حالت کو ''سخت مایع'' سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جنگ میں جب کوئی فریق کامیاب ہو کر قدم جمالے تو بالکل اسی مائع کی طرح ہوتا ہے جو بہنا بند کر کے کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ آیۃ مجیدہ کا مفہوم یہ ہوا کہ جب تک نبیؐ اور ان کے ساتھیوں کی یہ کیفیت نہ ہو جائے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی حالت ناقابل تغیر وتبدل ہو جائے اور وہ پوری طرح مستحکم ہو جائیں، کفار کو قیدی نہ بنائیں!

چنانچہ ''ثخن'' کے لغوی معنی ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''یثخن'' سے مراد صرف حتمی کامیابی ہے نہ کہ زیادہ خون ریزی۔ البتہ بعض اوقات حتمی کامیابی کے لیے دشمن کا مکمل جانی نقصان کرنا پڑتا ہے۔ البتہ جب دشمن پسپا ہو جائے اور شکست تسلیم کرلے تو پھر اس کو قتل کرنے کے بجائے قیدی بنالینا چاہیے۔

مزید برآں آیہ مجیدہ کے بعض دیگر نکات کی تشریح اس طرح ہے:

۱۔ آیۃ مجیدہ کا لہجہ سرزنش آمیز ہے مگر یہ سرزنش ہرگز حضور اکرمؐ کے لیے نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کو سرزنش کی گئی ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

تریدون عرض الدنیا

''یعنی تم (سب) مال دینا چاہتے ہو''

اگر اس میں حضور اکرمؐ بھی شامل ہوتے تو کوئی نہ کوئی حرف عطف ضرور استعمال کیا جاتا۔ جیسا کہ قرآن مجید کی بعض دیگر آیات میں پیغمبر اکرمؐ کو مسلمانوں کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے، مثلاً:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ يَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اُولِىۡ قُرۡبٰى (سورہ توبہ: ۱۱۳)

''پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا کہ مشرکین کی سفارش بارگاہِ الٰہی میں کریں اگرچہ وہ ان کے اقربا ہی کیوں

نہ ہو''

۲۔ آیۃ مجیدہ مشرکین کو حتمی کامیابی سے پہلے ہی قیدی بنانے سے مسلمانوں کو روک رہی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اللہ سبحانہ نے تقریباً ہر نبی کے لیے یہی حکم صادر فرمایا۔ اس کی وجہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ البتہ یہ ممانعت مشرکین یا کفار کو قیدی بناتے یا فدیہ لے کر ان کو آزاد کرنے پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتی کیونکہ قیدیوں کا تبادلہ یا تاوان لے کر ان کو آزاد کرنا ہمیشہ جنگ میں حتمی فیصلے کے بعد ہی عمل میں آیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس آیہ مجیدہ سے یہ مفہوم نکالنا زیادتی ہے۔ یہ آیہ مجیدہ تو دراصل اس مال دنیا کی لالچ وحرص سے منع کر رہی ہے جو جنگ کے نتائج تبدیل کرنے میں موثر ہو، جیسا کہ جنگ اُحد کے دوران ہوا اور مسلمانوں نے جیتی ہوئی جنگ مال غنیمت کے لالچ میں ہار دی۔ جنگ اُحد میں بالکل آیہ مجیدہ میں بیان کردہ خطرات پیش آئے۔ مسلمانوں نے ابتدائی طور پر کفار کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو ان کی حتمی شکست کا انتظار کیے بغیر ہی مال غنیمت جمع کرنے لگے۔ دشمن کو موقع مل گیا، چنانچہ وہ برق رفتاری سے چکر کاٹ کر پیچھے سے حملہ آور ہو گیا اور مسلمانوں کے ستر نمایاں مجاہد شہید ہو گئے۔

۳۔ اس موقع پر ان روایات کی صحت بھی مشکوک نظر آتی ہے جن کے مطابق بعض مسلمان مصنفین نے لکھا ہے کہ اس آیہ مجیدہ میں اللہ سبحانہ کی سرزنش کا رخ تمام مسلمانوں اور خود حضرت رسولؐ اکرم کی طرف ہے۔ البتہ حضرت عمرؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ اس سرزنش سے خارج ہیں کیونکہ انہوں نے قیدیوں کو تاوان لے کر چھوڑنے کے بجائے قتل کرنے کی رائے دی تھی۔ ہم اس کا بطلان اوپر لکھ آئے ہیں کہ ''تریدون'' کا لفظ وضاحت کر رہا ہے یہ سرزنش صرف حضور اکرمؐ کے ساتھیوں کے لیے ہے۔

۴۔ جائے تعجب یہ ہے کہ حضور اکرمؐ کو معتوب خدا اس لیے گردان رہے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے حکم سے پہلے ہی مال غنیمت پر تصرف شروع کر دیا تھا اور قیدیوں سے تاوان لے کر چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ حضور اکرمؐ کا معصوم ہونا اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہر قدم اگرچہ کتنا چھوٹا اور غیر اہم ہی کیوں نہ ہو، اللہ سبحانہ کے حکم سے ہی اٹھائیں۔ اگر ان لوگوں کی بات مان لی جائے۔

تو کیا مندرجہ ذیل آیۃ مجیدہ میں بھی حضور اکرمؐ کو شریک سمجھا جائے گا؟

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾

(سورہ انفال: ۶۸)

''اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قانون نہ ہوتا (یعنی وہ تفصیل احکامات کے بغیر ہی کسی کو مورد عتاب ٹھہرایا کرتا) تو (جنگ بدر میں کافروں کو قیدی بنانے پر، اے مسلمانو!) تمہیں سخت سزا دیتا''

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب پیغمبرؐ سے کبھی اس لہجہ میں بات نہیں کرتا، بلکہ حضور اکرمؐ کے بارے میں فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ (سورہ انفال: ۳۳)

''(اے حبیبؐ) جب تک آپؐ کے درمیان ہیں میں ان پر عذاب نازل نہیں کروں گا''

وہ ذات بابرکات جس کا وجود مسعود دوسروں پر عذاب اور ناراضی خداوند تعالیٰ کے لے مانع بنے، اس کا خود کوئی عمل کس طرح باعث عذاب ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا دوسری آیت سرزنش اور عتاب الٰہی کے حوالے سے پہلی سے بھی زیادہ سخت ہے اور یہ مشرکین کو قیدی بنانے کے بارے میں ہے۔ لفظ ''اخذتم''، یعنی جو تم سب نے قیدی بنائے، شاہد ہے کہ اس سے مراد مسلمان ہیں کیونکہ قیدی تو انہوں نے ہی بنائے تھے۔ حضور اکرمؐ نے اپنے دست مبارک سے تو کوئی قیدی نہیں بنایا تھا۔

جہاں تک تاوان لے کر قیدیوں کو آزاد کرانے کا تعلق ہے تو اس کام میں بے شک حضور اکرمؐ بہ نفس نفیس شریک تھے مگر یہ عمل اس وقت پیش آیا جب جنگ بدر جیتی جا چکی تھی اور مسلمان مدینہ واپس آ چکے تھے۔ چنانچہ ان بے بنیاد روایات کی اصلیت واضح ہوجاتی ہے جن میں حضور اکرمؐ کو موردِ عتاب الٰہی قرار دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں مزید چند نکات پیش خدمت ہیں:

(الف) دونوں آیات میں سرزنش کا تعلق اصحاب پیغمبر ہے نہ کہ خود حضور اکرمؐ سے۔ اگر آپؐ بھی اس حکم میں شامل ہوتے تو یہ آیۃ مجیدہ میں اس بات کے اظہار کے لیے ضروری کوئی نہ کوئی لفظ ہوتا۔

جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ (سورہ توبہ: ۱۱۷)

''اللہ سبحانہ نے حضور اکرمؐ اور مہاجرین و انصار میں سے ان حضرات پر جنہوں نے تنگی وعسرت میں آپؐ کی پیروی کی، رحمت نازل فرمائی''

(ب) تلخی اور تندی جو زیر بحث آیات میں پائی جاتی ہے، اللہ سبحانہ کے ہاں اپنے برگزیدہ پیغمبرؐ کے شایان شان نہیں ہے۔

(ج) ان دونوں آیتوں کا موضوع ''مشرکین کو قیدی بنانا'' ہے، جس کا حضورِ اکرمؐ نے ارادہ تک نہ فرمایا تھا۔ البتہ آپؐ قیدیوں سے تاوان لے کر انہیں آزاد کرنے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ضرور شریک تھے مگر یہ واقعہ میدانِ بدر سے مدینہ پہنچنے کے بعد پیش آیا۔

(د) جن لوگوں نے حضورِ اکرمؐ کی شان کے منافی اس قسم کی احادیث گھڑی ہیں ان کا مقصد شاید بعض دیگر حضرات کی شان بڑھانا ہوگا مگر ان کو یہ خیال نہ آیا کہ اسی طرح خود نبی کریمؐ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہوجائے گی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد قیدیوں کا قتل

انسان کے جذبہ رحم کا خاصہ یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص کو اس کی طرف سے خطرہ ٹل جانے اور جنگ جیت جانے کے بعد قتل نہ کیا جائے، ہر چند کہ وہ میدانِ جنگ میں مسلح ہو کر ہی کیوں نہ آیا ہو۔ چنانچہ مخالفین کو قیدی بنا لینا اسلام اور خود قیدی کے حق میں اچھا ہے کیونکہ بالآخر قیدی یا تو تبادلہ میں یا بلا شرط یا کسی تاوان کے عوض آزاد ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں عقل اور شریعت دونوں کا فیصلہ ایک ہی ہے۔ قرآن مجید بھی یہی ارشاد فرماتا ہے:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (سورہ محمد: ۴)

''(اے مسلمانو!) جب (میدانِ کارزار میں) کافروں سے جنگ کرو تو ان کو خوب قتل کرو۔ مگر جب وہ پسپا ہو جائیں تو ان کو قتل کرنے کے بجائے باندھ لو اور قیدی بنالو۔ بعد میں ان کو یا ممنونِ احسان بنا کر چھوڑ دو یا تاوان لے کر آزاد کر دو''

دنیا کا کوئی قانون اس سے زیادہ انصاف پسند نہیں کہ جب تک دشمن سے خطرہ ہو اس سے چوکنے رہو اور اس کی طاقت کو بڑھنے نہ دو، مگر جب اس کا خطرہ ختم ہو جائے تو پھر یا اس کو اپنا احسان مند بناتے ہوئے چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ یہ عمل اس کو اسلام کی طرف مائل کرے گا اور یا تاوانِ جنگ لے کر اس کو آزاد کر دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے وطن واپس چلا جائے۔

ہمارے رسولِ اکرمؐ نے بدر کے قیدیوں سے ایک اچھوتا سلوک فرمایا جو قیدی پڑھنا لکھنا جانتے تھے ان سے کہا گیا کہ اگر دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں تو آزاد کر دیئے جائیں گے۔[1] جو قیدی اس فن سے ناواقف تھے ان سے کہا گیا کہ تاوان کی رقم ادا کر دیں اور چلے جائیں۔ اس تاوان کی زیادہ سے زیادہ رقم چار ہزار درہم تھی اور کم سے کم ایک ہزار درہم۔ جب یہ خبر ان کے لواحقین تک پہنچی تو انہوں نے رقم کا بندوبست کیا اور اپنے آدمیوں کو چھڑوا کر لے گئے۔

جنگ بدر میں کل بہتر قیدی ہاتھ آئے تھے کچھ تو ان میں سے انصار کے بچوں کو تعلیم دینے کے عوض چھوٹ گئے اور باقی قیدیوں سے تاوان وصول کیا گیا۔ مگر یہ رقم آپؐ کے اس نقصان کے مقابلہ میں بہت کم تھی جو آپؐ کو اپنے چودہ جانثاروں کی شہادت کی صورت میں حاصل ہوا تھا۔

[1] سیرتِ حلبی، ج ۲، ص ۱۹۳

دو قیدیوں کو راستے میں سزائے موت

مذکورہ بالا حقائق کے باوصف یعنی جنگ ختم ہو جانے کے بعد کسی مخالف کو قتل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن بدر سے مدینہ لوٹتے ہوئے حضور اکرمؐ نے حکم فرمایا کہ ''عقبہ بن معیط'' اور ''نضر بن حارث'' دو قیدیوں کو سزائے موت دی جائے۔ یہ دونوں خبیث حد درجہ شریر اور فتنہ پرداز تھے۔ حضورِ اکرمؐ کی بعثت مبارک سے لے کر جنگ بدر میں قید ہو جانے تک انہوں نے مسلمانوں کو اذیت دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا تھا۔ ان دونوں کو چھوڑ دینے کا مطلب نئے سرے سے اسلام کے خلاف فتنہ بپا کرنا تھا۔ یا بالفاظ دیگر ان کو چھوڑ دینا بالکل ایسے ہی تھا جیسے جنگ ختم کرنے سے پہلے مشرکین کو قیدی بنا لینا۔

مختصر یہ کہ حضورِ اکرمؐ کا طرزِ عمل بجائے خود آیہ مجیدہ کی بہترین تفسیر ہے۔ آنحضرتؐ نے ان دو خطرناک قیدیوں کو سزائے موت دے کر گویا یہ درس دیا کہ اس قیدی کو ہرگز رہا نہ کیا جائے جو آزاد ہو کر اسلام کے خلاف شرارت کرے۔ اسے دنیا ہی میں نہیں رہنے دینا چاہیے، یا اگر وہ زندہ ہے تو تاحیات پابند سلاسل رہے۔ ''اثخان'' یا زمانۂ امن سے مراد یہ نہیں کہ وقتی طور پر جنگ کا خطرہ ٹل جائے بلکہ اگر کبھی بھی یا کسی صورت میں بھی امن وامان کے لیے خطرہ ہو اور جب تک دشمن کی طرف سے خطرہ کا مکمل ازالہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ ایسے خطرناک قیدیوں کے ضمن میں بدامنی اور حالت جنگ ہی کی سی کیفیت تصور کی جائے گی۔ چونکہ مذکورہ بالا دونوں خطرناک قیدیوں کی نگرانی کے لیے مدینہ میں کوئی اطمینان بخش قید خانہ نہ تھا، اس لیے ان کی سزائے موت ہی ان کے شر سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔ چنانچہ حضورِ اکرمؐ نے انہیں قتل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

''اثخان'' کے زیادہ وسیع معنی جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں، اس کی تائید جناب قمی کی تشریح سے ہوتی ہے جو انہوں نے اسی آیہ مجیدہ کی شانِ نزول کے ذیل میں بیان فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب آپؐ نے ان دونوں قیدیوں کے قتل کا حکم صادر فرمایا تو انصارِ مدینہ ڈر گئے مبادا کہ باقی قیدی بھی اسی طرح قتل کر دیئے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے بارگاہِ رسالت مآبؐ میں عرض کیا کہ آپؐ باقی قیدیوں کو قتل نہ کرائیں بلکہ تاوان لے کر انہیں چھوڑ دیں۔ بہرحال بعد میں اس سلسلہ میں حکم وحی بھی آ گیا۔

بے شک کافروں کی طرف سے خطرات کے مزد ہو جانے کے بعد قیدیوں سے تاوان کی وصولی اللہ سبحانہ کی وحی کی نظر میں حلال بلکہ طیب تھی۔ اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾

(سورہ انفال: ۶۹)

''تمہیں جو کچھ بھی غنیمت کے عنوان سے میسر آیا ہے، حلال اور پاکیزہ مال سمجھ کر کھاؤ پیو! البتہ اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے دامن بچاؤ اگرچہ وہ رحم کرنے والا، بخشنے والا ہے''

قیدیوں کو اسلام کی دعوت

قریشی قیدی مختلف بہانوں سے آزاد ہو گئے۔ اللہ سبحانہ نے حضور اکرمؐ سے فرمایا کہ جب کسی قیدی کو آزاد کرو تو اس سے دو باتیں ضرور کہو:

۱۔ اگر اسلام کے بارے میں تمہاری نیت مستقبل میں خیر خواہی کی ہو تو جو کچھ تم نے تاوان کے طور پر دیا ہے، اللہ سبحانہ اس سے کہیں زیادہ تمہیں عطا فرمائے گا۔

۲۔ اسی وقت یہ وعدہ کرو کہ اس آزادی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤ گے اور اپنے وطن جا کر پھر سے اسلام کے خلاف سرگرم نہیں ہو گے۔ اگر ایسا کیا تو جیسے اب قید ہوئے ہو پھر بھی گرفتار ہو جاؤ گے۔

یہ صورت حال دو آیات مبارکہ میں وارد ہوئی ہے۔ جہاں فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(سورہ انفال: ۷۰)

''اے پیغمبرؐ تمہارے پاس جو قیدی ہیں ان سے کہہ دیجیے، اگر اللہ سبحانہ کو یہ پتہ چلا کہ تمہاری نیت نیک ہے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ تمہیں ملے گا اور تمہارا قصور بھی معاف فرما دے گا۔ بے شک اللہ سبحانہ بخشنے والا، رحم کھانے والا ہے''

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (سورہ انفال: ۷۱)

''اگر (یہ قیدی) آپؐ سے غداری کریں گے (تو یہ کوئی نئی بات تو نہیں) انہوں نے اللہ سبحانہ سے پہلے ہی غداری کر رکھی ہے (دین اسلام کو چھوڑ کر شرک اختیار کر رکھا ہے) اور اللہ سبحانہ نے آپؐ کو ان پر غالب فرمایا ہے۔ بے شک اللہ سبحانہ جاننے والا، صاحب حکمت ہے''

ان دو آیتوں کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ قیدیوں کو تنبیہ کر دی جائے گی کہ اگر انہوں نے اسلام کے خلاف پھر کوئی حرکت کی تو جس خدا نے اس جنگ میں مسلمانوں کو اتنی طاقت دی ہے کہ انہیں قیدی بنا لیں، آئندہ بھی وہ ان کو قوت دے سکتا ہے اور اگر اسلام لے آئیں تو وہ اللہ سبحانہ کی تمام تر مہربانیوں اور عنایات میں تمام مسلمانوں کی طرح شریک ہوں گے۔ بعد میں نہ کہیں کہ ہمیں اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

پہلی آیہ مجیدہ کا مضمون بعض آزاد شدہ قیدیوں پر صادق آیا۔ وہ ایمان لے آئے اور جو کچھ انہوں نے تاوان کے طور پر ادا کیا تھا

اسے کہیں زیادہ انہیں مل گیا۔ حضورِ اکرمؐ کے چچا حضرت عباسؓ کے بارے میں ہے:

''ایک دفعہ حضوؤ ر اکرمؐ کی خدمت میں بہت سا مالِ غنیمت لایا گیا۔ پاس ہی حضرت عباسؓ بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا:

''چچا جان! اپنی عبا بچھایئے اور اس مال میں سے کچھ لے لیجیے!

جب حضرت عباسؓ اس مال میں سے لے رہے تھے تو حضور اکرمؐ نے یہی آیہ مجیدہ (انفال:۷۰) تلاوت فرمائی۔ [1]

اسی طرح جناب طبرسی لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ بحرین سے آپؐ کے پاس بہت سا مالِ غنیمت آیا۔ آپؐ نماز ظہر کی تیاری فرما رہے تھے۔ آپؐ نے نماز میں تھوڑی سی تاخیر فرمائی اور مال غنیمت کو نماز سے پہلے تقسیم فرمایا۔ اپنے چچا جناب عباسؓ سے فرمایا: ''آپ بھی لیجیے'' انہوں نے کہا: ''میں نے جو کچھ لے لیا ہے، واقعی تاوانِ آزادی سے کہیں زیادہ ہے''۔ [2]

---

[1] تفسیر نور الثقلین۔ جلد ۲، ص ۱۶۸

[2] مجمع البیان جلد ۲، ص ۵۶۰

(۲) جنگ اُحد

جنگ بدر کے بعد مسلمانوں کی دوسری دفاعی جنگ، جنگ احد ہے جو کوہِ احد کے دامن میں لڑی گئی۔ قرآن مجید نے ان دونوں جنگوں کے بارے میں بعض نکات بیان فرمائے ہیں اور تاریخ اسلام نے بھی ان جنگوں کے اسباب، واقعات اور نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی شاندار فتح کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں میں کوئی منافق شامل نہ تھا اور اگر تھا بھی تو اس کا کچھ بس نہ چلتا تھا اور مسلمان بالکل ایک تھے۔ جنگ احد کے موقع پر حالات اور تھے۔ منافقین اور دشمن کا پانچواں ستون مسلمانوں میں ہر جگہ موجود تھا، کیا محاذ پر، کیا کمک و رسد کے مقامات پر۔ وہ اپنا کام پورے شدومد سے کر رہے تھے اور اسلام کے خلاف گہری دسیسہ کاریوں میں مصروف تھے۔ اسی کتاب کی چوتھی جلد (فارسی) میں ہم نے ''جنگ احد'' کے دوران منافقین کی ریشہ دوانیوں پر مفصل بحث کی ہے۔ اختصار کے پیش نظر یہاں اس کا دہرانا مناسب نہیں۔ البتہ یہاں پر دیگر جہات کے حوالے سے قرآن مجید کے نقطہ نظر کے مطابق ہم اس مقدس دفاع پر روشنی ڈالیں گے۔

جنگ بدر میں مشرک قریشیوں کو جو ذلت آمیز شکست ہوئی اور ان کے نامور سربراہوں کی ایک جماعت کا جو عبرتناک انجام ہوا، اس سے ان میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ انہوں نے اگلے ہی سال مسلمانوں سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ چنانچہ انہوں نے اس انتقامی آگ کو مزید بھڑکانے کے لیے مرنے والوں پر ہر قسم کی گریہ وزاری ممنوع قرار دے دی۔ قریشی عوام کو اس مقصد کے لیے آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے۔

ا۔ مالی اخراجات کا انتظام

کسی قسم کا دفاع مال و دولت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ قریش کی خوش قسمتی تھی کہ بدر میں مارے جانے والے قریشی تجارتی قافلہ کا فدیہ سمجھے جانے لگے۔ ''امیہ''، ''ابوجہل'' اور دیگر لوگ جن کے بزرگ جنگ بدر میں مارے گئے تھے، ابوسفیان کے پاس آئے اور کہا کہ چونکہ ہمارے بزرگ تمہارے قافلہ کے دفاع میں مارے گئے ہیں اس لیے اگلی جنگ کے اخراجات تجارتی قافلہ کو ہونے والے منافع سے ادا کریں۔ اس طرح عربوں کے جذبات مسلمانوں کے خلاف زیادہ بھڑکیں گے۔

ابن ہشام اپنی کتاب سیرت میں لکھتا ہے کہ اس موقع پر درج ذیل آیہ مبارکہ نازل ہوئی۔[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ۲ مجمع البیان جلد ۲، ص ۵۴۱

جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ﴿۳۶﴾ (سورہ انفال: ۳۶)

''کافر، لوگوں کو راہ خدا سے ہٹانے کے لیے اپنی توانائیاں خرچ کرتے ہیں مگر اس سے ان کو بعد میں سوائے حسرت و یاس کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ ضرور (پھر) شکست کھائیں گے اور (آخرت میں) کافر جہنم میں جھونک دیے جائیں گے''

جنگی اخراجات کا انتظام ہو جانے سے یہ ہوا کہ قبیلہ 'بنی کنانہ' اور 'تہامہ' والے مشرکین قریش سے مل گئے اور ایک مقررہ دن سب کے سب مل کر انسانوں کا سیل رواں لے کر مدینہ منورہ پر چڑھ دوڑے۔

۲۔ خواتین کو فوج کے ہمراہ لانا

مشرکین کے سردار اور انتقامی جنگ کے محرکین جنگ بدر میں اپنے ساتھیوں کی پسپائی اور ستر ساتھی مروانے کے بعد میدانِ جنگ سے فرار دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس جنگ میں اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے یہ شرط لگائی کہ اکابرین قریش اپنی بیگمات بھی ساتھ لے جائیں گے۔ زمانہ جاہلیت میں عرب کے لیے ناموس کا دشمن کے ہاتھوں قید ہو جانا قطعاً نا قابل برداشت ہوتا تھا۔ تاریخ نے بڑی تفصیل کے ساتھ قریش اکابرین اور ان کی بیگمات کے نام نقل کیے ہیں۔ [1]

۳۔ فن حرب میں مہارت کا لحاظ

اس دفعہ قریش نے اپنی افواج کے افراد کو فن حرب میں مہارت کے مطابق منظم کیا۔ اس جنگ میں ان کی فتح کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ اس جنگ میں انہیں فتح ہوئی اور مسلمانوں کو شکست۔ البتہ مسلمانوں کے لیے یہ شکست بہت مفید ثابت ہوئی کیونکہ انہوں نے اپنی کوتاہیوں کا محاسبہ کیا جس سے ان کو مستقبل میں فائدہ پہنچا۔

قریش نے بارہ شوال ۳ھ کو بروز بدھ مدینہ منورہ سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر اپنا فوجی مستقر قائم کیا۔ حضور اکرمؐ بروز جمعہ مدینہ منورہ سے برآمد ہوئے اور بروز ہفتہ پندرہ شوال کو دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔

مسلمانوں میں اس دفعہ پہلا اختلاف طریقہ دفاع پر پیدا ہوا۔ ایک جماعت جس میں عبداللہ بن ابی پیش پیش تھا، اس بات پر اصرار کر رہی تھی کہ مدینہ منورہ کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے۔ خواتین چھتوں سے دفاع کریں، جب کہ مرد گلی کوچوں میں۔ دوسری جماعت، جس میں حضرت حمزہؓ جیسے بہادر جوان تھے، اس بات پر زور لگا رہے تھے کہ شہر سے باہر جا کر دشمن سے نپٹنا چاہیے آخر کار دوسری جماعت کی بات مان لی گئی۔

---

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ۲، ص ۶۲

قرآن مجید اس موقعہ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ (آل عمران: ۱۲۱)

''(اے حبیبؐ) اس وقت کو یاد کیجیے جب صبح صبح آپؐ شہر سے باہر جنگ کرنے کے لیے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو مختلف مقامات پر دفاع کے لیے مقرر کر رہے تھے''

رئیس المنافقین (عبداللہ بن ابی) کی رائے کو نظر انداز کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ اپنے تین سو خزرجی ساتھیوں سمیت آدھے راستے سے مقام ''بواط'' پر حضور اکرمؐ سے الگ ہو کر واپس مدینہ منورہ آ گیا۔ اس کے واپس چلے جانے کا اثر دوسروں پر بہت برا پڑا۔ چنانچہ قرآن مجید اسی آیۂ مجیدہ میں بیان فرما رہا ہے کہ اس موقع پر دو اور جماعتیں اسلامی فوج سے الگ ہونا چاہتی تھیں۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ (سورہ آل عمران: ۱۲۲)

''(اے حبیبؐ) اس وقت کو یاد کیجیے جب دو گروہوں نے کاہلی اور بزدلی کا مظاہرہ کیا (وہ واپس جانا چاہتے تھے)۔ اللہ سبحانہ ان کا سرپرست ہے۔ البتہ مسلمانوں کو صرف اللہ سبحانہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے''

اس آیہ مجیدہ میں تعجب خیز بات یہ ہے کہ وہ دو جماعتیں تو حضور اکرمؐ کا ساتھ چھوڑ کر واپس جانا چاہ رہی تھیں اور اللہ سبحانہ ان کی سرپرستی کا اعلان فرما رہا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں دراصل منافق نہیں تھے بلکہ ذرا ''ضعیف الایمان'' تھے، اس لیے دشمن کا سامنا کرنے سے کترانے لگے تھے۔

فتح کے بعد شکست

تاریخ کی مصدقہ خبر کے مطابق مسلمانوں کو ابتدا میں دست بدست لڑائی اور جنگ مغلوبہ دونوں میں کامیابی حاصل ہوئی، مگر کیا ہوا کہ یہ فتح شکست میں بدل گئی؟ تاریخ اس کی وجہ یہ بھی بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ حضور اکرمؐ نے اپنی فوج کا مستقر ایسی جگہ قرار دیا تھا کہ عقب میں اُحد کا پہاڑ تھا۔ اس طرح اسلامی فوج کو پیچھے سے ایک قدرتی حفاظت حاصل تھی مگر پہاڑ کے عین درمیان ایک درہ تھا۔ جنگ نقطۂ نگاہ سے اس بات کا احتمال تھا کہ دشمن کہیں پہاڑ کا چکر کاٹ کر اس درے کے راستے مسلمانوں پر حملہ نہ کر دے۔ اس خطرے کے پیش نظر حضورِ اکرمؐ نے پچاس ماہر تیر اندازوں کا ایک دستہ اس درے پر مقرر فرمایا۔ آپؐ نے ان تیر اندازوں کے سالار ''عبداللہ بن جبیر'' کو یہ ہدایات دیں کہ اگر دشمن اس طرف سے حملہ کر دے تو تیر اندازی سے اس کو روکنا اور کسی حالت میں بھی اس طرف سے کسی کو نہ آنے دینا۔ نیز ہدایت فرمائی کہ فتح ہو یا شکست درے سے ہرگز ہٹنے نہ پائیں۔

مگر افسوس! اس تاکیدی حکم کے باوجود جب تیر اندازوں نے مسلمانوں کی فتح اور کفار کی شکست مشاہدہ کی تو یہ کہتے ہوئے کہ اب اس جگہ رکاوٹ کی ضرورت نہیں، وہاں سے نیچے اُتر آئے اور مال غنیمت سمیٹنے کی فکر کرنے لگے۔ ان کا سالار پکارتا رہا کہ حضورِ اکرمؐ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو اور اس اہم مورچے کو نہ چھوڑو، مگر سوائے دس آدمیوں کے باقی سب چلے گئے۔

ہارے ہوئے دشمن نے جب درہ خالی دیکھا تو جلدی جلدی پہاڑ کا چکر کاٹ کر عقب سے پہاڑ کے اس درے پر حملہ کر کے ان دس محافظوں کو شہید کر دیا اور پیچھے سے غافل مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کو اس ناگہانی آفت کی توقع نہ تھی لہٰذا وہ سنبھل نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مسلمان مشرکین کے ہاتھوں درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ قرآن مجید اس واقعہ کو اس طرح خبر دیتا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٢﴾

(سورہ آل عمران: ۱۵۲)

''بے شک اللہ سبحانہ نے (اے مسلمانو!) تم سے کیا ہوا وعدہ (نصرت کا) پورا فرمایا (اسی وجہ سے) تم دشمن کے کشتوں کے پشتے لگاتے رہے۔ (یہ مدد جاری بھی رہی) حتیٰ کہ تم نے (خود) ہمت ہار دی اور (درے میں) جھگڑنے لگے۔ جب تمہاری دلی آرزو (فتح) پوری ہو گئی تو تم نے (ہمارے پیغمبرؐ کی) نافرمانی شروع کر دی۔ (تم میں دو گروہ بن گئے) ایک دنیا طلب ہو گیا اور دوسرا آخرت طلب۔ پھر اللہ سبحانہ نے تمہاری توجہ دشمن سے ہٹا دی تاکہ تمہاری آزمائش ہو۔ (بہر حال) اللہ سبحانہ نے تمہیں معاف کر دیا۔ بے شک اللہ سبحانہ مومنین پر لطف و کرم کیا ہی کرتا ہے''

اس آیہ مجیدہ کے ہر جملہ میں ایک وسیع و عریض مطلب پوشیدہ ہے جس کو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ ولقد صدقکم اللہ وعدہ اذتحسونھم باذنہ

''اللہ سبحانہ نے تم سے کیا ہوا وعدہ پورا فرما دیا جب کہ تم دشمنوں کو قتل کر رہے تھے''

یہ جملہ یہ بتا رہا ہے کہ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے فتح کا وعدہ فرمایا تھا جو جنگ کی ابتدا میں ہی پورا ہو گیا تھا، حالانکہ یہ بات واضح نہیں کہ اس وعدہ فتح کو کب پورا ہونا تھا۔ البتہ مسلمانوں کے ساتھ اللہ سبحانہ کا یہ وعدہ ہوا تھا کہ اگر کافر (جنگ بدر) کے بعد پھر حملہ آور ہوئے تو پانچ ہزار مسلح فرشتے ان کی مدد کو آئیں گے۔ ملاحظہ ہو:

بَلٰٓى ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَيَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ مُسَوِّمِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾ (سورہ آل عمران: ۱۲۵)

''ٹھیک ہے! اگر تم (اے مسلمانو!) ثابت قدم رہے اور اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچے رہے اور کافر پھر تمہارے خلاف اٹھے گرچہ کتنی جلدی ہی کیوں نہ آئیں تمہارا پروردگار پانچ ہزار مسلح فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے گا''

یہ واضح رہے کہ مدد کا وعدہ غیر مشروط نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ دو شرطیں تھیں:

(الف) ان تصبروا تم ثابت قدم رہو

(ب) وتتقوا اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچتے رہو۔

مگر جنگ احد میں درے کے محافظین دونوں شرطوں سے منحرف ہو گئے، نہ ہی انہوں نے ثابت قدمی دکھائی اور نہ ہی حضور اکرمؐ کے اس حکم پر عمل کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو اس مقام کو ترک نہ کریں۔

۲۔ حتیٰ اذا فشلتم و تنازعتم فی الامر

''حتیٰ کہ تم خود ہی ہمت ہار بیٹھے اور پیغمبرؐ کے حکم کے بارے میں باہم جھگڑنے لگے''

آیہ مجیدہ کا یہ جملہ درے پر تعینات محافظوں کی نزاعی گفتگو کو بیان کر رہا ہے۔ان کا سالار حضورِ اکرمؐ کے حکم پر قائم رہنے پر اصرار کرتا رہا جب کہ تیراندازوں کی اکثریت اس کی مخالفت کرتے ہوئے آخر کار درے کو چھوڑ کر چلی گئی۔

امام بخاری رقم طراز ہیں:

حضور اکرمؐ نے درے کے محافظوں سے فرمایا:

''اگر یہ دیکھو کہ آسمانی پرندے ہمیں اچک رہے ہیں تب بھی اپنے مقام کو نہ چھوڑنا۔اسی طرح اگر تم ہمیں فتح یاب دیکھو تب بھی میری اجازت کے بغیر اپنی جگہ سے مت ہلنا'' [۱]

۳۔ ''وعصیتم'' یعنی ''اور تم نے حکم رسولؐ کی نافرمانی کی'' یہ جملہ واضح طور پر مسلمانوں کو تنبیہ کر رہا ہے کہ تم نے پیغمبرؐ کی حکم عدولی کر کے گناہ کیا ہے جس سے مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔

۴۔ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ

''تم میں سے کچھ لوگ دنیا طلب ہو گئے جب کہ دوسرے آخرت طلب کر رہے تھے''۔(آل عمران: ۱۵۲)

---

[۱] تاریخ الخمیس جلد ۱ ص ۴۲۳

یہ جملہ درے میں موجود محافظوں کے مختلف نظریات کو بیان کررہا ہے۔ دنیا طلب وہ تھے جنہوں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں درے کو چھوڑ دیا اور نیچے آ گئے جب کہ آخرت طلب وہیں رہے۔ انہوں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک دشمن کی مزاحمت میں بہا دیا اور جامِ شہادت نوش کیا۔

۵۔ ثم صرفکم عنھم یعنی ''پھر اللہ سبحانہ نے تمہاری توجہ دشمن سے ہٹا دی''

یہ جملہ مسلمانوں کی دشمنوں سے غفلت اور مالِ غنیمت کی طرف توجہ کو بیان کررہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس غفلت کو اللہ سبحانہ نے خود اپنے ساتھ کیوں منسوب کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے اسی کے تعین کردہ قوانین کے تحت ہوتا ہے اگرچہ مقدمات اور اسباب خود انسان کے فراہم کردہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس طرح کے جملے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:

'فلمازاغوا اذاغ اللہ قلوبھم یعنی جب انہوں نے حق سے منہ پھیرا تو پھر اللہ سبحانہ نے بھی ان کو منحرف کر ہی دیا''۔

(صف:۵)

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے:

ثم انصرفوا صرف الہ قلوبھم یعنی جب وہ حق سے روگردان ہو گئے تو اللہ سبحانہ نے ان کو حق سے پھیر دیا'' (توبہ:۱۲۷)

۶۔ لیبتلیکم تاکہ تمہاری آزمائش کی جائے''

یہ جملہ کافروں کے ناگہانی حملے کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ جب کہ مسلمانوں پر کافر ٹوٹ پڑے تو پھر مخلص اور دنیا پرست مسلمانوں کے درمیان تمیز کرنا آسان ہو گیا۔

۷۔ ''ولقد عفاعنکم واللہ ذو فضل علی المومنین

''یعنی پھر اللہ سبحانہ نے تم کو معاف کر دیا۔ بے شک اللہ سبحانہ اپنا لطف وکرم مومنین کے شامل حال رکھتا ہے''

یہ جملہ اللہ سبحانہ کے کرم اور بے پایاں فیض رسانی کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ اس قدر بے قاعدہ اور بے ترتیب بندوں پر بھی عفو وکرم کی بارشیں برساتا ہے حالانکہ ان لوگوں کا محاسبہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر چونکہ اللہ سبحانہ کا عفو وکرم اس کے غیظ وغضب پر غالب ہے، لہٰذا ان لوگوں پر بخشش وکرم کی رحمت کی گئی۔

اسلامی فوج کی گھبراہٹ

خالد بن ولید کی سرکردگی میں دشمن کے چار سو افراد ان مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے جو اپنے ہتھیار ایک طرف رکھ کر میدانِ جنگ سے مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول تھے۔ مسلمان اس اچانک حملے سے بوکھلا اٹھے۔ تمام فوج میں گھبراہٹ وسراسیمگی پھیل گئی۔ فوجی نظم وضبط جاتا رہا اور ہر شخص خوف زدہ وسہما ہوا نظر آنے لگا۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ ادھر اُدھر بھاگ کر جہاں پناہ ملے چھپ جائیں۔ مسلمان فوجیوں کی ایک کثیر تعداد پہاڑ پر چڑھ کر میدانِ کارزار سے نکل گئی، جب کہ ایک بڑی تعداد دشمن کی تلواروں کا نشانہ بن گئی۔

حضور اکرمؐ کے گرد دفاعی گھیرا ہر لحظہ سکڑنے لگا یہاں تک کہ آپؐ کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ سوائے معدودے چند مسلمانوں کے جو حضورِ اکرمؐ کا دفاع کر رہے تھے، سب کے سب یا تو بھاگنے کی فکر میں تھے یا انہیں خود اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ حضور اکرمؐ بلند آواز سے پکار رہے تھے:

الی عباد اللہ الی عباد اللہ فانی رسول اللہ

''اللہ کے بندو! (کہاں بھاگتے ہو) میری طرف آؤ! میں اللہ سبحانہ کا پیغمبرؐ ہوں''

مگر حضورؐ کا استغاثہ گویا ان کے کان سنتے ہی نہ تھے۔ غم واندوہ کے گھٹا ٹوپ بادل ان کے دلوں پر چھائے جا رہے تھے۔ (شکست کا غم، اپنے عزیزوں کے بچھڑنے کا غم اور اس افواہ کی پریشانی کی حضورؐ شہید ہو گئے) اس پریشانی میں وہ مالِ غنیمت اور اپنا بچ نکلنا بھی بھول گئے۔ قرآن مجید نے ان کے خوف وہراس اور پریشانی کی اس طرح تصویر کشی کی ہے:

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴿۱۵۳﴾ (سورہ آل عمران: ۱۵۳)

''(اے مسلمانو!) اس وقت کو یاد کرو جب تم پہاڑ پر چڑھتے ہی چلے جا رہے تھے اور اپنے سوا کسی اور کا تمہیں ذرا دھیان نہیں تھا۔ پیغمبر اکرمؐ بھی تمہیں پیچھے سے آوازیں دے رہے تھے (مگر تم تھے کہ سنتے ہی نہ تھے) اس کے بعد تم پر پریشانی پر پریشانی چھانے لگی تا کہ تم مالِ غنیمت کے چھن جانے اور دیگر جنگی پریشانیوں کو بھول جاؤ۔ بے شک اللہ سبحانہ تمہاری کارکردگی سے خوب واقف ہے''

اگر اس آیہ مجیدہ کے جملوں پر غور کریں تو مسلمانوں کو جنگ اُحد میں پیش آنے والے مسلسل پریشان کن حوادث کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ذیل میں بعض نکات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

۱۔ ''اذ تصعدون ولا تلون علی احدٍ یعنی جب تم کسی اور کا فکر کیے بغیر پہاڑ پر چڑھے چلے جا رہے تھے''۔
یہ جملہ اکثر مسلمان سپاہیوں کے میدانِ جنگ سے بھاگ جانے کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

۲۔ ''والرسول یدعو کم فی اخرا کم'' یعنی جب کہ پیغمبرِ اکرمؐ تم میں سے ہر ایک کو پکار پکار کر بلا رہے تھے''
یہ جملہ بتلا رہا ہے کہ حضور اکرمؐ بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو پکارتے رہے مگر کسی نے جواب نہ دیا''

۳۔ ''فاثابکم غما بغمٍ یعنی پھر تم پر یکے بعد دیگرے کئی پریشانیاں چھا گئیں''
یہ جملہ بھاگ جانے والے مسلمانوں کے ذہنی کرب واندوہ کا ذکر کر رہا ہے۔

۴۔ ''لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم و لا ماآ اصابکم'' یعنی تا کہ تم مالِ کثیر کے چھن جانے اور کافروں کے حملوں کی

پریشانی کو بھول جاؤ''

یہ جملہ بتا رہا ہے کہ بھاگ جانے والے مسلمان میدانِ جنگ میں رہ کر کافروں سے مقابلہ کرنے والے مسلمانوں سے کہیں زیادہ پریشان ہوئے اور مال غنیمت سے محرومی یا اپنا زخمی ہونا تو گویا کہ ان پریشانیوں کے مقابلہ میں کوئی قابلِ ذکر بات ہی نہیں تھی۔

اگلی آیہ مجیدہ میں قرآن مجید حضورِ اکرمؐ کے بعض صحابہ کرامؓ کے بارے میں ایک خاص پیرائے میں ذکر کر کے کئی حقائق کی نقاب کشائی فرما رہا ہے:

ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغۡشٰى طَآٮِٕفَةً مِّنۡكُمۡ‌ۙ وَطَآٮِٕفَةٌ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ يَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ غَيۡرَ الۡحَـقِّ ظَنَّ الۡجَـاهِلِيَّةِ‌ؕ يَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَىۡءٍ‌ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ‌ؕ يُخۡفُوۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ مَّا لَا يُبۡدُوۡنَ لَكَ‌ؕ يَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ كَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا هٰهُنَا ‌ؕ قُلۡ لَّوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ لَبَرَزَ الَّذِيۡنَ كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمۡ‌ۚ وَلِيَبۡتَلِىَ اللّٰهُ مَا فِىۡ صُدُوۡرِكُمۡ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۵۴﴾ (سورہ آل عمران: ۱۵۴)

''(جنگ احد کے سانحہ کے بعد) اللہ سبحانہ نے رات کو تم پر پُرسکون نیند طاری کر دی۔ مگر صرف ایک گروہ ہی اس سے لطف اندوز ہو سکا جب کہ دوسرا گروہ نہ سویا، رات بھر انہیں اپنی جان کی فکر رہی اور اللہ سبحانہ کے بارے میں وہ زمانۂ جاہلیت کی سی بدگمانیاں کرتے ہوئے کہتے رہے: ''ہمارے اختیار میں خاک ہے؟ اگر ہمارے اختیار میں کچھ ہوتا تو ہم یوں کافروں کی تلواروں کی زد میں نہ آتے'' (اے حبیبؐ) ان سے کہہ دیجیے تمام اختیارات اللہ سبحانہ کے پاس ہیں۔ تمہارے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ! اگر تم اپنے گھر میں رہتے تو راہ خدا میں شہید ہونے والے بڑھ بڑھ کر میدانِ کارزار کی طرف لپکتے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ سبحانہ تمہیں آزمائے اور تمہارے ایمان کو خالص کر دے۔ بے شک اللہ سبحانہ دلوں کے راز جاننے والا ہے''

اس آیہ مجیدہ میں بھی کئی نکات وضاحت طلب ہیں جن کو ہم مختصراً بیان کرتے ہیں:

۱۔ ''ثم انزل علیکم من بعد الغم امنۃ نعاسا یعنی پھر اللہ سبحانہ نے تم پر میٹھی نیند طاری کر دی''

یہ جملہ جنگ کے بعد آنے والی رات کی تصویر کشی کر رہا ہے جو بڑی خوفناک اور تکلیف دہ رات تھی، تکلیف وہ اس لیے کہ اکثر مسلمان زخمی تھے اور خوفناک اس لیے کہ مسلمان ڈر رہے تھے کہ کہیں دشمن پھر نہ آ دھمکے اور ان پر پھر حملہ نہ کر دے۔ اس صورت حال میں حضور

اکرمؐ کے صحابہ کرامؓ دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ وہ کامل الایمان صحابہؓ جو آج کی اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے اور پشیمان ہو کر بارگاہِ رب العزت میں تائب ہو چکے تھے، میٹھی نیند سو گئے، کیونکہ وہ اللہ سبحانہ کے لطف وکرم پر یقین رکھتے تھے۔ اور آیہ مجیدہ کے اگلے جملے "یغشی طائفة منکم یعنی تم میں سے ایک گروہ پر نیند طاری ہوئی کا مصداق بنے۔ دوسری جماعت ضعیف الایمان یا ایمان سے بالکل عاری لوگوں کی تھی جو دشمن کے پلٹ آنے کے خوف سے جاگ رہی تھی اور اللہ سبحانہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کر رہی تھی۔

۲۔ قد اھمتھم انفسھم یعنی ان کے نفس ان کو ہراساں کر رہے تھے"

یہ جملہ ضعیف الایمان جماعت کی پہلی کیفیت بیان کر رہا ہے کہ انہیں صرف اپنی جان کی پریشانی تھی اور دین مقدس اسلام اور حضورِ اکرمؐ کی کوئی فکر نہ تھی۔

۳۔ "یظنون باالله غیر الحق ظن الجاھلیة یعنی زمانۂ جاہلیت کے طرزِ فکر کی طرح اللہ سبحانہ کے بارے میں بے جا بدگمانیاں کر رہے تھے۔ شکست کو بھول کر نصرت خداوندی کے منتظر تھے۔ ایسی فکر رکھنے والے ایمان سے بالکل عاری تھے۔

۴۔ "یقولون ھل لنا من الامر من شیئٍ" یعنی ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں، ہمارے بس میں کیا ہے؟"

کیا اس شکست کے بعد پھر ہمیں فتح نصیب ہوگی؟ کیا ہم پھر کبھی بھی کامیابی حاصل کر سکیں گے؟

اللہ سبحانہ اس کے جواب میں فرماتا ہے: "قل ان الامر کله لله یعنی (کہہ دیجیے) فتح صرف اللہ سبحانہ، ہی کے اختیار میں ہے کیونکہ حقیقی صاحب اختیار وہی ہے، بشرطیکہ اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو اور اس کے فرمودہ وسائل میں سے ایک حفظ انضباط ہے جس کو افسوس کہ تم نے ہاتھ سے دے دیا۔

۵۔ "یخفون فی انفسھم ما لا یبدون لك یعنی یہ اپنے دلوں پر جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس سے آپؐ کو آگاہ نہیں کرتے"

اس جملہ سے یہ مراد لیا جا سکتا ہے کہ دل میں یہ دین مقدس اسلام کی حقانیت پر شک کر رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اگر اسلام حق ہوتا تو ہم شکست سے دوچار نہ ہوتے۔

۶۔ "یقولون لو کان لنا من الامر شیئٍ ما قتلنا ھھنا یعنی وہ (ایک دوسرے کو) یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی گئی ہوتی تو اتنے لوگ قتل نہ ہوتے۔

یہ جملہ خاصا مبہم ہے اور واضح نہیں کہ "من الامر شیئٔ" سے کیا مراد ہے؟ ایک احتمال یہ ہے کہ اگر ہمارا دین برحق ہوتا تو ہم مارے نہ جاتے یعنی شکست اور ساتھیوں کے قتل ہو جانے کو اسلام کے حق نہ ہونے کی دلیل بنا رہے تھے۔ یا یہ کہ اگر ہماری بات یعنی یہ کہ مدینہ کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے، مان لی جاتی تو یہ حال نہ ہوتا۔

بہر حال کچھ بھی مراد ہو اللہ سبحانہ جواباً فرماتا ہے کہ موت برحق ہے جس سے فرار ممکن نہیں ہے اس لیے میدانِ کارزار میں جامِ شہادت نوش کرنا نہ دین کے باطل ہونے کی دلیل ہے اور نہ غلط فیصلے کی۔

۷۔ "قل لو کنتم فی بیو تکم لبر ز الذین کتب علیھم اقتل الی مضا جعھم یعنی اگر تم اپنے گھروں ہی میں رہتے

تب بھی جامِ شہادت جن کا مقدر تھا وہ بڑھ بڑھ کر میدانِ کارزار میں آ جاتے''

یہ جملہ بھی واضح نہیں ہے۔ ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو کہ اگر تم اپنے گھروں پر ہی رہتے تو ہمیں کوئی فرق نہ پڑتا، سچے مسلمانوں ہماری نافرمانی نہ کرتے، میدانِ کارزار میں جاتے، جنگ کرتے، دشمنوں کو مارتے اور خود شہید بھی ہو جاتے! مگر یہ مفہوم پہلے جملے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، ہر چند صاحب تفسیر مجمع البیان جناب طبرسی مرحوم نے اس مفہوم پر زور دیا ہے۔

دوسرا مطلب اس سے یہ لیا جا سکتا ہے کہ اگر تم اپنے گھروں پر ہی رہتے تو جن افراد کو موت آ چکی تھی وہ میدانِ کارزار کے بجائے گھروں پر اپنے بستروں ہی میں مرجائے۔ بقول سید الشہداء حضرت امام حسینؑ **لا محیص عما خط بالقلم یعنی قلم قضاء** نے جو انسان کے لیے لکھ دیا ہے، اس سے مفر نہیں''

یہ صحیح ہے کہ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور انہیں بڑی کٹھن تکالیف اٹھانا پڑیں مگر اس سے فائدہ بھی بہت ہوا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں میں جو کچھ تھا وہ ان کی زبانوں پر آ گیا اور یوں مومن اور منافق میں تمیز ہو گئی۔ چنانچہ اگلے جملے میں ارشاد ہوتا ہے:

''**ولیبتلی اللہ ما فی صدور کم ولیمحص ما فی قلو بکم** یعنی جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ سبحانہ اُسے آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے خالص بنائے۔

اگرچہ اللہ سبحانہ آزمائش سے پہلے ہی ہم میں سے ہر ایک کی کارکردگی سے آگاہ ہوتا ہے اور اُسے کسی حقیقت کی آگاہی کے لیے کسی تدریجی عمل کی ضرورت نہیں ہوا کرتی یہ تو صرف خود ہمیں بتانے کے لیے ہے کہ ہم کس مقام پر ہیں۔ آزمائشیں تو ہوتی ہی ہیں جیسا کہ اس جملے میں واضح کیا گیا اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے علم کی حدود کا تعلق ہے، وہ فرماتا ہے:

واللہ علیمٌ بذات الصدور

دورانِ جنگ بے بنیاد شور و غوغا کسی فوج کے حوصلے پست کرنے کا ایک پرانا اور آزمودہ طریقہ ہے۔ چنانچہ جنگ اُحد میں مشرکین نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور افواہ اڑا دی کہ (معاذ اللہ) حضورِ اکرمؐ شہید ہو گئے۔ اس افواہ کا اثر یہ ہوا کہ بعض ضعیف الاعتقاد مسلمان دوبارہ بت پرستی کو اپنانے کا سوچنے لگے۔ جس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے: ''**انقلبتم علی اعقابکم** یعنی کیا تم (بت پرستی) کی طرف دوبارہ پلٹ جاؤ گے؟ بعض لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مدینہ کی طرف بھاگے۔ البتہ ایک جماعت اپنے موقف پر قائم رہی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تو افواہ ہے۔ بالفرض یہ حقیقت بھی ہو تو حضورِ اکرمؐ کا خدا تو زندۂ جاوید ہے اور ہماری ذمہ داریاں اپنے مقام پر موجود ہیں، یعنی ہمیں مشرکین کے خلاف مصروفِ پیکار رہنا چاہیے! قرآن مجید نے اس واقعے کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـئًا ؕ

وَسَيَجۡزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ﴿۱۴۴﴾ (سورہ آل عمران: ۱۴۴)

''محمدؐ! پہلے رسولوں کی طرح ایک پیغمبرؐ ہی تو ہیں۔ کیا اگر وہ وصال پا جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو تم واپس (بت پرستی کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ اور جو پھر (بت پرستی) اختیار کرے گا، اللہ سبحانہ کا کیا بگاڑے گا، البتہ اللہ سبحانہ شکر گزار بندوں کو جزا ضرور دے گا''

شہدائے اُحد کے اجساد کا مثلہ

جب اکثر مسلمان میدانِ جنگ سے تتر بتر ہو گئے تو امیر معاویہ کی والدہ ابوسفیان کی بیوی اور عتبہ کی بیٹی ''ہندہ'' اپنی کچھ ساتھی خواتین کے ساتھ میدان میں آئی۔ اس نے بربریت کی انتہا کر دی۔ شہداء کے کان، ناک اور دیگر اعضاء کاٹ کاٹ کر ہار اور پازیبیں بنائیں۔ ہندہ نے اپنے گلے کا طلائی ہار اور طلائی گوشوارے حضرت حمزہؓ کے قاتل ''وحشی'' کو بخش دیئے اور اپنے گلے میں ان کے اعضاء بریدہ کا ہار ڈال لیا۔ اس پر بھی بس نہ کی بلکہ ان کا شکم چاک کر کے کلیجہ نکالا اور کچا چبا گئی مگر نگل نہ سکی اور مجبوراً اگلنا پڑا۔ اس کے بعد ایک بڑے سے پتھر پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کے خلاف رجز پڑھنے لگی۔ [1]

جب جنگ کے شعلے ٹھنڈے پڑ گئے تو حضور اکرمؐ نے میدانِ جنگ کا چکر لگایا اور شہداء کے اجساد اطہر کا مشاہدہ فرمایا۔ جب آپؐ کی نگاہ حضرت حمزہؓ کے جسد بریدہ و دریدہ پر پڑی تو آپؐ کی آہ نکل گئی اور آپؐ بہت رنجیدہ ہوئے۔ جب آپؐ کے ساتھیوں نے آپؐ کی ملول اور رنجیدہ کیفیت دیکھی تو فرطِ محبت سے بول اُٹھے: ''اگر ہمیں اللہ سبحانہ نے مشرکین پر فتح دی تو ہم ان کے مقتولین کا ایسا مثلہ کریں گے کہ ان کی نسلیں یاد رکھیں گی''۔ اسی اثنا میں وحی کے آثار نمودار ہوئے اور یہ آیات نازل ہوئیں:

وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ‌ ؕ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ﴿۱۲۶﴾ وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ‌ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ﴿۱۲۷﴾ (سورہ نحل: ۱۲۶۔ ۱۲۷)

''اگر (مشرکین) نے اپنی عداوت کا مظاہرہ اس بربریت سے کیا ہے تو (اے مسلمانو!) تم صرف انہیں اتنی سزا دو جتنا ان کا جرم ہے البتہ اگر صبر و تحمل سے کام لو تو یہ تو بڑی اعلیٰ اور مفید بات ہے۔ (اے حبیبؐ) آپ صبر کریں اور آپؐ کے صبر کی جزا اللہ سبحانہ ہی چکا سکتا ہے۔ آپؐ (مشرکین کے رویہ سے) اتنے پریشان نہ ہوں اور ان کی مکاری کا آپؐ اتنا اثر قبول نہ کریں''

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۳، ص ۳۹۳

دشمن کا تعاقب

۳ھ سولہ ماہِ شوال کی شب بڑی کربناک اور ہولناک تھی۔ ساری رات آہوں اور کراہوں میں گزری، بیواؤں کے نالے ایک طرف اور دوسری طرف زخمیوں کی آہیں اور آنسو! رات بھر کسی کو نیند نصیب نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں دشمن کے تازہ دم حملے کا ہر آن خطرہ سر پر تھا۔ ان سب عوامل نے مدینے کی فضا کو سوگوار اور اُداس بنا دیا تھا۔

پست حوصلہ مسلمانوں کی ہمت بندھانے اور مشرکین کو مرعوب کرنے کے لیے حضور اکرمؐ نے اگلی صبح بروز یکشنبہ حکم دیا کہ مدینہ میں منادی کرا دی جائے کہ جن لوگوں نے کل دشمن کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا دشمن کے تعاقب میں مدینہ سے روانگی کے لیے تیار ہو جائیں لیکن جن لوگوں نے جہاد کی مخالفت کی تھی وہ اس لشکر میں شرکت کا حق نہیں رکھتے۔ تھوڑی دیر میں تھکے ماندے زخمی مجاہدین کا لشکر حضور اکرمؐ کے گرد جمع ہو گیا۔ حضورؐ انہیں لے کر مدینہ منورہ سے باہر تشریف لائے اور مدینہ سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ''حمرا الاسد'' کے مقام تک تشریف لے گئے۔ آپؐ نے مدینہ میں ابن اُم مکتوب کو اپنا جانشین چھوڑا اور خود اپنے مجاہدین ساتھیوں تین دن (دوشنبہ، سہ شنبہ اور چہارشنبہ) اس مقام پر قیام فرمایا۔ جب آپؐ کو دشمن کے مکہ واپس ہو جانے کی اطلاع ملی تو آپؐ بھی مجاہدین کے ہمراہ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

ابوسفیان کا پکا ارادہ تھا کہ جنگ اُحد کے فوراً بعد مسلمانوں پر ایک اور بھرپور حملہ کیا جائے مگر خارجی اور داخلی عوامل نے اسے اس حملہ سے باز رکھا۔ خارجی عوامل سے مراد معبد خزاعی کا خوف تھا۔ وہ اس طرح کی معبد خزاعی اگرچہ مدینہ کا ایک مشرک تھا تاہم اس کا قبیلہ خزاعہ، پیغمبر اکرمؐ سے اچھے روابط رکھتا تھا اور حضور اکرمؐ کا مورِد اعتماد بھی تھا۔ وہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے حمرا الاسد کے مقام پر آنحضرتؐ کو ملا۔ آنحضرتؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی خستہ حالی اور پریشانی دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا۔ حضورِ اکرمؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مسلمانوں کی یہ حالت مجھ پر بڑی گراں ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپؐ کو شفا عطا فرمائے۔ یہ کہہ کر وہ مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مقام روحا پر وہ ابوسفیان سے ملا اور دیکھا کہ ابوسفیان مدینہ پر پلٹ کر حملہ کرنا چاہتا ہے تا کہ مسلمانوں پر ایک اور کاری ضرب لگائے۔ ابوسفیان 'معبد خزاعی' کو جو قبیلہ خزاعہ کا سردار تھا، جانتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ مدینہ کی خبریں کیا ہیں؟ معبد نے کہا! ''میں نے محمد (ص) اور ان کے ہمراہیوں کو دیکھا کہ وہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف تمہارے تعاقب میں مدینہ سے نکل چکے ہیں۔ اس فوج میں تازہ دم لوگ شریک ہیں جو کل کی جنگ میں شریک نہ تھے اور اپنے کل کے رویہ پر سخت نادم و پشیمان ہیں۔

داخلی عوامل سے مراد صفوان بن امیہ کا اقدام ہے جو خود اکابرین قریش سے تھا اور اس کا باپ امیہ بن خلف، جنگ بدر میں مارا گیا تھا۔ اس نے ابوسفیان سے کہا: ''میرے خیال میں دوسری مرتبہ لڑائی جو کل کی لڑائی سے مختلف ہو گی۔ لہٰذا اگر ہم مکہ واپس ہو جائیں اور اپنی اسی کامیابی پر اکتفا کریں تو یہ بہتر ہو گا۔ یہ گفتگو سبب بنی کہ وہ مدینہ پر دوبارہ حملہ سے باز رہیں۔

اس سلسلے میں آیاتِ قرآن مجید نازل ہوئیں: [۱]

اَلَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۷۲﴾ (سورہ آل عمران: ۱۷۲)

''جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد اللہ سبحانہ اور پیغمبر اکرمؐ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا، نیک اعمال کیے اور تقویٰ اختیار کیا، ان کے لیے اللہ سبحانہ کے ہاں بڑی جزاء ہے'' اور

اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِیۡمَانًا ۖۚ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِیۡلُ ﴿۱۷۳﴾ (سورہ آل عمران: ۱۷۳)

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں کہا گیا کہ دشمن تم پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار کھڑا ہے لہٰذا اس سے ڈرو! تو (بجائے اس کے کہ ان میں خوف و ہراس پیدا ہوتا) ان کا ایمان دوبالا ہو گیا، اور کہنے لگے: ''ہمارے لیے اللہ سبحانہ ہی کافی ہے کیونکہ وہ بہترین پشت پناہ ہے'' [۲]

فَانۡقَلَبُوۡا بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ لَّمۡ یَمۡسَسۡهُمۡ سُوۡٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوۡا رِضۡوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۷۴﴾ (سورہ آل عمران: ۱۷۴)

''توکل علی اللہ کی وجہ سے اللہ سبحانہ نے ان پر خاص کرم فرمایا، وہ میدانِ جنگ سے صحیح سلامت واپس لوٹے اور انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا۔ بے شک انہوں نے اللہ سبحانہ کو راضی کرنے والے حکم کی اطاعت کی تھی اور اللہ سبحانہ بڑا صاحب فضل و کرم ہے'' اور

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیۡطٰنُ یُخَوِّفُ اَوۡلِیَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَخَافُوۡنِ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۷۵﴾ (سورہ آل عمران: ۱۷۵)

''اپنے پیروؤں کو ڈرانا دھمکانا شیطان کا کام ہے۔ (اے مسلمانو!) تم ان سے نہ ڈرو بلکہ اگر ایمان رکھتے ہو تو صرف مجھ سے ہی ڈرو!

---

[۱] سیرتِ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۱

[۲] مکہ سے عبدالقیس نامی ایک شخص گندم خریدنے مدینہ آ رہا تھا۔ راستے میں اس کی ملاقات ابوسفیان سے ہوئی جس نے اس کے ذریعہ مسلمانوں کو پیغام بھجوایا کہ عنقریب قریشِ مکہ مسلمانوں کی بیخ کنی کے لیے مدینہ پر چڑھائی کرنے والے ہیں۔

اس آیہ مجیدہ میں ''عبدالقیس'' جیسے لوگوں کے عمل کو شیطانی عمل کہا گیا ہے جس سے مومنین کبھی نہیں گھبراتے بلکہ فتح یا شکست دونوں صورتوں میں اپنے آپ کو خوش نصیب جانتے ہیں۔

اگر مذکورہ بالا آیات کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ اگر مسلمانوں کو بعض وجوہ کی بنا پر شکست ہو ہی گئی تو وہ اس ظاہری شکست کو معنوی و روحانی شکست نہ سمجھیں بلکہ جلد از جلد اپنی باقی ماندہ قوت کو مجمع کر کے نئے معرکے کی تیاری کریں۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے جنگ احد کے مجروحین کے دوبارہ جنگ کے لیے نکل آنے پر ان کی ان الفاظ سے تعریف فرمائی ہے: ''الذین استجابوا اللہ''

۲۔ دشمن کی طرف سے دھمکی آمیز خبریں موصول ہونے پر بالکل خائف اور ہراساں نہ ہوں بلکہ ان کے ولولہ ایمانی کو اور زیادہ ابھرنا چاہیے کہ نئے معرکے میں کامیاب رہیں کیونکہ بہترین مددگار اللہ سبحانہ ہے البتہ مسلمانوں کو اللہ اور حضور اکرمؐ کی سرتابی سے بچنا چاہیے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''الذین قال لھم الناس...''

۳۔ ادھر اُدھر کی خبریں پہنچانے والے اور کفار کا پیغام لانے والے دراصل مشرکین کے مفاد میں کام کرتے ہیں اور وہ شیطان ہیں جو اپنے پیروؤں کو ڈرایا کرتے ہیں جب کہ مومن صرف اللہ سبحانہ ہی سے ڈرتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے: ''انما ذالکم الشیطان...''

غزوہ اُحد کے واقعات اختتام کو پہنچے۔ دشمن نے مکہ کی راہ لی۔ مدینہ کی زندگی بھی پرسکون دور میں داخل ہو گئی۔ اب موقع آن پہنچا ہے کہ اس غزوہ کے واقعات کا وحی الٰہی کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے۔

غزوہ اُحد میں شکست کی وجوہات

قرآن مجید غزوہ اُحد میں مسلمانوں کے ضعفِ ایمان کو شکست کی وجہ قرار دیتا ہے۔ نیز یہ کہ اُن پر اسلامی سوچ اور احکاماتِ حضرت رسولِ اکرمؐ کی اطاعت کے بجائے دنیا طلبی نے غلبہ پالیا تھا۔ پھر بھی خوشخبری آتی ہے کہ اگرچہ وہ اپنے اولین موقعہ سے ہٹ گئے تاہم فتح انہی کی ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾

(سورہ آل عمران: ۱۳۹)

''سستی مت کرو اور نہ ہی غم کھاؤ۔ اگر تم صاحب ایمان ہو تو بہرحال تم کامیاب ہو''

اس آیہ مجیدہ کا پیغام صرف اس جملہ میں مضمر ہے ''ان کنتم مومنین یعنی شرط یہ ہے کہ تم صاحبِ ایمان رہو، یہی حقیقت آیہ مبارکہ ''ولقد صدقکم اللہ وعدہ'' (آل عمران: ۱۵۲) کی تفسیر میں واضح کی جا چکی ہے۔

غزوۂ اُحد کی شکست کے روشن پہلو:

غزوۂ احد کے نتائج اچھے اور بُرے دونوں قسم کے تھے۔ مورچہ میں بعض دنیا طلب مسلمانوں کی لغزش کی وجہ سے اسلام کے بہترین محافظ قربان کرنا پڑے۔ مگر یہ سب خالی از منفعت بھی نہ تھا۔ مصیبت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو مجموعی طور پر کچھ فائدہ بھی ہوا۔ مندرجہ ذیل آیات جو سورہ آل عمران کی مختلف جگہوں سے پیش کی جا رہی ہیں، انہی مفید جہات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں:

مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ (سورہ آل عمران: ۱۴۰)

''اللہ سبحانہ، لوگوں میں دنوں کو گھماتا ہے (کبھی کسی قوم کو کامیابی ہوتی ہے اور کبھی کسی کو) تاکہ (پختہ) ایمان والوں کی پہچان ہو سکے، اور تم میں سے گواہوں (راہِ خدا میں شہید ہو جانے والوں) کو برگزیدہ کر سکے اور اللہ سبحانہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا''

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾ (آل عمران: ۱۴۱)

''تاکہ اللہ سبحانہ، پختہ ایمان والوں کو پاک و پاکیزہ بنائے اور کافروں کو برباد کر دے''

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾ (سورہ آل عمران: ۱۴۲)

''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صرف ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے جنت میں چلے جاؤ گے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ تم میں مجاہدین اور صبر کرنے والوں کو مشخص کرنا چاہتا ہے''

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾ (سورہ آل عمران: ۱۴۳)

''(اے مسلمانو!) دشمن سے لڑائی سے پہلے تم شہادت کی آرزو کیا کرتے تھے مگر جب موت کو سامنے دیکھا تو تمہارے قدم آگے نہیں بڑھتے تھے''

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ

مَنۡ يَّشَآءُ‌ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ‌ ۚ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَلَـكُمۡ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

(سورہ آل عمران:۱۷۹)

''اللہ سبحانہ کے شایانِ شان نہیں ہے کہ مومنین کو جیسے وہ ہیں رہنے دے مگر یہ کہ پاک و ناپاک لوگوں کو جدا کرے گا۔ اللہ سبحانہ تمہیں غیب سے آگاہ نہیں فرماتا البتہ وہ اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب فرما لیتا ہے۔ پس تم اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ۔ پس اگر تم ایمان لے آؤ اور متقی بن جاؤ تو تمہارے لیے بڑی اچھی جزا ہے''

ان تمام آیات میں ایک سلسلہ مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو سب غزوہ اُحد کے غیر ارادی نتائج کو ظاہر کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

فتح و شکست سنت الٰہی سے ہیں

''وتلک الایام نداولھا بین الناس'' یعنی فتح و شکست کبھی کسی قوم کے حصے میں آتی ہے۔ کبھی کسی کے کا جملہ ایک سنت الٰہی سے پردہ اٹھاتا ہے کہ فتح و تسلط کسی قوم کی ابدی ملکیت نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی قوم کے لیے حتمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ فاتح و ظفریاب ہی رہے گی بلکہ دنیا کی تمام اقوام پر عروج و زوال آتا رہا ہے اور تمام اقوال کا ستارۂ اقبال کبھی طلوع ہوتا اور کبھی غروب ہوتا ہے۔

۲۔ مومن اور منافق کی پہچان:

غزوۂ اُحد سے مومن اور کافر کی پہچان ہو گئی کیونکہ میدانِ جنگ میں استقامت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی بجا آوری علامت ایمان ہے جب کہ اس کے خلاف کوئی بھی عمل ضعف یا فقدان ایمان کی علامت ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ''ولیعلم اللہ الذین امنوا'' یعنی ''تاکہ خداوند عالم پختہ ایمان والوں کو پہچان لے''۔ اللہ تعالیٰ کی شناخت ان کے امتیاز کی طرف اشارہ ہے تاکہ لوگ بھی انہیں پہچان لیں۔

۲۔ اعمال کے بارے میں گواہوں کا وجود

اس واقعہ کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض مسلمان اتنے کامل الایمان ہیں کہ وہ دوسرے مسلمانوں کے کردار پر گواہ بنا لیے گئے اور روزِ قیامت ''شھدآءُ الاعمال'' کے نام سے پہچانے جائیں گے۔ چنانچہ فرماتا ہے ''ویتخذ منکم شھدآء'' یعنی (اللہ سبحانہ) نے تم میں سے گواہوں کو برگزیدہ کر دیا'' البتہ بعض مفسرین نے اس جملے کا یہ مطلب لیا ہے کہ بعض شہداء شہادت کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بہرحال خواہ گواہانِ اعمال کے معنی میں شمار ہوں یا اللہ کی راہ میں قربان ہونے کی صورت میں شہید سمجھے جائیں، ان کی ایک بڑی فضیلت اس

جنگ میں ظاہر ہوگئی۔

۴۔ نجاسات سے مومنین کی صفائی

"ولیمحص اللہ الذین امنوا ویمحق الکافرین یعنی اور تاکہ مومنین کو مخلص بنائے اور کافروں کی بیخ کنی کرے" لفظ تمحص کا عربی لغت میں مطلب تطہیر کرنا ہے۔ اسی طرح "محق" کے معنی تدریجاً نیست و نابود کرنا ہے۔ غزوہ اُحد میں یہ دونوں کام یعنی مومنین کی تطہیر اور کفار کی بیخ کنی کھلم کھلا انجام پائے۔ جماعت اوّل کی مثال اس طرح ہے جس طرح کٹھالی سے نکلنے کے بعد سونا اور چاندی ملاوٹ سے پاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مصیبت و ابتلا میں انسان کے نقائص اور کمزوریوں کا پتہ چل جاتا ہے۔

غزوہ بدر سے پہلے بہت سے مسلمان اپنے آپ کو مومن خالص سمجھتے تھے اور شہادت کی آرزو کرتے تھے جیسا کہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے: "ولقد کنتم تمنون الموت من قبل ان تلقرہ" مگر غزوہ احد نے ان کے ایمان اور شوقِ شہادت کو ظاہر کر دیا اور انہیں خود ہی ان کی کمزوریوں کا پتہ دے دیا۔

پختہ ایمان والے مسلمانوں نے اس واقعہ سے اپنے آپ کو مزید مخلص بنایا اور اپنے اسلامی جذبہ کی تکمیل کے بعد اسلام کی کفر و الحاد سے آئندہ نبرد آزمائی کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ سچ ہے کہ جب تک انسان خود اپنی تعمیر کردار نہ کر لے وہ معاشرے کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ایمان کے دعویدار آزمائش کے وقت مستقل رہیں تاکہ اُن کا استقلال ایمان واضح ہو جائے۔ اس کے بعد خود اپنے عیوب و نقائص دور کر کے معاشرہ سازی کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ **ولیمحص اللہ الذین امنوا و یمحق الکافرین** کا جملہ اسی مطلب کو بیان کر رہا ہے۔

۵۔ جنت کا حصول جہادِ استقامت میں ہے

غزوہ اُحد نے اس بات کو واضح کر دیا کہ بہشت کا حصول جہاد و استقامت میں ہے۔ اس غزوہ نے عملی طور پر سمجھا دیا کہ ایمان زبانی اور گفتگو میں بلند بانگ دعوؤں کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ میدان نبرد میں اظہار کردار اور ثابت قدمی ایمان کو ظاہر کرتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ
وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ﴿۱۴۲﴾ (سورہ آل عمران: ۱۴۲)

"(اے مسلمانو!) کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں یونہی چلے جاؤ گے؟ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں کس نے جہاد کیا اور وہ ثابت قدم لوگوں کو جانتا ہے"

مزید برآں قرآن مجید میں اس مفہوم کی بہت سی آیات ہیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا۔ ان کا مختصر طور پر یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

٦۔ پاک و ناپاک کی پہچان

قرآن مجید میں غزوہ اُحد کے بیان کے بعد جو دوسرا نتیجہ نکالا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خبیث باطن اور شریف باطن مسلمانوں میں امتیاز ہو سکے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ (سورہ آل عمران: ۱۷۹)

''اللہ سبحانہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ مومنین کو عام مسلمانوں میں محسوب کرے، بلکہ شریف باطن والوں کو خبیث باطن والوں سے ضرور ممتاز ہونا چاہیے''

آیہ مجیدہ میں بیان شدہ نتیجہ حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں:

۱۔ اللہ سبحانہ، الہام کے ذریعہ بعض مومنین کو مومن اور منافق سے متعارف کرواتا ہے۔

۲۔ اس قسم کی ممیز کرنے والی جنگ پیش آئے جس میں دونوں جماعتیں عملی طور پر ایک دوسری سے جدا ہو جائیں۔

پہلا طریقہ سنت الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہمیشہ کے لیے یہ رہی ہے کہ صرف اپنے خاص بندوں کو امور ''غیب'' سے مطلع فرماتا ہے، صرف انہیں پر وحی فرماتا ہے، ہر شخص پر نہیں، لہٰذا اس کام کے لیے صرف دوسرا طریقہ ہی باقی رہ گیا تھا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۝۱۷۹ (سورہ آل عمران: ۱۷۹)

''اللہ سبحانہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ سب لوگوں کو غیب سے آگاہ فرمائے بلکہ اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہتا ہے (اس کام کے لیے) منتخب فرمالیتا ہے''

یہاں تک ہم غزوہ اُحد میں شکست کے اسباب اور نتائج سے قرآن مجید کے حوالے سے مطلع ہوئے۔ اب صرف ایک نکتہ باقی رہ گیا ہے وہ یہ کہ ان سچے اور کامل الایمان مجاہدین کی ہمت کیسے بندھائی جائے جو اس جنگ میں شکست سے دو چار ہوئے باوجویکہ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کی قربانیاں بھی پیش کیں۔ ان کی حوصلہ افزائی اس طرح ہو کہ وہ اس ظاہری شکست کو فکری اور روحانی شکست کے طور پر تسلیم نہ کر لیں۔ اب ہم اس سلسلہ میں اللہ سبحانہ کی وحی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

بلند حوصلگی اور بلند ہمتی

فتح و شکست دو معاشرتی کیفیتیں ہیں جن سے خاص نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فتح سے فاتح جماعت کی بالادستی قائم ہوتی ہے

اوران کے عیوب کو اپنے نیچے چھپا لیتی ہے۔اس سے جو عظمت وعزت ان کو نصیب ہوتی ہے اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان کے عیوب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی زندگی کے تمام حالات ان کی قوت کے مظہر بن جاتے ہیں۔

لہٰذا اگر فتح اپنے دامن میں ایسے اثرات رکھتی ہے تو شکست کے اثرات اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔شکست کی صورت میں نہ صرف ان کے عیوب کو نظرانداز نہیں کیا جاتا بلکہ ان پر مزید حاشیہ آرائی ہوتی ہے، یہاں تک کہ بے بنیاد الزامات بھی ان کے خلاف جگہ پانے لگتے ہیں۔

جناب امیر،حضرت علیؑ نے اپنے ایک ارشاد میں اسی حقیقت کی نشاندہی فرمائی ہے۔آپ فرماتے ہیں:

اذا اقبلت الدنیا علی احدٍ اعارته محاسن غیره و اذا ادبرت عنه سلبته محاسن نفسه

''جب کسی طبقہ کو معاشرے میں غلبہ یا تسلط حاصل ہوتا ہے تو دوسروں کی خوبیاں بھی اُن کے حصہ میں آ جاتی ہیں اور اگر دنیا اس سے منہ موڑ لے تو خود ان کی مسلم اچھائیاں بھی ان سے چھین لی جاتی ہیں''۔[1]

غزوۂ اُحد میں یہی حقیقت کسی حد تک سامنے آتی ہے۔غزوہ بدر میں فتح کی وجہ سے کفار اور منافقوں کے دلوں میں مسلمانوں کا مقام بلند ہوا اوران کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب اور خوف جاگزیں ہوا جب کہ اُحد کی شکست ان کے تزلزل کا باعث ہوئی اوران کی منزلت روبہ زوال ہوئی۔

حضورِاکرمؐ کے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت ''دین پرستی'' کے بجائے ''شخص پرستی'' کا پرچار کرتی تھی۔یعنی حضورِاکرمؐ کی حیات اور کامیابی کو آپؐ کی حقانیت اور آپؐ کی موت وشکست کو آپؐ کے دین کی شکست اور کمزوری سمجھتی تھی۔قرآن مجید نے اس غلط سوچ کی دوطریقوں سے مخالفت فرمائی ہے:

(الف) دینِ اسلام کی صداقت حضورِاکرمؐ کی زندگی پر منحصر نہیں

دینِ مقدس اسلام کی حقانیت وصداقت حضورِاکرمؐ کی حیات اور کامیابی پر منحصر نہیں۔حضورِاکرمؐ کی حیثیت اس سلسلہ میں ایک پیغام لانے والے سے زیادہ نہیں۔لہٰذا آپؐ کی وفات کو آپؐ کے پیروؤں کے جاہلیت کی طرف لوٹ جانے کا ہرگز سبب نہ ہونا چاہیے۔اگر اس دین کی صداقت عقل ومنطق سے ثابت ہے۔تو بڑے سے بڑا حادثہ یا سانحہ اس کے اصل وجود کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔قرآن مجید نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں ''وما محمد الا رسولٌ...'' کی آیہ مبارکہ میں واضح فرمایا ہے۔جس کا متن اورتشریح پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ،کلماتِ قصار،شمارہ ۸

(ب) موت ایک سنت الٰہی ہے

ممکن الوجود مخلوق کے لیے موت وفنا اللہ تعالیٰ کے مستقل طریقوں میں سے ایک ہے۔ ہر وجود اپنی ایک سرنوشت رکھتا ہے۔ اور ہر انسان کے لیے موت وحیات کی ایک معینہ مدت ہے جس سے تجاوز ممکن نہیں۔ پیغمبر اکرمؐ بھی نبیؐ اور رسولؐ ہونے کے باوجود انسان ممکن الوجود ہیں جن کا اسی راہ سے گزرنا لازم ہے۔ قرآن مجید اسی حقیقت کو بیان فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ (سورہ آل عمران: ۱۴۵)

''کوئی انسان اذن خدا کے بغیر نہیں مرتا۔ موت ایک معین شدہ فیصلہ ہے۔ جو شخص (اپنے اعمال کی) دنیوی جزاء چاہتا ہے ہم اسے دے دیتے ہیں اور جو شخص اخروی جزا چاہتا ہے ہم اسے وہ دے دیتے ہیں اور اللہ سبحانہ شکر گزار بندوں کو جزا دیتا ہے''

لڑائی میں تکالیف ناگزیر ہوتی ہیں

نتائج جنگ خود جنگ کے مترادف ہوتے ہیں۔ کوئی جنگ تکالیف ونقصانات سے خالی نہیں ہوتی۔ مثل مشہور ہے کہ جنگ میں پھول نہیں برستے۔ اگر جنگ میں آپ زخمی یا شہید ہوں تو کفار بھی اسی طرح زخمی یا قتل ہوں گے۔ (اگر مسلمانوں کو غزوہ احد میں مالی اور جانی نقصان ہوا تو غزوہ بدر میں کافروں کا نقصان تمہارے اُحد کے نقصان سے کم نہ تھا) چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ (سورہ آل عمران: ۱۴۰)

''(اے مسلمانو!) اگر تمہیں میدانِ جنگ میں نقصان پہنچا ہے تو مخالفین کو بھی تو تقریباً اتنا ہی پہنچا ہے''

مجاہدین ماسبق

قرآن مجید حضورِ اکرمؐ کے ساتھیوں کی ہمت بندھانے کے لیے انبیاء ماسلف اور ان کے ساتھیوں کے معرکوں کا ذکر فرماتا ہے کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ تھوڑی سی فوج نے اپنے سے کئی گنا زیادہ فوج پر فتح پائی، صبر واستقامت سے کام لیا اور سستی و کاہلی کو قریب نہ آنے دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ

اللّٰہِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ۝۱۴۶

(سورہ آل عمران: ۱۴۶)

''کئی مرتبہ پیغمبروںؑ اوران کے ساتھیوں نے مخالفین سے جنگ کی مگر راہِ خدا میں تکالیف ونقصان اٹھانے کے بعد وہ تو وہ سست وکمزور ہوئے، نہ مایوس اور نہ ہی شکست خوردہ۔ بے شک اللہ سبحانہ ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے''

نیز ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ۝۱۴۷ (سورہ آل عمران: ۱۴۷)

''وہ صرف یہی کہتے تھے: پروردگار! ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری لغزشوں سے درگزر فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور کفار کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما''

شہیدانِ راہِ خدا زندہ ہیں

غزوۂ اُحد کے بعد جب مسلمان مدینہ لوٹے تو منافقوں کو مسلمانوں کے عقائد کو کمزور کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ اپنی زبان شماتت سے کہنے لگے: ''اگر یہ لوگ مدینہ سے باہر نہ جاتے تو محفوظ رہتے اور مارے نہ جاتے''۔ قرآنِ مجید منافقین کی شماتت کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝۱۶۸ (سورہ آل عمران: ۱۶۸)

''(اے حبیبؐ) ان لوگوں سے کہہ دیجیے جنہوں نے اپنے بھائیوں سے یہ کہا ہے کہ اگر ہماری پیروی کرتے تو مارے نہ جاتے، اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو اپنی موت کے بارے میں پیش گوئی کرو اور اسے ٹال کے دکھاؤ''۔[1]

قرآن مجید نے منافقین کی ان تخریبی باتوں کے دو جوابات دیے ہیں۔ ایک تو یہی جو آیہ مبارکہ کے متن میں موجود ہے کہ اگر یہ لوگ کسی کی موت کی پیش گوئی کا دعویٰ کرتے ہیں تو پہلے اپنی موت کے بارے میں ایسا کہیں اور اپنے آپ کو موت سے بچا کر دکھائیں! (قل

[1] اسی سورہ کی آیت ۱۵۶ میں بھی تقریباً یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔

قَادِفُ رَوُوْا...)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی راہ میں مرجانا حقیقتاً فناء و نابودی نہیں، بلکہ یہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہونا ہے، ایک تکلیف دہ مقام سے آسائش و آرام بھرے گھر میں منتقل ہونا ہے۔شہیدانِ راہ خدا زندہ ہیں، اللہ تعالیٰ سے روزی پاتے ہیں، اللہ سبحانہ کے خاص فضل و کرم سے جوان کے شامل حال ہے بڑے خوش وخرم ہیں۔مزید برآں شہادت شہید کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتی بلکہ ایک اور پر تکلف زندگی کا آغاز ہے جس میں بہتر روحانی اور رفاہی وسائل میسر ہیں جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ (سورہ آل عمران: ۱۶۹)

''جولوگ راہِ خدا میں مارے گئے ان کو ہرگز مردہ مت سمجھو! وہ زندہ ہیں اور اللہ سبحانہ سے رزق پاتے ہیں''

اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ (سورہ آل عمران: ۱۷۰)

''اللہ سبحانہ کی طرف سے آسائش و آرام پا کر وہ خوش وخرم ہیں، بعد میں آ ملنے والوں کو پا کر بہت خوش ہوتے ہیں اور ان کو وہاں کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوتے ہیں''

نیز ارشاد ہوتا ہے:

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ (سورہ آل عمران: ۱۷۱)

''اللہ سبحانہ کے ہاں سے طرح طرح کی نعمتیں پا کر فرحاں وشاداں ہیں۔ بے شک اللہ سبحانہ مومنین کو جزاء سے محروم نہیں فرماتا''

شہید کی ''حیاتِ جاوداں'' کے عقیدے کا مسلمانوں کی جہاد میں شرکت کے شوق کو پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ہے۔جس مجاہد کو یقین ہو کہ شہادت اختتام زندگی نہیں بلکہ اس سے ایک بہتر زندگی شروع ہوتی ہے۔ وہ بڑھ بڑھ کر جنگ میں شرکت کرتا ہے تا کہ عارضی زندگی کے بدلے دائمی زندگی حاصل کرے۔

سید الشہداء حضرت امام حسینؑ نے میدانِ کربلا میں اپنے ساتھیوں سے ایک جملہ ارشاد فرمایا جو ہمارے اس مضمون کے عین مطابق ہے۔لہٰذا اسی مناسبت سے ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔آپ نے جنگ کی گرماگرمی میں جب تلواروں کے ٹکرانے سے آگ وخون برس

رہے تھے، اپنے باقی ماندہ ساتھیوں سے ان الفاظ میں خطاب فرمایا:

"صبرا بنی الکرام فما الموت الاقنطرة تعبر بکم عن البؤس والضرآء الی الجنان الواسعة والنعم الدائمة فایکم یکرہ ان ینتقل من سجنٍ الی قصر [1]

''اے شرفاء کی اولاد! استقامت سے کام لو، کیونکہ موت تو صرف ایک پل کے مانند ہے جو تمہیں تکالیف و مصائب کی زندگی سے اس پار پہنچاتی ہے جہاں وسیع وعریض بہشت برین اور لازوال نعمتیں ہیں۔ کون ہے تم میں جو قید خانے سے محل میں منتقل ہونا نہ چاہتا ہو''

قارئین کرام! غزوۂ اُحد سے متعلق آیاتِ کریمہ کا بیان ہم ختم کرتے ہیں۔ اب ہم غزوہ خندق کے بارے میں آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں اور اپنی بات کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں:

پایانِ زندگانی ہر کس بہ مرگ اوست
جز مردِ حق کہ مرگ وے آغازِ دفتر است

''ہر شخص کی زندگی کا خاتمہ اس کی موت آنے پر ہوتا ہے سوائے مردِ حق کے کہ اس کی موت سے اس کی دائمی زندگی شروع ہوتی ہے''۔

[1] بلاغۃ الحسین، ص ۴۷

(۳)

خندق کے کنارے مقدس دفاع یا کفر و اسلام کا مقابلہ

غزوۂ احزاب شرک کے خلاف اسلام کی ایک مثالی جنگ ہے۔ اس کی اپنی ایک خاص حیثیت ہے۔ غزوہ بدر اور غزوہ اُحد میں مسلمانوں کی ایک قبیلہ یا بعض قبیلوں سے جنگ تھی، جب کہ اس جنگ میں مسلمانوں کے خلاف جزیرۃ العرب کے شمال اور مرکز کے تمام قبیلے شامل تھے۔ اس کے علاوہ خیبر اور مدینہ سے جلاوطن کیے جانے والے یہودی بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضورِ اکرمؐ نے مدینہ کے دو یہودی قبیلوں، بنی قینقاع اور بنی نضیر کو ان کی کھلم کھلا معاہدہ شکنی کے عوض مدینہ سے جلاوطن کر دیا تو انہوں نے خیبر کے یہودیوں سے مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ حضورِ اکرمؐ کے جانی دشمن بت پرست عرب قبیلوں کو ان کے خلاف ابھارا جائے تا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا قلع قمع کر دیں۔ چنانچہ بنی قینقاع، بنی نضیر اور خیبر کے سر برآوردہ یہودی مل کر مکہ گئے اور قریش کو حضورِ اکرمؐ کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کیا۔ مکہ میں حسب منشاء کامیابی سے سرشار ہو کر وہ شمال میں ''نجد'' کی طرف بڑھے اور غطفان کے قبیلہ کی مختلف شاخوں سے ساز باز کی۔ ان کو یہ لالچ دیا کہ حضورِ اکرمؐ پر فتح پانے کے بعد خیبر کی ایک سال کی پیداوار کا خراج ان کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اس طرح انہوں نے تمام چھوٹے چھوٹے قبیلوں کو اپنے اور قریش کے ساتھ ملا لیا۔ فیصلہ ہوا کہ ایک معینہ تاریخ کو مل کر مدینہ کے باہر فوجی مستقر قائم کریں، اسلحہ سے لیس تازہ دم فوج سے مدینہ پر حملہ کریں، شجرِ اسلام کو جڑ سے اکھاڑ دیں اور وہ خود یہودیوں سمیت جزیرۃ العرب میں رہنے والے تمام قبائل کو اس ''دشمن'' سے نجات دلا دیں۔

چنانچہ ۵ھ ماہ شوال کے شروع میں یہود کی دولت اور عربوں کے نظم وضبط کے تحت قبیلہ 'غطفان' سے ''بنی خزارہ''، ''بنی مرۃ'' اور ''بنی اشجع''، شمال سے ''بنی اسد'' مکہ سے قریش اور ان کے حلیف بنی سلیم مل کر ایک بڑے لشکر کی صورت مدینہ کے گرد جمع ہوئے۔ بالفاظِ دیگر در حقیقت جزیرۃ العرب کا عالم کفر پوری شد و مد کے ساتھ اسلام کے خلاف آن کھڑا ہوا۔ حضورِ اکرمؐ نے اپنی زبان مبارک سے اس کیفیت کے بارے میں فرمایا:

برز الشرك كله الى الاسلام كله

''(اس وقت) اسلام اور شرک اپنی پوری طاقت کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے ہیں''۔[۱]

تاریخ کہتی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی جب کہ دشمن تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھا۔ دشمن کو اپنی کثرت اور طاقت کے پیش نظر کسی طرح کا خوف وہراس نہ تھا۔ انہیں خواتین اور بچوں کے قید ہونے کا بھی کوئی ڈر نہ تھا جب کہ مسلمان خواتین اور بچوں کی وجہ سے زیادہ پریشان تھے کہ کہیں دشمن انہیں پریشان نہ کرے۔

---

[۱] بحار الانوار، ج ۲۰ ص ۲۱۵ 'کنز الفوائد' کراجکی سے نقل شدہ۔

یہ جنگ پہلی جنگوں کی طرح نہ تھی اور نہ ہی کسی مروجہ سادہ حربے کی مدد سے اتنی مشکل صورت حال پر قابو پانا ممکن تھا۔ مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا بھی کوئی فائدہ نظر نہ آتا تھا، نہ قلعہ بند ہو کر مدینہ کے گلی کوچوں، برجوں اور چھتوں سے دفاع کرنے کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ اس جنگ میں دس ہزار سے زیادہ جدید ترین اسلحہ سے لیس تازہ دم جنگجو سپاہی تھے جن کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک تہائی تھی جن کے پاس ہتھیار بھی کم اور ان کے معیار کے نہ تھے۔

اس موقعہ پر ''سلمانؓ'' نامی ایک ایرانی آزمودہ اور تجربہ کار افسر نے مدینہ کی حفاظت کے لیے تیار طریقہ تجویز کیا جس سے دشمن شہر میں داخل ہو کر خونریزی نہ کر سکتا تھا۔ وہ 'انوکھا' طریقہ یہ تھا کہ جدھر سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا امکان تھا اس طرف خندق کھود لی جائے کیونکہ مدینہ کے ایک طرف پہاڑ تھے اور دوسری طرف گھنے باغات تھے جو ایک قدرتی حفاظت تھی اور ان دو طرف سے دشمن شہر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ دو طرف سے ہموار زمین اور راستے تھے جہاں سے دشمن کا داخلہ کا کامل امکان ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایک محتاط اندازے کے مطابق (جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب ''فروغِ ہدایت'' میں لکھا ہے) مسلمانوں نے حضورِ اکرمؐ کے حکم سے ان دو اطراف میں تقریباً ساڑھے پانچ کلومیٹر لمبی پانچ میٹر چوڑی اور پانچ میٹر گہری خندق کھود لی۔ خندق میں جگہ جگہ مقررہ فاصلے پر مورچے بنا دیئے گئے تا کہ اگر دشمن خندق عبور کرنا چاہے تو اسے سنگباری یا تیراندازی کر کے روکا جا سکے۔

جب دشمن اس کیفیت یعنی خندق کے سامنے آیا تو سب کے سب اس طریقِ کار کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ طریقہ دفاع عربوں کا نہیں بلکہ کسی ایرانی نے یہ ترکیب بتائی ہے اور محمدؐ نے اس کو اختیار کیا ہے۔

غزوۂ خندق سے متعلق آیاتِ قرآن

غزوہ خندق اور اس کے بعد غزوۂ بنی قریظہ سے متعلق قرآن مجید میں وارد ہونے والی تمام آیات کی تعداد کل اٹھارہ ہے جو آیہ ۹ (سورہ احزاب) سے شروع ہو کر آیہ ۲۷ پر ختم ہوتی ہیں۔ اس سے کسی طرح زیادہ نہیں۔ آخری دو آیات ''بنی قریظہ'' سے متعلق ہیں جن کی تشریح ہم ''اہل کتاب سے آنحضرتؐ کا مناقشہ'' کے باب میں کر چکے ہیں۔ صرف ان سولہ آیات کی تشریح پیش کریں گے جو غزوۂ خندق سے متعلق ہیں۔ ان سولہ آیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ ان آیات پر مشتمل ہے جو کفار کی فوج کے مدینہ کے گرد جمع ہونے کے وقت مسلمانوں کی مجموعی حالت کو بیان کرتی ہیں۔ یہ آیات مومنین اور منافقین کی الگ الگ جماعتوں کا ذکر نہیں کرتیں اگرچہ ہر حالت میں ان دونوں جماعتوں میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

دوسرا حصہ ان آیات کا ہے جو منافق اور بد باطن مسلمانوں کی ایمانی کیفیت کو واضح کرتا ہے جو لڑائی شروع ہونے کے بعد دشمن کے اکا دکا حملوں کے وقت نہ صرف یہ کہ ثابت قدمی کا ثبوت نہیں دے رہے تھے بلکہ دوسروں کو بھی میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرنے پر اکسا رہے تھے۔

تیسرے حصہ آیات میں با ایمان مسلمانوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنے عہد پر قائم رہے اور جس بات کا انہوں نے عہد کیا تھا اس سے بر طریق احسن عہدہ برآء ہوئے۔ ہم مذکورہ بالا تینوں حصوں کی آیات کو الگ الگ پیش کرتے ہیں۔

آیات کا پہلا حصہ جو مسلمانوں کی مجموعی صورتِ حال کو بیان کرتا ہے

آیات کا یہ مجموعہ دشمن کے محاصرہ کے موقع پر مدینہ کی حالت پر تبصرہ کرتا ہے۔ جب دشمن کا لشکر جرار مدینہ کے گرد جمع ہو گیا، ان کی تلواروں کی جھنکار اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ مسلمانوں کے حواس پر چھا گئی تو ان کے کان بہرے اور آنکھیں چندھیانے لگیں۔ نہ اُن کی آنکھیں دشمن کے علاوہ کسی کو دیکھتی تھیں نہ ہی ان کے کانوں میں کوئی اور آواز آتی تھی، ان کے قلوب کی دھڑکن دشمن کی فوج کے خوف سے بڑھ گئی تھی اور ہر جماعت (مومنین کی ہو یا منافقین کی) اللہ سبحانہ کے بارے میں عقائد صحیح کے بجائے طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گئی۔ قرآن مجید کی اس عمومی کیفیت کو دو آیات میں اس طرح بیان فرماتا ہے:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰ (سورہ احزاب: ۱۰)

''(اے مسلمانو!) وہ وقت یاد تو کرو جب دشمن نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا، تمہاری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں، تمہارے کلیجے منہ کو آ گئے تھے اور تم اللہ سبحانہ، کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گئے تھے''۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱ (سورہ احزاب: ۱۱)

''یہ مسلمانوں کی آزمائش کا وقت تھا اور وہ شدید طور پر متزلزل ہو گئے تھے''

ان دو آیات میں اسلام کے پرچم تلے جمع ہونے والے مومن اور منافق دونوں قسم کے مسلمانوں کی مجموعی حالت بیان کی گئی ہے۔

ذیل میں ہم ان آیات کے قابل تشریح نکات بیان کرتے ہیں جو مسلمانوں کی عمومی کیفیت کی نشان دہی کرتی ہیں۔

۱۔ ''زاغت الابصار ڈر سے ان کی آنکھوں کی پتلیاں ٹھہر گئیں''

۲۔ ''وبلغت القلوب الحناجر خوف کے مارے ان کے قلوب حلق میں آ گئے''

۳۔ ''وتظنون باللہ الظنونا اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے''

اس بات کی دلیل کہ آیہ مجیدہ مسلمانوں کی مجموعی حالت کو بیان کر رہی ہے، یہ ہے کہ لفظ 'ظن' کے بجائے لفظ ''تظنون'' استعمال کیا گیا ہے۔ اگر یہاں کوئی مخصوص جماعت، خواہ مومن یا منافق مراد ہوتی تو واحد کے صیغہ کا استعمال صحیح ہوتا، کیونکہ منافقین کی جماعت خداوند تعالیٰ کے بارے میں اپنا ایک الگ تصور رکھتی تھیں۔ دوسرے اور تیسرے حصہ کی آیات میں آپ دیکھیں گے کہ اسلام کی اصلیت کے بارے میں کئی قسم

کے ظن پائے جاتے تھے۔ منافقین اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو جھوٹ سمجھتے تھے جب کہ مومنین کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت رسولِ اکرمؐ کا وعدہ سچا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعد کی آیات جو مسلمانوں کے تصورات کی نشاندہی کرتی ہیں دراصل آیہ مذکورہ کے جملہ "وتظنون باالله الظنونا" کی وضاحت کرتی ہیں۔

دوسری آیہ مجیدہ ''غزوہ خندق'' کو مسلمانوں کی سخت آزمائش قرار دیتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ اس روز مسلمانوں کا امتحان بہت شدید تھا۔ یہاں تک کہ وہ واقعی اس کی سختی سے لرز رہے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

(الف) ''هنالک ابتلی المومنون وہاں مومنین کی آزمائش کا موقع تھا''

(ب) وزلزلوا زلزالاً شدیداً سب کے سب بلا استثناء خوف سے کانپنے لگے''

اس اعتبار سے یہاں ''المومنون'' سے مراد یا تو پورا اسلامی معاشرہ ہے جس میں مومن اور منافق دونوں شامل ہیں یا صرف مومنین ہی مراد ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر منافقین کی کیفیت اس سے بدتر نہ بھی ہو تو مومنین کی کیفیت سے یقیناً بہتر نہ تھی۔

واضح رہے کہ امتحان و آزمائش کے شروع میں ہی کسی کی تعریف یا مذمت مقصود نہیں۔ جب تک کہ آیہ قرآنی مومنین کی ندامت پر شاہد نہ ہو، اس کا فیصلہ ممکن نہیں۔ اس کا فیصلہ تو جنگ کے اختتام پر ہی ہوسکتا ہے کہ کس نے کیا کردار پیش کیا۔ اس مقام پر تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی جمعیت دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئی، ایک جماعت مردود اور بُرے لوگوں کی اور دوسری مقبول اور قابل تعریف لوگوں کی۔ آیاتِ قرآن مجید کے دو باقی حصے ان دونوں مختلف و متضاد جماعتوں کے حالات پر مشتمل ہیں جن کے یکے بعد دیگرے تفصیل پیش کی جائے گی۔

آیت کا دوسرا حصہ۔ منافقین اور بیمار ذہن کے لوگوں کی حالت

یہ حصہ سورہ احزاب کی آیات ۱۲ تا ۲۰ کل نو آیتوں پر مشتمل ہے۔ یہ تمام آیات ایمانی اعتبار سے منافقین اور بیمار مسلمانوں کی کیفیت کو بیان کرتی ہیں جو حیلوں بہانوں سے میدانِ کارزار سے فرار چاہتے ہیں اور کسی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں کر رہے تھے۔ قرآن مجید ان کے مکروہ چہروں کو بے نقاب کر کے ان کی بہانہ سازیوں کو یکے بعد دیگرے بیان فرماتا ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے ہم ان آیات میں بیان شدہ مختلف عناوین کو الگ الگ کر کے پیش کرتے ہیں۔

(الف) اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو دھوکہ قرار دینا۔

جب مسلمان خندق کھود رہے تھے تو حضورِ اکرمؐ نے یہ مژدہ سنایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا ہے کہ مسلمان قیصر و کسریٰ پر بھی غالب رہیں گے۔ آنحضرتؐ کی یہ بات مومن اور منافق دونوں نے سنی۔ مگر جب منافقین نے کفر و شرک کی فوجوں کو دیکھا تو زبان طعن دراز کرنے لگے اور کہنے لگے: ''ہمیں تو اب کوئی جائے قرار نظر نہیں آتی۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس طرح ہمیں اپنے خدا کی طرف سے دو بڑی طاقتوں پر فتح کی خوشخبری سناتے ہیں۔ یہ وعدہ دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے۔ قرآن مجید اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا

غُرُوۡرًا ⑫ (سورہ احزاب: ۱۲)

''(اے رسولؐ) وہ وقت یاد کرو جب منافق اور بیمار ذہن کے مسلمان کہنے لگے کہ اللہ اور پیغمبرؐ کا وعدہ تو دھوکہ کے سوا کچھ نہیں''

اس آیہ مبارکہ میں ''منافق اور ''بیمار ذہن'' سے ان لوگوں کو مراد لیا گیا ہے جو شاید ضعیف الایمان تھے، جو کفر والحاد پر بھی ثابت قدم نہ تھے اور نہ ہی ایمان پر۔ گمان غالب یہ ہے کہ ان سے منافقین ہی مراد ہیں اور کوئی مرض منافقت سے بدتر نہیں۔ قرآن مجید منافقین کے بارے میں فرماتا ہے:

فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا (سورہ بقرہ: ۱۰)

''ان (منافقین) کے قلوب مریض ہیں اور اللہ سبحانہ نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا ہے''

جہاں تک ''ما وعدنا اللہ ورسولہ الا غروراً'' یعنی ''اللہ اور پیغمبرؐ کا وعدہ تو نرا دھوکہ نکلا'' والے جملہ کا تعلق ہے، تو یقین سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ جملہ صرف منافق ہی کہہ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان کا گزر نہیں ہوا، کوئی مسلمان کتنا بھی ضعیف الایمان کیوں نہ ہو، یہ بات کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

(ب) میدان کارزار سے فرار کی دعوت اور بہانہ سازی

جنگ خندق کے دوران منافقوں نے جو سب سے ذلیل اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت کی وہ یہ تھی کہ خندق کے کنارے کو جو دراصل میدانِ کارزار تھا، خالی کرنے لگے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دو طرح کے بہانے بنائے:

۱۔ خوف ودہشت کے مارے کہنے لگے کہ یہاں ٹھہرنا عقل مندی نہیں بلکہ جتنی جلدی ہو سکے اندرونِ شہر پناہ لینا چاہیے۔ یہ لوگ اپنے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اسی بات پر اکسانے لگے۔

۲۔ کچھ لوگ حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے ''ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ اجازت دیجیے کہ میدانِ کارزار سے نکل جائیں اور اپنے گھروں کی حفاظت کریں''

درج ذیل آیہ مبارکہ منافقین کے ان دونوں بہانوں کو بیان فرماتی ہے:

وَاِذۡ قَالَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ یٰۤاَہۡلَ یَثۡرِبَ لَا مُقَامَ لَکُمۡ فَارۡجِعُوۡا ۚ وَیَسۡتَاۡذِنُ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمُ النَّبِیَّ یَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ بُیُوۡتَنَا عَوۡرَۃٌ ؕ وَمَا ہِیَ بِعَوۡرَۃٍ ۚ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡنَ اِلَّا فِرَارًا ⑬ (سورہ احزاب: ۱۳)

''اس وقت کو یاد کریں جب اُن (منافقین) میں سے ایک جماعت نے کہا: اے یثرب والو! یہ جگہ تمہارے

ٹھہرنے کی نہیں، بلکہ شہر کو واپس چلو! اور ان کی ایک جماعت نے پیغمبرؐ سے واپسی کی اجازت چاہی۔ وہ کہنے لگے ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ ان کا مقصد (میدانِ جنگ سے) فرار کے علاوہ اور کچھ نہ تھا''۔

حضورِ اکرمؐ کے یثرب میں ورود کے بعد اس کا پرانا نام (یثرب) منسوخ کر دیا گیا اور اس کے بجائے ''مدینۃ الرسول'' رکھا گیا۔ یہ منافقین ہجرت کے پانچ سال بعد بھی ''یا اھل المدینہ'' کے بجائے ''یا اھل یثرب'' پکارتے تھے، گویا وہ اس طرح مومنین سے اپنی مخالفت کا اعلان کر رہے تھے یعنی یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ اس نظام جدید کو جس کی ابتدا شہر کا نام تبدیل کرنے سے ہوئی تھی۔ تسلیم نہیں کرتے۔ اسلامی انقلاب کے بعد بعض جگہوں پر ہمارے ملک میں بھی یہی کیفیت دیکھی گئی ہے کہ کچھ شہری انقلاب کی وجہ سے بدلے گئے ناموں کی جگہ پرانے طاغوتی نام ہی پکارتے ہیں۔

محولہ بالا آیہ مجیدہ میں ''فارجعوا............ کا جملہ دوسروں کو بھی میدان جنگ سے فرار کی دعوت کو ظاہر کر رہا ہے اور ''ویستاذن کا جملہ یہ بیان کر رہا ہے کہ منافقین خود میدانِ جنگ سے بھاگنے کے لیے کیا کیا بہانے بنا رہے تھے۔

(ج) ''شرک'' کی طرف واپسی

منافقین کو اسلام سے ذرہ بھر بھی لگاؤ نہ تھا۔ وہ جس دین کو بظاہر قبول کیے ہوئے تھے، اس سے دراصل اس قدر دور تھے کہ اگر دشمن کی فوج ایک مرتبہ مدینہ کا محاصرہ کر لیتی یا شہر میں داخل ہو جاتی تو ''عبداللہ ابی'' کی یہی جماعت دوبارہ مشرک ہونے کا اعلان کر کے 'لات و عزیٰ' کا کلمہ پڑھتے ہوئے نظر آتے۔ اسی کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ﴿۱۴﴾ (سورہ احزاب: ۱۴)

''اگر (مشرکین) مدینہ پر پھر چڑھائی کر دیتے اور منافقین سے کہا جاتا کہ شرک اختیار کر لو، تو وہ فوراً بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایسا کر لیتے''

یہ آیہ مجیدہ ہمیں یہ بتا رہی ہے کہ اسلامی نظام میں ایمان نہ لانے والے لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کبھی اہم قسم کے کلیدی اور تاریخ ساز کام ان کے سپرد کرنا چاہیں کیونکہ وہ تھوڑی ہی دیر میں اپنا رنگ بدل کر مختلف چہرے سے سامنے آ جاتے ہیں۔

(د) وعدہ خلافی اور احساس ذمہ داری کا فقدان

اگر یہ کہا جائے کہ انسان کی عظمت کردار کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ کس حد تک اپنے وعدے کی پاسداری اور اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داری کا احساس کرتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ صفت انسان کی پختہ شخصیت اور وقتی مادی مفادات کے مقابلہ میں استقامت و پائیداری کی

علامت ہے۔ منافقین کا کردار اس کے بالکل برعکس تھا۔ غزوہِ احد میں یہ لوگ میدانِ کارزار سے بھاگ گئے، جنگ کا غبار چھٹ جانے کے بعد یہ لوگ لوٹ آئے اور انہوں نے حضورِ اکرمؐ سے وعدہ کیا کہ آئندہ ایسا ذلیل کام نہیں کریں گے۔ مگر ''غزوہ خندق'' میں کمال ڈھٹائی سے انہوں نے پھر وہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ غزوہِ احد میں تو انہوں نے میدانِ جنگ سے صرف فرار ہی کیا تھا جب کہ غزوہ احزاب میں فرار کے علاوہ دوسروں کو بھی اس ذلیل عمل پر اکسایا جو انسانی شرافت وکرامت کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن مجید ان کے اس رویے کی گواہی دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ﴿۱۵﴾ (سورہ احزاب: ۱۵)

''انہوں نے پہلے بھی اللہ سبحانہ سے وعدہ کیا تھا کہ دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور اللہ سبحانہ سے کیے جانے والے وعدے کے بارے میں ضرور پوچھ گچھ ہوگی''

(ھ) فرار سے موت نہیں رُکتی

اسلامی نقطہ نظر میں ہر شخص اس دنیا میں ایک معین مدت تک رہتا ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی کم وبیش نہیں ہوتی، آیہ مبارکہ

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

(سورہ اعراف: ۳۴)

''یعنی جب کسی کی عمر ختم ہو جائے تو پھر (اس کی موت میں) ایک لحظہ بھر بھی پس وپیش نہیں کی جاتی''

اسی حقیقت کو بیان کر رہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ منافقین سے کہہ دیں کہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر انہوں نے موت کا راستہ بند نہیں کیا اور نہ ہی انہیں کوئی فائدہ ہوا ہے کیونکہ انسان دو کیفیتوں میں سے کبھی خالی نہیں، یعنی یا تو اس کی موت کا وقت آن پہنچا ہے یا ابھی نہیں پہنچا۔

پہلی صورت میں میدانِ کارزار سے بھاگے یا وہاں ٹھہرے پنجہ موت اس کی گردن کو دبوچ ہی لیتا ہے۔ دوسری صورت میں اگرچہ وہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہ لے گا تاہم یہ فانی زندگی کسی طرح بھی عالم ابدی کی ہمیشہ کی زندگی کے بالمقابل قابلِ ستائش نہیں ہو سکتی۔ ایک عقل مند آدمی کبھی بھی دوسری صورت کو پہلی پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾ (سورہ احزاب: ۱۶)

''(اے حبیبؐ) کہہ دیجیے کہ قتل ہونے یا مرنے سے فرار کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا (اگر فی الحال تم بچ بھی

گئے) اور سوائے چند روزہ زندگی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا“

غزوہ احد میں میدانِ کارزار سے بھاگ جانے والوں کے بارے میں بھی قرآن مجید اسی حقیقت کو بیان فرماتا ہے:

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ (سورہ آل عمران: ۱۵۴)

”(اے حبیبؐ) کہہ دیجیے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہو، پھر بھی جن کے لیے قتل ہونا مقدر ہو چکا ہے تو قتل ان کو ان کے بستر پر بھی آ لے گا (گھر میں بیٹھ رہنا ان کی نجات کا باعث ہرگز نہ ہوگا)“

(و) منشائے الٰہی پوری ہو کر رہتی ہے

اس کائنات میں اللہ سبحانہ کا ارادہ اور منشاء اٹل ہے۔ جس چیز کا بھی وہ ارادہ کرے کوئی اس میں دخل اندازی نہیں کرسکتا۔ اگر اللہ تعالی کی مصلحت اس میں ہے کہ کوئی قوم مبتلائے رنج والم ہو یا کسی قوم کو نعمتوں سے مالا مال کرے تو کوئی طاقت اس کی مصلحت میں مانع نہیں ہو سکتی۔

جو لوگ میدانِ کارزار سے بھاگ کر یہ سوچتے ہیں کہ ان کے فرار سے ارادۂ الٰہی بدل سکتا ہے تو وہ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝۱۷ (سورہ احزاب: ۱۷)

”(اے رسولؐ) کہہ دیجیے اگر اللہ سبحانہ تمہیں کسی آزمائش میں ڈالنا چاہے تو کون تمہیں اس سے بچا سکتا ہے یا اس کی رحمت میں مانع ہوسکتا ہے۔ ان کے لیے اللہ سبحانہ کے علاوہ کوئی سرپرست اور مددگار نہیں ہے“

(ز) اللہ سبحانہ کے علم کی وسعت بے پایاں ہے

چونکہ منافقین اللہ سبحانہ کے کمالات وصفات کی صحیح معرفت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ اللہ سبحانہ کے علم کی بے پایاں وسعت ونفوذ سے واقف ہیں اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی سیسہ کاریاں اس سے مخفی اور پوشیدہ ہیں، حالانکہ اللہ سبحانہ جانتا ہے کہ عنقریب منافقین خود بھی میدانِ کارزار سے بھاگ جائیں گے اور دوسروں کو بھی یہی سبق دیں گے۔ وحی الٰہی خبر دے رہی ہے کہ خداوند عالم ان کی وعدہ شکنی اور دوسروں کو جنگ سے فرار یا اس میں شریک نہ ہونے کے لیے آمادہ کرنے سے مکمل طور پر آگاہ ہے۔ اس لیے ارشاد ہوتا ہے:

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَاۗىِٕلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۸ (سورہ احزاب: ۱۸)

''اللہ سبحانہ، تمہیں جہاد سے روکنے والوں اور اپنے بھائی بندوں کو اپنی طرف بلانے والوں کو یقینا خوب جانتا ہے۔ یہ جماعت خود جہاد میں حصہ نہیں لیتے مگر بہت کم (صرف اتنا کہ ان کے نام مسلمانوں کی صف میں آ جائیں)''۔

اس آیہ مجیدہ میں قرآن مجید نے منافقین کے مخاطبین کو ''بھائی'' کہا ہے۔ کیا اس خطاب سے باایمان افراد مراد ہیں جو بظاہر ان کے بھائی تھے یا اس سے ان کے ہم خیال وہم قماش لوگ مراد ہیں، جس طرح قرآن مجید اسراف کرنے والوں کو شیطان کے بھائی قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ (سورہ اسراء آیت: ۲۷)

''بے شک اسراف کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں''

(ح) جہاد سے خوف اور موت

منافقوں کے نقطۂ نظر سے انسان کی زندگی صرف دنیا کی اطراف میں رہتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے اور موت سے انسان کی فنا و نیستی ہے۔ کوئی زندہ انسان جو کسی قدر عقل و خرد رکھتا ہو کبھی اپنی فنا کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے موت ابدی زندگی کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے جو بعض شرائط کے مطابق دنیوی زندگی سے بہتر یا بدتر ہو سکتی ہے۔

اول الذکر نقطۂ نظر کے مطابق کسی کو جہاد کی دعوت دینا گویا فنا و نیستی کی دعوت دینا ہے۔ ایسے نظریات کے حامل افراد کے لیے حکم جہاد یا دشمن پر حملہ کرنے کا حکم باعثِ اضطراب و خوف ہوتا ہے، جبکہ موخر الذکر یعنی اسلامی سوچ کے حامل افراد کے لیے جہاد و شہادت کی دعوت شہد سے زیادہ شیریں اور ہر چیز سے لذیذ تر ہوتی ہے۔ قرآن مجید درج ذیل آیہ مبارکہ میں منافقین کی کیفیت کی اس طرح تشریح فرماتا ہے:

عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَي الْخَيْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۹ (سورہ احزاب: ۱۹)

''جب خوف (جہاد فی سبیل اللہ) کا موقع آتا ہے تو (اے رسولؐ) یہ تمہاری طرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں گویا کہ ان پر موت طاری ہے۔ مگر جونہی خوف یا بحران کی حالت ختم ہوتی ہے تو بڑی ڈھٹائی سے زبان درازی کرتے ہوئے مالِ غنیمت پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان نہیں لائے، اللہ سبحانہ نے ان کے اعمال اکارت کر دیئے ہیں اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے آسان ہے''

مفاد پرست اور خودغرض لوگ ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔ مصیبت کے وقت قریب نہیں آتے، نہ ہی کسی کام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، سوائے اپنی فکر کے کسی اور کام یا شخص کی طرف نہیں دیکھتے۔ مگر جب سخت وقت ختم ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو مجاہد اعظم گردانتے ہوئے مال غنیمت میں سے زیادہ حصہ مانگتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیہ مجیدہ میں قرآن کریم ایسے منافق افراد کی مندرجہ ذیل خصوصیات بیان فرماتا ہے:

۱۔ تدور اعینھم کالذی یغشی علیه من الموت" یعنی جب کبھی خطرے کا سامنا ہوتا ہے تو منافقین آپ کی طرف ایسے دیکھتے ہیں گویا حالت احتضار میں مبتلا ہوں، گویا ان پر موت کی غشی طاری ہو۔

۲ فاذا ذھب الخوف سلقو کم بالسنة حدادٍ یعنی جنگ کے بعد امن و امان قائم ہو جانے پر زبان درازی سے مجاہدین کی دل آزاری کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا حصہ ہمیں دو کہ ہم کسی طرح تم سے کم نہیں ہیں۔

۳۔ اشحة علی الخیر یعنی میدانِ جنگ میں جان کا خوف کرنے والے تقسیم غنیمت کے وقت سب سے زیادہ لالچی ہوتے ہیں۔

"تشاح" لغت عرب میں "لڑائی جھگڑے" کو کہتے ہیں۔ اسی لیے یہ کہنا ہوگا کہ یہ لوگ تقسیم غنیمت کے وقت نزاع اور لالچ کرتے ہیں۔

"علی الخیر" میں لفظ خیر سے مراد مال و دولت ہے۔ قرآن مجید میں بھی مال و ثروت کے لیے لفظ خیر استعمال ہوا ہے جیسا کہ ہم آیت ارشاد میں پڑھتے ہیں "ان ترك خیرا" (بقرہ:۱۸۰)

۴۔ "اولئك لم یؤمنوا یعنی یہ ہرگز ایمان نہیں لائے۔ اس کے برعکس ان کی خبیث حرکات ہی ان کا ایمان ہیں۔

۵۔ "فاحبط الله اعمالھم" یعنی اللہ تعالیٰ ان کی نیت پاک نہ ہونے کی وجہ سے ان کے تمام اعمال کو برباد کر دے گا اور وہ اگلے جہان میں خالی ہاتھ محشور ہوں گے۔ لہٰذا ان کا انجام واضح ہے۔

(ط) ان کا خوف ابھی دور نہیں ہوا

۲۴ شوال سے ۲۴ ذیقعد ۵ ھ تک تقریباً ایک مہینے کے قیام کے بعد مشرکین مختلف وجوہات کی بنا پر متفرق ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ موسم میں ناگہانی تبدیلی بھی تھی۔ اچانک آندھیاں اور جھکڑ چلنے لگے۔ طوفان اتنا شدید تھا کہ ان کے خیمے اکھڑ گئے، دیگیں ان کے چولہوں میں الٹ گئیں۔ ان حالات کے اور بعض دیگر حالات کے پیش نظر ابوسفیان نے کوچ کا حکم دے دیا۔ ابھی سپیدہ سحر رونما نہ ہوا تھا کہ سپاہِ مشرکین نے میدان چھوڑ دیا اور ہر قبیلہ اپنے اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ گیا۔[1] قرآن مجید اس سورہ میں اس فتح کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا

---

[1] تاریخ طبری، ج ۲، ص ۲۴۴

عَلَيْهِمْ رِيحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝

(سورہ احزاب: ۹)

''ایمان والو! اپنے اوپر اللہ سبحانہ کی طرف سے نازل ہونے والی نعمتوں کو یاد کرو کہ جب دشمن نے تمہیں گھیرا ہوا تھا تو ہم نے انہیں پراگندہ کرنے کے لیے آندھی اور نا قابل دید لشکر (فرشتے) بھیجے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ سبحانہ اس سے پوری طرح آگاہ ہے''

منافقین اس قدر خوفزدہ، دنیا کی مادی زندگی کے شیدا اور جہاد فی سبیل اللہ سے گریزاں تھے کہ مشرکین و کفار کی تمام جماعتوں کو متفرق ہوتے اور اپنے علاقوں میں جاتا دیکھ کر بھی یقین نہیں کر رہے تھے کہ احزاب متفرق ہو چکے ہیں بلکہ ڈرتے تھے کہ وہ اس علاقہ میں موجود ہیں۔ قرآن مجید ان کی اس ذلیل فکر کو جس کی حیثیت خودغرضی اور مادی فائدے کے سوا اور کچھ نہ تھی، اس طرح بیان فرماتا ہے:

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَاۗىِٕكُمْ ۭ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝

(سورہ احزاب: ۲۰)

''(منافقین) یہ سمجھ رہے تھے کہ احزاب کی فوج ابھی گئی نہیں اور اگر وہ دوبارہ حملہ آور ہو گئے تو انہیں (منافقین کو) یہ زیادہ پسند ہوگا کہ خانہ بدوش عربوں کے ساتھ ادھر اُدھر منتشر ہو جائیں اور دور سے تمہارے بارے میں خبریں سنیں۔ اگر وہ تمہارے ساتھ رہتے تو بہت کم لڑائی میں حصہ لیتے''

اس آیہ مجیدہ میں مندرجہ ذیل نکات قابل غور ہیں:

۱۔ منافقین کو جہاد اور مشرکین کا سامنا کرنے کا خوف، اسی لیے ان کی خواہش یہ تھی کہ جنگ سے دور رہیں جیسا کہ اس جملہ سے واضح ہوتا ہے:

یودوا لو انهم بادون فی الاعراب یعنی ان کو یہ زیادہ پسند تھا کہ خانہ بدوش عربوں کے ساتھ ادھر اُدھر منتشر ہو جائیں۔

۲۔ خانہ بدوش عربوں کے ساتھ منتشر ہونے کی صورت میں بھی وہ مسلمانوں کے حالات سے مکمل آگاہی چاہتے ہیں کیونکہ فتح و کامیابی کی صورت میں مالِ غنیمت سمیٹنا اور شکست کی صورت میں فرار کے لیے بہانہ تراشی کا منصوبہ بنانا ہوتا ہے۔ آیہ مجیدہ کا یہ جملہ اس مطلب کا ثبوت ہے۔ ''**یسئلون عن انبائکم** ''یعنی وہ برابر تمہاری ٹوہ میں رہتے ہیں'۔

۳۔ منافقین کے فرار سے حضور اکرمؐ کو کوئی پریشانی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ میدانِ کارزار میں رہتے بھی تو چند افراد کے سوا جنگ میں شریک نہ ہوتے۔ چنانچہ ان کے رہنے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ ہے اور نہ بھاگ جانے سے کوئی نقصان۔ آیہ مجیدہ کا یہ جملہ بتا رہا ہے۔

"ولو کانوا فیکم ما قاتلوا الا قلیلاً یعنی اگر وہ تمہارے ساتھ ہوتے بھی تو کم ہی شریک جنگ ہوتے"

یہاں آیات کا دوسرا حصہ جو حضورِ اکرمؐ کے ساتھیوں کی ایک جماعت کے بارے میں تھا اختتام کو پہنچا۔

اب ہم آیات کے تیسرے حصہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں جو حقیقی مومنین کے بارے میں ہے۔

آیات کا تیسرا حصہ......رسولِ اکرمؐ اور آپ کے جاں نثار ساتھی

آیات کے اس حصہ کی تشریح کے ساتھ غزوہ خندق کے موقع پر اسلام کی دفاعی جنگ کا اختتام ہوتا ہے۔ ان آیات کی کل تعداد پانچ ہے۔ ان آیات کا محورِ موضوع خود سرکارِ دو عالم اور آپؐ کے باایمان جانثار ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ جنگ کے آغاز میں ڈرتے تھے اور ان پر خوف و ہراس طاری تھا، تاہم آخر کار ان کے اندر گوہرِ ایمان نے دلا دی کہ وہ چمک پیدا کر دی کہ بزدلی کی ساری تیرگی ان کے قلوب سے نکل گئی۔ ان آیات کے نکات درج ذیل اجزاء میں پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ حضورِ اکرمؐ ہمارے لیے بہترین نمونہ عمل ہیں

آیات کے اس مجموعہ کی پہلی آیہ مجیدہ خود حضورِ اکرمؐ کی ذات گرامی کو ہمارے لیے ایک نمونہ عمل کے طور پر پیش کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے قول و کردار مجسم اسلام ہیں جو ہر طرح کی افراد و تفریط سے پاک ہیں۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے کردار زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی قریب ترین معلم کا عملی اخلاق ہمیشہ بہت زیادہ اثر دکھاتا ہے۔ اصلاحِ معاشرہ کے لیے اسلام نے دونوں طریق کو ضروری جانا ہے۔ پس اسلام ایک ایسی شخصیت کا تعارف کراتا ہے جو کمالاتِ اخلاقی اور خصائل انسانی کا عظیم نمونہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ؕ﴿۲۱﴾ (سورہ احزاب: ۲۱)

"(اے مسلمانو!) تم میں جو لوگ اللہ سبحانہ اور روزِ قیامت کے امیدوار ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں، ان کے لیے حضرت رسولِ اکرمؐ کی سیرت طیبہ بہترین نمونہ عمل ہے"

۲۔ اللہ سبحانہ کے وعدے سچے اور مستقل ہوتے ہیں

منافقین اللہ سبحانہ اور حضورِ اکرمؐ کے وعدہ کو جھوٹ اور دھوکا سمجھتے تھے مگر مومنین نے احزاب کے لشکر کو دیکھتے ہی کہا: "اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کا وعدہ سچا اور پکا ہے"۔ جیسا کہ فرماتا ہے:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿٢٢﴾ (سورہ احزاب: ۲۲)

''مومنین نے جب مشرکین کی فوج کو دیکھا تو پکار اُٹھے ۔ یہ وہی کچھ ہے جس کا وعدہ ہم سے اللہ سبحانہ اور اس کے پیغمبرؐ نے فرمایا تھا اور انہوں نے بالکل سچ فرمایا تھا۔ اس نے ان کے ایمان میں کئی گنا اضافہ کر دیا''

منافقین لشکر کفار کو دیکھ کر زیر لب ''ماوعدنا الله ورسوله الاغرورا'' کہہ رہے تھے مگر مومنین فرطِ ایمانی سے پکار اُٹھے ''صدق الله ورسوله'' اور لحظہ بہ لحظہ ان کے ایمان اور جذبۂ اطاعت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

۳۔ شہیدانِ باوفا کا ذکرِ خیر

اس موقع پر جب مسلمان دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے، قرآن مجید غزوہ بدر و غزوہ اُحد میں ثابت قدم رہ کر بڑی دلیری سے لڑنے والے مجاہدوں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے اللہ اور رسولؐ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کیا تھا تاکہ ان کی پیروی کرنے والے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ قرآن مجید گویا یہ کہتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے افراد ایسے ہیں جو جامِ شہادت نوش کرتے ہیں یا اس انتظار میں رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ (سورہ احزاب: ۲۳)

''مومنین میں کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سبحانہ سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا۔ ان میں سے کچھ تو اپنی منزل پا گئے ہیں (میدانِ کارزار میں ثابت قدم رہتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے ہیں)۔ کچھ اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں آتی''

''ما عاهدو الله عليه'' سے مراد دینِ مقدس اسلام پر ثابت قدم رہتے ہوئے درجہ شہادت پر فائز ہونا ہے گویا کہ چند روزہ زندگی پر حیاتِ جاوداں کو ترجیح دینا ہے۔ یہ عہد انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہاں باندھا تھا، اس کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

۴۔ دونوں جماعتیں اپنے کردار کا بدلہ پاتی ہیں

اسلامی تعلیمات کے مطابق یہ دنیا عمل و کردار کی جگہ ہے اور آخرت نتیجہ و جزا کی۔ یہاں ہر شخص کو مومن ہو یا منافق، خوب سمجھنا چاہیے کہ کوئی عمل نتیجہ کے بغیر نہ ہوگا۔ مومن جو سچے دل سے اسلام کی پیروی کرتا ہے اپنے عمل کی جزا پائے گا اور اسی طرح منافق اپنے کردار کی سزا کو دیکھ لے گا سوائے اس کے کہ وہ اپنے اندر انقلاب پیدا کر کے منافقت کو خلوص میں بدل ڈالے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ

عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۚ﴿۲۴﴾ (سورہ احزاب: ۲۴)

''تا کہ اللہ سبحانہ سچے مسلمانوں کو اعمال صادقہ کے بدلے جزائے خیر دے اور منافقین کو اگر چاہے تو سخت سزا دے یا ان پر نظر کرم کرتے ہوئے ان کی توبہ قبول کر لے۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے''

اس آیہ مجیدہ میں دو نکتے قابل غور ہیں:

۱۔ منافقین کو بھی اللہ سبحانہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اللہ سبحانہ کی رحمت بے پایاں ہے۔ چنانچہ اگر وہ اپنے اندر انقلاب پیدا کر لیں تو اللہ سبحانہ کی رحمت ان کو بھی اپنی پناہ میں لے لے گی۔ ''اویتوب علیھم'' کا جملہ یہی بیان کر رہا ہے۔

۲۔ جزاء وسزا کے مسئلے میں 'معتزلہ' اور دیگر مسلمانوں پر پرانا اختلاف ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ جس طرح چاہتا ہے اپنی مرضیٰ سے کرتا ہے اور کتاب وسنت میں آنے والی وعید وتہدید کو جامۂ عمل پہنا دینا چاہیے۔ دونوں مکاتبِ فکر اپنے اپنے مقام پر طویل دلائل رکھتے ہیں جن کے ساتھ عملی طور پر یہاں بحث ممکن نہیں۔ تاہم محولہ بالا آیہ مجیدہ معتزلہ کے نظریات کی نفی کر رہی ہے کیونکہ آیہ مجیدہ واشگاف الفاظ میں مسئلہ جزا کو واضح کر رہی ہے اور فرماتی ہے:

لیجزی اللہ الصادقین بصدقھم یعنی ''سچے مسلمان کو اس کے پرخلوص اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا''۔ البتہ منافقین کی سزا کے بارے میں بیان مشروط ہے اور ارشاد ہوتا ہے:

''ویعذب المنافقین ان شآءَ یعنی ''اگر اس کی مشیت کا تقاضا ہوگا تو سزا دے گا۔ یہ جملہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ سزا و عقاب کی دھمکی اللہ سبحانہ کی شان عفو ودرگزر میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ دشمن کو سزا دینا اللہ تعالیٰ کا حق ہے جس سے وہ درگزر بھی فرما سکتا ہے۔

غزوۂ احزاب سے متعلق آخری آیت مجیدہ سورہ احزاب اب تک ہونے والی بحث کا خلاصہ دو حصوں میں بیان فرما رہی ہے:

۱۔ دشمن کی ناکامی

۲۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے مسلمانوں کی کامیابی

یہ دونوں حقائق آخری آیہ مبارکہ میں واضح ہو رہے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِغَيۡظِهِمۡ لَمۡ يَنَالُوۡا خَيۡرًا ؕ وَكَفَى اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ الۡقِتَالَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيۡزًا ۚ﴿۲۵﴾ (سورہ احزاب: ۲۵)

''رنج وغصہ سے بھرے ہوئے کافروں کو بغیر کسی مقصد کے حصول کے اللہ سبحانہ نے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا اور مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت تک نہ آنے دی۔ بے شک اللہ سبحانہ بڑی طاقت والا اور غالب ہے''

آیہ مجیدہ میں ''لم ینالوا خیراً'' کا جملہ دشمن کی نامرادی وناکامی کا عکاس ہے جو کسی بھی مقصد کو حاصل کیے بغیر واپس جانے پر مجبور ہو گیا۔ اور ''و کفی اللہ المومنین القتال'' کا جملہ اس غیبی طاقت کی نشاندہی کر رہا ہے جس نے کافروں کو لوٹ جانے پر مجبور کر کے

رکھ دیا۔ مسلمانوں کو لڑنے بھڑنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ان میں نہ کوئی شہید ہوا اور نہ ہی مسلمانوں کو کوئی مال نقصان برداشت کرنا پڑا۔

جنگ خندق کے واقعات کا خلاصہ

اس جنگ میں کفر اپنی پوری آب و تاب سے اسلام کے نوخیز پودے کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے میدانِ عمل میں آیا۔ اپنے اس ناپاک ارادے کی تکمیل کے لیے وہ قبیلے جو ایک دوسرے کے دشمن تھے، اپنی پرانی دشمنی بھلا کر دوش بدوش میدان میں آ گئے۔

۲۔ اس جنگ میں اہل کتاب بت پرستوں کے اتحادی بن گئے۔ یہودیوں نے، جو اپنے آپ کو موحد کہتے تھے اور جنہوں نے بت پرستی سے دشمنی کی قسم کھا رکھی تھی، اس موقعے پر قریش مکہ کے سوال کے جواب میں کہ ان کا دین بہتر ہے یا اسلام، کہا کہ بت پرستی اسلام سے بہتر ہے۔ قرآن مجید اس تلخ حقیقت کو اس طرح بیان فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿٥١﴾

(سورہ نسا: ۵۱)

"(اے رسولؐ) ان لوگوں کو تو دیکھو جن کو کتاب کا تھوڑا سا علم دیا گیا ہے، بت پرستی کی (حقانیت کی) تصدیق کرتے ہیں اور ان کو مومنین موحدین سے بہتر جانتے ہیں"

اس طرح بت پرست اور یہودی مل کر مرکزِ اسلام کے خلاف لشکر جرار لے کر میدان میں آ گئے۔

۳۔ اس جنگ میں "خندق" دشمن کی پیش قدمی میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوئی۔ مزید برآں اوس و خزرج کے جوانوں کی بہادری سامنے آئی جو شب و روز خندق کی نگرانی کرتے رہے اور اکا دکا بڑھتے دشمن کو پتھروں اور تیروں سے خندق کو عبور کرنے میں مانع رہے۔

۴۔ آخر ایک دن عربوں کا نامی جنگجو "عمرو ابن عبدود" خندق کو پھلانگ کر ادھر آ گیا۔ وہ عربوں کا نامی گرامی جنگجو اور بہادر تھا۔ اس کی دہشت ناک للکار سے مسلمانوں کی فوج میں عجیب قسم کا خوف و ہراس پھیل گیا۔ یہی وہ حساس اور نازک موقع تھا جب حضورِ اکرمؐ نے اسلام کے یکتائے روزگار بہادر امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابی طالب کو اس کے مقابلے میں بھیجتے ہوئے فرمایا:

"برز الايمان كله الى الشرك كله" یعنی آج پورا ایمان پورے شرک کے مقابلہ میں جا رہا ہے"

حضرت علیؑ نے کفر و شرک کے اس سورما کو تہ تیغ کر کے اسلامی افواج کے دل سے خوف کو دور کیا جس کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ عمرو ابن عبدود کے ساتھ آنے والے دیگر تین مشرکوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ عمرو بن عبدود کا مارا جانا بھی اس جنگ سے کافر لشکر کے ناکام واپس لوٹنے کے اسباب میں سے ایک ہے۔

۵۔ نعیم ابن مسعود نامی ایک تازہ مسلمان نے جس کے قریش، بنی غطفان اور یہودیوں سے قریبی مراسم تھے، بڑی مہارت سے اسلام

دشمن قبیلوں میں اختلاف ونفاق پیدا کیا جس سے وہ ایک دوسرے سے بدظن ہو گئے اور مزید تعاون کے لیے انہوں نے ایسی شرائط عائد کیں جو کسی کے لیے بھی قابل قبول نہ تھیں۔ چنانچہ انہوں نے وہاں سے کوچ میں عافیت سمجھی۔

٦۔ اللہ سبحانہ کی طرف سے شدید آندھیوں، طوفان اور فرشتوں کی صورت میں رات کی یخ بستہ فضا اور تاریکی میں ان پر کاری ضرب لگائی گئی جس سے وہ اس حد تک بوکھلا گئے کہ ایک دوسرے کو ملے بغیر ہی گھروں کو بھاگ لیے۔ خود ابوسفیان کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ اپنے اونٹ کے گھٹنے کھولے بغیر اس پر سوار ہو گیا اور اس کو تازیانے پر تازیانہ مارنے لگا، مگر وہ بیچارہ کیسے اٹھتا کہ اس کے گھٹنے تو بندھے ہوئے تھے۔[1]

---

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۳۲

(۴)

غزوہ بنی مصطلق

'بنی مصطلق' قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ تھی جو قریش کے قریب ہی آباد تھی۔ مدینہ منورہ خبریں پہنچیں کہ بنی مصطلق کا سردار ''حارث بن ابی ضرار'' اسلحہ اور لشکر جمع کر رہا ہے کہ مدینہ کا محاصرہ کرے۔ حضورِ اکرمؐ نے حسب سابق اس فتنہ کی ابتدائی مراحل ہی میں بیخ کنی کا ارادہ فرمایا۔ آنحضرتؐ نے بریدہؓ نامی ایک صحابی کو بنی مصطلق کے علاقے میں صورت حال کا پتہ لینے کے لیے بھیجا۔ جناب بریدہؓ نے بغیر شناخت ہوئے خفیہ طور پر معلومات اکٹھی کیں، خود سردارِ قبیلہ تک رسائی حاصل کر لی اور خبروں کی تصدیق ہو جانے کے بعد مدینہ واپس آ کر حضورِ اکرمؐ کو اصلی حالات سے مطلع کیا اور قبیلہ والوں کی تیاری کی تصدیق کی۔

حضور اکرمؐ نے اپنے اصحاب کے ہمراہ بنی مصطلق کی طرف نہضت فرمائی ''مریسیع'' کے کنویں کے پاس دونوں فوجیں مقابل ہوئیں اور جنگ شروع ہوگئی۔ مسلمانوں کی جانبداری اور سابقہ لڑائیوں میں مسلمانوں کی فتح سے کفار کے دلوں پر رُعب طاری تھا۔ لہٰذا جلد ہی دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دس کافر مارے گئے اور ایک مسلمان شہید ہوا، وہ بھی غلط فہمی سے۔ دشمن بالکل تتر بتر ہو گیا۔ نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کو کثیر مالِ غنیمت اور کنیزیں غنیمت میں ہاتھ لگیں۔

اس غزوہ کے بعض سیاسی پہلو بہت سبق آموز ہیں جو لڑائی کے بعد کے زمانہ میں حضورِ اکرمؐ کے حسن تدبر کو روزِ روشن کی طرح عیاں کرتے ہیں۔

اس جنگ کے بعد پہلی مرتبہ عرب میں مہاجرین اور انصار کا اختلاف رونما ہوا۔ اگر حضورِ اکرمؐ بروقت تدبیر نہ فرماتے تو بعض کوتاہ فکر افراد کی وجہ سے مسلمانوں کا اتحاد ہوا و ہوس کی نظر ہو سکتا تھا۔

ایسا ہوا کہ جب لڑائی ختم ہونے کے بعد دو مسلمان، جن میں ایک ''جہجاہ مسعودؓ'' نامی مہاجر تھا اور دوسرا ''سنان جہنی'' جو انصار سے تھا، کے درمیان پانی کے لین دین پر اختلاف ہو گیا تو دونوں نے اپنے اپنے قبیلہ کو مدد کے لیے پکارا۔ تھوڑی ہی دیر میں مہاجر و انصار ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے۔ اور قریب تھا کہ باہم لڑ پڑیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں۔ حضورِ اکرمؐ کو اطلاع ہوئی۔ اگر آپؐ بروقت مداخلت نہ فرماتے تو وطن سے دور مسلمان ایک دوسرے کا خون بہا دیتے۔ آپؐ تشریف لائے اور فرمایا:

> ''ان دونوں کو ان کے حالات پر چھوڑ دو۔ انہوں نے قبیلوں کی بنیاد پر جو صف بندی کرائی ہے سخت قابل نفرت اور ناگوار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے گھٹیا نظریات ان کے دماغ سے ابھی محو نہیں ہوئے۔ یہ دونوں اسلام سے بالکل بے بہرہ ہیں جو تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے۔ اس طرح کی تفرقہ بازی

دین اسلام میں بالکل بے معنی ہے''

ایک منافق کا آتش اختلاف کو ہوا دینا

پیغمبرِ اکرمؐ نے اپنے حکیمانہ طرزِ عمل سے مسلمانوں کی ان دونوں جماعتوں کے درمیان اختلاف کو ختم کر دیا جو ایک دوسرے کے خلاف لڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مگر رئیس المنافقین ''عبداللہ بن ابی'' نے جو اسلام کے خلاف بدترین کینہ رکھتا تھا، اور صرف مال غنیمت کے لالچ میں جہاد میں شریک ہوتا تھا، اپنے گرد کھڑے ہوئے لوگوں سے یہ کہتے ہوئے اپنے خبث و منافقت کا اظہار کیا:

''ہم اہل مدینہ نے خود اپنے لیے مصیبت مول لی ہے! ہم نے مہاجرین مکہ کو اپنی سرزمین پر پناہ دی، ان کو دشمن کے شر سے محفوظ کیا۔ ہمارا حال اس مشہور ضرب المثل کی طرح ہے کہ اپنے کتے کو اس قدر پالو کہ وہ خود تمہیں ہی کھانے لگے۔ مدینہ اور تمہارے لیے لازم ہے کہ پیغمبرؐ کے ساتھیوں کی مدد نہ کرو تاکہ وہ ان کے گرد سے پراگندہ ہو جائیں۔ خدا کی قسم اگر ہم مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں ان کمزور و ضعیف مہاجروں کو مدینہ سے نکال باہر کرنا چاہیے''

عبداللہ بن ابی کی ان باتوں کا ان نو مسلموں پر بہت برا اثر پڑا جن کے دلوں میں جاہلیت کے تعصّبات اور افکار موجود تھے۔ نزدیک تھا کہ مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد پر کاری ضرب پڑے۔

خوش قسمتی سے ''زید بن ارقمؓ'' نامی ایک غیرت مند مسلمان نوجوان قریب ہی موجود تھا۔ اس نے بڑی جرات سے اس کی ان شیطانی ریشہ دوانیوں کے جواب میں کہا:

''خدا کی قسم! ذلیل اور کمینہ تو خود ہے جو شخص خود اپنے عزیزوں کے درمیان کوئی عزت نہیں رکھتا وہ تو ہی ہے۔ حضور اکرمؐ تو مسلمانوں کے سر کا تاج ہیں اور ان کے دل آنحضرتؐ کی مہر و محبت سے بھرے ہوئے ہیں''

اس کے بعد زیدؓ اٹھے، اپنے لشکر میں آ کر بارگاہِ ختمی مرتبت میں حاضر ہوئے اور عبداللہ بن ابی کی دریدہ دہنی اور فتنہ جوئی سے آنحضرتؐ کو آگاہ کیا۔ آپؐ نے مسلمانوں کو انتشار اور خانہ جنگی سے محفوظ رکھنے کے لیے بظاہر تین بار زیدؓ کی بات کو مسترد کر کے فرمایا: ''زیدؓ! شائد تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے! شائد تم یہ باتیں غصہ اور رنج کی وجہ سے کہہ رہے ہو، شائد اُس نے تمہیں چھوٹا اور بے عقل سمجھا جب کہ اس کا مطلب کچھ اور ہوگا'' مگر زیدؓ نے تینوں احتمالات کا جواب نفی میں دیا اور کہا کہ عبداللہ بن ابی کا مقصد مسلمانوں کے درمیان اختلاف و نفاق ہی پیدا کرنا تھا۔

اس موقع پر حضرت عمر بن خطابؓ نے حضورِ اکرمؐ سے عبداللہ بن ابی کو قتل کرنے کی اجازت چاہی، مگر حضورؐ نے یہ کہہ کر روک دیا: ''یہ درست نہیں کیونکہ لوگ کہیں گے کہ ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں!''

اسی اثنا میں عبداللہ بن ابی کو آنحضرتؐ کے ساتھ زید بن ارقمؓ کی گفتگو کی اطلاع ہوئی۔ وہ فوراً آنحضرتؐ کے حضور حاضر ہوا اور کہنے

لگا: ''میں نے ایسی بات ہرگز نہیں کہی''۔ عبداللہ کے بعض ساتھیوں نے اس کی حمایت کی اور کہا: ''زیدؓ کو عبداللہ کا مطلب بیان کرنے میں اشتباہ ہوا ہے''

بات یہاں بالکل ختم نہ ہوئی۔ اسی عارضی خاموشی کو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ سمجھتے ہوئے اس پر اعتماد نہ کیا اور ایک عظیم رہبر کی طرح طرفین کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ بات آگے نہ بڑھے، آپؐ نے اسی وقت کوچ کا حکم صادر فرمایا۔ کوچ کا حکم سن کر ''اسید بن حضیر'' حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا: ''یہ کوچ کا موقعہ نہیں ہے۔ آخر اس حکم میں کیا راز ہے؟'' آنحضرتؐ نے فرمایا: ''کیا تم عبداللہ بن ابی کی باتوں اور جو آگ وہ لگانا چاہتا ہے، کی اطلاع نہیں رکھتے؟''

''اسید بن حضیر'' نے قسم کھائی اور عرض کیا:

''بخدا! تمام اختیارات آپؐ کے پاس ہیں۔ آپؐ اسے جب چاہیں باہر نکال سکتے ہیں۔ عزیز و گرامی تو آپؐ کی ذات ہے جب کہ وہ خوار و ذلیل ہے۔ اس کی رعایت کیجیے کہ وہ ایک شکست خوردہ آدمی ہے۔ مدینہ منورہ میں آپؐ کی تشریف آوری سے پہلے اوس و خزرج نے اسے والی مدینہ بنانے پر اتفاق کیا تھا اور اس کے تاج کے لیے ہیرے جواہرات بھی اکٹھے کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ستارۂ اسلام کے طلوع ہونے سے اس کی حیثیت میں خلل واقع ہوا، اس کے اردگرد سے لوگ پراگندہ ہو گئے، اس لیے وہ اپنی محرومی کا ذمہ دار آپؐ کو قرار دیتا ہے''۔

آخر کوچ کا حکم دیا گیا۔ مجاہدین اسلام نے چوبیس گھنٹے سے زیادہ سفر میں گزرے۔ سوائے نماز کے انہوں نے کہیں قیام نہ کیا۔ اگلے دن جب موسم شدید گرم ہو گیا اور کسی میں مزید سفر کی طاقت نہ رہی تو آپؐ نے قیام کا حکم صادر فرمایا۔ مسلمان سواریوں سے اُترتے ہی تھکن سے محوِ خواب ہو گئے۔ اس طرح باہمی تلخی ان کے دلوں سے جاتی رہی اور اس تدبیر سے اختلاف کی آگ خاموش ہو گئی۔[1]

اس موقع پر مندرجہ ذیل آیات مجیدہ نازل ہوئیں:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۞

(سورہ منافقون: ۷)

''یہ لوگ (منافقین) وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھیوں سے کسی طرح اتفاق نہ کرو تا کہ وہ ان کے گرد سے منتشر ہو جائیں، حالانکہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ زمین و آسمان کے خزانے اللہ سبحانہ کے پاس ہیں مگر منافقین سمجھتے نہیں''

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۹۱۔ ۲۹۲

وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾

(سورہ منافقون: ۸)

''وہ (منافقین) کہتے ہیں کہ اگر ہم (غزوہ بنی مصطلق سے) واپس مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو ان ذلیل لوگوں (مہاجرین کو جنھوں نے مدینہ میں پناہ لی ہے) کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔ حالانکہ عزت تو اللہ سبحانہ پیغمبرِ اکرمؐ اور مومنین کو حاصل ہے، مگر منافقین یہ نہیں جانتے''

یہ محاصرہ ان عوامل میں سے ہے جو کسی اقلیت کی اقتصادیات و مادی وسائل کی ترسیل میں رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں۔ ماضی میں طریقہ رہا ہے کہ جب کبھی بااثر متمول لوگوں نے معاشرے میں کسی حرکت کو اپنے مفاد کے منافی سمجھ لیا تو اقتصادی قطع تعلق کے ذریعے اٹھتی ہوئی انقلابی لہروں کا راستہ روک لیا۔

تحریکیں، انقلاب اور اصلاحی جدوجہد ہمیشہ ایک چھوٹے سے کمزور اور مفلوک الحال گروہ کی طرف سے شروع کی جاتی ہے۔ ان تحریکوں کو ناکام کرنے کے لیے یہی کافی ہوتا ہے کہ متمول لوگ ان سے اقتصادی قطع تعلق کر دیں اور ان کو اپنی منزل سے منحرف اور روگردان کرنے کے لیے ان کو بھوک وافلاس سے دوچار کر دیں۔

آغازِ اسلام میں مشرکین اور مخالفین توحید نے اسلام کے خلاف اسی سیاسی طریق کار کو اختیار کیا، مسلمانوں کو تباہ کن بھوک سے دوچار کر دیا اور انہیں مجبور کر دیا کہ تین سال کا عرصہ ''شعب ابی طالبؑ'' میں کھانے پینے بلکہ مجموعی بنیادی ضروریات سے محروم پڑے رہیں۔

بعثت کی ابتدا میں سردارانِ قریش نے اسلام کی بڑھتی ہوئی لہروں کو روکنے کے لیے ایک قرارداد منظور کر کے دیوارِ کعبہ سے لٹکا دی تھی۔ اس قرارداد کے تحت بنی ہاشم سے ہر قسم کا لین دین یا تعاون ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔

اس اقتصادی قطع تعلق کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب لوگوں نے خوف یا اقتصادی کاروبار کے تسلسل کی ضمانت فراہم کرنے کے لیے بنی ہاشم سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کر لیا۔ چنانچہ حضورِ اکرمؐ اپنے خاندان اور مسلمانوں سمیت عجیب قسم کی اقتصادی بے یقینی کی صورت حال سے دوچار ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ راتوں کو بھوکے بچوں کی آہ و بکا دور دور تک سنائی دینے لگی۔ حتیٰ کہ بنی ہاشم کی معجزانہ مقاومت کے اثر سے وہ معاہدہ لغو و بے معنی ہو گیا۔

آج بھی دنیا میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جن کے کارپرداز ان دین و مذہب سے کوئی عقیدت نہیں رکھتے اور مذہب کو ذاتی مفادات کے حصول میں بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نوجوانوں کو مذہب سے بدظن کرنے اور مذہبی لوگوں کو اپنی روش بدلنے پر مجبور کرنے کے لیے ان کو اکثر سیاسی، سماجی اور ثقافتی حقوق سے محروم رکھتے ہیں۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے بھی اسلام کو نابود کرنے کے لیے مندرجہ ذیل دو ترکیبیں وضع کیں اور اپنے پیروؤں سے کہا کہ ان ترکیبوں کو عملی جامہ پہنائیں۔

۱۔ مہاجرین مکہ اور حضورِ اکرمؐ کے پیروان کے ساتھ ہر قسم کا لین دین بند کر دیں تا کہ ہر طرف سے عرصۂ حیات کے تنگ ہونے سے وہ لوگ منتشر ہو جائیں۔

۲۔ مدینہ کے لوگ جو وہاں کی زمین کے مالک ہیں مہاجرین کو وہاں سے نکال باہر کریں تا کہ رسولِ اکرمؐ بھی وہاں سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔

عبداللہ بن ابی کی مکاری کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے ان مذموم ارادوں کا اظہار اس وقت کیا جب مہاجر و انصار کے دو افراد میں چپقلش شروع ہوئی اور دونوں طرف سے لوگ جذبات کی رو میں بہہ رہے تھے۔

قرآن مجید منافقین کے خیالات کی مذمت فرماتا ہے

۱۔ منافقین اس زعم میں مبتلا تھے کہ لوگوں کا رزق ان کے اختیار میں ہے! حالانکہ وہ اس طرح ایک بنیادی غلطی کر رہے تھے، کیونکہ تمام کائنات میں بسنے والوں کا رزق اللہ سبحانہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو اپنے دشمن (منافقین) تک کو رزق دیتا ہے ہرگز اپنے فرمانبردار بندوں پر بھوک کی مصیبت اور تنگی حیات مسلط نہیں فرماتا، جب کہ زمین اور آسمانوں کے تمام خزانے اسی کے اختیار میں ہیں۔

رزق و روزی کا وسیع و عریض نظام اس قدر منظم ہے کہ کائنات کا ہر ایک ذی روح ہر طور روزی پا رہا ہے اور یہ سارا انتظام اللہ سبحانہ کے دست قدرت میں ہے۔ بعض اوقات جب دشمنوں کی طرف سے مومنین سے اقتصادی قطع تعلق ہوتا ہے تو وہ صبر و استقامت اور اپنے عقیدے پر ثابت قدم رہتے ہوئے مخالفین کو نیچا دکھا دیتے ہیں۔ صرف بے صبرے اور متزلزل ایمان کے حامل لوگ شیطان کی چالوں میں آ کر طاغوت کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ مردانِ حق پختہ ایمان افراد خود متزلزل ہونے کے بجائے صبر و تحمل کے ذریعے دشمن کو باور کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ ان اوچھے ہتھکنڈوں سے ہم زیر ہونے والے نہیں چنانچہ وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ 'شعب ابی طالب میں مسلمانوں نے مشرکین کو زیر کرنے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

۲۔ منافقین مدینہ کو یہ زعم بھی تھا کہ عزت و شرافت جائیداد اور ملکیت رکھنے میں مضمر ہے۔ جب مدینہ کی اراضی مہاجرین کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو وہ ذلیل و خوار ہو جائیں گے۔ مگر وہ اس بات میں غلط فہمی کا شکار تھے اور نہیں جانتے تھے کہ بعض اوقات یہی زمین و جائیداد انسان کے گلے میں ذلت و رسوائی کا طوق بن جاتی ہے۔

شرافت اور رسوائی کا معیار مادی نہیں بلکہ روحانی اور نظریاتی ہوتا ہے۔ یہ معیار 'ایمان' ہے جو انسان کو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر شرافت کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ قرآن مجید کے بقول شرافت اور عزت صرف اور صرف صاحبانِ ایمان کا حصہ ہے۔

ایک مومن جو بنیادی انسانی اخلاقیات پر یقین اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے، اس دنیا کے بہت سے مادی پر فریب امور کو جن کا انجام ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں، ٹھکرا دیتا ہے اور کسی قیمت پر ان کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات تو اپنی عزت کے تحفظ اور گناہ سے بچنے کے لیے موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہوتی ہے۔ اور وہ ایسی موت کو آلِ

حیات اور بے وقار زندگی کو ننگ و عار جانتا ہے۔

امیر المومنین، حضرت علیؑ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الحیاۃ فی موتکم قاھرین والموت فی حیاتکم مقھورین[1]

''کسی کی غلامی میں جینا دراصل موت ہے اور آزادی کے ساتھ (راہِ خدا) مرجانا دراصل زندگی ہے''

حسن اتفاق سے ''غزوۂ مصطلق'' میں سب نے اپنی انکھوں سے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے اپنے ساتھیوں سمیت کیسی باوقار زندگی گزاری کہ آج چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود ان کا اسم گرامی کتنے احترام سے لیا جاتا ہے مگر عبداللہ بن ابی اور اس کے ہم خیال لوگ کتنی ذلت کی زندگی گزارتے رہے کہ خود اس کا اپنا بیٹا اس کو قتل کر دینا چاہتا تھا مگر حضرت رسولِ اکرمؐ نے اسے منع فرمایا اور اس سے حسن سلوک کی تلقین فرمائی۔

[1] نہج البلاغہ، طبع عبدہ، خطبہ ۵۰

(۵)

صلح حدیبیہ اور بیعتِ رضوان

چھٹی ہجری کے آخر میں حضرت رسول اکرمؐ نے خواب دیکھا کہ آپؐ اپنے اصحابؓ سمیت مسجدِ حرام میں وارد ہوئے ہیں اور مراسم ادا کر رہے ہیں۔ آپؐ نے اس خواب کو نیک فال سمجھا اور اپنے اصحابؓ سے ذکر فرمایا۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ آپؐ امرِ الٰہی سے مامور ہوئے کہ ماہِ ذیقعد الحرام میں عمرہ کی بجا آوری کے لیے، جس کے مراسم ایک دن میں انجام پا لیتے ہیں، اپنے اصحاب کو لے کر مکہ جائیں اور عمرہ کرنے کے بعد واپس مدینہ لوٹ آئیں۔ عمرہ کے اعمال احرام سے شروع ہوتے ہیں اور طوافِ خانہ کعبہ، دو رکعت نمازِ طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، تھوڑے بال یا ناخن کاٹنے اور طوافِ نسا پر مشتمل ہیں۔ اگر زائر قربانی کا جانور بھی ساتھ لایا ہو تو اسے مکہ ہی میں ذبح کرنا ہوتا ہے اور منیٰ میں لے جانا ضروری نہیں ہوتا۔

حضورِ اکرمؐ کو عمرہ کا حکم ایسے حالات میں دیا گیا جب خانہ کعبہ، مسجد حرام اور حرمِ خدا پر قریش کا قبضہ تھا، یا یوں کہہ لیجیے کہ اللہ سبحانہ کے گھر پر ابولہب نے قبضہ جما رکھا تھا۔ صرف یہ بات اطمینان بخش تھی کہ ذیقعد کے مہینے کو قریش بھی ''حرام'' گردانتے تھے اور تقریباً سارے جزیرہ نمائے عرب میں ان دنوں امن و امان ہوتا تھا۔ چنانچہ بعید تھا کہ ماہِ حرام میں قریش حرمِ خدا میں خانہ کعبہ کے زائرین کے خلاف تلوار اٹھائیں، اگر وہ جہالت اور انتقامی جذبہ سے مغلوب ہو کر ایسا کر بھی بیٹھتے تو خود ہی تمام عربوں کو اپنے خلاف متنفر کرتے۔

حضرت رسولِ اکرمؐ نے اپنی نیک نیتی کے اظہار کے لیے حکم دیا کہ سلاحِ مسافر یعنی تلوار کے علاوہ کسی قسم کا کوئی اسلحہ ساتھ نہ لیا جائے تاکہ قریش اور دیگر عرب قبائل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ مسلمان اسلحہ کے بغیر صرف عمرہ کرنا اور واپس مدینہ لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ یعنی اگر ان کا مقصد جنگ ہوتا تو اس کا انتظام کر کے آتے۔ بہر حال یہ کیفیت دو صورتوں سے خالی نہ تھی۔

۱۔ اگر قریش رکاوٹ نہ ڈالتے تو عمرہ بجا لایا جاتا اور مشرکین مکہ قریب سے اسلام کی تعلیم اور ان کے عظیم رہبر سے آشنا ہو سکتے تھے۔ اس طرح بہت سی غلط فہمیاں خود بخود ختم ہو جائیں۔ مشرکین مکہ خود دیکھ لیتے کہ اسلام کے عظیم قائد حضرت رسولِ اکرمؐ حج و عمرہ کے قائل اور اپنے آباؤ اجداد (حضرت ابراہیمؑ) کے مخالف نہیں ہیں۔

۲۔ اگر قریش مانع ہوتے تو دیگر مشرک قبائل میں خود بدنام ہوتے اور ان کی زیادتی طشت از بام ہو جاتی۔ یہ بات بذاتِ خود ترویجِ اسلام کے لیے بے اثر نہ ہوتی۔

ان حساس حالات میں دو ہزار سے کچھ کم مسلمانوں نے حضرت رسولِ اکرمؐ کی آواز پر لبیک کہا اور آنحضرتؐ کے حکم کے مطابق بغیر کسی اور اسلحہ کے صرف تلواریں لے کر سوئے حرمِ مکہ روانہ ہوئے۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کے مخبر کافی آگے آگے سفر کر رہے تھے تاکہ اگر راستہ میں

کوئی مانع ہو تو وہ بروقت آنحضرتؐ کو مطلع کر دیں۔

کیونکہ اس سفر میں غنیمت کی کوئی توقع نہ تھی بلکہ خطرہ تھا کہ کہیں قریش الجھ نہ پڑیں۔ لہٰذا دنیا طلب اور ضعیف الایمان لوگوں نے اس میں شرکت نہ کی اور مدینہ ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ جب رسولِ اکرمؐ اس سفر سے مظفر و کامران واپس مدینہ پہنچے تو یہ لوگ خفت مٹانے کے لیے بہانہ تراشی کرتے ہوئے بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوئے جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

ایک دن حضورِ اکرمؐ اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ منورہ سے عمرہ کی بجاآوری کے لیے عازمِ سرزمین حرم ہوئے۔ ابھی مکہ سے کافی دور ہی تھے کہ مخبروں نے اطلاع دی کہ قریش کو مسلمانوں کی روانگی کی اطلاع ہو چکی ہے اور وہ ''ذی طوی'' کے مقام پر جمع ہو رہے ہیں۔ نیز یہ کہ قریش نے قسم کھائی ہے کہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کو سرزمین حرم میں آنے نہیں دیں گے۔ اس مقصد کے لیے قریش نے اپنے ایک بہادر سردار ''خالد بن ولید'' کو دو سو سوار دے کر ''کراع الغمیم'' کی طرف روانہ کیا ہے تاکہ مسلمانوں کو آنے سے روکے۔ حضورِ اکرمؐ نے قبیلہ ''اسلم'' کے ایک شخص کے مشورہ سے اپنا راستہ بدل دیا تاکہ قریش سے معمولی سی تلخی بھی نہ ہونے پائے اور بہت دشوار گزار راستوں سے ہوتے ہوئے ''حدیبیہ'' کے مقام پر فروکش ہو گئے۔ آپؐ نے قیام کا حکم دیا تاکہ اللہ تعالیٰ آئندہ کے لیے کوئی لائحہ عمل واضح فرمائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس موقع پر اگر قریش مجھ سے کچھ ایسی شرائط چاہیں گے جس سے ہمارے رشتے مستحکم ہوں تو میں دریغ نہیں کروں گا۔ یہ بات جب قریش تک پہنچی تو ان کی طرف سے قاصدوں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ مسلمانوں کی آمد کے اصل مقصد سے آگاہ ہوں۔

سب سب پہلے ''بدیل'' نامی ایک شخص 'بنی خزاعہ' کے چند افراد کے ساتھ جو آنحضرتؐ کے ساتھ اچھے مراسم رکھتے تھے، قریش کی نمائندگی کرتے ہوئے بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوا تاکہ حضورِ اکرمؐ کے ارادوں سے آگاہی حاصل کرے۔ آنحضرتؐ نے اپنے آنے کا مقصد صرف ادائیگی عمرہ بتایا۔ پھر دوبارہ ایک شخص حاضر ہوا اور طرفین میں ویسی ہی گفتگو ہوئی۔ تیسری مرتبہ 'حلیس بن علقمہ' نامی ایک شخص قریش کی طرف سے حقیقت حال پوچھنے کے لیے آیا۔

دراصل قریش یقین نہیں کر رہے تھے کہ حضورؐ صرف ادائیگی عمرہ کے لیے بھی آ سکتے ہیں۔

جب 'حلیس'' نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کے کمزور و نحیف اونٹ بھوک کے مارے ایک دوسرے کے بال نوچ رہے ہیں تو وہ واپس لوٹ گیا اور سردارانِ قریش سے سختی سے کہنے لگا کہ تمہارے ساتھ ہمارا ایسا کوئی معاہدہ نہیں کہ ہم خانۂ خدا کے زائرین کو زیارت سے روکیں گے۔ مسلمان خانہ خدا کی زیارت کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتے۔ اس لیے قسم بخدا اگر آپ نے مسلمانوں کو زیارت سے روکا تو میں اپنے قبیلہ سمیت تم پر حملہ کر دوں گا۔ اور تمہاری نسل کو قطع کر دوں گا۔

'حلیس' کی دھمکی نے قریش کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ مسئلے کو سردست سیاسی طور پر رفع دفع کر دیں۔ اب انہوں نے 'عمرو بن مسعود' کو جو اپنی عقل و فہم میں مشہور تھا۔ حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ 'عمرو بن مسعود' حضورِ اکرمؐ کی روحانیت اور مسلمانوں کے حسن سلوک سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان آنحضرتؐ کے وضو کے پانی کو بھی آپس میں تبرکاً تقسیم کرتے اور آنحضرتؐ کا ایک بال بھی زمین پر نہ گرنے دیتے۔

حضورؐ کا قریش کی طرف اپنے نمائندے کو بھیجنا

اب حضورؐ نے بھی ارادہ فرمایا کہ ایک اپنا نمائندہ قریش کے پاس ارسال فرمائیں جو آپؐ کے اس سفر کا مقصد ان پر واضح کرے۔قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص ''خراس بن امیہ'' اس مہم کے لیے چنا گیا۔ جب 'خراس بن امیہ' مکہ پہنچا تو قریش نے تمام سفارتی آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کو قید کر لیا اور قریب تھا کہ اس کا خون بہا دیتے لیکن بعض دوسرے سرداروں کی بروقت مداخلت سے اس کی جان بچ گئی۔ اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ کسی ایسے شخص کو مکہ بھیجنا چاہیے جس کے اعزا مکہ میں ہوں اور وہ اس کی حفاظت کریں۔ چنانچہ بنی امیہ سے حضرت عثمان بن عفان اس مقصد کے لیے منتخب ہوئے۔ وہ ابان بن سعید بن عاص کی پناہ میں سرزمین حرم میں وارد ہوئے۔قریش نے حضرت عثمانؓ کو طواف کی اجازت دی مگر حضرت عثمان نے حضورِ اکرمؐ کے احترام میں تنہا طواف نہ کیا۔مگر قریش نے حضرت عثمان کو مکہ ہی میں روک لیا اور واپس نہ آنے دیا۔

بیعتِ رضوان

حضرت عثمان کی واپسی میں تاخیر رسولِ اکرمؐ اور مسلمانوں میں پریشانی اور اضطراب بڑھا۔حضورِ اکرمؐ اپنے ساتھیوں کے معیارِ ایمانی کو جانچنے، جذبۂ ایثار کو پرکھنے اور ان کے احساس وجذبہ کو گرمانے کی غرض سے ایک درخت کے نیچے تشریف فرما ہوئے اور ایک ایک مسلمان سے اس بات پر بیعت لی کہ آخر دم تک وہ دین مقدس اور پیغمبر اسلامؐ کی حفاظت کرتا رہے گا۔ یہ وہی بیعت ہے جس کا ذکر 'سورہ فتح' میں کیا گیا ہے اور اس کے لیے آیاتِ قرآن نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَيۡدِيۡهِمۡ‌ ۚ فَمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنۡكُثُ عَلٰى نَفۡسِهٖ‌ ۚ وَمَنۡ اَوۡفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيۡهُ اللّٰهَ فَسَيُؤۡتِيۡهِ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ۝۱۰ (سورہ فتح: ۱۰)

''(اے رسولؐ) جو لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ (دراصل) اللہ سبحانہ کی بیعت کر رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ سبحانہ کا ہاتھ ہے جو شخص اس بیعت کو توڑے گا اس کا نقصان خود اسے ہی ہوگا اور جو اللہ کے ساتھ عہد کا ایفا کرے گا اس کو اللہ سبحانہ جزائے بزرگ عطا فرمائے گا''

لَقَدۡ رَضِىَ اللّٰهُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ يُبَايِعُوۡنَكَ تَحۡتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَثَابَهُمۡ فَتۡحًا قَرِيۡبًا ۝۱۸ (سورہ فتح: ۱۸)

''اللہ سبحانہ ان لوگوں سے راضی ہو گیا جنہوں نے درخت کے نیچے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو کچھ ان

کے دلوں میں تھا اس سے آگاہ ہوا، ان کو سکون و اطمینان بخشا اور (بطورِ جزاء) انہیں قریبی فتح کا مژدہ جانفزا سنایا''

اس بیعت سے ایک طرف تو وطن سے دور مسلمانوں کے دلوں میں دشمن کے خلاف جذبات اُبھرے اور وہ مسلح کارروائی پر متفق ہوئے، دوسری طرف دشمن کو بھی تنبیہ ہوئی کہ امن کا راستہ اختیار کرے یا بھاری مالی و جانی نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے کیونکہ اب کا مقابلہ اس قوم سے تھا جنہوں نے مرنے مارنے کا حلف اٹھایا تھا۔ لہٰذا قریش نے حضرت عثمانؓ کو آزاد کر دیا۔ اور ''سہیل بن عمروؓ'' کو اپنا با اختیار نمائندہ بنا کر رسول اکرمؐ کی طرف روانہ کیا۔

اطاعتِ حضرت رسولِ اکرمؐ اور تجدید بیعت

یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حضرت پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت اور فرمانبرداری مسلمانوں کے لیے واجبات سے ہے۔ قرآن مجید آپؐ کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ (سورہ نسا: ۵۹)

''اللہ سبحانہ، حضورِ اکرمؐ اور اپنے میں سے ان لوگوں کی اطاعت کرو جو صاحبان امر ہیں''

اس صورت میں صلح حدیبیہ کے موقع پر بیعت کی اہمیت کیا تھی؟ اس کا جواب واضح ہے۔ آنحضرتؐ کی اطاعت اپنی جگہ واجب ہے لیکن اس وجوب پر عمل کرنے کا احساس پیدا ہونا بالکل الگ مسئلہ ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ آنحضرتؐ حساس حالات میں واجبات پروردگار عالم کے لیے شرائط عمل مہیا فرمائیں تاکہ سب مسلمان ایسے حساس مواقع پر اس وجوب پر عمل کر سکیں۔

اس تاکیدی عہد و بیعت کا مقصد یہی تھا کہ سب مسلمان اس حکم کی اطاعت کریں جس کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

ہجرت سے قبل مسلمان جو بیعت حضرت رسول اکرمؐ کے دست حق پرست پر کرتے تھے وہ دراصل ایمان کی بنیاد فراہم کرتی تھی جس کے بعد ان پر حضورِ اکرمؐ کی اطاعت لازم ہو جاتی تھی۔ یعنی بیعت سے اس بات کی تحریک ہوتی تھی جب کہ ہجرت کے بعد بیعت حضورِ اکرمؐ سے ہو یا کسی امام معصومؑ سے، اس سے مراد تجدیدِ عہد سے ہے جو وحی کے ذریعے مسلمانوں پر بذریعہ وحی الٰہی واجب ہو چکا ہے۔

فتح قریب کا مفہوم

فتح قریب سے مراد غزوہ خیبر ہے جو ۷ ھ میں واقع ہوئی اور فراواں مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ اس سے نہ فتح مکہ مراد ہے نہ غزوہ حنین کیونکہ فتح مکہ ۸ ھ میں ہوئی نہ کہ ۷ ھ میں، دوسرے اس فتح میں کوئی مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ نہ آیا۔ لہٰذا جنگ خیبر کی موجودگی میں، جو صلح حدیبیہ کے بعد پہلی جنگ ہے اور مالِ کثیر کی حامل بھی ہے، کسی دوسری جنگ کو اس کا مصداق سمجھنا غلط ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے صلح حدیبیہ کے بعد مندرجہ ذیل فتوحات حاصل کیں:

۱۔　فتح خیبر ۷ھ۔اس میں کثیر مالِ غنیمت حاصل ہوا۔

۲۔　فتح مکہ ۸ھ میں بغیر خون ریزی اور بغیر مالِ غنیمت واقع ہوئی۔

۳۔　غزوہ حنین ۸ھ میں واقع ہوئی اور مالِ غنیمت بھی ملا۔

۴۔　غزوۂ تبوک ۹ھ میں واقع ہوئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو ایک طرح کی سیاسی کامیابی حاصل ہوئی۔ لہٰذا غزوہ خیبر کے علاوہ جو مذکورہ بالا تمام جنگوں سے صلح حدیبیہ کے نزدیک ترین ہے کسی اور جنگ کو ''فتح قریب'' قرار دینا درست نہیں بالخصوص جب کہ اس کے بعد بہت سا مالِ غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا جیسا کہ سورہ فتح میں ارشاد ہوتا ہے:

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٩﴾ (سورہ فتح: ۱۹)

''(مسلمانوں کو) بہت مالِ غنیمت حاصل ہوا ہے (بے شک) اللہ سبحانہ غالب اور صاحبِ حکمت ہے''

صلح کی تفصیلات

قریش کے نمائندے ''سہیل'' سے مذاکرات کے بعد طرفین میں ایک معاہدہ طے پایا۔ ذیل میں ہم اس معاہدے کا متن پیش کر رہے ہیں تا کہ پتہ چلے کہ حضورِ اکرمؐ کو افراد کی آزادی سے کتنی دلچسپی تھی۔

معاہدہ حدیبیہ کی تفصیل

شرائط معاہدہ طے ہونے کے بعد پیغمبر اکرمؐ اور قریش کے درمیان معاہدہ مرتب ہوا جس کی شرائط درج ذیل ہیں:

۱۔　قریش اور مسلمان عہد کرتے ہیں کہ دس سال تک ایک دوسرے کے خلاف جنگ اور جارحیت کے مرتکب نہیں ہوں گے تا کہ حجاز میں مجموعی امن و امان بحال ہو سکے۔

۲۔　اگر قریش کا کوئی فرد اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر مکہ سے فرار کر کے اسلام لے آئے اور مسلمانوں کے ساتھ رہنا چاہے تو حضرت محمدؐ کو اسے واپس بھیجنا ہو گا لیکن کوئی مسلمان اگر بھاگ کر قریش کے پاس چلا جائے تو قریش اسے واپس کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔

۳۔　اس سال (حضرت) محمدؐ اور ان کے ساتھی یہیں سے واپس مدینہ لوٹ جائیں، البتہ آئندہ سالوں میں آزادی سے مکہ آئیں اور خانۂ خدا کی زیارت کریں اس شرط پر کہ مکہ میں تین دن سے زیادہ قیام نہ کریں اور تلوار کے علاوہ کوئی اور ہتھیار ان کے پاس نہ ہو۔[1]

۴۔　مکہ کے مسلمان اس معاہدہ کے تحت اپنے مذہبی امور انجام دینے میں آزاد ہوں گے، قریش کو کوئی حق نہیں کہ وہ ان مسلمانوں کو

[1] سیرت حلبی جلد ۲، ص ۲۴

ستائیں، ان کو ترکِ اسلام پر مجبور کریں یا اسلام کا مذاق اڑائیں۔[1]

۵۔ مسلمان اور قریش جس کسی قبیلے سے چاہیں معاہدہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

۶۔فریقین معاہدہ ایک دوسرے کے مال کو محترم جاننے کے پابند ہوں گے وہ دھوکہ، فریب ترک کر کے دلوں سے کینہ دور کر دیں گے۔

۷۔ جو مسلمان مدینہ سے مکہ آئیں ان کا مال اور جان محفوظ ہوں گے۔[2]

صلح حدیبیہ کے معاہدہ کا یہی متن ہے جس کو ہم نے مختلف کتب سے جمع کیا ہے جن میں سے بعض کا ہم نے حاشیہ میں ذکر کیا ہے۔ مذکورہ معاہدہ کے دو نسخے تیار کیے گئے۔ اس کے بعد قریش اور اسلام کے سرداروں کی ایک جماعت نے معاہدہ پر دستخط کیے۔ اس کی ایک نقل ''سہیل'' کو اور دوسری رسولِ اکرمؐ کو دے دی گئی۔

صلح حدیبیہ کے نتائج

تاریخ اسلام میں صلح حدیبیہ کے بعد جتنے بھی واقعات رونما ہوئے وہ اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ یہ صلح مسلمانوں کے حق میں کس قدر مفید ثابت ہوئی۔ اس معاہدے کے تحت حضورا کرمؐ مدینہ پر قریش مکہ کے حملوں اور تمام دیگر دشمنوں سے محفوظ ہو گئے۔ چنانچہ آپؐ بڑی یکسوئی کے ساتھ مندرجہ ذیل دو اہم کام سرانجام دے سکے:

(الف) آپؐ نے جزیرہ نماعرب میں واقع یہودیوں کی آخری کمین گاہ یعنی 'خیبر' کا محاصرہ فرمایا اور چند دن کی لڑائی کے بعد ''خیبر'' اور ''وادی القریٰ'' کے یہودیوں کی مکمل بیخ کنی کر دی۔ آنحضرتؐ جنوب میں قریش مکہ کی طرف سے محفوظ و مطمئن نہ ہوتے تو شمال میں قریش کے اتحادی خیبر کے یہودیوں سے آپؐ کے جنگ کرنے کا کوئی امکان نہ ہوتا۔

(ب) آپؐ نے ۷ھ میں حجاز کے گرد و نواح میں موجود اس وقت کے مہذب ممالک میں اپنے سفارت کار روانہ فرمائے اور ان متمدن ممالک کے سربراہوں کو دین اسلام کی دعوت دی۔ اس طرح آپؐ نے اپنے دین کی آفاقیت کا اعلان فرمایا۔ گویا آپؐ نے ان پر واضح کر دیا کہ اب تک کے آسمانی ادیان کا زمانہ ختم ہوا۔ لہٰذا سب کو چاہیے کہ آخری آسمانی دین کی پیروی کریں۔

صلح حدیبیہ کی بعض شقیں حضورِ اکرمؐ کے بعض صحابہ کرامؓ کے نزدیک بہت تلخ تھیں۔ خاص طور پر یہ شق کہ ''کفر سے بھاگا ہوا آدمی اگر اسلام کے دامن میں پناہ لے لے تو حضورؐ کو اسے قریش کو واپس کرنا ہو گا، جب کہ اسلام سے بھاگا ہوا مسلمان قریش واپس نہیں کریں گے۔ حضرت عمرؓ کی نظر میں یہ شرط بالخصوص بہت ذلت آمیز تھی! مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس شق کے دونوں اجزاء اسلام کے حق میں نہایت مفید تھے، یہاں تک کہ خود قریش نے محسوس کیا کہ حضورِ اکرمؐ سے یہ شرط منوا کر ہم نے بڑی غلطی کی ہے۔ چنانچہ وہ بعد میں اس شق کی

---

[1] بحار انوار، ج ۲، ص ۲۵۳

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۹، ص ۱۱۷

منسوخی کے لیے اصرار کرنے لگے۔[1]

بہر حال مسلمان بہت بڑی سیاسی فتح حاصل کر کے مدینہ واپس آئے۔ اللہ سبحانہ نے آیاتِ قرآن مجید کے ذریعے اس واقع کی تائید فرمائی اور اس کے بعد کامیابیوں کے ایک سلسلے سے بھی مطلع فرمایا۔ ان میں بعض کامیابیاں تو جلدی حاصل ہونے والی تھیں اور بعض کچھ دیر بعد، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝٢٠

(سورہ فتح: ۲۰)

''(اے مسلمانو!) اللہ سبحانہ نے تم سے کثیر مال غنیمت کا وعدہ فرمایا ہے جو تمہیں ملے گا، جس میں ایک تمہیں جلد مل جائے گا۔ اس نے تمہارے دشمنوں کو تم سے دور کر دیا ہے تاکہ مومنین کے لیے (حق وصداقت) کی نشانی رہے اور تمہیں راہ راست پر جاری وساری رکھے''۔

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝٢١ (سورہ فتح: ۲۱)

''اور دوسرا (مالِ غنیمت) جس کو حاصل کرنا تمہارے بس کی بات نہ تھی، البتہ اللہ سبحانہ اسے حاصل کرنے کی پوری قوت رکھتا ہے کیونکہ وہ تو ہر چیز پر غالب ہے''

اس آیہ مجیدہ میں تین طرح کے مالِ غنیمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

۱۔ موجل مالِ غنیمت جس کے حصول کے لیے ایک مدت مقرر ہے (وعد کم اللہ مغا نھم کثیرۃ)

۲۔ معجّل مالِ غنیمت: وہ مالِ غنیمت جو بہت جلد ہاتھ آنے والا ہے (فعجل لکم ھذہ)

۳۔ وہ مالِ غنیمت جس کے حصول کی مسلمان طاقت نہیں رکھتے تھے (واخری لم تقدروا علیھا)

مالِ غنیمت کی پہلی قسم سے مراد جنگ ہوازن کے بعد کا مالِ غنیمت ہے جو صلح حدیبیہ کے کچھ عرصے بعد مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ مالِ غنیمت کی دوسری قسم (معجّل) سے مراد خیبر سے حاصل ہونے والا کثیر مالِ غنیمت ہے جو صلح حدیبیہ کے فوراً بعد مسلمانوں کو ملا اور اسے فتح قریب بھی کہا گیا ہے۔ مالِ غنیمت کی تیسری قسم سے مراد وہ مالِ غنیمت ہے جو حضورِ اکرمؐ کے وصال کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

یہاں ایک اور احتمال سامنے آتا ہے جو سابقہ بحث میں شبہات پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر خود ''صلح حدیبیہ'' کو ''ایک طرح کی فتح سمجھتے

[1] ''فروغِ ابدیت'' ص ۲۰۳ تا ۲۰۵

ہوئے بات آگے بڑھائیں تو ''فعجل لکم ھذہ'' کا مصداق 'صلح حدیبیہ' ہوگی اور یہ کوئی سیاسی غنیمت نہ ہوگی جو اس سفر میں انہیں نصیب ہوئی۔ اس صورت میں غنیمت معجّل کی تشریح فتح قریب نہیں قرار پائے گی بلکہ معجّل سے ''حدیبیہ'' کی کامیابی اور فتح قریب سے فتح خیبر مراد ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں غیر معجّل مال غنیمت سے، جس کا ذکر دوسری آیہ مبارکہ (وعدکم اللہ مغانم کثیرۃ) میں ہوا ہے، خیبر کی غنیمت مراد ہوگی۔ مزید برآں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کو اللہ سبحانہ کی خاص عنایت سے حاصل ہوا وہ جنگ حنین و ہوازن میں حاصل ہونے والا مال غنیمت ہوگا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىۡ مَوَاطِنَ كَثِيۡرَةٍ‌ ۙ وَّيَوۡمَ حُنَيۡنٍ‌ ۙ (سورہ توبہ: ۲۵)

''(اے مسلمانو!) اللہ سبحانہ نے ان گنت مقامات پر تمہاری مدد کی (علی الخصوص) جنگ حنین کے موقع پر''

یہ آیہ مجیدہ دراصل آیہ (واخری لم تقدروا) یعنی (وہ مقامات جنگ) جب تم بے بس ہو گئے تھے کا ایک مصداق ہے۔

عذر تراش منافقین

صلح حدیبیہ کے بعد جب حضرت رسولِ اکرمؐ سیاسی کامیابی کے ساتھ مدینہ منورہ لوٹے تو منافقین ظاہر داری کرتے ہوئے آپؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے:

''ہم گھریلو مسائل اور گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے آپؐ کی ہمرکابی کے شرف سے محروم رہے۔ بارگاہِ خداوندی میں ہماری اس لغزش کی معافی کے لیے سفارش فرمائیے''

قرآن مجید گواہی دے رہا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے اور حضرت رسولِ اکرمؐ کے ساتھ اس سفر پر نہ جانے کا سبب دراصل ان کا احساس خوف تھا بلکہ وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے:

''حضورؐ اور مسلمان دشمن کے علاقے میں غیر مسلح جا رہے ہیں۔ یہ کبھی صحیح و سلامت واپس نہیں آئیں گے''

ظاہر ہے کہ ذاتی مسائل اور مصروفیات مسلمانوں کے ساتھ شریک نہ ہونے کا محض ایک بہانہ تھا۔ اس جماعت کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ گھر میں بیٹھ رہنا سلامتی اور حضورؐ کے ساتھ جانا پریشانی کا سبب نہیں، بلکہ ہوتا وہی ہے جس کا اللہ سبحانہ ارادہ فرما لے۔ اگر اللہ سبحانہ کسی کی بھلائی یا برائی چاہے تو یقیناً ویسا ہی ہو کر رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں۔

سَيَقُوۡلُ لَكَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ شَغَلَـتۡنَاۤ اَمۡوَالُـنَا وَاَهۡلُوۡنَا فَاسۡتَغۡفِرۡ لَـنَا‌ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَلۡسِنَتِهِمۡ مَّا لَـيۡسَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ‌ ؕ قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ لَـكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـئًـا اِنۡ اَرَادَ بِكُمۡ ضَرًّا اَوۡ اَرَادَ بِكُمۡ نَفۡعًا‌ ؕ بَلۡ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ۝۱۱ (سورہ فتح: ۱۱)

''ہماری کاروباری اور گھریلو مصروفیات آپؐ کے ساتھ نہ جانے کا سبب بنیں، اس لیے ہمارے لیے مغفرت

طلب کریں، یہ اپنے دل کی بات نہیں کہہ رہے۔ آپؐ ان سے کہہ دیجیے، ''اگر اللہ سبحانہ تمہارے نفع یا نقصان کا ارادہ کرلے تو کون ہے جو تمہیں اس کے ارادے سے محفوظ رکھے۔ اللہ سبحانہ خوب جانتا ہے جو تم کیا کرتے ہو''

آگے قرآن بیان کرتا ہے:

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۲﴾

(سورہ فتح: ۱۲)

''(اے منافقو! ہمارے پیغمبرؐ کے ساتھ نہ جانے کی وجہ تمہارا کاروبار اور گھریلو مصروفیات نہیں تھیں) بلکہ تمہارا رازِ غم تھا کہ اس سفر سے پیغمبرؐ سمیت کبھی واپس نہیں لوٹیں گے بلکہ (مارے جائیں گے)۔ اس بات پر تم نے یقین کرلیا اور بدظن ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تم خود ہی ہلاک ہوئے''

اصل بات یہ ہے کہ ایک منافق جس کا معنوی دنیا سے کوئی تعلق نہیں اس کے لیے تو سب کچھ یہی مادی دنیا اور مادی مفادات ہیں۔ جب بھی اسے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کہا جاتا ہے اسے اس میں جان کا خطرہ یا دور دراز کے سفر میں بغیر کسی مادی مفاد کے تھکن و تکلیف کی مصیبت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس کا جہاد سے منہ موڑنا قابل فہم ہے۔ البتہ اگر مالِ غنیمت ہاتھ آنے کا یقین ہو اور سفر دیگر دلچسپیوں کا باعث بھی ہو تو وہ 'جہاد' کے عنوان سے جانے کو تیار بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾ (سورہ توبہ: ۴۲)

''اگر سفر تھوڑا ہو، مالِ غنیمت ملنے کی توقع بھی ہو، تو یہ لوگ (منافقین) ضرور تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائیں گے۔ مگر (غزوہ تبوک) کا سفر چونکہ دور دراز اور تھکا دینے والا تھا اس لیے انہوں نے نافرمانی کی۔ وہ جلدی جلدی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو ضرور تمہارے ساتھ جاتے۔ اس طرح جھوٹ بول بول کر یہ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اللہ سبحانہ خوب جانتا ہے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں''

لالچی منافقین

جب حریص اور لالچی منافقین کو معلوم ہوا کہ آئندہ سفر جہاد دور دراز کا نہیں بلکہ قریب ہی کا ہے اور راستے میں کوئی زیادہ خطرہ بھی

نہیں، مالِ غنیمت بھی وافر ہاتھ آنے کی توقع ہے، تو بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوئے اور آئندہ جنگ میں شرکت کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس معاملہ میں وحی کا انتظار فرمانے لگے جو نازل ہوئی۔ آیاتِ مجیدہ سے جو اس سلسلہ میں نازل ہوئیں، معلوم ہوتا ہے کہ منافقین جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت کرنے کا اظہار کر رہے تھے لیکن یہ بھی کہتے تھے کہ اپنے ساتھ ان کی شرکت جہاد میں ممانعت سوائے حسد کے اور کچھ نہیں۔ قرآن مجید میں ان کی شرکت جہاد اور ان کے الزام حسد کے جواب میں دو آیات مجیدہ نازل ہوئیں۔ ہم ان آیات کے نکات، آیات اور ان کے ترجمہ کو نقل کرنے کے بعد پیش کرتے ہیں۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥﴾

(سورہ فتح: ۱۵)

''(اے رسولؐ) اب جب کہ آپؐ مالِ غنیمت والی جنگ کرنے جا رہے ہیں تو سفر عمرہ کی مخالفت کرنے والے بھی آپؐ کے ساتھ جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ یہ اللہ سبحانہ کی بات کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ آپؐ ان سے کہہ دیجیے کہ ہمارے ساتھ مت آؤ! اللہ سبحانہ نے پہلے ہی ممانعت کر دی ہے۔ جواباً وہ کہیں گے کہ مسلمان ہم سے حسد کرتے ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ یہ بہت کم سمجھتے ہیں''۔۔۔ نیز

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ ۖ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ۖ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٦﴾ (سورہ فتح: ۱۶)

''(اے رسولؐ) جنگ سے منہ موڑنے والوں سے کہہ دیجیے کہ عنقریب تم سے کہا جائے گا کہ ایک طاقت ور قوم کے خلاف لڑو جب تک کہ وہ ایمان لے آئیں یا مارے جائیں۔ اگر تم نے فرمانبرداری کی تو اللہ سبحانہ تمہیں بہترین جزا دے گا اور اگر پہلی کی طرح پھر روگردانی کی تو اذیت ناک عذاب سے دوچار کرے گا''

دونوں آیات میں مندرجہ ذیل نکات ہیں:

(الف) پہلی آیہ مجیدہ میں جملہ ''لن تتبعونا'' (ہرگز ہمارے ساتھ نہ آؤ) اگرچہ جملہ خبریہ ہے مگر اس سے نہی کے معنی مراد لیے گئے ہیں اور ترجمہ بھی نفی کے معنی میں ہی کیا گیا ہے۔ لیکن ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ ایک خبر غیب ہو جس سے اللہ سبحانہ اپنے پیغمبرؐ کو مطلع کر رہا ہو تا کہ وہ انہیں ان کے مستقبل کے بارے میں بتا دیں کہ وہ آئندہ کبھی دشمن کے ساتھ جنگ میں شرکت نہ کریں گے۔

(ب) اسی طرح ''یریدون ان یبدلوا کلام اللہ'' (یہ چاہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کی بات کی تردید ہو جائے) کا جملہ اس حقیقت کو آشکار کر رہا ہے

کہ منافقین جنگ میں شرکت پر اس لیے اصرار کر رہے تھے کہ اللہ سبحانہ کو جھٹلائیں کیونکہ اس سے پہلے جملہ میں اللہ سبحانہ اپنے رسولؐ کے ذریعے اعلان فرما چکا ہے کہ یہ لوگ جنگ میں ہرگز شرکت نہیں کریں گے۔ یہ بات ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ جہاد میں شریک ہو کر اللہ تعالیٰ کی بات کو جھٹلائیں۔ یہ مفہوم ''لن تتبعو نا'' کے جملہ کے ''خبریہ'' ہونے پر بہتر طور پر دلالت کرتا ہے۔

(ج) تیسرا جملہ ''بل تحسد وننا'' (بات یہ ہے کہ تم ہم سے حسد و بغض رکھتے ہو) منافقین کے سب سے بڑے ہتھکنڈے یعنی الزام تراشی اور تہمت لگانے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو حضورِ اکرمؐ کی طرف سے اجازت نہ ملنے پر انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ آپؐ حسد کی وجہ سے ان کو اجازت نہیں دے رہے۔اس پر قرآن مجید نے حضورِ اکرمؐ کا دفاع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ **''بل کانوا لا یفقھون الاقلیلاً''** (منافقین اپنی جہالت اور کج فہمی کی وجہ سے حضورِ اکرمؐ پر خواہ مخواہ الزام دے رہے ہیں)

(د) دوسری آیہ مجیدہ جنگ میں شرکت کے لیے منافقین کے اصرار کا مثبت جواب دے رہی ہے کہ ٹھیک ہے کہ اگر تم لوگ واقعی اہل تقویٰ و پرہیز گار ہو، اسلام کے ہمدرد بھی ہو اور اسلام کی سر بلندی کے لیے جہاد کرنا چاہتے ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ۔ایک طاقت ور دشمن کے ساتھ مقابلہ ہونے والا ہے۔تم اس میں اتنا جہاد کرنا کہ یا تو دشمن اسلام لے آئے یا مارا جائے۔تم ایسے مقدس جہاد میں شرکت کر سکو گے۔

اس آیہ مجیدہ میں چونکہ قرآن مجید نے جنگ کے خاتمہ کو دشمن کی مکمل نابودی یا قبول اسلام معیار مقرر کیا ہے، اس لیے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دشمن سے مراد ''مشرکین'' ہیں نہ کہ اہل کتاب کیونکہ مشرکین کے بارے میں خاتمہ جنگ کے یہی دو طریقے ہیں جب کہ اہل کتاب کے ساتھ تو جنگ جزیہ دینے کی آمادگی یا ذمی بننے کی خواہش پر بھی ختم ہو سکتی ہے۔ان کے لیے ضروری نہیں کہ اسلام ہی قبول کریں۔ چنانچہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس جنگ سے مراد ''غزوہ حنین'' اور قبیلہ ہوازن سے جنگ ہے کیونکہ وہ طاقت اور بہادری میں مشہور تھے۔آیہ مبارکہ میں اس جنگ سے سریۂ موتہ کا مراد لیا جانا چنداں درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ جنگ اہل کتاب سے ہونے والی تھی۔

یہ آیہ مجیدہ چھٹی ہجری کے اواخر میں نازل ہوئی۔اس وقت ابھی یہ اُمید باقی تھی کہ جنگ سے منہ موڑنے والوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان کو آئندہ پیش آنے والی جنگوں میں شرکت کی اجازت دے دی گئی۔مگر نویں ہجری میں نازل ہونے والی آیات جو 'غزوہ تبوک' کے ذیل میں نازل ہوئیں، اس حقیقت کی عکاس ہیں کہ منافقین اس حد تک گر چکے تھے کہ شرکت جہاد کی صلاحیت ہی ان میں ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ صریح طور پر ان کو جنگ میں شرکت سے روک دیا گیا۔جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ (سورہ توبہ: ۸۳)

''(اے رسولؐ) ان (منافقین) سے کہہ دیجیے کہ وہ اب کسی مہم پر آپؐ کے ساتھ نہ جائیں گے اور نہ کسی کے خلاف جہاد کریں گے۔تم لوگوں نے شروع ہی سے الگ روش اپنالی ہے۔پس مخالفین کے ساتھ ہی رہو!''

صلح حدیبیہ کے موقع پر دشمن کی عسکری طاقت

یہاں قرآن مجید ایک اہم نکتہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر قریش سے مسلمانوں کی صلح اس لیے نہ تھی کہ اگر جنگ چھیڑ جاتی تو مسلمانوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑتا اور قریش فتح یاب ہوتے، بلکہ اگر جنگ ہوتی تو قریش مسلمانوں کو پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾

(سورہ فتح: ۲۲)

''اگر کفار تم سے جنگ کرتے تو یقیناً انہی کے پاؤں اکھڑ جاتے اور (تمہارے خلاف) ان کا کوئی مددگار نہ ہوتا!''

اس موقع پر قرآن مجید ایک بنیادی اصول بیان کر رہا ہے کہ دراصل ''فتح'' اسلام کا حصہ ہے اور ''شکست'' کفر کا مقدر! یہی اللہ سبحانہ کی سنت و طریق کار ہے۔ قرآن پاک تاکید کے ساتھ اشارہ فرماتا ہے کہ سپاہ توحید کے مقابلہ میں کفر کی شکست ایک مسلمہ ہے لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں جن سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ لہٰذا جہاں بھی سپاہِ اسلام کو شکست ہوئی اس کی وجہ ان شرائط کو نظرانداز کرنا تھا، جن کا نتیجہ بصورت شکست ظاہر ہوا ورنہ سچے اور ایماندار مسلمان ہمیشہ فاتح و کامران رہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

(سورہ فتح: ۲۳)

''یہی اللہ تعالیٰ کی مستقل سنت ہے اور تم اس میں کبھی بھی تبدیلی نہیں پاؤ گے''

اللہ تعالیٰ کا یہ طریق کار خلوص و ایثار کا مرہون منت ہے جس کے مدارج یہ ہیں:

۱۔ انسان اللہ سبحانہ کے احکام کی نظم و ضبط کے ساتھ پیروی کرے۔

۲۔ جنگ کے مادی وسائل ممکنہ حد تک حاصل کر لیے گئے ہوں۔

۳۔ ایسے میں مسلمان کا ایمان اور جذبہ قربانی اس کو حتمی فتح سے ہمکنار کرتا ہے اگرچہ بعض اوقات ابتداء میں حالات مایوس کن ہوں مگر آخرکار فتح و کامرانی مسلمانوں ہی کا حصہ ہوتی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر صلح حدیبیہ کے موقع پر جنگ چھڑ جاتی تو مسلمان یقیناً فتح یاب ہوتے۔ اگر یہ صحیح بات تھی تو پھر

حضورِ اکرمؐ نے صلح کا راستہ کیوں اختیار فرمایا، بالخصوص جب کہ بعض قریشی مسلمانوں کو لوٹنے اور انہیں اسیر کرنے کی غرض سے حملہ آور ہوئے جن کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا، لیکن آنحضرتؐ نے انہیں غیر مشروط طور پر رہا کرنے کا حکم صادر فرمایا؟ درج ذیل آیہ مبارکہ اسی واقعے کو بیان فرما رہی ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝۲۴ (سورہ فتح: ۲۴)

''(اللہ سبحانہ) وہ ہے جس نے مکہ میں تمہارے اور قریش کے درمیان خونریزی کو روکا جب کہ تم ان پر غالب آ چکے تھے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو''

ہمارے مذکورہ بالا سوال میں یہ بات زیادہ شدت پیدا کر دیتی ہے کہ مشرکین مکہ دو سنگین جرائم کے مرتکب بھی ہوئے تھے۔

۱۔ انہوں نے بیت اللہ کے زائرین کا راستہ روکا تھا۔

۲۔ قربانیوں کو 'قربان گاہ' تک لے جانے کی ممانعت کی تھی کیونکہ بعض صحابہ کرامؓ اپنے ساتھ قربانیاں لائے تھے کہ عمرہ بجالانے کے بعد قربانیاں کریں گے۔ اس سب کچھ کے باوجود بات صلح پر تمام ہوئی۔

مندرجہ ذیل آیہ مجیدہ میں مشرکین مکہ کے مذکورہ بالا دونوں جرائم کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ مکہ معظّمہ میں بعض مومن افراد کی موجودگی کی وجہ سے جنگ کا حکم نہ دیا گیا۔ مکہ میں ابھی تک بعض مفلوک الحال مسلمان رہتے تھے جو بوجوہ مدینہ کی طرف ہجرت نہ کر سکے تھے۔ اگر جنگ چھڑ جاتی تو اس کا دائرہ مکہ تک پہنچ جاتا اور ان بیچاروں پر خواہ مخواہ مصیبت آ جاتی جو بجائے خود مسلمانوں کے لیے بہت بڑا نقصان ہوتا۔ البتہ اگر مشرکین مکہ ان مسلمانوں سے الگ تھلگ ہوتے تو ان کی بیخ کنی ضرور کی جاتی:

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔـوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۲۵

(سورہ فتح: ۲۵)

''(مشرکین مکہ) وہ لوگ ہیں جو کافر ہو گئے تمہیں مسجد حرام میں جانے سے روکا اور قربانیوں کو قربان گاہ تک نہ جانے دیا۔ اگر مکہ میں مومن خواتین و حضرات نہ ہوتے، جو تمہاری لاعلمی کی وجہ سے تمہارے ہی ہاتھوں مصیبت میں پڑ جاتے (تو تمہیں اللہ سبحانہ، ضرور ان پر غالب کرتا) اللہ سبحانہ، جسے چاہتا ہے اپنے دامن رحمت میں پناہ

دیتا ہے اور اگر کفار مسلمانوں سے الگ رہ رہے ہوتے تو ان کو سخت سزا دی جاتی''

اس آیہ مجیدہ میں ''**ھم الذین کفروا و صدو کم عن المسجد الحرام**'' والا جملہ ان کے پہلے جرم کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور **الھدی معکوفاً**'' کا جملہ دوسرے جرم کی طرف، جب کہ ''**ولولا رجالٌ...**'' کا جملہ جنگ کی اجازت نہ دینے کی علت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

آخری خوشخبری

اس کے بعد قرآن مجید مسلمانوں کو ایک اور خوشخبری سنا رہا ہے کہ اگر اس سال تم خانہ خدا کی زیارت سے محروم رہے ہو تو آئندہ سال تم احرام باندھے ہوئے مسجد حرام میں داخل ہو گئے اور نہایت سکون و امن کے ساتھ عمرہ کا فریضہ بجالاؤ گے۔ کیونکہ حضرت رسولِ اکرمؐ کا خواب سچا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ (سورہ فتح: ۲۷)

''اللہ سبحانہ نے اپنے پیغمبرؐ کا خواب سچ کر دکھایا۔ اب تم عنقریب نہایت امن وسکون کے ساتھ سر منڈواتے اور ناخن کاٹتے ہوئے مسجد حرام میں داخل ہو گے۔ تمہیں کسی کا ڈر وخوف نہیں ہوگا۔ اللہ سبحانہ وہ کچھ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے (وہ عمرہ میں تاخیر کی مصلحتوں سے آگاہ ہے) اور اس سے قبل ایک قریبی فتح بھی اس نے تمہارے لیے قرار دی ہے''

اس آیہ مجیدہ سے ان لوگوں کے منہ بند ہو گئے جو حضورِ اکرمؐ پر اعتراضات کر رہے تھے کہ نہ ہم مسجد حرام میں داخل ہو سکے اور نہ سر منڈوا سکے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اگلے ہی سال (ساتویں ہجری) ماہِ ذیقعد میں مسلمان مکہ میں داخل ہوئے اور بڑے عزت و وقار کے ساتھ مناسک عمرہ بجالائے۔ اس کو عمرہ قضاء کے نام سے پکارا گیا۔ مزید برآں اسی سال عمرہ سے پہلے مسلمانوں کو خیبر میں شہرہ آفاق فتح حاصل ہوئی اور ساتھ میں کثیر مالِ غنیمت بھی ہاتھ لگا۔

(٦)

غزوۂ ذات السلاسل

حضورِ اکرمؐ کے مخبروں نے اطلاع دی کہ ''وادیٔ یابس'' میں بسنے والے ہزاروں افراد نے باہمی معاہدہ کیا ہے کہ اسلام کو تباہ کر کے رہیں گے یا خود مارے جائیں گے یا حضورِ اکرمؐ اور ان کے سپہ سالار، اشجعِ روزگار حضرت علیؑ کو قتل کر دیں گے۔

جناب علی بن ابراہیم قمی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے حضورِ اکرمؐ کو بذریعہ وحی اس فتنے سے آگاہ فرمایا۔[1]

علی ہذا القیاس محقق دانشور جناب شیخ مفیدؒ رقم طراز ہیں کہ ایک مخلص مسلمان نے حضورِ اکرمؐ کو یہ اطلاع دی اور مقام اجتماع ''وادی الرمل'' بتایا جہاں[2] ہزاروں لوگ جمع تھے اور اسلام کے خلاف عہد کر چکے تھے۔ انہوں نے اتنا اضافہ کیا کہ وہ مدینہ پر شبخون مارنا چاہتے ہیں تا کہ مسلمانوں کے مرکز کو تباہ کر کے اسے ختم کر دیا جائے۔[3]

حضرت رسول اکرمؐ نے ضروری جانا کہ مسلمانوں کو اس سنگین خطرہ سے آگاہ فرمائیں۔ اس زمانہ میں لوگوں کو جمع کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ ''الصلوٰۃ جامعۃ'' کا جملہ پکارا جاتا اور لوگ مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ حضورِ اکرمؐ کے حکم سے منادی نے مسجد کے ایک بلند مقام سے مذکورہ جملہ بآوازِ بلند پکارا۔ تھوڑی ہی دیر میں مسلمان مسجد میں جمع ہو گئے۔ حضورِ اکرمؐ رونق افروزِ منبر ہوئے اور ارشاد فرمایا:

''مسلمانو! دشمن تمہاری گھات میں بیٹھا ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ کسی رات بے خبری میں تمہارے خلاف شبخون مارے۔ تم میں سے کون ہے جو اس مہم کو سر کرنے کے لیے جائے''۔

مسلمانوں کی ایک جماعت اسی وقت تیار ہو گئی۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کو سپہ سالار بنایا گیا اور اسی وقت وہ اس مہم کے لیے تیار ہو کر ''قبیلہ بنی سلیم'' کی طرف روانہ ہوئے۔ مسلمانوں کا سفر بہت پتھریلے راستہ میں تھا اور یہ قبیلہ پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع درہ میں رہتا تھا اور درے کے تمام نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف تھا۔ مسلمان جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قیادت میں درے میں پہنچے تو بنی سلیم نے ان کا راستہ روکا۔ مسلمان فوج کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ جس راستہ سے آئے تھے اسی پر واپس ہو جائیں۔[4]

جناب علی ابن ابراہیم اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ 'بنی سلیم' کے اکابرین نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے فوج کشی کا سبب دریافت کیا تو

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، ج ۲، ص ۴۳۴ سورۃ العادیات

[2] گمان غالب یہ ہے کہ ''وادی الرمل'' وادیٔ یابس کا بیابانِ خشک ہی ہے

[3] الارشاد، ص ۸۳

[4] الارشاد، ص ۸۴

آپؐ نے کہا کہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے کہ آپ کو دین اسلام کی دعوت دوں۔ اگر تم قبول کرنے سے انکار کرو تو تم سے جنگ کروں۔ اس پر سرداران قبیلہ نے اپنی کثیر فوج اور جدید اسلحہ کی نمائش کی، جس سے مسلمان مرعوب ہو گئے اور سپہ سالار نے بعض مسلمان مجاہدوں کی لڑنے کی رائے کے خلاف واپسی کا حکم دیا اور سب کو لے کر مدینہ واپس آ گئے۔

اسلامی فوج کی اس طرح واپسی پر حضور اکرمؐ بڑے دل گرفتہ ہوئے اور آپؐ نے فوراً حضرت عمرؓ کو بلا کر فوج کی سپہ سالاری ان کے سپرد کی۔ اس مرتبہ 'بنی سلیم' دشمن پہلے سے زیادہ ہوشیار تھا۔ چنانچہ وہ درے کے دہانے پر بڑے بڑے پتھروں اور درختوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جونہی اسلامی افواج درے میں نمودار ہوئیں وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور بہادری کے ساتھ حملہ کیا۔ مسلمان سپہ سالار نے اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیا اور یہ سب لوگ مدینہ واپس آ گئے۔

اس موقع پر عرب کا بڑا سیاست دان اور حیلہ گیر عمر عاصؓ حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں وہ تازہ تازہ حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا۔ اس نے آنحضرتؐ سے عرض کیا: ''جنگ صرف بہادری ہی سے نہیں جیتی جاتی بلکہ اس میں کچھ چالاکی کی ضرورت بھی ہوا کرتی ہے۔ اگر آپؐ مجھے سپہ سالار بنائیں تو میں اپنی مخصوص چالوں سے دشمن کو زیر کر لوں گا''۔ پیغمبر اکرمؐ نے بعض مصلحتوں کے باعث ان کو اجازت دے دی لیکن وہ بھی سابقہ سپہ سالاروں کی طرح اسی انجام سے دوچار ہوئے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ سپہ سالار بنائے گئے:

مسلمان افواج کی پے در پے پسپائیوں سے مسلمانوں کو بے انتہا رنج ہوا۔ آخر حضورِ اکرمؐ نے لشکر اسلام کی تنظیم نو کی اور امیر المومنین حضرت علیؑ کو سپہ سالار بنایا اور انہیں فوج کا علم عطا فرمایا۔ حضرت علی بیت الشرف میں تشریف لے گئے اور اپنی قابل احترام اہلیہ جناب زہراء سے وہ کپڑا مانگا جو آپ خطرناک مواقع پر سر پر باندھا کرتے تھے۔ آپ نے وہ کپڑا سر پر باندھا۔ دختر رسولؐ یہ منظر دیکھ کر آب دیدہ ہو گئیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کے شوہر عزیز کسی شدید وخطرناک مہم پر جا رہے ہیں۔ حضرت رسولِ اکرمؐ نے اپنی بیٹی کو دلاسہ دیا اور ان کے آنسو اپنے دست مبارک سے پونچھے۔ آپؐ حضرت علیؑ کے ہمراہ 'مسجد افراب' تک الوداع کہنے تشریف لے گئے۔ حضرت علیؑ ابلق گھوڑے پر سوار تھے۔ دو یمنی لباس پہنے تھے، ہندی نیزہ ہاتھ میں پکڑے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ آپ نے اپنے سفر کو بالکل پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ مجاہدین نے خیال کیا کہ آپ عراق کی طرف جا رہے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے مندرجہ ذیل جملہ حضرت علیؑ کے لیے فرمایا:

''ارسلته کرارا غیر فرار'' یعنی اب کی بار میں نے اس شخص کو سپہ سالار بنایا ہے جو دشمن پر بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہے اور بھاگنے والا نہیں''۔

حضرت علیؑ سے آنحضرتؐ کا یہ جملہ فرمانا ظاہر کرتا ہے کہ حضرت علی سے پہلے جانے والے تمام سپہ سالار نہ صرف یہ کہ دشمن سے شکست کھا گئے تھے بلکہ اسلام کے اصولِ جہاد کے برعکس قتال سے منہ موڑتے ہوئے واپس لوٹ آئے تھے جس میں اسلام کی زبردست اہانت تھی۔

اس جنگ میں حضرت علی کی فتح کا راز

امیر المومنین حضرت علیؑ کی فتح کے رموز کو تین مطالب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ آپ نے دشمن کو اپنے اقدام کا علم نہ ہونے دیا، اپنا راستہ اس قدر بدل دیا کہ خانہ بدوش عرب اور قبائل آپ کے حملہ کی خبر دشمن تک نہ پہنچا سکے۔

۲۔ آپؑ نے ایک خاص نظم و ضبط اختیار کرتے ہوئے اپنے سفر کو اس طرح مخفی رکھا کہ رات کو سفر فرماتے اور دن کو مخفی مقامات میں ٹھہر جاتے اور آرام فرماتے۔ ابھی آپؑ درہ کے کنارے پر نہیں پہنچے تھے کہ آپؑ نے سردارانِ فوج کو آرام کرنے کا حکم دیا۔ اس خیال سے کہ دشمن آپ کے درہ کے قریب آنے سے مطلع نہ ہو پائے۔ آپ نے حکم دیا کہ گھوڑوں کے منہ باندھ دیے جائیں تا کہ ان کی ہنہناہٹ دشمن کو بیدار و چوکس نہ کردے۔

علی الصبح آپؑ نے اپنے اصحاب کے ہمراہ نماز ادا فرمائی پھر سردارانِ فوج کو پہاڑ کی پچھلی طرف سے فوج کو پہاڑ پر چڑھنے اور دشمن پر حملہ کا حکم دیا۔ دشمن ابھی محوِ خواب تھا کہ اسلام کے مجاہدین اپنے بہادر و شجاع سپہ سالار کے حکم سے بجلی کی طرح ان پر حملہ آور ہوئے۔ انہوں نے ایک جماعت کو قیدی بنایا اور کچھ لوگوں نے راہِ فرار اختیار کی۔

۳۔ خود حضرت علی کی جوانمردی اور بہادری کا یہ عالم تھا کہ آپؑ نے بنی سلیم کے سات بہادروں کو زندہ گرفتار کیا۔ اس کے بعد دشمن میں تاب مقاومت نہ رہی اور وہ کثیر مال غنیمت چھوڑ کر فرار ہو گیا۔[۱]

اسلام کے یہ نامور سپہ سالار بے مثال فتح و کامرانی کے ساتھ مدینہ واپس آئے۔ حضورِ اکرمؐ اپنے صحابہ کرامؓ سمیت مدینہ سے باہر اسلامی افواج کی پیشوائی کے لیے تشریف لائے۔ جب حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کو آتے دیکھا تو فوراً گھوڑے سے اتر پڑے۔ حضورِ اکرمؐ نے آپ کی پشت کو تھپتھپایا اور فرمایا: ''علیؑ اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ اللہ سبحانہ اور اس کا رسول تم سے راضی ہیں''۔ فرطِ انبساط سے حضرت علیؑ اشکبار ہو گئے۔ اس موقع پر حضورِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کی شان میں ایک تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

> ''اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ میری امت بھی تمہارے بارے میں وہی کچھ اعتقاد رکھنے لگے گی جو عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بنا لیا ہے تو آج میں تمہارے حق میں وہ بات کہتا کہ تم جہاں سے بھی گزرتے لوگ تمہاری خاکِ پا کو بطورِ تبرک اٹھا لیتے''۔[۲]

حضرت علیؑ کی یہ بہادری اور جان نثاری اللہ سبحانہ کے حضور اتنی قابل قدر تھی کہ پوری سورہ ''العادیات'' اس واقعے کے بارے میں

---

[۱] تفسیر فرات، ص ۲۲۲ تا ۲۲۶ اور تفسیر مجمع البیان ج ۱۰، ص ۵۲۸

[۲] شرح ابن ابی الحدید جلد ۹ ص ۱۶۸، و مناقب ابن المغازلی ص ۲۳۷، ص ۲۳۸

نازل ہوئی۔اس میں کھائی جانے والی قسمیں اچھوتے انداز کی حامل اور عجیب طرح کی ولولہ انگیز ہیں جس سے ان مجاہدوں کی مردانگی اور دلاوری آشکار ہوتی ہے،سورۃ العادیات میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ (سورہ عادیات: ۱ تا ۵)

''قسم ہے سرپٹ دوڑنے والے ان گھوڑوں کو جو لمبی سانسیں لیتے ہوئے میدانِ کارزار کی طرف بڑھتے ہیں، سنگلاخ چٹانوں پر جن کے سم ٹکرانے سے بجلی کی چنگاریاں نکلتی ہیں، علی الصبح دشمن پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں، اپنی برق رفتاری سے فضا کو غبار سے بھر دیتے ہیں اور دشمن کو محصور کر لیتے ہیں''

مجاہدوں کے گھوڑوں کی قسم کھانے کا فلسفہ

اللہ سبحانہ جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت بیان کرنے کے لیے مجاہدوں کی ایک اچھوتے انداز میں تعریف فرماتا ہے۔مجاہدوں کی اس خاص کیفیت کی قسم کھاتا ہے کہ جب وہ یہ جان نثاری کر رہے تھے اور اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر جانبازی کے جوہر دکھا رہے تھے۔عین اس وقت جب وہ حملہ آور ہو رہے تھے، ان کے گھوڑے سرپٹ بھاگ رہے تھے، ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور سنگلاخ چٹانوں سے ان کے سم ٹکرا کر چنگاریاں پیدا کر رہے تھے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: والعادیات ضبحاً فالموریات قدحاً'

اللہ سبحانہ نے مجاہدوں کے گھوڑوں کی قسم کھا کر دراصل مجاہدوں کی عزت افزائی فرمائی ہے تا کہ دوسرے مسلمانوں میں بھی شوق جہاد پیدا ہو اور وہ اپنی تمام تر توانیاں اللہ سبحانہ اور انسانیت کے دشمنوں کو ختم کرنے میں صرف کریں۔[1]

---

[1] میرے روحانی بیٹے جناب ابوالقاسم رزاقی (شہید) نے ایک کتاب بعنوان ''قرآن کی قسمیں'' لکھی ہے۔اس کا مقدمہ مؤلف نے رقم کیا ہے۔قارئین اس سورۂ مجیدہ کی قسموں کے بارے میں مزید معلومات کے لیے اس کتاب کے صفحہ ۲۱۳ سے ۲۲۸ کا مطالعہ فرمائیں۔

(۷)

فتح مکہ یا فتح مبین

''توحید کا گھر'' جسے کعبہ کہتے ہیں مکہ مکرمہ میں واقع ہے۔ روزِ اول ہی سے اس کا تعلق موحدین سے رہا ہے۔ اس کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر کے موحدین سال میں ایک مرتبہ یہاں اکٹھے ہوں۔ توحید کے زبردست داعی جناب حضرت ابراہیم کے زمانہ سے صدیوں بعد تک یہ گھر موحدین کا مرکز رہا ہے۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کی بعثت سے تقریباً سو سال قبل 'شام' کے بت پرستوں کے ذریعے یہاں بت پرستی سرایت کر گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ توحید کا یہ گھر ''بت خانہ'' میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ مدینہ میں استحکام حاصل کرنے کے بعد سے حضرت رسولِ اکرمؐ کی یہ کوشش رہی کہ جلد از جلد بت پرستوں کے اس مرکز کو ختم کیا جائے اور خانہ کعبہ کو بتوں اور بے ہودہ رسومات سے پاک کر کے جزیرہ نمائے عرب میں بت پرستی و شرک کا مکمل قطع قمع کر دیا جائے۔

صلح حدیبیہ کے بعد کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ مسلمان اتنی جلدی اس مرکز پر قبضہ کر لیں گے کیونکہ صلح حدیبیہ کی شرائط کے تحت طرفین دس سال تک ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کرنے کے پابند تھے۔ مگر حدیبیہ سے واپسی پر اللہ سبحانہ کی طرف سے وحی کے ذریعے مسلمانوں کو دو بڑی کامیابیوں کی نوید سنائی گئی۔ یہ دو بڑی کامیابیاں یہ ہیں:

۱۔ فتح قریب، یعنی قریبی فتح

۲۔ فتح مبین یعنی کھلی ہوئی اور ظاہر و باہر فتح

اول الذکر ''فتح'' سے مراد خیبر کے قلعوں کی فتح تھی جو ۷ھ ماہ جمادی الاول میں انجام پائی جس سے [1] شمال کی طرف سے مدینہ محفوظ ہو گیا اور خیبر کے یہودی غیر مسلح ہو گئے۔ چونکہ اس معرکے اور صلح حدیبیہ میں بہت کم عرصہ کا فاصلہ تھا اس لیے اس کو ''فتح قریب'' پکارا گیا اور سورہ فتح ''واثابھم فتحا قریباً'' کا ارشاد ہوا۔ (فتح ۱۸، ۲۷)

البتہ اسی سورہ یعنی سورہ فتح کے شروع میں ہی مسلمانوں کو ایک اور فتح کی خوشخبری سنائی گئی ہے جس کو فتح واضح کا نام دیا گیا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا ۙ‏ ① (فتح:۱)

''بے شک ہم نے (اے مسلمانو!) ایک واضح فتح تمہارے لیے مقدر فرمادی''

مفسرین کا خیال ہے کہ چونکہ یہ سورہ حدیبیہ سے واپسی پر نازل ہوا اس لیے اس سے کوئی غیر متوقع کامیابی مسلمانوں کے نصیب ہونا

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۲، ص ۷۷

مراد ہے جس دن یہ آیات نازل ہوئیں مسلمانوں میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ''فتح مبین'' کیا ہے! خصوصاً اس پس منظر میں کہ طرفین میں دس سال تک جنگ و جارحیت نہ کرنے کا معاہدہ طے پا چکا ہے۔[1]

مگر ابھی اس معاہدہ کو ہوئے دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ خود مشرکین مکہ نے معاہدہ کی اس شرط کو خود ہی توڑ دیا۔ ہوا یوں کہ قریش نے ''کنانہ'' کی ایک شاخ ''بنی بکر'' کی مدد کی جنہوں نے مسلمانوں کے ایک حلیف قبیلے ''خزاعہ'' پر چڑھائی کی تھی، بہتوں کو قتل کیا اور مال و اسباب لوٹ کر لے گئے۔ مشرکین مکہ نے عملی طور پر یہ کارگزاری اس طرح کی کہ ظاہر میں قریش کا نام نہ آئے اور صرف 'بنی بکر' ہی سامنے رہیں تا کہ مسلمانوں کو کوئی بہانہ ہاتھ نہ لگے۔

لیکن جن قبیلہ والوں پر ظلم ہوا تھا انہوں نے اپنے نمائندگان بھیج کر حضرت رسولِ اکرمؐ کو قریش کی بربریت کی خبر کر دی۔ ان کے ایک نمائندہ نے مسجد نبویؐ میں کھڑے ہو کر قریش اور بنی بکر کے وحشیانہ حملہ کی تفصیل بیان کی اور آنحضرتؐ اور تمام مسلمانوں سے امداد کے حصول کے لیے اشعار پڑھے جن سے انہوں نے سب کے دلوں میں اپنے لیے ہمدردی کے جذبات کو ابھارا۔ ان حالات میں حضرت رسولِ اکرمؐ نے عہد شکن دشمن کو سزا دینے اور فتنہ کی بیخ کنی کا ارادہ فرمایا۔ مگر حضورِ اکرمؐ حرمِ الٰہی کے احترام میں یہ چاہتے تھے کہ جنگ کے بغیر ہی مکہ مسلمانوں کے قبضے میں آ جائے، اس سرزمین پر خونریزی نہ ہونے پائے اور بلا ضرورت کسی کی ناک سے بھی خون نہ نکلے۔ اس موقع پر ''فتح مبین'' کے واقع ہونے کی امیدیں پیدا ہونے لگیں اور زیرک مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ آیہ مجیدہ ''انا فتحنالك فتحا مبينا'' کا وقت آن پہنچا ہے

علاوہ براین جب حضرتِ رسول اکرمؐ مکہ سے مجبوراً ہجرت فرما رہے تھے تو آپؐ کو مکہ واپسی کی خوشخبری دی گئی تھی۔ لہٰذا مفسرین کہتے ہیں کہ یثرب کی طرف ہجرت کے دوران جحفہ کے مقام پر یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ (سورہ قصص: ۸۵)

''وہ ذات جس نے آپ پر قرآن مجید فرض کیا ہے آپ کو ضرور وطن (مکہ) واپس لائے گی''

بعض مفسرین مندرجہ ذیل دو آیات کو فتح مکہ ہی کے بارے میں قرار دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۸﴾ قُلۡ یَوۡمَ الۡفَتۡحِ لَا یَنۡفَعُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِیۡمَانُهُمۡ وَلَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۲۹﴾ (سورہ سجدہ: ۲۸، ۲۹)

''(کافر) طنز کرتے ہوئے کہ اگر آپؐ سچے ہیں تو بتائیں یہ فتح آپؐ کو کب حاصل ہوگی؟ (اے رسولؐ) ان سے کہہ دیجیے کہ فتح کے موقع پر ایمان کافروں کو کوئی فائدہ نہیں دے گا اور انہیں مطلقاً مہلت نہیں دی جائے گی''

---

[1] سیرتِ حلبی، جلد ۳، ص ۲۴

طبری نے ''فرا'' کے حوالہ سے اس آیہ مجیدہ میں بیان شدہ ''فتح'' کو ''فتح مکہ'' قرار دیا ہے۔مگر اس آیہ مجیدہ کا مفہوم ''فتح مکہ'' پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر کافروں کو ایمان لانے سے فائدہ ہوا اور انہیں مہلت دے دی گئی۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آیات کسی اور فتح کی نشاندہی کر رہی ہیں جس میں یہ دونوں علامات پائی جاتی ہوں۔

جاسوسی پکڑی گئی

مسلمانوں کو حضورِ اکرمؐ کے ارادے کا پتہ چل گیا کہ آنحضرتؐ مکہ فتح کرنے کا تہیہ فرما چکے ہیں۔ بات قریش مکہ کو بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ ان کا سردار ابوسفیان مدینہ آیا اور بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آنحضرتؐ قریش کے خلاف کسی طور جنگ نہ کریں۔مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔جب ابوسفیان نے اپنی بات پوری ہوتی نہ دیکھی تو اپنے اونٹ پر سوار ہو کر واپس مکہ چلا گیا۔

جنگی رازوں کو چھپانا جنگی حکمت عملی کا حصہ ہوتا ہے۔حضورِ اکرمؐ نے روزِ اوّل ہی سے اپنے سب غزوات میں اس اصول کو سامنے رکھا تھا۔مکہ والوں کو یہ پتہ تو چل گیا کہ حضورِ اکرمؐ بنی خزاعہ کے مظلوموں کا بدلہ لینے کے لیے مکہ پر حملہ آور ہوں گے مگر انہیں اس حملہ کے وقت کا علم نہ تھا۔حضورِ اکرمؐ نے اسلامی افواج کی حرکت کو صیغہ راز میں رکھنے کے لیے مکہ جانے والے تمام راستوں کی نگرانی کا حکم دے دیا تا کہ اسلامی فوج کی روانگی کی خبر کسی طرح مکہ والوں کو نہ ہو سکے۔ابھی اسلامی فوج حرکت میں نہ آئی تھی کہ ایک سادہ لوح مسلمان ''حاطب بن ابی بلتعہ'' کی خیانت کی خبر امین وحی نے آنحضرتؐ کو پہنچا دی۔اور بتایا کہ اس نے ''سارہ'' نامی ایک عورت کے ذریعے مکہ والوں کو خط لکھا ہے کہ مسلمان مکہ پر حملے کے لیے تیار ہیں۔

''سارہ'' مکہ کی ایک گائیکہ تھی جو شادی بیاہ پر گا نے گا کر اور موت کے موقع پر مرثیہ خوانی کر کے اپنا پیٹ پالتی تھی۔ جنگ بدر کے بعد جب قریش نے مرثیہ خوانی پر پابندی لگا دی اور شادی بیاہ کی رسوم بھی ختم کر دی گئیں تو وہ بھوکوں مرنے لگی۔آخر کار وہ مدینہ آ گئی۔حضورِ اکرمؐ نے اس سے پوچھا:

حضورِ اکرمؐ: سارہ کیا تو مسلمان ہو گئی ہے؟

سارہ: جی نہیں!

حضورِ اکرمؐ: کیا مکہ سے ہجرت کر آئی ہے؟

سارہ: جی نہیں!

حضورِ اکرمؐ: تو پھر یہاں کس لیے آئی ہے؟

سارہ: بدبختی اور بھوک کی وجہ سے

اس پر حضورِ اکرمؐ نے فرزندان عبدالمطلب سے فرمایا کہ اس کو کھانا اور کپڑے مہیا کریں۔

جب حضورِ اکرمؐ مکہ جانے کی تیاری کر رہے تھے تو حاطب بن ابی بلتعہ نے ''سارہ'' سے رابطہ کیا اور اسے دس دینار کے عوض اس بات

پر تیار کیا کہ اس کا خط قریشی اکابرین تک پہنچا دے۔ جونہی حضرت رسول اکرمؐ کو اس بات کا علم ہوا آپؐ نے حضرت علیؓ، حضرت عمارؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کو "سارہ" کے تعاقب میں بھیجا کہ جلد از جلد اسے راستے ہی میں جا لیں، اسے گرفتار کر لائیں اور خط اس سے چھین لیں۔ ان حضرات نے اسے "روضہ فاغ" میں جا پکڑا۔ جب اس سے حاطب کے خط کے بارے میں پوچھا تو اس نے انکار کیا مگر حضرت علیؓ کے ڈرانے دھمکانے سے اپنے بالوں سے خط نکال کر دے دیا اور اس کا اقرار بھی کیا۔ لہٰذا سب لوگ فوراً مدینے لوٹے اور خط خدمت اقدس رسالت مآبؐ میں پیش کیا۔ آپؐ نے حاطب کو بلایا اور خط دکھا کر پوچھا کہ وہ اپنے خط کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ اس نے فوراً اقرار کر لیا۔ آپؐ نے خط لکھنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے عرض کیا، "یا رسولؐ اللہ! جس دن سے میں ایمان لایا ہوں کبھی کفر کی حمایت نہیں کی۔ البتہ خط لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ تمام مہاجرین کے متعلقین جو مکہ میں رہ گئے ہیں، ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا کوئی نہ کوئی موجود ہے۔ میرے متعلقین کا وہاں کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے قریشی اکابرین کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بظاہر ان کی خدمت کرنا چاہی تا کہ شاید وہ مسلمانوں کے حملے کے موقع پر محفوظ رہیں۔ اس بات کا مجھے مکمل یقین ہے کہ اللہ سبحانہ کا عذاب ان پر نازل ہو کر رہے گا اور میرا خط ان کو بچا نہیں سکتا"۔

حضرت رسول اکرمؐ "حاطب" کی سادہ لوحی سے واقف تھے چنانچہ آپؐ نے اس کی معذرت قبول فرمائی، مگر حضرت عمرؓ نے اس کو قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن آنحضرتؐ نے اتفاق نہ فرمایا کیونکہ "حاطب" بدر کے مجاہدین سے بھی تھا۔ اس موقع پر درج ذیل آیات مجیدہ نازل ہوئیں جو اسلام کے اخلاقی و سیاسی احکام کو بیان کرتی ہیں۔ ہم اس حصہ کتاب میں اس موضوع پر سورہ "ممتحنہ" میں نازل ہونے والی تمام آیاتِ مبارکہ نقل کریں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ① (سورہ ممتحنہ: ۱)

"اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ۔ تم ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہو حالانکہ تمہاری طرف جو حق (اسلام و قرآن) آیا ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ وہ اللہ سبحانہ پر ایمان لانے کے جرم میں تمہیں اور پیغمبرؐ کو (مکہ سے) نکال باہر کر رہے ہیں۔ اگر تم واقعی راہِ حق میں جہاد اور میری رضا مندی کے لیے گھروں سے نکلے ہو (تو ان کو دوست مت بناؤ) مگر تم میں سے بعض خفیہ طور پر ان سے اظہارِ دوستی کر رہے ہیں۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، خفیہ یا اعلانیہ، مجھے اس کا علم ہے اور جو بھی ایسا کرے گا وہ راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہوگا"۔

اِنۡ یَّثۡقَفُوۡكُمۡ یَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ اَعۡدَآءً وَّیَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡكُمۡ اَیۡدِیَهُمۡ وَاَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَوَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ ؕ﴿۲﴾ (سورہ ممتحنہ: ۲)

''اگر وہ (کافر) تم پر غلبہ پالیں تو تمہارے دشمن بن جائیں گے، اپنے ہاتھوں اور زبان کو تمہاری برائی میں استعمال کریں گے۔ان کی تو یہی خواہش ہے کہ تم بھی کافر ہو جاؤ''

لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ ۚۛ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ ۚۛ یَفۡصِلُ بَیۡنَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۳﴾ (سورہ ممتحنہ: ۳)

''تمہارے رشتہ دار اور اولاد تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، روزِ قیامت اللہ سبحانہ تمہارے درمیان فیصلہ کردے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ سبحانہ اس کو خوب جانتا ہے''

قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا بَیۡنَنَا وَبَیۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ اِلَّا قَوۡلَ اِبۡرٰهِیۡمَ لِاَبِیۡهِ لَاَسۡتَغۡفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمۡلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَاِلَیۡكَ اَنَبۡنَا وَاِلَیۡكَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۴﴾ (سورہ ممتحنہ: ۴)

''(حضرت) ابراہیم اور ان پر ایمان لانے والوں کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ عمل ہے۔جب انہوں نے اپنے (مشرک) رشتہ داروں سے کہا ہم تم سے اور خدا کو چھوڑ کر جس کو تم پوجتے ہو، ان سے بیزار ہیں، ہم تمہارے اس دین کے منکر ہیں اور جب تک تم صرف اللہ سبحانہ پر ایمان نہیں لاتے ہمارے اور تمہارے درمیان دشمنی باقی رہے گی، البتہ (حضرت) ابراہیمؑ نے اپنے (منہ بولے) باپ (چچا) سے یہ کہا کہ میں تمہارے لیے اللہ سبحانہ سے طلب مغفرت کروں گا لیکن اس کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔(ابراہیم پکارے) پروردگار! ہمیں تیری (رحمت) ہی پر بھروسہ ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں (بلکہ) ہر چیز کی بازگشت تیری ہی طرف ہے''

رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا وَاغۡفِرۡ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ﴿۵﴾ (سورہ ممتحنہ: ۵)

''پروردگار! ہمیں کفار کی آزمائش کے لیے ذریعہ نہ بنا، ہمیں بخش دے۔ بے شک تو سب پر غالب ہے اور صاحب حکمت ہے''

یہاں تک ہم نے سورہ ممتحنہ کی پہلی پانچ آیات پیش کیں۔ اس کے علاوہ فتح مکہ سے متعلق بارہویں آیہ سے چار آیتیں جو سب فتح مکہ سے متعلق ہیں، بعد میں پیش کریں گے۔ پہلے مذکورہ بالا آیات میں قابل ذکر نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(الف) کفار سے دوستی کے مواقع

ان آیات کا موضوع ''کفار'' سے اظہارِ اخلاص اور دوستی ہے۔ اس مسئلہ کا کفار کے ساتھ معقول اور مناسب تجارتی یا سیاسی روابط سے کوئی تعلق نہیں۔ کفار سے دوستی میں کفر کو صرف نظر کرنا پڑتا ہے اور ان سے ایک مومن بھائی کی طرح برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں کوئی موقع ایسا بھی آ سکتا ہے کہ یہ دوستی اسلامی مفاد کے خلاف ہو چہ جائیکہ اس کو اسلامی دفاعی معلومات فراہم کر دی جائیں۔ ایسا ہی ''حاطب ابن ابی طبقہ'' کفار سے دوستی کی خواہش میں کر گزرا۔ اس طرح کی دوستی نہایت خطرناک ہوتی ہے اور بعض اوقات اسلام کی تباہی اور اسلام پر کفر کے غلبہ کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

مسلمانوں پر ''اندلس'' (یعنی موجودہ سپین) میں گزرنے والا المیہ کفار سے مسلمانوں کی دوستی کا دردناک انجام ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ محولہ بالا آیات زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہوں یعنی کفار سے ہر قسم کے روابط، حتیٰ کہ تجارتی اور سیاسی روابط بھی ممنوع ہوں۔ آیات کا یہ وسیع مفہوم آٹھویں اور نویں آیت کے پرتو میں ہے کیونکہ ان آیات میں کافروں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) ''ذمی'' اور (۲) ''حربی''۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات نے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے کہ 'حربی' کافروں سے ہر قسم کا رابطہ ممنوع ہے البتہ 'ذمی' کافروں سے بعض روابط استوار کیے جا سکتے ہیں۔

سورہ ممتحنہ کی دوسری آیہ مجیدہ میں کفار سے دوستی کے سنگین خطرناک نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے:

اِنۡ یَّثۡقَفُوۡکُمۡ یَکُوۡنُوۡا لَکُمۡ اَعۡدَآءً وَّ یَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡکُمۡ اَیۡدِیَہُمۡ وَ اَلۡسِنَتَہُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَ وَدُّوۡا لَوۡ تَکۡفُرُوۡنَ ؕ﴿۲﴾ (سورہ ممتحنہ: ۲)

''اگر کافر تم پر غلبہ حاصل کر لیں تو ان کی دشمنی کھل کر سامنے آ جائے گی وہ ہاتھ اور زبان سے تمہیں سخت اذیتیں دیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ اور جب تک تم دین حق ترک نہ کرو تمہیں چھوڑیں گے نہیں''

گویا اس سورہ مبارکہ کی پہلی دو آیتیں مسلمانوں کو ان خطرات سے خبردار کر رہی ہیں جن کا مسلمانوں نے بدقسمتی سے اندلس میں خیال نہ کیا، چنانچہ اپنا وقار خاک میں ملا دیا۔ اس کے نتائج ان کو اور پھر تمام ملت اسلامیہ کو بھگتنا پڑے۔

اس بنا پر مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی سے دوستی یا خلوص فکری ہم آہنگی کی وجہ سے ہی ہو سکتی ہے۔ طرفین سے اگر ایک فریق اس ہم

آہنگی سے عاری ہو تو محبت و دوستی نہیں کی جا سکتی، اگر چہ وہ اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم یعنی "تمہارے رشتہ دار اور اولاد تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے"

(ب) حضرت ابراہیمؑ۔ ابدی نمونۂ عمل

اگر چہ اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی اصول منطق و فہم عامہ سے متعلق ہوا کرتے ہیں تاہم اس کے واضح نمونے اس کیفیت کو کئی گنا روشن کر دیتے ہیں۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کو دشمنوں سے دوستی و محبت کرنے سے روکنے کے لیے جو حکم دیا ہے اس کے لیے ایک روشن مثال نمونے کے طور پر پیش کی ہے کہ کس طرح اللہ سبحانہ کی خوشنودی کی خاطر اپنے جملہ متعلقین سے قطع تعلق کیا جاتا ہے۔ وہ متعلقین جو احکامات الٰہیہ کی بجا آوری میں رکاوٹ تھے، یعنی حضرت ابراہیم کے پیروکاروں نے بیک آواز اپنے متعلقین سے کہہ دیا:

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ (سورہ ممتحنہ: ۴)

یعنی "ہم تم سے اور جن کو تم پرستش کرتے ہو، ان سے بیزار ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان اس وقت تک دشمنی رہے گی جب تک تم بھی اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان نہیں لے آتے"

(ج) حضرت ابراہیمؑ کی اپنے مشرک چچا کے لیے طلب مغفرت

آذر حضرت ابراہیم کا چچا مشرک تھا۔ آپؑ نے اس سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا اس امید پر کر لیا کہ وہ راہ راست توحید پر آ جائے گا۔ لیکن جب آپؑ کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے اور شرک پر قائم ہے تو آپؑ اپنے وعدے سے ہٹ گئے اور اس سے بیزاری اختیار کر لی۔

قرآن مجید آذر کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی طلب مغفرت کی کئی مقامات پر وضاحت فرماتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ (سورہ توبہ: ۱۱۴)

"حضرت ابراہیمؑ کا اپنے منہ بولے باپ (چچا) آذر کے لیے طلب مغفرت کرنا اس وعدہ کی بنا پر تھا جو انہوں نے اس سے کر لیا تھا۔ جب واضح ہو گیا کہ وہ اللہ سبحانہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے بیزاری اختیار کر لی۔ بے شک ابراہیم مہربان اور بردبار تھے"

اس آیہ مجیدہ سے صاف طور پر واضح ہو رہا ہے کہ آذر کے لیے حضرت ابراہیم کی طلب مغفرت کا وعدہ یا اس پر عمل صرف اس وقت

تک تھا جب تک آپؑ نے اُس سے اپنی طرف سے طلب مغفرت کا وعدہ فرمایا۔ جب اس کی عداوت بہ خدا واضح ہوگئی تو آپؑ نے اس سے بیزاری اختیار کر لی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آذر کے لیے طلب مغفرت اس وقت تک تھی جب تک بیزاری کا جواز پیدا نہ ہوا تھا۔ جب بیزاری اک جواز مل گیا تو آپؑ اس سے فوراً بیزار ہو گئے۔

شائد کوئی مسلمان اپنے کافر رشتہ داروں کے لیے طلب مغفرت کرے اور اس کی دلیل حضرت ابراہیمؑ کے طرز عمل کو قرار دے، چنانچہ قرآن مجید نے اس مسئلے کی وضاحت کر دی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس حالت میں آذر کے لیے استغفار کا وعدہ فرمایا تھا جب اس سے بیزاری کے حالات پیدا نہیں ہوئے تھے کیونکہ ابھی آپؑ کو آذر کے ہدایت پانے کی اُمید تھی۔ بیزاری اس وقت اختیار کی جاتی ہے جب کسی کافر کی ہدایت کی طرف سے ناامیدی یقینی ہو جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی حالت میں اپنے چچا آذر سے بیزاری اختیار کی تھی۔ یہ حقیقت ایک اور آیہ مبارکہ سے واضح ہو جاتی ہے اور اس سے نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں، جہاں فرماتا ہے:

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيۡكَ‌ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّىۡ‌ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِىۡ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾

(سورہ مریم: ۴۷)

''(اے چچا) تم پر سلام ہو، میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں آپ کے لیے طلب مغفرت کروں گا کیونکہ اس کا مجھ پر کرم خاص ہے اور میں تم سے اور جن کی تم پرستش کرتے ہو، بیزار ہوں''

اس آیہ مجیدہ پر تھوڑا سا بھی غور کرنے سے حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم سے ''واعتزلکم'' کے حکم کے تحت بیزاری کا اعلان فرما رہے ہیں مگر ابھی اپنے چچا آذر سے بیزاری اختیار نہیں کرتے بلکہ اسے طلب مغفرت کی نوید سناتے ہیں۔ یہ امتیازی سلوک اس لیے تھا کہ آذر کے علاوہ دیگر رشتہ داروں سے بیزاری کی شرائط پوری ہو چکی تھیں۔ لیکن جب آذر میں بھی اس کی قوم جیسے حالات کھل کر سامنے آ گئے تو حضرت ابراہیم نے اس سے بھی بیزاری کا اعلان فرما دیا۔ اسی لیے اگلی آیہ مبارکہ میں آپ کی آذر سمیت پوری قوم سے بیزاری کا ذکر ملتا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ‌ؕ وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾ (سورہ مریم: ۴۹)

''جب (ابراہیمؑ) نے (آذر سمیت) اپنی پوری قوم سے بیزاری اور علیحدگی اختیار کی تو ہم نے انہیں اسحاقؑ و یعقوبؑ جیسے بیٹے عطا فرمائے اور ان سب کو نبی بنایا''

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں حضرت ابراہیم کے طرز عمل اور اپنے چچا آذر کے ساتھ ان کے لگاؤ کو مشرک رشتہ داروں کے ساتھ دوستی و محبت کرنے کا بہانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اب ہم سورۂ ممتحنہ کی آیہ چہارم میں بیان شدہ استثناء کی طرف آتے ہیں جو ہماری بحث کا موضوع بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِلَّا قَوۡلَ اِبۡرٰهِیۡمَ لِاَبِیۡهِ لَاَسۡتَغۡفِرَنَّ لَكَ وَمَاۤ اَمۡلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَاِلَیۡكَ اَنَبۡنَا وَاِلَیۡكَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۴﴾ (ممتحنه: ۴)

دراصل یہ جملہ پوری آیہ مجیدہ کا ایک جزو ہے۔آیہ چہارم اس طرح شروع ہوتی ہے:

قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ (ممتحنه: ۴)

واضح یہ کرنا ہے کہ اس آیہ مجیدہ میں وہ شئے کیا ہے جس سے حضرت ابراہیم کا یہ قول مستثنٰی قرار دیا گیا ہے۔آیہ مجیدہ کو شروع سے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دو جملے اس ''استثنائی'' سے متعلق ہو سکتے ہیں:

۱۔ ''اسوة حسنه فی ابراهیم یعنی خود حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ حسنہ میں استثنا

۲۔ اذ قالو القر مهم انا برءؤا منكم یعنی پوری قوم سے بیزاری کرنے میں استثناء

اگر پہلے جملے کے استثناء کو لیں تو اس سے مراد حضرت ابراہیم کے اسوہ حسنہ کے ایک حصے کو مستثنٰی قرار دیا گیا ہے یعنی حضرت ابراہیم کی پوری زندگی قابل تقلید ہے سوائے اپنے چچا کے لیے استغفار کرنے کے۔لیکن یہ بات دو وجوہات کی بنا پر صحیح نہیں ہے:

۱۔ یہ مفہوم حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کی عصمت کے لیے ساز گار نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید بشمول حضرت ختمی مرتبت تمام انبیاء کے لیے حضرت ابراہیم کے اسوہ کو قابل اتباع بنا رہا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۸﴾ (سوره آل عمران: ۶۸)

''بے شک (حضرت) ابراہیمؑ کے شائستہ ترین وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی اور یہ پیغمبرؐ اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے ہیں۔بے شک اللہ سبحانہ مومنین کا سرپرست ہے''

اس آیہ مجیدہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابراہیم سے اپنے آپ کو صرف زبانی طور پر منسوب نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ اس زمانے کے یہود ونصاریٰ کیا کرتے تھے، بلکہ یہ اعزاز انہیں حاصل ہوتا ہے جو ان کے دین پر ایمان لائے اور عملاً ان کی پیروی کی۔حضرت رسول اکرمؐ کی بعثت سے قبل ان لوگوں کو ہی یہ اعزاز حاصل تھا۔جو حضرت ابراہیم پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کرتے تھے۔اس زمانہ میں (یعنی حضور اکرمؐ کے زمانہ میں سب سے بڑھ کر خود حضرت رسول اکرمؐ کو یہ اعزاز حاصل ہے اور ان کے پیروں کاروں کو بھی جو سب کے سب ملت ابراہیمی پر عمل کرتے ہیں۔اس آیہ مجیدہ میں حضرت رسول اکرمؐ اور ان کے پیروکاروں کو پہلے گروہ سے جو الگ کیا گیا ہے، وہ صرف حضرت رسول اکرمؐ کے احترام کی وجہ سے ہے جیسا کہ فرماتا ہے ''وھذا النبی......'' کیا اس وضاحت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ حضرت

ابراہیمؑ ہر جگہ نمونہ پیروی ہیں سوائے اس استغفار کے موقع کے؟

۲۔ سورہ ممتحنہ کی مذکورہ بالا آیہ میں واضح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم کا اپنے مشرک چچا سے طلب مغفرت کا وعدہ ان حالات میں بالکل مناسب اقدام تھا۔ پھر ان کا طرزِ عمل کیوں نہ نمونہ عمل قرار پائے؟ چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ استثناء پہلے جملے سے متعلق نہیں بلکہ دوسرے جملے (اذا قالوا لقومھم انا برءؤا منکم سے متعلق ہے۔ اس جملے میں لفظ ''قالوا'' جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروکاروں سمیت پوری قوم سے اظہارِ بیزاری کیا، حتیٰ کہ اپنے چچا آذر سے بھی، مگر سورہ مریم کی آیہ ۴۸ یہ بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا سے (ابھی) بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔

لہٰذا دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''انا برؤا منکم'' میں سے حضرت ابراہیم کا اپنے چچا کو طلب مغفرت کی بشارت دینا مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ اس جملے کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پیروکاروں نے تمام قوم سے اظہار بیزاری کیا۔ سوائے آپ کے چچا آذر سے کہ وقتی طور پر سے طلب مغفرت کی نوید سنائی گئی اگرچہ بعد میں وہ بھی اس کلی بیزاری میں شامل کر لیا گیا۔

یہاں تک ہم نے سورہ ممتحنہ کی پہلی پانچ آیتوں کے بعض نکات کی تفصیلات بیان کیں۔ اب ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں جن میں مشرکین و کفار کے ساتھ بعض حالات میں دوستی کی جا سکتی ہے۔

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِيۡهِمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ۞ (سورہ ممتحنہ: ٦)

''(اے مسلمانو!) تم میں سے جو اللہ سبحانہ اور روزِ قیامت سے اچھی اُمیدیں باندھے ہوئے ہیں ان کے لیے (حضرت) ابراہیمؑ کی طرزِ زندگی میں بہترین نمونہ عمل موجود ہے اور جو اس اسوۂ حسنہ سے منہ موڑے گا (اللہ سبحانہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا) بے شک اللہ سبحانہ ہر چیز سے بے نیاز اور قابل تعریف ہے''۔

عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّجۡعَلَ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَ الَّذِيۡنَ عَادَيۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۞ (سورہ ممتحنہ: ۷)

''شاید عنقریب اللہ سبحانہ تمہارے اور جن سے تم (شرک و کفر کی وجہ سے) دشمن رکھے ہو رشتہ دوستی استوار کر دے، بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے''

لَا يَنۡهٰٮكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَلَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۞

(سورہ ممتحنہ:۸)

''اللہ سبحانہ تمہیں ان لوگوں سے (روابط قائم کرنے سے) منع نہیں فرماتا جنہوں نے دین کے مسئلے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، اللہ سبحانہ انصاف پسند لوگوں کو دوست رکھتا ہے''

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑨ (سورہ ممتحنہ: ۹)

''اللہ سبحانہ تمہیں صرف ان لوگوں کی دوستی سے منع فرماتا ہے جنہوں نے دین کے مسئلے میں تم سے جنگ کی تمہیں گھروں سے نکالا یا گھروں سے نکالنے والوں کی مدد کی اور جو لوگ ان سے دوستی کریں گے وہ ظالم ہیں''

ان آیات میں قابل توضیح نکات یہ ہیں:

(د) کافروں سے از سر نو دوستی کی نوید

آیہ ششم میں اللہ سبحانہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پیروان کے طرزِ عمل کی پیروی کی تاکید فرماتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ آپ کی سنت سے روگردانی (دشمنانِ خدا سے قطع تعلق) اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کے علاوہ خدائے غنی کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

اس کے بعد ساتویں آیہ مبارکہ میں یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ شاید عنقریب مشرکین مکہ کے رویہ میں تبدیلی آ جائے اور وہ ایمان لے آئیں تو پھر مسلمانوں اور ان کے مکہ والے رشتہ داروں کے درمیان دوبارہ روابط پیدا کرنے کا جواز مل جائے گا۔ اور اس بات کو بھی کفار مکہ پر مسلمانوں کا ایک طرح کا غلبہ سمجھا جائے گا۔

(ھ) سیاسی اور تجارتی روابط قائم رکھنے کا بنیادی اصول

بادی النظر میں سورہ ممتحنہ کی پہلی آیت مسلمانوں اور کافروں میں جملہ روابط کی نفی کی تاکید کر رہی ہے حالانکہ عہد رسالت مآبؐ کے کافر دو طرح کے تھے:

۱۔ وہ کافر جو امور دین میں مسلمانوں سے برسر پیکار نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے مسلمانوں کو ہجرت کرنے یا اپنے وطن کو خیر باد کہنے پر مجبور کیا تھا اور قرآن مجید کی زبان میں وہ ''لم یقاتلو کم فی الدین ولم تخرجو کم من دیار کم'' کے زمرے میں آتے ہیں۔

۲۔ وہ کافر جو اول الذکر لوگوں کے بالکل الٹ تھے انہوں نے آئین توحید اختیار کرنے کی وجہ سے ہی مسلمانوں سے خونریزی کو ضروری جانا تھا۔ اور انہیں گھر بار سے نکال باہر کرنے کے لیے طاقت استعمال کی تھی۔

کافروں کی اوّل الذکر جماعت کے بارے میں صرف ان سے حسن سلوک اور عدل وانصاف کرنے کی حد تک تعلق رکھنے میں قرآن مجید کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا گیا کیونکہ ایسا کرنا خود دین مقدس اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا باعث ہے، جیسا کہ آیہ مجیدہ میں ''ان تبرو هم و تقسطو الیهم'' کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

البتہ اس سورہ کی آیت آغاز میں ''لا تتخذوا عدوی و عدو کم اولیاء'' کے تحت کافروں کی دوسری جماعت کے ساتھ ہر قسم کے روابط کی نفی پوری شدت سے موجود ہے۔ ان لوگوں سے دوستی ظلم کے علاوہ اور کچھ نہیں، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے ''و من یتو لهم فاولٰئك هم الظالمون'' اس موقع پر توضیح مزید کے لیے مندرجہ ذیل نکات کا پیش کرنا ناگزیر ہے۔

۱۔ اس سورہ کی آٹھویں اور نویں آیات مجیدہ پہلی آیت کی وسعت کی حدود اور اجمال کی تفصیل کو بیان کر رہی ہیں، کیونکہ پہلی آیہ تمام کافروں سے ہر طرح کے روابط کی نفی کر رہی ہے، جب کہ آٹھویں اور نویں آیات ان کو دو جماعتوں میں تقسیم کر رہی ہیں۔ ان میں ایک جماعت خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کو فقہی اصطلاح میں ''محارب'' کہتے ہیں جب کہ دوسری جماعت کو ''ذمی'' و ''صلح جو'' شمار کیا جاتا ہے۔

۲۔ ''ذمی'' کافروں سے روابط کی بھی کوئی قید ہے یا نہیں؟ بالالفاظ دیگر ''ان تبر و هم و تقسطوا الیهم'' کے تحت ان سے صرف تجارتی اور سیاسی روابط ہی قائم کیے جا سکتے ہیں یا روابط کا دائرہ مزید وسیع کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر بظاہر آیہ مجیدہ پہلی بات کی تائید کر رہی ہے کیونکہ ہر طرح کے روابط کا استحقاق ایک مسلمان کو حاصل ہے نہ کہ کافر کو۔

۳۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سورہ ممتحنہ کی آیہ ہشتم ''آیہ سیف'' کو منسوخ کرتی ہے جو سورہ توبہ میں وارد ہوئی ہے۔ جہاں ارشاد ہوتا ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ (سورہ توبہ: ۵)

''جہاں کہیں تمہیں مشرک نظر آئے اس کو قتل کر ڈالو، پکڑ لو یا محصور کر لو''

مگر یہ احتمال بہت کمزور ہے، کیونکہ ''آیہ سیف'' صرف ''محارب'' کفار کے لیے مخصوص ہے جب کہ سورہ ممتحنہ کی آیت زیر بحث ''ذمی'' یا معاہدہ کفار کے بارے میں ہے۔ لہٰذا یہ بات بالکل بے معنی ہے کہ ایک آیت کسی دوسرے موضوع کی ناسخ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ سورہ توبہ والی آیت ان کافروں کے بارے میں ہے جن کا مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہیں، یا اگر تھا بھی تو انہوں نے اسے توڑ دیا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ

(سورہ توبہ: ۱۳)

''(مسلمانو!) تم اس گروہ سے جنگ کیوں نہیں کرتے جنہوں نے معاہدہ کو توڑ دیا اور پیغمبر اکرمؐ کو جلا وطن کیا ہے''

چنانچہ یہ کہنا بجا ہے کہ سورہ ممتحنہ کی آیت ۸ اس آیت کے بالکل برعکس ہے، البتہ سورہ توبہ کی (آیہ سیف) اس سورہ کی نویں آیت کی موید و معاون ہے۔

۴۔ سورہ ممتحنہ کی آیت ۸، اور ۹ اور سورہ توبہ کی بعض آیات اسلامی حکومت اور سیاستِ خارجہ کے ایسے بنیادی خدوخال کا تعین کر رہی ہیں جن کے تحت ایک مسلمان ملک کو کافرممالک سے تجارتی اور سیاسی روابط قائم کرنے لازم ہیں۔ اسی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غاصب اسرائیلی حکومت، برطانیہ وفرانس اور جارح امریکہ سے مسلمانوں کے تعلقات کسی طور پر بھی جائز معلوم نہیں ہوتے۔ ان کی سیاہ کاریاں اظہرمن الشمس ہیں۔

(و) واقعہ فتح مکہ اور خواتین سے بیعت

قرآن مجید نے ''فتح مبین'' کی تفصیلات سے صرف نظر فرمایا ہے اور اس واقعے کی تفصیلات ہمیں صرف تاریخ وحدیث سے ہی ملتی ہے۔ ہم بھی ان تفصیلات کو تاریخ وحدیث پر ہی چھوڑتے ہیں۔ البتہ فتح مکہ کے بعد خواتین سے بیعت لی گئی جس کو قرآن مجید نے بیان فرمایا ہے، ہم اس کا ذکر یہاں کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ (سورہ ممتحنہ: ۱۲)

''اے پیغمبرؐ جب مومن خواتین آپؐ سے بیعت کرنا چاہیں کہ اللہ سبحانہ کا کوئی شریک نہیں، وہ چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، تہمت اور الزام تراشی کو وطیرہ نہ بنائیں گی اور نیکی و بھلائی میں آپؐ کی نافرمانی نہ کریں گے، اس صورت میں ان سے بیعت لیں اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں، بے شک اللہ سبحانہ مہربان اور بخشنے والا ہے''

چنانچہ آنحضرتؐ نے خواتین سے بیعت کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک پانی کا برتن لایا گیا۔ ایک طرف حضورِ اکرمؐ نے اپنا دست مبارک اس میں رکھا اور حکم دیا کہ خواتین بھی اس میں اپنا ہاتھ ڈالیں۔ آنحضرتؐ نے کسی خاتون کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ ہرگز نہ رکھا۔

یہ بیعت مندرجہ ذیل امور کو واضح کرتی ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ سب امور اعمال زشت کی نفی کرتے ہیں جو زمانہ جاہلیت کی عورت کی زندگی میں کارفرما تھے۔

۱۔ ان لا یشرکن — یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے ہر طرح کا ترک شرک

۲۔ ولا یسرقن یعنی ہر طرح کی چوری سے پرہیز اگرچہ شوہر ہی کی کیوں نہ ہو۔

۳۔ ولا یزنین یعنی ہر طرح کی فحاشی اور ناجائز جنسی تعلقات کا ترک

۴۔ ولا یقتلن اولادھن یعنی قتل اولاد کا ترک خواہ حمل ساقط کرنا یا زندہ درگور کرنا ہو۔ جس کو قرآن مجید قرار دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝ (سورہ تکویر: ۹،۸)

''جب زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کیوں قتل کی گئی؟''

۵۔ ولا یاتین ببھتان یعنی کسی پر کسی طرح کی تہمت یا بہتان کا ترک۔ اس جملے کے بعد ''بین ایدیھم وارجلھم'' کا جملہ آنے سے مفہوم محدود ہو گیا ہے کیونکہ یہ جملہ اس بچے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو شوہر کی عدم موجودگی میں پیدا ہوتا ہے اور جس کو شوہر کی واپسی پر اس سے نسبت دی جاتی ہے۔ اس سے ایسا بچہ ہی مراد ہو سکتا ہے جس کا حمل غیر مشروع ہو اور پھر عورت اسے کسی سے بطور شوہر نسبت دے۔ اس کو جملہ ''بین ایدیھن وارجلھن'' کے جملہ کا مقصود قرار دیا گیا ہے جس کی تعبیر یہ ہے کہ بچہ پیدائش کے وقت اپنی ماں کے سامنے اس کے دونوں پاؤں کے درمیان زمین پر آتا ہے۔

۶۔ ولا یعصینك فی معروفٍ یعنی حضورِ اکرمؐ جو ان احکامات دین کی مخالفت یا نافرمانی نہ کریں۔ حضور اکرمؐ خواتین کو سانحات اور حادثات کے موقع پر گریبان پھاڑنے اور مبالغہ آمیز آہ و زاری سے منع فرمایا کرتے تھے۔

(ر) پردہ اٹھتا ہے!

اس موقع پر مفسرین نے تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت رسول اکرمؐ 'صفا'' پر خواتین سے بیعت لے رہے تھے اور حضرت عمر بن خطابؓ پہاڑی کے نیچے کھڑے تھے۔ حضور اکرمؐ بیعت لینے کے ایک ایک جملے کو دھرا رہے تھے۔ آنحضرتؐ کے سامنے زوجہ ابوسفیان جواب دے رہی تھی اور حاضرین بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔

حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا ''ابا یعکن علی ان لا تشرکن باﷲ شیئًا'' یعنی میں آپؐ کی بیعت اس بات پر کر رہی ہوں کہ اﷲ سبحانہ کے ساتھ کسی شریک کی قائل نہیں ہوں''۔ ہندہ زوجہ ابوسفیان نے عرض کیا، آپؐ ہم سے اس طرح بیعت لے رہے ہیں، جب کہ مردوں سے جہاد فی سبیل اﷲ کے لیے بیعت لیتے ہیں۔

آنحضرتؐ نے ہندہ کو کیا جواب دیا، تاریخ اس پر خاموش ہے، البتہ اگر مرد و زن کے وجود کی ساخت پر غور کریں تو حضورؐ کا جواب بڑا واضح ہو جاتا ہے۔ اگر مرد میدانِ کارزار کے دھنی ہیں تو خواتین مردان جہاد کو جنم دیتی ہیں۔ حقیقت میں دونوں ہی جہاد میں حصہ لیتے ہیں، ایک فریق جہاد کرنے والا اور دوسرا مجاہدوں کی پرورش کرنے والا، یعنی بقولے ایک ہاتھ گہوارے کو ہلاتا ہے اور دوسرا دنیا کو متحرک کرتا ہے۔

پھر حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''ولا یسرقن'' یعنی چوری نہیں کرے گی۔ ہند بولی ''ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہے۔ میں نے اس کا

کچھ مال چوری کیا ہے۔ کیا وہ مجھ پر حلال ہے؟ قبل اس کے کہ حضورِ اکرمؐ جواب دیتے ابوسفیان بولا: ''اب تک جو کچھ تو لے چکی ہے میں نے اسے تجھ پر حلال کیا''۔ آنحضرتؐ مسکرائے کیونکہ آپؐ نے ابوسفیان کے جواب سے اس کی بیوی کو پہچان لیا۔ آپؐ نے پوچھا: ''کیا تو عتبہ کی بیٹی ہند ہے؟'' ہند نے کہا: ''جی ہاں! یا رسولؐ اللہ ہمیں بخش دے''

حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''ولا یزنین یعنی زنا مت کرنا۔ ہند بولی ''کیا آزاد عورت بھی فحاشی کی مرتکب ہوسکتی ہے؟ اس وقت حضرت عمرؓ مسکرائے کیونکہ زمانہ جاہلیت میں اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کے تعلقات رہ چکے تھے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا **ولا یقتلن اولادھن** یعنی ''اپنی اولاد کو قتل نہیں کروں گی''۔ ہند بولی: ''ہم نے اپنے بچے پال پوس کر جوان کیے اور آپؐ نے انہیں قتل کر دیا۔ ہند کا اشارہ اپنے بیٹے حنظلہ کی طرف تھا۔ جو جنگ بدر میں حضرت علی کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ اس موقع پر پھر حضرت عمرؓ ہنسے اور پیچھے ہٹ گئے۔ حضرت رسول اکرمؐ نے نے بھی تبسم فرمایا۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا: ''ولا یعصینک فی معروفٍ یعنی ''کسی پر بہتان نہیں لگائے گی''۔ ہندہ بولی: خدا کی قسم تہمت قبیح عادت ہے جب کہ آپؐ ہمیں ایمان و حسن اخلاق کی دعوت دیتے ہیں''۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: ''**ولا یعصینك فی معروفٍ** یعنی ''تیری طرف سے نیک کاموں کی مخالفت نہ ہوگی۔ ہند نے کہا: ''ہم اب اس حیثیت میں نہیں رہے کہ آپؐ کی مخالفت کا ارادہ کر سکیں''۔ [۱]

فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ نے اور بہت سے اعلانات فرمائے جو تاریخ اور سیرت کی کتب میں پائے جاتے ہیں مگر چونکہ ہماری بحث صرف آیاتِ قرآنی کے حوالے سے ہے، ہم ان کو بیان کرنے سے صرف نظر کرتے ہیں۔ [۲]

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، ج ۵، ص ۲۷۴

[۲] فروغِ ہدایت، ج ۲، ص ۴۲۳ تا ص ۴۳۰

(۸) غزوہ حنین [1]

مکہ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ اسلامی فوج نے فتح کر لیا اور وہاں بت پرستی کی بساط الٹ دی گئی مگر ابھی بنی ہوازن و ثقیف کا علاقہ یعنی ''طائف'' بت پرستی کا ایک نا قابل تسخیر قلعہ سمجھا جا تا تھا۔ اس لیے حضرت رسولِ اکرمؐ نے ارادہ فرمایا کہ جس قدر جلد ممکن ہو طائف پر قبضہ کیا جائے۔ طائف پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے دو پہاڑوں کے درمیان طویل درے کو عبور کرنا ضروری تھا، جو ''حنین'' کے علاقے تک چلا گیا تھا۔

مکہ فتح ہونے کے بعد جب بنی ہوازن و ثقیف کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے محسوس کیا کہ حضرت رسولِ اکرمؐ صرف مکہ تک ہی اکتفا نہ کریں گے بلکہ تازہ دم فوج لے کر ان کی طرف بھی آئیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قبیلہ کی تمام شاخوں کو اکٹھا کیا اور متحد ہو کر اسلام کے خلاف ایک جواں ہمت اور بہادر آدمی، جس کا نام ''مالک بن عوف'' تھا کو سپہ سالار مقرر کیا۔ ان کی فوجی کمان نے فیصلہ کیا کہ اسلامی فوج کے ان پر حملہ کرنے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ کر ان کے مقابلہ پر آ جائیں۔ اپنے سپاہیوں کی غیرت کو بیدار رکھنے کے لیے خواتین اور ملازمین کو اپنے ہمراہ لیا اور اپنے پیچھے رکھا تا کہ کوئی شخص فرار کا تصور بھی نہ کر پائے۔ انہوں نے اس پر بھی اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے جاسوس مکہ روانہ کر دیئے تا کہ مسلمانوں کی جنگی تیاری کے متعلق معلومات حاصل کریں۔

مالک بن عوف جو ایک قابل جنگجو تھا اس نے اپنی افرادی و دفاعی طاقت کو مزید مضبوط بنانے کے لیے ایک اور اقدام کیا کہ درہ کے آخر میں جہاں سے ''حنین'' کا علاقہ شروع ہوتا ہے، اپنی فوج کو لے گیا اور سپاہیوں کو بڑی بڑی چٹانوں کے پیچھے درختوں کی اونٹ میں اور غاروں میں چھپا دیا تا کہ جونہی اسلامی فوج وہاں سے گزرے، یکدم اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ان پر تیروں اور پتھروں کی بارش کر دیں، پھر شمشیر زنوں کا ایک دستہ اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور تیر اندازوں کے پرتو میں اسلامی فوج کو تلواروں پر رکھ لیں۔

اسلامی فوج، جس کی تعداد دشمنوں سے تقریباً دوگنی تھی، علی الصبح حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں درہ میں داخل ہوئی۔ حضرت رسول اکرمؐ ان کے پیچھے پیچھے تشریف لا رہے تھے۔ جب اسلامی فوج کا بیشتر حصہ تنگ درہ میں داخل ہو گیا تو یکدم دشمن نے کمین گاہوں سے باہر نکل کر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے اسلامی فوج میں ایسی ابتری اور دہشت پیدا ہوئی کہ فوج کے منافقین پکار اُٹھے: ''جادو ختم ہو گیا''

حضرت رسول اکرمؐ اور جاں نثاروں کی استقامت

مسلمانوں کے فرار و گریز سے جو فوج پر دہشت طاری ہوئی اس سے حضورِ اکرمؐ بڑے دل گرفتہ ہوئے۔ آپؐ نے محسوس کیا کہ اگر ذرا بھی تاخیر کی گئی تو محورِ تاریخ بدل جائے گی، انسانیت راہ ہدایت گم کر بیٹھے گی، مشرک فوج موحدین کو تباہ کر ڈالے گی۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے مرکب پر سوار ہو کر با آواز بلند پکارنا شروع کر دیا: ''یا انصار اللہ و انصار رسول انا عبد اللہ و رسولہ'' اے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد

---

[1] مکہ اور طائف کا درمیانی علاقہ حنین کہلاتا ہے۔

کرنے والوں! میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں''۔

یہ کہہ کر آپؐ نے اپنے خچر کو میدانِ جنگ کی طرف بڑھایا جہاں ''مالک'' کے سپاہی لڑ رہے تھے اور مسلمانوں کو قتل کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ کے ساتھ آپؐ کے جاں نثار مثلاً حضرت علیؑ، حضرت عباسؓ، فضل بن عباسؓ، اسامہؓ اور ابوسفیان بن حارثؓ بھی جو آغازِ جنگ ہی سے آنحضرتؐ کی طرف سے غافل نہ تھے اور آپؐ کی حفاظت کر رہے تھے، وہاں پہنچ گئے۔ یہ مجاہدین شروع ہی سے آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ تھے اور ایک لمحہ کے لیے بھی آپؐ سے الگ نہ ہوئے تھے۔[1] حضورِ اکرمؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کو جن کی آواز بہت بلند تھی، حکم دیا کہ اپنی بلند آواز سے مسلمانوں کو اس طرح پکاریں: ''اے انصارِ مدینہ جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی مدد کی تھی، اور اے لوگوں جنہوں نے درخت کے نیچے آنحضرتؐ سے بیعت رضوان کی تھی، کہاں جا رہے ہو!'' حضرت عباسؓ کی اس آواز نے ان کی خوابیدہ غیرت وحمیت کو بیدار کیا اور وہ 'لبیک یارسول اللہ' کہتے ہوئے آنحضرتؐ کی طرف لوٹ آئے۔

حضرت عباسؓ کی آواز جو پیغمبر اکرمؐ کی سلامتی کی خبر دے رہی تھی اس بات کا باعث بنی کہ بھاگی ہوئی فوج بڑی شرمندگی و پشیمانی کی حالت میں آنحضرتؐ کی طرف واپس آ گئی، اپنی صفوں کو منظم و مرتب کیا اور حضرت رسول اکرمؐ کے حکم کی بجا آوری اور فرار کے دھبہ کو مٹانے کے لیے مل کر عام حملہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں دشمن پسپائی وفرار پر مجبور ہو گیا۔ اس موقع پر مجاہدوں کی حوصلہ افزائی کے لیے حضور اکرمؐ یہ جملہ فرماتے رہے:

''میں اللہ سبحانہ کا پیغمبرؐ ہوں، کبھی غلط بات نہیں کرتا، اللہ نے مجھ سے فتح کا وعدہ فرمایا ہے''

یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ بنی ہوازن وثقیف کے جوان جو ایک جنگجو قوم تھی، اپنی خواتین اور غلاموں کو چھوڑ کر ''اوطاس ونحلہ'' کے علاقہ میں طائف کے قلعہ کی طرف بھاگ گئے۔ ان میں سے اکثر قتل اور بہت سے اسیر ہوئے۔

قرآن مجید حنین کی جنگ کے بارے میں فرماتا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝۲۵ (سورہ توبہ:۲۵)

''(اے مسلمانو!) اللہ سبحانہ نے کئی مواقع پر تمہاری مدد کی جن میں ایک موقع جنگ حنین کا ہے جب کہ تم اپنی کثرت پر نازاں تھے (تمہارا خیال تھا کہ فتح کے لیے صرف کثرتِ فوج ہی کافی ہے) مگر یہ کثرت تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی، زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ گئے''

---

[1] واقدی، جلد ۳، ص ۹۰۲۔ یہاں حضرت علیؑ کی جانبازی کے کئی واقعات درج ہیں۔

ابن سعد، ''طبقات'' میں رقم طراز ہے:

''حضرت ابوبکر صدیق اسلامی فوج کی کثرت پر فخر کرنے لگے اور کہا: ''ہم تو دشمن سے کئی گنا زیادہ ہیں ہم ہرگز شکست نہیں کھائیں گے''۔ حالانکہ کثرت فوج فتح کے عوامل میں ایک عامل ہے، جبکہ ایمان محکم دشمن کی جاسوسی، جنگی مہارت کا بروئے کار لانا اور کمزور سے کمزور دشمن کو بھی کمزور نہ سمجھنا دیگر عوامل میں ہیں جن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ حنین کو جاتے ہوئے مسلمان سپاہی ان عوامل سے غافل تھے''۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ (سورہ توبہ: ۲۶)

''اس کے بعد اللہ سبحانہ نے اپنے پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو سکون عطا فرمایا، نا قابل دید فوج سے ان کی مدد فرمائی اور کفار کو سزا دی۔ کفار کا یہی حشر ہوتا ہے''۔

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

(توبہ: ۲۷)

''پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنی رحمت کے سایہ میں لے آتا ہے اور اللہ بخشنے والا رحیم ہے''

نا قابل دید افواج سے مراد فرشتے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی مدد کی۔ آیہ مجیدہ کا آخری حصہ یہ بتا رہا ہے کہ جنگ سے بھاگنے والوں میں جو پہلی آیت میں ''ولیتم مدبرین'' کا مصداق ہیں اور گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں، جس کو چاہے بخش دے گا۔

جنگ حنین کا مالِ غنیمت

جنگ حنین میں ملنے والا مالِ غنیمت سابق میں ہاتھ آنے والے اموالِ غنیمت میں سب سے زیادہ تھا۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دشمن چھ ہزار قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بھیڑ بکریاں اور آٹھ سو باون کلوگرام سونا چھوڑ کر فرار ہوا۔

حضرت رسولِ اکرمؐ نے دشمن کی مکمل بیخ کنی کے لیے اس کا تعاقب ضروری جانا۔ آپؐ نے تمام مالِ غنیمت کو ''جعفرانہ'' کے محفوظ علاقہ میں منتقل کرنے کا حکم دیا تا کہ اس کی حفاظت ہو سکے اور خود تجربہ کار مجاہدین کے ہمراہ اوطاس نحلہ اور طائف کے علاقہ میں دشمن کے تعاقب میں تشریف لے گئے۔ آنحضرتؐ اس تعاقب میں کامل طور پر کامیاب ہوئے البتہ طائف کا قلعہ بوجوده فتح نہ ہو سکا۔ آنحضرتؐ بغیر کسی نتیجہ کے مالِ غنیمت کی تقسیم کی غرض سے جعفرانہ لوٹ آئے۔ اس موقع پر تاریخ نے بڑے دلچسپ اور سبق آموز واقعات نقل کیے ہیں جن میں سے اکثر ہم نے اپنی تاریخی کتب میں تحریر کیے ہیں، یہاں ہم صرف ایک واقعہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

مالِ غنیمت کی تقسیم اور ایک تمیمی کا اعتراض

صحابہ کرامؓ کا اصرار تھا کہ مالِ غنیمت مجاہدین کے درمیان جلد از جلد تقسیم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں آنحضرتؐ اپنی بے غرضی ظاہر کرتے ہوئے ایک اونٹ کے پاس کھڑے ہو گئے، اس کے کوہان پر تھوڑی اون کو پکڑ لیا اور اپنی انگلیوں میں اونٹ کی اس اون کو پکڑے ہوئے لوگوں کی طرف رخ کر کے فرمایا: ''تمہارے اس مالِ غنیمت میں اس اون سمیت خمس سے زیادہ میرا کوئی حق نہیں ہے اور میں اپنے حصہ کو بھی تمہارے درمیان بانٹ دوں گا۔ چنانچہ تم میں سے جس کسی کے پاس مالِ غنیمت سے جو کچھ بھی ہے، اگرچہ ایک سوئی بھی ہو تو وہ لے آئے تا کہ اسے مطابق عدل سب میں بانٹ دیا جائے''

حضرت رسولِ اکرمؐ نے تمام مالِ غنیمت مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا۔ نیز آنحضرتؐ نے بیت المال کا خمس بھی جو آپؐ کی ذات کے لیے مخصوص تھا، ان قریشی سرداروں میں بانٹ دیا جو ابھی تازہ تازہ اسلام لائے تھے۔ آنحضرتؐ نے اس مال سے ابوسفیان، اس کے بیٹے معاویہؓ، حکیم بن حزام، حارث بن حارث، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، ہویطب بن عبدالعزیٰ اور علاء بن جاریہ وغیرہ جیسے افراد کو جو چند دن پیشتر آنحضرتؐ کے بدترین دشمن تھے، زیادہ اونٹ عطا فرمائے۔ اسی طرح ان سے کم حیثیت لوگوں کو پچاس اونٹ فی کس عطا فرمائے۔ اس عطائے بے بہا سے ان کے دلوں میں حضورِ اکرمؐ کی بے پناہ محبت پیدا ہوگئی اور وہ قدرتی طور پر اسلام کی طرف کھنچے چلے آئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اسلام کی فقہ میں ''مولفة القلوب'' کہتے ہیں اور مال زکوٰۃ کا ایک مصرف یہی لوگ ہیں۔ [1]

ابن سعد [2] واضح طور پر لکھتا ہے: ''یہ سب بخشش اسی خمس سے کی گئی جو خود پیغمبرِ اکرمؐ کا اپنا مال تھا کسی اور کے حصے سے ایک دینار بھی اس جماعت کی تالیفِ قلوب کے لیے خرچ نہ کیا گیا [3]۔

قریشی اکابرین کو حضرت رسولِ اکرمؐ کی طرف سے یہ عطیات بہت سے مسلمانوں بالخصوص بعض انصار پر گراں گزرے۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کی اس عطا کے مضمرات سے وہ ناواقف تھے۔ ان کے خیال میں حضورؐ نے خویش پروری فرمائی اور غنیمت کا خمس اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا۔ یہاں تک کہ 'بنی تمیم' کے ایک آدمی نے جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، اس قدر گستاخی کی کہ آنحضرتؐ کی طرف رخ کر کے کہنے لگا:

---

[1] سیرتِ ابن ہشام، ج ۲، ص ۴۹۳

[2] طبقات، جلد ۲، ص ۱۵۳

[3] سیرتِ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۹۶۔ المغازی کہتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس کے بارے میں فرمایا:

ان له اصحابا یحقر احد کم صلاته مع صلاتهم و صیامه مع صیامهم یقرون القراٰن لا یجاوز تراقیهم یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیه

''اُس کے ساتھی ایسے ہوں گے کہ ان کی نمازوں اور روزوں کے مقابلہ میں تم اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر جانو گے۔ قرآن مجید پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق کے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ لوگ دینِ اسلام سے اس تیزی سے نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے''

''آپؐ نے آج مالِ غنیمت کی تقسیم کرتے ہوئے عدل نہیں کیا'' رسولِ اکرمؐ اس کی گستاخی پر سخت ناراض ہوئے، آپؐ کے چہرہ مبارک سے غصہ کے آثار نظر آنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تجھ پر وائے ہو۔ اگر میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا؟''

حضرت عمر فاروق نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ اگر اجازت دیں تو اسے قتل کر دیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو یہ شخص مستقبل میں ایک ایسی جماعت کا سرغنہ بنے گا جو دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکلتا ہے''۔

آپؐ کا ارشاد حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔ ذوالخویصرہ حضرت علیؑ کے عہد خلافت میں خوارج کا سرغنہ بنا جنہوں نے مسلمانوں کا خون بہایا۔ مگر چونکہ ازارتکاب جرم سزا نہیں دی جاسکتی، حضور اکرمؐ نے اسے چھوڑ دیا۔

اسی طرح سعد بن عبادہؓ انصار مدینہ کے نمائندہ بن کر حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور ان کی شکایت پیش کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ سب کو ایک جگہ جمع کرو تا کہ میں اپنے طرزِ عمل کی تشریح کر دوں۔ آنحضرتؐ نہایت باوقار طریقہ سے انصار کے اس جلسہ میں تشریف لے گئے اور یوں خطاب فرمایا:

''تم لوگ گمراہ تھے میرے ذریعہ تم نے ہدایت پائی۔ تم لوگ فقیر و محتاج تھے، بے احتیاج ہو گئے۔ ایک دوسرے کے دشمن تھے، آپس میں مخلص ہو گئے''

سب بیک زبان بولے: ''اے اللہ کے رسولؐ! یہ سب کچھ صحیح ہے''۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''تم میری ان باتوں کا ایک اور طرح بھی جواب دے سکتے ہو۔ میری ان خدمات کے مقابلہ میں تمہارا جو حق مجھ پر ہے اس کی بنا پر کہہ سکتے ہو کہ یارسول اللہ! جب قریش آپؐ کو جھٹلا رہے تھے تو ہم نے آپؐ کی تصدیق کی۔ قریش نے آپؐ کو دوست نہ رکھا، ہم نے آپؐ کی مدد کی۔ قریش نے آپؐ کو جلاوطن کیا، ہم نے آپؐ کو پناہ دی اور جب آپؐ کے پاس کچھ نہ تھا تو ہم نے آپؐ کی مدد کی۔ اے جماعتِ انصار! تم اس تھوڑے سے مال کی وجہ سے جو میں نے قریش کو بطور مسلمان استوار ہونے کے لئے دیا ہے، کیوں پریشان ہو رہے ہو جب کہ تمہیں اسلام کی دولت سے مالا مال کیا ہے؟ کیا تم اس تقسیم پر راضی نہیں ہو کہ وہ لوگ تو اونٹ بکریاں لے جائیں اور تم اللہ سبحانہ کے رسولؐ کو اپنے ہمراہ لے جاؤ! خدا کی قسم! اگر ساری دنیا ایک راہ اختیار کرے اور انصارِ مدینہ دوسری راہ تو میں انصار کا راستہ اختیار کروں گا''۔ اس کے بعد آپؐ نے انصار اور ان کی اولاد کے حق میں طلب رحمت فرمائی۔

آپؐ کی اس تقریر سے ان کے ضمیر پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ رونے لگے۔ پھر بیک زبان بولے: ''یارسول! ہم اس تقسیم کو تہ دل سے قبول کرتے ہیں اور آپؐ سے ہمارا کوئی گلہ نہیں''۔

درج ذیل آیات مبارکہ اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئیں:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝٥٨ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝٥٩ اِنَّمَا

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ‌ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۞ (سورہ توبہ: ۵۸۔۵۹۔۶۰)

''ان (مسلمانوں) میں سے بعض مالِ غنیمت کی تقسیم پر آپ ؐ کو طعن کررہے ہیں۔ان کو حصہ مل جائے تو خوش ہو جاتے ہیں ورنہ ناراض۔اگر وہ اللہ سبحانہ اور پیغمبر اکرم ؐ کی عطا پر راضی رہتے اور کہتے ہمیں اللہ سبحانہ ہی کافی ہے، عنقریب اللہ اور اس کا رسول ؐ ہمیں اپنے فضل و کرم سے نوازیں گے، ہم تو اللہ ہی کی طرف متوجہ ہیں۔صدقات تو غریبوں، محتاجوں زکوٰۃ کے عملے کے لوگوں، مولفۃ القلوب، غلاموں، مقروض لوگوں، راہِ خدا میں کام کرنے والوں اور سفر میں محتاج ہونے والوں کا حق ہے۔یہ حکم اللہ سبحانہ کی طرف سے ہے۔بے شک اللہ سبحانہ جاننے والا اور صاحب حکمت ہے''۔

(۹) غزوۂ تبوک

حضرت رسولِ اکرمؐ کے زمانہ میں ''شام'' مشرقی روم کی ایک نوآبادی سمجھا جاتا تھا جس کا دارالسلطنت ''قسطنطنیہ'' تھا۔ اس کے تمام سرحدی علاقوں کے عوام اور حکومتیں عیسائیت کی پیروکار تھیں۔ سرحد کے اکابرین اور قبائلی سردار شام کی مرکزی حکومت کے ماتحت تھے البتہ شام کی مرکزی حکومت خود شاہِ روم کی آلہ کار تھی۔

مسلمانوں کے ہاتھوں بت پرستی کے مضبوط قلعے ''مکہ'' کی فتح اور ان کی پے در پے دیگر فتوحات سے شاہِ روم کے دل پر مسلمانوں کی دہشت بیٹھ گئی۔ اُسے یہ فکر لاحق ہوگئی کہ ایسا نہ ہو کہ حضورِ اکرمؐ شام پر حملہ آور ہوں اور اپنی مملکت کو وسعت دیں۔

لٰہذا شاہِ روم نے اپنے تئیں مسلمانوں کو بے خبری میں ہی ختم کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس مقصد کے لیے اس نے شام کے فرمانروا کو یہ مہم سونپی کہ ''لخم'' عاملہ غسان اور جذام قبائل کے افراد پر مشتمل ایک فوج تشکیل دے اور رومی لشکر ساتھ لے کر مدینہ کو فتح کرے۔ اس طرح چپکے چپکے اسلام کی جواں سال حکومت کو ختم کر ڈالے۔

حضورِ اکرمؐ کو شاہِ روم کے اس مذموم منصوبہ کی خبر تجارتی قافلوں کے ذریعے ملی۔ آنحضرتؐ نے بھی ارادہ فرمایا کہ آپ دشمن کو غفلت کی حالت میں رکھ کر اس کی غفلت سے فائدہ اٹھائیں۔

شامی اور رومی افواج کی مسلمانوں کے خلاف تیاریوں کی خبر مدینہ میں اس وقت پہنچی جب فصل پکنے کو تیار تھی، کھجوریں درختوں پر تیار ہو رہی تھیں اور مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں ایک ہلکے سے قحط کی سی صورت پیدا ہو رہی تھی۔

حضورِ اکرمؐ کی طرف سے مدینہ اور اس کے نواح میں عام فوجی بھرتی کا اعلان ہوا۔ اس عمل کا مقصد بھی متعین کر دیا گیا تا کہ مسلمان جہاں تک ممکن ہو دور دراز علاقہ میں جنگ کے لیے حتی الوسع تیاری کر لیں اور پوری آمادگی و تیاری کے ساتھ محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہوں۔

جنگی اخراجات بھی تو مسلمانوں کو خود ہی برداشت کرنا تھے۔ اسی غرض سے حضورِ اکرمؐ نے بعض اشخاص کو مکہ اور اس کے گرد و نواح میں بھیجا تا کہ ہر جگہ مسلمانوں سے اس سلسلے میں تعاون حاصل کیا جائے۔ اس موقع پر مسلمان خواتین و حضرات نے کھل کر تعاون کیا۔ اگر حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ سے چار ہزار دینار سے مدد کی تو ابو عقیلؓ نامی ایک بہشتی نے جس کے پاس صرف دو من گندم تھی، ایک من لشکر اسلام کی مدد میں دے دی۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ جیسے امیر کبیر آدمی کے مقابلہ میں اس مخلص مسلمان کی تھوڑی سی گندم پر منافقین نے زبان طعن دراز کی اور اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان کی سرزنش کے لیے یہ آیت نازل ہوئی:

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۹﴾

(سورہ توبہ: ۷۹)

''وہ لوگ (منافقین) جو متمول لوگوں کو راہِ خدا میں خیرات کرتے ہوئے اور محنت کشوں کو حسب توفیق عطیات دیتے ہوئے تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں، اللہ سبحانہ اس کا خوب مزہ چکھائے گا اور ان کے لیے اذیت ناک عذاب منتظر ہے''

نیز ارشاد ہوا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (سورہ توبہ: ۸۰)

''(اے رسولؐ) ان منافقین کے لیے آپؐ طلب بخشش کریں یا نہ کریں (برابر ہے) بلکہ اگر آپؐ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے طلب مغفرت کریں گے تو اللہ سبحانہ کبھی ان کو نہ بخشے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ سبحانہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں لائے اور اللہ سبحانہ ایسے فاسق لوگوں کی ہدایت نہیں کیا کرتا''

بہر حال تقریباً تیس ہزار مسلمان اس جنگ میں شرکت کے لیے تیار ہو گئے اور سب کے سب مدینہ منورہ کی چھاؤنی ''ثنیۃ الوداع'' میں جمع ہو گئے۔ اسلام کے اس لشکر عظیم میں دس ہزار مسلح سوار اور بیس ہزار پیدل مجاہد تھے۔ حضور اکرمؐ نے حکم دیا کہ ہر قبیلے کو ایک الگ پرچم دیا جائے۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اتنی بڑی فوج اکٹھا کرنا آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں خصوصی تنبیہ و تہدید سے کام لے کر اس لشکر جرار کو جمع کروایا۔ یہ بتا دینا کافی ہے کہ جس طرح اس جنگ میں شرکت کے لیے قرآن مجید کی طرف سے تاکید و تنبیہ سے کام لیا گیا۔ اس سے پہلے کسی جنگ میں شرکت کے لیے یہ لہجہ اختیار نہیں کیا۔

مندرجہ ذیل آیت اس سلسلہ میں نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (سورہ توبہ: ۳۸)

''اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تمہیں جہاد کا حکم دیا جاتا ہے تمہارے قدم زمین میں گڑ جاتے ہیں۔ کیا آخرت سے زیادہ تمہیں دنیا پسند ہے حالانکہ دنیا کی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے''

علی ہذا القیاس ارشاد ہوتا ہے:

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ (سورہ توبہ: ۳۹)

''اگر تم نے جہاد میں شرکت نہ کی تو اللہ سبحانہ تمہیں دردناک عذاب سے دوچار کرے گا اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے''

اس آیہ مجیدہ میں ''ویستبدل قوماً غیر کم''یعنی تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا'' کا جملہ قابل غور ہے۔ سورہ مائدہ اور سورہ محمدؐ میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٤﴾ (سورہ مائدہ: ۵۴)

''عنقریب اللہ سبحانہ ایسے لوگوں کو تمہارے بجائے لے آئے گا جن کو وہ پسند فرماتا ہے اور وہ بھی اللہ کو دوست رکھتے ہیں۔ جو مومنین کے سامنے متواضع اور کافرین کے لیے سخت ہیں اور راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں''۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم ﴿٣٨﴾ (سورہ محمد: ۳۸)

''(اے مسلمانو!) اگر تم اللہ سبحانہ کے احکامات سے روگردانی کرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا جو تمہارے جیسے نہیں ہیں''

ان آیات کی تفسیر میں جو روایات ملتی ہیں اُن سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ نئے گروہ سے مراد ''غیر عرب'' لوگ ہیں۔

طبری مرحوم لکھتے ہیں کہ آیہ مبارکہ ''یستبدل قوماً غیر کم'' کے نزول کے بعد مسلمانوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ وہ جماعت کون لوگ ہیں۔ آپؐ نے پاس ہی بیٹھے ہوئے حضرت سلمان فارسیؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''ھذا و قومہ'' یعنی ''یہ اور ان کی قوم''۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

لو کان ایمان منوطاً باالثریا لتناولہ رجال من فارس

''اگر ایمان ثریا تک دور چلا جائے تو ایرانی اس کو وہاں سے بھی لے آئیں گے''[1]

منافقین کی جنگ تبوک میں شرکت سے مخالفت

اللہ سبحانہ کی طرف سے خلاف معمول تاکید اس بات کا سبب بنی کہ احساس ذمہ داری والے تمام مسلمان اس جنگ میں شریک ہوں۔ ان کے مالی اور جانی تعاون سے ایک منظم فوج محاذ کی طرف روانہ ہوئی۔ اس فوج کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں:

و کان زادھم الشعر المسوس والا ھالة السخة والمر الزھید

''ان کا آذوقہ کرم خوردہ جو، خراب گھی اور ناپسندیدہ کھجوروں پر مشتمل تھا''۔

البتہ ان کے پاس ان مادی سہولیات کے فقدان کے لیے جو ساز و سامان تھا وہ ''عشق لقاء الٰہی'' یعنی اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں باریابی کا عشق تھا جو ان تمام کمیوں کو پورا کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی اس جماعت کے مقابلے میں منافقین تھے جن میں چند افراد کے سوا کسی نے اس جنگ میں شرکت نہ کی اور جنہوں نے شرکت کی انہوں نے بھی رستے میں حضور اکرمؐ کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کا منصوبہ بنایا۔

منافقین کی اس اعلانیہ نافرمانی اور گستاخی کو اللہ تعالیٰ نے بے نقاب کر دیا اور منافقین کی شدید مذمت فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ منافقین کی جس قدر مذمت اس سورہ میں کی گئی ہے۔ قرآن کے کسی اور سورہ میں نہیں ملتی۔ ان تمام آیات کی تفسیر جو منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں طوالت کا باعث ہوگی۔ لہٰذا ہم یہاں صرف جنگ تبوک کے سلسلہ میں منافقین کے بارے میں نازل ہونے والی آیات کا ذکر کرتے ہیں اور باقی آیات کے بیان کو کسی دوسرے موقع تک ملتوی کرتے ہیں۔

منافقین کے اس غزوہ میں شریک نہ ہونے کی وجوہات

۱۔ مادی وسائل کا فقدان

۲۔ محاذ کا دور دراز ہونا

۳۔ موسم کا گرم ہونا

(۱)(۲) یعنی مال غنیمت کا فقدان اور دوری محاذ

ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۵، ص ۱۰۸

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ﴿٤٢﴾ (سورہ توبہ: ۴۲)

''(اے رسولؐ) اگر مال غنیمت کا جلدی ہاتھ آنا نظر آتا اور محاذ جنگ نزدیک ہوتا تو (منافقین) آپؐ کا ساتھ دیتے مگر (مدینے سے تبوک) کا سفر ان کو بہت دور لگا۔ اس لیے قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے ہیں کہ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو (جہاد) میں ضرور شرکت کرتے۔ (یہ لوگ جھوٹ بول کر) اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اللہ سبحانہ خوب جانتا ہے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں''۔

عَفَا اللّٰهُ عَنكَ ۚ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِينَ ﴿٤٣﴾ (سورہ توبہ: ۴۳)

''(اے رسولؐ) یہ جو آپؐ نے ان کو (گھر بیٹھے رہنے کی) اجازت دی، قبل اس کے کہ سچے اور جھوٹے کا پتہ چلتا، اللہ سبحانہ درگزر فرمایا''۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَن يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿٤٤﴾ (سورہ توبہ: ۴۴)

''(اے رسولؐ) جو لوگ اللہ سبحانہ اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور اپنے مال و جان سے راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں، آپؐ سے گھر بیٹھے رہنے یا ترکِ جہاد کی اجازت نہیں مانگتے! بے شک اللہ سبحانہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے''

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿٤٥﴾ (سورہ توبہ: ۴۵)

''صرف وہی لوگ ترکِ جہاد کی اجازت مانگتے ہیں جو نہ اللہ سبحانہ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ روزِ آخرت پر اور ہمیشہ شکوک و شبہات میں مبتلا رہتے ہیں''

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَّلٰكِن كَرِهَ اللّٰهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقٰعِدِينَ ﴿٤٦﴾ (سورہ توبہ: ۴۶)

''اگر وہ (منافقین) صدق دل سے (جہاد میں شرکت کرنا چاہتے تو اس کے مقدمات طے کرتے، مگر اللہ سبحانہ نے (ان کی بد نیتی کی وجہ سے) ان کی حرکت کو نا پسند فرمایا اور ان کو روکے رکھا۔ چنانچہ ان سے کہا گیا کہ گھر بیٹھنے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو!''

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ﴿۴۷﴾ (سورہ توبہ: ۴۷)

''اگر وہ تمہارے ساتھ چل پڑتے تو تمہاری مشکلات میں اضافہ ہی کرتے تمہاری صفوں میں انتشار پھیلانے کے لیے آتے کیونکہ تمہارے پاس افواہوں پر کان دھرنے والے بہت ہیں اور بے شک اللہ سبحانہ ظالموں کو خوب پہچانتا ہے''

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ﴿۴۸﴾ (سورہ توبہ: ۴۸)

''اس سے پہلے بھی یہ لوگ (منافقین) فتنہ بپا کرتے اور تمہارے کام بگاڑتے رہے ہیں۔ ان کے علی الرغم حق کامیاب ہوا اور اللہ سبحانہ کا حکم صادر ہو کر رہا''

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ﴿۸۱﴾ (سورہ توبہ: ۸۱)

''(جنگ تبوک سے) منہ موڑنے والے پیغمبرؐ کی نافرمانی کر کے (اپنے تئیں) خوش ہیں۔ وہ نہ چاہتے تھے کہ راہِ خدا میں اپنی جانوں اور مال سے جہاد کریں (ایک دوسرے سے اور مسلمانوں سے) کہتے تھے کہ اس گرم موسم میں جہاد کے لیے مت جاؤ! ان سے کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ اس سے بہت زیادہ گرم ہے''

سیاسی تبدیلیاں، شدید بحران اور تلخ واقعات وہ مصائب ہیں جن سے ضعف اور استقامت کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ امتحان و آزمائش کٹھالی کی مانند ہیں جس سے سونا اور مٹی الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ آزمائش کے بعد میں جھوٹے دعوے دار اور منافقین کا مومنین اور مخلص مجاہدین میں امتیاز ممکن ہوتا ہے۔

عام حالات میں جب حکومت ہر چیز پر قادر ہوتی ہے یا بالفاظ دیگر امن وسکون مملکت پر سایہ فگن ہوتا ہے تو ہر شخص خیر خواہی واستحکام کا مدعی بن کر سامنے آتا ہے۔ ان حالات میں حکومت سے وفاداری اور تعاون کے نعرے لگائے جاتے ہیں مگر جونہی حالات پلٹ آ کھاتے ہیں،

امن و امان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے، دشمن کے حملے انتظامیہ کے لیے خطرات کا باعث نظر آتے ہیں، اس وقت وفاداروں، غدار، مومن و منافق، صادق دکاذب الگ الگ نظر آتے ہیں اور لوگوں کے درمیان گہرے اختلافات سامنے آجاتے ہیں۔

جس دن (مصریوں کی شورش کے نتیجے میں خلیفہ سوم کے قتل کے بعد) امیر المومنین حضرت علیؑ تمام مسلمانوں کی متفقہ رائے سے خلیفہ منتخب ہوئے، آپ نے مہاجروانصار کو آئندہ پیش آنے والے مصائب وامتحانات کے بارے میں تاکید فرمائی اور اس طرح فرمایا:

والذی بعثه بالحق لتبلبلن بلبلة، ولتغر بلن غربلة ولتسان سوط القدر حتی یعود اسفلکم اعلاکم واعلاکم اسفلکم"

(نهج البلاغه، خطبه ۱۶)

''اس ذات کی قسم جس نے پیغمبر اکرمؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، میں سچ کہتا ہوں کہ میرے عہد خلافت میں تم سخت آزمائے جاؤ گے، ایک دوسرے سے الگ نظر آؤ گے، تم اس طرح سے اُلٹ پلٹ کیے جاؤ گے جیسے دیگ میں کفگیر سے طعام اُلٹ پلٹ کیا جاتا ہے اس طرح کہ تم میں پست لوگ اوپر آجائیں گے اور تمہارے بلند ترین لوگ نیچے چلے جائیں گے''

مذکورہ بالا آیات کریمات اور حضرت علیؑ کے ارشاد حسنہ پر اگر غور کیا جائے تو بڑی آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ ایسے تھے جن کو کوئی خلوص وجدان حاصل نہ تھا۔ یہ لوگ پرلے درجے کے بے ضمیر تھے۔ ظاہراً ہر جگہ پر مسلمانوں کے ساتھ کھڑے ہوئے نظر آتے تھے، ہر موقع پر ظاہری دیانتداری اور ایمانداری کا مظاہرہ کرتے تھے، اسی لیے تمام جنگوں میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت سے کافی حصہ پاتے تھے مگر شرکت صرف ان جنگوں میں کرتے تھے جن میں مسلمانوں کی فتح یقینی ہو اور محاذ جنگ دور بھی نہ ہو۔ ان جنگوں میں اپنے مفاد کی خاطر مسلمانوں کے ساتھ کافی دوڑ دھوپ کرتے تھے، البتہ جن جنگوں میں محاذ جنگ دور دراز ہوتا، موسم سخت گرم ہوتا اور چلچلاتی دھوپ میں جانا پڑتا، یہ لوگ کبھی وہاں شرکت نہ کرتے۔ چونکہ ان کے دل میں ایمان واسلام کی ذراسی رمق بھی نہ تھی، لہٰذا اسلام کی نوخیز حکومت کے زوال کی انہیں بالکل پرواہ نہ تھی مگر ظاہرداری کے لیے جنگ میں عدم شرکت کے لیے ایسے بہانے تراشتے جو قوم موسیٰ سے کسی طرح کم نہ ہوتے۔ محولہ بالا سورہ توبہ کی آیہ ۴۲ میں جنگ تبوک میں ان کی عدم شرکت کی یہی وجہ بتائی گئی ہے کہ اس جنگ کا محاذ بہت دور تھا۔ مدینہ میں قیام کی صورت میں ان کے مفادات یقینی طور پر محفوظ تھے۔ جب کہ جنگ میں حاصل ہونے والے مفادات مشکوک تھے۔

اسی لیے انہوں نے محاذ پر جانے کے بجائے مدینہ میں قیام کو ترجیح دی۔ ان کا یہ کہنا کہ وہ قوت وقدرت جنگ نہیں رکھتے بالکل جھوٹ تھا کیونکہ اگر وہ ارادہ کر لیتے تو سفر کی ضروریات مہیا کر سکتے تھے۔ بقول قرآن مجید ولو ارادوا الخروج لا عدوا له'' پہلے ہی سے اس کی تیاری کر لیتے، مگر وہ تو پہلے ہی پیغمبر اکرمؐ کی نافرمانی کا ارادہ کر چکے تھے۔

ایمان اور منافقت میں فرق

سورۂ توبہ کی آیات ۴۴ اور ۴۵ میں مومن اور منافق میں امتیاز کی واضح علامتیں بیان کی گئی ہیں، وہ اس طرح کہ اس حساس موقع پر جب مسلمانوں کا مرکز رومی افواج کی طرف سے سخت خطرے میں تھا تو اللہ سبحانہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں نے فرمانِ جہاد سنتے ہی اپنی آمادگی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے بنی اسرائیل جیسے بہانوں کو چھوڑ کر جہاد کی طرف پیش قدمی کو اپنا شعار بنایا جب کہ منافقین جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان نہ رکھتے تھے، بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوئے اور مضحکہ خیز بہانے بنا کر مدینہ میں بیٹھے رہنے کی اجازت مانگنے لگے تاکہ وہ اس جہاد میں شرکت نہ کر کے مدینہ میں ہی رہیں۔ اس نازک موقع پر جب ایمان و اسلام خطرہ میں تھے، جنگ میں عدم شرکت اور گھر میں قیام کی اجازت مانگنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ایمان ان کے دلوں میں وجود نہ رکھتا تھا۔

ہمارے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ محولہ بالا دونوں آیات میں منافقین کا اجازت لینا جہاد کرنے کے لیے نہیں بلکہ ترکِ جہاد کے لیے تھا کیونکہ مومن کبھی جہاد میں شرکت کے لیے اجازت نہیں لیا کرتا بلکہ منافق کو جہاد میں شرکت کی اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ وہ جہاد میں شرکت کی اجازت مانگ کر دراصل ''ترکِ جہاد'' کی اجازت چاہ رہا ہوتا ہے[1]۔

ہمارے اس دعوے کی ایک اور دلیل کہ یہاں جہاد کے لیے اجازت مانگنا ترکِ جہاد کی اجازت کے مترادف ہے، سورہ توبہ کی آیہ ۸۶ اور آیہ ۹۳ بھی ہیں جن کی بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ منافقین دراصل کس بات کی اجازت مانگ رہے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ ﴿٨٦﴾

(توبہ: ۸۶)

''خوشحال اور متمول لوگ آپؐ سے معذور افراد کی طرح مدینہ میں بیٹھے رہنے کی اجازت مانگ رہے ہیں''

اس طرح آیت ۹۳ میں بھی کم و بیش یہی مضمون ہے۔

حضورِ اکرمؐ کا اجازت دے دینا مصلحت اندیشی تھا

جو لوگ عصمت انبیاء پر ایمان نہیں رکھتے وہ اپنے دعوے کی دلیل میں انہی آیات کو پیش کرتے اور کہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کا منافقین کو گھر بیٹھنے کی اجازت دے دینا خلاف مصلحت تھا۔ یعنی یہ آپؐ کی خطا اور لغزش تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سرزنش

---

[1] اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیہ ۴۴ میں لفظ ''کراھۃً'' یا ''لِئَلاَّ'' مصدر ہے۔ ''لا یستاذنك الذین یؤمنون باللہ والیوم الاخر (کراھۃ) ان یجاھدوا... یا... لِئَلا یجاھدوا۔ اور اسی طرح کی مثالیں قرآن میں بکثرت ہیں۔

اور مذمت کی اور فرمایا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ (سورہ توبہ: ۴۳)

''(اے رسولؐ) یہ جو آپؐ نے ان کو (گھر بیٹھے رہنے کی) اجازت دی ہے قبل اس کے سچے اور جھوٹے کا پتہ چلتا، اللہ سبحانہ نے اس سے درگزر فرمایا''

اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ نے منافقین کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دے کر غلطی کی تھی ورنہ معاف کر دینا یا درگزر کرنا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

انبیاء کی عصمت کے قائل لوگوں کی طرف سے اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ منافقین کو قیام کی اجازت دینا گناہ نہیں ترک ادنی، تھا۔ بہتر یہ تھا کہ حضرت ان کو مدینہ میں رہ جانے کی اجازت ہی نہ دیتے۔ ''درگزر'' یا معافی کا لفظ دونوں صورتوں میں مستعمل ہے۔

ہمارے خیال میں اس اعتراض کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ آیات کے ظاہری معنی ہی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حضور اکرمؐ کا منافقین کو قیام کی اجازت دینا مصلحت اندیشی تھا۔ فرض کیجیے اگر حضور اکرمؐ قیام کی اجازت نہ دیتے تو کیفیت دو صورتوں سے خالی نہ ہوتی۔

۱۔ حضور اکرمؐ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے منافقین جنگ میں شریک ہو جاتے اور اطاعت کرتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو کر عازمِ جہاد ہو جاتے۔

۲۔ یا کھلم کھلا حضورؐ کی نافرمانی پر اتر آتے اور آپؐ کی واضح طور پر حکم عدولی کرتے۔

یہ دونوں صورتیں شدید نقصان اور مفسدہ سے خالی نہ ہوتیں۔ پہلی صورت میں جہاد میں شرکت تو کرتے مگر سورہ توبہ کی آیہ ۴۷ کے مطابق فتنہ پردازی کرتے، فوج میں اختلافات اور افواہیں پھیلاتے۔ چنانچہ اس بات کا نقصان ان کے تخلف جہاد سے زیادہ ہوتا۔

دوسری صورت میں علی الاعلان حضور اکرمؐ کی نافرمانی کرتے ہوئے مدینہ میں رہ جاتے۔ اس طرح حضور اکرمؐ کا رعب وجلال جاتا رہتا اور آہستہ آہستہ منافقین زیادہ شدید جسارت و گستاخی کے مرتکب ہونے لگتے۔

چنانچہ حضورِ اکرمؐ نے اپنی خداداد بصیرت سے اسی بات میں مصلحت دیکھی کہ اگر منافقین مدینہ میں رکنے کی اجازت مانگیں تو ان کو اجازت دے دی جائے تاکہ دونوں مفاسد سے بچ جائیں۔

آیہ مبارکہ میں ''عفو'' سے کیا مراد ہے؟

ہمارا یہ تصور کہ جہاں کہیں بھی عربی میں ''عفا اللہ عنک'' کا جملہ استعمال کیا گیا ہو وہاں کسی جرم یا گناہ کا سرزد ہونا مراد ہے، غلط ہے۔

دراصل یہ جملہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے لوگ خلفاء کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے اس طرح کہتے تھے، ''اصلح اللہ حال الامیر'' یعنی اللہ خلفیہ کو صحت دے''۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امیر بیمار ہے، خدا اُسے صحت دے۔ بلکہ یہ جملہ خلیفہ کی خیر سگالی اور خیر اندیشی کی علامت ہے۔

اسی طرح جملہ ''لم اذنت'' یعنی آپ نے اجازت کیوں دی!'' اگر چہ ناراضی کا مظہر ہے مگر اس ناراضی کا مصداق منافقین ہیں نہ کہ حضورِ اکرمؐ۔ مقصد یہ ہے کہ منافقین کا جھوٹ اور مکاری اس قدر واضح ہے کہ معمولی سی آزمائش ہی ان کی عیاری کا پردہ چاک کر سکتی تھی۔ آنحضرتؐ اجازت نہ دیتے تب بھی حقیقت خود ہی بے نقاب ہو جاتی۔

غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے اللہ سبحانہ کی ناراضگی کا رخ منافقین کی طرف ہے جو جھوٹے اور مکار ہیں اور حضورِ اکرمؐ سے تو صاف کہا جا رہا ہے کہ آپؐ نے ان کا پردہ رکھا۔ اگر آپ ۱۵ اجازت نہ دیتے تو ان کا جھوٹ بے نقاب ہو جاتا۔

اجازت نہ دینا تصویر کا ایک رخ تھا۔ اگر چہ اس سے مومن و منافق کی کھل کر پہچان ہو جاتی تاہم تصویر کا دوسرا رخ زیادہ مصلحت اندیش تھا جیسا کہ بیان ہو چکا۔

''لقد ابتغوا الفتنه'' یعنی ''وہ فتنہ پردازی کرتے'' کا جملہ جنگ حنین سے متعلق ہے جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

وہ جاں نثار مجاہد جس کا مقصد مقدس ہو، ہر مشکل کو آسان سمجھتا ہے۔ وہ ہر تکلیف کو خود اپنے لیے اختیار کرتا ہے تا کہ اس کا مقصد حاصل ہو۔ جاں نثار مردوں کا یہی شیوہ ہے۔ گرمی، سردی، بھوک، پیاس، مشقت و رنج و تعب، پردیس اور دربدری ان کے آہنی ارادہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ البتہ منافق جن کے دل میں نہ ایمان ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی منزل، وہ نازک موقع پر بچگانہ بہانے بنا کر ایک دوسرے کو کہتے ہیں: ''لا تنفروا فی الحر'' یعنی موسم بہت گرم ہے، جہاد پر مت جاؤ''۔ موسم کا تو ایک بہانہ ہے۔ دراصل یہ خود غرض جماعت جذبہ جاں نثاری و جہاد سے قطعی طور پر عاری ہوتی ہے۔

امیر معاویہ نے حضرت علیؑ سے بغاوت کرتے ہوئے شام میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد اس نے عراقی عوام کے حوصلے پست کرنے کے لیے دہشت گرد دستے عراق بھیجنے شروع کر دیئے تا کہ وہ لوٹ مار کریں اور حضرت علیؑ کی حکومت عدم استحکام کا شکار ہو جائے۔

امیر معاویہ کے حکم سے سفیان بن عوف نے ''انبار'' کے شہر پر حملہ کیا۔ حضرت علی کے گورنر حسان بن حسان بکری کو قتل کیا، عوام کا مال و اسباب لوٹا حتی کہ خواتین کی بالیاں، کنگن اور پازیب وغیرہ بھی زبردستی چھین لیے۔ حضرت علیؑ کو کوفہ میں خبر پہنچی۔ آپؑ نے ایک خطبہ میں عوام کو جہاد کی دعوت دیتے ہوئے بے ہدف منافقین کے بعض مضحکہ خیز بہانوں کا ذکر فرمایا:

فاذا امر تکم باالسیر الھیم فی ایام الصیف قلتم ھذہ حمارۃ القیظ امھلنا عنا الحر و اذا امرتکم بالسیر الیھم فی الشتاء قلتم ھذہ صبارۃ القر امھلنا ینسلخ عنا البرد کل ھذا فرار من الحر والقر...... فانتم

والله من اسلیف افریا اشباہ الرجال ولا رجال

(نہج البلاغه، خطبه ۲۷)

''جب کبھی تمہیں موسم گرما میں جہاد کے لیے کہتا ہوں تو کہتے ہو بڑی جھلسا دینے والی گرمی پڑ رہی ہے، ذرا مہلت دیجیے تا کہ تپش کم ہو جائے۔ اور جب سردیوں میں جہاد کے لیے کہتا ہوں تو کہتے ہیں شدید سردی ہے۔ سردی گزر جانے دیجیے۔ تمہارے یہ گرمی سردی کے بہانے دراصل جنگ سے فرار کے لیے ہیں۔ اگر تم گرمی اور سردی سے بھاگتے ہو تو خدا کی قسم تم تلوار سے اور زیادہ بھاگنے والے ہو۔ اے مردنما لوگو! تم میں مردانگی نام کو بھی نہیں ہے''۔

ماہرین نفسیات اس بچگانہ بہانہ تراشی کو ذہن کا تزلزل اور بے ہدفی کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسے لوگ کبھی بھی جہاد کے لیے قدم نہیں بڑھایا کرتے۔ یہ بے مقصد زندگی گزارنے والے تمام عمر ڈانوا ڈول ہی رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن مجید میں بالکل صحیح فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی سیاہ کاریوں پر ہمیشہ روتے رہیں گے اور انہیں کبھی ہنسنا نصیب نہیں ہوگا۔

اس قماش کے افراد کے لیے سپہ سالار کا فرض

جن کا ذکر اوپر ہوا، ایسے سست، غافل، بے توجہ اور بے مقصد لوگ کسی صورت میں بھی جہاد کے لیے مناسب نہیں ہوتے۔ یہ لوگ کسی وقت بھی مورچوں کو دشمن کے حوالے کر کے بھاگ سکتے ہیں۔ سورہ توبہ کی آیت ۸۳ میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حضور اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے کہ ان کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہ دیں کیونکہ انہوں نے سابقہ آزمائش میں بھی ثابت قدمی کا ثبوت نہیں دیا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:
''فاقعدوا مع الخالفین'' (توبہ: ۸۳) یعنی معذور لوگوں کی طرح گھر ہی بیٹھے رہتے ہیں۔

اس سلسلے میں نازل ہونے والی آیات ذیل میں درج کی جاتی ہے:

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾ (سورہ توبہ: ۸۱)

''جنگ سے منہ موڑنے والے پیغمبر اکرمؐ کی نافرمانی اور ان سے جدائی کے باعث خوش ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مال اور جان سے راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کو ناپسند کیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ شدید گرمی میں جہاد کے لیے مت جاؤ۔ (اے رسولؐ) ان سے کہہ دیجیے کہ اگر عقل کرو تو جہنم کی آگ اس گرمی سے زیادہ گرم ہے (جو تمہارا انتظار کر رہی ہے)''۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا وَّلۡيَبۡكُوۡا كَثِيۡرًا‌ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۸۲﴾

(سورہ توبہ: ۸۲)

''پس تم کم ہنسو اور زیادہ تر روتے رہو کہ تمہارے اعمال کی یہی سزا ہے''

نیز فرماتا ہے:

فَاِنۡ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنۡهُمۡ فَاسۡتَاۡذَنُوۡكَ لِلۡخُرُوۡجِ فَقُلْ لَّنۡ تَخۡرُجُوۡا مَعِىَ اَبَدًا وَّلَنۡ تُقَاتِلُوۡا مَعِىَ عَدُوًّا‌ ؕ اِنَّكُمۡ رَضِيۡتُمۡ بِالۡقُعُوۡدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقۡعُدُوۡا مَعَ الۡخٰلِفِيۡنَ ﴿۸۳﴾ (سورہ توبہ: ۸۳)

''اب جب اللہ سبحانہ، تمہیں ان میں سے کسی جماعت کی طرف لوٹائے اور وہ درخواست کریں کہ (آئندہ وہ جنگ میں) شرکت کریں گے اور تمہارے ساتھ جائیں گے تو کہہ دیجیے ہرگز نہیں! نہ تم ہمارے ساتھ جانے اور نہ ہی کسی دشمن سے لڑنے کے اہل ہو، کیونکہ تم نے پہلے جنگ سے منہ موڑا تھا۔ اب بھی گھر میں بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو!''

وہ لوگ جو جہاد میں شرکت سے مستثنٰی ہیں

فقہی کتابوں میں جہاد سے مستثنٰی لوگوں کے متعلق مکمل ہدایت پائی جاتی ہیں۔ البتہ اس سورہ کی آیات ۹۱ اور ۹۲ میں ایسے بعض افراد کی صفات بیان کی گئیں ہیں جو جہاد سے مستثنٰی ہیں، یعنی وہ بوڑھے جن میں جنگ کی طاقت نہ ہو، مریض اور ایسے مفلوک الحال لوگ جن کے پاس جنگ میں شرکت کے وسائل نہ ہوں، بشرطیکہ وہ حضورِ اکرمؐ کی غیر حاضری میں مخلص مسلمانوں کی طرح رہیں اور کسی قسم کی فتنہ پردازی نہ کریں جیسا کہ آیہ مجیدہ میں "اذا نصحوا للہ ورسولہ یعنی اللہ اور رسولؐ کے ساتھ مخلص رہیں'' کے جملے سے واضح ہے۔ یاد رہے کہ جہاد سے معذور افراد کی تعداد و اقسام اس سے کہیں زیادہ ہیں جو اپنی جگہ پر مذکور ہے مگر اس سورہ میں صرف اتنے ہی لوگوں کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَجَآءَ الۡمُعَذِّرُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ لِيُؤۡذَنَ لَهُمۡ وَقَعَدَ الَّذِيۡنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ‌ ؕ سَيُصِيۡبُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۹۰﴾

(سورہ توبہ: ۹۰)

''خانہ بدوشوں میں سے بعض افراد آئے کہ انہیں (جہاد میں شرکت نہ کرنے کی) اجازت دے دی جائے، جب کہ وہ اللہ و رسولؐ پر جھوٹ باندھنے والے، گھروں میں بیٹھے رہے، ان میں سے جو کافر ہو گئے ان کے لیے اذیت ناک عذاب ہے''

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ (سورہ توبہ:۹۱)

''بوڑھے بیمار اور جنگی اخراجات برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھنے والوں سے کوئی مواخذہ نہیں (اگر وہ جنگ میں شرکت نہ کریں) بشرطیکہ وہ اللہ سبحانہ اور پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ مخلص رہیں۔ بے شک نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ سبحانہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے''

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾

(سورہ توبہ: ۹۲)

''اسی طرح (ان لوگوں کے ذمے بھی کوئی الزام نہیں) جو آپؐ کی خدمت میں آئے کہ آپؐ ان کے لیے سواری کا انتظام کر دیں مگر جب آپؐ نے معذوری ظاہر کر دی تو وہ اشکبار آنکھوں سے لوٹ گئے۔ وہ بہت غمگین ہو رہے تھے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں''۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾ (سورہ توبہ: ۹۳)

''قابل مواخذہ تو وہ لوگ ہیں جو مالی استطاعت بھی رکھتے ہیں کہ جنگی اخراجات برداشت کریں مگر پھر بھی (جنگ میں عدم شرکت) کی آپؐ سے اجازت مانگتے رہتے ہیں اور بڑے خوش ہیں کہ گھر معذوروں کی طرح گھر بیٹھے رہے ہیں۔ اللہ سبحانہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ وہ کچھ سوچ سمجھ نہیں سکتے''

جہاد سے منہ موڑنے والے دنیا طلب لوگوں سے منفی رویہ

اللہ سبحانہ کے فضل و کرم سے حضور اکرمؐ نے تمام مسائل کو حل فرما لیا اور تیس ہزار کے لشکر کے ہمراہ تبوک کی طرف تشریف لے گئے۔

تبوک کے علاقہ میں پہنچنے پر آنحضرتؐ نے دشمن کی فوج کا کوئی نشان نہ پایا گویا اسلامی فوج پہنچنے سے پہلے ہی دشمن متفرق ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ نے سرحدی مقامی لوگوں کے ساتھ معاہدہ کیا اور واپس مدینہ لوٹ آئے۔ اس سفر کے دوران مومن اور منافق کھل کر سامنے آ چکے تھے۔ بعض اچھے بھلے صاحبانِ ایمان مسلمانوں کا منافقوں کے ساتھ اس لحاظ سے سمجھوتا سامنے آیا تھا کہ انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ پر مفاد و آسائش دنیا کو ترجیح دی تھی۔ چنانچہ ضروری تھا کہ تھوڑی سی ان کی سرزنش کی جائے۔ مندرجہ ذیل آیات میں قرآن مجید اس موضوع کی طرف اشارہ فرماتا ہے۔ ان آیات کا ترجمہ پیش کرنے کے بعد ہم ان کی تفسیر بھی پیش کریں گے۔ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ (سورہ توبہ: ۱۱۷)

''اللہ سبحانہ نے پیغمبرؐ اور ان مہاجرین و انصار پر خاص اپنا فضل و کرم نازل فرمایا جنہوں نے اس نازک اور مشکل موقع پر پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت کی جب ایک جماعت کے دل حق سے روگردان ہو رہے تھے پھر اس نے اپنی رحمت ان پر نازل فرمائی کیونکہ وہ ان پر مہربان ہے''۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ (سورہ توبہ: ۱۱۸)

''اسی طرح اللہ سبحانہ نے ان تین ہزار افراد پر بھی اپنا خاص فضل و کرم نازل فرمایا جو پیچھے رہ گئے تھے اور ان (لوگوں کے قطع تعلق) کی وجہ سے زمین ان پر تنگ ہو گئی حتیٰ کہ ان کے لیے جینا دوبھر ہو گیا۔ ان کو احساس ہو گیا کہ اللہ سبحانہ کے علاوہ کوئی اور جائے پناہ نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ نے بھی اپنی رحمت ان کے شامل حال کر دی تا کہ وہ توبہ کر لیں۔ بے شک اللہ سبحانہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (سورہ توبہ: ۱۱۹)

''اے ایمان والو! اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو''۔

جس دن حضورِ اکرمؐ نے جنگ تبوک کے لیے تیاری کا حکم دیا تین سچے مسلمان، جن کے نام حلال، کعب اور مرارہ ہیں، اس مقدس جنگ سے جو اسلام کی بنیاد کو مضبوط کرنے والی تھی، کنارہ کش ہو گئے، حالانکہ یہ وہ موقع تھا کہ اگر مسلمان اپنے دفاع کا معقول انتظام نہ کرتے تو شاید حضور اکرمؐ اور تمام مسلمانوں کی بائیس سالہ محنت شاقہ پر پانی پھر سکتا تھا۔ یہ تینوں آدمی بارگاہِ رسالت مآبؐ میں معذرت کے لیے حاضر

ہوئے، جنگ میں عدم شرکت کی یہ وجہ بیان کی کہ کھجوریں پکنے کو آئی ہیں اور یہی وقت فصل جمع کرنے کا ہے۔ مزید برآں انہوں نے وعدہ کیا کہ چند روزہ میں وہ اپنے کام نپٹا کر اسلامی افواج سے آن ملیں گے۔

ظاہر ہے کہ ان کا عذر غیر منطقی تھا۔ جب دین کو خطرہ لاحق ہو تو ایسے عذر قطعی نا قابل قبول ہوا کرتے ہیں۔ دنیا کے مال و متاع کا اس وقت ہی لطف آتا ہے جب ملت کا استحصال محفوظ ہو اور قومی دولت کے لٹ جانے کا خوف نہ ہو۔ جو قوم اپنا دفاع نہ کرے، چند من جو یا کھجور کی خاطر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہے اور دشمن کے لیے راستہ صاف کر دے کہ وہ کسی وقت بھی اچانک حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لے، کبھی مالی و اقتصادی اعتبار سے خوش نہ ہوگی۔

عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک سال کی محنت کو قومی سلامتی اور سیاسی و اقتصادی آزادی پر قربان کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر افسوس کہ مذکورہ بالا افراد کی عقل اس حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر رہی اور انہوں نے وقتی مفاد کو دائمی مفاد پر ترجیح دی۔ دنیا کی محبت ان کے دل میں اس قدر سما گئی کہ محاذ جنگ پر جانے کو آج اور کل پر ٹالتے رہے حتیٰ کہ ایک دن اچانک خبر آ گئی کہ حضور اکرمؐ مظفر و کامران واپس تشریف لا رہے ہیں۔ یہ تینوں حضرات اس قدر پریشان و پشیمان ہوئے جس کی حد نہیں اور اپنی کوتاہی کے پیش نظر آنحضورؐ کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ سلام عرض کیا اور فتح کی مبارک باد بھی پیش کی مگر آنحضرتؐ نے توجہ نہ فرمائی۔

مدینہ پہنچ کر اور بھی سخت احکامات ان کے بارے میں صادر فرمائے کہ تمام مسلمان ان کے ساتھ معاشرتی مقاطعہ کریں۔ ان کی مستورات آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ''کیا اس مقاطعہ میں ہم پر بھی کوئی فرض عائد ہوتا ہے؟''

آپؐ نے فرمایا: ''تم تو ان کے گھر میں ہو مگر تم پر لازم ہے کہ ان کے ساتھ ازدواجی روابط منقطع رکھو''۔

تین آدمیوں کے خلاف عمومی مقاطعہ کا اعلان ہو گیا۔ پہلی بار اسلامی معاشرے میں یہ منفی طرزِ عمل دیکھنے میں آیا۔ آنحضرتؐ کی عاقلانہ سیاست جو آپ کے آئین کا جزو لاینفک تھی، کے سبق آموز اثرات پیدا ہوئے۔ جہاد کے متخلفین کی تجارت متاثر ہوئی۔ ان کی اجناس بک نہ سکیں، ان کے نزدیک ترین اقارب نے بھی ان سے بات چیت چھوڑ دی اور بقول قرآن مجید ''ضاقت علیھم الارض بما رحبت'' سرزمین مدینہ اپنی تمام تر برکتوں کے باوجود ان کے لیے ایک قید خانہ بن گئی۔ وہ روحانی طور پر شدید مصیبت میں گرفتار ہو گئے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے وضاقت علیھم انفسھم

اس موقع پر ان تینوں کی عقلوں سے صحیح کام کیا اور وہ سمجھ گئے کہ مسلمانوں کے معاشرہ میں مسلمانوں سے مل جل کر رہنے کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت میں ایک ناچیز اقلیت زندہ نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ بقول قرآن مجید ''وظنوا آن لا ملجا من اللہ الا الیہ'' انہوں نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کہیں پناہ نہیں''۔ اس کے وسیع معنی ہیں جس میں یہ بات بھی شامل ہے۔ یعنی ان کو ایمان کے لیے دو چیزوں کی ضرورت لازم ہے ایک فطرت و وجدان جو نہیں ایمان اور توبہ کی طرف لے جائے اور دوسری اجتماعی معاشرتی لوازمات ایمان کے لوازمات کے علاوہ کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا کہ اس طرح ان کی زندگی محال ہو جائے گی۔ ناچار ان کو حق و حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

مقاطعہ کیسے ختم ہوا؟

یہ معاشرتی مقاطعہ پچاس دن جاری رہا۔ یہ لوگ چالیس دن مدینہ میں اور دس دن مدینہ کے گرد ونواح میں بیابان میں رہے۔ آخری تین دن انہوں نے روزے رکھے اور تینوں جنگل کے گوشوں میں عبادت کرتے رہے۔ آخر جبرئیل امین آئے اور سورہ توبہ کی آیت ۱۱۸ لائے۔ حضورِ اکرمؐ نے کسی کو بھیجا کہ ان کو جنگل میں جا کر بشارت دے کہ ان کی توبہ قبول ہوگئی ہے۔ [۱]

منفی رویہ آسان ترین طریقہ مقابلہ ہے

جو سیاست دین اسلام کا حصہ ہے اس کا معقول ترین طریقہ وہ ہے جو حضرت رسول اکرمؐ نے اختیار فرمایا۔ کسی گھر کا نظام بصیرت سربراہ کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ایک تجارتی ادارہ مناسب سربراہ کے بغیر شکست سے دوچار ہوجاتا ہے۔ لہٰذا کیا یہ ممکن ہے کہ ایک وسیع سلطنت جو رسولِ اکرمؐ اور ان کے جانشینوں کے تحت وجود میں آئی ہو، کوئی سیاسی لائحہ عمل نہ رکھتی ہو؟

یہی آیہ مجیدہ یعنی سورہ توبہ کی آیہ ۱۱۸ جہاں مسلمان ممالک کے سربراہوں کے لیے ان گنت سبق اپنے اندر رکھتی ہے ملت کے ہر فرد کے لیے بھی لاتعداد نکات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے! مگر افسوس ہم نے اس آیہ مجیدہ کے سبق کو معمولی سمجھ کر قابل توجہ نہیں جانا۔ یہ آیت ہم سب مسلمانوں سے مخاطب ہے۔ ہمارے اردگرد بے شمار لوگ ایسے ملتے ہیں جو ہر روز احکامات دین تو ذکر کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ زبانی کلامی سمجھانے بجھانے کے بعد اگر وہ نافرمانی خدا ترک نہ کریں تو ہم ان کے ساتھ روابط کم کرلیں، ان لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش نہ آئیں۔ جو ہمارے مشفقانہ نصائح سے سبق حاصل نہ کریں؟ شاید اسی طرح وہ راہِ راست پر آجائیں اور گناہ چھوڑ دیں۔ البتہ یہ مرحلہ کئی مراحل کے بعد آتا ہے۔ امر بالمعروف کے پہلے مراحل اگر کسی شخص پر موثر ثابت نہ ہوں تو پھر منفی رویے کا مرحلہ آتا ہے۔ یہاں ہم ایک حدیث شریف پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

ادنی الانکار ان تلقی اهل المعاصی بوجوه مکنهرة [۲]

''نہی عن المنکر کا گھٹیا ترین درجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے نافرمان سے تیوری چڑھا کر بات کی جائے''

لقد تاب اللہ علی النبی کے جملے کا مطلب

نص قرآن اور عقلی تقاضوں کے اعتبار سے پیغمبر اکرمؐ ہر قسم کے گناہ سے معصوم ہیں۔ مہاجرین وانصار معصوم نہیں بلکہ سب کے سب

---

[۱] مجمع البیان، ج ۳، ص ۷۹

[۲] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ باب ۱۶ امر بالمعروف کے ابواب میں حدیث ۲

منزلِ عدالت پر بھی فائز نہیں ہیں۔ تاہم اس (جنگ تبوک کے) موقع پر وہ کسی ایسے گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے جو فسق سمجھا جائے۔ اس بات کا گواہ خود قرآن مجید کا یہ جملہ ہے:

"من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منهم" یعنی "قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل حق سے روگرداں ہو جاتے" (یعنی وہ دین سے منحرف نہیں ہوتے کہ موجب فسق ہوتا)

جنگ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کے بارے میں اگر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ چونکہ فصلیں پکی ہوئی تھیں اور موسم گرم تھا، انہوں نے سستی سے کام لیا، یہ ایک فطری امر ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

لہٰذا اس پس منظر میں "تاب اللہ" کا مفہوم لغت کے مطابق رحمت کو کسی کے شامل حال کرنا ہے۔ لغت کے مطابق "تاب علیہ (رجع الیہ بالرحمۃ۔ اس سے ہرگز صدورِ گناہ مراد نہیں لیا جا سکتا۔

رہ گیا ان تین مسلمانوں کا جنگ میں شریک نہ ہونا تو بے شک نافرمانی کے زمرے میں آتا ہے۔ اور "علی الثلاثۃ" کا جملہ ظاہراً علی النبی والمہاجرین" کے جملے پر عطف بھی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے باوجود حضرت رسولِ اکرمؐ اور ان کے باوفا ساتھیوں کی طرف جو تمام حالات میں آنحضرتؐ کی پیروی کرتے رہے، صدورِ معصیت کی نسبت نہیں دی جا سکتی، کیونکہ آیت ۱۱۷ خود جو آنحضرتؐ اور آپ کے اصحاب کی کیفیت حال کو بیان کرتی ہے عدم صدورِ معصیت پر گواہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں جملہ "وعلی الثلاثۃ" کا جملہ "وعلی النبی" پر عطف اور دونوں جملوں کو اکٹھے آنا معنوں کے ہم معنی ہونے پر دلیل نہیں۔

(۱۰) مدینے میں نجران کے نمائندہ کی کیفیت

نجران کا صاف ستھرا علاقہ جس میں تقریباً ستر قصبے تھے، یمن اور حجاز کی سرحد پر واقع ہے۔ طلوعِ اسلام کے زمانہ میں حجاز میں عیسائیوں کا صرف یہ علاقہ بت پرستی سے محفوظ تھا اور عیسائیت کا پیرو تھا۔[۱]

حضور اکرمؐ نے جب تمام ممالک کے سربراہوں اور مذہبی مراکز کو دعوتِ اسلام کے خطوط تحریر فرمائے تو نجران کے "اسقف" ابوحارثہ کو بھی خط لکھا جس میں آپؐ نے اسے حلقہ بگوش اسلام ہونے کی دعوت دی۔ خط کا مضمون یہ ہے:[۲]

"ابراہیم واسحٰق ویعقوب کے رب کے نام سے یہ خط، اللہ سبحانہ کے پیغمبر محمدؐ کی طرف سے نجران کے اسقف کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ میں ابراہیمؑ واسحٰقؑ ویعقوبؑ کے پروردگار کی حمد بجالاتا ہوں اور آپ لوگوں کو بندوں کی

---

[۱] یاقوت حموی "معجم البلدان، جلد ۵، ص ۲۶۶۔۲۶۷ پر وہ وجوہات بیان کرتا ہے جن کی بنا پر وہ لوگ عیسائیت کی طرف مائل ہوتے۔

[۲] "اُسقف" یونانی لفظ "اپسکوپ" کا معرب ہے۔ اس کے معنی رقیب ونگران کے ہیں۔ اور اب تک اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو پادری سے رُتبے میں بلند ہو اور اس کا محتسب ہو۔

عبادت ترک کرنے اور اللہ سبحانہ کی عبادت کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ اللہ سبحانہ کے بندوں کی فرمانبرداری سے نکل کر اللہ سبحانہ کی اطاعت میں آ جائیں۔ اگر آپ میری دعوت قبول نہیں کرتے تو کم از کم اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کریں تا کہ وہ تمہارے مال و جان کی حفاظت کرے، ورنہ آپ کے لیے طرہ پیدا ہو سکتا ہے"۔ [۱]

بہت سے شیعہ تاریخی مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے اہل کتاب سے متعلق آیت قرآن جو سب کو خدائے وحدہ لاشریک کی دعوت دیتی ہے، بھی خط میں تحریر فرمائی [۲] ی۔

یہ خط لے کر حضرت رسول اکرمؐ کے نمائندے نجران گئے، اسقف کو خط دیا۔ اس نے بڑے غور سے خط کو مکمل طور پر پڑھا اور فیصلہ کرنے کے لیے اس نے مذہبی اور غیر مذہبی معروف شخصیتوں کی ایک مجلس تشکیل دی۔ اس مجلس کا ایک رکن شرجیل تھا جو عقل و شعور اور حل مسائل میں ید طولی رکھتا تھا۔ اس نے اسقف کے جواب میں کہا کہ میری مذہبی معلومات بہت ہی کم ہیں۔ اس لیے اس خالص مذہبی مسئلے میں کوئی رائے دینے کا حق نہیں رکھتا۔ البتہ اس مذہبی موضوع کے علاوہ کوئی بات ہے تو میں ضرور مشورہ دوں گا۔ بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنے مذہبی پیشواؤں سے اکثر یہ بات سنتے آتے ہیں کہ ایک دن منصب نبوت حضرت اسحاق کی نسل سے نکل کر حضرت اسماعیلؑ کی نسل کو منتقل ہو جائے گا۔ چونکہ حضرت محمدؐ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ہیں اس لیے یہ بعید نہیں کہ یہ وہی پیغمبر موعود ہوں۔

آخر میں اس مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ (اہل نجران کی طرف سے ایک نمائندہ مدینہ جائے اور حضرت محمدؐ سے مفصل بات کر کے آئے نبوت کے دلائل معلوم کرے پھر کوئی فیصلہ ہو۔

پس ساٹھ افراد کا ایک نمائندہ وفد تشکیل دیا گیا۔ یہ ساٹھ افراد نجران کے علماء اور داناترین افراد تھے جن میں یہ تین مذہبی پیشوا تھے۔

۱۔ ابو حارثہ بن علقمہ، اسقف اعظم نجران جو حجاز میں کلیسائے روم کا نمائندہ تھا۔

۲۔ عبدالمسیح، جو عقل و دانش میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔

۳۔ ایہم، جو سن رسیدہ شخص تھا اور نجران کے معزز اکابرین میں شمار ہوتا تھا۔ [۳]

یہ وفد ریشمی لباس فاخرہ پہنے ہوئے، سونے کی انگوٹھیاں ہاتھوں میں اور صلیبیں لٹکائے شاہانہ خدم و حشم کے ساتھ مسجد نبوی میں داخل ہوا اور حضور اکرمؐ کو سلام کیا۔ مگر آپ ان کی یہ متکبرانہ حالت دیکھ کر اور وہ بھی مسجد میں، بہت کبیدہ خاطر ہوئے انہوں نے آنحضرتؐ کی ناراضی کو

---

[۱] البدایہ والنہایہ ص ۵۳، بحار الانوار جلد ۲۱، ص ۲۴۵

[۲] اس سے مراد آیہ مبارکہ (قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمةٍ سوآءٍ بیننا و بینکم (آل عمران: ۶۴) بحار، ج ۲۱، ص ۲۸۷

[۳] تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۶۶

محسوس کیا مگر اس کی وجہ نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے فوراً حضرت عثمانؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ سے رابطہ کیا جوان سے پرانی شناسائی رکھتے تھے مگر انہوں نے کہا کہ یہ عقدہ صرف حضرت علیؑ ہی حل کر سکتے ہیں وہ لوگ حضرت علیؑ کی خدمت میں آئے۔ آپؑ نے فرمایا: ''یہ شاہانہ لباس و آرائش اور زیور وغیرہ اتار کر سادہ اور شریفانہ لباس میں بارگاہِ رسالت میں جاؤ۔ دیکھو وہ کتنا احترام کریں گے''۔ نمائندگان نجران نے ایسا ہی کیا۔ حضورؐ نے بڑے احترام سے ان کے سلام کا جواب دیا اور ان کے تحائف کو بھی کسی قدر شرفِ قبولیت بخشا۔

نمائندگان نجران نے مذاکرات سے پہلے عرض کیا کہ ان کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے بڑی فراخدلی سے اجازت مرحمت فرمائی کہ مسجد نبوی میں مشرق کی طرف منہ کر کے اپنے مذہب کے مطابق نماز ادا کریں۔ [۱]

حضور اکرمؐ کے ساتھ نجران کے وفد کے مذاکرات

محدثین اسلامی مورخین اور سیرت نگاروں نے حضرت رسولِ اکرمؐ کے ساتھ نجران کے وفد سے مذاکرات کی تفصیلات بیان کی ہیں جن میں جناب سید بن طاؤس نے سرگزشت مباہلہ کے سب سے زیادہ واضح و جامع حالات لکھے ہیں۔ انہوں نے ان مذاکرات کو جنہیں ''مباہلہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ از اول تا آخر تمام جزئیات سمیت بیان کیا ہے۔ واقعہ کی تفصیل انہوں نے جناب محمد بن عبدالمطلب شیبانی کی کتاب 'مباہلہ' اور حسن بن اسماعیل کی کتاب ''عمل ذوالحجہ'' سے نقل کی ہے۔ [۲] البتہ بعض سیرت نگاروں کی کتابیں پڑھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس اہم اور ناقابل فراموش واقعہ کو صرف چند جملوں میں بیان کیا ہے۔ یہاں ہم اس واقعے کی تمام تفصیلات بیان نہیں کر سکتے کیونکہ اس کتاب میں گنجائش اتنی نہیں ہے۔ چنانچہ ہم صرف سیرت حلبی کے حوالے سے مختصراً کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ [۳]

حضرت رسول اکرمؐ:

''میں آپ حضرات کو دین توحید، عبادت خدائے واحد اور اس کے احکامات کو ماننے کی دعوت دیتا ہوں''

اس موقع پر آپؐ نے قرآن مجید کی بعض آیات تلاوت فرمائیں۔

نجران کا وفد:

''اگر اسلام سے مراد خدائے واحد پر ایمان لانا ہے تو ہم پہلے ہی اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی اطاعت کر رہے ہیں''

---

[۱] سیرت حلبی، ج ۳، ص ۲۳۹

[۲] جو صاحب اس واقعہ کی تفصیلات جاننا چاہتے ہیں وہ ابن طاؤس مرحوم کی کتاب ''اقبال ص ۴۹۶ تا ص ۵۱۳ کی طرف رجوع کریں۔

[۳] سیرتِ حلبی جلد ۳، ص ۲۳۹

حضرت رسولِ اکرمؐ:

''اسلام کے کچھ تقاضے ہیں اور تمہارے بعض افعال صریحاً اسلام کے خلاف ہیں۔ ایسے میں تم کیسے کہتے ہو کہ تم خدائے واحد کی عبادت کرتے ہو جبکہ تم صلیب کی عبادت کرتے ہو، سور کا گوشت کھاتے ہو اور خدا کو صاحب اولاد جانتے ہو''

نجران کا وفد:

''ہم عیسیٰؑ کو خدا مانتے ہیں کیونکہ انہوں نے مردوں کو زندہ کیا، بیماروں کو صحت بخشی اور مٹی سے پرندے بنا کر ان کو اڑایا، یہ تمام کام خدا ہی کر سکتا ہے''

حضرت رسولِ اکرمؐ:

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ عیسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے بندہ ہیں جن کو اللہ سبحانہ نے جناب مریم کے شکم میں قرار فرمایا اور مذکورہ افعال کی اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت و قدرت عطا فرمائی''

نجران کے وفد میں سے ایک شخص:

''ہم عیسیٰؑ کو خداوند تعالیٰ کا بیٹا اس لیے سمجھتے ہیں کہ ان کی والدہ گرامی حضرت مریمؑ بغیر شادی کے ان کو دنیا میں لانے کا باعث بنیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ ہر حالت میں خدائے کائنات ہیں''

اس موقع پر آنحضرتؐ پر نزولِ وحی کے آثار نمودار ہوئے، فرشتہ وحی نازل ہوا اور اس نے کہا کہ آپ اس طرح جواب دیں:

چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٥٩ (سورہ آل عمران: ۵۹)

''اللہ تعالیٰ کا عیسیٰؑ کو پیدا کرنا بالکل آدمؑ کی مانند ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ لامحدود سے ماں اور باپ دونوں کے بغیر مٹی سے خلق فرمایا۔ پس اگر صرف باپ کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ رہے ہیں تو پھر آدمؑ اس منصب کے زیادہ مستحق قرار پاتے ہیں جن کے نہ باپ ہے اور نہ ہی ماں''۔

نجران کا وفد:

''آپؐ کی دلیل ہمیں قائل نہیں کرتی''۔ اب صرف ایک ہی صورت باقی ہے کہ کسی مقررہ وقت پر باہم ایک دوسرے سے مباہلہ کر لیں۔ جھوٹے

پر لعنت کریں اور خداوند عالم سے دعا کریں کہ جھوٹے کو ہلاک و برباد کر دے''۔[1]

اس موقع پر فرشتہ وحی نازل ہوا اور آیت مباہلہ کے ذریعہ پیغمبر اکرمؐ کو حکم پہنچایا کہ جو لوگ آنحضرتؐ کے ساتھ مجادلہ اور بحث کرتے ہیں، حق کو تسلیم نہیں کرتے تو وہ مباہلہ کے لیے تیار ہوں اور طرفین اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ جھوٹوں کو اپنی رحمت سے دور کر دے۔ چنانچہ آیہ مباہلہ یہ ہے:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝٦١

(سورہ آل عمران: ۶۱)

''(اے حبیبؐ) بات بالکل واضح ہو جانے کے بعد جو بھی آپؐ سے کج بحثی کرے تو اس سے کہہ دیجیے کہ پھر ہم اور تم اپنے بیٹوں اور خواتین اور اپنے نزدیکیوں سمیت آ جاتے ہیں اور جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ سے لعنت طلب کرتے ہیں''

طرفین اس مباہلہ کے فیصلے پر راضی ہو گئے اور طے پایا کہ اگلی صبح مباہلہ کے لیے تیار ہو کر آ جائیں گے۔ چنانچہ مباہلہ کا وقت مقرر ہو گیا۔ آنحضرتؐ اور نجران کے نمائندگان متفق ہو گئے کہ مباہلہ شہر مدینہ کے باہر دامن صحرا میں منعقد ہوگا۔

اگلی صبح حضرت رسولِ اکرمؐ نے اس تاریخی واقعے میں شرکت کے لیے تمام مسلمانوں اور اپنے کثیر متعلقین سے صرف چار افراد کا انتخاب فرمایا! یہ مایہ ناز شخصیات:

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام

حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام

حضرت امام حسن علیہ السلام

اور حضرت امام حسین علیہ السلام

کے سوا اور کوئی نہ تھیں کیونکہ تمام مسلمانوں میں ان ہستیوں سے زیادہ کوئی شخص ایمان اور طہارت کے اعتبار سے ان سے اعلیٰ درجہ پر فائز نہ تھا۔

گھر سے مباہلہ کے مقام تک کا فاصلہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے ایک خاص انداز سے طے فرمایا۔ سب سے آگے آپؐ بہ نفس نفیس

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۱، ص ۳۴۲ بحوالہ البتہ سیرت حلبی کے مطابق 'مباہلہ' کی تجویز حضور اکرمؐ کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔

تشریف لے جا رہے تھے۔ داہنی انگلی حضرت امام حسنؑ نے تھام رکھی تھی اور امام حسینؑ حضرتؐ کی آغوش میں تھ[1] ے۔ آپ کے پیچھے پیچھے حضرت فاطمۃ الزہرا چل رہی تھی اور سب سے آخر میں امیر المومنین حضرت علیؑ تشریف لے جا رہے تھے۔ قبل اس کے کہ آپؐ میدان مباہلہ میں قدم رکھیں آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

''جب میں دعا مانگوں تو آپ سب فوراً آمین کہیں''

ادھر نجران کے وفد کے سربراہ حضرت رسولِ اکرمؐ کے پہنچنے سے پہلے ایک دوسرے سے یہ کہہ رہے تھے کہ اگر حضرت محمدؐ نے آج اپنی مادی طاقت کا مظاہرہ کیا، اپنے سپہ سالاروں و اکابرین کے ساتھ ہمارے مقابلے میں آئے تو سمجھ لینا کہ وہ اپنے دعوے میں سچے نہیں ہیں اور انہیں اپنی نبوت پر اعتماد نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ اپنی اولاد و جگر گوشوں کے ساتھ ہر قسم کی مادی شان و شوکت سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑانے کے لیے آئے تو ثابت ہوگا کہ وہ ایک 'نبی صادق' ہیں اور ان کو اپنے آپ پر اتنا ایمان و بھروسہ ہے کہ نہ صرف اپنی جان کو سپردِ ہلاکت کرنے پر آمادہ ہیں بلکہ کمالِ جرات و دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنیا میں اپنے عزیز ترین افراد کو بھی تباہی و بربادی کی بھٹی میں جھونک رہے ہیں۔

نجران کے نمائندہ سربراہ ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت رسولِ اکرمؐ کا نورانی چہرۂ مبارک صرف چار دوسرے افراد کے ساتھ نمودار ہوا، جن میں سے تین خود ان کے اپنے پارۂ جگر تھے۔ عیسائی تعجب و تحیر کی عجیب کیفیت میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ وہ یہ دیکھ کر انگشت بدندان رہ گئے کہ حضرت رسولِ اکرمؐ اپنے معصوم بچوں اور اکلوتی بیٹی کو میدانِ مباہلہ میں لے آئے ہیں۔ پس وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آنحضرتؐ کو اپنے موقف پر مکمل اعتماد ہے ورنہ ایک غیر متیقن آدمی کبھی اپنی اولاد کو عذاب الٰہی اور بلائے آسمانی کے سپرد ہرگز نہیں کر سکتا۔

پس نجران کا اسقف بولا:

''خدا میں ایسے نورانی چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ بڑے سے بڑے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا دے تو اللہ تعالیٰ فوراً ایسا کر دے گا۔ ہمارا ان نورانی مقربان بارگاہِ الٰہی سے مباہلہ کرنا کسی طور پر بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم سب کے سب تباہ ہو جائیں گے۔ بعید نہیں کہ عذاب خدا اس قدر وسیع ہو کہ روئے زمین پر ایک عیسائی بھی باقی نہ بچے''۔

---

[1] بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرات حسنؑ و حسینؑ کے ہاتھ تھامے ہوئے تھے، علیؑ آنحضرتؐ کے سامنے اور جناب فاطمہؑ آنحضرتؐ کے عقب میں چل رہی تھیں۔ ج ۲۱ ص ۳۳۸

نجران کے وفد کی مباہلہ سے دستبرداری

مذکورہ بالا صورتِ حال میں وفد کے اکابرین نے دیر تک باہم صلاح مشورہ کیا اور آخر کار متفقہ فیصلہ کیا کہ ہرگز مباہلہ نہ کیا جائے بلکہ متفق ہوئے کہ ہر سال ایک مقررہ رقم بطور جزیہ ادا کریں جس کے بدلہ میں اسلامی حکومت ان کے مال و جان کی حفاظت کیا کرے۔ حضورِ اکرمؐ نے ان کی اس درخواست کو قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا:

''اگر نجران کا وفد مباہلہ کرتا تو عذاب ان کے لیے تیار ہو چکا تھا جس کے تحت ان کی شکلیں مسخ کر دی جاتیں، صحرا میں ان پر آگ برستی اور یہ جل کر راکھ ہو جاتے۔ مزید برآں یہی عذاب نجران کے علاقہ تک پھیل جاتا''

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''مباہلہ کے دن حضرت رسول اکرمؐ نے اپنی سیاہ چادر کے نیچے چار افراد کو جمع کیا اور اس آیہ مبارکہ کی تلاوت فرمائی:

وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿٣٣﴾ (احزاب: ۳۳)

''اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ اے اہلبیت تمہیں ہر قسم کی پلیدگی سے دور رکھے اور ایسا پاک کر دے جو پاک کرنے کا حق ہے''

زمخشری نے اس آیۃ مباہلہ کے ذیل میں کچھ نکات بیان کیے اور آخر میں لکھا ہے:

''مباہلے کا واقعہ محولہ بالا آیۃ مجیدہ کا نزول اصحاب کساء کی فضیلت کا بین ثبوت ہے اور دین مقدس اسلام کی حقانیت کی نا قابل تردید دلیل ہے''[1]

طرفین کے مابین صلح نامہ

اس واقعہ کے بعد نجران کے وفد نے حضورؐ سے درخواست کی کہ عیسائیوں کی طرف سے جزیہ کی ادائیگی اور مسلمان حکومت کی طرف سے نجران کی سلامتی و استحکام کی ذمہ داری کے بارے میں جو معاہدہ سے پایا ہے اس کو تحریری شکل دے دی جائے۔ آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ معاہدہ تحریر کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے مندرجہ ذیل تحریر رقم کی:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم! یہ معاہدہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت محمدؐ اور نجران اور اس کے گرد و نواح کے رہنے والوں کے درمیان طے پایا ہے۔ اہل نجران سے جزیہ کے بارے میں یہ طے پایا ہے کہ نجران والے ہر سال دو ہزار لباس اسلامی حکومت کو دیں گے جن میں سے ہر ایک لباس کی قیمت

---

[1] تفسیر کشاف، جلد ا

چالیس درہم سے زیادہ نہ ہوگی۔ اہل نجران اس تعداد کا نصف ماہِ صفر میں اور دوسرا نصف ماہِ رجب میں دے سکتے ہیں۔ جب کبھی یمن کے خلاف جنگ ہوگی تو اہل نجران اسلامی حکومت سے تعاون کرتے ہوئے تیس زرہیں، تیس گھوڑے اور تیس اونٹ ادھار کے طور پر اسلامی افواج کو دیں گے۔ جب کبھی اسلامی وفد نجران جائے گا تو ایک ماہ کی مدت تک اس کی مہمانی اہل نجران کے ذمہ ہوگی۔ اس کے مقابلے میں نجران کی سرزمین کی حفاظت اور اس پر بسنے والے لوگوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبرؐ کے ذمہ اس شرط پر ہوگی کہ اہل نجران فوراً ہر قسم کی سودخوری کو ترک کر دیں اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو حضرت رسول اکرمؐ کا ان سے کوئی پیمان نہ ہوگا اور نہ ہی یہ معاہدہ نافذ العمل ہوگا''[1]

یہ معاہدہ سرخ رنگ کی ایک کھال پر لکھا گیا۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کے دو اصحاب نے معاہدہ پر بطور گواہ دستخط کیے، پھر حضورؐ نے اپنی مہر مبارک اس پر لگائی اور معاہدہ نجران کے وفد کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ معاہدہ جس کا ہم نے بڑے اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اسلامی قیادت بڑی عادل ہے اور اسلامی حکومت جابر و ظالم حکومتوں کی طرح نہیں جو فریق مخالف کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں اور ان پر بھاری خراج کا بوجھ ڈال دیتی ہیں۔ بلکہ اسلامی حکومت سلامتی اور انصاف جیسے انسانی اصولوں پر مبنی ہے اور دوسروں پر ان کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتی۔

فضیلت کی سب سے بڑی سند

مباہلہ کا واقعہ اور اس ذیل میں نازل ہونے والی آیۃ مجیدہ مکتب تشیع کے لیے فضیلت و اعزاز کی سب سے بڑی سند ہے۔

اسلام کی قابل فخر سند اور فضیلت کی تشریح

جو لوگ زندہ ضمیر رکھتے ہیں وہ اب تک پیش کی جانے والی دلائل توحید باری تعالیٰ اور اس کی کسی طرح کی اولاد نہ رکھنے سے متعلق دلیلوں پر ضرور غور کریں گے۔ مگر مباہلہ کے واقعہ میں اللہ سبحانہ کی وحدانیت کے ثبوت کا ایک اچھوتا انداز نظر آتا ہے، وہ یہ کہ توحید کے علمبردار اعلان کرتے ہیں کہ ہم اپنی خواتین، بچوں اور مردوں سمیت آ جاتے ہیں، تم بھی اپنی خواتین، بچوں اور مردوں سمیت آ جاؤ، پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں کہ جھوٹوں کو اپنی رحمت سے دور فرمائے۔

۱۔ مباہلہ کی تجویز خود حضرت رسولِ اکرمؐ کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ کو اپنے موقف پر یقین تھا کہ آپ کی دعا سے عذاب نازل ہوگا اور دشمن نیست و نابود ہو جائے گا۔ چنانچہ آیہ مباہلہ شروع ہی اس طرح ہوتی ہے:

فمن حآبك فيه من بعد ما جآءك من العلم

''یعنی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد اگر کوئی آپ سے کج بحثی کرے تو..................

---

[1] فتوح البلدان، ص ۷۶

۲۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کو اپنے موقف کے حق ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ آنحضرتؐ نے اپنے بچوں، خواتین اور مردوں کو خطرہ میں ڈال دیا یعنی اس سلسلہ میں نہ صرف بہ نفس نفیس خود میدان مباہلہ میں تشریف لائے بلکہ اپنے پیاروں کو بھی ہمراہ لے آئے۔

۳۔ آیۂ مجیدہ واضح طور پر کہہ رہی ہے کہ طرفین کے مابین اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کی دوری تین قسم کے افراد کی موجودگی میں طلب کی جائے۔

(الف) طرفین اپنے بچوں کو ساتھ لے آئیں۔ (ابناء نا وابناء کم)

(ب) طرفین اپنی خواتین کو لے کر آئیں۔ (نساءَ نا ونساءَ کم)

(ج) طرفین کے ایسے قابل اعتماد افراد موجود ہوں جن کو وہ خود اپنی جان کے برابر جانتے ہوں۔ (انفسنا وانفسکم) اس کا مطلب یہ ہے کہ طرفین کے مرد و زن سب موجود ہوں۔

۴۔ چونکہ آیۂ مجیدہ میں خواتین بچوں اور مردوں کے مباہلہ میں لانے کا ذکر ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ''اسلام'' کی طرف سے صرف حضرت رسول اکرمؐ ہی فریق نہیں تھے اور وہ اپنے ساتھ لانے کے لیے خواتین، بچے اور مرد نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ آیۂ مجیدہ میں 'جمع' کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے یعنی ''کاذب'' کے بجائے ''کاذبین'' کہا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ طرفین میں سے ہر ایک دوسرے گروہ میں ایک سے زیادہ افراد کو جھوٹا سمجھ رہا ہے۔ اگر مباہلہ میں صرف ایک شخص ہی مراد ہوتا تو ''علی الکاذبین'' کے جملہ کے بجائے ''علی الکاذب'' استعمال ہوتا۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ طرفین کے ساتھ اور بھی مباہلہ میں شریک تھے اور دعا کرنے والوں میں شامل تھے۔

۵۔ آیۂ مجیدہ بچوں، خواتین اور مردوں کے بارے میں ذکر کر رہی ہے لیکن عملی طور پر حضرت رسول اکرمؐ نے صرف حضرت امام حسن و حسین اپنی نور نظر حضرت فاطمۃ الزہراؑ اور حضرت علیؑ کے ساتھ میدان مباہلہ میں قدم رکھا اس سے بخوبی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ مذکورہ بالا تین طبقوں کے مصداق صرف یہی چار حضرات تھے۔ اگر ان کے علاوہ کسی اور فرد میں اتنی صلاحیت ہوتی تو حضرت رسولِ اکرمؐ ضرور مدینہ کے مسلمان بچوں، خواتین، اپنی ازواج گرامی اور صحابہ کرامؓ کے تینوں طبقات سے لوگ اپنے ساتھ لے جاتے تا کہ آیۂ مجیدہ میں استعمال شدہ صیغہ جمع کے الفاظ ''ابناء'' ''نساء'' اور ''انفس'' کا تقاضا پورا ہو جاتا۔ مگر آنحضرتؐ نے ''ابناء'' کی جگہ صرف دو بچے: ''نساء'' کی جگہ صرف ایک خاتون اور ''انفس'' کی جگہ صرف ایک صاحب کا انتخاب فرمایا۔ حضور اکرمؐ کا یہ عمل اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ ان چار حضرات کے علاوہ کسی اور میں آیۂ مجیدہ کے مصداق بننے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔

۶۔ ''انفسنا'' کے لفظ میں ایک اور نکتہ بھی ہے یعنی اس لفظ کا مصداق صرف ایسی شخصیت ہی کو ہونا چاہیے جو ذاتی کمالات اور خصوصیات میں اس منزل پر ہو کہ اسے 'نفس نبیؐ' قرار دیا جا سکے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ شخصیت منصب و مقام کے لحاظ سے بھی پیغمبر اکرمؐ کے برابر ہو۔ خاص خیال رکھنا لازم ہے کہ ''انفسنا'' سے مراد پیغمبر اکرمؐ کی ذات مبارکہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آیۂ مجیدہ کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ 'ندع'' کا مفعول ہے یعنی یہ ایک 'داعی' ہے 'مدعو' سے مختلف یہ بات بالکل لغو ہوگی کہ ایک شخص خود اپنے آپ کو پکار رہا ہو۔

آیۃ مجیدہ میں استعمال شدہ الفاظ اس بات کا پتہ دے رہے ہے کہ حضرت رسولِ اکرمؐ کے ساتھ جانے والے افراد خاص فضیلت کے حامل ہیں کیونکہ آیۃ مجیدہ نے جہاں حضرات حسنینؑ کو پیغمبر اکرمؐ کے بیٹے، جناب فاطمۃ الزہرا، کو خاندانِ نبوت کی واحد خاتون قرار دیا ہے وہاں حضرت علیؑ کو لفظ ''انفسنا'' کا مصداق قرار دیا ہے اور ان کی عظیم شخصیت کو پیغمبر اکرمؐ کی جان قرار دیا ہے۔کسی شخص کی اس سے زیادہ اور فضیلت ہو ہی کیا سکتی ہے کہ وہ معنوی اور ذاتی لحاظ سے اس قدر بلند ہو کہ خود اللہ تعالیٰ اس کو پیغمبر اکرمؐ کی جان وروح کے برابر قرار دے۔کیا یہ آیہ مجیدہ اس بات کی بین گواہ نہیں کہ حضرت علیؑ تمام مسلمانوں سے برتر ہیں؟

ہمارے مذہبی قائدین کی طرف سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کے مطابق مباہلہ صرف حضرت پیغمبر اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے ہی مختص نہیں ہے، بلکہ مذہبی مسائل میں ہر مسلمان اپنے مخالف سے مباہلہ کر سکتا ہے۔ایسے موقع پر پڑھی جانے والی دعائیں کتب حدیث میں موجود ہیں۔البتہ اگر قارئین کرام اس سلسلے میں مزید معلومات لینا چاہتے ہیں تو ''کتاب نور الثقلین'' جلد ا، ص ۲۹۱، ۲۹۲ سے رجوع کریں۔

استاد محترم جناب علامہ طباطبائی نے مباہلہ کے بارے میں یوں تحریر فرمایا ہے:

''مباہلہ دین مقدس اسلام کے زندہ معجزوں میں سے ایک ہے۔ہر باایمان مسلمان حضرت رسولِ اکرمؐ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اس کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے اپنے مخالفین سے مباہلہ کر سکتا ہے۔اس موقع پر وہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کر سکتا ہے کہ مخالف فریق کو ذلیل ورسوا کرے''۔[1]

---

[1] بعض اسلامی روایات میں اس موضوع کی وضاحت کی گئی ہے۔اس سلسلہ میں اصول کافی کتاب ...... بابِ مباہلہ ص ۵۳۸ کی طرف رجوع فرمائیں۔

(۹) چند نکات کا بیان

شیعہ مفسرین اور دانشوروں نے تو مباہلہ کے واقعہ کو اپنی ہر تفسیر اور تصنیف میں نمایاں طور پر بیان کیا ہی ہے، برادرانِ اہل سنت میں سے ساٹھ اہل قلم حضرات نے اس واقعے پر قلم اٹھایا ہے۔ذیل میں ہم بعض کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

۱۔ صحیح مسلم میں جو صحاح ستہ کی دوسری صحیح کتاب ہے جناب مسلم بن حجاج رقم طراز ہیں:

''معاویہ نے سعدؓ بن ابی وقاص سے پوچھا تم علی پر سب کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا: علیؑ میں تین خوبیاں ایسی ہیں جن میں کاش کہ میں ایک کا ہی حامل ہوتا ان میں ایک یہ ہے کہ جب آیۂ مباہلہ نازل ہوئی تو حضرت رسول اکرمؐ نے علیؑ، فاطمہؑ اور حسنین علیہما السلام کو بلایا۔ جب یہ لوگ آ گئے تو فرمایا: ھو لاءِ اھلی یعنی یہ ہی میرے اہل بیت ہیں''۔[۱]

۲۔ مستدرک میں حاکم بنشاپوری لکھتا ہے:

''ابن عباسؓ اور دیگر راویوں سے متواتر روایتیں ملتی ہیں کہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے حسنین اور علی علیہم السلام کو ساتھ لیا، حضرت فاطمہ کو اپنے پیچھے رکھا اور نجران کے وفد کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

ھو لاء ابنا ئنا وانفسنا و نسا ئنا فھلموا انفسکم وابنا ئَکم و نسائکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین

''یعنی یہ حضرات میرے بچے، میری خواتین اور ایسے مرد ہیں جو مجھ جیسے ہیں۔تم بھی اپنے ایسے ہی مردوں، بچوں اور خواتین کو لے آؤ کہ مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت طلب کریں''۔[۲]

۳۔ ثعلبی اپنی تفسیر میں لکھتا ہے:

''جب حضرت رسولِ اکرمؐ میدان مباہلہ میں تشریف لائے تو حسینؑ آپؐ کی گود میں تھے حسن انگلی پکڑے ہوئے چلے آ رہے تھے، آپؐ کی دختر محترمہ آپؐ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں اور ان کے پیچھے حضرت علیؑ تھے۔اس موقع پر نجران کے اسقف نے کہا یا معشر النصاری انی لاری وجوھاً لوسالوا اللہ ان یزیل جبلاً من مکانہ لازالہ فلا تبتھلوا فتھلکوا یعنی اے میرے ہم مذہبو میں ایسے معصوم چہرے دیکھ

---

[۱] صحیح مسلم، ج ۷، ص ۱۲۰

[۲] مستدرک، ج ۳، ص ۱۵۰

رہا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ سے کوہِ گراں کو اکھاڑ ڈالنے کی دعا کریں تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی قبول فرمالے۔ان سے ہرگز مباہلہ نہ کرنا، ورنہ نیست و نابود ہو جاؤ گے''۔[1]

۴۔ ''زمخشری'' ''کشاف میں ثعلبی کے جملے نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''نجران کے اسقف نے مزید کہا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اہل نجران کی نابودی کا وقت آن پہنچا ہے۔ اگر مباہلہ کرو گے تو تمہاری انسانی صورتیں حیوانوں میں مسخ ہو جائیں گی، یہ صحرا تمہارے لیے آگ کی بھٹی بن جائے گا اور خداوند عالم نجران کے عیسائیوں کا نام و نشان تک مٹا دے گا''۔[2]

۵۔ ابن حجر اپنے زمانہ کے معروف محدث ''دارقطنی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''امیر المومنین حضرت علیؑ جب حضرت عمرؓ کی طرف سے تشکیل شدہ مجلس شوریٰ میں تشریف لے گئے تو آپؑ نے اراکین شوریٰ کے سامنے آیۂ مباہلہ ہی کے حوالے سے اپنی برتری کے بارے میں احتجاج کیا اور فرمایا: کیا تم میں سے کوئی ہے جس کا تعلق حضرت رسول اکرمؐ سے مجھ سے زیادہ قریب تر ہو؟'' روز مباہلہ حضرتؐ نے مجھے اپنی جان، میرے بچوں کو اپنے بچے اور میری اہلیہ کو اپنی پارۂ جگر فرمایا''

سب اراکین شوریٰ نے بیک زبان ان کی تصدیق کی اور کہا: ''یہ تمام خصوصیات ہم سوائے آپ کے اور کسی میں نہیں پاتے۔[3]

آخر میں ایک اور نکتہ کا ذکر نا گزیر ہے۔ حضرت علیؑ کی شخصیت کی پہچان کے لیے اور ذرائع بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔قرآن مجید نے انبیاء ماسلف کی فضیلتیں بیان کرتے ہوئے بعض مخصوص صفات بیان کر کے اہل بیت حضرت رسول اکرمؐ علی الخصوص حضرت علیؑ کا ذکر خیر بھی انہی صفات کے حوالے سے کیا ہے۔

ان صفات کی بنا پر موازنہ کی صورت میں قرآن مجید کا ایک اچھوتا انداز ہے جن سے ان فضائل کا پتہ چلتا ہے جو اب تک ہم سے پوشیدہ تھے۔ اس موقع پر ہم نہایت اختصار سے اس موازنہ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہم یہ موازنہ جناب محقق طوسیٰ مرحوم کے ایک کتابچہ سے نقل کر رہے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید حضرت نوحؑ کو ایک شکر گزار بندہ کے طور پر یاد کرتا ہے: "انه کان عبداً شکوراً یعنی ''وہ (نوحؑ) ایک شکر گزار بندے تھے۔[4] جبکہ حضرت علیؑ کے ذکر میں صفتِ ''مشکور'' لائی گئی ہے۔ ان هذا کان لکم جزاءً و کان سعیکم مشکوراً یعنی یہ تو

---

[1] عمدہ ابن بطریق، ص ۹۵

[2] کشاف، ج ۱، ص ۱۹۳

[3] صواعق محرقہ، ص ۱۵۴

[4] سورہ اسرائیل، آیۃ ۳

رہا آپ کا بدلہ، اور آپ کی جدوجہد قابل قدر ہے‘‘۔[1]

یعنی حضرت نوح اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک شکر گزار بندہ کے مقام پر ہیں جبکہ حضرت علیؑ کا رتبہ یہ ہے کہ ان کی جہد مسلسل مورد قدر و عزت افزائی پروردگار عالم ہے۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے ایک جگہ نوحؑ بندہ شکر گزار ہے اور دوسری جگہ امام کی سعی و کوشش مقدر ہو چکی ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیم کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے

وابراهیم الذی وفی یعنی ابراہیمؑ جنہوں نے وعدہ پورا کر دکھایا۔[2]

قرآن مجید نے حضرت علیؑ کو بھی اس صفت سے یاد کیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ **یوفون بالنذر** (یعنی اہل بیت) اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں۔[3] اس طرح دونوں میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ ’’**واتیناھم ملکاً عظیماً**‘‘ یعنی ہم نے اولادِ ابراہیم کو وسیع وعریض حکومت عطا فرمائی[4]۔ اسی طرح سورہ دھر میں حضرت علیؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ ’’**واذا رایت ثم رایت نعیماً و ملکاً کبیراً**‘‘۔ یعنی اگر غور کریں تو لا متناہی حکمت ملے گی۔[5] یہ صحیح ہے کہ حضرت اسحاقؑ سے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم الشان فرمانروا ہوئے ہیں مگر حضرت علیؑ بھی نص قرآن کی بنا پر عظیم مملکت کے مالک ہیں لیکن ان دو مملکتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی حکومت صرف اس دنیا میں ہے جبکہ حضرت علیؑ کی حکومت عالم بقا سے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔

۴۔ قرآن حکیم حضرت ایوبؑ کا ایک صابر و شاکر بندہ کے طور پر تعارف کرواتا ہے۔ **انا وجدناہ صابر انعم العبد** یعنی ہم نے انہیں (حضرت ایوبؑ کو) صابر و شاکر بندہ پایا۔ وہ کتنے اچھے بندہ ہیں۔[6] حضرت علیؑ کے صبر و تحمل کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کے بہترین بدلہ کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

’’**وجزاھم بما صبروا جنۃ و حریراً**‘‘ یعنی (دنیا) میں انہوں نے جتنا صبر و تحمل اور بردباری سے کام لیا اس کا بدلہ بہشت برین

---

[1] سورہ دھر، آیۃ ۲۲

[2] سورۂ نجم، آیۃ ۳۷

[3] سورۂ دھر، آیۃ ۷

[4] سورۂ نسا، آیۃ ۵۴

[5] سورۂ دھر، آیۃ ۲۰

[6] سورۂ ص، آیۃ ۴۴

اور حریر و دیباج کے لباس فاخرہ ہیں۔[۱]

۵۔ حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کرتے ہوئے انہیں نماز و زکوٰۃ ادا کرنے کے بارے میں کہا گیا ہے۔"و اوصانی بالصلوٰۃ والزکوۃ ما دمت حیاً[۲] یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے ساری زندگی نماز و زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک زندہ ہو نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔مگر حضرت علیؑ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ و هم را کعون یعنی (حضرت علیؑ) ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جو برابر نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔[۳]

اس آیۃ مجیدہ کی تفسیر کے بارے میں اکثر مفسرین نے اتفاق کیا ہے کہ جب حضرت علیؑ نے سائل کو حالت رکوع میں انگوٹھی صدقہ کے طور پر عنایت فرمائی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

۶۔ قرآن فرشتوں کی خدا ترسی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے "یخافون ربھم من فوقھم و یفعلون ما یو مرون یعنی فرشتے اپنے اوپر نازل ہونے والے عذاب الٰہی سے ڈرتے ہیں اور جو بھی حکم دیا جائے بجالاتے ہیں۔[۴]

حضرت علی کے بارے میں بھی یہی ارشاد ہوتا ہے:"و یخافون یوماً کان شرہ مستطیراً یعنی (اہل بیتؑ) اس دن سے خائف رہتے ہیں جس کی ہولناکیاں یقینی ہیں"۔[۵]

۷۔ اللہ تعالیٰ خود اپنی یعریف قرآن کے ان الفاظ میں فرمارہا ہے......فاطر السموت والارض و ھو یطعم ولا یطعم یعنی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا وہ رب ہے جو دوسروں کو تو کھلاتا ہے مگر خود کسی سے نہیں کھاتا۔[۶] چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ دوسروں کو کھلاتا ہے۔قرآن مجید میں حضرت علیؑ کو بھی اسی صفت سے متصف بیان کیا گیا ہے۔"ویطعون الطعام علی حبه مسکینا ویتیما و اسیرا"یعنی (اہلبیتؑ پیغمبرؐ) مساکین یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلایا کرتے ہیں، حالانکہ انہیں خود اسی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔[۷]

اس مقام پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور ان کے مقدس اہل خاندان کا سرسری سا تعارف کرایا جاسکا ہے، تاہم اس سے بھی ان کا مقام اصلی اور قرب معنوی روشن و واضح ہوجاتا ہے۔

---

[۱] سورۂ دھر، آیۃ ۱۲

[۲] سورۂ مریم، آیۃ ۳۱

[۳] سورۂ مائدہ، آیۃ ۵۵

[۴] سورۂ نحل، آیۃ ۵۰

[۵] سورۂ دھر، آیۃ ۷

[۶] سورۂ انعام، آیۃ ۱۴

[۷] سورۂ دہر، آیۃ ۸

(۱۲) مشرکین سے بیزاری ولاتعلقی کا اعلان

۸ھ میں مکہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا اور اسی سال یہاں سے شرک کی بیخ کنی مکمل ہو گئی۔ ۹ھ میں حضرت رسول اکرمؐ نے شام تک اسلام کا لوہا منوا لیا اور جنگ تبوک کے بعد وہاں کے بہت سے قبائل کے ساتھ معاہدے کر کے حضور اکرمؐ مدینہ واپس ہوئے۔ اس وقت ظاہری حالات ایسے تھے کہ حضرت رسولِ اکرمؐ ۹ھ میں حج کے لیے تشریف لیجاتے اور پچھلے سال فتح ہونے والے اپنے آبائی شہر کو ملاحظہ فرماتے مگر اسی اثناء میں ایک اور واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے حضور اکرمؐ اس سال حج کے لیے تشریف نہ لیجا سکے۔ وہ واقعہ اس طرح تھا۔

زمانہ جاہلیت میں عربوں کی رسم تھی کہ جن کپڑوں سے خانہ خدا کا طواف کرتے انہیں طواف کے بعد راہِ خدا میں بطور صدقہ دے دیا کرتے تھے۔ دوسری مرتبہ طواف کے لیے اگر ان کے پاس اور لباس نہ ہوتا تو وہ برہنہ ہی طواف کرنے لگتے۔ اس سال ایسا ہوا کہ ایک حسین و جمیل عورت حرام مہینوں میں مسجد حرام میں آئی۔ پہلے طواف کے بعد نیا لباس نہ ہونے کی وجہ سے اور کسی سے لباس نہ مانگتے ہوئے دوسرا طواف برہنگی کی حالت میں ہی کرنے لگی۔ اس سے خانہ خدا کے گرد موجود افراد کی شیطانی خواہشات کو تحریک ہوئی۔

حضرت رسول اکرمؐ کو اس مشرک عورت کے طوائف کے دوران فحش حرکات کی اطلاع ملی جن کو تاریخ نے قلمبند کیا ہے۔ آپؐ کے نقطہ نظر کے مطابق چونکہ خانہ کعبہ اور اس کے ماحول کو آسمانی تعلیمات کی تربیت گاہ ہونا چاہیے تھا، بت پرستی اور شرک کے زمانہ کی اس رسم نے جس میں عورتیں برہنہ طواف کرتی تھیں اور ان کے جسم شہوت پرستوں کی نظروں کے تختہ مشقف بنتے تھے، آنحضرتؐ کو بہت متاثر کیا! ایسے میں جبرائیل امینؑ حاضر خدمت ہوئے اور سورۂ توبہ کی پہلی چند آیات لائے۔ یہ آیات دراصل اسلامی حکومت کی طرف سے مشرکین کے لیے مقاطعہ کی حیثیت رکھتی ہیں کہ وہ چار ماہ کی مدت میں فیصلہ کر لیں کہ یا تو اپنی وضع کو حکومت توحید کے مطابق ڈھال لیں یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

قبول اسلام یا جنگ

حضرت رسول اکرمؐ نے یہ آیات حضرت ابوبکرؓ کو یاد کرائیں اور چالیس آدمیوں کا ایک وفد ان کی قیادت میں مکہ بھیجا تا کہ وہ عید الضحیٰ کے موقع پر بت پرستوں اور مشرکوں کو وہ آیات پڑھ کر سنا دیں جن کے تحت مشرکین سمجھ جائیں کہ آئندہ وہ اسلامی معاشرہ میں اپنے مشرکانہ عقائد و اعمال کے مطابق زندگی جاری نہیں رکھ سکتے۔

حضرت ابوبکرؓ نے وہ آیات اچھی طرح یاد کر لیں اور چالیس دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ مکہ روانہ ہو گئے۔ ابھی انہوں نے زیادہ مسافت طے نہیں کی تھی کہ دوبارہ ان الفاظ میں یا ان سے مشابہ الفاظ میں وحی نازل ہوئی:

لا یؤدیھا الا انت او رجل منك

''ان آیات کو یا تو خود آپؐ یا وہ شخص جو آپؐ کے اہل بیتؑ میں سے ہو مشرکین کو جا کر سنا سکتا ہے''

حضورؐ نے فوراً حضرت علیؑ کو بلایا، خود اپنی سواری ان کو دی، جابرؓ بن عبداللہ کو ان کے ماتحت کر کے روانہ فرمایا اور حکم دیا: ''جس قدر جلدی ممکن ہو ابوبکرؓ کو راستہ میں جا لو، وہ آیات ان سے لے لو اور منیٰ کے روز جمرہ عقبہ کے پہلو میں کھڑے ہو کر آیاتِ مذکورہ مشرکین کو پڑھ کر سنا دو۔ ان آیات کے علاوہ مندرجہ ذیل چار احکام بھی مشرکین کو سنا دو۔

۱۔ مسلمانوں کے علاوہ کسی شخص کو خانہ کعبہ کے پاس جانے کا حق حاصل نہیں۔

۲۔ برہنہ حالت میں طواف کرنے کی کسی کو اجازت نہیں۔

۳۔ مشرکین کو مراسم حج میں شریک ہونے کی اجازت نہیں۔

۴۔ جس کافر کا حضرت رسولِ اکرمؐ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ ہے وہ معاہدہ اپنی پوری مدت تک نافذ العمل ہے مگر جن کا حضورؐ کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں، یا انہوں نے معاہدہ شکنی کی ہے، چار مہینے کی مدت تک ان کا مال اور جانیں امان میں ہیں۔ اس مدت کے بعد ان کو واضح اعلان کرنا ہوگا کہ وہ شرک و بت پرستی پر باقی رہتے ہیں یا حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی صورت میں وہ دیگر مسلمانوں کی طرح آزاد ہیں، ورنہ ان کے مال و جان کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر نہیں ہوگی۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ آیاتِ مذکورہ حضرت ابو بکرؓ سے واپس لے لیں، انہیں سفر میں اپنے ہمراہ رکھیں یا مدینہ واپس بھیج دیں۔

حضرت علیؑ فوراً روانہ ہو گئے اور جحفہ کے مقام پر حضرت ابوبکر سے جا ملے، حضرت رسول اکرمؐ کا پیغام ان کو پہنچایا، ان سے آیات واپس لے لیں اور فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو میرے ساتھ مکہ چلیں، ورنہ واپس لوٹ جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے چند لمحے سوچا، پھر مدینہ واپس جانے کو مکہ کے سفر پر ترجیح دی۔ حضرت ابوبکرؓ مدینہ آ کر بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

اهلتنی لا مرطالت الاعناق الیه، فلماصرت ببعض الطرق عزلتنی منه،

''یارسول اللہؐ! آپؐ نے خود ہی ایک ایسے کام کے لیے مجھے مامور کیا تھا جس کے انجام دینے کو سب لوگ باعث افتخار سمجھتے تھے جب میں نے کچھ فاصلہ طے کر لیا تو آپؐ نے مجھے معزول فرما دیا''

اس کے بعد عرض کیا: ''کیا میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا:

''آیت تو نازل نہیں ہوئی البتہ وحی آئی تھی کہ ان آیات کو میں خود جا کر مشرکین کو سناؤں یا کوئی میرا اہل خاندان ایسا کرے''

حضرت علیؑ مکہ پہنچے اور جمرۂ عقبہ کے اوپر کھڑے ہو کر سورہ توبہ کی آیات اور حضورِ اکرمؐ کا چار نکاتی پیغام مشرکین کو پہنچا دیا۔ آیات کے فیصلہ کن، دوٹوک لہجے اور حضرت رسولِ اکرمؐ کے چار احکام نے بت پرستوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ لہٰذا ابھی چار ماہ نہیں گزرے تھے کہ

مکہ اور اس کے گرد و نواح میں بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا اور سب لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

نا قابلِ تردید فضیلت

اس میں کوئی شک نہیں کہ سورۂ توبہ کی آیات کی تلاوت کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کی معزولی اور امیر المومنین علیؑ کا تقرر موخر الذکر کا نا قابل تردید اعزاز ہے جس کو نہ صرف شیعہ محدثین و مفسرین نے اپنی کتابوں میں تحریر کیا ہے بلکہ اکثر سنی محدثین و علماء نے بھی اپنی کتابوں میں اس کو بیان کیا ہے۔ علامہ امینی مرحوم نے اپنی کتاب ''الغدیر'' جلد ۶ ص ۳۱۸ تا ۳۲۱ میں اس واقعہ کو بہتر ۷۲ اہل سنت و بزرگوں اور دانشوروں کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ پس اس واقعہ کی روایت کے ''تواتر'' سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اہل سنت عالم جناب شمس الدین مکی نے جنہوں نے ۷۸۰ھ میں وفات پائی، خلفاؓ کی شان میں مندرجہ ذیل اشعار اپنے قصیدہ میں کہے ہیں:

وارسله عنه الرسول مبلغاً

وخص بهذا الامر تخصيص مفردٍ

وقال هل التبليغ عني ينبغي

لمن ليس من بيتي من القوم فاقتدي

''حضرت رسولِ اکرمؐ نے امیر المومنین حضرت علیؑ کو اپنا پیغامبر خاص بنا کر روانہ کیا۔ سب اصحابؓ میں سے آپؐ نے صرف حضرت علیؑ ہی کو اس کام کے لیے برگزیدہ فرمایا۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ کیا وہ شخص جو میرے اہل بیتؑ سے نہیں، میرا پیغامبر بن سکتا ہے؟''

حضرت ابوبکرؓ کی معزولی اور حضرت علیؑ کا ان کی جگہ تقرر مسلمان مفسرین و مورخین کے درمیان ایک جذباتی موضوع رہا ہے۔ ہر شخص نے اپنے ذہن کے رجحان کے مطابق اس واقعے کا تجزیہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو رائے خود ساختہ عقیدے کی بنیاد پر قائم کی جائے گی وہ رائے قائم کرنے والے کی اپنی ذاتی ہی ہوگی۔ اگر مذکورہ بالا تمام اہل قلم اپنی اپنی رائے سے قطع نظر صرف حضرت رسولِ اکرمؐ کے اس ایک جملے کو نظر میں رکھتے جو آپؐ نے اس معزولی اور تقرر کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا تو بات کی حقیقت تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہو جاتی مگر افسوس کہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے ارشاد سے صرف نظر کر کے خود ساختہ دلائل سے اپنی ذاتی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

جناب محمود آلوسی بغدادی، متوفی ۱۲۷۰ھ نے اپنی کتاب ''روح المعانی'' میں حضرت ابوبکرؓ کی معزولی کے واقعہ کی توجیہہ کرتے ہوئے یہ کوشش کی ہے کہ عام مسلمانوں کے ذہن میں حضرت ابوبکرؓ کے معنوی کردار کا تصور کم نہ ہونے پائے۔

وہ لکھتے ہیں:

''حضرت ابوبکرؓ ایک نرم دل اور مہربان آدمی تھے جبکہ حضرت علیؑ ایک دلیر و شجاع مردِ مجاہد تھے۔ مشرکین کے معاہدہ کو ختم کرنا اور ان کے خون کے مباح ہونے کا اعلان کرنا ایک بہادر اور مضبوط دل آدمی کا کام تھا اور یہ صفت حضرت علیؑ میں حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ پائی جاتی تھی

اسی لیے حضرت رسول اکرمؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو اس پیغام کے پہنچانے کے لیے معذور جانا اور حضرت علیؑ کو ان کی جگہ بھیجا''۔ [1]

آلوسی کی یہ توجیہہ حضرت ابوبکرؓ کی حمایت اور حضرت رسولِ اکرمؐ کی بیان کردہ وجہ کے نظرانداز کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کے تقرر کی ہرگز وہ وجہ نہیں فرمائی جسے آلوسی نے لکھا ہے بلکہ اس تبدیلی کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان آیات کو یا تو خود میں مشرکین تک پہنچاؤں یا وہ شخص پہنچائے جو میرے اہل بیتؑ سے ہو۔ اگر حضرت ابوبکرؓ کی معزولی کی وجہ ان آیات کے پہنچانے کے سلسلہ میں ان کے مزاج کی ناسازگاری ہوتی تو آنحضرتؐ کے لیے اس بات کے اظہار کا صحیح موقعہ تھا۔ بلکہ موقعہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی رحمدلی وشفقت کا حضرت علیؑ کی شجاعت اور قوتِ قلب کے بالمقام بطور دلیل ذکر فرماتے۔

جناب آلوسی نے اپنی اس بحث میں حضرت ابوبکرؓ کا دفاع کرتے ہوئے نادانستہ طور پر تعصب کرتے ہوئے خود حضرت پیغمبرِ اکرمؐ کی عظمت کو کم کر دیا ہے کیونکہ ان کی بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت رسولِ اکرمؐ بھی بذات خود ان آیات کے ابلاغ کے اہل نہ تھے کیونکہ اگر اس عمل میں حضرت ابوبکرؓ کی معذوری کی وجہ ان کی رحیم وکریم طبیعت تھی تو حضرت رسولؐ خود رحمت وشفقت ورافت کے بہترین مظہر اور نصِ قرآن کے مطابق ''رحمۃ اللعلمین'' ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کے ابلاغ کے قابل نہ تھے، درآنحالیکہ آنحضرتؐ اپنے آپ کو اس عمل کا بالکل اہل جانتے تھے اور فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے:

لا یؤدیھا الا انت اورجل منك

''یعنی ان آیات کو مشرکین تک پہنچانے کی صلاحیت یا تو خود آپؐ میں ہے یا آپؐ کے اہل بیتؑ کے کسی فرد میں ہے''

دمشق کے مدرسہ ''دارالسعادہ'' میں ایک مناظرہ [2]

اس موقع پر اس مناظرہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا جو دمشق کے مدرسہ دارالسعادہ کے ایک فاضل استاد سے راقم کتاب کا ہوا استاد اپنے شاگردوں کو جناب محمد رضا مصری کی کتاب ''محمد رسول اللہ'' میں سے سبق پڑھا رہا تھا۔ سبق پڑھا لینے کے بعد مؤلف کتاب کے الفاظ کی روشنی میں حضرت ابوبکرؓ کی شجاعت پر بات چل نکلی۔ راقم نے فاضل استاد کی اجازت سے مندرجہ ذیل گفتگو کی!

''اکثر وبیشتر اہل سنت اہل قلم حضرت ابوبکرؓ کو ایسی متضاد صفات سے متصف کرتے ہیں جن کا ہونا عام طور پر محال ہے اسی واقع معزولی کو ہی لے لیجیے۔ بتایا جاتا ہے کہ چونکہ حضرت ابوبکر رقیق القلب اور رحم دل واقع ہوئے تھے۔ اس لیے ان کو آیات پہنچانے سے معذور

---

[1] روح المعانی جلد ۱۰، ص ۴۵

[2] یہ مدرسہ دمشق کے ایک مذہبی کالج کا مقدماتی مدرسہ ہے۔ کوچہ حضرت رقیہؑ میں 'مسجد امیہ' کے شمال کی طرف واقع ہے۔ مناظرہ کی تاریخ ۱۳۹۶ھ ش ہے۔

رکھا گیا۔ حالانکہ رحمدلی، بہادری اور شجاعت کی ضد ہے۔ اس طرح وہ حضرت ابوبکرؓ کا دفاع کرتے ہیں۔ پھر اسی کتاب میں مؤلف حضرت ابو بکرؓ کو حضرت علیؑ سے شجاع تر قرار دیتا ہے اور کہتا ہے ایک دفعہ حضرت علیؑ سے پوچھا گیا کہ آپؑ زیادہ شجاع ہیں یا حضرت ابوبکرؓ؟ آپؑ نے فرمایا: ''ابوبکرؓ''

لہٰذا سوچنا چاہیے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؑ سے زیادہ بہادر تھے تو آلوسی حضرت ابوبکرؓ کی معزولی مختلف وجہ یعنی ان کی نرمی و مہربانی کیوں قرار دیتا اور حضرت علیؑ کو قہر و شجاعت کا مظہر کیوں بتلاتا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ اسلام میں کوئی موقعہ ایسا نہیں ملتا جہاں حضرت ابوبکرؓ نے کسی مشرک یا یہودی بہادر کا مقابلہ کیا ہو، یا کسی کو اپنی تلوار سے قتل کیا ہو۔ ایسی کسی چیز کا نہ صرف یہ کہ تاریخ میں کوئی وجود نہیں ملتا بلکہ میدانِ جنگ سے ان کے فرار کے آپ کو واضح شواہد ملیں گے۔ خود محولہ بالا کتاب کا مؤلف جنگ خیبر کے واقعات میں حضرت ابوبکرؓ کا میدان سے فرار کرنا بیان کر رہا ہے۔ میں نے اس کتاب کے وہ صفحات نکالے جہاں یہ واقعات درج تھے اور استادِ مذکور کے لیے پڑھنا شروع کیا:

وہاں یہ لکھا ہوا ہے:

''جنگ خیبر میں حضرت رسولِ اکرمؐ نے بعض افراد کو علمدار بنایا جن میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شامل تھے مگر وہ بغیر کسی نتیجے کے واپس لوٹ آئے۔ اس موقعہ پر حضورِ اکرمؐ نے فرمایا: 'کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں اور وہ بھی دشمن کو پیٹھ دکھانے والا نہیں ہے (لا یولی الدبر)۔[1]

''اس کے بعد میں نے فاضل استاد سے کہا:

''اس جملہ کے کیا معنی ہیں۔ رسول اکرمؐ نے کیوں فرمایا: وہ کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھاتا۔ یہ جملہ آنحضرتؐ نے اس لیے فرمایا کہ اس سے پہلے جتنے حضرات نے علم اسلام اٹھایا تھا۔ سب دشمن کو پیٹھ دکھا کر پلٹ آئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی انہیں ایک مردِ شجاع و دلیر کہنا صحیح ہوگا؟''

میرے ان بیانات کو تاریخ کے استاد نے ان متضاد وجوہ کی بنا پر سخت ناپسند کیا اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں جن کا ذکر باعثِ طوالت و نامناسب ہے۔

ایک اور نامناسب توجیہہ

آٹھویں صدی ہجری کا مشہور مفسر ابن کثیر شامی اپنی تفسیر میں اس واقعہ کی ایک اور توجیہہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''کسی معاہدہ کو توڑنے کے بارے میں عربوں میں یہ طریقہ تھا کہ خود معاہدہ کرنے والا یا اس کا کوئی رشتہ دار معاہدہ توڑنے کا اعلان

---

[1] مصری مؤلف نے حضرت علیؑ کے بارے میں یہ جملہ ''لا یُولی الدبر یعنی کبھی پیٹھ نہ دکھانے والا'' منسوب کیا ہے حالانکہ حضرت رسول اکرمؐ نے ''کرار'' ''غیر فرار'' کے الفاظ استعمال فرمائے تھے۔

کرتا تھا۔ چونکہ حضرت علیؑ پیغمبر اکرمؐ کے رشتہ دار تھے اس لیے آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کا تقرر فرمایا''۔

یہ تاویل بھی حقیقت سے موافقت نہیں رکھتی کیونکہ حضرت رسولِ اکرمؐ کے رشتہ داروں میں حضرت عباسؓ بن عبدالمطلبؑ (آپؐ کے چچا) جیسے بزرگ بھی موجود تھے جن کی پیغمبر اکرمؐ سے رشتہ داری حضرت علیؑ سے کم نہ تھی۔ پھر اس کام کے لیے ان کو آنحضرتؐ نے کیوں نہ مقرر فرمایا۔

حقیقت بین نظریہ

اس واقعہ کے ذیل میں کہے گئے حضرت رسولِ اکرمؐ کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو تین نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ...... اور جل منک یعنی تم میں سے کوئی آدمی'' والا جملہ اس حقیقت کو آشکار کر رہا ہے کہ حضرت علیؑ حضورِ اکرمؐ کے قریب ترین فرد تھے۔ ایسے ہی اور جملے بھی ہیں جن کو اسلامی محدثین نے نقل کیا ہے۔

۲۔ ''معاہدہ کو منسوخ کرنا یا توڑنا حکومت و سیاست کا کام ہے اور یہ کام سربراہِ حکومت ہی کیا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ کوئی اور شخص نہ تو معاہدہ کر سکتا ہے اور نہ ہی معاہدہ توڑنے کا مجاز ہوتا ہے۔

اس پہلو سے غور کرنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت علیؑ کو سیاسی اور حکومتی امور میں حضور اکرمؐ کے ہم پلہ شمار کر رہا ہے اور حکم دے رہا ہے کہ اس کام کو یا آپؐ خود انجام دیں کیونکہ آپؐ تو مطلق طور پر سربراہِ اسلام ہیں یا وہ شخصیت جو آپؐ سے ہو۔ کوئی اور شخص اس کام کی صلاحیت نہیں رکھتا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی یہ بتانا چاہتا ہے کہ حکومتی و سیاسی امور صرف ان دو ہستیوں ہی کو حل کرنا لازم ہیں۔ پس اگر حضور اکرمؐ دنیا سے تشریف لے جائیں اور جب خورشید رسالت غروب ہو جائے تو پھر حضرت علیؑ کے علاوہ کسی اور سے ہرگز رجوع نہ کیا جانا چاہیے۔

امورِ حکومت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مسلمہ سربراہِ حکومت کی زندگی میں ہی کسی دوسرے شخص کو اس کی نیابت کا کام سونپ دیا جائے۔

چنانچہ سربراہ کی وفات کے بعد بھی وہی شخص اس کا جانشین ہو جو اس کی زندگی میں امورِ سیاسی کو حل کرتا اور ان کا فیصلہ کرتا رہا ہو۔

۳۔ جو شخص قرآن مجید کی چند آیات کے ابلاغ کی استعداد نہ رکھتا ہو وہ مجموعی طور پر اسلام قرآن و سنت، اسلامی حکومت کے انتظام و انصرام، امورِ مسلمین اور تبلیغِ دین اسلام کی ہرگز صلاحیت نہیں رکھتا نہ ہی اس قابل ہو سکتا ہے کہ امورِ مسلمین کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دی جائے اور وہ مسلمانوں کے دنیوی اور آخروی امور کا مرجع قرار پائے۔ یہ ان آیات کی تشریح ہے جو اس سلسلہ میں نازل ہوئیں اور جن کی تعداد سولہ کے عدد سے تجاوز نہیں کرتی۔ ان آیات کی مفصل تفسیر چند حصوں میں بیان کی جاتی ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ①

(سورہ توبہ: ۱)

''(اے مسلمانو!) مشرکین کے جس گروہ کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا اللہ سبحانہ اور اس کا پیغمبرؐ ان سے لاتعلقی کا

اعلان کرتے ہیں"

فَسِيۡحُوۡا فِى الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ‌ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخۡزِى الۡكٰفِرِيۡنَ‏ ﴿۲﴾ (سورہ توبہ: ۲)

"(اے مشرکین!) صرف چار ماہ تک تم اس علاقہ میں رہ سکتے ہو اور یادرکھو کہ تم اللہ تعالیٰ کو کمزور نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ کافروں کو ذلیل کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے"

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَكۡبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىۡۤءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ وَرَسُوۡلُهٗ‌ ؕ فَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ‌ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍۙ‏ ﴿۳﴾

(سورہ توبہ: ۳)

"حج اکبر کے دن اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبرؐ کی طرف سے لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ مشرکین سے بیزار ہیں۔

(اے مشرکین!) اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم توبہ سے انکار کرو گے تو خوب جان لو کہ تم اللہ سبحانہ کو کمزور نہیں کر سکتے۔

(اے پیغمبرؐ!) کافروں کو اذیت ناک عذاب کا مژدہ سنا دو!"

اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدْتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ثُمَّ لَمۡ يَنۡقُصُوۡكُمۡ شَيۡـئًا وَّلَمۡ يُظَاهِرُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَحَدًا فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰى مُدَّتِهِمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ‏ ﴿۴﴾ (سورہ توبہ: ۴)

"(اے مسلمانو!) البتہ وہ مشرکین جن سے تم نے کوئی معاہدہ کیا اور انہوں نے اس معاہدہ میں کوئی کمی بیشی نہ کی، نہ ہی تمہارے کسی دشمن سے ساز باز کی، تم بھی ان کے ساتھ معاہدہ کی مدت پوری کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ پرہیز گار لوگوں کو پسند فرماتا ہے"

فَاِذَا انْسَلَخَ الۡاَشۡهُرُ الۡحُـرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدْتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا لَهُمۡ كُلَّ مَرۡصَدٍ‌ ۚ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا

الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(سورہ توبہ: ۵)

"(اے مسلمانو!) جونہی مقدس مہینے ختم ہوں مشرکین جہاں بھی ملیں ان کو قتل کرو، پکڑ لو، محاصرے میں لے لو اور ہر جگہ ان کے خلاف مورچہ بندی کرلو۔ تاہم اگر وہ توبہ کرلیں، نمازی بن جائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نہایت بخشنے والا مہربان ہے"

جب اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی گئی تو حضرت رسولِ اکرمؐ نے اس حکومت کے استحکام کو یقینی بنانے کے لیے بعض قبائل سے معاہدے فرمائے۔ یہ لوگ دو قسم کے تھے:

۱۔ وہ لوگ جنہوں نے معاہدہ کی پابندی کی۔

۲۔ وہ لوگ جنہوں نے معاہدے توڑ دیئے۔

چنانچہ مذکورہ بالا احکامات میں معاہدہ شکن لوگوں کو اسلامی حکومت کی امان سے خارج کر دیا گیا ہے کیونکہ انہوں نے معاہدہ کی پاسداری نہیں کی تھی اور اسلامی حکومت کی کمر میں چھرا گھونپنے کا کردار ادا کیا تھا۔ سورۂ برأت کی تمام سولہ آیات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ ان مشرکین کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے جو معاہدہ کے پابند رہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

الا الذین عهد تم من المشرکین ثم لم ینقصو کم شیئًا و لم یظاهروا علیکم احداً فاتموا الیهم عهدهم

"یعنی جو مشرکین معاہدہ میں کمی بیشی نہ کریں اور نہ ہی تمہارے دشمنوں سے ساز باز کریں، ان کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی مدت پوری کرو"

اور سورہ توبہ کی آیہ ۷ میں بھی جو اس بات کی تفسیر کرتی ہے، فرمایا گیا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (سورہ توبہ: ۷)

"وہ لوگ (مشرکین) جن سے مسجد حرام کے قریب معاہدہ کیا گیا تھا اور انہوں نے اس کی پاسداری کی، پس (اے مسلمانو!) تم بھی ان کے ساتھ معاہدہ کی پاسداری کرو"

صرف ان دو آیتوں ہی کے ذریعے معاہدہ کے پابند مشرکین کو "تنبیہ" سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس سورہ کی آیہ ۸، ۱۰ اور ۱۱ میں

بھی اس بات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات بجائے خود دین اسلام کے آسمانی اور صادق ہونے کی اور حضرت رسولِ اکرمؐ کی صداقت وراستی کی بین دلیل ہے کہ غلبہ اور طاقت کے باوجود دشمن کے ساتھ کیا گیا معاہدہ یک طرفہ توڑا نہیں جا رہا بلکہ جب تک دشمن معاہدہ نہ توڑے ان کے ساتھ وفاداری کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود مستشرقین نے دینِ اسلام اور قرآن کے خلاف بہت شور مچایا کہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے تمام مشرکین کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک روا رکھا، حالانکہ مندرجہ بالا سولہ آیتوں میں واضح طور پر معاہدہ کے پابند مشرکین کا احترام کیا گیا ہے جو میدانِ منیٰ میں حضرت علیؑ نے پڑھ کر سنائی تھیں۔

اسلامی حکومت ''مشرکین'' کو تسلیم کیوں نہیں کرتی؟

فی الحال ہماری بحث ''جہاد کے فلسفہ'' سے متعلق نہیں ہے کیونکہ اس موضوع کی تفصیلات کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے جو ہماری اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔ ہمیں یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ محولہ بالا آیات میں مشرکین کے خلاف جو قرارداد پیش کی گئی اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر مشرکین کی بیخ کنی کر دی گئی اور تمام مشرک بت پرستی کو ترک کر کے رفتہ رفتہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

اس قرارداد کا سب سے زیادہ واضح پہلو یہ ہے کہ ''بت پرستی'' تمام ادیانِ توحید کے بنیادی اصول ''توحید'' کے خلاف کھلی بغاوت ہے، چنانچہ کوئی دینی حکومت ایسے کھلم کھلا دشمنوں کو فعالیت کی اجازت نہیں دے سکتی اور نہ ہی ان کو ایک مکتبِ فکر کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ یہ نظریہ صرف اسلام ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیا میں یہی طریقہ رائج ہے کہ جو نظریہ کسی حکومت کے بنیادی اصول کے خلاف ہو اس کو قانونی تحفظ نہیں دیا جاتا۔ اس موقع پر اگر آپ یہ کہیں کہ سرمایہ داری نظریہ رکھنے والے بعض ممالک میں اشتراکیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور اشتراکی سرگرمیاں جاری رکھنے کو قانونی اجازت دی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان ممالک میں اشتراکیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ جونہی انہیں یہ خدشہ ہو کہ عوام اشتراکیت سے متاثر ہو رہے ہیں ان کی تمام مراعات فوراً واپس لے لی جائیں گی۔ ہمارے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ حکومت امریکہ لاطینی امریکہ میں ''نکارا گوا!'' جیسی کمزور حکومت کے ''سوشلسٹ'' ہونے کو برداشت نہیں کرتی اور ہر وقت اس کے درپے رہتی ہے کیسے ممکن ہے وہ خود اپنے ملک میں اشتراکیت کو کھلی چھٹی دے رہے؟

حضرت رسولِ اکرمؐ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک معین مقصد رکھتے تھے

اصولی طور پر اسلامی حکومت کا مقصد توحید کی دعوت وتبلیغ اور ہر طرح کی بت پرستی کا خاتمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت پیغمبر اکرمؐ اس بات پر مامور تھے کہ ہر طریقہ سے (دلیل ومنطق، وعظ ونصیحت اور اگر ضرورت پڑے تو کے استعمال سے) بت پرستی اور بت گری کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ ایسی صورت میں آنحضرتؐ کس طرح اپنی قلمرو میں بت پرستوں کو قانونی تحفظ فراہم کر سکتے اور انہیں آزادیِ

عمل کی اجازت دے سکتے تھے۔ مستشرقین کو چاہیے کہ جب ان کے ذہن میں یہ بات آ جائے کہ انبیاء اور ان کے برحق ساتھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاشرے کی تطہیر، شرک کی بیخ کنی، توحید پرستی اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے قیام کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، تو انصاف کرتے ہوئے حق کو تسلیم کریں۔

انبیاءؑ ہرگز جمہوری حکام کی طرح نہیں ہوتے کہ عوام کی اکثریت کی حمایت کی مدد سے برسرِ اقتدار آئے ہوں اور قانون وشریعت کی تصویب کے لیے عوام کی رائے کو پیش نظر رکھیں اور عوام اگر شرک وکفر کو تسلیم کرنے لگیں تو وہ بھی اس کو تسلیم کر لیں۔

اس کے برعکس انبیائے کرامؑ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص لائحہ عمل لے کر آتے ہیں۔ ان کا ہدف توحید پرستی کی دعوت اور غیر اللہ کی عبادت کی بیخ کنی ہوتا ہے۔ جب انسان اس حقیقت کو تسلیم کر لے تو تمام اعتراضات لغو وبے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں شرک وبت پرستی کی بیخ کنی سے بڑا کوئی ہدف نہیں۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اسلام کے عظیم رہبر نے کیا طریقِ کار اختیار کیا، کس قسم کے وسائل سے استفادہ فرمایا اور اپنے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے لوگوں سے کس طرح پیش آئے۔ آنحضرتؐ نے پورے تیرہ سال مکہ میں وعظ ونصیحت فرمائی، بت پرستی وشرک کے نقائص بیان فرمائے مگر اس کی قیمت آپؐ کو اپنی جان بچانے کے لیے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جانے کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔ اگر ایسا نہ کرتے تو یقیناً آپؐ کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ مدینہ میں آنے اوس وخزرج اور دیگر قبائل کے قبول اسلام کے بعد بھی مشرکین مکہ نے آپؐ کا پیچھا نہ چھوڑا اور برابر مدینہ پر حملہ آور ہوتے رہے۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کی قیادت میں شجاعانِ اسلام ان کے حملوں کو ناکام بناتے رہے۔ حضورِ اکرمؐ کی مستقل مزاجی پورے حجاز پر اسلام وتوحید پرستی کا سبب بنی۔ اسلام کی نوزائیدہ حکومت تشکیل ہوئی، شرک وبت پرستی کے تمام مراکز ختم کر دیئے گئے اور تمام علاقہ مسلمانوں کے زیر تسلط آ گیا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عظیم انسان، ہمدرد قائدؐ آخر ان لوگوں کے خلاف کیا طریقہ اختیار کرتے جو پورے تیرہ سال وعظ ونصیحت کا جواب سنگ بارانی اور گالی گلوچ سے دیتے رہے۔ ستائیس باران کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ پچپن بار آنحضرتؐ کے پیروان سے جنگ کی اور پھر بھی انسانیت سوز افعال کے ترک نہ کرنے پر مصر وبضد رہے۔ اس کا صرف ایک ہی علاج تھا کہ سخت اور فیصلہ کن الفاظ میں ان کو آگاہ کر دیا جاتا کہ یا تو اپنے اعمالِ قبیحہ سے باز آ جائیں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اگر آنحضرتؐ ایسا نہ کرتے تو ان کی اصلاح کا اور کوئی حل موجود نہ تھا۔

بُرے کام کے ترک پر اصرار عیب نہیں

کبھی کبھی یہ خیال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کسی کو بت پرستی جیسی بری عادت سے روکنے پر اصرار کرنا جمہوریت وآزادی کے خلاف ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی بے جا فعل کو ترک کرنے پر اصرار قطعاً برا نہیں ہوتا۔ فرض کیجیے کسی ملک میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑتی ہے وہاں کی وزارت صحت کی ذمہ داری ہوگی کہ عوام کو اس مرض سے بچاؤ کے لیے حفاظتی ٹیکے لگائے۔ اگر کسی جگہ بعض افراد جہالت کی وجہ سے یہ ٹیکے نہیں لگوانا چاہیں تو وزارتِ صحت کا ردِعمل کیا ہوگا؟ بالکل مناسب ہوگا کہ زبردستی لوگوں کو ٹیکہ لگائے جائیں! اس صورت میں وزارتِ صحت کے عملہ پر

کیا یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جمہوریت اور آزادی کے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے؟ کبھی نہیں بلکہ ان کی تعریف کی جائے گی کہ انہوں نے جاہل لوگوں کی زندگی بچانے کے لیے انسانی ہمدردی کا کام کیا!

آزادی کی بھی کوئی حدود ہوتی ہیں

آزادی ایک خوبصورت اور پرکشش لفظ ہے، تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ آزادی کی حدود پر غور کریں کہ کیا افراد اور معاشرہ کی ہر قسم کی آزادی مستحسن وزیبا ہے، یا آزادی کی کچھ حدود ہیں جن سے تجاوز کرنا ذلت وبدبختی کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہوگا کہ ہر حال ہر قسم کی آزادی درست ومستحسن نہیں ہوسکتی بلکہ بلا قید وشرط آزادی ایک بچے کی آزادی کی مانند ہے جو پوری آزادی سے گھر کی تمام اشیاء کو توڑتا پھرے، ہر جگہ آزادی سے چلا جائے اور ہر کام میں دخل اندازی کرے۔ ایسی آزادی یقینا پورے انسانی معاشرہ کے لیے باعث نقصان ہوگی۔

فرض کریں کہ بعض افراد کلب بنا کر معاشرہ میں فحاشی کا مرکز کھولنا، عوام کے اخلاق کو تباہ کرنا، آزادی عقیدہ وعمل کے نام سے انسانیت کے حقوق کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ایسے افراد کی مخالفت ''آزادی وحریت'' انسانی کے خلاف ہوگی؟

آزادی صرف اس حد تک قابل احترام ہے جہاں یہ صحیح اصولِ زندگی کو قائم کرے اقدارِ اخلاقی کو محفوظ رکھے اور معاشرے کو حیوانی اور غیر انسانی سطح تک نہ جانے دے۔ ورنہ اس کے خلاف افکار وعقائد واعمال وکردار معقولی نظریات سے متصادم ہوگی۔ ہر وہ شخص جو انسانی معیارِ شرافت کا قائل ہے اس کا اخلاقی فریضہ ہے کہ شرمناک افعال کرنے والے افراد کی مزاحمت کرے۔ اسی لیے دنیا میں بعض ایسے ممالک آزادی وجمہوریت کے لیے مشہور ہیں جہاں ایسے قوانین نافذ ہیں جو نقصان دہ اقتصادی واخلاقی طریقوں کی مزاحمت کرتے ہیں اور کوئی عقل مند آدمی ان قوانین کو آزادی کے خلاف نہیں کہتا۔

اصولی طور پر ہر وہ شخص جو انسانی تہذیب کو معیاری دیکھنے کا خواہاں ہے اس کا فرض یہ ہے کہ بے حیائی، فحاشی اور غیر انسانی اقدار کے پھیلاؤ کو روکنے کی کوشش کرے اگرچہ اس کو عوامی غیظ وغضب کا شکار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

البتہ بعض ممالک جو ہر قسم کی قیود سے آزادی کے قائل ہیں ان میں کچھ افراد خفیہ کلبیں بنا کر لوگوں کو فحاشی وعریانی کی دعوت دیتے ہیں، یا کچھ لوگ آزادی کی آڑ میں ہم جنس پرستی کے قانون کے جواز کے خواہاں ہیں۔ راقم نے خود امریکہ کی ایک ریاست میں ایک ایسے مظاہرہ کا مشاہدہ کیا ہے جو اس مکروہ فعل کی قانونی اجازت مانگ رہے تھے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس حد تک آزادی انسانی معاشرہ کے لیے مناسب ہوسکتی ہے؟ اگر امریکہ یا برطانیہ کے اکثر عوام اس حد تک آزادی چاہتے ہیں تو کیا یہ صحیح ہوگا کہ امریکی کانگریس اور برطانیہ کی پارلیمنٹ کی صرف اس اصول کے تحت کہ قانون اکثریت کی خواہش کا آئینہ

دار ہونا چاہیے اکثریت کی خاطر ایسا ننگِ انسانیت قانون رائج کر دینا چاہی[i] ے۔

اس پس منظر میں دین مقدس اسلام کے آزادی کی حدود کا تعین کرنے سے اس دین کی عظمت و بزرگی کا ثبوت ظاہر ہو جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں کسی فعل میں آزادی حاصل کرنے کے لیے صرف ایک شرط عائد کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس سے کسی دوسرے کی آزادی پر زد نہ پڑے۔ چنانچہ اس شرط کے تحت بت پرستی، قمار بازی، شراب نوشی، رقص وسرود اور علی الاعلان عصمت فروشی کی اجازت دے دی گئی ہے کیونکہ ان کی نظر میں مذکورہ بالا ننگِ انسانی افعال کسی دوسرے کی آزادی پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوتے۔

لیکن دین مقدس اسلام نے حصولِ آزادی کے لیے دو شرطیں عائد کی ہیں:

۱۔ کسی دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔

۲۔ شرفِ انسانی کا زیان نہ ہو۔

جہاں کہیں بھی مذکورہ بالا دونوں شرطیں موجود نہ ہوں اسلام میں وہاں کسی بھی ایسے فعل کی آزادی کی شدید ممانعت کی گئی ہے چاہے اس فعل کے خواہاں کتنی ہی اکثریت میں کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ دینِ مقدس اسلام کے مطابق کئی ایسے افعال کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور ان افعال کے مرتکب افراد کو سزا بھی دی جاتی ہے جو کئی ایک جمہوری ممالک میں قانوناً جائز و رائج ہیں۔

یہی بنیادی وجوہات ہیں جو اسلامی معاشرہ میں شرک و بت پرستی کو جرم قرار دیتے ہیں، بلکہ شرک کی سزا تو سزائے موت ہے کیونکہ شرک انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے، انسان کو اس عز و شرف کے باوجود اس قدر ذلیل و خوار کر دیتا ہے کہ وہ پتھر و مٹی سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ سرزمین عرب میں دین مبین اسلام سے پہلے وہاں کے لوگوں کی اکثر فحش رسومات ''توحید سے روگردانی ہی کی وجہ سے وجود میں آتی تھیں جن کو اسلام کے عظیم رہبر نے معاشرہ سے ختم کیا۔ کیا ایسی صورت میں مناسب تھا کہ حضورِ اکرمؐ شرک اور مشرکین کو قانونی تحفظ دے کر مسلمانوں کے انحطاط کا تماشہ دیکھتے؟

شرک و بت پرستی انسان سے ہر طرح کی صلاحیت چھین کر اس کو اتنا ذلیل کر دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گائے بھینس جیسے جانوروں بلکہ چاند، سورج، پتھر اور مٹی جیسی بے جان چیزوں کی سطح سے بھی نیچے لے آتا ہے۔ کیا یہ بات صحیح سمجھنا چاہیے کہ بھارت کے کروڑوں افراد تو بھوکوں مریں اور لاکھوں گائیں ان کے کھیت، پھلدار درخت اور فصلیں کھاتی رہیں اور کھا کھا کر آخر ایک دن آبادیوں کے درمیان ہی مر جائیں اور بھوکے انسانوں کو ان کے مردوں کو ٹھکانے لگانے کا دردِ سر برداشت کرنا پڑے؟

بھارتیوں کی سیاہ بختی اور حیاتیات سے بھری ہوئی اس قدرتی غذا سے محرومی کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ وہ انسان سے بڑھ کر ایک جانور کا احترام کرتے ہیں۔ اگر وہ اس ذلت سے چھٹکارا حاصل کر لیں، اپنے آپ کو ایک جانور کے مقابلہ میں ذلیل و خوار نہ جانیں اور اپنی اس

---

[i] یورپ و امریکہ میں ایسی ہی آزادی کا نتیجہ ''ایڈز'' کی بیماری کی صورت میں نکلا ہے۔ جس سے ایسی آزادی کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا ہے اور اب سب لوگ پریشان و پشیمان ہیں۔

عقیدت سے دست بردار ہوجائیں تو وہ دنیا کا خود کفیل ملک بن سکتے ہیں۔یہی وہ مقام ہے جہاں شرک کے خلاف احکامِ قرآن کی عظمت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ ﴿۳۱﴾ (سورہ حج:۳۱)

''جس کسی نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کیا اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کو آسمان سے زمین پر دے مارا گیا ہو، یا پرندے اسے اچک لے جائیں، یا تند آندھیاں اسے گہری کھڈ میں گرا دیں''۔

یہ آیہ مجیدہ بھارتی مشرکین کی کیفیت کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔اگر ہم تاویل قرآن میں آزاد ہوتے تو ضرور کہتے کہ یہ آیہ مبارکہ بت پرستوں ہی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

یہ لوگ ہمیشہ سے مغرب کے غلام رہے ہیں۔اب جب کہ انہیں آزادی ملی تو توحید سے دوری کی وجہ سے انہوں نے گائے کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اتنا ذلیل کرلیا ہے کہ بدنصیبی کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔اس سے زیادہ بدنصیبی اور کیا ہوگی کہ اگر کبھی کوئی گائے ریل کی پٹڑی پر بیٹھ جائے تو ہزاروں انسانوں کو لے کر جانے والی گاڑی رک جائے گی اور جب تک گائے اپنی مرضی سے اُٹھ نہ جائے گی گاڑی سیٹی بجا کر بھی اسے نہیں ہٹا سکتی اگر چہ اتنے میں کئی انسان پریشانی کے عالم میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھیں۔

حال ہی میں ایران کے ایک رسالہ میں لکھا گیا کہ ایک دن مقدس گائیں نئی دہلی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے کے رن وے پر براجمان ہوگئیں۔لہٰذا واچ ٹاور سے اعلان ہوا کہ جب تک مقدس گائیں از خود رن وے خالی نہ کردیں نہ کوئی پرواز آسکتی ہے، نہ جاسکتی ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر بڑی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت رسولِ اکرمؐ نے مشرکین کے خلاف اتنا سخت موقف کیوں اختیار فرمایا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو توحید پرست کہتے ہیں، تورات وانجیل جیسی کتب آسمانی کی پیروی کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ انبیاء توحید پرستی کی ترویج اور بت پرستی کی مزاحمت کے لیے مبعوث ہوئے تھے وہ بھی یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ اور حضرت پیغمبر اکرمؐ نے مشرکین سے نفرت و بیزاری کا اظہار کر کے آزادیٔ انسان کی نفی کی ہے۔یہ لوگ حضرت رسول اکرمؐ کی وعدہ خلاف مشرکین کے ساتھ مخالفت کو خلافِ اصول کہتے ہیں حالانکہ حضرت رسولِ اکرمؐ کا طریق کار بالکل انبیائے ماسلف ہی کی طرح کا تھا۔

آخر میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انبیاؑ نے مشرکین سے نفرت کر کے انسانی معاشرے کی خدمت کی ہے اور انسان کو ذلت و خواری سے نجات دلائی ہے یا نہیں؟ ماننا پڑے گا کہ انبیاؑ نے انسان کو ذلت سے نجات دلائی ہے کوئی بھی حق بین آدمی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا! پس حضرت رسولِ اکرم کا یہ اقدام معاشرہ بشریت کی فلاح کے لیے تھا اور اس کی تکمیل کے لیے طاقت کا استعمال بھی بالکل صحیح تھا اگر چہ مشرکین اس کو ناانصافی ہی سمجھتے رہیں۔

(۱۳) سورۂ برات کے اہم نکات

۱۔ فسیحوا فی الارض اربعة اشھرٍ کے جملہ کے تحت مشرکین کو مہلت دی جارہی ہے کہ چار ماہ تک مکہ میں آزادانہ رہیں۔ اپنے دشمن کو یہ آزادی دینا نو عمر اسلامی حکومت کا امتیاز ہے تاکہ ایک خاص مدت تک دشمن عقل وشعور کی بنا پر غور وخوض کر کے شاید راہِ سعادت اختیار کر لے یا جہاں چاہے جا کر پناہ لے لے۔ اس کے برعکس اگر مسلح مقابلہ کرنا چاہے تو بھی تیاری کر لے۔ اگر نو عمر اسلامی حکومت برحق نہ ہوتی تو دشمن کو یہ مہلت دینے کے بجائے شب خون مار کر انہیں نیست ونابود کر ڈالتی۔

۲۔ الذین عاھدتم من المشرکین کے جملہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ تھوڑا تاریخ کا مطالعہ کریں اور سولہ آیات پر مشتمل قرارداد پر غور کریں۔ ان دونوں مطالب کی تشریح یہ ہے:

(الف) چھٹی ہجری میں ''حدیبیہ'' کے مقام پر حضرت رسولِ اکرمؐ نے قریش مشرکین سے ''عدمِ جارحیت'' کا معاہدہ فرمایا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے طرفین مندرجہ ذیل شرائط پر متفق ہوئے تھے۔

۱۔ مشرکین اور مسلمان دس سال تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔

۲۔ اس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس مدینہ چلے جائیں گے۔

۳۔ اگلے سال مسلمان مکہ آئیں گے اور تین دن وہاں رہ کر واپس مدینہ چلے جائیں گے۔

''معاہدہ حدیبیہ'' ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ قبیلہ ''بنی خزاعہ'' کے سرداروں نے حضرت رسولِ اکرمؐ اور ''بنی بکر'' کے روسا نے قریش کے ساتھ معاہدے کر لیے، درآنحالیکہ یہ دونوں قبیلے ابھی مشرک تھے۔

ان معاہدوں کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ''بنی خزاعہ'' اور ''بنی بکر'' کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ قریش نے ''بنی بکر'' کی اسلحہ سے مدد کر کے عملی طور پر عہد نامہ کی خلاف ورزی کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۸ ھ میں (یعنی معاہدہ حدیبیہ کے دو سال بعد) حضرت رسولِ اکرمؐ نے قریش کی معاہدہ شکنی کی وجہ سے مکہ کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ مکہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں فتح ہو گیا۔ قریش اور اُن کی ذیلی شاخوں میں سے بعض لوگ ایمان لے آئے اور بعض اپنے شرک پر باقی رہے۔

اس تاریخی پس منظر سے آیہ مجیدہ میں بیان شدہ ''عاھدتم من المشرکین'' کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ان مشرکین سے مراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے حضورِ اکرمؐ کے ساتھ معاہدہ شکنی کی اور ان کے وہ ساتھی ہیں جو شرک پر باقی رہے۔

(ب) سورۂ برات کی تیرہویں آیت بھی ہمارے اس دعوے کی تصدیق کر رہی ہے کہ معاہدہ توڑنے والوں سے قریش مراد ہیں کیونکہ یہ آیت پیمان شکنوں کو اس طرح متعارف کرواتی ہے۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ

اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ⑬

(سورہ توبہ: ۱۳)

''(اے مسلمانو!) ان لوگوں سے کیوں جنگ نہیں کرتے ہو جنہوں نے معاہدہ شکنی کی، حضرت رسولِ اکرمؐ کو جلا وطن کرنے کا عہد کیا اور تمہارے ساتھ دشمنی میں پہل کی''

اس آیہ مجیدہ سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہ صفات قریش کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائی جاتیں۔

۲۔ ''یوم الحج الاکبر'' سے مراد وہی دس ذوالحج یعنی منیٰ میں قیام کا دن ہے۔''اکبر' اس ''دن'' کی صفت ہے یعنی اس سے حج کا دن مراد ہے جو ایک عظیم دن ہے۔ منیٰ میں قیام کا دن جو دراصل 'حج کا دن' ہے یقیناً ایک عظیم دن ہے کیونکہ یہ دن مسلمانوں کی بڑی 'عید'' ہے، دوسرے حج کے اکثر بڑے اعمال بھی اس دن انجام پاتے ہیں۔ اسی لیے ہم 'حج اکبر' اور 'حج اصغر' کے دو نام کسی طرح قرار نہیں دیتے۔

جن حضرات نے 'اکبر' کو حج کی صفت خیال کیا ہے وہ مجبور ہیں کہ 'حج اکبر' کے مقابلے میں کوئی 'حج اصغر' بھی تسلیم کریں۔ چنانچہ انہوں نے اس سال 'حج اکبر' کی مندرجہ ذیل توجیہ کی ہے:

(الف) چونکہ اُس سال مسلمانوں اور یہودیوں کی عید ایک ہی دن آتی تھی اس لیے وہ اس سال کے حج کو 'حج اکبر' کہتے ہیں۔

(ب) چونکہ اس سال مسلمانوں اور مشرکین نے مل کر حج کیا اور پھر کبھی دونوں کو اکٹھے نہ ہونا تھا، اس لیے اس حج کو 'حج اکبر' کہتے ہیں۔

ان دونوں غیر تسلی بخش دلیلوں کے مقابلے میں ہماری تفسیر نہایت معقول معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اس دن مشرکین کے خلاف اس قرارداد کو پڑھ کر سنانے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ تمام حجاز کے نمائندے وہاں جمع تھے اور اس 'قرارداد' کو حجاز کے کونے کونے میں پہنچا سکتے تھے۔

بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے ان آیات کو مقام 'جمرۂ عقبہ'' پر پڑھنے پر ہی اکتفا نہ فرمایا بلکہ مشرکین کے گھروں کے سامنے جا کر بھی ان آیات کو پڑھ کر سنایا۔

۴۔ ان آیات کا مفہوم شان نزول اور ان کو پڑھ کر اعلان کرنے کا طریقہ یہ بات بالکل واضح کر دیتا ہے کہ حضورِ اکرمؐ اس قرارداد کے اعلان سے اپنی نو عمر حکومت کی معنوی بنیادیں مضبوط فرما رہے تھے، جزیرہ نما عرب کے تمام باشندوں پر اپنے دین اور حکومت کا قیام واضح فرما رہے تھے اور آیہ مجیدہ میں استعمال شدہ لفظ 'اذان' کی عملی تفسیر فرماتے ہوئے گویا آپ واضح اعلان فرما رہے تھے کہ آج کے بعد جو کام بھی ''توحید کی بنیاد پر نہ ہوگا وہ غیر قانونی اور ناقابل قبول ہوگا۔

اس قرارداد کا اعلان اس وقت عمل میں آیا جب حضورِ اکرمؐ غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے۔ اس وقت 'طائف'، 'تھامہ'، 'نجد' تبوک تک رہنے والے تمام قبائل مسلمان ہو چکے تھے بلکہ پورا جزیرہ نمائے عرب حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا۔ اس موقع پر لازم تھا کہ نو عمر اسلامی حکومت کے استحکام کے لیے اعلان کیا جاتا تاکہ اس حکومت کے تحت توحید کے عقیدہ اور اسلام کے نظریہ کے علاوہ کوئی عقیدہ اور نظریہ قانونی اور

جائز نہیں ہوگا۔

۵۔ وبشر الذین کفروا بعذابٍ الیمٍ

''(اے حبیبؐ) کفار کو اذیت ناک عذاب کا مژدہ سنا دیجئے''

قارئین کرام پر اس جملے کی اہمیت مخفی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اذیت ناک عذاب کے لیے لفظ بشارت کا استعمال ایک طرح کا جملہ استہزاء ہے، جیسا کہ ہم اپنی علاقائی زبانوں میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص کی ڈنڈوں سے تواضع کی گئی۔

۶۔ ولم یظاھروا علیکم

''اور کفار تمہارے خلاف جارحیت کا ارتکاب نہ کریں''

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو قبائل تمہارے دشمن ہیں، مشرکین ان کی مدد نہ کریں، جس طرح قریش نے 'بنی بکر' کی مدد کی جو مسلمانوں کے حلیف قبیلہ 'بنی خزاعہ' سے برسر پیکار تھے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ نے ''معاہدہ حدیبیہ'' کو کالعدم قرار دے کر مکہ کو فتح کیا۔

۷۔ 'معاہدہ' انسان کا کسی فرد یا معاشرہ سے اس وقت تک کا عہد ہوتا ہے جب تک فریق مخالف بھی اس کی پاسداری کرے۔ معاہدہ پر قائم رہنا سچائی اور بہادری کی علامت ہے، جب کہ معاہدہ شکنی ذلت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث میں معاہدہ کی پابندی کی سخت تاکید کی گئی ہے اور پیمان شکنی کو بہت بڑا گناہ سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ؀ (سورہ بقرہ: ۲۷)

''جو لوگ اللہ سبحانہ سے معاہدہ کر کے توڑ دیتے ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کا حکم دیا ہے ان سے قطع رحمی کرتے ہیں اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں، یقیناً وہ خسارے میں ہیں''

اس آیہ مجیدہ میں معاہدہ شکنی کو قطع رحمی اور روئے زمین پر فتنہ و فساد برپا کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کا انجام تباہی و بربادی بتایا گیا ہے۔

البتہ جو لوگ امانتیں صحیح و سالم لوٹاتے ہیں ان کی قرآن مجید نے بڑی تعریف فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ (سورہ مومنون: ۸)

''(مومن وہ لوگ ہیں) جو امانتیں لوٹاتے اور اپنے معاہدوں کی پاسداری کرتے ہیں''

عہد و پیمان کی پاسداری کا ایک عجب واقعہ تاریخ میں ملتا ہے۔

جنگ صفین کے دوران معاویہ بن ابی سفیان نے دھوکہ سے حضرت علیؑ کی فوج کو جنگ ترک کرنے پر مجبور کیا اور قرار پایا کہ ایک سال

کی مدت تک طرفین ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں۔ اس مدت میں طرفین کے دو نمائندے مقرر ہوں جو اختلافات کا فیصلہ کریں۔ جب یہ معاہدہ لکھا گیا اور دو شخص حکم مقرر ہو گئے تو اسی جماعت کو جنہوں نے امیر المومنینؑ کو مجبور کر کے معاہدہ حکمین طے کرایا تھا، اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے امیر المومنینؑ کو رائے دی کہ معاہدہ توڑ دیں اور جنگ دوبارہ شروع کر دیں۔ اس موقع پر امیر المومنین حضرت علیؑ نے تاریخی جواب دیا جو درج ذیل ہے:

ویحکم ابعد الرضآء والعهد نرجع اولیس الله یقول اوفوا بالعقود و قال اوفوا بعهد الله اذا عاهدتم؟ ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدها و قد جعلتم الله علیکم کفیلاً ان الله یعلم ما تفعلون

''حیف ہے تم پر! کیا ہم معاہدہ کر کے پیمان شکنی کریں؟ کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا کہ معاہدوں کی پابندی کرو، اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرو اور قسمیں کھانے کے بعد انہیں مت توڑو، حالانکہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنا کفیل سمجھتے ہو۔ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے بخوبی آگاہ ہے''

ایفائے عہد کا انسانی معاشرے میں ایک معیار ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے چوتھی آیہ مبارکہ میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جو لوگ معاہدہ کی پابندی کریں اور تمہارے دشمنوں کی مدد نہ کریں، تم بھی ان سے معاہدہ کو قائم رکھو، البتہ وہ لوگ جو معاہدہ توڑ دیں اور اسلام کے دشمنوں کی مدد کریں، مسلمانوں پر چھپ کر وار کر رہے ہوں، ان کو کچل دو۔ اس آیہ مجیدہ اور بعد میں آنے والی دیگر آیات میں جن کی تفسیر ہم بعد میں بیان کریں گے، معاہدہ کرنے کی وجہ بیان کی گئی ہے، یعنی مشرکین کے خلاف سخت رویہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ انہوں نے پیمان شکنی کی، مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد کی اور اس طرح مغرب کے گماشتہ مستشرقین کے لیے کوئی صورت نہیں چھوڑی کہ وہ کوئی کہانی تراش سکیں۔

۸۔ عام طور پر جب بھی دو متحارب گروہوں میں معاہدہ طے پاتا ہے تو وہ معاہدہ ایک محدود اور خاص مدت کے لیے ہوتا ہے۔ اسی اصول کے تحت حضور اکرمؐ نے مشرکین سے جو معاہدہ فرمایا وہ محدود تھا۔ چنانچہ جن مشرکین نے معاہدہ کی پابندی کی وہ مسلمانوں کی امان میں رہے، جب کہ معاہدہ شکن مشرکین کو چار ماہ کی مہلت دی گئی تا کہ اس مدت میں وہ اپنے لیے کوئی فیصلہ کر لیں۔

اس سے قطع نظر وہ نبیؐ جو مشرک والحاد کی بیخ کنی کے لیے مبعوث ہوا ہو اس سے ہرگز یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مشرکین سے دائمی معاہدہ کر لے، تا کہ اگر مشرکین معاہدہ نہ توڑیں تو نبیؐ معاہدہ کی رو سے ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کر سکیں اور اس طرح بت پرستی کو دنیا میں دوام حاصل رہے۔ اس اصول سے نتیجہ یہ نکلا کہ حضور اکرمؐ نے اپنی زندگی میں کسی مشرک سے کسی طرح کا کوئی دائمی معاہدہ نہیں فرمایا بلکہ حضور اکرمؐ کے تمام معاہدے محدود و مشروط ہوتے تھے جن کی رو سے معاہدہ کرنے والے مشرکین دو جماعتوں میں تقسیم ہو جاتے تھے یعنی معاہدہ کے پابند رہنے والے اور معاہدہ شکن۔

اس بحث میں صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ مذکورہ آیات میں حضور اکرمؐ سے معاہدہ کرنے والے مشرکین کے بارے میں

تو مفصل بیان موجود ہے جبکہ ان مشرکین کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا گیا جنہوں نے حضورِ اکرمؐ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا تھا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو اس وقت کوئی مشرک باقی ہی نہ تھا جس نے حضورِ اکرمؐ سے معاہدہ نہ کیا ہو۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی مشرک تھا بھی تو اس کے لیے صرف چار ماہ کی مہلت تھی کہ اپنے لیے آخری فیصلہ کر لے۔

۹۔ اب ہم ان چند معاہدوں پر غور کرتے ہیں جو حضورِ اکرمؐ نے مشرکین سے فرمائے۔ اس طرح ہمیں ان معاہدوں کے اہداف کو جاننے کا موقع ملے گا۔ آج کی دنیا میں حکومتیں ایک دوسرے کے ساتھ فوجی، اقتصادی اور ثقافتی معاہدے طے کرتی ہیں۔ فوجی معاہدہ کا مقصد کچھ ایسی شرائط ہوتی ہیں جن میں دونوں ملک مل کر مشترکہ دشمن کا مقابلہ کریں اور اس طرح متحد ہو کر مشترک دشمن کا دفاع کر کے اسے ختم کریں۔

اقتصادی معاہدہ کا مقصد ملک کی تجارت میں توسیع ہوتا ہے تاکہ دونوں ممالک کی پیداوار ایک دوسرے کی منڈیوں میں جگہ پائے۔ اسی طرح ثقافتی معاہدہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معلومات، طلباء علوم اور تکنیکی معلومات کا آپس میں تبادلہ ہو سکے۔ مختصر یہ کہ اس طرح کے معاہدوں کا مقصد ملک کی فوجی، اقتصادی اور ثقافتی بنیادوں کو مضبوط بنانا ہوتا ہے لیکن حضورِ اکرمؐ کے مشرکین کے ساتھ معاہدوں کا ہدف نہ تو فوجی تھا، نہ اقتصادی اور نہ ہی فروغِ ثقافت تھا۔ ان معاہدوں سے آنحضرتؐ کے صرف دو مقاصد تھے:

(الف) مسلمانوں اور مشرکین ایک دوسرے کے ملکوں میں آزادانہ آمد و رفت رکھ سکیں۔ اس طرح مشرکین اسلام کے نظریات سے متاثر ہوں اور رفتہ رفتہ اسلام کی طرف مائل ہو کر آخر کار حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔

(ب) اس طرح حضورِ اکرمؐ کو فرصت مل جاتی کہ آپؐ اپنے انتظامی امور، داخلی استحکام اور آئندہ پیش آنے والے ہنگامی خطرات سے نپٹنے کی طرف توجہ دے سکیں۔ اس سے بھی بڑھ کر آپؐ کو امن و سکون کی فضا میں مسلمانوں کی تربیت کا اچھا موقع مل جاتا اور آپؐ تبلیغِ اسلام کے لیے تربیت شدہ افراد کو گرد و نواح میں قرآن و اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیج سکتے تھے۔

اسی لیے جب کبھی دشمن کی طرف سے صلح کی پیش کش ہوتی تو آپؐ مشکل ترین شرائط پر اسے منظور فرماتے کیونکہ اس صلح سے اسلام کی جنگ کی نسبت زیادہ فائدہ ہوتا تھا، اگرچہ کوتاہ نظر مسلمان مخالفت کرتے تھے۔ چنانچہ ''صلح حدیبیہ'' نے حضورِ اکرمؐ کے اہداف کو کسی حد تک واضح کر دیا تھا۔

۱۰۔ قرآن مجید میں بعض آیات ایسی ہیں جن میں حضورِ اکرمؐ سے عوام الناس کو معاف کر دینے اور ان کی غلطیوں سے صرف نظر کی سفارش کی گئی ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط (سورہ بقرہ: ۱۰۹)

''اللہ تعالیٰ کے فیصلے تک عفو و درگزر سے کام لیں''

بعض آیات میں حضرت رسولِ اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ کفار و مشرکین سے کہہ دیں کہ طرفین اپنے دین و ملت پر قائم رہیں اور دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ (کافرون: ٦)

''تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین''

بعض آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (سورہ بقرہ: ٢٥٦)

''دین اختیار کرنے میں کسی قسم کا جبر و اکراہ روا نہیں کیونکہ حق و باطل کی راہیں سب پر واضح ہو چکی ہیں''

ان آیات کی روشنی میں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر حضرت رسولِ اکرمؐ اور مسلمانوں کو عفو و درگزر کا حکم دیا گیا ہے، لوگ آزاد ہیں کہ جو دین چاہیں اختیار کر لیں اور اسلام قبول کرنے میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں، تو پھر موردِ بحث آیات میں یہ کیوں کہا گیا ہے:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ

(سورہ توبہ: ٥)

''محترم مہینے ختم ہوتے ہی مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو'' اور

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۝ (سورہ توبہ: ٢٦)

''مشرکین کے خلاف اُسی طرح بھرپور جنگ کرو جس طرح وہ سب مل کر تمہارے خلاف جنگ کرتے ہیں''

ہمارے اس سوال کا جواب بعض مفسرین نے یہ دیا ہے کہ سورۂ توبہ کی جنگ و قتال کی یہ آیات عفو و درگزر کرنے والی آیات کی ناسخ ہیں۔ مگر یہ جواب صحیح و اطمینان بخش نہیں کیونکہ اگر ہم مان بھی لیں کہ قرآن میں منسوخ اور ناسخ دونوں طرح کی آیات ہیں تب بھی سورہ توبہ کی پہلی آیات پہلی آیات کی ناسخ نہیں قرار پاتیں کیونکہ:

(الف) زیرِ بحث آیات کے مضامین کوئی شرعی احکام نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آئے تو اس پر عمل ہو، بلکہ یہ تو ایک طاقت ور دشمن کا مقابلہ کرنے کا منصوبہ ہے جو وحی کے بغیر بھی انسانی عقل و خرد کی روشنی میں بنایا جا سکتا ہے۔ اگر وحی الٰہی نہ بھی آتی تو صبر و بردباری کے طور پر دشمن ہے'' تم اپنے دین پر رہو اور ہمیں ہمارے دین پر رہنے دو'' کا طریق کار اختیار کیا جا سکتا تھا کیونکہ جب کوئی باہدف آدمی، اس کا ہدف خواہ کتنا ہی مقدس ہو اپنے ہدف کے خلاف کسی طاقت ور دشمن کو دیکھتا ہے جو اُس کے ہدف کی توسیع میں رکاوٹ بن رہا ہے، تو وہ صبر و گذر کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ یقیناً عفو و درگزر کا طریقِ کار صاحب ہدف کے ضعف و ناتوانی کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ جب طاقت و تسلط حاصل ہو جائے تو پھر اپنے ہدف میں درگزر کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور عقل صاحبِ ہدف کو دفاع کی اجازت نہیں دیتی۔

اس بنا پر سورۂ برات کی آیات کو عفو و درگزر کی آیات کا ناسخ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان آیات کا حکم کوئی امر شرعی نہیں بلکہ ایک دفاعی منصوبہ ہے جس کے لیے اگر حکم شرع موجود نہ بھی ہو تو عقل و خرد کی بنیاد پر ایسا کیا جا سکتا تھا۔ آیاتِ منسوخ صرف ان کو کہا جاتا ہے جن کے نسخ کے

لیے اللہ تعالیٰ کا واضح حکم آ جائے۔

(ب) کسی حکم کو منسوخ کرنے کی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ حکم ظاہراً دائمی واستمراری ہو اگرچہ باطناً وقتی اور عارضی ہو۔ مگر عفو و درگزر والی آیات دائمی حکم نہیں رکھتیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں:

ا۔ عفو و درگزر کا طریقِ کار یا ''لکم دینکم ولی دین'' والا قانون کمزوری وناتوانی کے ایام سے مخصوص ہوتا ہے جب کہ طاقت وتسلط کے دور میں ایک مقدس ہدف رکھنے والے مصلح کے لیے مصلحت کے مطابق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسا حکم کرنے والی آیات طاقت کے دور سے متعلق ہی نہیں جس دور کو سورۂ برأت کی آیات ظاہر کر رہی ہیں۔ لہٰذا ہم ایک سلسلۂ آیات کو دوسری کا ناسخ تسلیم نہیں کر سکتے۔

۲۔ عفو و درگزر والی آیات روزِ اوّل ہی سے دوسری آیات کے احکام کی آمد تک محدود ہیں، یعنی............حتیٰ یاتی اللہ بامرہٖ'' (جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہ آئے) پس جب کوئی حکم روزِ اوّل ہی سے دوسرے حکم کے آنے تک محدود ہو تو مؤخر الذکر کے آنے تک وہ منسوخ نہیں کہا جائے گا۔ مثلاً ایک طبیب کسی مریض کو ایک شربت پینے کے لیے دیتا ہے اور ہدایت دیتا ہے کہ جب شربت ختم ہو جائے تو دوسری دوائی استعمال کرنا۔ اس صورت میں دوسری دوائی کو شربت کا ناسخ نہیں کہیں گے بلکہ دوسری ہدایت کو ناسخ اس وقت کہیں گے جب ابھی پہلا شربت باقی ہو اور طبیب اس کو چھوڑ کر دوسری دوائی کھانے کا مشورہ دے۔

(ج) غالباً لا اکراہ فی الدین یعنی ''دین کے معاملے میں کوئی جبر واکراہ روا نہیں ہے'' کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مشرکین کو اپنے شرک پر رہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔ بلکہ آیہ مجیدہ کے اگلے جملے ''قد تبین الرشد من الغی'' یعنی ''حق اور باطل کی دو جدا راہیں'' سے مطلب واضح ہو چکا ہے۔ یعنی اسلام کو آنکھیں بند کر کے اندھی تقلید کے طور پر تسلیم نہیں کرنا ہے کیونکہ آزاد ماحول کے اثرات نے ضلالت وگمراہی کو ہدایت ورستگاری سے الگ کر دیا ہے اور اب کسی قسم کی اندھی تقلید وپیروی کی ضرورت باقی نہیں ہے۔

۲۔ فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھرٍ

یہ وہ جملہ ہے جس کے ذریعہ مشرکین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ چار مہینوں کی مدت کے اندر اندر اسلامی حکومت کے سامنے اپنا موقف واضح کریں۔ یہ چار مہینے دس ذوالحجہ سے لے کر نو ربیع الثانی تک بنتے ہیں۔ ان تاریخوں کا تعین ہم نے اس طرح کیا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے دس ذوالحجہ کو یہ قرارداد پڑھ کر مشرکین کو سنائی۔ چنانچہ جس تاریخ سے اُن کے علم میں بات آئی اس تاریخ سے ان کی مہلت کی تاریخ شروع ہونی چاہیے کیونکہ زبردستوں کے ساتھ اسلامی مہر وترحم کا یہی تقاضا ہے۔ لہٰذا ربیع الثانی کے مہینے سے پہلے مشرکین کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر ایک اور الجھن پیدا ہوگئی کہ پانچویں آیہ مجیدہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جونہی محترم مہینے اختتام کو پہنچیں مشرکین سے سخت رویہ اختیار کر لیا جائے:

فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین

''جونہی محترم مہینے ختم ہوں مشرکین کو قتل کرو''

اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکین چار ماہ کے عرصہ میں اپنی وضع و کیفیت کو حکومتِ اسلامی پر واضح کریں۔ یہ مہینے دس ذوالحجہ سے شروع ہوتے اور دس ربیع الثانی پر ختم ہوتے ہیں۔ امیر المومنینؑ نے ''منیٰ'' میں ان آیات کا اعلان فرمایا اور چونکہ یہ عرصۂ چار ماہ مہربانی کا زمانہ تھا اس لیے ظاہر ہے کہ ان چار ماہ کی ابتدا اس وقت سے ہوگی جب پابندی ان کے گوش گزار کی گئی۔ لہٰذا مشرکین پر سخت گیری کا زمانہ دس ذوالحجہ سے ہی شروع ہوتا ہے، حالانکہ پانچویں آیت میں اس سختی کا آغاز ماہ ہائے حرام سے ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: **فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین** (جب حرام مہینے ختم ہو جائیں تو مشرکین کو قتل کرو) سب جانتے ہیں کہ حرام مہینے یہ ہیں: رجب، ذیقعد، ذوالحجہ، محرم۔ چنانچہ آیہ مجیدہ کے ظاہری مفہوم کے مطابق ماہِ محرم کے ختم ہوتے ہی مشرکین پر سختی شروع کر دینا چاہیے۔ دونوں آیات میں مزید غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اختلاف کو رفع کرنے کے لیے درجہ ذیل تین وجوہات کا امکان ہو سکتا ہے:

(الف) ان چار مہینوں میں جن کی مشرکین کو مہلت دی گئی ہے کچھ تو محترم ہیں اور کچھ نہیں۔ یعنی ذوالحجہ اور محرم تو محترم مہینے ہیں جب کہ صفر اور ربیع محترم نہیں ہیں۔ تاہم ذوالحجہ، محرم، صفر اور ربیع الثانی کو ماہ ہائے حرام سمجھا جائے گا اور ان سب کو ہی ماہِ حرام کہا جائے تو یہ تغلیب کی خاطر ہوگا۔

(ب) کیا اس آیہ مجیدہ میں ''اشھر الحرم'' سے مراد وہی اصطلاح چار مہینے نہیں ہیں بلکہ ان سے مراد دس ذوالحجہ سے دس ربیع الثانی تک کا عرصہ ہے؟ البتہ یہ سوال کہ ان کو محترم کیوں کہا گیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان مہینوں کے دوران بطور مہربانی مشرکین کے خلاف لڑائی کو ممنوع قرار دے دیا۔

(ج) ان چار ماہ سے مراد وہی اصطلاحی چار مہینے ہی ہیں جن کا اختتام محرم میں ہو جاتا ہے۔ ان کا آغاز اس دن سے ہوتا ہے جب رسولِ اکرمؐ پر وحی نازل ہوئی اور یہ مدت محرم کے اختتام پر تمام ہوگئی کیونکہ مشرکین کو اس مدت کے دوران ان احکام سے مطلع کر دیا گیا تھا۔

۱۲۔ سورۂ توبہ کی پانچویں آیہ مجیدہ میں جزیرہ نمائے عرب سے شرک والحاد کے بیخ کنی کے لیے پانچ احکامات جاری کیے گئے ہیں جن میں ہر علم کے لیے خاص شرائط ہیں:

۱۔ فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم یعنی ''جہاں کہیں مشرک کو پاؤ، اسے قتل کر ڈالو''

۲۔ ''**وخذوھم**'' یعنی ان کو قید کر لو اور غلام بنا لو''

۳۔ **واحصروھم** یعنی ان کا محاصرہ کر لو اور ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ منقطع کر دو''

۴۔ ''**واقعدوا لھم کل مرصدٍ** یعنی راستوں میں ان کی گھات میں بیٹھ جاؤ اور ان کے راستے روک لو''۔

مذکورہ بالا چار احکامات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک والحاد کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ یہ چاروں احکامات ان پر اس وقت تک عائد رہیں گے جب تک کہ وہ شرک والحاد پر قائم رہتے ہیں۔ اگر وہ ایمان لے آئیں اور اپنے ایمان کو نماز و زکوٰۃ ادا کرنے سے ظاہر کریں تو پھر ان کو آزاد کر دو اور یہ پانچواں حکم ہے:

۵۔ فانِ تابوا و اقاموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلھم ان اللہ غفور رحیم''

یعنی جب مشرکین توبہ کر کے ایمان لے آئیں، اپنی بداعمالیوں پر شرمندہ ہوں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں، تو ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور پھر یہ قانون کہ ''الاسلام یجب ما قبلہ'' یعنی اسلام انسان کو اس کے سابقہ اعمال سے منقطع کر دیتا ہے'' یعنی وہ شرک سے کٹ جائیں گے اور وہ اسلامی معاشرے کے افراد بن جائیں گے۔

دعوتِ اسلام کا طریقہ

ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورہ توبہ: ٦)

''اگر کوئی مشرک امان چاہے تو اسے امان دے دو تا کہ وہ کلامِ خدا کو سنے۔ پھر اس کو اس کی اپنی جگہ اور جائے امن پر پہنچا دو یہ (کلام خدا سننے کی اجازت) اس لیے ہے کہ یہ نادان لوگ ہیں (شائد کلام اللہ سن کر وہ متوجہ ہو جائیں)''

اپنے نظریہ کی حمایت تقاضائے فطرت ہے

فطری طور پر ہر شخص اپنے عقیدہ کی حفاظت کرتا ہے اور اس کی نشر و اشاعت اور حفاظت کے لیے قربانی پیش کرتا ہے کیونکہ افکارِ انسانی اس کی روح اور قوتِ فکر کی پیداوار ہوتے ہیں، جس طرح اس کی اولاد اس کے قوائے جسمانی سے ہوتے ہیں جن کی بقا کے لیے قربانی دینا اس کے لیے ایک فطری امور ہوتا ہے۔

دوسری طرف انسان کو اپنے عقیدہ سے اتنی ہی محبت اور لگاؤ ہوتا ہے جتنی محنت اس نے اس کو اپنانے میں کی ہوتی ہے۔

تجربات سے یہ بات ثابت ہے کہ عقیدہ کے تحفظ کے دفاع کے لیے انسان کا معیارِ قربانی اس کے مادی مفادات کے لیے جذبۂ قربانی سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ اگرچہ مال و دولت اور اقتدار سے لگاؤ انسان میں ایک طرح کی قوتِ مدافعت و استقامت پیدا کر دیتا ہے تاہم یہ قوت ہرگز اس توانائی کے برابر نہیں ہو سکتی جو انسان کے معنوی عقائد یعنی آزادی وغیرہ کے تحفظ کی خاطر پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں انسان کے مادی و معنوی مفادات کا جذبۂ تحفظ اسے جنگ و جدل پر آمادہ کر دیتا ہے جس کے لیے وہ بسا اوقات جانبازی اور قربانیاں پیش کرتا ہے لیکن معنوی مفادات مثلاً عقائد کا تحفظ انسان میں مادی تحرکات کی نسبت زیادہ جذبۂ قربانی پیدا کرتا ہے۔ بالخصوص جب انسان کا عقیدہ وحی الٰہی کا مرہونِ منت ہو تو تاریخ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ پھر اپنے عقائد کے تحفظ کے لیے اس کی استقامت و فدا کاری بہت شدید اور سخت تر نوعیت کی ہوگی۔

انبیاؑ کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جذبۂ جہاد ایک معنوی جذبہ ہے اور اس کا ہدف انسانی معاشرے کو شرک والحاد اور مذموم اخلاق سے پاک کرنا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی مشرک مسلمانوں کے سربراہ سے گزارش کرے کہ اسے نبوت بعثت اور اہدافِ اسلام سمجھنے کے لیے مہلت دی جائے تا کہ وہ قریب آ کر غور سے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو سن سکے اور غور کر سکے تو اسلامی سربراہ کا فرض ہے کہ اس کی درخواست فوراً منظور کر لی جائے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ کلامِ خدا کو سن کر منقلب ہو جائے اور اسلامی معاشرے کا ایک مفید رکن بن جائے۔ حضور اکرمؐ نہ صرف اس کی درخواست قبول فرمائیں بلکہ اس کو جان کی امان بھی دیں۔ پھر اگر وہ راہِ راست پر نہ آئے تو اس کی سابقہ حیثیت پر اسے لوٹا دیا جائے۔ البتہ اس کے ساتھ معاہدہ کے مطابق عمل کیا جائے تا کہ دیگر مشرکوں کے لیے بھی راستہ کھلا رہے۔ یہ اقدام بجائے خود اسلام کی شجاعت، آزادی اور حقیقت پر مبنی دلالت کرتا ہے کہ اگر دشمن بھی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لیے تعاون چاہے تو اس کی ہدایت کے تمام تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

یہ صحیح ہے کہ پانچویں آیہ مجیدہ میں مشرکین کے قتل اور محاصرہ کا حکم دیا گیا ہے مگر زیرِ بحث آیہ مجیدہ حقیقت کے متلاشی مشرکین کو مستثنٰی قرار دے رہی ہے اور ان سب کو امان دینے کی سفارش کر رہی ہے۔

آیہ مجیدہ کے مختلف نکات

۱۔ ''استجارک'' اور ''فاجرہ'' کے الفاظ مادۂ ''جار'' سے ہیں جس کے معنی ہمسایہ بنانا ہیں اور اس سے پناہ دینا مراد ہے کیونکہ عرب کا دستور تھا کہ اپنے ہمسایہ کی حمایت کرتے تھے اور اکثر کسی حمایتی کو لفظ ''جار'' سے پکارا کرتے تھے۔ خود قرآن مجید میں بھی لفظ ''جار'' حامی اور ناصر کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذۡ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيۡطٰنُ اَعۡمَالَهُمۡ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَـكُمُ الۡيَوۡمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىۡ جَارٌ لَّـكُمۡ ۚ (سورہ انفال:۴۸)

''جب شیطان نے ان کی بداعمالیوں کو ان کی نظروں میں اچھا بنا کر دکھایا اور ان سے کہا، آج کون ہے جو تم پر غلبہ پا سکے (کیونکہ) میں تمہارا حامی و ناصر ہوں''

۲۔ ''حتیٰ یسمع کلام اللہ یعنی تا کہ کلام اللہ سنتا رہے''

اس جملے میں دو احتمال ہیں:

(الف) احتمال یہ ہے کہ جملۂ ''استجارک'' ''اگر کوئی مشرک امان چاہے'' کے معنی میں ہے۔ یعنی اگر کوئی مشرک کلامِ خدا سننے کے لیے امان چاہ رہا ہے تو اسے امان دی جائے۔ اس صورت میں اسے امان صرف اس صورت میں ملے گی کہ کلامِ خدا سنے۔ لیکن اگر وہ کسی اور مقصد کے لیے یعنی شرائط صلح طے کرنے یا دیگر مادی و دنیوی مشکلات کو حل کرنے کے لیے امان چاہے تو ایسے معاملات میں ضروری نہیں کہ اس کی امان کی درخواست قبول کی جائے۔ امان کی درخواست قبول کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ حقیقت آشنائی چاہتا ہو۔ اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے

پانچویں آیہ مجیدہ میں بیان کردہ تمام قوانین اس پر عائد ہوں گے۔ اگر ہم یہ احتمال بھی تسلیم کرلیں کہ اگر مشرکین کو کسی دنیوی مسئلے میں تعاون کی خاطر مسلمانوں کے علاقے میں عارضی اقامت کی اجازت دے دی جائے کہ شاید وہ مسلمانوں کے رویہ سے متاثر ہو کر ایمان لے آئیں، پھر بھی ان کی امان کی درخواست قبول کرنا ضروری نہیں۔

(ب) یہ جملہ ''فاجرہ'' یعنی ''اسے امان دے دیجیے'' سے متعلق ہے یعنی اگر مشرک کسی بھی مقصد کے لیے چاہے اسے امان دے دی جائے۔ اس غیر مشروط امان دینے کا مقصد یہ ہے کہ اسی امان کے نتیجہ میں وہ قرآن مجید بھی سنے گا کہ شاید وہ ہدایت پا جائے۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ حضورِ اکرمؐ کا مقصدِ بعثت گمراہوں کی ہدایت ہے، جب کبھی کوئی مشرک کسی بھی وجہ سے امان چاہے، اسے امان دے دینی چاہیے کیونکہ یہ امان بہرصورت اس کو ہدایت پا جانے کا ایک موقع ضرور فراہم کرتی ہے۔ اس لحاظ سے دوسرا مفہوم حضورِ اکرمؐ کے مقاصدِ بعثت سے زیادہ قریب ہے۔

۳۔ کلام اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام سے مراد قرآن مجید کی آیات ہیں۔ ہر انصاف پسند انسان قرآن مجید کی سراپا معجزہ آیات سن کر حضورِ اکرمؐ کی نبوت کی تصدیق کرتا ہے اور ساتھ ہی توحید سے متعلق آیات سن کر شرک و بت پرستی کے بطلان سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص سورہ عنکبوت کی دل کش آیہ ۴۱ کو سنتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوتا ہے تو پھر اپنے بت پرست رجحانات پر پشیمان ہو کر توحید کے مضبوط قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۱

(سورہ عنکبوت: ۴۱)

''جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا سہارا بنا لیتے ہیں ان کی مثال اس مکڑی کی سی ہے جو جالے کا گھر بنا کر اپنے آپ کو آندھیوں سے محفوظ سمجھ بیٹھی ہے، حالانکہ مکڑی کا گھر کمزور ترین گھر ہوتا ہے، کاش یہ لوگ سمجھ سکتے''

۴۔ ''ابلغه مامنه'' یعنی اسے اس کی جگہ پر پہنچا دیں''

اس جملے کا تعلق بھی ''فاجرہ یعنی اس کو امان دے دیں'' سے ہے۔ دراصل یہ ایک تاکیدی حکم ہے، یعنی جب تک وہ امان میں ہے اس کے مال و جان محفوظ ہیں۔ اب اگر امان چاہنے والا شخص مسلمان ہو جاتا ہے تو وہ مسلمانوں میں رہ سکتا ہے بصورتِ دیگر اس کو بحفاظت اپنی سابقہ جگہ پر پہنچانا بھی امان کا حصہ ہے اگرچہ اپنی جگہ پر پہنچائے جانے کے بعد پھر وہ مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں آ جائے۔

امان سے دست کش ہونے کی وجوہات

۷۔ ارشاد ہوتا ہے:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (سورہ توبہ: ۷)

''مشرکین کا اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبرؐ کے ساتھ معاہدہ کیسے ہوسکتا ہے؟ البتہ مسجدِ حرام کے قریب جن سے (اے پیغمبرؐ) آپؐ نے معاہدہ کرلیا ہے، جب تک وہ معاہدہ کی پابندی کریں، آپؐ بھی پابندی کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ پرہیزگار لوگوں کو پسند فرماتا ہے''

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (سورہ توبہ: ۸)

''(یہ مشرکین تمہارے ساتھ) کیسے معاہدہ کرسکتے ہیں؟ اگر یہ تم پر غلبہ پالیں تو نہ قرابت داری کا کوئی لحاظ رکھیں گے اور نہ ہی معاہدہ کا کوئی لحاظ۔ یہ تو صرف زبانی طور پر تمہیں خوش کرنے کی کوشش کررہے ہیں، حالانکہ ان کے دل تمہارے خلاف ہیں، ان میں اکثر بدکار ہیں''

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا

(سورہ توبہ: ۹)

''(مشرکین نے) اللہ تعالیٰ کی آیات کو بہت سستے داموں بیچ ڈالا اور خود بھی راہِ راست سے منحرف ہوگئے۔ بے شک انہوں نے بہت بُرا کردار ادا کیا''

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝

(سورہ توبہ: ۱۰)

''(مشرکین نے) کسی مومن کی قرابت داری یا معاہدہ کے لحاظ سے کوئی رعایت نہیں کی اور یہ تجاوز کرنے والے ہیں''

فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ‌ؕ وَنُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۞ (سورہ توبہ: ۱۱)

''اگر (مشرکین) توبہ کریں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں، تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، باخبر لوگوں کے لیے ہم ان آیات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں''

وَاِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَطَعَنُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّةَ الۡـكُفۡرِ‌ ۙ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَنۡتَهُوۡنَ ۞ (سورہ توبہ: ۱۲)

''اگر (مشرکین) معاہدہ کر لینے کے بعد عہد کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنائیں تو تم بھی کفر کے سرغنوں سے جنگ کرو کیونکہ اب ان کے ساتھ کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا، شاید اس طرح وہ اپنے کردار سے باز آ جائیں''

چھٹی صدی ہجری میں حضورِ اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نے بیت اللہ کی زیارت کا ارادہ فرمایا۔ چونکہ یہ ایام محترم مہینوں کے تھے اس لیے توقع تھی کہ قریش ان کے مکہ میں وارد ہونے میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے، کیونکہ محترم مہینوں میں عرب جنگ کو تاکید کے ساتھ ممنوع جانتے تھے اور سب کو یہ پورا حق تسلیم کیا جاتا تھا کہ ان مہینوں میں آزادانہ طور پر مکہ جائیں، زیارت کریں یا تجارت کریں۔

حضورِ اکرمؐ مہاجرین وانصار کی ایک جماعت کو لے کر ماہِ ذیقعد کے شروع میں مدینہ منورہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپؐ کے ساتھ قربانی کے اونٹ بھی تھے اور سب لوگ احرام باندھے ہوئے بھی تھے۔ سوائے تلوار کے جو عربوں کا معمول تھا اور کوئی اسلحہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس طرح سفر کرنے سے آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ قریش مطمئن رہیں کہ آنحضرتؐ لڑائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

اس کے باوجود قریش نے تہیہ کر لیا کہ مکہ میں مسلمانوں کے داخلہ کی مزاحمت کریں۔ لہٰذا قریش کے سوار مکہ سے باہر نکل کر ''ذی طویٰ'' کے مقام پر کمر بستہ ہو گئے کہ مسلمانوں کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ حضورِ اکرمؐ اس وقت مکہ سے دس منزل کے فاصلہ پر 'عسفان' نامی ایک گاؤں میں آرام کی خاطر پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ نے عسفان سے قریش کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ بنی کعب کے ایک شخص نے بتایا کہ آنحضرتؐ کی آمد سے قریش سخت غصے میں ہیں اور ہر قیمت پر آپؐ کا مکہ میں داخلہ روکنے کے لیے کوشش کریں گے۔ نیز ''ذی طویٰ'' کے مقام پر خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل کی سرکردگی میں ان کے سوار آپؐ کے مقابلہ کے لیے موجود ہیں۔

ان حالات میں حضورِ اکرمؐ نے ہر قیمت پر صلح وسلامتی سے کام لینے کا ارادہ فرمایا۔ پس ایک رہبر کو ساتھ لے کر دشوار گزار دروں سے گزرتے ہوئے مکہ کے نزدیک ''حدیبیہ'' کے مقام پر خیمہ زن ہو گئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر آپؐ کا ناقہ بیٹھ گیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اس اونٹ کو اللہ تعالیٰ نے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا ہے اگر قریش صلح کا ہاتھ بڑھائیں گے تو میں اس کو ضرور قبول کر لوں گا''۔

صلح حدیبیہ کی شرائط کا متن

قریش کے نمائندوں نے حضورِ اکرمؐ سے رابطہ کیا۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ حضورؐ جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ مگر انہوں نے مسلمانوں کے مکہ میں داخل ہونے کو قبول نہ کیا۔ آخر کار قریش نے سہیل بن عمرو نامی ایک شخص کو بھیجا کہ آنحضرتؐ سے ملے اور درخواست کرے کہ اس سال آپؐ جدھر سے آئے ہیں اُدھر ہی واپس چلے جائیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ قبائل عرب یہ کہیں کہ آنحضرتؐ طاقت کے زور پر مکہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ سہیل نے قریش کے کہنے کے مطابق صلح کی قرارداد طے کی اور اس کے علاوہ ایک یہ شرط بھی مسلمانوں پر عائد کی کہ اگر کوئی مسلمان بھاگ کر قریش سے آ ملے تو وہ واپس نہیں کریں گے۔ البتہ اگر کوئی قریش مسلمانوں سے جا ملے تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہو گا۔ علاوہ ازیں حجاز کے تمام قبائل آزاد ہیں کہ وہ مسلمانوں یا قریشیوں، جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کر لیں۔ ابھی یہ صلح نامہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ 'بنی خزاعہ' نے حضورِ اکرمؐ کے ساتھ اور 'بنی بکر' نے مشرکین قریش سے معاہدہ کر لیا۔

حضورؐ کی طرف سے معاہدہ کی پابندی

صلح حدیبیہ کی شرائط آنحضرتؐ کے ساتھ طے پا چکی تھیں مگر ابھی معاہدہ معرض تحریر میں نہیں آیا تھا کہ سہیل کا بیٹا، ابو جندلؓ جو مسلمان ہو چکا تھا اور مشرکوں سے زبردستی اُسے مکہ میں روک رکھا تھا، یہ معلوم کر کے کہ مسلمان حدیبیہ کے مقام پر خیمہ زن ہیں، اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے کسی طرح مکہ سے نکل کر 'حدیبیہ' پہنچ گیا۔ اتفاقاً وہ عین اس وقت پہنچا جب صلح نامہ حدیبیہ پر دستخط ہونے والے تھے۔ جب سہیل کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی کہ وہ مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے آیا ہے تو اس کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو منہ پر طمانچہ مارا اور اسے کرتہ سے کھینچا کہ قریش کی طرف لے جائے۔ 'ابو جندل' نے شور مچایا کہ مسلمانو! مجھے مشرکین میں چھوڑے جاتے ہو! مگر حضورؐ نے فرمایا: ''ابو جندل! صبر کر اب ہم قریش سے معاہدہ کر چکے ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور دیگر کمزور مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعہ نجات پیدا فرما دے گا''

صلح حدیبیہ کی شرائط بعض اصحابِ پیغمبرؐ کی ناراضی کا باعث ہوئیں۔ یہ سادہ لوح یہ سوچنے لگے کہ ایسا کیوں ہے کہ مسلمان تو قریش کے پناہ چاہنے والوں کو قریش کو واپس کر دیں جب کہ قریش مسلمان ہونے والے لوگوں کو واپس نہ کریں؟ مگر مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مانتا تھا کہ حضورِ اکرمؐ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ ہیں، لہٰذا اسرارِ الٰہی اور رموزِ پروردگار سے آگاہ ہیں دل و جان سے شرائط حدیبیہ کا معتقد ہو گیا۔ وہ طبقہ ان حقائق سے بھی آگاہ تھا کہ اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تو وہ اس قابل نہیں رہتا کہ دوبارہ اسلامی معاشرے کا رکن بن سکے، جب کہ سچے دل سے مسلمان ہونے والا، اگرچہ مشرکین کے نرغے میں ہو، اس کا دل نورِ ایمان سے ہمیشہ منور و تاباں رہتا ہے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ اس کی فلاح کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیتا ہے۔ یہ بھی پیغمبر اکرمؐ کے آزادانہ اصول کا ایک عظیم نمونہ تھا۔

ایفائے عہد کی ایک اور مثال

'اذھر بن عوف' کا ایک زرخرید غلام، جس کا نام ابوبصیر تھا، ایمان لے آیا وراپنے آقا کی اجازت کے بغیر بھاگ کر مدینہ آ گیا۔ اذھر بن عوف نے حضورِ اکرمؐ کو ایک شخص کے ذریعہ خط بھیجا، جس کے ساتھ ایک غلام بھی تھا کہ معاہدہ حدیبیہ کے حوالہ سے آنحضرتؐ ابوبصیرؓ کو واپس کر دیں۔ آنحضرتؐ کو جب خط کے مضمون کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا: ابوبصیر! ہم قریش کے ساتھ معاہدہ کر چکے ہیں جس کا تجھے بھی علم ہے۔ ہم معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے''۔ ابوبصیرؓ نے عرض کیا: ''کیا آپؐ مجھے مشرکین کے حوالے کر رہے ہیں کہ وہ مجھے میرے دین سے منحرف کر دیں؟''

آنحضرتؐ نے فرمایا: ''صبر سے کام لو۔ انشاءاللہ عنقریب تمہارے لیے اور دیگر تمام مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ اللہ تعالیٰ پیدا فرمادے گا''

قریش کے بزدلانہ اقدام

مسلمانوں کے ہم پیمان 'بنی خزاعہ' اور قریش کے ہم پیمان 'بنی بکر' میں دیرینہ دشمنی تھی۔ معاہدہ حدیبیہ کے بعد ان کی باہمی عداوت میں قدرے کمی آ گئی تھی۔ مگر موتہ کے مقام پر مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان جنگ کے بعد قریش نے یہ سوچا کہ مسلمانوں کی طاقت کم ہوگئی ہے۔ بنی بکر نے بھی اپنے مقام پر سوچا کہ اب بنی خزاعہ سے انتقام لینے کا اچھا موقع ہے۔ چنانچہ قریش کی ایک جماعت نے جن میں عکرمہ بن ابوجہل بھی شامل تھا، بنوبکر کی مدد کی اور انہیں اسلحہ فراہم کیا۔ نتیجہ کے طور پر بنوبکر نے شب خون مار کر قبیلہ خزاعہ کے لوگوں کو قتل کیا۔ بنی خزاعہ کی طرف سے عمر بن سالم فریاد لے کر حضورؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ حضورِ اکرمؐ نے ارادہ فرمایا کہ قریش کی معاہدہ شکنی کی مکہ فتح کر کے تلافی کی جائے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے ایسا ہی کیا:

اب تک کے بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید نے جن لوگوں سے معاہدہ کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے ان سے مراد قریش نہیں ہیں کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ ۸ ہجری میں قریش نے فتح مکہ سے پہلے ہی معاہدہ شکنی کی اور آنحضرتؐ نے ان کے نقضِ عہد کے جواب میں مکہ فتح فرمایا۔ سورۂ برات ۹ ہجری میں نازل ہوتی ہے اس سے حتمال ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ وہ ہوں جنہوں نے سورۂ برأت کے نزول تک معاہدہ کی پابندی کی تھی۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد 'بنی بکر' کی ایک شاخ ہے جس نے معاہدہ نہیں توڑا تھا۔ البتہ ''بنی بکر کی دوسری شاخ ''بنی الدئل' نے قریش کے ساتھ مل کر معاہدہ کی خلاف ورزی کی تھی۔

ان دو آیات اور بعد میں آنے والی آیات کے ذیل میں ہماری تحقیق معاہدہ کی پابندی کرنے والے لوگوں کے ساتھ حضورِ اکرمؐ کے دلیرانہ اور سچے رویہ کی خبر دیتی ہے اور مشرکین کے خلاف قتلِ عام کے حکم کا راز افشاء کرتی ہے۔

معاہدہ کی پابندی کرنے والے لوگ

سورۂ برأت کے ساتویں آیہ مجیدہ میں ان لوگوں کو مشرکین کے خلاف عام اور اعلانِ جنگ سے مستثنیٰ کر رہی ہے جنہوں نے حضورؐ کے ساتھ مسجدِ حرام کے قرب وجوار میں معاہدہ کیا تھا اور پھر معاہدہ کی پابندی بھی کی تھی۔ارشاد ہوتا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ○ (سورہ توبہ: ۷)

''ان لوگوں سے جنہوں نے آپؐ کے ساتھ مسجدِ حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا، جب تک وہ معاہدہ کی پابندی کریں، آپ بھی معاہدہ کے پابند رہیں''

آیہ مجیدہ کے مفہوم کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے مسجدِ حرام کے قریب حضورِ اکرمؐ کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور آیاتِ برأت کے نزول تک معاہدہ کے پابند بھی رہے تھے۔یقیناً یہ لوگ نہ تو قریش تھے اور نہ ہی 'بنی بکر' کیونکہ یہ لوگ تو معاہدہ توڑ چکے تھے۔مزید برآں قرآن مجید واضح الفاظ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ہر قسم کے معاہدہ کی نفی فرما رہا ہے۔چنانچہ اسی آیہ مجیدہ کے اگلے حصے میں ارشاد ہوتا ہے:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ (سورہ توبہ: ۷)

''اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبرؐ کے ساتھ مشرکین کا معاہدہ کیونکر ہو سکتا ہے؟''

ہم جانتے ہیں کہ دونوں جماعتوں کے درمیان معاہدہ و پیمان موجود تھا، مگر قرآن مجید ایسے کسی معاہدے کا قطعی انکار کر رہا ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ حقیقی معاہدہ وہ ہوتا ہے جس پر طرفین عملاً تحقق پذیر ہوں، مگر جب ایک فریق تو صرف الفاظ و تحریر تک محدود رہے اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہے کہ ہاتھ آتے ہی معاہدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے انحراف کر لے اور اسے پامال کر دے تو یہ معاہدہ نہیں بلکہ دھوکا ہوگا اسی حقیقت کے بارے اللہ تعالیٰ نے اس طرح استدلال فرمایا ہے:

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ (سورہ توبہ: ۸)

''(ان لوگوں سے کیسے معاہدہ کیا جا سکتا ہے؟) جب کہ اگر وہ تم پر غلبہ پالیں تو نہ قربت داری کا کوئی لحاظ کریں اور نہ معاہدہ کا۔وہ صرف زبان سے تمہیں خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کے دل ان کی باتوں کی تصدیق نہیں کرتے''

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ⑩

(سورہ توبہ: ۱۰)

''(مشرکین) کسی مومن کے بارے میں بھی کسی قرابت داری یا معاہدہ کی رعایت نہیں کرتے اور یہ زیادتی کرنے والے لوگ ہیں''

سورہ برأت کی آٹھویں اور دسویں دونوں آیتوں میں مشرکین کے بارے میں ''اکثر ھم فاسقون'' اور ''و اولئِكَ ھم المعتدون'' جیسے جملے استعمال کیے گئے ہیں۔ ''فسق'' کے لغوی معنی خروج اور باہر نکلنا ہے۔ جب نئی کھجور اپنے غلام سے باہر آتی ہے تو کہتے ہیں ''فسقت التمرۃ'' یعنی کھجور اپنے غلاف سے باہر نکل آئی۔ دینِ اسلام کی اصطلاح میں جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے خارج ہو جائے اس کو فاسق کہتے ہیں۔ اس آیہ مجیدہ میں 'فاسقون' کا لفظ اسی لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے قوانین سے انحراف کیا ہے۔

اسی لیے دوسری آیہ مجیدہ میں ان کو ''المعتدون'' یعنی 'جارح' کہا گیا ہے۔ تیسری بار قرآن مجید پھر اسی مطلب کی طرف لوٹتا ہے۔ مشرکین کی منافقت کی وجہ سے دونوں جماعتوں کے درمیان ہر قسم کے عہد و پیمان کو نظرانداز کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ (سورہ توبہ: ۱۲)

''کفر کے سرغنوں سے جنگ کرو کیونکہ ان کے ساتھ کوئی عہد و پیمان نہیں''

لغت عرب میں لفظ ''اِل'' کا مطلب قرابتداری اور بعض اوقات معاہدہ کے ہوتے ہیں۔ بقول شاعر

لعمرك ان الك من قريشٍ

كال السقب من رال النعام

''تیری جان کی قسم تیری قریش کے ساتھ قرابت داری اونٹ کے بچے کی شترمرغ کے انڈے کے ساتھ قرابت داری کی مانند ہے''۔

یعنی کوئی قرابت داری تمہارے اور ان کے درمیان ہے ہی نہیں۔ اس شعر میں لفظ ''اِلِ'' قرابت داری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک دوسرے شعر میں یہ پیمان کے معنی میں ہے

و جد نا هم كاذباً الهم

و ذوالال والعهد لا يكذب

''ان کے معاہدہ کو سوائے جھوٹ کے کچھ نہ پایا حالانکہ معاہدہ کرنے والے جھوٹ نہیں بولا کرتے''

زیرِ بحث آیات میں لفظ ''اِل لفظ ذمہ کے ساتھ بھی آیا ہے چونکہ لفظ ذمہ سے معاہدہ ہی مراد ہے۔ اس قرینہ سے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ ''اِل'' سے قرابت داری ہی مراد ہوگی۔

تیسری بات یہ ہے کہ سورۂ برأت کی آیہ ۹ مشرکین کے خلاف قتلِ عام کے راز کا ایک گوشہ افشا کرتی ہے اور مشرکین کو یہودیوں کے مشابہ قرار دیتی ہے جو خدائی آیات کو سستے داموں بیچ دیا کرتے تھے۔ درج ذیل آیہ مبارکہ میں قرآن مجید تمام یہودیوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ (سورہ بقرہ: ۴۱)

''اللہ تعالیٰ کی آیات کو سستے داموں مت بیچو اور میری مخالفت سے پرہیز کرو''

ایک اور آیت میں ان کا اس طرح تعارف ہوتا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ (سورہ بقرہ: ۸۶)

''یہ لوگ (یہودی) وہ ہیں جنہوں نے آخرت کی زندگی کو دنیا کے عوض بیچ ڈالا یعنی دنیا کو ترجیح دی ہے''

اسلامی معاشرے کی عکاسی قرآن مجید اس طرح فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورہ توبہ: ۱۱۱)

''اللہ تعالیٰ نے مومنین کی جانیں اور اموال بہشت کے عوض خرید لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں''

سورہ برأت آیہ ۹ میں قرآن مجید نے مشرکین کی تعریف بھی یہودیوں کی طرح فرمائی ہے:

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ (سورہ توبہ: ۹)

''(مشرکین) نے اللہ تعالیٰ کی آیات (معاہدہ اور کئی ایک اصول) سستے داموں بیچ ڈالے ہیں اور راہِ حق سے رو گرداں ہو گئے ہیں''

یہودیوں کی طرح مشرکین نے بھی فرومایگی کا ثبوت دیا اور ۶ ہجری میں حضورِ اکرمؐ نے ان کے ساتھ جو معاہدہ حدیبیہ کیا تھا اسے پامال کر دیا، یہاں تک کہ ابوسفیان نے کھانے کی ایک دعوت کا اہتمام کیا، مشرکین سے وعدہ لیا کہ مسلمانوں کے حلیف قبیلے 'بنی خزاعہ' پر شب خون ماریں اور انہیں تہ تیغ کر دیں۔ اس کا بدلہ فرعونِ قریش کی طرف سے صرف ایک ضیافت قرار پایا۔

لفظ ''اشترآء'' کے معنی ایک چیز کے بدلے دوسری چیز لینا ہیں۔ لغت عرب کے مطابق لفظ اشترا کے بعد دو لفظ آتے ہیں۔ ایک کے ساتھ حرف ''با'' ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرے کے ساتھ ''با'' نہیں ہوتا۔ جب اس کے ساتھ حرف ''با'' ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ انسان اپنے پاس سے دیتا ہے اور جو مفعول بغیر حرف 'با' کے ہوتا ہے وہ لینے کے معنی میں ہوتا ہے۔ مثلاً اشتریت ھذا بھذا یعنی ''میں نے اس کو

اس کے عوض خریدا''۔ آیہ مجیدہ میں حرف ''با'' آیاتِ الٰہی کے ساتھ ہے یعنی مشرکین نے آیات اللہ دے کر معمولی سی قیمت وصول کی ہے [1]
اس سے واضح ہوا کہ قرآن مجید میں لفظ ''اشتراء'' کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اس کی معاوضہ لے کر تفسیر کی گئی۔

سورۂ براءت کی گیارہویں آیہ مجیدہ انسانی دوستی کی اعلیٰ مثال پیش کر رہی ہے اور مشرکین کے مفاد میں ان کے لیے اسلام کا دامن کھول رہی ہے جیسا کہ اسی سورہ کی پانچویں آیہ مجیدہ میں عفو و درگزر کا دامن پھیلایا گیا تھا۔ یہ آیہ مجیدہ بھی ان کے سامنے دستِ تعاون پھیلا رہی ہے۔ مشرکین کے تمام سابقہ جرائم اگرچہ قتل و غارت اور فساد کی حد تک سنگین تھے، نظرانداز کر کے ارشاد ہوتا ہے:

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ ...''

''اگر (مشرکین) توبہ کریں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں......''

توبہ سے مراد شرک و الحاد سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ جب کسی مشرک سے کہا جائے کہ 'توبہ کرو' تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو عوامل اور اعمال و افکار اسے توحید سے روکتے ہیں، ان کو چھوڑ دے۔ بالفاظ دیگر اللہ وحدہ لاشریک اور اس کے پیغمبرؐ پر صدقِ دل سے ایمان لے آئے۔ البتہ جب کسی مسلمان سے کہا جائے کہ توبہ کرو تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ مومنین کے شان کے خلاف جو کام کرتا ہے ان کو ترک کر دے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَتُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ جَمِیۡعًا اَیُّہَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۱﴾ (سورہ نور: ۳۱)

''اے مومنو! سب کے سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ''

زیرِ بحث آیہ مجیدہ میں حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین توبہ کے علاوہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ بھی ادا کریں (واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ) یعنی یہ نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ کیونکہ نماز انسان کا اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑنا اور یہ معاشرہ اسلامی کی رکن اعلیٰ ہے۔ جب کہ زکوٰۃ اسلامی معاشرے سے وابستگی کا مظاہرہ اور اس کا اقتصادی رکن ہے۔

پس اگر مشرکین توبہ کے بعد ان دو ارکان کو عملاً بجا لائیں تو پھر تمہارے معاشرہ کے افراد گویا کہ تمہارے بھائی ہوئے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''فاخوانکم فی الدین'' کتاب و سنت کی بنیاد پر اسلامی برادری بڑی اہمیت کی حامل ہے چنانچہ سورۂ حجرات میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ (سورہ حجرات: ۱۰)

---

[1] جب امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے ان ساتھیوں کے لیے جو پختہ دوست نہ تھے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا اللھم بدل لی بھم خیراً یعنی ''بارالہا! ان کے بدلہ مجھے اچھے ساتھی عنایت فرما''۔ سورہ بقرہ میں قرآن مجید بنی اسرائیل کی مذمت یوں فرما رہا ہے: اتستبدلون الذی ھو ادنی بالذی ھو خیر، یعنی تم بہتر چیز کو گھٹیا سے بدلنا چاہتے ہو۔ پس متن میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ ''تبدیلی'' اور ''استبدال'' کے قاعدۂ کلی کی وضاحت ہے۔

یعنی ''مومنین ایک برادری کے افراد ہیں''

حضرت رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے:

المسلمون اخوة تتكافادماءُ هم و تسعى بذمتهم ادنا هم و هم يد على من سواهم

یعنی ''سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ان میں ہر ایک کا خون محترم ہے۔ ان میں کسی ایک کا کیا ہوا معاہدہ سب کے لیے نافذ ہے اور وہ دشمن کے مقابلے میں یک جان ہیں''[1]

ملت ساز عوامل کے ماہرین کے مطابق نسل، زبان، آب و ہوا اور وطن قومیتیں پیدا کرنے کے لوازمات ہیں۔ یہ عوامل انسانوں کو ایک قوم کی صورت میں متحد کرتے ہیں، اگرچہ نظریہ اور عقیدہ کے اعتبار سے ان کے عقائد و افکار میں ہم آہنگی نہ بھی پائی جاتی ہو۔

مگر قرآن مجید کے مطابق صرف اور صرف ایک عامل قومیت کو جنم دیتا ہے اور وہ ہے وحدتِ عقیدہ۔ قوم کی بنیاد اس کے سوا کسی چیز پر نہیں۔ اس کے علاوہ دیگر عوامل ہرگز متضاد نظریات کو وحدت و یگانگت کے طور پر جمع نہیں کر سکتے کہ اس کو ملت واحد کی اصطلاح کا نام دیا جا سکے۔

آج کی دنیا میں نسل، زبان، آب و ہوا اور وطن کا سہارا لیا جاتا ہے اور عوام کو ان عناصر کے تحت ایک قوم کے نام پر متحد کیا جاتا ہے۔ کیا یہ اتحاد صرف نمائشی اور نازک رسی سے ایک بپھرے ہوئے ہجوم کو باندھنے کے مترادف نہیں جو ایک ہی جنبش سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور زیادہ وقت گزرنے سے پہلے وہ لوگ نظریاتی اختلاف کی وجہ سے الگ الگ جماعتوں میں بٹ جائیں اور اپنے درمیان اختلافات کی لکیریں کھینچ لیں؟

حقیقت یہ ہے کہ معاشرے کے مختلف افراد کو جو چیز ملت واحد کی شکل دے سکتی ہے وہ صرف عقیدہ و ایمان کی وحدت ہے جو سب مختلف افراد کو وحدت و یگانگت بخشتی ہے جو سب افرادِ ملت کو ایک متحدہ راستہ پر چلاتی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے حقوقِ بشر کے داعیان کے خلاف صرف با ایمان لوگوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔ اسی لیے سورۂ برأت کی پانچویں اور گیارہویں آیت میں مشرکین کو توبہ کے موضوع کے بعد نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کو کہا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ مشرک توبہ کے علاوہ ان دو ارکان کی بھی مکمل پابندی کریں۔

خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ عمل ایمان کا جزو ہے۔ مومن صرف وہی ہے جو دیگر باتوں کے علاوہ ان دو اور ان جیسے دوسرے ارکان کا پابند ہو جس کے بغیر وہ کافر متصور ہوگا۔ اس بنا پر ان کے عقیدہ کے مطابق گناہ کبیرہ کا مرتکب مومن نہیں ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے سورۂ برات کی یہی آیت پیش کی ہے، یعنی توحید اور توبہ کے علاوہ نماز و زکات بھی شرائط ایمان میں شامل ہیں۔ اس نظریہ کے خلاف

---

[1] وسائل شیعہ۔ جلد نمبر ۱۹۔ کتاب القصاص۔ باب ۳۱ حدیث ۱، ۲، ۳

حقیقت یہ رہ جاتی ہے کہ پھر ایمان داری کے بھی درجات ہیں۔[1]

ایمان کے انہی درجات کا ایک درجہ انسان کو دوزخ کی آگ سے نجات دلاتا ہے۔ یہ وہی درجۂ ایمان ہے جو فرائض پر عمل کرنے اور گناہ سے پرہیز کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ معاملہ صرف نماز تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ تمام دینی و مذہبی فرائض پر عمل کیا جائے۔

اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اسلامی معاشرے کا جز و قرار پاتا ہے۔ پھر تمام مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے مال و جان کا احترام کریں اور اس کے ساتھ شادی بیاہ رچائیں۔ اس مرحلہ پر کلمۂ توحید اور نبوت کا اقرار کافی ہوتا ہے پھر اگر ایسا شخص اپنے دینی ارکان پر عمل نہ کرے تو حاکم شرع اس پر حد جاری کرے گا جو دین مقدس نے اس کے لیے معین کی ہے۔ لہٰذا صرف ترکِ نماز یا زکوٰۃ سے انسان اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ مشرکین پیمان شکن ایمان لانے کے علاوہ ان دو ارکان کے پابند کیوں رہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا معاملہ عام لوگوں سے ذرا مختلف ہے۔ انہوں نے پہلے مسلمانوں سے معاہدہ کیا، پھر توڑ ڈالا۔ لہٰذا جب تک ان کے زبانی اقرار کے ساتھ عملی اسلام مشاہدے میں نہ آئے ان کے ظاہری اقوال قابلِ اعتماد نہیں۔ اس لیے ان پر یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ ان کی سابقہ پیمان شکنی کی موجودگی میں جب تک ان میں اعمال نیک اور کردارِ صحیح جو ایمان کے لوازمات سے ہیں، نہ دیکھے جائیں ان کے ایمان ظاہری پر اعتماد نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کے لیے دیگر قیود مقرر کی گئیں اور ان کے ظاہری اقرار ایمان کو کافی نہیں سمجھا جاتا جب کہ ہر موقع پر مقرراتِ ظاہری کے مطابق دیگر لوگوں کے اظہارِ اسلام کو کافی خیال کیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ ہم نے گیارہ آیات کے بعض نکات کو قارئین کی نذر کیا۔ اب سورہ برأت کی بارہویں آیہ مجیدہ پر بحث کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ (توبہ: ۱۲)

یعنی "اگر انہوں نے معاہدوں کو توڑ دیا"

اس آیہ مجیدہ کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اس مشرک کے بارے میں ہے جس نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کیا اور پھر اسے توڑ دیا یا اُس مشرک کے بارے میں ہے جو مسلمان ہو گیا، پھر کسی وقت معاہدہ شکنی کرنا چاہتا ہے؟

ہم پہلے نظریہ کے حامی ہیں جب کہ جناب زمخشری، صاحبِ تفسیر کشاف دوسرے نظریہ کو صحیح جانتے ہیں دونوں نظریات میں فرق یہ ہے:

۱۔ آیہ مجیدہ کا سیاق بتا رہا ہے کہ اس سے پہلی آیات کی طرح یہ آیہ مجیدہ بھی مشرکین کے بارے میں مسلمانوں کے فرض کو واضح کر رہی ہے۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کے دور کے مشرکین کئی طرح کے تھے:

---

[1] اس سلسلے میں مزید معلومات کے لیے جناب جعفر سبحانی کی کتاب "بحوث فی الملل والنحل" سے رجوع کیا جائے۔

الف۔ وہ مشرکین جنہوں نے معاہدہ توڑا، اسلام بھی نہ لائے اور اپنے شرک پر قائم رہے۔ ان سے سلوک کے بارے میں پانچویں آیہ مجیدہ احکامات کو واضح کر چکی ہے۔

ب۔ وہ مشرکین جنہوں نے چار مہینوں کی مہلت کے دوران شرک سے توبہ کی اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ان سے سلوک کے بارے میں پانچویں اور گیارہویں آیات احکامات واضح کر چکی ہیں۔

ج۔ وہ مشرکین جنہوں نے معاہدہ کیا اور ان آیات کے نزول تک اس کی پابندی کی۔ ان سے سلوک کے بارے میں چوتھی آیت احکامات واضح کر رہی ہے۔

اس طرح کے تیسری قسم کے مشرکین کے بارے میں قرآنی احکام کا ہونا لازم ہے کہ آئندہ اگر وہ معاہدہ کو توڑ دیں تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ آیہ مجیدہ زیر بحث انہی کے بارے میں وضاحت فرما رہی ہے کہ **"وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم....."** یعنی اگر یہ لوگ آئندہ کسی وقت پیمان شکنی کریں اور دینِ مقدس کے بارے میں زبان طعن و تشنیع دراز کریں تو پھر ان کے لیے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہتا۔ اپنے اس مطلب کی تائید مزید کے لیے مندرجہ ذیل نکات پیش خدمت ہیں:

۲۔ یہ آیہ مسلمانوں کے بارے میں تو ہو نہیں سکتی کیونکہ اس میں ارشاد ہو رہا ہے **"وطعنو فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر** یعنی اگر یہ تمہیں دینِ مقدس کے بارے میں طعن و تشنیع کریں تو کفر و الحاد کے سرغنوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرو"۔

اس طرح کی بات تو اس شخص کے لیے ہی کہی جا سکتی ہے جو اپنے شرک و کفر پر ڈٹا رہے نہ کہ اس مشرک کے بارے میں جو مسلمان ہو جائے اور کسی وقت پھر منحرف ہو جائے۔

۳۔ فاضل مؤلف تفسیر کشاف ہمارے بیان کردہ نظریہ سے مختلف ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق اس آیہ مجیدہ کا تعلق پچھلی آیہ مجیدہ یعنی آیہ ۱۱ سے ہے یعنی وہ لوگ جو شرک چھوڑ کر مسلمان ہو گئے، نمازیں پڑھنے اور زکوۃ دینے لگے، مگر پھر انہوں نے اپنا معاہدہ توڑ ڈالا یا توڑنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ان کے بارے میں آیت ۱۱ کے بعد آیہ نازل ہوئی۔ شاید آیہ مجیدہ انہی کے بارے میں ہے مگر مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر ایسا نہیں لگتا!

i۔ کسی مشرک کے معاہدہ کا تصور اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب وہ اسلام کے مقابلے میں شرک و الحاد پر قائم رہے۔ اگر وہ ایمان لے آئے، نماز و زکوۃ کا پابند ہو جائے تو پھر وہ معاشرۃ اسلامی کا ایک فرد ہوگا۔ اس صورت میں کسی قسم کے معاہدہ یا سربراہِ مملکت اسلامی سے کسی عہد و پیمان کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ عہد و پیمان اس جماعت سے ہوتا ہے جو اسلامی مملکت سے اختلاف یا علیحدگی رکھتے ہوں۔ ایسی صورت کے علاوہ نہ انہیں معاہدہ کرنے کی ضرورت ہے، نہ ہی صاحبِ پیمان ہونے کی۔

ii۔ آیہ مجیدہ ان لوگوں کے بارے میں بحث کر رہی ہے جو مستقبل میں معاہدہ توڑ دیں، دین کے بارے میں طعن و تشنیع کریں اور ایسے فرمانرواؤں کے ماتحت ہوں جن کو قرآن مجید **"ائمۃ الکفر"** کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ علامتیں ان مشرکین کی ہوتی ہیں جو سرے سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہی نہ ہوں۔ اگر اس سے مراد وہ مشرکین ہوتے جو ایمان لے آنے کے بعد مرتد ہو گئے ہوں تو پھر **"وطعنوا فی**

دینکم ‘‘ کی بجائے ’’وطعنوا فی دینھم ‘‘ کہنا زیادہ مناسب تھا۔مزید برآں آئمہ کفر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے شرک پر اصرار کریں نہ کہ وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہوں۔

کیا اس آیہ مجیدہ کا مصداق وہ مرتد ہیں جو آنحضرتؐ کے بعد کافر ہو گئے؟

تاریخ گواہ ہے کہ اس آیہ مجیدہ کا مفہوم حضرت رسولِ اکرمؐ کی حیات دنیوی میں تحقق پذیر نہ ہو سکا کیونکہ اس سورہ کے نزول کے بعد نو عمر اسلامی حکومت کا دشمنوں کے قلوب پر اتنا رعب بیٹھ گیا کہ کسی کو مخالفت یا معاہدہ توڑنے کی جرات ہی نہ تھی۔ادھر حضورِ اکرمؐ کا وصال ہوا اُدھر مرکز سے دور خطہ سے فتنۂ ارتداد کی آواز مسلمانوں کو سنائی دی۔چونکہ ابھی حضورؐ کی تعلیمات کا اثر باقی تھا لہٰذا مسلمانوں نے اس فتنۂ ارتداد کو مٹانے کے لیے صحیح تدابیر بروقت اختیار کر لیں جس کے نتیجہ میں مرتدین کی ایک جماعت ماری گئی اور باقی ایک بار پھر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

شاید کوئی یہ سمجھے کہ یہی مرتد اس آیہ مجیدہ کا مصداق ہیں جنہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔یہ نظریہ دو پہلوؤں سے درست نہیں۔

(الف) غور کرنا چاہیے کہ معاہدہ مرتدین کی طرف سے تھا یا مسلمانوں کی جانب سے؟ صاف ظاہر ہے کہ معاہدہ کرنے والے مسلمان تھے اور اپنے آپ کو معاشرہ اسلامی کے افراد قرار دیتے تھے۔تو پھر ان کو اس آیہ مجیدہ کا مصداق کیسے مان لیا جائے۔

(ب) اگر اس اشکال کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تو ایک اور اشکال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان لوگوں کا حضورِ اکرمؐ کے ساتھ معمولی سا بھی کوئی معاہدہ نہیں تھا اور ایمان لانا عہد و پیمان کرنا نہیں ہوا کرتا۔

کسی کے ذہن میں یہ غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے کہ جو بھی ایمان لاتا وہ حضورِ اکرمؐ کے ساتھ کسی معاہدے کا پابند سمجھا جاتا، بلکہ معاملہ اس سے زیادہ آسان تھا کیونکہ قبولِ ایمان کی اساس تصدیق لفظیٔ ہی ہوتی تھی۔اس قدر کافی تھا کہ کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا جائے۔عہد و پیمان و بیعت لینا مسلمانوں کے لیے لازمی و دائمی نہ تھا بلکہ بعض اوقات اہم مواقع پر مسلمانوں سے بیعت لی جاتی تھی تا کہ حضورِ اکرمؐ ان کے جذبۂ ایمان اور جذبۂ ایفائے عہد کو اسلامی مقاصد کے لے استعمال فرما سکیں۔اس کی بڑی واضح مثال ’بیعت رضوان‘ ہے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر وہاں پر موجود مسلمانوں سے لی گئی۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ (سورہ فتح: ۱۸)

’’(اے حبیبؐ) جب مومنین درخت کے نیچے آپؐ کی بیعت کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا، خداوندِ عالم ان کے دلی ارادوں سے آگاہ ہو گیا۔ان کے قلوب کو اطمینان بخشا اور ایک قریبی شاندار فتح کو ان کے لیے انعام قرار دیا‘‘

’’بیعتِ رضوان‘‘ کے موقع پر جتنے لوگ بھی موجود تھے وہ پہلے سے مسلمان و مومن تھے۔یہ بیعت ان کے ایمان و اسلام کی افزائش و

تحقیق کے لیے نہیں تھی بلکہ ممکنہ جنگ میں ثابت قدم رہنے کے لیے تھی۔ اسی طرح بعض اوقات حضورِ اکرمؐ خواتین سے (ان کے ایمان لے آنے کے بعد) اس بات پر بیعت لیا کرتے تھے کہ جادۂ توحید سے باہر قدم نہیں رکھیں گی اور اپنے آپ کو مادی خیانت سے محفوظ رکھیں گی، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ (سورہ ممتحنہ: ۱۲)

''اے پیغمبرؐ! جب خواتین آپؐ کے پاس اس وعدہ پر بیعت کرنے آئیں کہ شرک نہیں کریں گی، چوری نہیں کریں گی اور منافیِ عفت عمل نہیں کریں گی، تو ان کی بیعت قبول کرلیں''۔

نتیجۂ گفتگو

زیر بحث آیہ مجیدہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کا حضورِ اکرمؐ کے ساتھ کوئی معاہدہ تھا۔ حضورِ اکرمؐ کے بعد جو لوگ مرتد ہو گئے ان کا کوئی بھی معاہدہ حضورؐ کے ساتھ نہیں تھا اور وہ مرتد ہونے سے پہلے مومن تھے۔ ان کے آنحضرتؐ پر ایمان لانے کے لیے ہرگز بیعت لازم نہ تھی بلکہ ان سے بیعت صرف حساس مواقع پر لی جاتی تھی۔ اس بنا پر مرتدین اس آیہ مجیدہ کا مصداق نہیں بنتے۔

اس آیہ مجیدہ کے اولین مصداق اصحابِ جمل ہیں

یہ درست ہے کہ آیہ مجیدہ اُن مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کا حضورِ اکرمؐ کے ساتھ معاہدہ تھا۔ مگر آیہ مجیدہ میں بیان شدہ حکم کی نوعیت پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ بیان شدہ حکم عام ہے اور اس سے مراد صرف مشرکین ہی نہیں، یا صرف وہ لوگ ہی مراد نہیں جو عہدِ پیغمبرؐ میں تھے بلکہ ہر وہ شخص مراد ہے جو اسلامی حکومت کے سربراہ کے ساتھ معاہدہ کر کے توڑ دے، خواہ اس کا تعلق کسی زمانے سے ہو! وہ شخص چاہے زمانۂ آنحضرتؐ کا مشرک ہو یا مومن اس آیہ کا مصداق ہے چنانچہ جب کبھی کوئی طبقہ اسلامی حکومت کے سربراہ کے ساتھ بیعت کر کے توڑ دے تو آیہ مجیدہ میں بیان شدہ حکم اس پر جاری سمجھا جائے گا کیونکہ حکم کا تعلق عہد شکنی سے ہے خواہ کوئی بھی اس کا مرتکب ہو۔

خلافت و امامت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ خاص صلاحیتوں اور استعدادات سے ہے۔ جس کسی میں یہ خاص صلاحیتیں پائی جائیں وہی اس منصب پر فائز ہوسکتا ہے۔ مگر عملی طور پر حضورِ اکرمؐ کے زمانے میں اور بعد میں بھی اس کی ایک خاص رسمی صورت نظر آتی ہے۔ مثلاً جب میدانِ غدیرخم میں حضرت علیؑ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت رسولِ اکرمؐ کے خلیفہ اور مومنین کے قائد و امیر کے طور پر تعارف ہوا تو حضورِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے اعلانِ امامت کے بعد حکم دیا کہ ایک ایک آدمی آکر ان کے ہاتھ پر بیعت کرے جس سے مقصود یہ تھا کہ رسمی طور پر حضرت علیؑ کا تقرر تمام امت دیکھ لے۔

اتفاق یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے تو اس وقت بھی بالکل یہی صورتِ

حال دہرائی گئی اور مسلمانوں کے پیش پیش جناب حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ آئے اور حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کو مسلمانوں کا متفقہ سربراہ مان لیا۔ مگر بعد میں حضرت علیؑ کا عدل پسندانہ اور عادلانہ طریقہ کار ان دونوں کی جاہ طلبی کا متحمل نہ ہو سکا۔ اُن کا اصرار تھا کہ تقسیم بیت المال اور مناصب دیتے ہوئے حضرت علیؑ بھی طبقہ بندی قائم رکھیں۔ مگر امیر المومنین سے ایسا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے حضرت علیؑ سے کی ہوئی بیعت توڑ ڈالی اور عمرہ کے بہانہ سے مدینہ سے نکل گئے۔ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اپنے ساتھ ملایا۔ لوگوں کو طرح طرح کے لالچ اور بخشش دے کر کافی تعداد میں اپنے ساتھ ملا لیا۔ وہاں سے وہ بصرہ کی طرف بڑھے جہاں حضرت علیؑ کے بہت سے ساتھیوں کو قتل کر کے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔

حضرت علیؑ اپنی فوج لے کر مدینہ سے بصرہ تشریف لائے۔ بصرہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو حضرت علیؑ نے دشمن سے اس طرح خطاب فرمایا:

''کیا میں نے تم پر کوئی ظلم کیا ہے، میں نے مال و دولت اپنی آل و اولاد کے لیے وقف کیا ہے، یا میں نے احکاماتِ الٰہی کے نفاذ میں کسی کے ساتھ امتیازی سلوک کیا ہے؟'' سب نے بیک زبان عرض کیا ''نہیں''۔ پھر آپ نے پوچھا:

ما لبیعتی تنکث و بیعة غیری لا تنکث یعنی ''پھر کیا وجہ ہے کہ تم نے میری بیعت توڑ ڈالی مگر دوسروں سے کی گئی بیعت کا احترام کیا؟

اس کے بعد آپؑ نے اپنا رخِ انور اپنی فوج کی طرف موڑا اور ارشاد فرمایا: ''ان اللہ یقول فی کتابہ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی کتاب مبارک میں ارشاد فرماتا ہے: و ان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم ...'' اس کے بعد ارشاد فرمایا:

انھا لاصحاب ھذہ الایة و ما قوتلوا منذ نزلت [1]

''اس آیہ کے مصداق یہ لوگ ہیں جس پر آج تک عمل نہیں کیا گیا تھا'

یعنی جنگِ جمل سے پہلے کس نے اس طرح معاہدہ یا بیعت نہیں توڑی تھی نہ ہی ایسا فعل کرنے والوں سے کوئی جنگ ہوئی تھی۔

اس آیہ مجیدہ کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا نظریہ

اکثر مفسرین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیہ مجیدہ قریش اکابرین کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ مگر یہ روایت بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ سورۃ برات ۹ھ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ جب کہ قریش کے تمام اکابرین ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے۔ لہٰذا آیہ مجیدہ کا روئے سخن مشرکین کی طرف ہے نہ کہ مسلمانوں کی طرف۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۲، ص ۱۸۹

قابل غور دو نکتے

۱۔ اس آیہ مجیدہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان اُن لوگوں سے لڑیں جو ان کے دین کا مذاق اڑاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: **و طعنوا فی دینکم** (تمہارے دین پر طعن کریں) اس میں واضح بات یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اس کا دین اس کی جان و مال سے بھی عزیز تر ہے۔

۲۔ زیر بحث آیہ مجیدہ مسلمانوں کو کفر و الحاد کے سرغنوں سے جنگ کرنے کی دعوت دیتی ہے ارشاد ہوتا ہے: **فقاتلوا ائمة الکفر** (کفر کے سرغنوں سے لڑو) اس میں نکتہ یہ ہے کہ یہ سردارانِ کفر عوام کی گمراہی کا سبب ہیں۔ اگر ان کی اصلاح ہوجائے تو پورا معاشرہ ٹھیک ہوسکتا ہے۔ بصورتِ دیگر گمراہی سارے معاشرہ کو گھیرے میں لے لے گی۔

حضرت رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

"صنعان من امتی اذا صلحا صلحت الامة و اذا فسد فسدت الامه الامرآ والفقرآءُ"

''اگر میری امت کے دو طبقے راہِ رست پر آ جائیں تو تمام امت راہِ رست پر آ جائے گی اور اگر یہ گمراہ ہوجائیں تو تمام امت گمراہ ہوگی۔ یہ دونوں طبقات فرمانرواؤں اور دانشمندوں پر مشتمل ہیں۔''

دینی ذمہ داری کے بارے میں ترغیبات

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(سورہ توبہ: ۱۳)

''(اے مسلمانو!) کیوں ان لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے معاہدہ کو توڑا، پیغمبر اکرمؐ کو جلا وطن کرنے پر آمادہ ہوئے اور تمہارے ساتھ دشمنی کرنے میں پہل کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم واقعی مومن ہو تو پھر اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔''

اگلی آیہ مجیدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ

صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ (سورہ توبہ: ۱۴)

''(مسلمانو!) ان لوگوں سے جنگ کرو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ ان پر عذاب نازل کرے، ان کو رسوا کرے تمہیں ان پر مسلط کرے اور مومنین کے دلوں کو خوش کرے۔''

پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾ (سورہ توبہ: ۱۵)

''تا کہ اس طرح (اللہ تعالیٰ) مومنین کے دلوں میں غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کرے اور ان میں سے جس کو چاہے بخش دے کہ اللہ باخبر و حکیم ہے۔''

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

(سورہ توبہ)

''تم کیا سمجھتے ہو کہ آزمائش سے بچے رہو گے، کیا ابھی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کو پرکھا نہیں ہے اور نہ ہی یہ معلوم کیا ہے کہ کون کون اللہ تعالیٰ، اس کے پیغمبرؐ اور مومنین کو چھوڑ کر غیروں کو راز دیتا ہے؟ بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری کارگزاریوں سے پوری طرح باخبر ہے''۔

یہ چار آیات ان آیات کا آخری حصہ ہیں جو امیر المومنین حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے میدانِ منیٰ میں مشرکین کو سنائیں۔ اس حصہ کی تفسیر کے ساتھ وہ تمام آیات اختتام کو پہنچتی ہیں جو آنحضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو تعلیم فرمائی تھیں۔ اس کے بعد کی آیات میں ایک مختلف موضوع شروع ہوتا ہے۔

آیات کے اس حصہ میں جس کی ہم اب تفسیر کرنے والے ہیں قرآن مجید منطقی دلائل کے ذریعہ موحدین کو مشرکین کے خلاف جنگ کی ترغیب دے کر ان میں جاںنثاری اور دلیری کی روح پھونک رہا ہے۔

آج دنیا بھر کے فوجی مراکز میں صرف عسکری جذبات کو ابھار کر دشمن کے خلاف تربیت دی جاتی ہے (ایسے احساسات جن کی کوئی معینہ حدود نہیں ہوتیں اور جن سے ہر قسم کے مانع کیفیات پر قابو پانا مقصود ہوتا ہے)۔ ظاہر ہے کہ عقل و انسانیت سے عاری ہو کر غرور ملی اور احساس برتری کی خاطر دشمن کے خلاف ہر حربہ استعمال کرنے سے گریز نہ کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر متحارب جماعتوں میں ایک کو فوجی برتری حاصل ہو جاتی ہے تو دوسری طرف مکمل تباہی و بربادی پھیلتی ہے۔ دینِ مقدس اسلام نے اس طرح کی سفاکی اور بربریت کی

روک تھام کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ بانیٔ اسلام حضرت رسولِ اکرمؐ چونکہ کشور کشائی اور وسعت طلبی کے خواہاں نہیں تھے، جب کبھی فوج کو میدانِ جہاد کی طرف روانہ فرماتے تو جہاں ان کے جذبۂ جہاد کو ابھارتے وہاں انہیں ظلم اور بے جا خونریزی کے خلاف سختی سے احتیاط کرنے کا حکم دیتے تھے۔ اس طرح مجاہدوں کی فوجی سرگرمیاں قابو میں رکھتے۔ آنحضرتؐ ایسے مواقع پر اکثر مندرجہ ذیل طریقہ پر خطاب فرماتے تھے:

''مجاہدو! تمہاری تلواریں جنت کے دروازوں کی چابیاں ہیں، تمہارے گھوڑے بہشت کی طرف بڑھنے کا ذریعہ ہیں، جنت میں جانے کا ایک دروازہ ''باب المجاہدین'' کہلاتا ہے، مجاہد اس حالت میں جنت میں داخل ہوں گے کہ انہوں نے تلواریں حمائل کر رکھی ہوں گی اور فرشتے ان کا والہانہ استقبال کر رہے ہوں گے۔''

لیکن مجاہدین کے جذبات کے نظم وضبط کی خاطر مندرجہ ذیل جملے بھی ارشاد فرماتے:

''مگر مجاہدو! تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کے نام پر جہاد کرنا ہے۔ تمہارا مقصد صرف خوشنودی پروردگارِ عالم ہے جس نے انسانی خون کے احترام کا حکم دیا ہے۔ وہ بلا ضرورت خون بہانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر بے گناہوں کو قتل کرو، درختوں کو کاٹ ڈالو، دشمن کے اعضائے جسم کے ٹکڑے کر ڈالو، بیماروں، بوڑھوں، خواتین اور معذوروں پر ہاتھ اٹھانے لگو''۔

جب کسی مجاہد کو اس طرح کے جذبات سے مسلح کیا جائے گا تو جنگ منطقی اور تعمیری صورت اختیار کرے گا اور مجاہد کو ویرانی پھیلانے کے بجائے آبادیاں قائم رکھنے کی فکر ہوگی۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کا لائحہ عمل

حضرت علیؑ کا طریقہ بھی بالکل اپنے آقا حضرت رسولِ کریمؐ ہی کی طرح تھا۔ جب آپؑ کو بتایا گیا کہ امیر معاویہ کے حکم سے سفیان بن عوف نے عراق کے سرحدی شہر 'انبار' پر حملہ کر کے وہاں کے عامل کو قتل کر دیا ہے، مال و دولت حتی کہ خواتین کے زیور تک کو لوٹ لیا ہے، تو آپؑ فوراً منبر پر تشریف لے گئے اور آپؑ نے ایک ولولہ انگیز خطبہ ارشاد فرمایا: [1]

ان الجهاد باب من ابواب الجنة فتحه الله لخاصة اولياء و هو لباس التقوى و درع الله الحصينة و جنته ابو ثيقة'

''جہاد بہشت کے دروازوں میں ایک دروازہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص دوستوں کے لیے کھول رکھا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ، تقویٰ کا لباس، مضبوط زرہ اور قابل اعتماد ڈھال ہے۔ جو لوگ جہاد ترک کرتے ہیں انہیں ذلت و رسوائی گھیر لیتی ہے اور مصائب و مشکلات ان کا مقدر بن جاتی ہیں''۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۶، مطبوعہ عبدہ

جنگ جمل کے دوران امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے فرزند ''محمد حنفیہ'' کو علم عطا فرمایا اور ان کو یہ نصیحت فرمائی:

تزول الجبال ولا تزل عض علی جاجذك اعر الله جمجمتك تد فی الارض

بقدمك ارم ببصرك اقصی القوم و غض بصرك واعلم ان النصر من

عند الله سبحانه'[1]

''بیٹے! میدانِ جنگ میں پہاڑ سے بھی زیادہ ثابت قدم رہو، دانتوں کو بھینچ لو، اپنے سر کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اُدھار دے دو، اپنے پاؤں میخ کی طرح زمین میں گاڑ دو، اپنی نظر دشمن کی فوج کے آخری حصہ پر جمائے رکھو، اس کی کثرت کو خاطر میں نہ لاؤ اور یاد رکھو کہ 'مدد' صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوا کرتی ہے'۔

اس کے باوجود تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ امیر المومنینؑ نے ہمیشہ دشمن کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا۔ یہ احکامات آپ نے مختلف مواقع پر اپنے سپہ سالاروں کو صادر فرمائے۔ مجموعی طور پر آپؑ کے ارشادات جہاد کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ جہاں آپؑ اپنے مجاہدوں کو میدانِ جنگ میں دشمن کے خلاف دلیری و شجاعت کا درس فرماتے تھے۔ وہاں مغلوب دشمن پر رحم و کرم کی تلقین بھی فرماتے تھے اور انسانیت سے گرے ہوئے کسی بھی غیر منطقی اقدام کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

سورہ توبہ کی آیات ۱۴، ۱۵ مختلف جہات سے مجاہدان فی سبیل اللہ کو حصول مقصد کے لیے ہر طرح کی جانثاری کی ترغیب دے رہی ہے۔ شاید پورے قرآن مجید میں اس طرز پر مجاہدوں کو جہاد کے لیے تشویق و ترغیب نہیں دی گئی حالانکہ آیہ ۱۳ میں عقلی و منطقی طریقہ سے ان پر ضرورت اہمیت جہاد کو واضح کیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان آیات میں جنگی جذبات انسانی میلانات اور عقلی تقاضوں کے مطابق ہر پہلو سے مسئلہ جہاد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ذیل میں جہاد کے عقلی اور جذباتی عوامل پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ جہاد کے عقلی عوامل

سورہ توبہ کی آیہ ۱۳ میں اس سلسلے میں اس طرح سے ارشاد ہوتا ہے:

اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ یعنی معاہدہ توڑنے والے لوگوں سے جنگ کیوں نہیں کرتے۔

بات یہ تھی کہ صلح حدیبیہ کی شرائط مشرکوں کے حق میں تھیں۔ اس معاہدہ صلح کے فوراً بعد 'بنی بکر' نے قریش کے ساتھ اور قبیلہ 'خزاعہ' نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کیا۔ مگر مشرکوں نے اپنے فائدے میں ہونے والے معاہدہ کا بھی لحاظ نہ کیا۔ بنی بکر نے زیادہ وقت نہ گزارا تھا کہ قریش کی مدد سے 'بنی خزاعہ' پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے اکثر لوگوں کو قتل کر ڈالا اور باقی بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ 'بنی خزاعہ' کا سردار فریاد لے کر بارگاہ رسالت مآبؐ میں مدینہ پہنچا اور پوری کیفیت بیان کی۔ آنحضرتؐ ان کی مظلومی کی خبر سن کر متاثر ہوئے اور فرمایا: ''لا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱، مطبوعہ عبدہ

نصرت ان لم انصر یعنی اگر اس وقت میں تمہاری مدد نہ کروں تو اللہ میری مدد نہ کرے'' خود ہی فیصلہ کریں کہ کیا ایسے نا جواں مردانہ معاہدہ شکن لوگ سزا و تنبیہ کے مستحق نہیں

۲۔ انہوں نے حضورؐ کو ان کے وطن سے نکال دیا!

دوسری بات جو اسی آیہ مبارکہ میں کہی گئی ہے اور جو بالکل مطابق عقل ہے، یہ ہے ''و ھموا باخراج الرسول یعنی انہوں نے پیغمبرؐ اکرم کو جلاوطن کیا''۔ پیغمبر اکرمؐ کی جبری جلاوطنی (جسے عام طور پر ہجرت کہتے ہیں) کا مفصل واقعہ اسی سورہ کی آیہ ۴۰ میں بیان کیا گیا ہے۔

ممکن ہے کوئی صاحب یہ سوال کریں کہ جب قریش نے حضور اکرمؐ کو جلاوطنی پر مجبور کیا تو اس وقت وہ مشرک تھے مگر وقتِ نزول سورۂ برأت وہ مسلمان ہو چکے تھے؟ ان حالات میں قرآن کیسے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہا ہے؟

اس کا جواب تاریخ میں واضح طور پر موجود ہے۔ ''دارالندوۃ'' میں صرف قریش ہی نہ تھے بلکہ دوسرے قبائل کے سردار بھی ان کے ساتھ جمع ہوئے تھے جن میں اکثر نزولِ سورۂ براءت کے موقع پر مشرک تھے۔ اس پر مستزاد یہ کی خود قریش میں بعض افراد نے فتح مکہ کے بعد بھی شرک و بت پرستی کو ترک نہیں کیا تھا۔

۳۔ جنگ کی ابتدا ان کی طرف سے تھی

مشرکین کا تیسرا جرم یہ تھا کہ حضور اکرمؐ کے مکہ سے چلے جانے کے باوجود انہوں نے حضورؐ کا پیچھا نہ چھوڑا بلکہ 'بدر'، 'احد' اور 'احزاب' کی جنگیں آنحضرتؐ پر مسلط کیں۔ اس لیے آیہ مجیدہ کہہ رہی ہے ''و ھم بدو کم اوّل مرۃ یعنی انہوں نے ہی جنگ کرنے میں پہل کی۔

اس کے بعد آیہ مجیدہ میں ایک جملہ اور ہے ''اتخشو نھم فا اللہ احق ان تخشوہ یعنی کیا تم ان سے ڈرتے ہو حالانکہ ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے زیادہ ڈرنا چاہیے''۔ یہ جملہ مسلمانوں میں ان لوگوں کے لیے ہے جو بزدل تھے۔

یہ تھے وہ عقلی و منطقی عوامل جو مسلمان مجاہدوں کو جنگ کی ترغیب دیتے تھے۔ ان عوامل کے اختتام کے بعد اب ہم ان حساس پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں جن کی طرف آیات ۱۴ اور ۱۵ اشارہ کرتی ہیں۔ وہ مختلف نکات یہ ہیں:

ا۔ مجاہدانِ اسلام اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مظہر ہیں

اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اسلام کی شان کا اس قدر بلند تعارف کرایا ہے کہ انہیں ارادہ اور مشیتِ خداوندی کا مظہر قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''یعذبھم اللہ بایدیکم یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ مشرکین کو سزا دینا چاہتا ہے'' مطلب یہ ہے کہ مجاہدین اسلام اللہ تعالیٰ کے اتنے نزدیک ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنا کام ان سے کروائے۔

۳۔اللہ تعالیٰ مشرکوں کو ذلیل اور مجاہدین کو سرفراز فرماتا ہے

جہاد کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے: ''ی خزھم وینصر کم یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین کو رسوا کرتا اور مجاہدین کی امداد فرماتا ہے''۔ یہ بات قرآن مجید کی پیشین گوئی ہے جو صرف چار ماہ بعد ہی پوری ہو گئی۔

۳۔قلوبِ مومنین کے لیے شفا

مندرجہ ذیل دو جملے مجاہدین کو سب سے زیادہ جہاد کی طرف مائل کرتے ہیں۔

(لف) و یشف صدور قومٍ مومنین یعنی جنگ کروتا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے دکھی مومنین کے مجروح دلوں کو شفا عطا فرمائے۔

(ب) ''ویذھب غیظ قلو بھم ''یعنی جہاد کروتا کہ اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے مومنین کی آتشِ غضب کو ٹھنڈا کردے'۔

مطلب یہ ہے کہ مشرکین کے ظلم وستم کی وجہ سے ابھی تک مومنین کے سینے زخمی اور دل غیظ وغضب سے بھرے ہوئے ہیں۔تمہارا جہاد راہِ خدا ان کے مجروع سینوں کا مرہم اور ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کا باعث ہوگا۔پھر پندرہویں آیہ مجیدہ کے اختتام پر ایک اسلامی اصول بیان کیا گیا ہے کہ ابھی مشرکین پر توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ارشاد ہوتا ہے: و یتوب اللہ علی من یشاء یعنی اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے معاف فرما دیتا ہے''

اسلامی معاشرہ اور مشرکین کے درمیان ابھی تک رشتہ داریاں موجود تھی۔ بسا اوقات مسلمانوں کے ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی فرما نبرداری سے زیادہ اپنے رشتہ داروں کا خیال رہتا ہے۔ چنانچہ دورانِ جہاد وہ اُن سے نرمی برتتے تھے اور مسلمانوں کو راز دار بنانے کے بجائے مشرکین کو اپنا راز دار بنا لیتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ

(سورہ توبہ: ۱۶)

''کیا تمہارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے حال پر یوں ہی چھوڑ دے گا جب کہ ابھی اس نے تم میں سے جہاد کرنے والوں اور اللہ تعالیٰ پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کو چھوڑ کر غیر کو راز دار نہ بنانے والوں کو دوسروں سے الگ نہیں کیا ہے؟''

کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ازل سے ہی انسان کے کردار سے واقف تھا۔اس کی اس آ گہی کے لیے کوئی زمانہ مقرر نہیں فرماتا ہے: ''و لما جاھدوا یعلم اللہ الذین جاھدوا ''اس سے مراد یہ نہیں کہ امتحان و آزمائش کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کو علم نہیں تھا کہ کون مجاہد مخلص ہے اور کون نہیں۔وہ تو ازل سے ہر ایک کے بارے میں کما حقہٗ آگاہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ (سورہ آل عمران: ۱۷۹)

''اللہ تعالیٰ مومنین کے معاشرہ کو ان کی وضع پر نہیں چھوڑے گا بلکہ شریف وخبیث کو نمایاں کر کے رہے گا''

اسی سورہ کی آیات ۱۴۱ تا ۱۵۴ میں بھی ایسا ہی طرزِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔

(۱۴) واقعہ غدیر یا تکمیل دین

۱۰ھ میں حضرت رسول اکرمؐ مسلمانوں کو مناسک حج سکھانے کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ یہ فریضہ حج آنحضرتؐ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری سال میں تھا۔ اسی لیے اس حج کو ''حجۃ الوداع'' کہتے ہیں۔ اس موقع پر جو مسلمان آنحضرتؐ کے ساتھ ہم سفر ہونے کے شوق میں یا مناسکِ حج سیکھنے کے لیے آنحضرتؐ کے ہم رکاب تھے، ان کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ بیس ہزار لگایا جاتا ہے۔

مناسک حج ادا کرنے کے بعد حضرت رسول اکرمؐ مدینہ روانہ ہوئے۔ لوگوں کا ایک انبوہِ کثیر آنحضرتؐ کے ہمراہ تھا۔ سوائے مکہ میں مقیم لوگوں کے تمام مسلمان حضورِ انورؐ کے ساتھ تھے۔ جب یہ قافلہ حجفہ سے تین میل کے فاصلے پر مقام ''غدیر خم'' پر پہنچا تو اچانک وحی نازل ہوئی اور آنحضرتؐ نے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم بھی دیا کہ ہر شخص رک جائے تاکہ پیچھے رہ جانے والے بھی آ جا ملیں۔

سب مسلمان اس چلچلاتی دھوپ اور بے آب وگیاہ میدان میں عین دوپہر کے وقت قیام کے حکم پر حیران بھی ہوئے۔

مسلمان آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے آیا ہے جس کے اعلان کے لیے حضورؐ نے ایسے نامساعد حالات کے باوجود روکنے کا حکم صادر فرمایا ہے تاکہ فرمانِ خداوند تعالیٰ کا اعلان فرمائیں۔ آنحضرؐ کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان درج ذیل آیہ مبارکہ کی صورت میں نازل ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ (سورہ مائدہ:۶۷)

''اے رسولؐ! جو کچھ آپؐ پر اپنے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کا اعلان کر دو۔ اگر آپؐ نے یہ عمل نہ کیا تو گویا رسالت کا کوئی کام ہی نہیں کیا اور لوگوں کی مخالفت سے اللہ آپ کی حفاظت فرمائے گا''

اس آیہ مجیدہ پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ جس اقدام کا اس موقع پر حکم دیا گیا تھا وہ اس قدر اہم تھا کہ اگر وہ انجام نہ دیا جاتا تو گویا حضورِ اکرمؐ اپنا فرض منصبی ہی ادا نہ کر پاتے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسی اقدام سے آپؐ کی رسالت کی ذمہ داریاں انجام کو پہنچ رہی تھیں۔ بالفاظ دیگر ''ما انزل .... سے مراد تمام آیاتِ قرآن اور مجموعی طور احکام اسلام نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ بات کسی تفصیل کی محتاج نہیں کہ اگر آنحضرتؐ نے تمام احکام الٰہی کا اعلان نہ کیا ہوتا تو واقعی اپنی رسالت کے فرائض انجام نہ دیئے ہوتے۔ اس کے لیے کسی خاص آیۃ کے نازل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اس اعلان سے مراد کسی خاص اقدام کا اعلان ہے جس کو تکمیل رسالت قرار دیا جا رہا ہے اور جب تک اس عمل کو انجام نہ دیا جائے رسالت کے عظیم فرائض تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر آنے والی وحی دینِ اسلام کے اصول سے متعلق کوئی خاص حکم لائی ہے جس کا تعلق دیگر اصول و فروع سے ہے اور توحید و رسالت آنحضرتؐ جیسا ہی کوئی خاص امر ہے۔

۲۔ مجموعی طور پر یہ کوئی ایسی بات تھی جس کے بیان کے سلسلہ میں حضورِ اکرمؐ کو مسلمانوں کی طرف سے کسی منفی ردِعمل کا اندیشہ تھا یا آنحضرتؐ پر اقربا پروری کا الزام لگنے کا احتمال تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ آپؐ کے ارادہ کی تقویت کی خاطر ارشاد فرماتا ہے:

واللہ یعصمک من الناس یعنی لوگوں کی مخالفت سے اللہ تعالیٰ آپؐ کو محفوظ فرمائے گا''۔

اب دیکھنا پڑے گا کہ مسلمان مفسرین نے اس آیہ مجیدہ کے بارے میں جو احتمالات بیان کیے ہیں ان میں کون سا بیان آیہ مجیدہ کے مفہوم کے نزدیک تر [1] ہے۔

تمام شیعہ محدثین اور تیس محدثین اہل تسنن کہتے ہیں کہ زیرِ بحث آیہ مجیدہ ''غدیر خم' کے دن نازل ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے حضرت رسولِ اکرمؐ کو حکم دیا کہ حضرت علیؑ کا بطور مولائے مومنین تعارف کرایا جائے۔ آنحضرتؐ کی جانب سے امام کی ولایت و جانشینی اس قدر عظیم اور اہم مسئلہ تھا کہ اس کا انجام دینا تکمیلِ رسالت کے مترادف تھا اور ایسا نہ کرنا امرِ رسالت کی ادائیگی میں نقص شمار ہوتا۔

علی ہذا القیاس یہ بات قابلِ فہم ہے کہ حضورِ اکرمؐ اس اعلان سے مسلمانوں کے مجموعی ردِعمل سے کیوں خائف تھے۔ بات یہ تھی کہ حضرت علیؑ کو جن کا سن مبارک اس وقت صرف تینتیس سال تھا، تمام مسلمانوں کا حاکم قرار دینا جن میں اکثر کی عمر ان سے کہیں زیادہ تھی، بہت ہی دشوار بات تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ حضورِ اکرمؐ کے گرد جتنے افراد بھی جمع تھے ان کے اکثر رشتہ دار میدانِ جہاد میں حضرت علیؑ کی تلوار سے مارے گئے تھے۔ لہٰذا عرب جیسی کینہ دوز قوم پر حضرت علیؑ کی حکومت کا اعلان واقعی بہت مشکل مرحلہ تھا۔

علاوہ ازیں حضرت علیؑ حضورِ اکرمؐ کے چچا زاد بھائی اور داماد بھی تھے۔ چنانچہ بطور جانشین پیغمبرؐ ان کا تقرر ایسے کوتاہ بین افراد کی نظر میں جن کی ہر معاشرہ میں کمی نہیں ہوتی، کنبہ پروری کے تعصب کو جنم دیتا تھا۔ اس پہلو سے بھی اس تقرری کے خلاف اس سب کچھ کے باوجود، نا مساعد حالات اور ناموافق ماحول کے علی الرغم اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ کا یہی تقاضا ہوا کہ عہدۂ خلافت پر حضرت علیؑ کی تقرری اور پیغمبرِ اکرمؐ کے جانشین کے طور پر ان کی تعیین کو بطور رہبر و رہنما بعدِ رسولؐ مستقل کیا جائے کہ یہی عمل تکمیلِ رسالت قرار پائے۔

اب ہم ذیل میں اس واقعے کے تاریخی پہلو پیش کرتے ہیں:

واقعہ غدیر ابدی اور جاودانی کیفیت کا حامل ہے

اٹھارہ ذوالحج کی دوپہر کا سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ غدیر خم کی وادی پر آگ برسا رہا تھا۔ وادی کی زمین شعلوں کی طرح تپ

---

[1] علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر کبیر کی جلد ۳، ص ۶۳۵ پر اس آیہ مجیدہ کے ذیل میں دس احتمالات کا ذکر کرتے ہیں جن میں سے دو یہ ہیں (۱) یہ آیۂ مجیدہ حکم دے رہی ہے کہ بدکار مرد اور عورت کو رجم و سنگسار کیا جائے (۲) یہ آیۂ مجیدہ یہودیوں پر حضورِ اکرمؐ کی تنقید سے متعلق ہے۔ ان دونوں باتوں سمیت سب احتمالات آنحضرتؐ پر نازل ہونے والے موجودہ حکم کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ ان کے اعلان کے بغیر کارِ رسالت ہی کو نامکمل قرار دیا جا سکے۔

رہی تھی۔ ایسے حالات میں تاریخ کے مطابق ستر ہزار سے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کا جمِ غفیر پیغمبر خداؐ کے حکم سے وہاں آ کر رکا اور ایک تاریخ ساز اعلان کا انتظار کرنے لگا۔ ہر شخص اپنی عبا کا ایک پلو سر پر اور دوسرا پاؤں کے نیچے رکھے ہوئے تھا تاکہ گرمی کی شدت سے کسی قدر بچاؤ ممکن ہو۔

ایسے میں نمازِ ظہر کی اذان کی آواز صحرا میں گونجنے لگی اور مسلمانوں نے نماز کی تیاری شروع کر دی۔ حضورِ اکرمؐ نے مقتدیوں کی بے نظیر تعداد کے ساتھ نماز ظہر ادا فرمائی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرزمین غدیر نے آج سے پہلے اتنا بڑا اجتماع اپنے اوپر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نماز کے بعد آنحضرتؐ پالان شتر سے بنے ہوئے منبر کے بلند ترین مقام پر جلوہ افروز ہوئے اور بآواز بلند درج ذیل خطبہ ارشاد فرمایا: (خطبے کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے)

''تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ہم سب اسی سے مدد کے طالب ہیں، اسی پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہم اپنی بداعمالیوں سے بچ کر اس خدا کی پناہ میں جاتے ہیں جو اگر کسی کو راہِ راست پر لے آئے تو کوئی طاقت اسے گمراہ نہیں کر سکتی۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ اس ذاتِ بابرکات کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندہ اور رسولؐ ہیں۔

لوگو! خدائے لطیف وخبیر نے مجھے مطلع فرمایا ہے کہ دعوتِ حق کو لبیک کہوں۔ چنانچہ اب میں تم لوگوں کے درمیان سے جانے والا ہوں۔ میں اپنی ذمہ داریوں کا جوابدہ ہوں اور تم بھی اسی طرح جوابدہ ہو۔ بتاؤ کہ میرے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

صحابہؓ کبار نے عرض کیا: ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہمیں پہنچادیا، ہمیں دلنشیں طریقہ سے وعظ ونصیحت فرمائی اور اس سلسلے میں آپ نے پوری کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ آپؐ کو بہترین اجر مرحمت فرمائے''

جب مجمع خاموش ہوا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: ''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندہ اور رسولؐ ہیں، جنت، جہنم اور موت برحق ہیں۔ قیامت کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اب زیر خاک جاچکے ہیں، دوبارہ زندہ فرمائے گا؟''

اصحابؓ: کیوں نہیں، کیوں نہیں! ہم سب گواہی دیتے ہیں''۔

رسولِ اکرم: میں تمہارے درمیان دوگراں بہا اور سنگین چیزیں چھوڑے جارہا ہوں۔ تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرو گے''

ایک ناسمجھ نے پوچھا: ''یارسول اللہؐ! ان دوگراں بہا چیزوں سے کیا مراد ہے؟''

رسولِ اکرمؐ: ''ان میں ثقلِ اکبر، اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب (قرآن مجید) ہے جس کا تعلق ایک طرف اللہ تعالیٰ سے ہے اور دوسری طرف یہ کتاب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام لو تاکہ گمراہ نہ ہوسکو۔ ثقلِ اصغر میری عترت اہل بیتؑ ہیں۔ میرے اللہ نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ دیکھو! کبھی کتاب خدا اور میری عترت سے آگے بڑھنے یا ان کو پس پشت ڈالنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ برباد ہو جاؤ گے''

پھر آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو بازو سے پکڑ کر بلند کیا اور ہر شخص نے حضرت علیؑ کو آنحضرتؐ کے پہلو میں دیکھ لیا، جس سے تمام مجمع سمجھ گیا کہ اس اجتماع کا مقصد حضرت علی علیہ السلام سے تعلق رکھتا ہے۔ سب ہمہ تن گوش ہو گئے کہ آنحضرتؐ کے فرمان کو بغور سن سکیں۔

رسول اکرمؐ: لوگو! وہ کون ہے جو مومنین پر خود ان کے نفوس سے زیادہ اختیار رکھتا ہے؟"

اصحاب کرام: "اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبرؐ بہتر جانتے ہیں"

پیغمبر اکرمؐ: اللہ تعالیٰ میرا مولا ہے اور میں تمام مومنین کا مولا ہوں اور ان کے نفوس پر خود ان سے زیادہ سزاوار اور اولیٰ ہوں۔ پس لوگو! جس شخص کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کے مولا ہیں"۔

آنحضرتؐ نے یہ جملہ تین مرتبہ دہرایا۔ اس کے بعد کہا: "پروردگار! علیؑ کے دوست سے دوستی فرما اور اس کے دشمن سے دشمنی۔ علیؑ کے دوستوں کی مدد فرما اور علیؑ کے دشمنوں کو ذلیل اور رسوا فرما۔ خداوند علیؑ کو محورِ حق قرار دے"۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد آپؐ نے فرمایا: "جتنے مسلمان یہاں موجود ہیں ان پر لازم ہے کہ ان سب لوگوں کو یہ پیغام سنا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں"۔

ابھی آپؐ بالائے منبر ہی تھے کہ فرشتہ وحی نازل ہوا اور آنحضرتؐ کو خوشخبری دی کہ آج اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل فرما دیا، تمام اہل ایمان پر اپنی نعمت کو تمام فرمایا اور یہ آیہ مبارکہ نازل ہوئی:

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ (سورہ مائدہ: ۳)

"آج ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی طرف سے عطا کی جانے والی نعمتوں کا اتمام کیا اور تمہارے لیے دین اسلام پر راضی ہوئے"

حضرت رسولِ اکرمؐ نے اس پر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فرمایا: "خداوند تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جس نے اپنے دین و نعمت کو مکمل فرمایا اور میری رسالت و علیؑ کی ولایت و امامت سے راضی ہوا"۔[1]

حضورِ اکرمؐ منبر سے نیچے تشریف لائے۔ صحابہ کرامؓ نے باری باری آ کر حضرت علیؑ کو اس اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کی مبارکباد پیش کی اور انہیں تمام مومن مردوں اور خواتین کا مولا تسلیم کیا۔

اس موقع پر بارگاہِ رسالت مآبؐ کے مشہور شاعر جناب حسان بن ثابتؓ نے ایک طولانی قصیدہ کہا جس میں غدیر کا تاریخ ساز واقعہ بیان کر کے اسے جاودانی حقیقت قرار دیا۔ ہم صرف اس کے دو شعر نذرِ قارئین کرتے ہیں۔

فقال له قم یا علی فاننی
رضیتك بعدی اماماً و هادیاً

[1] الغدیر جلد ۱، ص ۱۰، ۱۱۔ مسند احمد حنبل میں حضور اکرمؐ کے تشکر کے الفاظ خطبہ میں چار مرتبہ دہرائے گئے ہیں۔ نسائی نے اپنی کتاب "الخصائص"، ص ۲۰ پر اس واقعہ کی سند جناب زید بن ارقم سے بیان کی ہے۔

فمن　کنت　مولاہ　فھذاولیہ

فکونو　الہ　اتباع　صدق　موالیا

(روزِ غدیر) حضرت رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: ''اٹھو علیؑ! میں نے تمہیں اپنے بعد مسلمانوں کا رہبر و پیشوا مقرر کیا ہے۔ لہٰذا جس شخص کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔ لوگو! تم پر واجب ہے کہ علیؑ کے سچے پیرو اور حقیقی دوست بن جاؤ''۔

واقعۂ غدیر کے سلسلے میں ہم نے جس طرح اس کو اوپر نقل کیا ہے یہ برادرانِ اہل سنت کے مطابق ہے۔ شیعہ کتب میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے۔

علامہ طبرسی مرحوم نے اپنی کتاب ''احتجاج'' میں اسی سلسلے میں ایک طویل خطبہ نقل کیا ہے۔ خواہش مند حضرات اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔

ابدی وجاودانی واقعہ

حکیم مطلق، اللہ تعالیٰ کی مصلحت کاملہ یہ ہے کہ غدیر کا تاریخی واقعہ ہر زمانے میں اسلامی تاریخ کے ایک روشن باب کی حدیث سے جانا جائے اور مسلمانوں کے دل اس کی طرف کھینچتے رہیں۔ مفسرین، محدثین، اہل قلم، دانشور شعرا، مورخین، واعظین، ذاکرین، علماء اور خطباء غرضیکہ معاشرہ اسلامی کا ہر بااثر طبقہ حضرت علیؑ کی اس نا قابل تردید تقرری کا اعلان کرتے رہیں۔ اس قرآنی واقعہ سے اپنے معیارِ ادب وسخن کو بلند کریں اور ہر زمانے میں نئے انداز سے اس نا قابل فراموش واقعہ کی یاد کو تازہ رکھیں۔

چنانچہ ہمیں تاریخ میں بہت کم ایسے واقعات ملتے ہیں جن کی طرف واقعۂ غدیر کی طرح معاشرہ کے ہر طبقے کی توجہ مبذول رہی ہو۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں اس دور کے محدثین، مفسرین، فلسفی، خطبا و شعرا اور مورخین نے اس واقعہ کے بارے میں گفتگو نہ کی ہو۔

اس واقعے کو ہمیشہ زندہ رکھنے کا ایک اور سبب بھی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں اس واقعہ کے بارے میں تین آیات نازل ہوئی ہیں۔ پس جیسے قرآن مجید زندہ وجاوید ہے، یہ واقعہ بھی زندہ وجاوید رہے گا اور کبھی بھی بھلایا نہ جاسکے گا۔

مزید برآں صدرِ اسلام میں تمام مسلمان اور آج کل بھی دنیا کے تمام شیعہ مسلمان واقعۂ غدیر کو ایک بڑی عید کے طور پر مناتے رہے اور منا رہے ہیں۔ اس طرح بھی ''واقعہ غدیر'' کو ہمیشگی حاصل ہوگئی ہے اور اس کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸ ذی الحج کی تاریخ مسلمانوں میں ''عید غدیر'' کے نام سے مشہور رہی ہے۔ چنانچہ ابن خلکان بادشاہ ''مستعلی بن مستنصر'' کے بارے میں لکھتا ہے کہ ۴۸۷ھ میں عید غدیر کے دن ''مستنصر باللہ'' کی بیعت کی گئی۔[1]

''العبیدی'' المستنصر باللہ کے بارے میں لکھتا ہے: ''ذی الحجہ ۴۸۷ھ کے ختم ہونے میں ابھی بارہ دن باقی تھے کہ یہ واقعہ پیش

---

[1] حاکم نیشاپوری نے مستدرک جلد ۳، ص ۱۰۹ (طبع حیدرآباد، دکن) میں دو اسناد سے اس واقعہ کو جناب زید بن ارقمؓ سے نقل کیا ہے۔

آیا۔ یہ اٹھارہ ذی الحجہ کی شب تھی جو شب عید غدیر ہے۔

ابو ریحان بیرونی نے ''الآثار الباقیہ'' میں لکھا ہے کہ 'عید غدیر' مسلمانوں کی ایک بہت بڑی عید شمار ہوتی تھی اور مسلمان اس دن بڑے اہتمام سے جشن منایا کرتے تھے۔[۱] ابن خلکان اور ابو ریحان بیرونی ہی صرف وہ مورخ نہیں ہیں جنھوں نے اس دن کو روزِ عید قرار دیا ہے بلکہ ''ثعالبی'' نے بھی اس شب کو امت اسلامی کے درمیان شب ہائے معروف میں شمار کیا ہے۔[۲]

اس عیدِ سعید کا رشتہ خود روزِ غدیر سے اس طرح ملتا ہے کہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے مہاجرین و انصار، حتیٰ کہ اپنی ازواج مطہرات کو حکم دیا کہ وہ حضرت علیؑ کے پاس جائیں اور ان کو اس عظیم منصب پر مبارکباد پیش کریں۔ چنانچہ جناب زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ مہاجرین میں حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ نے سب سے پہلے حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی اور انہیں مبارکباد پیش کی اور مبارک و بیعت کے مراسم مغرب تک جاری رہے۔

واقعہ 'غدیر' کی ابدیت کے مزید دلائل

اس واقعے کے اہم اور نا قابل فراموش ہونے کی صرف یہ دلیل ہی کافی ہے کہ اس کو ایک سو دس صحابہؓ نے نقل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کے راوی صرف وہی اکابر صحابہؓ نہیں جن کا ذکر ہم کر آئے ہیں کیونکہ اہل سنت حضرات کے علماء نے ایک سو دس صحابیوںؓ سے اس واقعے کی روایت کی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے تو ایک لاکھ افراد کے مجمع میں 'غدیر' کے مقام پر خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ یہ مجمع حجاز کے کونے کونے میں پھیل گیا البتہ غیر معروف مسلمانوں اور دور افتادہ علاقوں سے اس کی روایت نہیں کی جاسکی یا اگر نقل بھی ہوئی ہے تو ہم تک نہیں پہنچ سکی۔

تاریخ اسلام کی دوسری صدی میں جو تابعین کی صدی کہلائی ہے، نواسی اکابر تابعین نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔ اس کے بعد کے زمانوں میں حضرات اہل سنت سے اس واقعے کے راویوں کی مجموعی تعداد تین سو ساٹھ تک پائی جاتی ہے جنھوں نے اپنی کتابوں میں اس واقعہ کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔ ذیل میں ہم صدی بہ صدی اس یادگار واقعہ کے راویوں کی تعداد پیش کرتے ہیں۔

تیسری صدی میں بانوے، چوتھی میں تنتالیس، پانچویں میں چوبیس، چھٹی میں بیس، ساتویں میں اکیس، آٹھویں میں اٹھارہ، نویں میں سولہ، دسویں میں چودہ، گیارہویں میں بارہ، بارہویں میں تیرہ، تیرہویں میں بارہ اور چودہویں میں بیس اہل سنت راویوں نے حدیث 'غدیر' کو نقل کیا ہے۔ بعض راویوں نے صرف نقل حدیث ہی کو کافی نہیں جانا بلکہ حدیث کی مستقل کتابیں بھی تحریر کی ہیں جن میں اس حدیث کی تمام اسناد گنوائی گئی ہیں۔

---

[۱] مناقب، فقیہ معروف بہ ابن مغازل، طبع اسلامیہ، تہران

[۲] اخطب الخطبآ، خوارزمی، مناقب، ص ۹۳، طبع تبریز

عظیم مسلمان مورخ طبری نے ''الولایة فی طوق حدیث الغدیر' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے اور پچھتر مختلف طریقوں سے اس کو حضرت رسولِ اکرمؐ سے براہِ راست نقل کیا ہے۔

جناب ابن عقدہ کوفی نے کتاب 'ولایت' میں ایک سو پانچ راویوں سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

جناب ابوبکر محمد بن عمر بغدادی المعروف ''جمعانی'' نے اس حدیث کو پچیس طریق سے نقل کیا ہے۔

ذیل میں اہم ان عظیم محدثین کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے متعدد اسناد سے اس شہرۂ آفاق حدیث کو حضرت رسولِ اکرمؐ سے نقل فرمایا ہے:

احمد بن حنبل شیبانی	چالیس اسناد سے
ابن حجر عسقلانی	پچیس اسناد سے
جزری شافعی	اسی اسناد سے
ابوسعید سجستانی	ایک سو بیس اسناد سے
امیر محمد یمنی	چالیس اسناد سے
نسائی	دوسو پچاس اسناد سے
ابوالعلاء ہمدانی	ایک سو اسناد سے
ابوالعرفان حبان	تیس اسناد سے

آج تک واقعہ غدیر سے متعلق چھبیس مستقل اور ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں صرف اس واقعہ کی تفصیلات درج ہیں۔ شاید اس کے علاوہ بھی اس عنوان پر کئی رسالے اور کتابیں لکھی گئی ہوں جن کے نام تاریخ نے ہم تک نہیں پہنچائے۔

شیعہ علماء نے اس تاریخی واقعہ سے متعلق گرانقدر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سب سے جامع کتاب ''الغدیر'' ہے جو مرحوم آیت اللہ امینی کی تابناک تالیف ہے۔ ہم نے موجودہ کتاب کے سلسلہ میں بھی علامہ امینی کی کتاب سے بہت استفادہ کیا ہے۔

(۱۵) قرآن مجید اور واقعہ غدیر خم

واقعۂ غدیر خم سے متعلق قرآن مجید میں آیۂ تبلیغ یعنی "یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك" کے علاوہ دو اور آیات نازل ہوئی ہیں جنہوں نے اس واقعہ کو ابدی و جاودانی رنگ دیا ہے۔ وہ آیاتِ مبارکہ یہ ہیں۔

۱۔ آیہ کمال دین

۲۔ آیہ سوال عذاب

دونوں آیات کے بارے میں درج ذیل بحث پیش کی جاتی ہیں۔

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ (سورہ مائدہ: ۳)

"آج کافر مایوس ہو گئے ہیں (اسلام کی بربادی سے) پس ان سے مت ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے اور 'اسلام' کو تمہارے دین کے طور پر میں نے پسند کیا ہے"۔

آیۃ مجیدہ میں غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے نزول کے دن کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آیا تھا۔ جس سے کافر مسلمانوں پر غلبہ پانے کے بارے میں مایوس ہو گئے، دین مکمل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جانے والی گرانقدر نعمتیں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔

اب ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کون سا دن ان تمام خبروں کا حامل ہوسکتا ہے اور صفحاتِ تاریخ جس کی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

(الف) کیا فتح مکہ کا دن ان خصوصیات کا حامل ہوسکتا ہے؟ بالکل نہیں کیونکہ اس دن تو ابھی مسلمانوں کا مشرکین سے معاہدہ پوری شدومد سے باقی تھا، ابھی مناسک حج زمانۂ جاہلیت کی طرح ادا کیے جاتے تھے اور ابھی بہت سے احکاماتِ اسلام نازل ہونا باقی تھے۔ چنانچہ نہ ہی کفار اسلام کو مغلوب کرنے کے بارے میں مایوس ہوئے تھے اور نہ ہی دین فروع واصول کی حد تک مکمل و محکم ہوا تھا۔

(ب) کیا یہ وہ دن ہوسکتا ہے جب مشرکین سے بیزاری و برات کا اعلان کیا گیا تھا، اس لیے کہ اس دن بھی کفار پر مایوسی و ناامیدی چھا گئی تھی؟ بالکل نہیں کیونکہ ابھی احکاماتِ دین کی حد تک مکمل نہیں ہوئے تھے۔ اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ مشرکین سے برات کے بعد 'حدود' 'قصاص اور 'کلالہ' سے متعلق کئی احکامات اس کے بعد نازل ہوئے تھے۔ لہٰذا کفار و مشرکین کی مایوسی تو اس دن کی علامت نہیں، بلکہ تکمیل دین دوسری بڑی علامت ہے جب تک کسی دن یہ دونوں علامتیں اکٹھی پہنائی جائیں ہم اس دن کو وہ خاص دن نہیں کہہ سکتے۔

(ج) اب ہمیں غور کرنا چاہے کہ اس عظیم خبر کا حامل دن کون سا ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دن ۱۰ ھ میں کیے جانے والے 'حجۃ الوداع' کے دوران "روزِ عرفہ" ہے کیونکہ اس دن کے مناسک حج کو کافی اہمیت حاصل ہے مگر غور کرنے سے صاف پتہ چلے گا کہ روزِ عرفہ کی اہمیت

اپنے مقام پر مسلم ہے مگر جو خصوصیات اس دن کی ہم نے اوپر بیان کی ہیں، ان میں کوئی بھی اس میں نہیں پائی جاتی۔

اب یہ دیکھیں کہ کفار و مشرکین کس طرح اور کس کیفیت میں اسلام کو مغلوب کرنے کے سلسلے میں مایوس ہو سکتے ہیں؟ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(الف) کفار و مشرکین کی مایوسی تو روزِ عرفہ سے پہلے ہی اس دن عمل میں آ چکی تھی جس دن مکہ فتح ہوا تھا۔ پھر جب مشرکین سے بیزاری کا اعلان کیا گیا تو مایوسی اور بڑھ گئی، چنانچہ روزِ عرفہ ۱۰ ھ سے تقریباً ایک سال پہلے یہ مایوسی کفار و مشرکین پر چھا چکی تھی۔

(ب) روئے زمین پر تمام کفار کسی دن بھی اس قدر مایوس نہیں ہوئے تھے۔

جہاں تک تکمیل دین کا تعلق ہے، اگر اس سے فروع و اصول دین مراد ہوں تو یہ احکام ہرگز روزِ عرفہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ایک سلسلۂ احکام جس کا تعلق رہا، وراثت اور کلالہ سے ہے، حجۃ الوداع کے روزِ عرفہ کے بعد نازل ہوئے تھے۔

ان حالات میں صرف روزِ غدیر ہی وہ دن ہو سکتا تھا جب جانشین پیغمبر اسلامؐ کے تعین کی وجہ سے دشمنانِ دین پر مایوسی مسلط ہوئی اور اسی سے مراد تکمیل دین خدا ہے۔ یہ دونوں کیفیات یعنی تعین جانشین رسولؐ اور تکمیل دین توام ہو سکتی ہیں۔

یاد رہے کہ تکمیل دین سے مراد نزول احکامات اور ضمانت بقائے اسلام ہے نہ کہ ان کی تفصیلات و فروعات کا بیان۔ اب ہم ان دونوں مطالب کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

(الف) پیغمبر اکرمؐ کے جانشین کا تقرر اور دشمن پر مایوسی کا غلبہ

جس دن حضرت رسولِ اکرمؐ نے اپنے جانشین کا تقرر فرمایا اس دن کفار اسلام کی ناکامی و تباہی سے مایوس و ناامید ہو گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اسلام صرف حضرت رسولِ اکرمؐ کی شخصیت تک ہی قائم ہے۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد یہ خود بخود ختم ہو جائے گا اور پھر وہی جاہلیت کا ماحول عود کر دیا جائے گا۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ آپؐ نے مسلمانوں کی قیادت کے لے ایک بابصیرت و باکردار اور علم و عمل کی حامل ایسی شخصیت کو مقرر فرمایا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں اور مسلمانوں نے اس کی بیعت بھی کر لی ہے تو وہ زوالِ اسلام سے بالکل مایوس ہو گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ اسلام ایک مستقل و محکم دین کے طور پر قائم ہو چکا ہے اور اب اس کے زوال کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

قرآن مجید کی متعدد آیات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ کفار کی یہ دلی آرزو تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر کے اپنے آباو اجداد کے دین کا پیرو بنائیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا ۚ

(سورہ بقرہ: ۱۰۹)

''اہل کتاب میں سے بہت سے لوگوں کی خواہش تھی کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹا دیں''

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کی تیز رفتار ترقی اور مکہ یعنی شرک والحاد کے مرکز کی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح نے مشرکین کی امیدوں کو کافی حد تک مایوسی میں بدل دیا تھا تاہم ایک امید باقی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ بانی اسلام کا کوئی بیٹا نہیں جو ان کے بعد اسلام کی نوعمر حکومت کی قیادت کو سنبھال سکے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد اسلام کی بساط لامحالہ خود ہی لپٹ جائے گی۔ اس طرح زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ مشرکین کامیاب ہوجائیں گے اور سب لوگ اپنے پرانے دین پر واپس آجائیں گے۔ قرآن مجید کفار کی اس آرزو کی نشاندہی اس طرح فرماتا ہے:

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ۝۳۰ (سورہ طور: ۳۰)

''(کفار) تو یہ کہتے ہیں کہ وہ (پیغمبر اکرمؐ) ایک شاعر ہیں اور ہم انتظار کر رہے ہیں کب وہ حوادثِ روزگار کا شکار ہو کر دنیا سے جاتے ہیں''

کفار کی یہ آخری آرزو تھی لیکن جس دن رسولِ اکرمؐ نے اپنا وصی اور اپنے بعد مسلمانوں کے رہبر کا تقرر فرمایا اس دن کفار کی زندگی پر خوف و ہراس و مایوسی کے سائے پھیلنے لگے اور تمام واقعات ان کے دلوں سے نکل گئے۔

(ب) تکمیلِ دین

'غدیر' کے دن ایک طرف تو حضرت رسولِ اکرمؐ کے خلیفہ و جانشین کے تقرر سے مشرکین پر مکمل مایوسی مسلط ہوگئی دوسری طرف اسی دن اسلام نے ایک مکمل آئین کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ آیہ مجیدہ میں ''اکمالِ دین'' سے مراد صرف فروعات اور مسلمانوں کے فرائض و اعمال کا بیان ہی نہیں بلکہ دین کی بقا اور استحکام کا بندوبست مستقل کرنا ہے جو آنحضرتؐ کے بعد قیادت کے تعین کے ذریعے انجام پا گیا۔ ایک فلسفیانہ اور منطقی مسلک جس پر اس کتاب میں زور دیا گیا ہے اور جس کے بغیر مؤلف کتاب کو اور کوئی صورت نظر نہیں آتی، درآنحالیکہ آئین خداوندی کا ہدف ہی حیاتِ انسانی میں ایک کامل دین کو قائم کرتا ہے، یہ ہے کہ اس دین کے قیام کے لیے رہبر دین اپنے بعد کے نظام سے متعلق پیش بینی کرے، ورنہ بصورتِ دیگر آئین ہرگز مکمل نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا اس پہلو سے دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا کہ اس دن کفار کی مکمل مایوسی کے علاوہ خود دین مقدس اسلام نہ صرف ایک باقی اور قائم رہنے والا دین بن کر سامنے آ گیا بلکہ اس کی بقائے دائمی تعین رہبر اور تکمیل دین کی صورت میں سامنے آ گئی۔ ان دونوں مفاہیم کو ذہن میں رکھ کر آیہ مجیدہ کی تلاوت کی جائے تو دونوں معانی آپس میں مربوط اور متناسب نظر آنے لگتے ہیں۔ اور اس دن کا یقین خود بخود ہو جاتا ہے۔ جس میں دونوں واقعات بہ یک وقت متحقق ہوئے۔

آیہ غدیر کے نزول کی اسناد

مسلمان مفسرین اور محدثین نے اس آیت کے روزِ غدیر نازل ہونا بیان کیا ہے۔ ہم یہاں ان میں سے بعض اسناد پیش کرتے ہیں۔

اگر مکتب تشیع کے حوالے سے حاصل ہونے والی اسناد کے ساتھ مکتب حنفی کی اسناد بھی شامل کی جائیں تو آیہ غدیر اسناد تواتر کی اعلیٰ ترین مثال بن جاتی ہیں۔

محقق حضرات ذیل میں دی گئی کتب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ تمام کتابیں علمائے اہل سنت کی تحریر کردہ ہیں۔ جس میں انہوں نے تصریح کی ہے کہ زیر بحث آیہ مجیدہ روزِ غدیر نازل ہوئی تھی۔

۱۔ ''الولایہ'' تالیف طبریؒ (۴۷۷ھ)

۲۔ تفسیر الدر المنثور، جلال الدین سیوطیؒ شافعیؒ۔ جلد ۲، ص ۲۵۹ (۹۱۱ھ) اور الاتقاق، ج ۱، ص ۳۱، (مطبوعہ ۱۳۶۰)

۳۔ تفسیر ابن کثیر شامیؒ، جلد ۲، ص ۱۴ (۴۷۷ھ)

۴۔ تاریخ ابوبکر خطیب بغدادی، جلد ۸، ص ۲۹۰ (۴۳ھ)

۵۔ فرائد السمطین، شیخ الاسلام حموینی، باب ۱۳

۶۔ مناقب، خوارزمی، ص ۹۴،۸۰ (۵۶۸ھ)

۷۔ تاریخ ابن کثیر، جلد ۵ ص ۲۱۰۱

۸۔ تذکرہ سبط ابن جوزی حنفی، ص ۱۸، (۶۵۴ھ)

علامہ عالی قدر امینی مرحوم نے ''الغدیر'' جلد ۱، ص ۲۳۰ پر آیہ تکمیل دین کے بارے میں علمائے اہل سنت کی تمام اسناد نقل کر کے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر شیعہ روایات امامت کے موضوع سے متعلق تمام کتب اور معتبر تفاسیر میں پائی جاتی ہیں۔

آیہ مبارکہ سے متعلق چند نکات

۱۔ فخر الدین رازی نے ''مفاتیح الغیب'' میں، آلوسی نے 'روح المعانی' میں اور عبدہ نے 'المنار'' میں لکھا ہے کہ اس آیہ مجیدہ کے نزول کے بعد حضرت رسولِ اکرمؐ اکیاسی دن سے زیادہ دنیا میں نہ رہے۔ اس طرح اگر آپؐ کی رحلت (کلینی کے مطابق اور اہل سنت کی روایت کی رو سے) ۱۲ ربیع الاول ہی سمجھی جائے اور محرم اور صفر کے مہینوں کو ۲۹ دن کا تسلیم کریں تو ٹھیک آیہ مجیدہ کا روزِ نزول ۱۸ ذوالحج بنتا ہے۔

۲۔ جن راویوں نے اس آیہ مجیدہ کا نزول روزِ غدیر نقل کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ حضرت رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کی خلافت کا اعلان کرنے کے بعد اس طرح ارشاد فرمایا:

الله اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمة و رضا الرب برسالتی و

بالولایة لعلی (علیه السلام) من بعدی [1]

''تکمیل دین، اتمام نعمت، میری رسالت ونبوت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتا ہوں''

ملاحظہ فرمائیں خود پیغمبر اکرمؐ نے آیہ مجیدہ میں بیان شدہ مضمون مکمل طور پر اپنے کلام میں شامل فرمایا ہے جو اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ یہ آیہ مبارکہ روزِ غدیر نازل ہوئی تھی۔

۳۔ اگر چہ قطعی اور مستقل دلائل نزول آیت کی گواہی دے رہے ہیں تاہم زیر بحث آیہ مجیدہ حرام گوشت اور حلال گوشت کی آیت کے درمیان واقع ہے۔اس میں جو نکتہ پوشیدہ ہے وہ صدرِ اسلام کے علماء سے مخفی نہیں کیونکہ تاریخ اور صحیح احادیث شاہد ہیں کہ حضرت رسول اکرمؐ آخری وقت اپنی امت کے لیے ایک وصیت نامہ لکھنا چاہتے تھے تاکہ بعد میں امت گمراہ نہ ہونے پائے ،لیکن بعض بااثر افراد کو محسوس ہوا کہ آنحضرتؐ خلافت کے بارے میں نوشتہ تحریر کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے حضور اکرمؐ پر ہذیان کی تہمت لگادی۔

یہ واقعہ اور اس طرح کے دیگر واقعات جن کو تاریخ نے نقل کیا ہے بتاتے ہیں کہ صدر اسلام میں بعض مسلمان جانشینی پیغمبر اکرمؐ اور خلافت کے بارے میں خاص طور پر حساس تھے اور اس سلسلے میں حدود وقیود کے بھی پابند نہیں تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر اکرمؐ نے اس آیہ مجیدہ کو ہر طرح کی تحریف وتغییر سے بچانے کے لیے حرام وحلال کے مسائل کے درمیان جگہ دی ہے تاکہ دشمنوں کی نظر اس پر کم سے کم پڑے اور یہ سند من وعن مسلمانوں کی آئندہ نسلوں تک پہنچ جائے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیت حکم پیغمبرؐ سے اپنی موجودہ جگہ پر رکھی گئی ہے۔اصولی طور پر ان آیات کا اپنے موجودہ مقام پر ہونا مستند بھی اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب یہ حضرت پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے رکھی گئی ہوں۔صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں جمع قرآن کی تاریخ پایہ ثبوت تک نہیں پہنچتی۔ان کا کام صرف قرآن مجید کو معرضِ تحریر میں لانا، اس کی قرأت مقرر کرنا اور مختلف قراءتوں کو منسوخ کرنا تھا۔ان امور کی تفصیل تاریخ قرآن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

نزولِ عذاب کے لیے دعا کی آیت

غدیر کے سلسلے میں نازل ہونے والی تیسری آیت وہ ہے جس میں نزولِ عذاب طلب کیا گیا ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت رسولِ اکرمؐ نے غدیرِ خم میں حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تو یہ خبر تمام اطراف میں پھیل گئی۔''نعمان بن حارث فہری'' حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور بولا:''آپؐ نے ہمیں توحید کی دعوت دی، ہم نے اسے مان لیا۔ پھر نماز، روزہ وحج وزکوٰۃ ادا کرنے کو کہا، اسے بھی ہم نے تسلیم کرلیا۔اس پر بھی آپؐ راضی ہوئے اور اب اس جوان آدمی کو (اس نے حضرت علیؑ کی طرف اشارہ کیا) اپنا جانشین مقرر کردیا ہے۔کیا یہ اقدام آپؐ نے اپنی مرضی سے کیا ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؟''

[1] کتاب شریف الغدیر ج ۱ ص ۱۱۲ کی طرف رجوع کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس خدا کی قسم، جس کے سوا کوئی خدا نہیں، یہ حکم اسی کی طرف سے ہے''۔
یہ سن کر نعمان نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور ایک جملہ کہا جس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ

(سورہ انفال:۳۲)

''اللہ سبحانہ اگر یہ حکم تیری طرف سے ہی ہے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر برسا''

اس کی یہ بات پوری ہوتے ہی آسمان سے ایک پتھر آیا اور اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍۙ ۝١ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌۙ ۝٢ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِؕ ۝٣ (سورہ معارج: ۱ تا ۳)

''مانگنے والے نے عذاب کی درخواست کی جو واقعہ ہو گیا۔ یہ عذاب کافروں کے لیے مخصوص ہے اور اس کا کوئی مدافعہ نہیں ہے۔ یہ عذاب اس خدا کی طرف سے ہے جو کہ آسمانوں کی طرف صعود کرنے والے فرشتوں کا مالک ہے''

اس آیہ مجیدہ کی شان نزول شیعہ اور سنی مفسرین اور محدثین نے جن کی تعداد تیس ہے بیان کی ہے۔[1]

اس آیہ مجیدہ کی جو شانِ نزول ہے مسلمانوں کے تمام فرقوں کے جید علماء نے اس کی تائید کی ہے سوائے ابن تیمیہؒ کے جو اہل بیت پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں حسن اعتقاد سے عاری ہے۔ وہ اپنی کتاب ''منہاج السنۃ'' میں جس کو حقیقت میں ''منہاج البدعۃ'' کہنا چاہیے۔ آیہ مبارکہ کی اس شانِ نزول پر سات اعتراضاف کرتے ہیں۔ مگر علامہ امینی مرحوم نے الغدیر کی پہلی جلد میں ان ساتوں اعتراضات کے منطقی جواب دیے ہیں ہم بڑے اختصار کے ساتھ ان میں بعض اعتراضات اور ان کے جوابات نقل کرتے ہیں۔

۱۔ واقعہ غدیر حجۃ الوداع سے واپسی پر پیش آیا جب کہ آیہ زیر بحث کی شانِ نزول میں یہ ہے کہ نعمان حضورؐ کی خدمت میں مکہ کے گرد و نواح میں ''ابطح'' کے علاقے میں حاضر ہوا تھا۔

جواب: سیرۃ حلبی اور سبط ابن جوزی وغیرہ کی روایات میں بتایا گیا ہے کہ نعمانی مدینہ پہنچنے کے بعد مسجد نبوی میں رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں آیا تھا اور وہاں یہ باتیں ہوئی تھیں۔

دوسرے ہر ریتیلے علاقے کو یا جہاں سے سیلاب گزرا ہو ابطح کہتے ہیں۔ محقق حضرات کا لغت سے رجوع کرنا اس معاملہ میں کافی ہے۔

۲۔ سورہ معارج مکی ہے اور واقعہ غدیر سے دس برس پہلے نازل ہوئی تھی۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ یہ ایسے حادثہ کی نشاندہی کرے جو واقعہ

---

[1] الغدیر جلد ۱، ص ۲۳۹ تا ۲۴۶

غدیر کے بعد رونما ہوا؟

جواب: مکی اور مدنی سورتوں کا فیصلہ ہر سورہ کی آیات کی اکثریت پر مقامِ نزول کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ کئی مکی سورتیں ایسی ہیں جن کی کئی آیات مدینہ میں نازل ہوئیں اور اس کے برعکس بھی اسی طرح ہے جو قرآن ملک عرب میں چھپتے ہیں۔ ان میں ہر سورہ کے شروع میں مکی یا مدنی چھپا ہوتا ہے ان کی طرف رجوع کرنے سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

۳۔ آیہ مبارک

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ (سورہ انفال: ۳۲)

جنگ بدر کے بعد اور واقعہ غدیر سے پہلے نازل ہوئی۔

جواب: یہ بالکل بچگانہ اعتراض ہے کیونکہ بحث یہ نہیں ہے کہ یہ آیہ کب نازل ہوئی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ یہ جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی تھی۔ لیکن بحث تو آیہ عذاب کے بارے میں ہے اور پہلی آیت اگر اس آیہ عذاب کے واقعہ سے متعلق ہونے کی بنا پر دوسری دفعہ نازل ہوگئی ہو پھر بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۴۔ آیہ مبارکہ

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ (سورہ انفال: ۳۳)

''اے حبیبؐ جب تک آپؐ ان میں ہیں یا جب تک یہ توبہ واستغفار کر رہے ہیں، میں ان پر عذاب نہیں بھیجوں گا''۔

اس بات کا ثبوت ہے کہ حضورؐ کی موجودگی میں عذاب آ ہی نہیں سکتا۔

جواب: جس عذاب کے نہ آنے کی ضمانت یہ آیہ مبارکہ دے رہی ہے اس سے مراد وہ عذاب ہیں جو پوری امت یا ایک طبقے کو مکمل برباد کر دیں، جیسا کہ پہلی امتوں پر آتا رہا ہے، نہ کہ کسی ایک فرد پر اور وہ بھی جو خود نزولِ عذاب کی درخواست کرے۔ اس کی اور مثالیں بھی تاریخ میں مل جائیں گے جیسے حضرت رسولِ اکرمؐ نے ''اسود بن مطلب'' اور ''مالک بن ظلالہ'' پر لعنت کی اور ان پر عذاب نازل ہوا۔

۵۔ اگر اس طرح کا کوئی واقعہ رونما ہوا ہوتا تو واقعہ 'اصحاب فیل' کی طرح مشہور ہو جاتا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک واقعہ جو ایک فرد واحد سے متعلق ہو اس واقع کی نسبت بہت زیادہ غیر اہم ہوگا جو ایک پوری امت کے ساتھ پیش آیا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ واقعہ اصحاب فیل کو مشہور کرنے والے بہت سے لوگ تھے جب کہ یہاں فضائلِ علیؑ کو چھپانے والے زیادہ تھے۔ اس کے باوجود تیس علماء کا اس واقعہ کے بارے میں لکھنا اللہ تعالیٰ کی عنایت سے کم نہیں کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حجت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتایا ہے۔

۶۔ شانِ نزول کے مطابق نعمان پانچواں اصولِ دین کو مانتا تھا پھر اس پر عذاب کیسے نازل ہوا؟

جواب: یہ غلط ہے۔ شانِ نزول تو یہ بتا رہی ہے کہ اس نے نہ صرف رسولِ اکرمؐ کے فرمان کا انکار کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس نے کہا: ''اگر خلافت پر علیؑ کا تقرر اللہ کی طرف سے ہے تو مجھ پر عذاب نازل ہو۔ اس سے زیادہ ارتداد اور کیا ہوگا؟''

۷۔ جن کتب میں حضورِ اکرمؐ کے صحابہ کرامؓ کے نام آتے ہیں ان میں نعمان بن حارث کا کہیں ذکر نہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کے صحابہ کرامؓ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کتب و تراجم میں بیان کی گئی ہے۔ ہر ایک مولف نے اپنی معلومات کے مطابق صحابہ کرامؓ کے نام لکھے ہیں۔ محققین ''الاستیعاب''، ''اسد الغابہ'' اور ''والاصابہ'' نامی کتابوں سے اور ان کتب سے رجوع کریں جو ان کے بارے معرض تحریر میں آئی ہیں۔[1]

---

[1] الغدیر جلد ۱، ص ۲۴۸ تا ۲۶۶

(۱۶)

بعثت سے قبل حضرت رسولِ اکرمؐ اور ان کے آباؤ اجداد کا مذہب

حضرت رسولِ اکرمؐ کی حیات طیبہ کے، قرآن مجید کے حوالے سے، ہم نے مختلف پہلو پیش کیے۔ اکثر مواقع پر ہم نے حضورِ اکرمؐ کے تابناک کردار کی طرف اشارہ کیا۔ صرف ایک پہلو باقی ہے وہ یہ کہ بعثت سے پہلے آپؐ کس دین پر تھے۔ اس عنوان پر بہت کم قلم اٹھایا گیا ہے۔ جن حضرات نے اس پہلو پر قلم اٹھایا بھی ہے انہوں نے اتنا مبہم اور الجھا ہوا تاثر پیش کیا ہے کہ صحیح صورت حال علمی مباحث اور کثیر احتمالات میں دب کر رہ گئی ہے۔ ہم نے اس حصے کو، جو اگرچہ آپؐ کی حیات طیبہ کے ابتدائی دور سے متعلق ہے، آخری عنوان کے طور پر شروع کیا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ قارئین کرام کو واضح دلائل کی روشنی میں آنحضرتؐ کے قبل بعثت دینی رجحانات سے روشناس کروائیں۔

بعثت سے پہلے کہ زمانہ میں حضرت رسولِ اکرمؐ کے مذہب کو جاننے کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم آنحضرتؐ کے آباؤ اجداد کے دین و اعمال سے آشنا ہوں۔ کیونکہ عام طور پر کسی بچے کی ہدایت و ایمان، یا گمراہی و کفر اس درخت کی شاخ کی طرح ہوتا ہے جو اس گھر میں اگتا اور پھلتا پھولتا ہے جہاں وہ بچہ پیدا ہوا ہے چنانچہ اگر حضرت عبد المطلب، ابو طالبؑ اور آنحضرتؐ کے والدین علیہما السلام جیسی شخصیات کا ایمان اور تصورِ توحید واضح ہو جائے تو آنحضرتؐ کے قبل بعثت معیارِ تصورِ توحید میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

اس مقصد کے پیش نظر اس موضوع پر مفصل اور مدلل گفتگو سے پہلے آپؐ کے آبا و اجداد اور خاندانِ بنی ہاشمؑ کے تصورات دین کی تشریح کریں گے اور اس کے بعد قبل بعثت آنحضرتؐ کے تصورات دینی پر گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلے آنحضرتؐ کے دادا حضرت عبد المطلبؑ والدِ گرامی حضرت عبداللہ، والدہ گرامی حضرت آمنہؑ اور آپؐ کے چچا حضرت ابو طالب کے بارے میں باری باری گفتگو کرتے ہیں۔ ان چاروں شخصیات کی دینی کیفیت کی تفصیل اس طرح ہے:

(الف) ایمان حضرت عبد المطلب

یہاں ایمان سے مراد اللہ تعالیٰ کے وجود پر یقین و اعتقاد مقصود نہیں کیونکہ اس زمانہ میں چند لوگوں کے علاوہ عربوں کی اکثریت خدائے واحد پر یقین رکھتی تھی۔ عربوں کا خدائے واحد پر یقین رکھنا حضرت ابراہیمؑ کے آثار سے تھا۔ اس بحث میں 'ایمان' سے مراد توحید پرستی اور بت پرستی سے پرہیز و اجتناب ہے۔ جس پر عربوں کی واضح اکثریت متفق تھی اور چند افراد کے علاوہ سب لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن اکابرین بنی ہاشم اس نجاست سے پاک تھے۔

اگرچہ ان میں بھی ابولہب جیسے چند افراد ماحول سے متاثر ہو کر بت پرستی کی حمایت کرتے تھے، جہاں تک حضرت عبد المطلب کے

اخلاص وتصوراتِ توحید کا تعلق ہے اس کے لیے کافی ہے کہ ہم مورخین کے تبصروں کا مطالعہ کریں۔

۱۔ تیسری صدی کا مورخ یعقوبی لکھتا ہے:

''حضرت رسولِ اکرمؐ کے دادا عبد المطلبؑ کو بت پرستی سے نفرت تھی اور وہ خدائے واحد کی عبادت کرتے تھے۔ انہوں نے خدائے واحد کے لیے اپنی نذر کا ایفا کیا اور ہمیشہ ان امور پر عمل پیرا رہے جن کی تائید وحی الٰہی سے ہوتی ہے اور جن کی طرف رسولِ اکرمؐ کی سنت اشارہ کرتی ہے۔[۱]

۲۔ جب 'ابرہہ' بیت اللہ کو منہدم کرنے کے لیے مکہ پر حملہ آور ہوا اس وقت آپ کی توحید پرستی اور بتوں سے بیزاری بڑی واضح صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب آپؑ کو ابرہہ کے ارادہ کی خبر ہوئی اور انہیں معلوم ہوا کہ اس کی فوج نے آپؑ کے اونٹوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے تو آپؑ فوراً فوجی مستقر پر تشریف لے گئے۔ اس نے آپؑ کا بڑا احترام و اکرام کیا۔ آپؑ نے اس سے صرف یہ درخواست کی کہ اپنی فوج کو حکم دے کہ غصب کیے گئے اونٹوں کو واپس کر دیا جائے۔

ابرہہ کو اس کی خطرناک مہم کے مقابلہ میں اس معمولی سی استدعا پر حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے وہاں آیا تھا۔ اس نے کہا: ''حیرت ہے کہ میں تو اس گھر کو منہدم کرنے آیا ہوں جو آپ کے قبیلہ اور بزرگوں کا مایۂ افتخار ورثہ ہے اور آپ صرف اپنے اونٹوں کی واگزاری کی بات کر رہے ہو؟ مناسب تو یہ تھا کہ آپ مجھ سے درخواست کرتے کہ میں اپنے انہدام کعبہ کے ارادہ سے باز رہوں۔

حضرت عبد المطلب نے نہایت اطمینان اور کمال متانت سے جواب دیا: ''میں اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور ان کا مطالبہ کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس گھر کا بھی ایک مالک ہے جو اس کی حفاظت کرتا ہے''۔

'ابرہہ' نے کہا: ''مجھے اپنے ارادہ سے کوئی نہیں روک سکتا''

یہ کہہ کر ابرہہ نے حکم دیا کہ اونٹوں کو چھوڑ دیا جائے۔ حضرت عبد المطلبؑ نے اپنے اونٹوں کے واگزار ہوتے ہی ان سب کو کعبہ کی نذر فرما دیا۔ انہیں حرم میں آزاد کر دیا تا کہ ان پر ہر قسم کی دست درازی اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث بن جائے۔ پھر آپ قریش کے پاس آئے اور سب کو ابرہہ کے ارادہ سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد سب کے سب کعبہ کی طرف گئے، خانہ کعبہ کی کنڈی پکڑی اور اللہ تعالیٰ سے استدعا کی:

''بارالہا! تیرے علاوہ مجھے کسی پر بھروسہ نہیں، اپنے گھر کو ان ظالموں سے محفوظ فرما۔ تیرے گھر کا دشمن خود تیرا دشمن ہے۔ ان کو انہدام کعبہ کے ارادے سے باز رکھ''[۲]

اگر آنحضرتؐ کے آباء بت پرست ہوتے تو اس نازک اور مشکل وقت میں دیگر مشرکین کی طرح بتوں کو پکارتے اور ان کے سامنے دست حاجت دراز کرتے۔

---

[۱] تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۸

[۲] سیرۃ ابن ہشام جلد ۱، ص ۵۰ کامل ابن اثیر جلد ۱، ص ۱۲

۳۔ ایک مرتبہ مکہ میں خشک سالی واقعہ ہوئی، بارش نہ ہوئی۔ قریش مل کر حضرت عبدالمطلبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؑ سب کو لے کر کوہِ ابوقبیس پر تشریف لے گئے۔ حضرت رسولِ اکرمؐ اس وقت لڑکپن کی عمر میں تھے۔ آپؐ کے دادا نے ان کو بھی ساتھ لے لیا اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح راز و نیاز فرمایا:

''بارالٰہا! یہ تیرے بندے، کنیزیں اور ان کے بچے ہیں۔ تو ان سے اور مسلسل خشک سالی کے باعث ان کی مشکلات سے اچھی طرح واقف ہے۔ بارالٰہا! جانور ہلاک ہو گئے ہیں اب کچھ باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ یہ خود ہلاک ہو جائیں۔ خداوندا! اس قحط کو فراوانی رزق میں تبدیل فرما دے''

حضرت عبدالمطلبؑ ابھی رب کریم سے راز و نیاز میں مصروف تھے کہ رحمت حق جوش میں آ گئی، موسلا دھار بارش ہونے لگی اور جنگل و بیابان جل تھل ہو گئے۔ اس موقع پر شعرا نے عبدالمطلبؑ کی تعریف میں قصائد کہے جن کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

مبارك الامم يستى الغمام به

ما فى الانا م له عدل ولاخطر [1]

''وہ نام کتنا مبارک ہے جس کے وسیلہ سے بارانِ رحمت کی دعا کی جاتی ہے۔ بے شک ساری دنیا میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے''۔

اس موقع پر حضرت ابو طالب نے بھی ایک قصیدہ کہا جو سیرۃ حلبی اور تاریخ کی دیگر کتب میں موجود ہے۔

۴۔ شہرستانی نے الملل والنحل میں حضرت عبدالمطلبؑ کی دعائے استسقاء کو بہتر طریقہ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''ایک دفعہ تقریباً دو سال تک مکہ میں بالکل بارش نہ ہوئی۔ حضرت عبدالمطلبؑ نے حضرت ابو طالبؑ سے فرمایا کہ میرے بیٹے 'محمدؐ' کو لاؤ جو اس وقت شیر خوارگی کی عمر میں تھے۔ حضرت عبدالمطلبؑ نے آنحضرتؐ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا، کعبہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور یوں عرض کیا: ''بارالٰہا! اس بچہ کے صدقہ میں ہمیں اپنی بارانِ رحمت سے سیراب فرما''۔ اس دعا کے دوران آپؑ اپنے بیٹے کو ہوا میں اچھالتے اور پکڑتے رہتے اور آپ کی دعا مقبول ہوئی۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس قدر بارش ہوئی کہ لوگوں کو خطرہ ہونے لگا کہ مسجد الحرام ہی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

اس کے بعد شہرستانی لکھتا ہے:

''حضرت عبدالمطلبؑ نور محمدؐ کے بارے میں اپنی اولاد کو نیکی کا حکم دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس دنیا کے

---

[1] سیرۃ حلبی جلد ۱، ص ۱۳۱ تا ۱۳۳

بعد ایک اور دنیا ہے جہاں نیکی کرنے والوں کو جزا اور بدکاروں کو ان کے اعمال کی سزا ملے گی''۔[1]

۵۔ حضرت عبدالمطلب کے چشمۂ آبِ زمزم جاری کرنے کے بعد آپؑ سے قریش کے دیگر افراد نے اختلاف کیا۔ فیصلہ ہوا کہ ایک کاہن سے جو شام میں رہتا تھا، رجوع کیا جائے۔ آپؑ راضی ہو گئے اور سب شام کی طرف روانہ ہوئے۔ نصف راستے میں قافلہ والوں پر پیاس کا اس قدر غلبہ ہوا کہ سب کو موت نظر آنے لگی۔ اس وقت یہ طے ہوا کہ ہر شخص اپنے لیے قبر کھود لے تا کہ جب وہ مر جائے تو ساتھ کھڑا ہوا آدمی اس کو اس قبر میں دفن کر دے۔ اس طرح سوائے آخری مرنے والے آدمی کے سب کی لاشیں دفن ہو جائیں گی اور وہ درندوں کی خوراک نہ بنیں گے۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنی قبر کھود لی اور سب موت کا انتظار کرنے لگے۔ سب لوگ اسی انتظار میں تھے کہ اچانک حضرت عبدالمطلبؑ نے فرمایا: ''اٹھو! اس صحرا میں چل پھر کر دیکھیں شاید کہیں پانی مل جائے کیونکہ اس طرح مایوس ہو کر بیٹھنا اور موت کا انتظار کرنا کمزوری کے سوا کچھ نہیں''۔ چنانچہ صحرا میں تلاش شروع ہوئی اور لوگ ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اچانک حضرت عبدالمطلبؑ کے اونٹ کے پاؤں کے نیچے سے پانی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ عبدالمطلبؑ اور آپؑ کے ساتھیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ سب نے سیر ہو کر پانی پیا، برتن بھی پانی سے بھر لیے۔ اسی جگہ حضرت عبدالمطلبؑ کے سب مخالفین اختلافات سے دستبردار ہو گئے اور کہنے لگے: ''جس خدا نے اس ریگستان میں آپ کو اس عمدہ پانی سے نوازا ہے، یقیناً آبِ زمزم پر بھی اسی نے آپؑ کو اختیار دیا ہے۔ لہٰذا سب لوگ واپس چلیں اور آپؑ حاجیوں کو سیراب کرنے کے عہدہ کی سرپرستی فرمائیں''۔

۶۔ ام ایمنؓ کہتی ہیں کہ صحرا سے واپسی کے بعد حضرت رسولِ اکرمؐ کی پرورش میرے سپرد کی گئی۔ ایک روز مجھ سے غفلت ہو گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ حضرت عبدالمطلبؑ تشریف لائے۔ مجھ سے کہا ''میرا یہ بچہ سدرہ'' سے بلند تر مقام سے مجھے حاصل ہوا ہے۔ اس کے بارے میں غفلت مت کرو۔ اہل کتاب کہتے ہیں کہ یہ اس امت کا نبیؐ ہے اور میں اس کے بارے میں ان کے شر سے امان نہیں پاتا، ام ایمن ہوشیار ہو گئیں۔ حضرت عبدالمطلبؑ کھانا کھانے سے پہلے فرماتے: ''میرے بیٹے کو لے آؤ''۔ کبھی ان کو پہلو میں بٹھا لیتے، کبھی گود میں اور ہر بات میں ان کو اپنے آپ پر مقدم رکھتے''۔[2]

۷۔ جب حضرت عبدالمطلبؑ کا وصال قریب ہوا تو آپؑ نے مکہ کی حکومت اور خانہ کعبہ سے متعلق معاملات اپنے بیٹے 'زبیر' کے سپرد کیے، زمزم سے عوام کی سیرابی اور حضرت رسولِ اکرمؐ کی کفالت حضرت ابوطالبؑ کے سپرد کی۔ آپؑ نے حضرت رسولِ اکرمؐ کے وجود کو اپنے خاندان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شرفِ عظیم قرار دیا۔ آخری وقت میں آپؑ نے چند اشعار کہے جن کا مضمون یہ تھا کہ حضرت رسولِ اکرمؐ کو ہر حالت میں دشمنوں کی گزند سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے۔[3]

تاریخ کی ان واضح شہادتوں کے بعد حضرت عبدالمطلبؑ کے ایمان اور توحید پرستی میں کوئی شک وشبہ نہیں رہنا چاہیے۔ جس شخص پر

---

[1] الملل والنحل شہرستانی، ج ۲، ص ۲۴۸

[2] سیرۃ زینی دحلان، حاشیہ سیرتِ حلبی جلد ۱، ص ۶۴

[3] تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۱۰

اللہ تعالیٰ کی اتنی مہربانیاں ہوں، ممکن نہیں کہ وہ خدائے واحد کی عبادت کو چھوڑ کر لکڑی یا دھات کے بنے ہوئے بتوں سے متوسل ہو جائے۔

حضرت رسولِ اکرمؐ کی وفات، آنحضرتؐ کی عترت کی خلافت کے اعلان اور عثمانی محدثین کے پیدا ہو جانے کے بعد حضرت رسولِ اکرمؐ کے آباؤ اجداد کے فضائل کو زیب طاقِ نسیان کر دیا گیا کیونکہ اس گھر سے متعلق ہر قسم کی کرامت وفضیلت کا بیان سرفرازی امام کو واضح کرتی تھی۔ لہٰذا ان محدثین کا مشن ہی یہ تھا کہ اس گھر کے افراد کے عزوشرف کو جس حد تک ہو سکے تاریخ میں ذکر نہ کریں۔ پس جتنا کچھ تاریخ میں آ چکا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم کی وجہ سے دشمن کی دست برد سے محفوظ رہ سکا ہے۔

(ب) بعثتِ حضرت رسولؐ اکرم سے پہلے ایمان حضرت ابوطالبؑ

اس خوف سے کہ کہیں حضرت علیؑ کے وقار و منزلت میں اضافہ نہ ہو حکومتوں اور ان کے سیاسی مشیروں نے حضرت علی کے والد گرامی کے دین وایمان کو چھپایا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان کو ایک غیر مسلم ثابت کریں۔ حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے جتنے دلائل تاریخ میں موجود ہیں اگر کسی اور شخص کے بارے میں اس کا دسواں حصہ بھی ہوتے تو وہ بہت بڑا صحابی، دیندار، متقی اور حضرت رسولِ اکرمؐ کا جانثار مشہور ہوتا۔ مگر چونکہ یہ دلائل حضرت علیؑ کے والد ماجد کے حق میں ہیں اس لیے تعصب کے دبیز پردوں میں حقیقت کو چھپا دیا گیا ہے۔ البتہ آپؑ کے ایمان کے بارے میں کتابیں اور بے شمار رسالہ جات لکھے گئے ہیں۔ ہم نے بھی اپنی کتاب ''فروغِ ابدیت'' میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ چنانچہ یہاں ہم کسی قدر اختصار سے کام لیں گے اور اپنی بحث کو دو حصوں میں تقسیم کریں گے۔

(الف) حضرت رسولِ اکرمؐ کی بعثت سے قبل حضرت ابوطالبؑ کی توحید پرستی

ا۔ طلبِ رحمت میں پیغمبر اکرمؐ سے توسل

حضرت عبدالمطلبؑ کی رحلت کے بعد حضرت رسولِ اکرمؐ کی حفاظت حضرت ابوطالبؑ کے ذمہ تھی۔ انہی دنوں ایک بار پھر مکہ اور اس کے گرد و نواح میں شدید خشک سالی کا حملہ ہوا۔ قریش رسولِ اکرمؐ کے عم محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ان کے لیے طلب رحمت کریں۔ ابو طالبؑ نے اپنے بھتیجے کو ساتھ لیا، جو سورج کی طرح پرنور تھے جس کے گرد تاریک بادل چھائے ہوئے ہوں اور خانہ کعبہ کے پاس تشریف لے گئے۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کو اس طرح اپنے ہاتھوں پر اٹھایا کہ آپؐ کی پشت مبارک دیوار کعبہ سے لگی ہوئی تھی۔ حضرت ابوطالبؑ نے آپؐ کی طرف اشارہ کر کے اور آپؐ کا واسطہ دے کر بارانِ رحمت کی دعا شروع کی۔ اس وقت تک آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہ تھا۔ آپ کی دعا مقبول ہوئی۔ گھٹائیں گھر کر آ گئیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بستیاں اور صحرا سب جل تھل ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت ابوطالبؑ نے پیغمبر اکرمؐ کی شان میں ایک قصیدہ کہا جو ہر مشہور تاریخی اور ادبی کتاب میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

وابیض یستسقی الغمام بوجهه
ثمال الیتامی عصمة الارامل [۱]

''وہ رخ انور جس کے وسیلہ سے بارانِ رحمت کی دعا کی جاتی ہے، یتیموں کا ملجا اور بیواؤں کا سہارا ہے''

حضرت ابو طالبؑ نے یہ قصیدہ اس وقت کہا تھا جب تمام بنی ہاشم شعب ابی طالبؑ میں محصور تھے۔ اس قصیدہ میں انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی اور دین مقدس اسلام کے ساتھ اپنے لگاؤ اور اس پر ایمان کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اگر حضرت ابو طالبؑ کی زندگی میں دعائے استسقاء اور اس قصیدہ کے علاوہ حضورِ اکرمؐ پر ایمان کی کوئی دوسری دلیل نہ بھی ہوتی تو آپؑ کا ایمان مسلّم تھا۔

۲۔ حضرت ابو طالبؑ کو اپنے فرزند حضرت علیؑ کی ولادت کے بارے میں ایک زاہد کی بشارت

اس زمانہ میں ایک بہت پرہیزگار آدمی اپنے زہد وتقویٰ میں مشہور تھا۔ اس نے ایک دن حضرت ابو طالبؑ سے عرض کیا: ''مجھے الہام ہوا ہے کہ آپؑ کے ہاں عنقریب ایک بچہ پیدا ہوگا جو اللہ کا ولی ہوگا''۔ چنانچہ جس دن حضرت علیؑ خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے تو حضرت ابو طالبؑ نے اس مردِ زاہد کو اطلاع دی۔ وہ آیا اور مکہ کے عوام کی موجودگی میں سب نے دیکھا کہ حضرت ابو طالبؑ نے اپنی زوجہ محترمہ سے اپنا بچہ گود میں لیا اور آسمان کی طرف بلند کر کے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ بچہ کا نام رکھنے میں ان کی مدد فرمائی جائے۔ ہاتف کی آواز آئی:

فاسمه فی شامخ العلی
علی اشتق من العلی [۲]

''اس بچے کا نام اللہ تعالیٰ جو ارفع و اعلیٰ ہے، سے مشتق ہے اور وہ نام 'علیؑ' ہے۔

۳۔ حضرت ابو طالبؑ اپنے بھتیجے کو اپنے ساتھ شام لے جاتے ہیں

قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا تھا۔ قرار پایا کہ حضرت ابو طالبؑ بھی اس قافلے کے ساتھ بغرض تجارت شام جائیں گے۔ آپؑ کا ارادہ تھا کہ پیغمبر اکرمؐ کو اپنے گھر والوں کے پاس مکہ میں ہی چھوڑ جائیں، مگر عین رخصت کے وقت حضورؐ آبدیدہ ہو گئے اور چچا کی جدائی پر اداس ہو گئے۔ شفیق چچا سے رہا نہ گیا اور آپؑ نے اپنے پیارے بھتیجے کو بھی اپنے ساتھ شام لے جانے اور بارہ سالہ بچہ کے لیے صعوباتِ سفر برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سفر میں ابو طالبؑ نے ''بحیرا نامی'' ایک عیسائی راہب کو حضور اکرمؐ کی طرف خاص توجہ کے ساتھ مائل پایا۔ راہب نے بڑی صراحت کے ساتھ بتایا کہ یہ 'بچہ' وہی پیغمبر آخر الزمانؐ ہے جس کے بارے میں حضرات موسیٰ و عیسیٰ پیش گوئی کر چکے ہیں۔ راہب نے یہ بھی کہا کہ یہودیوں نے اگر آنحضرتؐ کو پہچان لیا تو ان کو قتل کرنے کے درپے ہو جائیں گے۔

---

[۱] سیرۃ حلبی جلد ۱، ص ۱۱۶ سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۲۷۳ تا ۲۸۰
[۲] سیرۃ ابن ہشام جلد ۱، ص ۱۸۲ طبقات کبریٰ جلد ۱، ص ۱۲۰

ایک ناواقف راہب سے یہ بات سن کر ایک عام بے غرض آدمی بھی آنحضرتؐ پر ایمان لانے پر مائل ہو جائے گا، پھر حضرت ابو طالبؑ تو اپنے بھتیجے کے لیے مجسمۂ عشق و اخلاص تھے۔

۴۔ حضرت ابو طالبؑ پر حضرت عبدالمطلبؑ کو مکمل اعتماد تھا

تمام دیگر مسائل سے قطع نظر مورخین متفق ہیں کہ حضرت عبدالمطلبؑ نے حضرت ابو طالبؑ کو پیغمبر اسلامؐ کا سرپرست مقرر فرمایا تھا۔ کیا حضرت عبدالمطلبؑ جیسی سرشارِ توحید و اخلاص شخصیت اپنے پوتے کو جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ یہ نبی آخرالزمانؐ ہے، کسی مشرک کی یا بت پرست کے زیر کفالت دے سکتی تھی اور مستقبل کے ایک بت شکن بچہ کو ''بتوں کے پوجنے والے'' کے سپرد کر سکتی تھی؟ فہم عامہ کا تقاضہ ہے کہ اگر حضرت عبدالمطلبؑ اور ابو طالبؑ کے نظریات دینی مشترک نہ ہوتے تو وہ کبھی قریش کی قیادت اور حضور اکرمؐ کی کفالت ابو طالبؑ کے سپرد نہ کرتے۔

حضرت ابو طالبؑ نے اپنے اشعار میں اس وصیت کا تذکرہ فرمایا ہے:

راعیت فیه قرابة موصولة
وحفظت فیه وصیة الاجدادً[1]

''میں نے (حضورِ اکرمؐ کے ساتھ) حسن سلوک کے بارے میں اپنے آبا و اجداد کی وصیت پر عمل کیا ہے یعنی اگر میں ان پر اپنی جان قربان کرتا ہوں تو یہ اس سفارش کے مطابق ہے جو محمدؐ کی حفاظت کے بارے میں میرے بزرگوں نے مجھے کی ہے''

محولہ بالا چار واقعات اور اس طرح کے کئی دوسرے مشاہدات جو تمام حضرت رسولِ اکرمؐ کی بعثت سے پہلے رونما ہوئے، روزِ روشن کی طرح ایمانِ حضرت ابو طالبؑ کو ثابت کرتے اور تمام شکوک و شبہات کو ختم کر دیتے ہیں۔

اب ہم وہ واقعات پیش کرتے ہیں جو حضرت رسولِ اکرمؐ کی بعثت کے بعد رونما ہوئے اور ایمان ابو طالبؑ پر حجت بنتے ہیں۔ یہ دلائل اتنے زیادہ ہیں کہ ہمارے لیے ان کے دسویں حصہ کا بیان بھی ان صفحات میں ممکن نہیں۔

بعثت رسولؐ کے بعد ایمان ابو طالب

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا کہ حضرت ابو طالبؑ کے اپنے بھتیجے پر ایمان کے ثبوت میں بیشمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کی حقیقت ایمان بالکل واضح ہے، تاہم ایمانِ ابو طالبؑ کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں دو طرح کی رکاوٹیں ہیں۔ ایک رکاوٹ تو دور کی جا سکتی ہے، مگر دوسری دور نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] طبقات کبریٰ جلد ۱، ص ۱۲۰

سادہ لوح مسلمانوں کے دل میں ایمانِ ابوطالبؑ کے بارے میں شک پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جناب ابوذرؓ اور ابن مسعودؓ وغیرہ کی طرح مسجد الحرام میں آ کر اپنی زبان سے ایمان کا اقرار کیوں نہیں کیا اور اپنے آپ کو صرف اپنے بھتیجے کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے تک کیوں محدود رکھا؟

مسلمانوں کے ایک اور طبقے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ان کے لیے مشکل یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ حضرت علیؑ کے والد ماجد ہیں جو خود مومنین کے امیر ہیں۔ اگر ایمان ابوطالبؑ ثابت ہو جائے تو حضرت علیؑ کے لیے یہ بات باعث فضیلت ہوگی کیونکہ دوسرے خلفاء اس فضیلت سے محروم ہیں۔

اول الذکر طبقہ کے شکوک تاریخی دلائل سے دور کیے جا سکتے ہیں مگر موخر الذکر طبقہ کی کیفیت علمی بحث سے دور نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ ہم یہاں حضرت رسولِ اکرمؐ پر حضرت ابوطالبؑ کے مکمل ایمان کے دلائل پیش کرتے ہیں تا کہ پہلا طبقہ غور و خوض کے بعد اپنی غلط فہمی دور کر لے۔ دوسرے طبقے کیلئے بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہیں کہ ان کے دلوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ حقیقت کو پا سکیں کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ ''مقلب القلوب'' ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں گوش شنوا اور چشم بینا مرحمت فرمائے۔ پس ایمان ابوطالب کے حق پر یہ دلائل ہیں:

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی تین دلیلیں

کسی شخص کی ذہنیت کو سمجھنے کیلئے سب سے زیادہ اطمینان بخش طریقہ یہ ہے کہ مندرجہ ذیل تین امور میں اس کا نظریہ جانچا جائے

۱۔ متعلقہ امور سے متعلق اس کی گفتگو

۲۔ متعلقہ امور سے متعلق اس کا کردار

۳۔ اس کے حق میں اس کے اعزاء کے خیالات

حضرت رسولِ اکرمؐ پر حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے سلسلے میں ہم مذکورہ بالا سہ گانہ نکات کا باری باری جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں ہم کہاں پہنچتے ہیں۔

ابوطالبؑ کے یادگار آثار ادبی

حضرت ابوطالبؑ کے طویل قصائد سے ہم چند قطعات پیش کرتے ہیں اور ان کی وضاحت کے لیے ان کا ترجمہ بھی کریں گے۔

لیعلم خیار الناس ان محمدا
نبی کموسی والمسیح بن مریم

اتانا بهدی مثل ما اتیا به
فکل با مر الله یهدی و یعصم[1]

''شریف اور سمجھدار افراد جانتے ہیں کہ محمدؐ حضرت موسیٰ وعیسیٰؑ کے مانند نبی ہیں۔ان کے پاس بھی وہی نورِ ہدایت ہے جو ان دونوں کے پاس تھا۔تمام انبیاء اللہ تعالیٰ کے حکم سے لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں اور انہیں گناہ سے روکتے ہیں''۔

تمنسیتم ان تقتلوه وانما
اما نیکم هذی کا حلام نائم
نبی اتاه الوحی من عندربه
و من قال لا یقرع بهاسن نادم

''سردارانِ قریش کا خیال ہے کہ اس پر ہاتھ اٹھا سکتے ہیں لیکن ان کی یہ خواہش ایک خواب پریشان ہے کیونکہ وہ (محمدؐ) تو پیغمبرؐ ہیں۔ان پر خداوند تعالیٰ کی جانب سے وحیٔ نازل ہوتی ہے۔جو اس حقیقت کا منکر ہوگا وہ حیران و پریشان ہوکر رہ جائے گا''۔

الم تعلموا انا و جدنا محمدا
رسولا کموسیٰ خط فی اوّل الکتاب
و ان علیه فی العباد محبة
ولا حیف فیمن خصه الله بالحب[2]

''(قریس کے لوگو!) کیا تم نہیں جانتے کہ ہم نے حضرت (محمدؐ) کو حضرت موسیٰؑ جیسا پیغمبر پایا ہے اور ان کا ذکر پہلی آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔لوگ ان سے خاص قسم کی محبت رکھتے ہیں۔لہٰذا اس شخص پر ظلم کرنا روا نہیں جس کی محبت خدا لوگوں کے دلوں میں ڈال دے''۔

والله لن یصلوا الیك بجمعهم
حتی اوسد فی التراب وفینا
وابشر بذاك وقرمنك عیوناً

---

[1] دیوانِ ابوطالبؑ ص ۲۲، سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۳۷۳

[2] شرح ابن ابی الحدید، ج ۱۴، ص ۷۴ و دیوانِ ابوطالبؑ، ص ۱۷۳

ودعوتنی و علمت انك ناصحی

و لقد دعوت و کنت ثم امینا

و لقد علمت ان دین محمد

من خیر ادیان البریه دینا[1]

''میرے پیارے بھتیجے! قریش کبھی تم پر قابو حاصل نہیں کریں گے جب تک کہ میں قبر میں نہ پہنچ جاؤں اور مٹی میں نہ مل جاؤں۔ میں کبھی تیری محبت سے دستبردار نہ ہوں گا۔ جس فرض پر تم مامور ہوا سے واضح کیے جاؤ کسی چیز سے خوف نہ کھاؤ، لوگوں کو بشارت دو اور ان کی آنکھیں روشن کرو، مجھے تم نے دین کی دعوت دی اور میں جانتا ہوں کہ تم میرے ناصح ہو، اپنی دعوت میں امین اور صحیح ہو۔ خدا کی قسم محمدؐ کا دین بہترین دین ہے''۔

اوقو منوا بکتاب منزل عجیب

علی نبی کموسی او کذی النون[2]

''کیا تم اس کتاب (قرآن مجید) پر ایمان لانے پر تعجب کرتے ہو جو حضرت موسیٰ اور حضرت یونسؑ کی طرح کے نبیؐ پر نازل ہوا ہے''

ان میں سے ہر قطعہ حضرت ابوطالب کے طویل اور خوبصورت قصائد سے بطور نمونہ لیا گیا ہے۔ ان کو ہم نے اس لیے منتخب کیا ہے کہ ان سے ایک نظر میں ابوطالبؑ کے اپنے بھتیجے پر ایمان رکھنے کی صراحت ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان اشعار کا ہر شعر شاعر کے ایمان اور خلوص کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان اشعار کا کہنے والا کوئی اور اغراض و تعصّبات سے خارج شخص ہوتا، اس کے ایمان پر سب متفق ہوتے مگر چونکہ یہ اشعار حضرت ابوطالبؑ نے کہے ہیں اور بنوامیہ و بنوعباس کی سیاست کا تقاضا آل ابوطالبؑ کی مخالفت پر مبنی تھا اس لیے ان لوگوں نے نہ چاہا کہ حضرت ابوطالبؑ کی کوئی فضیلت ثابت ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوطالبؑ حضرت علیؑ کے والد گرامی ہیں جن کے خلاف خلفاء ہر طرح کی تبلیغ کرتے رہے۔ اگر ان کے والد ماجد کا ایمان ثابت ہو جائے تو یہ بات دوسرے خلفاء کی شان کی کمی کا باعث ہو گی کیونکہ ان سب کے باپ حالتِ کفر و شرک میں رہے تھے۔ بہر حال ان قصائد، اقوال اور کردارِ صادق کے باوجود بعض مسلمان حضرت ابوطالب کا کفر ثابت کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ کے کفر کے بارے میں آیات نازل ہوئی ہیں گو یا اسلام کا مقابلہ سوائے اس کے حضرت ابوطالبؑ کے ساتھ تھا یا یہ کہ حضورِ اکرمؐ کے پاس دوزخ کی کوئی اور خبر ہی نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ حضرت ابوطالبؑ کا مقام جہنم میں ثابت کریں۔

---

[1] تاریخ ابن کثیر، ج ۲، ص ۴۲

[2] مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۶۲۳، مجمع البیان، ج ۷، ص ۳۷، الحجۃ ۵۷

حضرت ابو طالب کے ایمان کے ثبوت کا دوسرا طریق

حضرت ابو طالبؑ کے ایمان کے ثبوت میں ان کا حضرت پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ برتاؤ، دفاعِ رسولؐ بلکہ دین کے لیے ان کی جانبازی اور جاںنثاری کے جذبات ہیں، جن کا ہر واقعہ ابو طالب کے آئینۂ فکر اور ان کے نفس روشن کا ثبوت ہے اس لیے کہ حضرت ابو طالبؑ کی وہ شخصیت ہے جس نے کبھی پیغمبر اکرمؐ کی پریشانی برداشت نہ کی، یہاں تک کہ نہایت نامساعد حالات اور طرح طرح کی رکاوٹوں کے باوجود وہ آنحضرتؐ کو شام جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت ابو طالبؑ کے اپنے بھتیجے پر اعتقاد کی انتہا یہ ہے کہ بارانِ رحمت کی دعا کے لیے مقامِ دعا پر اپنے ساتھ لے گئے اور آنحضرتؐ کی منزلت کی قسم دے کر بارانِ رحمت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

انہوں نے حضرت پیغمبر اکرمؐ کی حفاظت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی حتیٰ کہ مسلسل تین سال تک ایک تنگ گھائی میں محصور رہنے کو مکہ کی سیاست و قیادت پر ترجیح دی، حتیٰ کہ تین سال کی اس دربدری نے انہیں بوڑھا کر دیا، صحت خراب ہوگئی اور اس اقتصادی مقاطعہ کے ختم ہونے کے بعد اپنی خانگی زندگی میں واپس آئے۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ابو طالبؑ نے اس حیاتِ فانی کو خیر باد کہا۔

حضرت ابو طالبؑ کا حضرت پیغمبر اکرمؐ پر ایمان اس قدر پختہ تھا کہ آپؑ ان پر اپنے تمام بیٹے قربان کرنے پر رضامند تھے کہ وہ بے شک مارے جائیں لیکن محمدؐ زندہ رہیں۔ رات کو حضرت پیغمبر اکرمؐ کے بستر پر حضرت علیؑ کو سلا دیتے تا کہ اگر کوئی دشمن حملہ کرے تو پیغمبر اکرمؐ تک نہ پہنچ پائے۔ اس سے بھی بڑھ کر ابو طالبؑ ایک دن تمام قریش سرداروں کو بطور انتقام قتل کرنے کے درپے ہو گئے اور نتیجہ بنی ہاشم کے جوان بھی مارے جاتے۔ ذیل میں ہم اس واقعے کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

ایک دن تمام قریش اکابر جمع ہو کر حضرت ابو طالبؑ کے گھر پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ بات چیت کرنے آئے۔ یہ اکابرین گفتگو کے نتیجہ پر پہنچے بغیر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور عقبہ بن معیط نے شور مچا کر کہنا شروع کیا: ''اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کو کسی نصیحت کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو دہشت گردی سے قتل کر کے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ [i]

حضرت ابو طالبؑ یہ جملہ سن کر بہت رنجیدہ ہوئے مگر کیا کرتے کہ وہ سب لوگ آپؑ کے مہمان تھے۔ اتفاق سے اسی دن پیغمبر اکرمؐ گھر سے باہر تشریف لے گئے اور مغرب تک واپس نہ آئے۔ آنحضرتؐ کے تمام چچا آئے مگر آنحضرتؐ کو ان کے گھر میں نہ پایا۔ سب اہل خانہ اور اعزا نے ادھر اُدھر ڈھونڈا مگر آپؐ کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔ اچانک حضرت ابو طالبؑ کا خیال 'عقبہ بن معیط' کی دھمکی کی طرف گیا۔ انہوں نے سوچا کہ انہوں نے یقیناً میرے بھتیجے کو دہشت زدہ کر کے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ہے۔

ابو طالبؑ نے خود ہی فیصلہ کیا کہ بات ہاتھ سے نکل گئی۔ اب مجھے مکہ کے فرعونوں سے محمدؐ کا انتقام لینا چاہیے۔ چنانچہ تمام اولادِ ہاشم و عبد المطلبؑ کو جمع کیا، پھر انہیں حکم دیا کہ ہر شخص اپنے کپڑوں کے نیچے اسلحہ چھپا کر آئے اور مل کر مسجد الحرام میں چلیں۔ ہر ہاشمی ایک قریشی کے

---

[i] لا هوذ الیه ابه و ما خیر من ان نغتال محمداً

پہلو میں بیٹھ جائے جونہی میں یہ جملہ کہو:

یا معشر قریش ابغی محمد

یعنی ''قریشیو! مجھے تم سے محمدؐ چاہیے''

ابوطالبؑ گھر سے چلنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ زید بن حارثہ ان کے گھر آن پہنچے۔ وہ تمام بنی ہاشم جوانوں کی تیاری دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے اور کہنے لگے: ''حضورؐ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ آنحضرتؐ ایک مسلمان کے گھر تبلیغ میں مصروف ہیں''۔ یہ کہہ کر زید بن حارثہ دوڑ کر حضورِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آنحضرتؐ کو ابوطالبؑ کے ارادہ سے آگاہ کیا یہ سن کر حضورؐ برق رفتاری سے واپس تشریف لے آئے، جب حضرت ابوطالبؑ کی نظر اپنے محبوب بھتیجے کے حسین چہرہ پر پڑی تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور بے اختیار پوچھا:

این کنت یا بن اخی اکنت فی خیر

''میرے پیارے بھائی کی نشانی! آپؐ کہاں تھے؟ کیا اس عرصہ میں تم خوش وخرم رہے اور کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

آنحضرتؐ نے جواب دیا: ''چچا جان! مجھے کسی نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا''

اس رات حضرت ابوطالبؑ بڑے بیتاب رہے اور سوچتے رہے کہ اگرچہ آج تو ان کا بھتیجا دشمن کے ضرر کا نشانہ نہیں بنا لیکن قریش جب تک انہیں قتل نہ کریں گے آرام سے نہ بیٹھیں گے۔ چنانچہ عافیت اس بات پر پائی کہ کل طلوعِ آفتاب کے بعد تمام بنی ہاشم جوانوں کے ساتھ مسجد حرام میں وارد ہوں اور قریش اکابر کو اپنے کل کے ارادہ سے آگاہ کریں۔ اس طرح شاید وہ مرعوب ہو جائیں اور محمدؐ کے قتل کے ارادے سے باز رہیں۔ چنانچہ اگلے دن جب سورج اونچا ہو گیا اور قریش اپنے گھروں سے نکل کر اپنی محافل میں مشغول ہوئے، ابھی اپنی باتوں میں مصروف نہ ہوئے تھے کہ دور سے ابوطالبؑ کی شکل نظر آئی۔ دیکھا کہ ان کے پیچھے بہادر بنی ہاشم جوان بھی چلے آ رہے ہیں۔ سب نے اپنے اوسان مجتمع کیے اور انتظار کرنے لگے کہ ابوطالب کیا کہتے ہیں اور کس مقصد کے لیے ان جوانوں کو ساتھ مسجد الحرام میں آئے ہیں۔

حضرت ابوطالبؑ اس محفل کے سامنے آ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

''کل میرا بھتیجا محمدؐ کچھ دیر کے لیے میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں سمجھا کہ شاید تم نے عقبہ کے کہنے میں آ کر اس کو قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ میں نے ارادہ کیا کہ ان تمام جوانوں کے ساتھ مسجد الحرام میں وارد ہوں۔ میں نے انہیں حکم دیا تھا کہ ان میں سے ایک ایک شخص تم میں سے ہر ایک کے پہلو میں بیٹھ جائے اور جونہی میری آواز بلند ہو۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہو جائیں اور اپنے پوشیدہ ہتھیاروں سے تم سب کا خون بہا دیں۔ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ محمدؐ کو زندہ و سلامت پا لیا۔ پس ابوطالبؑ نے اپنے دلاور جوانوں کو حکم دیا کہ اپنے چھپائے ہوئے ہتھیاروں کو باہر نکال لیں'۔

پھر اپنی بات کو اس جملہ پر ختم کیا:

''اگر تم میرے بھتیجے کو قتل کر دیتے تو خدا کی قسم میں تم میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑتا اور آخری قطرہ خون تک تم سے جنگ کرتا اور ....[۱]

اگر آپ ابو طالبؑ کی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو صاف نظر آئے گا کہ پورے بیالیس سال انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی ہر طرح سے مدد فرمائی بلکہ بعثت کے بعد کے پورے دس سال جو حضورِ انورؐ کا تبلیغ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا، حضرت ابو طالبؑ نے اپنی بساط سے بڑھ کر جانثاری کا مظاہرہ فرمایا۔ ان تمام خدمات کی وجہ صرف آپؑ کا ایمان راسخ ہی تھا جو آپؑ کو حضرت پیغمبر اکرمؐ کی نبوت و رسالت پر حاصل تھا۔ اگر ابو طالبؑ کے عزیز بیٹے علیؑ کی فداکاریوں کو خود ابو طالبؑ کی خدمات کے ساتھ جمع کر دیا جائے تو درج ذیل اشعار کی حقیقت سمجھ میں آئے گی، جن کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اشعار ابن ابی الحدید کے قصیدہ سے ہیں۔

''اگر حضرت ابو طالبؑ اور ان کے نورِ نظر حضرت علیؑ نہ ہوتے تو دین کبھی مستحکم نہ ہوتا۔ باپ نے مکہ میں حقِ حمایتِ وحفاظت ادا کر دیا اور بیٹے نے مدینہ میں جانثاری کی لازوال روایت قائم کی''[۲]

حضرت ابو طالبؑ کی وصیت، وقتِ وفات

حضرت ابو طالبؑ نے اپنے وقتِ وفات اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی:

''میں 'محمدؐ' کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ محمدؐ قریش کے امین اور عربوں کی ''سچی زبان'' ہیں۔ آپؐ جامع جمیع صفات ہیں۔ وہ ایسا فطری دین لائے ہیں کہ دل اس پر ایمان لائے۔ مگر زبانیں خوفِ کے باعث شماتت وانکار کے لیے کھل گئیں۔ میں اب دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے مظلوم اور کمزور لوگ ان کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ان پر ایمان لے آئے ہیں۔ چنانچہ محمدؐ نے ان کی مدد سے صفوفِ قریش کو توڑنے پر قیام کیا ہے، ان کے سردار ذلیل ہو رہے ہیں، ان کے گھر اُجڑ گئے ہیں اور مظلوم بے یار و مددگار عوام قوی ہو کر ان کے کام میں مدد کر رہے ہیں۔ پس میرے عزیزو! محمدؐ کے دین (اسلام) کے حمایتی بنو جو اس کی مدد کرے گا خوش نصیب ہوگا۔ اگر مجھے اجل مہلت دیتی تو میں خود حوادثِ روزگار کو ان سے دفع کرتا'۔[۳]

---

[۱] واللہ لو قتلتموہ ما ابقیت منکم احداً حتیٰ نتفانی نحن و انتم (طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۰۲۔ ۲۰۳، طرائف، ص ۸۵)

[۲] شرح ابن ابی الحدید، ج ۱۴، ص ۸۴

[۳] سیرتِ حلبی، ج ۱، ص ۳۹۰ اور تاریخ الخمیس، ج ۱، ص ۳۳۹

حضرت ابوطالبؑ کے اس کلام میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ان کی مسلسل دس سال کی خدمات اور جاں فشانیاں اس کی صداقت گفتار پر گواہ ہیں۔ تاریخ سے اوراق آپؐ کی گواہی دے رہے ہیں۔ آپؐ کا ایک اور گواہ وہ وعدہ ہے جو بعثت کے شروع میں آپؐ نے اپنے بھتیجے سے کیا تھا۔ یہ اسی دن کی بات ہے جب آنحضرتؐ نے اپنے اعزا کی دعوت کی تھی اور ان کے سامنے اپنا دین پیش کیا تھا۔ اس وقت حضرت ابوطالبؑ نے فرمایا تھا:

''میرے پیارے بھتیجے! آپ اپنا کام شروع کریں۔ آپ برگزیدہ شخصیت ہیں، ایک بلند مرتبہ باپ کے بیٹے ہیں اور آپؐ کی جماعت دنیا کی بہترین جماعت ہے۔

اگر کسی شخص نے آپؐ کے خلاف زبان کھولی تو وہ رسوا ہوگا اور آپؐ کی حمایت میں تلواریں اس کو کاٹ ڈالیں گی۔

خدا کی قسم! تمام عرب آپؐ کے سامنے اس طرح نیاز مند کھڑے ہوں گے جیسے کسی جانور کے بچے اپنی ماں کے سامنے ہوتے ہیں'' [1]

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کا آخری ثبوت

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے ثبوت میں آپؐ کے خاندان کے مخلص افراد کی رائے کو سامنے رکھ کر بہتر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ گھر والے گھر کی بات بہتر طور پر جان سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم چند واقعات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ جب حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کو حضرت ابوطالبؑ کے انتقال کی خبر دی تو آنحضرتؐ نے شدید گریہ فرمایا، اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دعا فرمائی اور حضرت علیؑ سے فرمایا کہ ان کے غسل وکفن کا بندوبست کریں۔ [2]

۲۔ حضرت امام محمد باقرؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ کا ایمان اکثر مسلمانوں سے بلند تر درجے کا تھا اور وہ امیر المومنین حضرت علیؑ سے فرمایا کرتے تھے کہ ان کی طرف سے حج بجا لانا۔ [3]

۳۔ حضرت امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطالبؑ کی مثال اصحابِ کہف کی مثال ہے جو دل میں ایمان رکھتے تھے اور ظاہراً شرک۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو دوگنا اجر عطا فرمائے گا۔ [4]

---

[1] سید ابن طاؤس کی کتاب ''الطرائف، ص ۸۵ بحوالہ غایۃ السئول فی مناقبِ آلِ رسولؐ (ابراہیم بن علی دنیوری)

[2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۴، ص ۷۶

[3] شرح ابن الحدید، جلد ۱۴، ص ۶۸

[4] اصول کافی، ص ۲۴۴

شیعہ علماء کا نظریہ

اہل بیتؑ کی پیروی میں امامیہ اور زیدیہ شیعہ علماء کا اس پر مکمل اتفاق ہے کہ حضرت ابو طالبؑ ممتاز مسلمانوں میں سے تھے۔ جب آپؑ کی رحلت ہوئی ہے اس وقت آپؑ کا دل ایمان کی دولت اور اسلام کی محبت و خلوص سے مالا مال تھا۔ اس موضوع پر لاتعداد کتابیں، مقالے اور رسالے لکھے گئے ہیں۔ اس بارے میں تقریباً اٹھارہ کتابیں اب تک لکھی جا چکی ہیں۔ قارئین مزید معلومات کے لیے کتاب الغدیر جلد ۷، ص ۴۰۲ تا ۴۰۴ طبع نجف اشرف کا مطالعہ کریں۔

حدیث ''ضحضاح'' کی وضاحت [۱]

بعض بخاری و مسلم جیسے محدثین نے سفیان سعید ثوری، عبد الملک بن عمیر، عبد العزیز محمد درآوردی جیسے راویوں سے رسولِ اکرمؐ سے اس طرح روایت کی ہے:

وجدته فی غمرات من النار فاخرجته الی ضحضاح

''میں نے ابو طالبؑ کو آگ کی بھٹی میں پایا۔ چنانچہ وہاں سے نکال کر میں نے انہیں 'پایاب' مقام پر منتقل کیا'۔

اسی مفہوم کو دوسری طرح بھی بیان کیا گیا ہے:

لعله تنفعه شفاعتی یوم القیامة فیجعل فی ضحضاج من النار یبلغ کعبیه یغلی منه دماغه

''شاید میری شفاعت روزِ قیامت حضرت ابو طالبؑ کو کوئی فائدہ پہنچائے اور انہیں اس آگ سے نکال کر 'پایاب' میں پہنچا دیا جائے جو ان کے پاؤں تک اس طرح پہنچے گی کہ ان کا دماغ اُبلنے لگے''

اگرچہ بیان کردہ روایات اور واضح دلائل بکثرت اس روایت کی بے بنیادی کو ثابت کرتی ہیں تاہم مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے ہم اس کی وضاحت دو پہلوؤں سے ضروری جانتے ہیں۔

۱۔ حدیث ''ضحضاح'' کی سند کا ضعف

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے حدیث ضحضاح کے راوی سفیان بن سعید ثوری عبد الملک ابن عمیر اور عبد العزیز بن محمد درادردی ہیں۔ ہم علم رجال کے علماء کے ذریعہ جس سے اہل سنت حضرات محدثین کے احوال حاصل کرتے ہیں، ان راویوں کی تحقیق کرتے ہیں:

---

[۱] ''ضحضاح'' کے معنی پایاب ہیں یعنی دریا کا وہ حصہ جہاں پانی اتنا کم ہو کہ انسان پیدل چل سکے۔

(الف) سفیان ابن سعید ثوری

''علمِ رجال'' کے ایک مشہور اہل سنت عالم ابوعبداللہ محمد ابن احمد بن عثمان ذہبی سفیان ثوری کے بارے میں یہ کہتے ہیں: ''کان یدلس عن الضعفاء''، یعنی وہ ضعیف راویوں کے حوالے سے جعلی احادیث بیان کرتا تھا''۔[۱] ایک مستند عالم علمِ رجال کی طرف سے سفیان ثوری کے بارے میں یہ کلمات اس کی سند کو درجۂ اعتبار سے گرا دیتے ہیں۔

(ب) عبدالملک بن عمیر

طال عمره وسا حفظه قال ابو حاتم لیس بحافظ تغیر حفظه و قال احمد ضعف یغلط و قال ابن معین مخلط و قال ابن خراش کان شعبی لا یرضاه و ذکر الکوسج عن احمد انه ضعیف جداً[۲]

''عبدالملک بن عمیر کی قوتِ حافظہ کمزور تھی اور وہ احادیث کو حفظ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا''۔

احمد بن حنبل کہتے ہیں: ''وہ ضعیف اور خطا کار تھا''

ابن معین کا کہنا ہے: ''وہ صحیح احادیث کے ساتھ غلط احادیث کو ملا دیتا تھا''۔

ابن فراش کہتا ہے:

''شعبی نے بھی اس پر عدم اعتماد کیا ہے اور کوسج نے بھی احمد بن حنبل کے حوالے سے کہا ہے کہ وہ بری طرح ضعف کا شکار تھا۔

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالملک بن عمیر مندرجہ ذیل نقائص کا حامل تھا:

۱۔ کمزور حافظہ رکھتا تھا اور بھول جاتا تھا۔

۲۔ ضعیف راوی (علم رجال کی اصطلاح)۔ ضعیف راوی اسے کہتے ہیں جس پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔

۳۔ غلط کار

۴۔ مخلط (جو صحیح اور غلط روایات کو مخلوط کر دے)۔ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا صفات میں سے ہر ایک عبدالملک بن عمیر کی بیان کردہ احادیث کی بے پائیگی کے لیے کافی ہے کیونکہ یہ سب نکات اس کے ضعف کا ثبوت ہیں۔

---

[۱] میزان الاعتدال، ج ۲، ص ۱۶۹

[۲] میزان الاعتدال، ج ۲، ص ٦٦٠

(ج) عبدالعزیز بن محمد دراوردی

علمِ رجال کے اہل سنت علماء نے اسے بھی نسیان کا مریض اور کمزور حافظہ والا بتایا ہے اور کہا ہے کہ عبدالعزیز کی بیان کردہ روایت سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ احمد بن حنبل اس کے بارے میں کہتے ہیں:

اذا حدث من حفظه جآء ببواطیل [1]

''جب کبھی وہ حدیث بیان کرتا ہے وہ بے ربط اور بے بنیاد کلام ہوتا ہے''

ابو حاتم بھی اس کے بارے میں مذکورہ بالا کتاب ہی میں کہتے ہیں: «لا یحتج به» یعنی اس کی بیان کردہ روایت سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

اسی کتاب میں ابوزراعہ سے «سیئ الحفظ» یعنی خراب حافظہ والا'' کہتے ہیں۔

اس مدلل بیان سے واضح ہے کہ حدیث 'ضحضاح' کے راوی انتہائی نا قابل اعتماد وضعیف ہیں اور ان کی بیان کردہ روایت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) قصۂ ضحضاح کتاب وسنت کے خلاف ہے

مذکورہ بالا حدیث ضحضاح کو حضرت رسولِ اکرمؐ سے یہ نسبت دی گئی ہے کہ انہوں نے حضرت ابوطالبؑ کو آگ کی بھٹی سے نجات دلا کر پایاب جگہ میں منتقل فرمایا اور اس طرح ان کے عذاب میں کمی فرمائی، یا روزِ قیامت ان کی شفاعت کی آرزو کا اظہار فرمایا، حالانکہ قرآن وسنت اس بات کی نفی کرتی ہیں کہ کافروں کے عذاب میں کمی کی جائے یا کوئی ان کی شفاعت کرے۔ اگر حضرت ابوطالبؑ کافر ہوتے تو آنحضرتؐ بھی ان کے عذاب میں کمی نہ کرتے اور نہ ہی ان کی شفاعت کی آرزو فرماتے۔ اس سے اس حدیث کا ضعف ثابت ہو جاتا ہے۔ اب ہم اس مسئلہ کے روشن دلائل کتاب وسنت کے ذریعہ پیش کرتے ہیں: (الف) قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝۳۶ (سورہ فاطر: ۳۶)

''دوزخ کی آگ کافروں کا مقدر ہے۔ نہ ان کو موت ہی آئے گی کہ مرکر اس سے نجات پائیں اور نہ ہی اس میں کمی کی جائے گی۔ کافروں کو ایسی ہی سزا دی جاتی ہے''

(ب) قرآن مجید کے علاوہ خود سنت پیغمبر اکرمؐ بھی کافروں کے لیے شفاعت کی نفی کرتی ہے۔ ثبوت کے لیے ذیل میں ہم دو حدیثیں پیش

---

[1] میزان الاعتدال، ج ۲، ص ٦٦٤

کرتے ہیں:

۱۔ حضرت ابوذر غفاریؓ رسولِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں: اعطیت الشفاعة و هی نائله من امتی من لا یشرك با الله شیئًا ''یعنی مجھے حق شفاعت عطا کیا گیا مگر میں ان لوگوں کے حق میں اس کو استعمال کروں گا جو مشرک نہ ہوں۔[1]

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت رسول اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں۔''و شفاعتی لمن شهد ان لا اله الا الله مخلصاً و ان محمداً رسول الله یصدق لسانه و قلبه و قلبه لسانه'' [2] یعنی میری شفاعت اس کے نصیب ہوگی جو خلوصِ دل سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور میری نبوت کی گواہی دے اور اس کے زبان و دل ہم آہنگ ہوں یعنی جو کلمہ شہادت کو کہتا بھی ہو اور مانتا بھی ہو۔

مذکورہ بالا آیۃ مجیدہ اور احادیث سے قصہ ضحضاح کا بطلان ثابت ہوجاتا ہے۔

نتیجہ:

جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ ''حدیث ضحضاح'' نہ سند کے اعتبار سے قابل اعتماد ہے اور نہ ہی متن و مضمون کے اعتبار سے ہے۔ لہٰذا اس سے استدلال نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ دشمنوں نے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی نفی کے لیے جو مضبوط ترین قلعہ تعمیر کیا تھا وہ گر جاتا ہے۔

حضرت پیغمبر اکرمؐ کے والدین شریفین کا ایمان

ہم نے حضرت رسولِ اکرمؐ کے آباؤ اجداد اور عم نامدار کے ایمان کے بارے میں مفصل بحث کی ہے۔ اب حضورِ اکرمؐ کے والدین گرامی کے ایمان کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

اثنا عشری، زیدیہ اور اہل سنت علماء کا اعتقاد یہ ہے کہ حضورِ اکرمؐ کے والدین توحید پرست تھے اور زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی وہ اس عقیدے سے روگردان نہیں ہوئے۔ چونکہ تاریخ میں آپؐ کے والدین گرامی کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے اس لیے ان کے ایمان کے منکرین کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرسکیں۔ اس کے برعکس ان کے ایمان کے بہت سے ثبوت تاریخ میں مل جاتے ہیں۔ جو پیش کیے جارہے ہیں:

۱۔ ایک دن ''فاطمہ خشعمی'' نے اپنے آپ کو حضرت رسولِ اکرمؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہؑ کے سامنے پیش کیا۔ آپؑ نے اس کے جواب میں دو شعر فرمائے جو آپ کی عفت و پاکدامنی کا مکمل ثبوت ہیں:

---

[1] الترغیب والترہیب، ج ۴ ص ۴۳۳

[2] الترغیب والترہیب، ج ۴

اما الحرام فا الممات دونه
والحل لا حل فاستبينه
يحمى الكريم عرضه و دينه
فكيف بالا مر الذى تبغينه [1]

''فعلِ حرام کے ارتکاب سے موت بہتر ہے۔ تو نے حلال بات کی نہیں کہ میں اس پر غور کروں۔ شریف آدمی اپنے عزت و دین کی حفاظت کرتا ہے۔ پس میں کس طرح تیری خواہش سے اپنے آپ کو آلودہ کروں''۔

اس جواب سے آپؑ کی عفت و پاکدامنی نکل کر سامنے آ رہی ہے۔

۲۔ خود حضورِ اکرمؐ نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا:

لم ازل انقل من اصلاب الطاهرين الى ارحام الطاهرات

''میں ہمیشہ پاک و پاکیزہ اصلاب سے با عفت ارحام کو منتقل ہوتا آیا ہوں''۔

اس سے صرف اعمالِ زشت سے پاکیزگی اور عفت سے مراد نہیں بلکہ اس میں کفر و شرک سے بھی برأت کا اعلان ہے۔[2]

۳۔ حضرت رسولِ اکرمؐ کی والدہ ماجدہ جناب آمنہؑ بنت وہب کے ایمان کے بارے میں صرف اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ آپؑ اپنے بیٹے کی نبوت سے آگاہ تھیں۔ جب آپؑ اپنے عزیزوں سے ملنے مدینہ تشریف لے گئیں تو آنحضرتؐ ان کے ہمراہ تھے۔ حضرت آمنہؑ نے دیکھا کہ مدینہ کے یہودی آنحضرتؐ کی نبوت کی خبر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس خوف سے کہ وہ آنحضرتؐ کو کوئی گزند نہ پہنچائیں آپ نے فوراً مکہ کو واپسی کا مقصد فرمایا لیکن نصف راستہ میں 'ابوا' کے مقام پر آپؑ راہِ ملک آخرت ہوئیں۔ احتضار کے وقت آپ نے آنکھ کھولی، اپنے فرزند کی زیارت کی اور یہ دو شعر کہے:

ان صح ما ابصرت فى المنام
فانت مبعوث الى الانام
فالله انهاك عن الاضنام
ان لا تو اليها مع الاقوام

''میں نے جو کچھ خواب میں دیکھا ہے اگر وہ سچ ہے تو (اے میرے نورِ نظر!) تو کائنات کی طرف نبیؐ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے بتوں سے بیزار رکھا ہے تا کہ دوسرے لوگوں کی طرح ان کا گرویدہ نہ ہو جائے''۔

---

[1] سیرت حلبی، ج ۱، ص ۴۶ وغیرہ

[2] سیرت ذینی وحلان، حاشیہ سیرت حلبی ج ۱، ص ۵۸

اس کے بعد آپؑ کی والدہ گرامی نے زندگی کا آخری جملہ یوں ارشاد فرمایا:

کل حیی میت و کل جدید بال و کل کبیر یفنی وانا میته و ذکری باق وولدت طهراً

''جو زندہ ہے وہ ضرور مرتا ہے، ہر تازہ اور نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے، ہر بزرگی کو آخر زوال ہے، میں تو دنیا سے جا رہی ہوں مگر میرا نام ہمیشہ رہے گا اور میں دینِ حق پر پیدا ہوئی ہوں''

علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب ''مواہب'' کی شرح لکھتے ہوئے جناب زرقانی لکھتے ہیں کہ جناب سیوطیؒ اس جملے کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت آمنہؓ کے یہ اعترافات گواہی دیتے ہیں کہ جناب آمنہ توحید پرست تھیں کیونکہ آپؑ نے دین حق سے ''ملتِ ابراہیمؑ'' مراد لیا ہے اور اپنے لختِ جگر کی نبوت کا اقرار کیا ہے۔[1]

عالمِ تشیع شیخ مفیدرقم طراز ہیں کہ علمائے امامیہ متفق ہیں کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عبداللہ تک حضرت رسولِ پاکؐ کے تمام آباؤاجداد موحد اور مومن تھے۔ اس پر انہوں نے آیاتِ قرآن اور دیگر اخبار سے استدلال کیا ہے۔ خود رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں: ''میں ہمیشہ پدرانِ پاک کے صلب سے مادرانِ پاکیزہ کے رحموں میں منتقل ہوتا رہا حتیٰ کہ میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی۔ اس کے بعد علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے یہ جملہ لکھا ہے: ''حضورِ اکرمؐ کی والدہ گرامی جناب آمنہ بنت وہب توحید پرست تھیں اور مومنین کے گروہ میں محشور ہوں گی''۔[2]

۴۔ جناب ابن کثیرؒ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں بہت سی روایات ذکر کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت رسولِ اکرمؐ کے والدین شریفین موحد اور مومن تھے ہم ان میں سے چند کو نقل کرتے ہیں:

ایک دن حضرت رسولِ اکرمؐ نے خطبہ کے دوران ارشاد فرمایا:

''میں محمدؐ بن عبداللہ ہوں۔ جب کبھی میرے آباؤاجداد میں افراد الگ الگ ہوتے تو اللہ تعالیٰ مجھے بہترین جانب رکھتا حتیٰ کہ میں اپنے والدین کے گھر پیدا ہوا۔ میرا دامن کبھی بھی جاہلیت کی نجاست سے آلودہ نہیں ہوا۔ میں آدم سے لے کر اپنے والدین تک ازدواج ہی کا نتیجہ ہوں۔ بدعملی کا نہیں۔ اس طرح میں نسل کے اعتبار سے تم میں سب سے بہتر ہوں''۔[3]

۵۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ فرماتی ہیں:

''حضرت رسولِ اکرمؐ نے بحوالہ جبرائیل امینؑ فرمایا: میں نے مشرق و مغرب چھان مارا لیکن مجھے رسولِ پاکؐ

---

[1] الاتحاف ''مضفہ شیرازی'' ص ۱۴۴، سیرۃ النبی ''رحلان'' حاشیہ سیرۃ حلبی، جلد ا، ص ۵۷

[2] اوائل المقالات، ص ۱۲

[3] البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۵۵

سے بہتر کوئی فرد نہیں ملا، بنی ہاشم سے بہتر کوئی خاندان نظر نہیں آیا۔ اس ''بہتر'' سے مراد توحید پرستی اور سنت ابراہیمی کا تحفظ ہے''

۶۔ کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کے لیے یہ دعا مانگی:

وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ﴿۳۵﴾ (ابراھیم: ۳۵)

''بارِالہا مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے محفوظ فرما''

ایک اور آیہ مبارکہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی:

''توحید کو ایک اصل ثابت کی شکل میں میری نسل میں باقی رکھ۔'' وجعلها كلمة باقية في عقبه'' یعنی انہوں (ابراہیمؑ) نے اس (توحید) کو اپنی نسل میں باقی رکھا۔ (زخرف: ۲۸)

بے شک حضرت ابراہیمؑ کی دعا بہت وسیع ہے مگر حضرت رسولِ اکرمؐ کے آباؤ اجداد ہر حال میں اس میں شامل ہیں۔ چنانچہ اگر حضرت ابراہیم کی یہ دعا قبول ہوئی ہے اور آپؑ کی نسل توحید پر باقی رہی ہے تو مسلمہ طور پر حضرت رسولِ اکرمؐ کے آباؤ اجداد اس کا بہترین مصداق ہیں۔

اس بحث سے ہمیں یہ راہنمائی ملتی ہے کہ خاندان بنی ہاشم توحید پرست تھا اور خدائے واحد پر ایمان رکھتا اور یہ بات بعثت سے پہلے خود حضرت رسولِ اکرمؐ کی توحید پرستی پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ جس گھر میں توحید کا درخت پھلے پھولے، جس گھر کے افراد اور بزرگ دینِ فطرت اور ملتِ ابراہیمیؑ کے پیروں ہوں، اس گھر میں پلنے والے بچے بھی یقیناً اسی دین پر ہوں گے۔ یہ ہمارے ذاتی دلائل ہیں جن کی تائید تاریخ کے محکم اور مستقل دلائل سے ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ کے قبل بعثت کے ایمان کے دلائل یہی ہیں۔

۱۔ آنحضرتؐ اپنے بچپن کے پہلے پانچ سال صحرا میں ''بنی سعد'' کے درمیان گزارتے ہیں۔ آپؐ کی دایہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ فرماتی ہیں:

''ابھی محمدؐ تین سال کے تھے کہ ایک دن مجھ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ دن بھر میرے بھائی نظر نہیں آتے؟' میں نے جواب دیا کہ وہ دن میں بھیڑیں لے کر آبادی سے دور چراگاہوں میں چلے جاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: میں بھی ان کے ساتھ باہر جایا کروں گا۔ میں نے کہا اگر آپؐ چاہتے ہیں تو ضرور ساتھ چلے جائیں۔ اگلے روز جب میرے بچے جانے لگے تو میں نے محمدؐ کی آنکھوں میں سرمہ لگایا، بالوں میں تیل ڈالا اور نظر بد سے بچنے کے لیے ان کے گلے میں ایک ڈوری ڈالنے لگی جس میں یمنی تعویذ تھا۔ آپؐ نے فرمایا: 'اماں! اسے رہنے دیجیے۔ ایک ہستی ایسی ہے جو ہر قسم کے گزند سے میری حفاظت کرتی ہے۔[1]

بزرگوں جیسی باتیں ایک تین سالہ بچہ سے سننے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کوئی غیبی طاقت اس کے مربی کے طور پر اس کے ہمراہ ہے جو اسے معارفِ الٰہی اور مکارمِ اخلاق سے روشناس کرا رہی ہے۔ وہ اس صغیر سنی میں ایسی باتیں کرتا ہے جن کو اس وقت کے بزرگ بھی سمجھنے سے قاصر تھے اور جو ہمیشہ پتھر و مٹی کی پناہ میں زندگی بسر کرتے تھے۔

---

[1] بحارالانوار، جلد ۱۵، ص ۳۹۲

۲۔ حضرت ابن سعدؒ اپنی ''طبقات'' میں رقم طراز ہیں کہ جب رسولِ اکرمؐ بچپن میں اپنے چچا کے ساتھ شام کے سفر پر تشریف لے گئے تو راستے میں ''بحیرا' نامی ایک راہب نے آپؐ کو دیکھا اور اُسے آپؐ کی ذات گرامی میں نبی آخرالزمانؐ کی نشانیاں نظر آئیں۔ اس نے تصدیق کے لیے آپؐ سے کہا: ''میں آپؐ کو لات وعزیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ جو کچھ میں آپؐ سے پوچھوں اس کا جواب دیں''۔ آپؐ نے اس کے سوال سے پہلے ہی فرمایا: ''کائنات میں ان دو بتوں سے زیادہ میں کسی سے نفرت نہیں کرتا جن کی تو نے مجھے قسم دی ہے، پھر راہب نے اپنی قسم کو بدل کر پوچھا: ''اچھا آپؐ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ جو میں پوچھوں گا اس کا جواب دیں''۔ آپؐ نے فرمایا: ''پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو''[۱]

۳۔ اس کے بعد حضرت ابن سعدؒ ''طبقات'' میں لکھتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ نے جناب حضرت خدیجہ الکبریٰ کی یہ درخواست قبول فرمائی کہ آپؐ ان کے تجارتی قافلے کی نگرانی فرمائیں گے تو انہوں نے اپنا ایک قابل اعتماد غلام میسرہ آنحضرتؐ کے ساتھ کر دیا تا کہ آپؐ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ میسرہ بیان کرتا ہے کہ ملک شام میں آنحضرتؐ کی ایک شامی تاجر کے ساتھ اختلاف ہو گیا۔ شامی نے کہا کہ آپؐ اپنی صدق گفتاری کے لیے 'لات وعزیٰ' کی قسم کھائیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں نے زندگی میں کبھی ان کی قسم نہیں کھائی۔ تو بھی ان دونوں سے پرہیز کر''۔ وہ شامی تاجر فوراً اٹھا، آپؐ کے موقف کی تائید کی۔ پھر میسرہ سے کہا: ''خدا کی قسم یہ شخص نبیؐ ہے''۔[۲]

۴۔ آپؐ کے توحید پر ایمان کا واضح ترین ثبوت یہ ہے کہ ان لوگوں کے درمیان آنحضرتؐ کی چالیس سالہ زندگی کے دوران کسی نے ایک مرتبہ بھی آنحضرتؐ کو کسی بت کو سجدہ کرتے ہوئے یا راہِ توحید سے انحراف کرتے نہ دیکھا بلکہ بعثت سے کئی سال پہلے آنحضرتؐ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور اعتکاف وعبادات خدا میں مشغول رہتے۔ اسی عالم میں روح الامین آنحضرتؐ کے پاس آئے اور آپؐ کو نبوت ورسالت کی خوشخبری سنائی۔

۵۔ خطبہ 'قاصعہ' میں حضرت امیر المومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں:

و لقد قرن الله من لدن ان کان فطیما اعظم منك من ملائکة یسلك به طریق المکارم و محاسن اخلاق حلم لیله و نهاره لیله و نهاره[۳]

''جس دن سے حضورِ اکرمؐ کا دودھ چھڑایا گیا (یعنی حضرت دو سال کے ہوئے) اللہ تعالیٰ نے اپنا عظیم ترین فرشتہ آپؐ کے ساتھ کر دیا تا کہ شب وروز آپؐ کے ساتھ مکارمِ اخلاق ومحاسن اطوار کی دشوار گزار راہیں طے کرے''

جس شخصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا سب سے بزرگ فرشتہ شب وروز رہے، نہ صرف یہ کہ وہ راہِ توحید سے بھٹک نہیں سکتا بلکہ بھول

[۱] طبقات ابن سعد، جلد ۱، ۱۵۴، سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ۸۲

[۲] طبقات ابن سعد، جلد ۱ ص ۱۵۶

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ، شمارہ ۱۸۷

چونکہ غلطی اور سہو و نسیان سے بھی دور رہتا ہے اور وہ ہر قسم کے عمدی و سہوی فروگزاشت سے محفوظ رہتا ہے۔

بعثت سے پہلے حضورِ اکرمؐ کس شریعت کے پیرو تھے؟

حضورِ اکرمؐ کا بعثت سے پہلے ایمان اور توحید پرستی واضح طور پر ثابت ہوگئی۔ اب ہم اس مسئلے کی طرف آتے ہیں جو پہلے مسئلے سے بھی زیادہ مبہم ہے، وہ یہ کہ بعثت سے پہلے اپنی چالیس سالہ زندگی میں آنحضرتؐ جو عبادت و ریاضت فرماتے رہے وہ کون سی سابقہ شریعت کے تحت فرماتے رہے۔ اس سوال کے جواب میں صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ آپؐ موحد و عابد تھے۔ بلکہ کھل کر بتانا پڑے گا کہ آپؐ ذاتی اور معاشرتی معاملات حلال و حرام اور پاک و نجس کے مسائل میں اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کون سی شریعت کو اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس مسئلے پر بہت سے نظریات کتابوں میں موجود ہیں اور ان میں اکثر کے نظریات شاید بلا دلیل بھی ہیں۔ ان کا بیان بے جا طوالت کا باعث ہوگا۔ علمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں بحث کرتے ہوئے اپنے اپنے نظریات تحریر کیے ہیں۔ محقق حضرات درج حاشیہ کتب کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم یہاں صرف چند نظریات کا حوالہ دیتے ہیں۔ [۱]

۱۔ کیا حضورِ اکرمؐ کسی شریعت کے پیرو تھے؟

اس خیال کی نسبت ابوالحسین بصری سے دی جاتی ہے۔ لیکن حضورِ اکرمؐ کی سیرت طیبہ اس کی نفی کرتی ہے کیونکہ آپؐ بعثت سے پہلے غارِ حرا میں اعتکاف فرماتے تھے حتیٰ کہ آپؐ پر پہلی وحی بھی اسی غار میں حالتِ اعتکاف میں نازل ہوئی۔ کیا آنحضرتؐ کی عبادت کسی شریعت کی پیروی کے بغیر انجام پا سکتی ہے؟

مزید برآں آنحضرتؐ نے بعثت سے قبل بیس مرتبہ مناسب حج میں شرکت فرمائی اور حج کے مناسک ادا کرنے کے لیے قانون و شریعت کی پیروی لازم ہے۔ [۲]

آنحضرتؐ نے زندگی کے ایک حصے میں تجارت بھی کی اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا تجارتی قافلہ لے کر گئے۔ تجارت بذاتِ خود حلال و حرام سے متعلق احکام کی حامل ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تجارت کے زمانہ میں حلال و حرام آنحضرتؐ کی نظر میں یکساں تھے۔

مکہ اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے لوگوں کی زندگی قمار بازی اور شراب خواری جیسی بری عادتوں سے مملوتھی۔ مگر حضورِ اکرمؐ ان سے بری ہو کر الگ تھلگ تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی گزار رہے تھے بلکہ اس صفت میں آنحضرتؐ ید طولیٰ رکھتے اور اس لحاظ سے ان سب کے راہبر و راہنما تھے۔ اس پس منظر میں 'ابوالحسن بصری' کا نظریہ آخر کے طرزِ زندگی سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا۔

---

[۱] ''ذریعہ'' سید مرتضیٰ، ج ۲، ص ۵۹۵۔ ''عدہ'' شیخ طوسیٰ، ج ۲، ص ۶۰۔ ''معارج'' محقق حلی، ص ۶۰ ''مبادی'' علامہ، ص ۳۰ بحار الانوار، ج ۱۸، ص ۲۷۱۔ ''قوانین'' قمی، ج ۱، ص ۴۹۱۔ ان کتب میں پانچ نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

[۲] وسائل الشیعہ، ج ۸، باب ۴۵ ''باب تکرارِ حج وعمرہ'' ص ۸۷۔ بحار الانوار، ج ۱۱، ص ۲۸۰

امام احمد بن حنبلؒ اپنی مسند میں ''حضرت سعید بن زید'' سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے اپنے باپ کے حق میں ایسی فضیلت کا دعویٰ کیا ہے جس سے رسولِ اکرمؐ محروم تھے۔ لہٰذا ایسی حدیث کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

سعید کہتا ہے: ''رسولِ اکرمؐ زید بن حارثہ کے ہمراہ مصروفِ طعام تھے کہ ''زید بن عمرو بن نفیل (سعید کا باپ ان کے پاس سے گزرا۔ آنحضرتؐ نے زین بن عمرو کو کھانے کی دعوت دی لیکن زید نے جواب دیا: ''میں اور میرا بھتیجا بتوں کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کا گوشت نہیں کھاتے''۔ اس دن کے بعد آپؐ کو بھی ان جانوروں کا گوشت تناول کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔[۱]

ایسی حدیث جو سعید بن زید کے ذریعہ نقل ہوئی ہے کوئی وقعت نہیں رکھتی کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ایک شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے منتخب کیا ہو حلال وحرام کے سلسلہ میں ایک عام آدمی سے بھی کم باخبر ہو سکتا ہے۔

۲۔ کیا رسولِ اکرمؐ کسی سابقہ شریعت پر عمل کرتے تھے؟

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ حضورِ اکرمؐ مناسکِ حج ادا فرماتے تھے، مردار سے اجتناب کرتے تھے، حلال گوشت تناول فرماتے تھے لہٰذا یقیناً کسی نہ کسی شریعت کی پیروی کرتے تھے۔[۲] مگر ہم اس کو نہیں مانتے کیونکہ حضورِ اکرمؐ جتنے کام بھی انجام فرماتے تھے وہ اب تک نازل ہونے والے شریعتوں کی پیروی کے بغیر بھی انجام دیے جا سکتے تھے۔ لہٰذا یہ کوئی دلیل نہیں کہ آپؐ لازماً کسی نہ کسی سابقہ شریعت کے پیرو تھے۔

علاوہ ازیں سابقہ شریعتوں میں سے کسی پر عمل کرنے سے بعض اعتراضات پیدا ہوتے ہیں جن کو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

(الف) اسلام سے پہلے نازل ہونے والی شریعتوں پر آپؐ کا عمل اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ شریعتیں آفاقی حیثیت رکھتی ہوں اور کسی خاص جماعت سے مخصوص نہ ہوں، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ حضورِ اکرمؐ کا ان پر عمل بعید از قیاس ہے۔ ہم اس مطلب کو اپنی کتاب ''مفاہیم القرآن''، میں بڑی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ خواہشمند حضرات اس کا مطالعہ فرمائیں۔[۳]

(ب) سابقہ شریعتوں پر عمل صرف اسی وقت ممکن ہے جب ان کا علم ہو۔ دیکھنا ہوگا کہ رسولِ اکرمؐ ان سے کس طرح واقف ہوئے۔ اس کے دو طریقہ ہو سکتے ہیں۔ ہم دونوں کا ذکر کرتے ہیں

i۔ اہل کتاب سے معاشرت اور میل جول رکھ کر سابقہ شرائع سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ یہ راستہ بالکل بند ہے کیونکہ بعثت سے قبل مطلقاً آنحضرتؐ کا اہل کتاب سے کوئی رابطہ ہی نہیں تھا، بالخصوص مکہ میں کسی یہودی یا عیسائی مذہبی راہنما کا وجود نہ تھا۔ جس سے آنحضرتؐ شرائع سابقہ

---

[۱] مسند احمدؒ، ج ۱، ص ۱۸۹۔۱۹۰

[۲] ''ذریعۃ'' سید مرتضیٰ، ج ۲، ص ۵۹۶

[۳] مفاہیم القرآن، ج ۴، ص ۷۷ تا ۱۱۶

کے احکام سیکھے۔

اس سے قطع نظر حضرت عیسیٰ کی کوئی مفصل شریعت نہ تھی کیونکہ ان کی غرض بعثت یہودیوں کے بعض اندرونی اختلافات کو دور کرنا تھا اور بنی اسرائیل پر بعض حرام امور کی حلت واضح کرنا تھی۔ قرآن مجید اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۝۵۰

(سورہ آل عمران: ۵۰)

''میں پہلے سے نازل شدہ تورات کی تصدیق اور تم پر حرام کیے گئے بعض امور کی حلت اور ایک آیت لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے پرہیز کرو اور میری اطاعت کرو''۔

یہاں ایک تیسرا مطلب بھی پایا جاتا ہے وہ یہ کہ روایات کے مطابق حضور اکرمؐ کائنات میں افضل ترین فرد ہیں۔ لہٰذا افضل کا مفضول کی پیروی کرنا محالِ عقلی ہے۔

ii۔ آنحضرتؐ کے لیے سابقہ شریعتوں سے آگاہی کا دوسرا طریقہ وحی و الہام ہے۔ اس طریقہ سے یہ کبھی اور کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ انبیائے ماسلف کے پیرو رہے ہوں بلکہ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ کو وحی کے ذریعے ان شریعتوں کا علم تھا اور ان میں سے جس کام پر آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمل کا حکم ہوتا، آپؐ عمل کرتے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا (سورہ مائدہ: ۴۴)

''ہم نے تورات نازل کی۔ اس میں ہدایت اور نور ہے اور اس لیے بعض انبیاءؑ اس کے ذریعہ امور بجا لاتے ہیں''

اگر آنحضرتؐ کی وحی و الہام کے ذریعے رہنمائی ہوتی تھی تو اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ آنحضرتؐ غیبی ہدایات پر عمل کرتے تھے، رہی یہ بات کہ آنحضرتؐ کسی شریعتِ سابقہ پر عمل کرتے تھے تو اس کے لیے ہمیں اسی تیسرے نظریہ پر گفتگو کرنا ہوگی جس کو ہم اب پیش کرتے ہیں:

۳۔ حضورِ اکرمؐ الہامِ غیبی پر عمل کرتے تھے؟

اس نظریہ کے مطابق بعثت سے پہلے حضرت رسولِ اکرمؐ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی الہام کے مطابق کرتے تھے۔

اس صورت میں ضروری نہیں کہ یہ الہام سابقہ شریعتوں کے دائرہ کار میں منحصر تھا یا آئندہ آنے والی شریعت اسلام کے مطابق ہوتا

تھا۔ یہ نظریہ مذکورہ بالا دونوں نظریوں سے بہتر اور زیادہ قرینِ عقل و منطق ہے اور اس پر حضرت علیؑ نے بھی گواہی دی ہے، جس کی توضیح یہ ہے:

ا۔ مقامِ نبوت وہ بلند ترین مقام ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے انسان اس مقام پر رفتہ رفتہ فائز ہوتا ہے۔ اس سے انسان میں روحانی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ فرشتہ کو دیکھ سکے۔ وحی الٰہی کو سن سکے اور مافوقِ طبیعت مادہ سے براہِ راست رابطہ پیدا کر سکے۔ اس صلاحیت کو حاصل کرنے کے لیے ایک غیبی معلم و رہبر کی نگرانی میں عرفان و شعور کی منازل طے کرنا پڑتی ہیں، حتیٰ کہ وہ معلم نبیؐ کا ہاتھ پکڑ کر اس کو ارفع و اعلیٰ مدارج تک لے جاتا ہے۔ قرآن مجید اس حقیقت کو اس طرح بیان فرماتا ہے: "علمه شديد القوىٰ یعنی ایک عظیم اور طاقت ور معلم نے ان کو پڑھایا" (نجم: ۵)۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعثت سے پہلے آنحضرتؐ معلم غیبی اور قربت الٰہی سے بے نیاز نہیں تھے، حتیٰ کہ وہ کیفیت و مقام آنحضرتؐ کو حاصل ہوا کہ آنحضرتؐ "اقرا باسم ربك الذى خلق" کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

حضرت علیؑ اس حقیقت کو خطبہ قاصعہ میں بیان فرماتے ہیں۔

و لقد قرن الله من لدن ان كان فطيما اعظم ملك من ملائكته يسلك به طريق المكارم و محاسن اخلاق العالم ليله و نهاره[۱]

"جس دن سے حضورِ اکرمؐ کے دودھ چھڑایا گیا، اللہ تعالیٰ نے اپنا بزرگ ترین فرشتہ آپ کے ساتھ کر دیا تاکہ شب و روز آپؐ کے ساتھ مکارمِ اخلاق و محاسن اطوار کی دشوار گزار راہیں طے کرے"

۳۔ عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ وحی کا پہلا مرحلہ جو حضرت رسولِ اکرمؐ کو پیش آیا وہ ایک خواب صادق تھا۔ جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے اسی طرح وہ بات صبح صادق کی مانند واقع ہوتی۔ پھر آنحضرتؐ نے تنہائی میں رہنا اختیار کر لیا، کئی کئی دن غارِ حرا کی تنہائی میں گزارتے اور اس کے بعد گھر تشریف لاتے۔ تھوڑے دن گھر پر رہ کر پھر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے اور دوبارہ ریاضت و عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ ایک مدت تک حضورِ اکرمؐ کا یہی دستور رہا۔ آخر ایک دن وحی نازل ہوئی اور آپؐ کو مقامِ نبوت کا افتخار حاصل ہوا۔[۲]

کلینیؒ "نبی اور رسولؐ میں فرق" کے باب میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

نبی وہ ہوتا ہے جو حقائق کو خواب میں مشاہدہ کرتا ہے، جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا تھا۔ اسی طرح پیغمبر اکرمؐ اسبابِ نبوت کو نزولِ وحی سے قبل مشاہدہ فرماتے تھے۔ اسی حالت میں ایک دن جبرائیل امینؑ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو رسالت پر مامور کیا۔[۳]

یہ روایات و واقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ بعثت سے پہلے حضرت رسولِ اکرمؐ ایک فرشتہ سے تربیت حاصل کر رہے تھے، آپؐ

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ، شمارہ ۱۸۷

[۲] صحیح بخاری ج ۱ ص ۳، باب برالوحی الی رسول اللہ سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۲۳۴ تا ۲۳۶

[۳] کافی ج ۱ ص ۱۷۶

حقائق کو حالتِ خواب میں مشاہدہ فرماتے تھے اور آوازیں سنتے تھے حتیٰ کہ اس منزل پر فائز ہوئے کہ جبرائیل امینؑ آپؐ کے سامنے آئیں اور قرآن مجید آپؐ پر نازل ہو۔ بعثت سے پہلے تمام مدت آپؐ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، کائنات کی تخلیق پر تفکر فرماتے تھے اور ساتھ ہی اپنے ذاتی اور بیوی بچے سے متعلق ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے۔ ان تمام حالات میں غیبی رابطہ آنحضرتؐ کی رہنمائی کرتا رہا۔ اس غیبی رابطے ہی سے آپؐ کو مختلف اوقات و کیفیات میں احکام ملتے رہے جو سابقہ یا آئندہ شریعت کے مطابق تھے یا نہیں۔ یہ حقیقت اس وقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے جب ہم حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ یہ دونوں بچپن کے زمانے ہی میں مقامِ نبوت پر سرفراز ہو چکے تھے اور عالمِ غیب سے رابطہ رکھتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰيَحۡيٰى خُذِ الۡكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيۡنٰهُ الۡحُكۡمَ صَبِيًّا ۙ﴿۱۲﴾ (سورہ مریم: ۱۲)

''اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے تھام لو۔ ہم نے بچپن ہی میں اس کو منصبِ نبوت عطا فرما دیا تھا''

اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِىَ الۡكِتٰبَ وَجَعَلَنِىۡ نَبِيًّا ۙ﴿۳۰﴾ (سورہ مریم: ۳۰)

''میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب عطا فرمائی اور مجھے نبی بنایا ہے''

بالکل اسی طرح ہمارے نبی اکرمؐ بھی بعثت سے پہلے نبوت کے مختلف مراحل کو طے فرما رہے تھے اور عالمِ غیب الٰہی سے رابطہ رکھتے تھے، حتیٰ کہ چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو لوگوں کو دین حق کی دعوت دینے کی ذمہ داری پر فائز فرمایا۔

اس بحث وتمحیص کی بنا پر ہم اس قابل ہو گئے کہ حقیقت سے کسی قدر پردہ اٹھا کر لوگوں کو حق کے ''رخِ روشن کی ایک جھلک دکھا سکیں۔

اب تک کی بحث سے جو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت رسولِ اکرمؐ نے اس خاندان میں آنکھ کھولی جو توحید، ایمان اور تقویٰ کا پابند تھا اور اس گھر کے سربراہ دینِ ابراہیمیؑ کے مکمل طور پر پابند تھے۔

۲۔ بعثت سے پہلے آنحضرتؐ کا ہر طرح عالمِ غیب سے رابطہ تھا اور آپؐ کو مقامِ نبوت کے بعض مراحل حاصل تھے حتیٰ کہ چالیس سال کے سن میں آپؐ مقامِ رسالت پر فائز ہوئے۔

۳۔ بعثت سے قبل آپؐ ذاتی اور معاشرتی تمام معاملات عالمِ غیب کی ہدایات کے مطابق بجا لاتے تھے خواہ وہ سابقہ شریعت کے مطابق تھے یا نہیں۔

آنحضرتؐ کے قبل بعثت ایمان سے متعلق پانچ آیات کی تفسیر

بعض کوتاہ نظر افراد نے، جو مقام انبیاء کے بارے میں کافی علم نہیں رکھتے، آیاتِ قرآن مجید کے ظواہر پر نظر کی ہے، اس لیے انہوں نے رسولِ اکرمؐ کی قبل بعثت کی زندگی پر تنقید کی ہے جو کسی طرح بھی منازلِ علمی، تاریخ واقعی اور احادیث صحیح سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہم اس قسم کی آیات پر پہلے ہی اس کتاب کی جلد ششم میں بحث کر چکے ہیں اور وہاں ہی ان کی تفسیر پیش کی ہے۔ قارئین کرام اس کی طرف رجوع فرمائیں۔

تفسیر موضوعی

جلد ہشتم

قرآن

کا دائمی منشور

نگارش

آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی

ترجمہ

الحسن

حبیب الحسن۔ حسنین گردیزی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شفاعت ایک اسلامی نظریہ ہے

ہم سب لفظ شفاعت سے پوری طرح واقف ہیں کہ جب کسی شخص کو اس جرم اور گناہ کی سزا سنائی جاتی ہے تو ایک شخص ثالث درمیان میں آتا ہے۔ پھر ایک ایسے آدمی کو واسطہ بنالیتا ہے جو اس کی سزائے موت اور حبس وقید سے نجات دلاتا ہے۔ ایسے موقع پر ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس مجرم کے حق میں سفارش کی۔

کلمۂ ''شفاعت''، ''شفع'' سے لیا گیا ہے جس کے معنی ''جفت'' کے ہیں اور یہ ''طاق'' کے مقابلے میں ہے۔ یہاں گناہ گار کو نجات دلانے والے شخص کے واسطہ کو شفاعت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے کا مقام ومرتبہ اور اس کا اثر ونفوذ نیز وہ اسباب وعوامل نجات جو خود مشفوع لہ میں پائے جاتے ہیں (اگر چہ قلیل ہی ہوں) سب آپس میں مل کر ہی اس گناہ گار کی نجات کا موجب بنتے ہیں۔ اولیاء خدا جو گناہ گار کی شفاعت کرتے ہیں ظاہراً اس کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے مقرب بندے اپنے اس قرب ومنزلت کے ذریعے جو خدا کی بارگاہ میں انہیں حاصل ہے خطا کار اور گناہگار بندوں کے لیے وسیلہ نجات بن سکتے ہیں اور خدا سے التماس کرتے ہیں کہ ان گناہ گاروں کو بخش دے۔ لیکن یہ بات یادرہے کہ خود شفاعت اور اس کی قبولیت کچھ شرائط میں مضمر ہے جن میں سے بعض مشفوع لہ اور بعض خود مورد شفاعت سے مربوط ہیں۔ بالفاظ دیگر شفاعت یعنی اذنِ خدا سے ہی اولیائے خدا کا ایسے گناہ گار افراد کی مدد کرنا جو درعین حال کہ گناہ گار تو تھے لیکن انہوں نے خدا اور خاصان خدا سے اپنا ایمانی رشتہ نہیں توڑا تھا۔

ایک لحاظ سے شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ ایک ادنیٰ موجود جو کمال وترقی کی صلاحیت کا حامل ہے کسی بلند وبالاتر موجود سے بحکم ایک قانون فطری مدد طلب کرے، البتہ مدد چاہنے والا روحانی کمال کے لحاظ سے اتنی پستی میں ڈوبا ہوا نہ ہو کہ اپنی ترقی وکمال کی صلاحیت ہی کو گنوا دے کہ اب اس کے لیے دوبارہ پاکیزہ انسان بننے کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے۔

مسلمانوں کے درمیان عقیدۂ شفاعت اتنا راسخ ہے کہ جہاں بھی جائیں اور جس سے بھی دریافت کریں وہ عقیدۂ شفاعت کو اپنے اسلامی عقائد میں ضرور شمار کرتا ہے اور اسلام کے حوالے سے اصل عقیدۂ شفاعت میں اسے کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہوتا۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ مسلمان خدا سے اپنے راز ونیاز کے وقت نیز اپنے عظیم وبزرگ اسلامی رہنماؤں کی قبروں پر جب آتے ہیں تو گناہ گار افراد کے دل وافکار بارگاہِ الٰہی کی جانب سے معین شدہ شفیعوں کی طرف مرکوز ہوجاتے ہیں اور اُن سے خدا کی بارگاہ میں اپنی مغفرت و بخشش کی درخواست کرتے ہیں تاکہ ان انبیاء واوصیاء کی شفاعت کے نتیجے میں خدا کی رحمت ومغفرت ان کے شامل حال ہوجائے۔

اس قسم کا ایک راسخ ومحکم عقیدہ خود ساختہ یا غیر اصیل نہیں ہوسکتا بلکہ یقیناً اسلامی معاشرے کا اس عقیدے کی طرف متوجہ ہونا اس لیے ہے کہ قرآن مجید اور اسلامی روایات میں یہ چیز وارد ہوئی ہے کیونکہ یہ بعید ہے کہ ایک ارب سے زائد آبادی اور بالخصوص اس کے علماء ایک

ایسے عقیدے کی پیروی کریں جو ان کی آسمانی کتاب اور دینی مآخذ میں موجود ہی نہ ہو۔

البتہ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اسلام کا یہ اصلی مسئلہ بھی بعض دوسرے اسلامی معارف کی طرف بعض غلط قسم کے نظریات و شبہات سے مخلوط ہوا ہے۔ اسی لیے علماء اسلام سے لازم ہے کہ عوام پر اس امر کو واضح کریں اور اس کے اصل اسلامی مطالب کو جعلی اور من گھڑت عقائد سے جدا کریں۔

مسئلہ شفاعت اور فردِ عالی کا ادنیٰ فرد کی مدد کرنا پارٹی بازی اور غلط قسم کی ظالمانہ اور طاغوتی سفارشوں سے بالکل جدا ہے۔ اب اگر ایک نا قابل فرد یا جاہل گروہ نے اس اسلامی اصول کو اس کے صحیح محور سے ہٹا دیا ہے اور اس کے پاکیزہ چہرے کو آلودہ کر دیا ہے تو یہ امر اسلام کے صحیح نظریے سے مربوط ہی نہیں۔

بعض لوگ شاید یہ خیال کرتے ہوں گے کہ قیامت کے دن خدا کے مقررہ شفیع یزید و حجاج اور چنگیز خاں جیسے ظالم و سفاک افراد کو بھی اپنی شفاعت کے دائرے میں داخل کریں گے اور وہ سب ان برگزیدہ شفیعوں کی معنویت و نورانیت سے بہرہ مند ہوں گے۔ یوں ان کے مرکز وجود میں پاکیزگی کی طرف ایک جست و خیز پیدا ہوگی۔ مگر وہ لوگ اس لحاظ سے بڑے اشتباہ میں ہیں اس لیے کہ شفیعانِ حقیقی کی شفاعت ایسے افراد کے حق میں ہے جن کے نفس و روح میں کمال و پاکیزگی کی جانب کوئی صلاحیت موجود ہو۔ ایسے افراد جن کے پورے وجود میں لفظ کمال و قوتِ ترقی ہی نہ ہو ان کے تاریک وجود کو شفیع کی نورانیت ہرگز روشن نہ کرے گی۔

البتہ شفاعت کے بارے میں ہمیں یوں سوچنا چاہیے کہ ایک ایسے شخص کو فرض کریں جس نے اپنی عمر کا کچھ حصہ گناہ اور اخلاقی برائیوں میں گزار دیا مگر اللہ کے صالح اور نیک بندوں سے رابطہ رکھنے کی وجہ سے اس کے دل میں ایک روشنی پیدا ہوگی، اس کے اندر ایک انقلاب آ گیا جس نے اسے ایک اچھا انسان بنا دیا۔ اسی کے مشابہ روزِ قیامت انسانوں کے بارے میں تصور کریں کہ وہ انسان جس کی روح و نفس میں آلودگی تو تھی مگر دوسری جانب اس کے اندر کمال تک پہنچنے کی قوت و صلاحیت ختم نہ ہوگئی تھی۔ ایسی صورت میں جب یہ گناہ گار خدا کی جانب سے بھیجے گئے مربیوں سے تمسک کرتے ہیں اور ایسے نورانی انسانوں کے ماحول میں داخل ہوتے ہیں تو نتیجے میں ان کے وجود میں ایک قسم کا انقلاب رونما ہو جاتا ہے اور ان کے نفس و روح میں جانب کمال حرکت کی انقلابی جھلک ظاہر ہو جاتی ہے۔ بس اخروی شفاعت کی حقیقت کے لیے یہ ایک ناقص اور نارسا تعبیر ہے جو خدا کی جانب سے مقررہ شفیع کے وسیلے سے باذنِ الٰہی انجام پائے گی۔ لیکن جب تک اس جہانِ آخرت میں قدم نہ رکھیں شفاعت کی حقیقت سے آگاہ بھی نہ ہو سکیں گے۔

شفاعت کے بارے میں اسی طرح سوچنا چاہیے جس طرح توبہ اور ندامت کے بارے میں سوچا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ توبہ اور گذشتہ گناہوں پر ندامت اگر ان شرائط کے ساتھ ہو جو بتائے گئے ہیں تو یہ انسان کو ان گناہوں سے پاک وصاف کر کے اس کے مرکز وجود میں انقلاب کی رمق پیدا کرتی ہے۔ کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ شریعت میں توبہ کا جواز ظالموں اور مفسدوں کی جرأت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ پس اسی طرح مسئلہ شفاعت کو بھی گناہوں کی وسعت اور گناہ گاروں کے لیے جرأت گناہ کا ذریعہ تصور کرنا درست نہیں بلکہ اسے طہارت و پاکیزگی کی طرف بازگشت کا وسیلہ سمجھنا چاہیے۔ اس امر کی تشریح آپ کتاب ہذا کے حصہ اول میں ملاحظہ کریں گے۔

ہم خدا کے لطف وکرم کے طفیل اس جلد میں مسئلہ شفاعت پر مختلف پہلوؤں سے بحث وتمحیص کریں گے اور غیر موزوں پیرائے اور مطالب کو جو مسئلہ شفاعت کے ساتھ خلط کیے گئے ہیں اس طرح علیحدہ کریں گے جیسے وہ بیکار سبز جڑی بوٹیاں جو گلوں کے جوار سے جدا کی جاتی ہیں۔

اس کتاب میں مسئلہ شفاعت پر جو مختلف زاویوں سے بحث کی گئی ہے اس کی اجمالی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ عقیدۂ شفاعت کے تعمیری اور تربیتی اثرات۔

۲۔ شفاعت سے متعلق علماء اسلام کے نظریات وآرائی۔

۳۔ قرآن کی نگاہ میں شفاعت۔

۴۔ شفاعت کی حقیقت کیا ہے؟

۵۔ شفاعت کا نتیجہ سزا کا ختم ہونا ہے یا درجہ کی بلندی؟

۶۔ شفاعت سے متعلق جھوٹے عقیدے اور ان اعتراضات کا جواب جو عقیدۂ شفاعت پر کیے گئے ہیں۔

۷۔ اولیاء خدا سے طلب شفاعت کیسے کی جائے؟

۸۔ شفاعت اسلامی احادیث میں۔

۹۔ قرآن وحدیث میں شفیع اور مشفوع لہ۔

۱۰۔ عربی وفارسی ادبی آثار میں شفاعت۔

اللہ تعالیٰ سے لیاقت وشائستگی کی توفیق چاہتے ہیں تا کہ قیامت کے دن اس کی بارگاہ میں محبوب بندوں کی شفاعت ہمارے نصیب ہو اور اگر خدانخواستہ اس فیض سے محروم ہو گئے تو ان شفیعوں سے گلہ نہ کریں بلکہ اپنی کوتاہی، تقصیر اور گناہ کی طرف متوجہ ہوں (اور کیف افسوس ملیں) بقول شیخ سعدیؒ ؎

گر خواجہ شفاعت نکند روزِ قیامت
شاید کہ زمشاطہ نرنجیم کہ ز شتیم

شفاعت کے علاوہ دو مسئلوں توبہ اور احباط وکفارۂ گناہ پر بھی قدرے گفتگو کریں گے کیونکہ شفاعت کے ساتھ ان کا قریبی رابطہ ہے۔ بہر حال ان سب پر بحث وگفتگو کرنے کے بعد منشور جاوید جو فارسی زبان میں اولین تفسیر موضوعی ہے، کی ساتویں جلد قارئین محترم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے اور پھر دیگر تین جلدیں گنا میں ''معاد از نظر قرآن'' سے متعلق بحث ہے، جلد ہی چھپ کر منظر عام پر آئے گی۔

جعفر سبحانی

مؤسسہ حضرت امام صادقؑ علیہ السلام

قم

عقیدۂ شفاعت کے تعمیری اور تربیتی اثرات

دیباچے میں بطور خلاصہ حقیقت شفاعت کے بارے میں گفتگو کی گئی۔ مناسب ہے کہ اس مذہبی عقیدے کے تربیتی اثرات اور تعمیری خصوصیات کا جائزہ لیں اگرچہ کلاسیکی ابحاث کے طریقہ کار کے مطابق لازم تھا کہ پہلے شفاعت کے دلائل کو قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھ لیتے بعدازاں اس کے تربیتی اور انقلابی اثرات کا ذکر کرتے، اس لیے کہ جب تک کسی چیز کو عقل ونقل کے ذریعے ثابت نہ کیا جائے اس کے بارے میں بحث ایک ثانوی اور فرعی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن آج کل بہت سارے دانشوروں کو نظر میں ایک مذہبی عقیدے کے بارے میں بحث وتمحیص کی حیثیت اس کے تعمیری اور تربیتی آثار ونتائج پر منحصر ہے۔ پس اگر کسی مذہبی عقیدے میں یہ اثرات نہ ہوں تو وہ اس مذہب کے فرعی اور ثانوی درجہ کے مسائل میں شمار ہوگا۔ پھر ایسے مسائل کی تحقیق کو بعض اوقات اہل نظر افراد نظرانداز کرتے ہیں۔

اس وجہ سے شفاعت کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اور یہ کہ انہی موازین کے تحت جن کو ان دانشوروں نے کسی مذہبی مسئلے کی اہمیت کو واضح کرنے کی خاطر متعین کیا ہے عقیدۂ شفاعت سرفہرست مذہبی مسائل میں سے ہے۔ لہٰذا ہم بھی اس کے تربیتی اور تعمیری اثرات سے متعلق گفتگو کو دیگر ابحاث پر مقدم کرتے ہیں۔

شفاعت امید کا جوہر ہے

شفاعت پر عقیدہ گناہ گاروں کے دل میں امید پیدا کرتا ہے اور دورانِ حیات میں خدا کی جانب پلٹ آنے کا ذریعہ ہے۔ اگر شفاعت کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اولیاء اللہ کی شفاعت کا عقیدہ نہ صرف خدا کے مقابلے میں جرأت اور نافرمانی کا سبب نہیں بلکہ یہ عقیدہ ہی سبب بنتا ہے کہ کچھ لوگ اس اُمید پر کہ خدا کی طرف بازگشت کا دروازہ کھلا ہوا ہے اولیاء اللہ کے وسیلے سے اپنے گذشتہ گناہوں سے نجات پاتے ہیں اور یوں معصیت وسرکشی اور نافرمانی سے پرہیز کر کے خدا کی جانب لوٹ آتے ہیں۔

نہ فقط شفاعت انسانوں کی زندگی میں یہ کردار ادا کرتی ہے بلکہ قبولیت توبہ، یا اس سے بالاتر امر انتظارِ فرج اور مستقبل میں معاشرے کی اصلاح کی امید وغیرہ ان تعمیری اور قوت بخش عوامل میں سے ہیں جو انسانوں کے حالات میں بہتر تبدیل لاتے ہیں اور اضطراب کا سدباب کرتے ہیں اور اسے مایوسی اور نااُمیدی کے گھپ اندھیرے سے امید ورجا کی روشن فضا میں داخل کرتے ہیں۔

اولیائے خدا کی شفاعت کا عقیدہ (مخصوص شرائط کے تحت) گناہ گاروں کے لیے اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ ایک گناہ گار انسان یہ عقیدہ قائم کرے کہ وہ اس کے بعد اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے اور گذشتہ اعمال ایسے نہیں ہیں کہ اس کے لیے حتمی بدبختی کی اور ناقابل تغیر صورت اختیار کر چکے ہیں اور نہ بدلنے والا نتیجہ مقدر کیا ہو بلکہ وہ ابھی سے ہی اولیائے خدا کی مدد اور خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کے پختہ ارادے سے اپنے مقدر کو بدل سکتا ہے اور اپنے لیے سعادت کے دروازے کھول سکتا ہے مگر اس کے برعکس مایوسی اور نااُمیدی اور یہ خیال کہ اب نہ خود اس

سے اور نہ کسی اور سے کوئی کام بن سکتا ہے، ایسا خیال اس کے شبستانِ حیات کے چراغ کو گل کر دیتا ہے۔

وہ جوان جس کی زندگی گناہ اور لغزشوں میں بسر ہوئی ہو اگر وہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ اس کے گذشتہ برے کاموں نے اس کی سعادت کے محل کو اس طرح ڈھا دیا ہے کہ اب اس کی دوبارہ تعمیر ممکن نہیں اور ایک ایسا بخت ونصیب تیار کیا ہے کہ جو کسی بھی طرح بدلا نہیں جا سکتا اور خدا کی مغفرت کے حصول کی اب کوئی راہ باقی نہیں رہ گئی، یہاں تک کہ توبہ وندامت اور اولیائے حق کی مدد بھی طلب کرنا اس کے برے انجام کو بدل نہیں سکتا۔

ایسا عقیدہ نہ صرف اس کے گناہ کو کم نہ کر سکے گا بلکہ یہی عقیدہ سبب بنے گا کہ اس کی زندگی روز بروز تاریک اور اجیرن ہوتی جائے اور بار گناہ سنگین تر ہوتا رہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے تئیں یہ خیال کرے گا کہ اب تو میرے لیے نیک راہ کی طرف آنے کا کوئی راستہ نہیں اور جتنا بھی نیکی اور اطاعت کی راہ میں قدم اُٹھالوں میرے لیے اس میں کسی قسم کا فائدہ نہیں۔ پس جب یہ حال ہے تو اب کوئی وجہ نہیں بنتی ہے کہ اپنی باقی ماندہ زندگی میں اطاعت کی زحمت خواہ مخواہ برداشت کروں اور لذت بخش گناہوں سے ہاتھ اٹھالوں۔ لیکن اس کے برخلاف جب وہ اپنے لیے امید کا دروازہ کھلا دیکھتا ہے اور جان لیتا ہے کہ ابھی زندگی اور مقدر سنوارنے کا وقت ہے تو ایسی صورت میں وہ کوشش کرتا ہے کہ گذشتہ کی تلافی کرے اور آیندہ کے لیے اپنے آپ کو سدھارے۔

مزید برآں آیندہ عرض کریں گے کہ اولیائے خدا کی شفاعت موقوف ہے خدا کے اذن پر جب تک خدا کا اذن نہ ہوگا کوئی بھی شخص شفاعت نہیں کر سکتا۔ بنا کہے ظاہر ہے کہ اذن خدا بلا وجہ اور بغیر حکمت نہیں ہوا کرتا تو پس یہ کہہ دیا جائے کہ اذن خدا ان لوگوں کے لیے ہوگا جو عفو و درگزر کی اہلیت رکھتے ہوں اور اگر اپنی زندگی میں کسی لغزش یا خطا کے مرتکب ہوئے بھی ہوں تو یہ پردہ داری، علی الاعلان نافرمانی اور سرکشی کی حد تک نہ پہنچی ہو۔ اگر خدا سے رابطہ بعض پہلوؤں میں کمزور بھی ہوگیا ہو تو بھی بالکل ہی منقطع نہ ہو چکا ہو۔ ایسے افراد کہ جنہوں نے حق وحقیقت سے ہر طرح کا تعلق نہ توڑ دیا ہو تو وہ شفاعت کے اہل ہیں اور شفاعت ان کے شامل حال ہو جائے گی۔

گناہ گاروں کے لیے اس شرط کے ساتھ شفاعت کی خوشخبری خود ایک قسم کی تنبیہ ہے کہ وہ ہوشیار رہیں اور گناہ سے فوراً ہاتھ اٹھالیں اور اپنے تمام رابطوں کو خدا سے قطع نہ کریں، کھلے بندوں گناہ نہ کریں اور شفاعت کی روشن کرن سے دور نہ ہو جائیں اس لیے کہ شفاعت کے علاوہ ان کی نجات کے لیے کوئی راہ باقی نہیں۔

یہی احساس اور توجہ گناہ گاروں کے لیے نیک راستے کی طرف لوٹ آنے اور اپنے غلط لائحہ عمل کے اوپر تجدید نظر کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ درحقیقت شفاعت کا عقیدہ ان کے دل میں امید پیدا کرتا ہے کہ زندگی کو برائیوں سے پاک کرنے کا راستہ موجود ہے جو زندگی کے لائحہ عمل کو غلط اور تاریک نقاط سے پاک کرنے کا ذریعہ ہے۔

تجربے نے ثابت کیا ہے کہ اگر مجرموں پر امید کا دریچہ کھول دیا جائے اور وہ یہ احساس کریں کہ اگر وہ زندگی کے غلط اور ناروا طرزِ عمل پر تجدید نظر کریں تو ابھی ان کے لیے راہ نجات باقی ہے تو ان میں سے بہت سارے بے راہ روی کو ترک کر کے صحیح راستے پر پلٹ آئیں گے۔

تمام اقوام کے جزا وسزا کے قوانین میں ایک قانون موجود ہے کہ بڑے مجرموں اور عمر قید کے سزا یافتگان کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس

کا مقصد یہ ہے کہ ان افراد کے لیے اُمید کا ایک دریچہ کھل جائے تا کہ وہ اپنے زندگی کے طرزِ عمل پر تجدید نظر کریں اور اگر یہ امید کا دریچہ نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ ہوتی کہ وہ اس جگہ پر بھی آرام سے رہیں اور کسی قسم کا جرم نہ کریں، کیونکہ عمر قید سے بڑھ کر تو ان کے لیے کوئی سزا نہیں ہوسکتی۔

شفاعت بھی لائق اور شائستہ افراد کے لیے اپنے طرزِ عمل پر دینی اور اخلاقی اعتبار سے تجدید نظر کے لیے دریچہ امید کے علاوہ کوئی شے نہیں اور یہ شفاعت ان افراد سے مخصوص ہے جنہوں نے خدا اور اولیائے دین سے اپنا رابطہ محفوظ رکھا ہے مگر وہ آدمی جس کے نیک اعمال نہیں ہوں اور وہ خدا پر ایمان سے بھی بہرہ مند نہ ہو بلکہ اپنی عمر کا ایک حصہ گناہ اور برائی میں بسر کر چکا ہو تو وہ ہرگز شفاعت کا حق دار نہ ہوگا۔

مذکورہ دو قسم کے گروہوں کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے لیے، ہم ایک مثال عرض کرتے ہیں۔ فرض کریں کہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر موجود ایک قلعہ کو فتح کرنے کے لیے کچھ فوجی مامور کیے گئے ہیں۔ اس قلعہ کو فتح کرنا بیرونی جارحیت سے ملک کی حفاظت کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ فوجی دستے کا تجربہ کار اور ماہر کمانڈر پہاڑی پر چڑھنے اور قلعہ کو فتح کرنے کے تمام ضروری وسائل ان کے لیے مہیا کرتا ہے اور فوجی دستے کو پہاڑی پر چڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ اس دستے کے کچھ ڈرپوک اور بے نظم افراد اگر اپنے کمانڈر کے حکم کو پس پشت ڈال کر پہاڑی کے دامن ہی رک جائیں تو ایسے افراد کو کمانڈر کی حمایت ہرگز حاصل نہیں ہوگی، لیکن وہ افراد کہ جو ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیزی سے پہاڑی پر چڑھ جائیں گے، اگر ان کے درمیان بعض کمزور اور ناتواں افراد ہوں گے کہ جو بعض گزرگاہوں پر ڈگمگائیں گے یا پہاڑی کے بعض حساس نقاط پر ان کے لئے اوپر چڑھنا مشکل ہوگا تو ہمدرد کمانڈر ان کی نگہبانی کرے گا اور ان مشکل مقامات سے گزرنے میں ان کی مدد کرے گا۔ اس قسم کی نگہبانی اور مدد ایک طرح کی شفاعت ہے اور اس کے مستحق وہی افراد ہیں جو منزل مقصود کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ اب کوئی قباحت بھی نہیں ہے کہ پہاڑی پر چڑھ جانے سے پہلے ہی ہمدرد کمانڈر اس بات کا اعلان کرے اور کہہ دے کہ اگر تم خطرناک مقامات پر چڑھ نہ سکو تو گھبرانا نہیں، میری بے دریغ مدد تم کو ملتی رہے گی اور میری مدد سے محروم نہ رہو گے، میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ منزل تک پہنچنے میں تمہاری مدد کروں۔ اس طرح وقت سے پہلے اعلان اس کام کو انجام دینے کے لیے حوصلے کا باعث بنتا ہے اور ان کے دل میں امید کی جھلک پیدا ہوتی ہے نیز ان کی طاقت و استقامت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی درحقیقت یہ تکامل کے لیے ایک قسم کی تربیت اور وسیلہ ہے۔ اس مقام پر ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ عقیدۂ شفاعت اس صورت میں موثر اور تربیت دھندہ ہوسکتا ہے جب اس کی تفسیر و تشریح ہر طرح کی عوام فریبی سے دور رہ کر کی جائے۔ وہ نظریہ شفاعت کہ جس کی جانب قرآن و حدیث اور ہماری عقل دعوت دیتی ہے اس کو اس شفاعت سے جدا کیا جائے جس کو اسلامی تعلیمات سے دور بعض افراد نے پیش کیا ہے، اس لیے کہ بعض اوقات اسلام سے ناواقف افراد کی شفاعت کے لیے اس طرح کی غلط تفسیر لوگوں کو حقیقت تک پہنچنے سے روکتی ہے۔

ہمیں ایک شاعر ''حاجب'' کا شعر یاد آرہا ہے کہ وہ خیال کرتا تھا کہ قیامت کے دن مولا علیؑ کا دست مبارک گناہ گاروں کی شفاعت کے لیے اس طرح کھلا ہوا ہے کہ آپ کے چاہنے والے آپ کی شفاعت پر اطمینان کر کے جیسا دل چاہے آزادی سے گناہ کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے امام کی شان میں اس نے ایک قیصدہ کہا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

حاجت اگر معاملہ حشر با علی است
من ضامنم تو ہر چہ بخواہی گناہ کن

(حاجب اگر حشر کا معاملہ علیؑ کے ہاتھ میں ہے تو میں ضامن ہوں جتنے چاہے گناہ کر)

لیکن یہی شاعر اپنے قول کے مطابق خواب میں مولا علیؑ کو دیکھتا ہے اور اس طرح کے غلط شعر کہنے پر مولا علیؑ کی ناراضگی کو محسوس کرتا ہے، نیز امام نے خواب میں اس سے فرمایا کہ شعر کے دوسرے مصرعے کو تبدیل کرو اور یوں کہو ؎

حاجت اگر معاملہ حشر باعلیؑ است
شرم از رُخ علی کن و کمتر گناہ کن

(حاجت اگر حشر کا معاملہ علیؑ کے ہاتھ میں ہے تو علیؑ سے حیا کر اور گناہ کم کر)

یہ قصہ چاہے حقیقت رکھتا ہو یا افسانہ یا محض ایک مفروضہ، بہر حال حقیقت تو یہی ہے جو اس قصے میں بیان ہوئی ہے۔

عزیز نو جوان اور مکتب انبیاء کے چاہنے والوں کو چاہیے کہ اپنے دینی معارف کو صاحب تحقیق علماء اور اصلی اسلامی کتابوں سے حاصل کریں تاکہ حقیقی اور تحریف شدہ شفاعت کو بخوبی پہچان سکیں اور کسی سادہ ظاہر فتنہ ساماں یا پیشہ ور داستان گو یا پھر نااہل افراد کی گمراہ کنندہ تحریروں پر اعتماد نہ کریں۔

شفاعت علماء اسلام کی نظر میں

اس حصے میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ تمام علماء اسلام اور مسلمان دانشور شفاعت کو اسلام کے اصول مسلمہ میں سے سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے کسی فرقے نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے، البتہ اگر اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کے مفہوم و معنی میں ہے۔

علماء اسلام کی اکثریت ظاہر آیات و احادیث کی روشنی میں شفاعت کی یوں تفسیر کرتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے سائے میں اور شفیعانِ حقیقی کے اس مقام و احترام کے طفیل جو خدا کی بارگاہ میں ان کو حاصل ہے کچھ گناہ گار افراد (ان شرائط کے تحت جو بعد میں بیان کی جائیں گی) عذاب سے نجات پائیں گے اور خدا ان کے گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔

مگر علماء اسلام کے دو فرقے معتزلہ اور خوارج نے اصل شفاعت کو اگرچہ قبول کیا تاہم اس کی تفسیر و تشریح میں دیگر علماء اسلام کی مخالفت کی ہے۔ ان کا یہ تصور ہے کہ شفاعت کے مستحق افراد نیکوکار اور فرمانبردار لوگ ہیں، گناہ گار اس کی اہلیت نہیں رکھتے۔ پس اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت ان نیک بندوں کے درجات میں اضافے کا سبب بنے گی نہ یہ کہ گناہ گاروں کی نجات کا باعث۔

ان دونوں فرقوں نے شفاعت کے مفہوم میں تمام علماء اسلام کی جو مخالفت کی ہے اس کی وجہ ان کا وہ نظریہ ہو سکتا ہے جو انہوں نے گناہِ کبیرہ کرنے والے افراد کے بارے میں اختیار کیا ہے، اس لیے کہ دونوں فرقے معتقد ہیں کہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہونے والوں کو کبھی بھی بخشا نہیں جائے گا، بلکہ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ اس وجہ سے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ شفاعت سے متعلق آیات و احادیث کی ظاہر کے

خلاف اور غیر صحیح تفسیر کریں اور اگر وہ مقدمہ سننے سے پہلے فیصلہ نہ کر لیتے تو شفاعت والی آیات واحادیث کی اس طرح غلط توجیہہ ہرگز نہ کرتے کیونکہ کسی مسئلے کے بارے میں قبل از وقت فیصلہ دینا باعث ہوتا ہے کہ انسان دیگر مسائل میں بھی خطا کرے اور گمراہ ہو جائے۔

اس حصے میں ہمارا ہدف شفاعت سے متعلق علماء اسلام کے تمام کلمات ونظریات کی تحقیقی وجانچ پڑتال نہیں، اس لیے کہ اس کام کی تکمیل کے لیے تاریخ اسلام کے تمام ادوار اور صدیوں میں لکھی ہوئی عقائد پر مشتمل دینی کتابوں اور تفسیروں نیز احادیث کی کتابوں میں تلاش و تحقیق لازم ہے۔ یہ کام ہمیں اس کتاب کے اس ہدف سے باہر لے جائے گا کہ ہم قرآنی نظر سے مسئلہ شفاعت کی تحقیق کریں البتہ اکابر علماء شیعہ وسنی کے افکار ونظریات کو نمونہ کے طور پر ہم ان کی مولفات سے نقل کریں گے تاکہ یوں دیگر علماء اسلام کے آراء ونظریات سے اجمالی طور پر قارئین محترم آشنا ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر!

''مشت نمونہ خر وار گردو''

علمائے کے افکار ونظریات

۱۔ ابی منصور محمد بن محمد ماتریدی سمرقندی (متوفی سال ۳۳۲ھ) آیۃ "ولا یقبل منها شفاعة"[1] جو شفاعت کی نفی کرتی ہے، اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ آیت شفاعت مقبولہ کی طرف اشارہ ہے اور اس شفاعت مقبولہ کے اثبات کے لیے "لا یشفعون الا لمن ارتضی"[2] سے استدلال کرتے ہیں۔[3] اور کہتے ہیں کہ اگرچہ پہلی آیت شفاعت کی نفی کرتی ہے لیکن اسلام میں ایک شفاعت مقبولہ بھی ہے جس پر مذکورہ آیت دلالت کرتی ہے۔

۲۔ تاج الاسلام ابوبکر محمد کلا آبادی متوفی سال ۳۸۰ھ کہتے ہیں کہ من جملہ وہ امور جن کو خدا نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابلاغ بھی کیا ہے ان میں سے ایک مسئلہ شفاعت بھی ہے۔ خدا شفاعت کے بارے میں یوں فرماتا ہے:

وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيكَ رَبُّكَ فَتَرۡضَىٰٓ ۝٥[4]

''اور تمہارا پروردگار عنقریب اس قدر عطا کرے گا کہ تم خوش ہو جاؤ۔''

نیز ارشاد ہوا:

---

[1] سورۃ بقرہ آیت ۴۸

[2] سورۂ انبیاء آیت ۲۸

[3] تفسیر ماتریدی معروف بہ تاویلات اہل السنۃ، طبع قاہرہ ۱۳۸۹ھ ص ۱۴۸

[4] سورہ ضحیٰ آیت ۵

عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾[۱]

''امید ہے کہ (قیامت کے دن) خدا تم کو مقام محمود تک پہنچائے۔''

اسی طرح پھر ارشاد فرمایا:

وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی[۲]

''اور یہ لوگ اس شخص کے سوا جس سے خدا راضی ہو کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے۔''

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ادخترت شفاعتی لاهل الکبائر من امتی"[۳]

''میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے ان گناہ گار افراد کے لیے ذخیرہ کیا ہے جو جہالت کی بناء پر بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔''

۳۔ استاد شیعہ شیخ مفید مرحوم فرماتے ہیں:

علمائے امامیہ کا اتفاق ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے دن گناہانِ کبیرہ کرنے والوں کی شفاعت کریں گے اور نہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلکہ امیر المومنینؑ اور آئمہ معصومینؑ بھی آپ کے بعد گناہ گار شیعوں کے حق میں شفاعت کریں گے۔ ان کی شفاعت کے نتیجے میں کافی سارے گناہ گار شیعہ نجات پائیں گے۔

مگر اہل سنت کے کچھ خاص افراد مثلاً معتزلہ نے امامیہ کی مخالفت کی اور یہ تصور کیا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت مطیع اور فرمانبردار افراد کے لیے ہوگی نہ کہ گناہ گاروں کے لیے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے افراد کی شفاعت ہرگز نہیں فرمائیں گے جو عذاب سے کے مستحق ہیں۔

ان افراد کے عقیدے کے تحت شفاعت بلندی اور جزا میں اضافے کا سبب ہوگی نہ کہ گناہوں کی بخشش کا باعث۔[۴]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

قیامت کے دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شیعہ گناہ گاروں کے حق میں شفاعت فرمائیں گے اور خدا آپؐ کی شفاعت کو قبول

---

[۱] سورہ اسرا آیت ۷۹

[۲] سورہٴ انبیا آیت ۲۸

[۳] التصرف المذہب اہل التصوف، باب ۱۸ ص ۵۴۔۵۵، تحقیق عبدالحلیم محمود وطٰہٰ عبدالباقی سرور طبع ۱۳۸۰ھ

[۴] اوائل المقالات ص ۱۴ و ۱۵

فرمائے گا۔ امیر المومنین بھی اسی طرح شفاعت کریں گے اور خدا اُن کی شفاعت بھی قبول کرے گا، یہاں تک کہ نیک اور صالح مومن بھی اپنے گناہ گار دوست کے لیے شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت بھی موثر ہوگی۔ خدا اس کی شفاعت کو بھی قبول فرمائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جس پر تمام امامیہ علماء کا اتفاق ہے، قرآن نے بھی اس امر کی تصریح کی ہے اور احادیث اسلامی بھی اس مسئلے کی تائید کرتی ہیں۔

مگر کافر افراد شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لیے وہ قیامت کے دن حسرت سے کہیں گے:

فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيۡقٍ حَمِيۡمٍ ﴿۱۰۱﴾[۱]

''ہمارے لیے نہ کوئی شفیع ہے اور نہ مہربان دوست۔''

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں قیامت کے دن شفاعت کروں گا اور میری شفاعت قبول ہوگی، علیؑ بھی شفاعت کریں گے اور ان کے شفاعت بھی قبول ہو جائے گی اور کم سے کم شفاعت وہ ہوگی جو ایک مومن کرے گا اور وہ یہ کہ وہ اپنے چالیس دینی برادران کے حق میں شفاعت کرے گا۔''[۲]

۴۔ شیخ طوسی (متوفی ۴۶۰ھ) ''وَلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ''[۳] کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اس آیت میں اس شفاعت کی قبولیت کی نفی ہو رہی ہے جو کافروں کے حق میں ہوگی، اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو مومن افراد کے حق میں شفاعت فرمائیں گے اور شفاعت کا نتیجہ کچھ گناہ گار افراد کا عذاب الٰہی سے نجات حاصل کرنا ہے۔''

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ادخرت شفاعتی لاهل الكبائر من امتی''

''میں نے اپنی شفاعت کو ان افراد کے لیے ذخیرہ کیا ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔''

نہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفاعت کریں گے بلکہ آئمہ معصومینؑ اور بہت سارے اہل ایمان جو صالح و پاک ہیں وہ بھی شفاعت کریں گے۔

اس کے بعد شیخ طوسی نے اس اختلاف کا ذکر ہے جو شفعت کے معنی میں مسلمانوں اور ان کے ایک گروہ معتزلہ کے درمیان واقع ہوا

---

[۱] سورہ شعرائ آیت ۱۰۰، ۱۰۱

[۲] اوائل المقالات ص ۵۲۔ ۵۳

[۳] سورہ بقرہ آیت ۴۸

ہے اور اس ضمن میں جناب شیخ نے مطلب کا حق ادا کر دیا ہے۔[1]

۵۔ عظیم المرتبت شیعہ مفسر طبرسی مرحوم اپنی مایہ ناز تفسیر میں لکھتے ہیں:

''تمام مسلمانوں کو اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قیامت کے دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت قبول ہو جائے گی، اگر چہ معتزلہ اور دیگر فرقوں کے درمیان کیفیت شفاعت میں اختلاف ضرور ہے۔ ہم (اہل تشیع) کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا مقصد گناہ گاروں کو عذاب سے نجات دینا اور اُن کے برے اعمال کی بخشش ہے جبکہ معتزلہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت فرمانبردار افراد کے حق میں قبول ہوگی یا پھر ان افراد کے لیے ہوگی جنہوں نے گناہوں سے توبہ کی ہے۔

نہ صرف پیغمبر کی شفاعت قبول ہو جائے گی بلکہ آپ کے برگزیدہ اصحاب اور آئمہ معصومینؑ اور صاحبانِ ایمان اور صالح افراد کی شفاعت بھی قبول ہو جائے گی۔[2]

۶۔ قاضی عیاض کہتے ہیں:

''اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ عقل کی نگاہ میں شفاعت کے بارے میں کوئی اشکال نہیں ہے اور ادلہ منقولہ کے لحاظ سے شفاعت پر عقیدہ رکھنا لازم اور واجب ہے، اس لیے کہ قرآن مجید اور مخبر صادق (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے بارے میں خبر دی ہے اور بہت ساری احادیث کہ جن کی تعداد تواتر کی حد تک پہنچتی ہے، اس مسئلے میں وارد ہوئی ہیں۔''

یہ تمام روایات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ قیامت کے دن گناہ گار مومن افراد کے حق میں شفاعت ہوگی۔ اس مسئلے میں مسلمانوں کے تمام علماء گذشتہ کا اتفاق نظر ہے سوائے خوارج اور معتزلہ کے کہ ان کا عقیدہ شفاعت پر نہیں ہے۔ ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے خیال کیا ہے کہ گناہگار لوگ عذابِ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور انہوں نے اس مطلب کے لیے فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾[3] سے استدلال کیا ہے۔[4] درحالیکہ یہ آیت وجودِ شفاعت کی نفی نہیں کر رہی اس لیے کہ یہ آیت مشرکوں سے مربوط ہے اور بت پرستوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جبکہ ہم ان صاحبانِ ایمان کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں جو کسی گناہ ولغزش میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

مگر ان لوگوں کا نظریہ بہت بے اساس ہے جو احادیث شفاعت کی تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مقصود یہ ہے کہ شفاعت کے نتیجے میں پاک دامن افراد کا رُتبہ بڑھ جاتا ہے، نہ یہ کہ گناہگار عذاب سے نجات پائیں گے اس لیے کہ قرآن کی آیات اور احادیث اسلامی پوری

---

[1] تبیان ج۱ ص ۲۱۳، ۲۱۴۔ چاپ نجف

[2] مجمع البیان، ج۱ ص ۱۰۳۔ نیز ج۲ ص ۸۳ تفسیر آیت ۵۸ سورۂ نسا

[3] سورہ مدثر آیت ۴۸

[4] قرآنی شفاعت کی بحث میں اس آیت کے ذیل میں تشریح کی جائے گی

صراحت کے ساتھ ان دونوں گروہوں کے عقیدے کو رد کرتی ہیں۔[۱]

۷۔ امام ابوحفص عمر بن محمد نفسی (متوفی ۵۳۷ھ) لکھتے ہیں:

روزِ قیامت شفاعت کا حق انبیاء اور صالح افراد کے لیے قطعی طور پر ثابت ہے اور یہ مسئلہ دین اسلام میں بطور مستفیض ثابت ہو چکا ہے۔[۲]

۸۔ سعد الدین تفتازانی (متوفی ۷۹۱ھ) کہ جنہوں نے اس کتاب (العقائد النسفیہ) پر شرح لکھی ہے، متن کی تصدیق کر کے اسی کی شرح لکھ دی ہے۔

۹۔ ابوعلی محمد بن احمد فتال نیشاپوری، کتاب ''روضۃ الواعظین'' میں شفاعت سے مربوط کچھ آیات وروایات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے درمیان اس میں اختلاف نہیں ہے کہ شفاعت اسلام کے اصولِ مسلمہ میں سے ہے۔ البتہ جو چیز اختلافی ہے وہ یہ ہے کہ جو ''مکتب وعیدیہ''[۳] کے ماننے والے کہتے ہیں کہ شفاعت کا نتیجہ ثواب میں اضافہ اور درجہ کی بلندی ہے جبکہ دیگر علماء نے شفاعت کے معنی اور اس کی تفسیر عذاب سے گناہگار افراد کی نجات بیان کیا ہے۔'' اس کے بعد انہوں (ابوعلی محمد بن احمد فتال نیشاپوری) نے وعیدیہ کے نظریہ کو رد کیا ہے اور اسی پر بحث کو ختم کیا ہے۔[۴]

۱۰۔ احمد بن الحسن الرصاص (متوفی ۶۰۰ھ تقریباً) مؤلف کتاب ''مصباح العلوم''[۵] (جو عقائد زیدیہ کے بارے میں تالیف کی گئی ہے) میں یوں لکھتے ہیں:

''روزِ قیامت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت قطعی اور ناقابل انکار امور میں سے ہے۔''

۱۱۔ فخر رازی لکھتے ہیں:

اُمت اسلامی کا اتفاق ہے کہ روزِ قیامت رسولِ گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شفاعت کرنے کا حق حاصل ہے۔ البتہ معتزلہ نے شفاعت کا معنی کچھ اور انداز میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قیامت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت سے مقصود یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی شفاعت سبب ہوگی کہ بندگانِ صالح کا اجر زیادہ ہو نہ یہ کہ گناہ گاروں کو عذاب سے رہائی مل جائے۔

مگر حق وہی ہے جس کو تمام اسلامی فرقوں (سوائے مذکورہ فرقے کے) نے بیان کیا ہے، اور شفاعتِ پیغمبرؐ کے معنی یہ ہیں کہ گناہ

---

[۱] شرح صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۸، بحار الانوار ج ۸ ص ۶۲

[۲] العقائد النسفیہ ص ۱۴۸ طبع آفسٹ بغداد

[۳] مقصود معتزلہ ہے

[۴] روضۃ الواعظین ص ۴۰۵

[۵] معروف بہ ثلاثین۔ انتشارات دانشگاہ بیروت با مقدمہ ڈاکٹر محمد عبدالسلام کنافی استاد ادبیات اسلامی دانشگاہ قاہرہ چاپ ۱۹۷۱

گاروں کو دوزخ کے عذاب سے نجات دلائے تا کہ وہ جہنم میں داخل نہ ہو جائیں اور وہ لوگ بھی جو جہنم کی آگ میں جل رہے ہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے سائے میں دوزخ کی آگ سے نکل کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

اسی طرح تمام مسلمانوں کا اتفاق نظر ہے کہ شفاعت مومن کا خاصہ ہے اور کافر افراد شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔ [۱]

۱۲۔ خواجہ نصیر طوسی مرحوم فرماتے ہیں:

عقیدۂ شفاعت اسلام کے صحیح عقائد میں سے ہے، چاہے اس سے مراد ثواب میں زیادتی لی جائے یا سزا سے رہائی۔ [۲]

۱۳۔ علامہ حلیؒ کہتے ہیں:

علمائے اسلام کا اتفاق نظر ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قیامت میں شفاعت کا حق ہے اور درج ذیل آیت اس کی گواہ ہے:

عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾

''امید ہے کہ تیرا پروردگار تجھے مقام محمود تک پہنچا دے۔'' [۳]

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں شفاعت بتائی ہے اور شفاعت کے معنی میں دو نظریے موجود ہیں:

بعض کا کہنا ہے کہ شفاعت کا مقصد باایمان افراد کے اجر کی زیادتی ہے، جبکہ بعض اور کہتے ہیں کہ شفاعت کا مقصد عذاب سے گناہ گاروں کو نجات دلانا ہے اور یہی بات حق ہے۔

اس کے بعد وہ (علامہ حلیؒ) ایک معروف حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس کو اسلامی محدثین نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے اور اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ یہ حدیث ان مشہور احادیث میں سے ہے جس کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"اوخرت شفاعتی لاھل الکبائر من امتی"

''میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے بڑے گناہوں میں مرتکب ہونے والے افراد کے لیے ذخیرہ کیا ہے۔'' [۴]

---

[۱] تفسیر مفاتیح الغیب ج ۳ ص ۶۳ تفسیر آیت ۱۲۳ سورہ بقرہ

[۲] شرح تجرید الاعتقاد طبع صیدا ص ۲۶۲

[۳] سورۂ اسرا آیت ۷۹

[۴] کشف المراد ص ۲۶۲، مبوعہ صیدا

۱۴۔ ابن تیمیہ حرانی ومشقی کہتے ہیں:[۱]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین قسم کی شفاعت کے حامل ہیں اور دو قسموں کو بیان کرنے کے بعد کہتا ہے: تیسری شفاعت وہ ہے جو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عذاب کے مستحق افراد کے بارے میں کریں گے، نہ صرف آپؐ بلکہ تمام انبیاء وصدیقین اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی گناہ گاروں کے حق میں شفاعت کریں گے تا کہ گناہ گاروں کو عذاب نہ دیا جائے اور اگر جہنم میں داخل ہو چکے ہیں تو وہاں سے باہر نکل آئیں۔ پھر وہ کہتے ہیں ان مطالب کی تفصیل آسمانی کتابوں اور انبیائ، بالخصوص آنحضرتؐ سے مروی روایات میں ملتی ہے۔[۲] اس نے نہ صرف مذکورہ رسالے میں بلکہ اس کے علاوہ اپنے ایک اور رسالے ''الاستغاثۃ'' میں بھی شفاعت کی صحت کے بارے میں تصریح کی ہے اور معتزلہ اور خوارج کو جو کہ شفاعت کے مروجہ معنوں میں اس کے منکر ہوئے ہیں گمراہ اور بدعت گزار کہا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ شفاعت تو اتر اور اجماع سے ثابت ہے اور وہ لوگ جو دلیل کے باوجود اس طرح کے مسئلے کا انکار کریں تو وہ کافر ہوں گے۔[۳]

باوجود یکہ ابن تیمیہ وہ پہلا فرد ہے جس نے اسلامی معاشرے میں وہابیت کا بیج بویا ہے، لیکن خود اس نے بھی ان دونوں کتابوں میں شفاعت کا واضح طور پر اقرار کیا ہے اور اس کے منکر کو کافر جانا ہے۔

---

[۱] حنفی الدین ابو العباس احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام بن تیمیہ حرانی ومشقی (متوفی ۷۲۷ھ) اس نے بہت سارے اصول وفروعِ اسلام میں مشہور علمائے اہل سنت کی مخالفت کی ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل مسائل کا نام لیا جا سکتا ہے۔

(۱) خدا جسم رکھتا ہے۔ (۲) خدا عرش سے آسمانِ اول پر آئے گا۔ (۳) قرآن قدیم ہے اور ذاتِ خدا کے ساتھ قائم ہے۔

(۴) اس نے جب قبر پیغمبرؐ کی زیارت کے سفر کو حرام کہا تو اسے علمائے اسلام کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور یہ بات سبب ہوئی کہ علماء نے اس موضوع کی وضاحت کے لیے کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ مثلاً ''شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام'' تالیف تقی الدین سبکی اور کتاب ''التحفۃ المختارۃ فی الرد علی المنکری الزیارۃ'' مولفہ تاج الدین الفاکمانی (متوفی ۷۳۴ھ)

ابن تیمیہ اور دیگر علمائے اسلام کے درمیان جنگ وجدل اور کشمکش اس حد تک پہنچی کہ شام کے بزرگ علماء کے ایک گروہ اور چاروں مذاہب کے فقہا نے ابن تیمیہ کے کافر ہونے کا فتویٰ دیا۔ ابن تیمیہ اور دیگر علماء کے درمیان مناظرہ وجدل کا مطالعہ درج ذیل کتابوں میں فرمایئے: (۱) دفع الشبہ ص ۴۷-۴۵۔ (۲) تکملہ الصیف، ص ۱۱۵۔ (۳) الغدیر، ج ۵ ص ۸۷-۷۲۔

اس حال کے باوجود اس نے اپنی کتاب ''مجموع الرسائل الکبریٰ'' میں شفاعت کا صریحاً اعتراف کیا ہے۔

[۲] الرسائل الکبریٰ، ج ۱، رسالہ عقیدہ واسطیہ ص ۴۰۷۔ یہ رسالہ الگ سے بھی بیروت میں شائع ہو چکا ہے۔ صفحہ ۷۶ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۳] الرسائل الکبریٰ ''رسالہ الاستغاثۃ'' جلد ۱ ص ۴۸۱

۱۵۔ "محمد بن عبدالوہاب"[۱] وہابیت کا بانی ہے جس کو بعض نے شفاعت کے منکرین میں سے قرار دیا ہے جبکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے اس لیے کہ وہ ان تمام انحرافات کے باوجود جو ولایت سے متعلق مسائل میں کر چکا ہے، شفاعت کا ہرگز منکر نہیں ہے بلکہ شفاعت کو اسلام کے مسلمہ اصولوں میں سے مانتا ہے۔ ذیل میں اس کے کچھ کلمات ملاحظہ فرمائیں:

"اسلامی روایات کے تحت رسولِ اکرمؐ، انبیاء، فرشتے، اولیاء اور بچے بھی قیامت کے دن شفاعت کریں گے اور ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ شفاعت کو اس کے حقیقی مالک اور شفاعت کی اجازت دینے والے سے طلب کریں جو کہ خدا ہے اور یوں کہیں کہ: "پروردگار! روزِ قیامت ہمارے حق میں پیغمبرؐ کی شفاعت قبول فرما، خدایا! ہمارے حق میں اپنے صالح بندوں اور فرشتوں کی شفاعت قبول فرما......" اور ہرگز ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ بلا واسطہ رسولؐ خدا یا ولی خدا سے عرض کریں کہ ہمارے حق میں شفاعت کریں، اس لیے کہ وہ خدا کے اذن کے علاوہ شفاعت کی قدرت نہیں رکھتے ہیں اور جب بھی کوئی غیر مقدور چیز اُن سے طلب کریں تو اس صورت میں ہم نے انہیں خدا کا شریک ٹھہرا دیا۔"[۲]

وہ مزید کہتا ہے:

"آخرت کے مسلم اُمور میں سے ایک امر شفاعت ہے اور ہر مسلمان پر لازم ہے کہ پیغمبرؐ اور دوسرے شفیعوں کی شفاعت پر ایمان رکھے۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ خدا پر امید رکھیں اور خدا ہی سے طلب کریں کہ ہمارے حق میں رسولِ اکرمؐ کی شفاعت قبول فرمالے۔"[۳]

وہ ایک رسالے میں، جو اپنے ماننے والوں کے لیے تعلیم مناظرہ کے عنوان سے لکھا ہے، اس میں کہتا ہے:

"جب بھی پوچھا جائے کہ کیا تم رسول اکرمؐ کی شفاعت کا انکار نہیں کرتے بلکہ آپؐ ایسے شفیع ہیں کہ جن کی شفاعت قبول کی جائے گی اور رسولؐ کی شفاعت کی امید بھی رکھتے ہیں مگر یہ ضرور جان لینا چاہیے کہ شفاعت کی قدرت خدا کے ہاتھ میں ہے اور پورا اختیار خدا کو حاصل ہے۔ کوئی بھی اذنِ خدا کے بغیر شفاعت نہیں کرسکتا۔ پیغمبرؐ اور دوسرے بھی خدا کے اذن کے بعد ہی شفاعت کریں گے۔ اب مرکز شفاعت سے آگاہ ہوئے تو لازم ہے کہ یوں کہیں: اے خدا! ہمیں پیغمبرؐ کی شفاعت سے محروم نہ فرما۔ اے خدا! ہمارے حق میں پیغمبرؐ کی شفاعت قبول فرما۔"[۴]

---

[۱] محمد بن عبدالوہاب ۱۱۱۵ھ کو سرزمین نجد میں پیدا ہوا اور ۱۲۰۶ھ کو مر گیا۔ بعض کا نظریہ ہے کہ ابن تیمیہ کے بعد وہ مذہب سلفیہ کا سب سے بڑا مروج تھا۔ درحقیقت اس کے مکتب کی بنیاد ابن تیمیہ کے نظریات پر قائم ہے۔ اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ ابن تیمیہ کا نظریہ شفاعت بیان کرنے کے بعد محمد بن عبدالوہاب کا نظریہ ذکر کیا جائے۔ اگرچہ عصر کے لحاظ سے ان کا شمار بارہویں صدی کے آخر اور تیرہویں صدی کے ابتدائی ایام کے علماء میں ہوتا ہے۔ اس کے حالات زندگی سے آگاہ ہونے کے لیے کتاب "الاعلام" تالیف زرکلی ج ۷ ص ۱۳۷۔۱۳۸ اور "معجم المولفین" تصنیف عمر رضا کحالہ ج ۲ ص ۲۶۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] الہدیۃ السنیۃ، الرسالۃ الثانیہ، ص ۴۲، کشف الارتیاب ص ۲۳۹

[۳] الہدیۃ السنیۃ، الرسالۃ الاولی۔ کشف الارتیاب ص ۲۴۰

[۴] کشف الارتیاب ص ۲۴۱

اس گفتگو پر غور کریں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس گروہ سے منسوب جو بات نقل کی گئی ہے کہ وہ شفاعت کے منکر ہیں، درست نہیں۔ وہ شفاعت کے ہرگز منکر نہیں بلکہ شفاعت کو ایک مسلم اسلامی اصول کے طور پر مانتے ہیں البتہ اس فرقے اور دیگر اسلامی فرقوں کے دوران جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ شفاعت خدا ہی سے طلب کی جائے اور خدا ہی سے دعا کی جائے کہ خدا ہمارے حق میں شفیعوں کی شفاعت قبول فرمائے۔ اس میں یہ حق نہیں ہے کہ براہِ راست شفیعوں سے شفاعت طلب کریں۔

مختصر یہ کہ اصل وجودِ شفاعت ایک موضوع ہے اور شفیعوں سے ہی شفاعت کی درخواست کرنا ایک الگ موضوع ہے۔ وہابیوں نے شق اول (وجودِ شفاعت) کو مانا ہے۔ دوسری شق کو شرک خیال کرنے کی وجہ سے باطل قرار دیا ہے۔ ابھی ہماری گفتگو چونکہ اصل شفاعت کے بارے میں ہے۔ لہٰذا ان کو بھی حامیوں میں سے شمار کرتے ہیں اور خدا کی توفیق شامل رہی تو شق دوم کے بارے میں ایک اور باب میں گفتگو ہوگی۔

۱۶۔ فاضل مقداد شرح نہج المسترشدین میں لکھتے ہیں:

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گناہ گار افراد کے حق میں شفاعت فرمائیں گے۔ یہ مسئلہ درج ذیل دلیلوں سے ثابت ہو چکا ہے۔

۱۔ پیغمبرؐ کی شفاعت کے بارے میں تمام مسلمانوں کا اتفاق۔

۲۔ خدا پیغمبرؐ کو فرماتا ہے کہ گناہ گاروں کے حق میں مغفرت طلب کرے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ [۱]

''اپنے اور مومنین و مومنات کے گناہوں کے بارے میں مغفرت طلب کرو۔'' [۲]

۱۷۔ علاء الدین معروف ملا علی قوشچی (متوفی ۸۷۹ھ) جن کا شمار اہل سنت کے ماہرین علم کلام میں سے ہوتا ہے، وہ اپنی کتاب شرح تجرید میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں نے شفاعت کو ایک مسلم امر کے طور پر مانا ہے اور اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ آیت میں مقام محمود (پسندیدہ مقام) سے مراد پیغمبرؐ کی شفاعت ہے۔

اس کے بعد وہ گفتگو کے سلسلے کو معنی شفاعت کی تحقیق تک لے کے جاتے ہیں اور معتزلہ اور دوسرے علمائے اسلام کا نظریہ واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ [۳]

---

[۱] سورہ محمد آیت ۱۹

[۲] ارشاد الطالبین ص ۲۰۶ اور کتاب شرح باب حادی عشر ص ۶۱، ۶۲ جو فاضل مقداد کی کلامی کتب میں سے ایک ہے جس میں پورے طور پر شرح دی ہے۔

[۳] شرح تجرید مطبوعہ تبریز ص ۵۰۱

۱۸۔ محقق دوانی اپنی معروف شرح[۱] میں رقمطراز ہیں:

شفاعت دفع عذاب کے لیے اور اس گروہ کے درجات میں اضافہ کہ جس کو خدا اذن شفاعت دیتا ہے، ثابت ہے جیسے انبیاء اور صاحبانِ ایمان۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾[۲]

۱۹۔ شعرانی کہتے ہیں:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے فرد ہیں جو روزِ قیامت شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ کوئی بھی شخص شفاعت کے مسئلے میں ان پر سبقت نہیں لے جاسکتا۔ اس کے بعد جلال الدین سیوطی سے نقل کیا ہے کہ سرکارِ ختمی مرتبت آٹھ قسم کی شفاعت کے مالک ہیں۔[۳]

۲۰۔ شیخ الاسلام علامہ شہیر محمد باقر مجلسی مرحوم (متوفی ۱۱۱۰ھ) نے احادیث آئمہ معصومین علیہم السلام کو جمع کرنے میں بڑی زحمت اٹھائی ہے اور احادیث کی مشکلات کے حل میں مکمل طور پر کامیابی حاصل کی ہے، ان افراد میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں بالخصوص ''حق الیقین'' ص ۳۷۴ ''مطبوعہ انتشاراتِ جاویدان'' اور بحارالانوار ج ۸ ص ۶۳ ۔ ۲۹ میں مسئلہ شفاعت سے متعلق وارد ہونے والی روایات کے بارے میں حق کلام ادا کیا ہے۔

۲۱۔ سید شبر کہتے ہیں:

مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی امت بلکہ گذشتہ امتوں کے حق میں بھی شفاعت کریں گے اور یہ مسئلہ دین اسلام کی ضروریات میں سے ہے۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ شفاعت کے معنی میں ہے۔

علماء امامیہ اور اکثر اہل سنت علماء کہتے ہیں کہ شفاعت اجر کے اضافے اور درجات کی بلندی کے لیے بھی کی جائے گی اور اسی طرح گناہ گار کی عذاب سے نجات کے لیے بھی۔ لیکن خوارج اور معتزلہ نے اسے صرف پہلے کام میں منحصر کرلیا ہے۔ عقلی اور نقلی دلیلیں اس کے خلاف گواہی دیتی ہیں۔

۲۲۔ محمد عبدہ جن کا شمار عصر حاضر کے معروف علماء اور مصری معاشرہ کے مصلحین میں ہوتا ہے، وہ شفاعت کو ایک اصل مسلم کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''شفاعت سے متعلق جو آیات اور روایات وارد ہوئی ہیں وہ متشابہ آیات میں سے ہیں اور علماء ما سلف کا اس قسم کے مسائل میں یہ طریقہ رہا ہے کہ ان پر ایمان رکھیں، اگرچہ ان کی کنہ اور حقیقت سے واقف نہ ہوں۔ بہرحال شفاعت ایک ایسا امتیاز ہے جو خدا

---

[۱] شرح جلال الدین ج ۲ ص ۲۷۰

[۲] سورہ طٰہٰ آیت ۱۰۹

[۳] الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر مولفہ عبدالوہاب شعرانی ج ۲ ص ۱۷۰

اپنے بعض بندوں کو عطا کرے گا اور یہ مسلم ہے کہ آخرت والی شفاعت ہمارے درمیان جو شفاعت متعارف ہے، اس سے بالکل مختلف ہے۔

بہت سارے علماء شفاعت کی حقیقت یوں بیان کرتے ہیں کہ خدا شفیع کی دعا کو رد نہیں کرتا جب وہ کسی کی شفاعت کے لیے کرے۔

صحیح بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری کتب میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے کہ روزِ قیامت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدے میں سر رکھ کر خدا کی حمد و ثناء کریں گے۔ اس اثناء میں خدا کی جانب سے خطاب آئے گا کہ ''سجدے سے سر اٹھائیں اور شفاعت کریں ہم آپ کی شفاعت قبول کریں گے۔''

اس کے بعد مزید لکھتا ہے:

حقیقت شفاعت یہ نہیں ہے کہ خدا کا ازلی ارادہ شفیع کی شفاعت کے پرتو میں بدل جائے بلکہ وہی ازلی ارادہ ہے جو شفیع کی دعا کے بعد نافذ ہوتا ہے۔[1]

۲۳۔ مصر کے مشہور مصنف سید رشید رضا جو اُستاد عبدہ کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں اور اپنے استاد کے درس تفسیر قرآن کو ''تفسیر المنار'' کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔

وہ کہتے ہیں:

ابن تیمیہ اور دوسرے علماء نے بھی حقیقت شفاعت کی یوں تفسیر کی ہے۔ علماء اسلام کی یہ تصریحات کہ شفاعت اسلام کے اصول مسلم میں سے ہے اس سے کہیں زیادہ ہے کہ اس رسالہ میں ان سب تصریحات کو جمع کیا جائے۔ اتنی مقدار کافی ہے کہ تمام علمائے اسلام آخرت میں شفاعت کے ہونے پر راسخ عقیدہ رکھتے ہیں اور اگر کوئی اختلاف ہے بھی تو اس کے فرعی زاویوں میں ہے۔[2]

۲۴۔ سید سابق جامعہ الازہر کے استاد لکھتے ہیں:

شفاعت سے مراد یہ ہے کہ خدا سے لوگوں کے حق میں خیر طلب کریں۔ درحقیقت شفاعت ایک طرح کی قبول شدہ دعا ہے کہ اس کا زیادہ حصہ ہمارے آقا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص ہے۔ آپؐ خدا سے عرض کریں گے کہ لوگوں کے درمیان حکم اور فیصلہ کرے تا کہ لوگوں کے اوپر حشر کی وحشت کم ہو۔ اس اثناء میں خدا آپؐ کی دعا کو مستجاب فرمائے گا اور تمام مخلوق آپؐ کے اس عظیم مقام پر رشک کریں گے۔ اس طرح آپؐ کی دوسروں پر فوقیت و برتری بھی ثابت ہو جائے گی۔ یہ وہی بلند و پسندیدہ مقام ہے جس کا خدا نے آپ کو وعدہ دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

---

[1] المنار ج ا ص ۳۰۷

[2] المنار ج ا، ص ۳۰۷

''رات کے کچھ حصے میں خدا کی عبادت کیجیے شاید خدا تمہیں مقام محمود تک پہنچا دے۔''[۱]

~~اس کے استاد شفاعت~~ کی بعض روایات اور شرائط شفاعت کے متعلق بحث وتمحیص کرکے گفتگو کو تمام کرتے ہیں۔[۲]

۲۵۔ ڈاکٹر سلیمان نیا استاد دانشکدہ اصول دین شیخ محمد عبدہ کے نظریات کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وہ افراد جن کو خدا نے اذن شفاعت دیا ہے (مثلاً انبیاء اور مومنین) اور جو گناہ گاروں کو نجات دلانے اور دوسروں کے درجات کی بلندی کے لیے کوشش کرسکتے ہیں قرآن ان افراد کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ[۳]

''قیامت کے دن کسی کی بھی شفاعت سودمند نہ ہوگی سوائے اس کے جس کو خدا اذن دے۔''[۴]

۲۶۔ محمد الفقی جامعہ الازہر کے علماء میں سے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

شفاعت کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کافی روایات نقل ہوئی ہیں خصوصاً جب حشر میں لوگوں کو دیر تک روکا جائے گا اور غم واندوہ شدید تر ہو جائے گا، سب پر وحشت طاری ہوگی، اس دن جب مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں کو بھی بھول جائیں گی، اہل حشر انبیاء کی طرف دوڑ پڑیں گے اور ہر نبی مسئلے کو اپنے بالاتر نبی کے حوالے گا، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باری آن پہنچے گی تو آپؐ سے سجدے میں رکھیں گے۔ تب ایک ندا آئے گی کہ اپنا سر اٹھایئے اور شفاعت فرمایئے اس لیے کہ آپؐ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

اس کے بعد موصوف چند اشعار نقل کرتے ہیں جن کی سواد بن عازب نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پڑھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کی تھی۔ بہرحال ہم دو بند قارئین کی خدمت میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

وانك اول المرسلين وسيلة
الى الله يابن الاكرمين الاطايب

(اے گرامی اور پاکیزہ شخصیات کے فرزند! آپؐ انبیاء میں خدا کی طرف بہترین وسیلہ ہیں)

وكن لى شفيعاً يوم الا ذوشفاعة
سواك بمغن عن سواد بن عازب

---

[۱] سورہ اسرا آیت ۷۹

[۲] العقاید الاسلامیہ ص ۲۷۳ و ۲۷۵ تالیف السید سابق طبع دار الکتابت العربی بیروت

[۳] سورہ طٰہٰ آیت ۱۰۹

[۴] الشیخ محمد عبدہ بین الفلاسفہ والکلامیین جلد ۲ ص ۶۲۸

(جس دن کوئی شفاعت سواد بن عازب کو بے نیاز نہ کرے تو میری شفاعت فرما۔ میرا شفیع ہو جا)۔ [۱]

نا قابل معافی لغزش

محمد فرید وجدی، مولف ''دائرۃ المعارف'' جو کہ مصر کے ایک بڑے قلم کار ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں عالم اسلام کے لیے بہت سی خدمات انجام دی ہیں، موصوف کی تحریریں اور تصنیفات اسلام کی طرف ان کی بے انتہا رغبت و جذبے کی غمازی کرتی ہیں۔ [۲]

لیکن وہ ولایت اور اسلام کے عظیم الشان پیشواؤں کے مقام و منزلت سے متعلق مسائل میں وہابیت کے جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہوا ہے اور وہابی نقطۂ نظر سے ہی انہیں دیکھا ہے۔ [۳]

انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ شفاعت ہے جس پر اپنی دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) میں اجمالاً گفتگو کی ہے اور ایک اصول کا جسے علماء اسلام نے چودہ سو سال سے اسلام کے مسلم اصول میں شمار کیا ہے، موصوف نے انکار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

شفاعت یہ ہے کہ بعض صالح بندے خدا سے دعا کریں کہ بعض گناہ گاروں کی تقصیر کو معاف کر دے۔ ایسی شفاعت کے عقیدہ نے ادیان کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ان معنی میں شفاعت ایک تحریف ہے جسے کاہنوں نے وجود بخشا ہے تا کہ لوگوں کے سامنے اپنے مقام و منزلت کو مضبوط کر سکیں۔ درحالیکہ اسلام آیا اور اقوام کے عقائد کو محکم و استوار کیا اور شفاعت سے متعلق ان کے عقیدے کے بارے میں یوں کہا:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ [۴]

''کون ہے جو خدا کے حضور اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے۔''

نیز ارشاد ہوا:

وَ کَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی ﴿۲۶﴾ [۵]

''آسمانوں میں کتنے سارے فرشتے ہیں کہ ان کی شفاعت کوئی فائدہ نہ دے گی مگر یہ کہ خدا کے اذن کے بعد

---

[۱] التوسل والزیارۃ فی الشریفۃ الاسلامیہ ص ۲۰۶ طبع مصر ۱۳۸۸

[۲] ان کی بہترین تصنیفات میں سے تین کتابیں یہ ہیں ''الاسلام فی عصر العلم'' المرأۃ المسلمۃ فی رو المرأۃ الجدیدۃ اور ''علی الطلال المذہب المادی'' جو مادی گری کی رد میں تحریر کی ہے۔

[۳] انسائیکلوپیڈیا مادہ شفع مراجعہ ص ۴۰۲ ج ۵۔ انسائیکلوپیڈیا وجدی

[۴] سورہ بقرہ آیت ۲۵۵

[۵] (سورہ نجم آیت ۲۶)

(ان کے لیے) جن کو خدا چاہے اذن دے اور راضی ہو جائے۔''

جب بھی انسان جان لے کہ حقیقی شفیع خدا ہے، کوئی اور کچھ نہیں کر سکتا تو فطری بات ہے کہ وہ دوسروں سے اپنا رُخ موڑ لے گا اور خدا کی طرف متوجہ ہوگا تاکہ ہر قسم کی بت پرستی سے دور رہ کر توحید اور یکتا پرستی کے نزدیک ہو جائے۔[1]

ایک ایسے دینی دانشور سے جس نے اپنی ایک عمر اسلامی معاشرے میں اور وہ بھی جامعہ ازہر کے بزرگ اساتید کے درمیان گزاری ہو یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ شفاعت کے بارے میں کہ جس پر تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے اور جس کے ثبوت میں بہت ساری آیات و روایات بھی موجود ہیں، اس طرح کا فیصلہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود خود اس کی گفتگو بھی ابہام سے خالی نہیں۔ (مثلاً)

وہ اپنے کلام کے آغاز میں اصل شفاعت سے انکار کرنا چاہتا ہے اور اسے ایک نقصان دہ عقیدہ اور کاہنوں کی فکر کا شاخسانہ قرار دیتا ہے، جبکہ گفتگو کے اختتام پر وہابیوں کے نظریے کی تقلید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''لازم ہے کہ غیر خدا سے نظریں ہٹا کر خدا ہی کی طرف متوجہ ہو جائیں اور خدا سے انبیاء کی شفاعت طلب کریں۔''

ان تمام کلمات سے بدتر اس کی یہ بات ہے کہ اس نے شفاعت کے عقیدے کو ایک قسم کی بت پرستی کا نام دیا ہے۔ خدا کی توفیق شامل رہی تو آئندہ موصوف کے بے بنیاد کلام کو واضح طور پر رد کریں گے۔

یہ خطا صرف ''فرید وجدی'' سے مخصوص نہیں، بلکہ اس کے ہم عصر معروف عالم طنطاوی جب اپنی تفسیر میں پہلی آیت، جو شفاعت کے متعلق ہے، تک پہنچتا ہے تو اعتراف کرتا ہے کہ شفاعت اسلام کے مسلّم اور قطعی اصولوں میں سے ہے اور اس معنی میں معتزلہ اور فلاسفہ اور دوسرے اسلامی مکاتب کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ اگر اختلاف ہے بھی تو اس کی کیفیت اور معانی میں ہے۔

لیکن جب علمائے اسلام کے درمیان اتفاقی شفاعت جو عبارت ہے گناہ گاروں کے بخشوانے میں صالح بندوں کے واسطے سے کا تجزیہ و تحلیل صحیح نہ کر سکا اور اس کو ہر قسم کے اعتراض سے جدا نہیں سمجھ سکا، تو شفاعت کے معنی کچھ اور کیے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے شریعت و آئین اور قرآن لا کر تمام انسانوں کو حق و حقیقت کی طرف رہبری کی ہے اور جو لوگ آپ کی پیروی کریں گے عذاب اور شکنجوں سے رہائی پائیں گے جب کہ مخالفت کرنے والے دوزخ میں داخل ہو جائیں گے۔ اس لحاظ سے شفاعت پیغمبرؐ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ آپؐ کی رہبری اور ہدایت کے سائے میں عذابِ الٰہی سے نجات پائیں۔ اسی طرح ہر شخص کے اعمال و کردار اس کے لیے شفیع ہیں اس لیے کہ وہ اپنے اعمال ہی کے نتیجے میں عذاب کے شکنجوں سے رہا ہو سکتا ہے۔[2]

شفاعت کی اس طرح تفسیر جس کا نام مناسب ہے شفاعت رہبری یا عمل کی شفاعت رکھیں، اگر چہ اپنے مقام پر یہ تفسیر درست ہے اور اس بارے میں کچھ روایات بھی وارد ہوئی ہیں، لیکن اس کا اس شفاعت سے جو اسلامی معاشرے میں مورد اتفاق ہے، کوئی ربط نہیں۔ اس

---

[1] دائرۃ المعارف ج ۵ ص ۴۰۳ مطبوعہ مصر سال ۱۳۸۶ھ مادہ شفاعت

[2] تفسیر طنطاوی ج ۱ ص ۶۴ اختصار کے ساتھ

حصے کی وضاحت آئندہ صفحات میں ہوگی۔

ان بڑے علماء کی گفتگو کو یہاں لانے کا مقصد یہی ہے کہ یہ بات تو واضح ہو جائے کہ شفاعت ایک قطعی اسلامی اصول ہے۔اس میں شک وشبہ درحقیقت اسلام کے واضح مسائل میں شک (کے مترادف) ہے۔

البتہ جن لوگوں نے (خواہ علماء شیعہ یا علماء اہل سنت) شفاعت کے مسئلے میں گفتگو کی ہے،اس کتاب کی گنجائش سے خارج ہے کہ ہم سب کے نام اوراُن کے کلام کو بھی یہاں ذکر کریں۔

علماء شیعہ میں سے شیخ جواد بلاغی مرحوم مولف آلاء الرحمن فی تفسیر القرآن و سید محسن عاملی مرحوم مولف کتاب ''کشف الارتیاب فی شبہات محمد بن عبدالوہاب'' و کتاب ''الحصون المنیعۃ فیما اوروہ صاحب المنار علی الشیعۃ'' نے دوسرے علماء سے زیادہ اپنی کتاب میں شفاعت کے موضوع پر گفتگو کی ہے،لیکن ہم طوالت کلام کی وجہ سے ان کے کلام کو نقل کرنے سے قاصر ہیں۔

قرآن کی نگاہ میں شفاعت

گذشتہ تحقیق سے ثابت ہوا کہ شفاعت پر عقیدہ اور یہ کہ انبیاء واولیاء اور صالحین قیامت کے دن ایسے بندوں کی شفاعت کریں گے جنہوں نے اپنا ایمانی تعلق خدا سے قطع نہ کیا ہے اور اپنا معنوی اور روحانی رابطہ درگاہِ الٰہی کے شفیعوں سے محفوظ رکھا ہے،یعنی شفاعت کے عمدہ تربیتی آثار ہیں اور مکمل طور پر تعمیری پہلو موجود ہے،لہٰذا یہ عقیدہ سبب بنتا ہے کہ گناہ گاروں کا ایک گروہ راہِ اطاعت پر واپس آئے۔

مذکورہ بحث آیات شفاعت پر تحقیق کرنے کے لیے بطور کامل راہ ہموار کرتی ہے۔لہٰذا لازم ہے کہ تمام آیات پر ایک ایک کر کے گفتگو اور تحقیق کی جائے تا کہ آیات کا ہدف معلوم ہو جائے۔

مادہ شفاعت قرآن میں اپنے تمام مشتقات کے لحاظ سے تیس مرتبہ متعدد سورتوں میں بطور نفی واثبات ذکر ہوا ہے اور یہ امر بذاتِ خود موضوع کی اہمیت کی حکایت کرتا ہے۔آیاتِ شفاعت سے صحیح نتیجہ لینا اس بات پر متوقف ہے کہ تمام آیاتِ شفاعت پر غور وخوض کیا جائے اور ان تمام آیات سے مجموعی طور پر ایک نتیجہ لیا جائے جو تمام آیات کا ہدف ہے۔

یہ بڑی خطا ہوگی کہ شفاعت سے متعلق ان تمام آیات میں سے صرف ایک ہی آیت سے اپنے دعوے پر استدلال قائم کریں اور دوسری آیات کو نظر انداز کریں۔وہ لغزشیں جو شفاعت اور دوسرے عقلی مسائل کے بارے میں پائی جاتی ہیں وہ سب اسی طرح ایک ناقص اور نامکمل تحقیق کا نتیجہ ہیں اور یہ کہ ایک آیت کو ہی اخذ کریں جبکہ دوسری آیات جو اسی آیت کے لیے مفسر یا اس کے معنی کے لیے قرینہ بن سکتی ہیں، انہیں نظر انداز کریں،یہ بات تحقیقی اسلوب کے منافی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"ان القران یصدق بعضہ بعضا"

''قرآن کے مختلف حصے ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔''

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وینطق بعضه ببعض، و شهد بعضه علی بعض"[1]

''قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تشریح کرتا ہے اور ایک حصہ دوسرے حصے پر گواہی دیتا ہے۔''

لہٰذا شفاعت سے مربوط آیات کے ہدف، حصولِ نتیجہ اور تشریح میں دیگر آیات کو ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے کیونکہ بعض آیات کے ابہام اور اجمال کو دوسری آیات کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر کتاب مفاہیم القرآن کے مقدمے میں تفصیلی بحث کی ہے۔''[2] بہرحال اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ مسئلہ شفاعت سے مربوط آیات کی توضیح اور تشریح میں یہی اسلوب اپنایا جائے۔

---

[1] نہج البلاغہ، عبدہ ج ۲ ص ۲۳ خطبہ ۱۲۹

[2] مفاہیم القرآن ص ۴-۵

شفاعت سے متعلق آیات کی تقسیم بندی

گروہ اوّل

ایک آیت شفاعت کی بطور مطلق نفی کرتی ہے۔ارشاد ہوا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ [۱]

''اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس دن کے آنے سے پہلے (خدا کی راہ میں خرچ کرو) جس میں نہ تو (خرید) فروخت ہوگی، نہ یاری (اور نہ آشنائی) اور نہ سفارش (ہی کام آئے گی) اور کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں۔''

ولا شفاعة کا جملہ ان لوگوں کے لیے سند ہے جو شفاعت کو کاہنوں کی فکر کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔لیکن مندرجہ ذیل نکات کی طرف دی جائے تو آیت کا مطلب واضح ہو جاتا ہے:

۱۔ ایک آیت کی طرف توجہ دے کر دوسری کو نظر انداز کرنا تفسیر قرآن کے لیے درست طریقہ نہیں ہے، اس لیے کہ جیسا عرض کیا گیا، ایک موضوع پر مشتمل آیات کا مجموعہ ایک ہی ہدف کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔لہٰذا جب تک ان تمام آیات کو مدنظر نہ رکھا جائے تو قرآن مجید کا آخری مقصد ہرگز معین نہیں کیا جا سکتا۔مثلاً اس آیت مجیدہ میں ظاہری اعتبار سے قرآن روزِ قیامت شفاعت کے وجود کی نفی کرتا ہے جبکہ بعد والی آیت جو آیت الکرسی کے نام سے معروف ہے، اس میں کچھ شفیعوں کے بارے میں تصریح کر رہا ہے جو خدا کے اذن سے کچھ افراد کے حق میں شفاعت کریں گے۔چنانچہ ارشاد ہوا:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ [۲]

''کون ہے جو خدا کے سامنے اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے؟''

آیت سے متصل قرینے اور اس قسم کے ایسے دیگر قرائن سے جو دوسری آیات میں موجود ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مطلب و معنی جو ابتدائی نظر میں سامنے آتا ہے وہ نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ کچھ اور معنی ہونا چاہیے۔یعنی مراد باطل شفاعتوں کی نفی ہے، نہ کہ مطلق طور پر

---

[۱] سورہ بقرہ آیت ۲۵۴

[۲] سورہ بقرہ آیت ۲۵۵

شفاعت کی نفی۔

۲۔ اس بات کی گواہی کہ نفی سے مراد مطلق شفاعت کی نفی نہیں بلکہ مراد ایک خاص قسم کی شفاعت (باطل شفاعت) کی نفی ہے وہی جملہ یعنی ولا خلة (دوستی نہیں) ہے اس لیے کہ اس جملے کا ظاہر یہ ہے کہ قیامت کے دن تمام افراد کی دوستی کوئی دوستی نہ رہے گی، جبکہ دوسری ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف کافروں کی آپس کی دوستی ختم ہو جائے گی، لیکن مومنوں کی دوستی جس طرح دنیا میں تھی اسی طرح باقی رہے گی۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿٦٧﴾ [1]

''قیامت کے دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے پرہیزگاروں کے'' (کہ ان کی دوستی کا پیوند باقی رہے گا)۔''

اگرچہ الا المتقین کے ظاہری استثناء سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرہیزگار ایک دوسرے کے دشمن نہیں لیکن جب غور کیا جائے تو یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ پرہیزگار افراد نہ صرف ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ اُن کے درمیان دوستی کا رشتہ بھی باقی رہے گا، اس لیے کہ گناہ گاروں کی دوستی کا ختم ہو جانا اور ان کا ایک دوسرے کا دشمن ہو جانا اس وجہ سے ہے کہ ان کی دنیاوی دوستی ایک دوسرے کی گمراہی کا موجب تھی جب کہ نیک اور پرہیزگاروں کی دوستی نہ صرف گمراہی کا موجب نہ تھی بلکہ ان کی دوستی ہی ایک دوسرے کی رہنمائی اور کامیابی کا راز تھی۔ اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ آیت کا ہدف نہ صرف پرہیزگار افراد کے آپس میں دشمن نہ ہونے کے بارے میں بتانا ہے بلکہ ان کی دوستی کی بقاء کی طرف اشارہ کرنا بھی ہے۔

مختصر یہ کہ جس طرح ولا خلة کے ظاہر کو اخذ نہیں کیا جا سکتا، یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیامت کے دن تمام افراد کی دوستی کا تعلق، خواہ مومن یا کافر، بہر حال سب تعلقات ختم ہو جائیں گے، کیونکہ ایک اور آیت بعض دوستیوں کے باقی رہنے کی تصریح یا کم از کم اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح ''ولا شفاعة'' کو کلی طور پر شفاعت کی نفی کے لیے دلیل نہیں لیا جا سکتا کیونکہ بعض آیات شفاعت کے ہونے کو چند شرائط کے ساتھ ثابت کرتی ہیں اور اس کی صحت پر دلالت کرتی ہیں۔

۳۔ آیت میں انفاق سے مراد ہی زکوٰۃ کی ادائیگی ہے اور اس فریضے کی اہمیت کے لیے یہی کافی ہے کہ آیت کا ذیل ایسے افراد کو کافر قرار دیتا ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ ارشاد ہوا:

''والکافرون هم الظالمون'' (کفار ستمگر ہیں)

اسی طرح حج سے مربوط آیت میں ارشاد ہوا:

---

[1] سورہ زخرف آیت ۶۷

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿٩٧﴾ [1]

''جو شخص بھی کفر کرے خدا تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے۔''

ومن کفر والا جملہ جملہ من لم یحج کے مقام پر آیا ہے اور اس کی وجہ کہ خدا نے اس مطلب کو من کفر سے ادا کیا یہ ہے کہ واضح ہو جائے کہ فریضہ حج انجام دینا اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اس فریضے کا ترک کرنا خدا کے انکار کے برابر ہے۔ [2]

اس مطلب کی طرف توجہ دینے سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ آیت دراصل ایسے لوگوں کے حق میں شفاعت کی نفی کرتی ہے جو اصلاً ایمان نہیں لائے ہیں اور اگر ایمان لائے ہیں تو بھی ان کا ایمان اتنا ضعیف ہے کہ انہیں اس قسم کے عظیم اسلامی فریضہ (ادائے زکوٰۃ) کو ادا کرنے کی طرف ابھارتا نہیں ہے اور مذکورہ دونوں قسم کے لوگ اس آیت کے حوالے سے شفاعت سے محروم ہوں گے۔

انشاءاللہ ہم اپنی آئندہ گفتگو میں ثابت کریں گے کہ انبیاء اور صالح بندوں کی شفاعت ان افراد کے حق میں ہے جو شفاعت کی اہلیت وصلاحیت رکھتے ہوں اور خدا سے اپنا ایمانی رابطہ قطع نہ کر چکے ہوں اور ان کا خدا کے معزز بندوں کے ساتھ روحانی تعلق باقی رہا ہو۔ جو لوگ جن سے شفاعت کی نفی ہوئی وہ یا کافر اور غیر مومن ہیں یا مسلمان ہیں لیکن مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہیں، لہٰذا یہ دونوں گروہ شفاعت کے مستحق نہیں۔ یہ دلیل نہیں بن سکتی کہ دوسروں کے حق میں بھی شفاعت کی نفی ہو۔

دوسرا گروہ

ایسی آیات میں جو یہودیوں کے دعوئے شفاعت کی نفی کرتی ہیں، کیونکہ شفاعت سے متعلق ان کا ایک مخصوص عقیدہ تھا جس کی ابھی وضاحت ہوگی۔ اس قسم کی شفاعت سے متعلق آیات درج ذیل ہیں:

۱۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾ [3]

''اس دن سے ڈرو جس دن نہ تو کسی کو کسی کی جگہ پر سزا دی جائے گی اور نہ شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ ہی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

۲۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۹۷

[2] کشاف ج ۱ ص ۲۹۱

[3] سورہ بقرہ آیت ۴۸

تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ﴿۱۲۳﴾ [1]

یہ دو آیتیں اپنے قبل و بعد کے سہارے سے یعنی سیاق و سباق کے ساتھ مل کر ایسی شفاعت کی نفی کرتی ہیں جس کے بارے میں یہود عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں آیتوں میں ''واتقوا'' کا جملہ ان کے لیے خطاب ہے۔ ان دونوں آیتوں سے قبل والی آیت یہ ہے:

يٰبَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ﴿۴۷﴾ [2]

''اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کیں اور میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی۔''

اس صورت میں کہ مذکورہ دونوں آیتوں میں ہر قسم کی شفاعت کی نفی کی گئی ہے اس شفاعت کا ذکر ہو رہا ہے جس کے متعلق بنی اسرائیل اپنے لیے عقیدہ رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے:

''ہم انبیاء کی اولاد ہیں، ہمارے گناہ جتنے بھی سنگین ہوں ہمارے آباء (انبیاء) ہمارے حق میں شفاعت کریں گے۔''

اس قسم کی بلاقید و شرط شفاعت پر عقیدہ اور یہ کہ پیغمبروں کے بیٹوں کے ہاتھ پاؤں ہر برے کام کے لیے آزاد ہوں اور ان کا خاندانِ رسالت سے منسوب ہونا کافی ہو کہ ان کے آباء ان کے حق میں شفاعت کریں گے، تو یہ ایسا عقیدہ ہے جس کا اسلام شدت سے انکار کرتا ہے۔ اس لیے کہ دین اسلام میں نجات کا ملاک و معیار ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ نسب اور رشتہ داری۔ اس لیے قرآن اُن کے عقیدہ شفاعت کی نفی کرتا ہے اور فرماتا ہے:

"واتقوا یوما...... ولا یقبل منها...... شفاعة......"

درحقیقت قوم یہود اپنے آپ کو ایک برگزیدہ اور دیگر اقوام سے الگ ایک ملت تصور کرتی تھی۔ تمام دنیا والوں کے کانوں نے ان کا یہ جملہ سنا ہے کہ ہم خدا کی برگزیدہ امت ہے۔ یہ دعوت نہ صرف یہودیوں کا تھا بلکہ مسیحیوں کا بھی اپنے بارے میں ایسا ہی عقیدہ تھا، چنانچہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ وَالنَّصٰرٰى نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ [3]

''یہود اور نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔''

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۲۳

[2] سورہ بقرہ آیت ۴۷، ۱۲۲

[3] سورہ مائدہ آیت ۱۸

وہ لوگ آخرت میں نجات اس شخص کے بارے میں تصور کرتے تھے جو بنی اسرائیل کے خاندان میں سے ہو۔ خاندانی اعتبار سے اسرائیل سے نسبت پیدا کرنا ان دونوں میں سے کسی ایک آئین سے منسوب ہونا اگرچہ کوئی عمل بھی نہ کیا ہو، انسانوں کی نجات کے لیے کافی ہے یہاں تک کہ قرآن ان کی یہ بات نقل کرتا ہے کہ انہوں نے کہا:

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ [1]

''بہشت میں یہودی یا مسیحی کے علاوہ کوئی اور داخل نہیں ہوگا۔''

قرآن برملا اس غلط نظریے کے ساتھ مبارزہ کرتا ہے کہ اسرائیلی خاندان سے نسبت یا کسی آئین سے نسبت نجات کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ نجات کی کنجی ایمان قلبی اور تسلیم باطنی کے ساتھ عمل نیک بھی ہے۔ قرآن لفظی اور خاندانی تعلق کے بے اساس ہونے کو یوں ارشاد فرماتا ہے:

تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ [2]

''یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ (اے رسولؐ) تم ان سے کہہ دو کہ بھلا اگر تم سچے ہو کہ ہم ہی بہشت میں جائیں گے تو اپنی دلیل پیش کرو، ہاں البتہ جس شخص نے خدا کے آگے اپنا سر جھکا دیا اور اچھے کام بھی کرتا ہے تو اس کے لیے پروردگار کے یہاں اس کا بدلہ (موجود) ہے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں پر نہ کسی طرح کا خوف ہوگا نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔''

ان کی گستاخی یہاں تک پہنچی تھی کہ بڑی بے شرمی سے کہا کرتے تھے:

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا [3]

''کہتے ہیں کہ گنتی کے چند دنوں کے سوا ہمیں آگ چھوئے گی بھی تو نہیں۔ (اے رسولؐ) ان لوگوں سے کہو کہ کیا تم نے خدا سے کوئی اقرار لے لیا ہے (کہ وہ پھر ہرگز اپنے اقرار کے خلاف نہ کرے گا)؟''

یہ دو آیتیں ایسی متکبر و خود خواہ قوم و ملت کے بارے میں بتلا رہی ہیں اور ان کے عقیدے والی شفاعت کی جو کسی طرح کی قید و شرط

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۱۱

[2] سورہ بقرہ آیت ۱۱۱، ۱۱۲

[3] سورہ بقرہ آیت ۸۰

کے بغیر ہو، دونوں آیتیں نفی کرتی ہیں۔ پس ایسی صورت میں یہ دونوں آیتیں ایسی شفاعت کو بیان کرنے والی نہیں جس کو خود قرآن اور دین اسلام نے چھ شرائط کے تحت قبول کر کے لوگوں کے لیے اعلان کیا ہے۔

اس لحاظ سے اکابر علمائے تفسیر جب مذکورہ دونوں آیتوں پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں:

یہ دو آیتیں ایسی شفاعت کی نفی سے مربوط ہیں جس کے یہود اپنے لیے معتقد تھے اور کہتے تھے: ہم انبیاء کی اولاد ہیں اور قیامت کے دن اسی لحاظ سے ہماری شفاعت ہو جائے گی۔ [1]

تیسرا گروہ

کچھ آیات ہیں جو صراحت سے کہتی ہیں کہ قیامت کے دن کافروں کے لیے کوئی شفیع اور شافع نہیں ہے یا شفیع کی شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ ارشاد ہوا:

يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ نَسُوۡهُ مِنۡ قَبۡلُ قَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ‌ۚ فَهَلۡ لَّنَا مِنۡ شُفَعَآءَ فَيَشۡفَعُوۡا لَنَاۤ اَوۡ نُرَدُّ فَنَعۡمَلَ غَيۡرَ الَّذِىۡ كُنَّا نَعۡمَلُ‌ؕ قَدۡ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ۝۵۳ [2]

”جو لوگ اس کو (قیامت کو) پہلے سے بھولے بیٹھے تھے (بیساختہ) بول اٹھیں گے کہ بیشک ہمارے پروردگار کے سب رسول حق لے کر آئے تھے تو کیا (اس وقت) ہماری بھی سفارش کرنے والے ہیں جو ہماری سفارش کریں یا ہم پھر (دنیا میں) لوٹا دیے جائیں تو جو جو کام ہم کرتے تھے ان کو چھوڑ کر دوسرے کام کریں؟ بے شک ان لوگوں نے سخت گھاٹا کیا اور جو افتراء پردازیاں کیا کرتے تھے وہ سب غائب (غلا) ہو گئیں۔“

اس آیت میں شفاعت کے طلب کرنے والے وہی لوگ ہیں جو روز قیامت کے منکر تھے اور ”قد خسروا“ کا جملہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ ان لوگوں کے لیے کوئی شفیع نہیں۔ اگر ان کے لیے شفیع ہوتے تو ”قد خسروا انفسھم“ کہنا ہرگز صحیح نہیں تھا۔

۲۔ اِذۡ نُسَوِّيۡكُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ۝۹۸ وَمَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الۡمُجۡرِمُوۡنَ۝۹۹ فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِيۡنَ۝۱۰۰ وَلَا صَدِيۡقٍ حَمِيۡمٍ۝۱۰۱ [3]

---

[1] کشاف ج ۱ ص ۲۱۵ اور مجمع البیان ج ۱ ص ۱۰۳

[2] سورہ اعراف آیت ۵۳

[3] سورہ شعراء آیات ۹۸ تا ۱۰۱

''جب انہیں اپنے معبودوں کے ساتھ جہنم میں گرا دیا جائے گا تو وہ اپنے معبودوں کی طرف منہ کر کے کہیں گے) ہم تم کو پرستش میں سارے جہان کے پالنے والے (خدا) کے برابر سمجھتے رہے اور ہم کو بس (ان) گناہ گاروں نے (جو ہم سے پہلے ہوئے) گمراہ کیا تو اب نہ تو کوئی (صاحب) ہماری سفارش کرنے والے ہیں اور نہ کوئی دل پسند دوست ہے۔''

۳۔ وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾ حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾ [۱]

''اور روز جزا کو جھٹلایا کرتے تھے (اور یوں ہی رہ) یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی، تو (اس وقت) انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش کچھ کام نہ آئے گی۔''

مفسرین کہتے ہیں کہ آیت میں شافعین سے مراد وہی حقیقی شفیع ہیں، فرضی شفیع جیسے بت وغیرہ مراد نہیں جن کو بت پرست اپنا شفیع تصور کرتے تھے (اس سے مربوط آیات میں یہ بات ذکر ہوگی)۔اس بات کا سبب کہ ان شفیعوں کی شفاعت مذکورہ گروہ کے لیے کوئی فائدہ نہ دے گی یہ ہے کہ یہ لوگ کفر اور قیامت کے انکار نیز گناہانِ کبیرہ میں مبتلا ہونا اور فرائض کے ترک (جیسا کہ گذشتہ آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے)[۲] کی وجہ سے شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتے، اس لیے کہ خدا سے تھوڑا بہت بھی ان کا رابطہ نہیں تھا اور شافعینِ حقیقی سے اپنا روحانی تعلق بھی قطع کیا ہوا ہے۔

اس قسم کے لوگ پاک دامنی اور تقویٰ سے دور رہنے کے نتیجے میں شفاعت کے ذریعے ہرگز پاک وطاہر نہیں ہوں گے اور شفاعت کی اہلیت کے دارا نہ ہونے کی وجہ سے شفاعت ان کو کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ بالفاظ دیگر لوگوں کے حق میں صالح بندوں کی شفاعت کا دارومدار اذانِ خدا اور اس کی خوشنودی پر ہے اور اذنِ خدا ایسے افراد کے حق میں ہے جنہوں نے خدا سے اپنا رابطہ قائم رکھا ہو اور انہیں خوشنودی خدا حاصل رہی ہو۔البتہ احتمال ہے کہ آیت میں شافعین سے مراد اس گروہ کے فرضی اور خودساختہ شفیع ہوں کیونکہ آیات کا سیاق بتا رہا ہے کہ وہ بت پرست تھے اور روزِ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

بہرحال اس گروہ کے حق میں شفاعت موثر نہیں ہوگی، اس لیے کہ یا تو یہ کہ وہ شفاعت کے اہل نہیں ہیں یا یہ کہ اُن کے خودساختہ شفیع

---

[۱] سورہ مدثر ۴۶ تا ۴۸

[۲] مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾ (سورۂ مدثر ۴۲ تا ۴۵)

''کس چیز سے تم کو دوزخ میں داخل کیا۔کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، مسکینوں کو طعام نہیں دیتے تھے اور باطل میں ڈوبے ہوئے تھے۔''

میں اہلیت شفاعت نہیں ہے۔

بہرصورت کافروں اور معاد کے منکرین کے لیے شفیع کا نہ ہونا (جیسا کہ قبل کی دو آیتوں سے معلوم ہوتا ہے) یا ان کے حق میں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا فائدہ مند نہ ہونا (جیسا کہ آیت آیت نمبر ۳ سے معلوم ہوتا ہے) اس امر کے منافی نہیں کہ اہل ایمان کے حق میں بھی شفاعت ثابت ہو۔

چوتھا گروہ

کچھ آیات ہیں جو بتوں کے شفیع ہونے پر تنقید کرتی ہیں۔

قرآنی آیات اور عرب کے دورِ جاہلیت کی تاریخ پر نظر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بتوں کی پوجا کرنے والے لکڑی، پتھر اور دھات کے بنائے ہوئے بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے اور وہ یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ان مصنوعی خداؤں کی پرستش سے خدا کی توجہ اور خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں اور یہ بت بارگاہِ الٰہی میں ان کے حق میں شفیع بن سکتے ہیں۔

قرآن مجید مختلف انداز سے نہ صرف ان کو بتوں کی پرستش سے روکتا ہے بلکہ ان کے شفیع ہونے کی سختی سے تردید کرتا ہے اور توجہ دلاتا ہے کہ یہ عاجز و حقیر معبود جو اپنے لیے بھلائی یا برائی کے مالک بھی نہیں، عذابِ الٰہی سے دوسروں کو کیسے بچا سکتے ہیں۔

اس سلسلے کی آیات درج ذیل ہیں:

۱۔ وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ [۱]

”(بت پرستوں سے کہا جائے گا) ہم کیوں تمہارے ان سفارش کرنے والوں کو نہیں دیکھ رہے جن کو تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہاری (پرورش وغیرہ میں ہمارے) ساجھے دار ہیں۔ اب تو تمہارے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے اور جو کچھ تم خیال کرتے تھے وہ سب تم سے غائب ہو گئے۔“

۲۔ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ [۲]

---

[۱] سورہ انعام آیت ۹۴

[۲] سورہ یونس آیت ۱۸

''یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نقصان ہی پہنچا سکتی ہے نہ نفع اور کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں یہی لوگ ہمارے سفارشی ہوں گے۔ (اے رسولؐ) تم (ان سے) کہو تو کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کو وہ نہ تو آسمانوں میں (کہیں) پاتا ہے اور نہ زمین میں۔ یہ لوگ جس چیز کو اس کا شریک بناتے ہیں، اس سے وہ پاک صاف اور برتر ہے۔''

۳۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ﴿۱۳﴾ [۱]

''اور ان کے (بنائے ہوئے خدا کے) شریکوں میں سے کوئی ان کا سفارشی نہ ہوگا اور یہ لوگ خود بھی اپنے شریکوں سے انکار کر جائیں گے۔''

۴۔ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ﴿۴۳﴾ [۲]

''کیا ان لوگوں نے خدا کے سوا (دوسرے) سفارشی بنا رکھے ہیں؟ (اے رسولؐ) تم کہہ تو دو کہ اگرچہ وہ لوگ کچھ اختیار رکھتے ہوں نہ کچھ سمجھتے بوجھتے ہوں (تو بھی سفارشی بناؤ گے)۔''

ان آیات کے متن اور وہ قرائن جو ان آیات کے سیاق و سباق میں موجود ہیں کی طرف توجہ کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ان تمام آیات کا مقصد بتوں کے شفیع ہونے کی مذمت اور رد ہے، اس لیے کہ یہ موجودات (جو قرآن کی تعبیر کے لحاظ سے عقل و شعور نہیں رکھتے اور کسی چیز کے بھی مالک نہیں) کیسے دوسروں سے ضرر و رفع کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کا مفاد شفاعت کی بطور مطلق نفی نہیں۔

۵۔ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ﴿۲۳﴾ [۳]

''کیا میں (خدا) کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنا لوں؟ اگر خدا مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ ان کی سفارش ہی میرے کچھ کام آئے گی اور نہ لوگ مجھے (اس مصیبت سے) چھڑا ہی سکیں گے۔''

مفسرین کے مطابق مذکورہ سخن کہنے والی حبیب نجار ہے جو حضرت عیسیٰؑ کے بھیجے ہوئے لوگوں کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور بتوں کی طرف توجہ کرنے اور ان کی شفاعت کے عقیدہ پر مذمت کی تھی۔

---

[۱] سورہ روم آیت ۱۳

[۲] سورہ زمر آیت ۴۳

[۳] سورہ یس آیت ۲۳

بناء بریں شفاعت کی نفی کرنے والی آیات کو چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔استاد علامہ طباطبائی مرحوم نے شفاعت کی نفی کرنے والی آیات کی وضاحت کی ہے جس کا خلاصہ یہاں ہم عرض کریں گے:

گذشتہ اقوام خواہ بت پرست ہوں یا غیر بت پرست ان کا عقیدہ تھا کہ آخرت کی زندگی بھی دنیوی زندگی کی ایک قسم ہے اور اس میں بھی دنیاوی قوانین یعنی مادی اور طبعی اسباب و تاثیر اور اثرات بعینہ حکم فرما ہیں، اس وجہ سے وہ لوگ مختلف قسم کی قربانیاں اور ہدیے اپنے خداؤں کے بھینٹ چڑھاتے تھے تاکہ ان کے گناہوں سے درگزر کریں یا ان کی مشکلات میں ان کی مدد کریں۔ یا پھر ان کو (خداؤں کو) اپنے لیے شفاعت کا وسیلہ قرار دیتے تھے یا اپنے جرائم اور گناہوں کا بدل اور فدیہ تصور کرتے تھے۔ یا پھر اشخاص اور اسلحہ سے مدد طلب کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ مختلف قسم کے آلاتِ زینت اور اسلحہ کو اپنے مردوں کے ساتھ دفن کرتے تھے۔

اس خیال سے کہ آخرت میں ان سے استفادہ کیا جائے گا یا اس کے ذریعے دفاع کیا جا سکے گا۔ بعض اوقات بات یہاں تک پہنچ جاتی تھی کہ بعض کنیزوں کو میت کے مانوس ہونے کی خاطر یا بعض بہادر افراد کو مردے کی مدد کے لیے ساتھ دفن کرتے تھے۔ آج بھی عجائب گھروں میں مختلف زمینی آثار کے ساتھ بہت سارے پرانے نمونے دکھاء دیتے ہیں جو اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ملت اسلامیہ کے مختلف فرقوں میں بھی ان عقائد کے شبیہ طرح طرح کے عقائد نظر آتے ہیں جو اس زمانے کے بطور میراث باقی رہ گئے ہیں اور مختلف ادوار کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان عقائد نے بھی کیا ہی مختلف تازہ (رنگ اختیار کیا ہے باوجودیکہ قرآن نے ان سب اور غلط عقائد و نظریات کو باطل قرار دیا ہے اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ:

وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝۱۹ [۱]

''اس دن حکم اور فرمان دینے کا حق خدا کو ہے۔''

نیز ارشاد ہوا:

وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝۱۶۶ [۲]

''جب عذاب دیکھیں گے تو (دفع عذاب کے اسباب) ان کے لیے منقطع ہوں گے۔''

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ

---

[۱] سورہ انفطار آیت ۱۹

[۲] سورہ بقرہ آیت ۱۶۶

شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۠﴿۹۴﴾[1]

''اور آخر تم ہمارے پاس اسی طرح تنہا آئے (نا) جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا، اور جو ہم نے تم کو دیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے اور تمہارے ان سفارش کرنے والوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کو تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہاری (پرورش وغیرہ) میں (ہمارے) ساجھے دار ہیں، اب تو تمہارے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے اور جو کچھ تم خیال کرتے تھے وہ سب تم سے غائب ہو گئے۔''

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ۠﴿۳۰﴾[2]

''وہاں پر (قیامت میں) ہر شخص جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہے جانچ لے گا اور وہ سب کے سب اپنے سچے مالک خدا کی بارگاہ میں لوٹا کر لائے جائیں گے اور (دنیا میں) جو کچھ افترا پردازیاں کرتے تھے سب ان کے پاس سے غائب ہو جائیں گے۔''

اس کے مانند اور آیات کہ جن میں خدا نے یہ بیان فرمایا ہے کہ عالم آخرت دنیاوی اسباب اور ان طبعی روابط سے خالی اور دور ہے، اس اصل کے تحت وہ تمام عقائد اور اوہام بطور اجمال باطل ہو جاتے ہ[3] یں۔

قرآن نے ان آات میں بطور اجمال مطلب کو بیان کیا ہے لیکن دوسری آیات میں اس مطلب کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور ہر ایک عقیدہ کو الگ الگ کر کے باطل کر دیا ہے۔ ارشاد ہوا:

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴿۴۸﴾[4]

''اس دن سے ڈرو (جس دن) کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ فدیہ ہو سکے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش

---

[1] سورہ انعام آیت ۹۴

[2] سورہ یونس آیت ۳۰

[3] مراد یہ نہیں ہے کہ آخرت میں اسباب بطور کلی بے اثر ہوں گے اور ان کا بالکل ہی کوئی اثر و تاثیر نہ رہے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ اسباب جو دنیا میں کارفرما ہیں آخرت میں بے کار ہوں گے اور یہ طریقے جو لوگ اپنے دنیاوی منافع کے حصول کے لیے استعمال میں لاتے ہیں، آخرت میں ان کا کچھ اثر نہ رہے گا بالفاظ دیگر وہاں کا نظام یہاں کے نظام سے ہٹ کر الگ اور جدا ایک نظام ہے۔

[4] سورہ بقرہ آیت ۴۸

مانی جائے گی اور نہ اس کا کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ اس کی مدد کی جائے گی۔"

يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۗ [1]

"اس دن کہ جس میں نہ خرید و فروخت ہے اور نہ دوستی اور نہ شفاعت۔"

يَوْمَ لَا يُغْنِىْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا [2]

"اس دن (قیامت میں) کوئی دوست اپنے دوست کے ہرگز کام نہ آئے گا۔"

يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ [3]

"جس دن تم پیٹھ پھیر کر (جہنم کی طرف) چل رہے ہو گے تو خدا کے (عذاب) سے تمہارا کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔"

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ [4]

"تمہیں کیا ہو گیا کہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے (جواب کیا دیں) بلکہ وہ آج پوری طرح گردن جھکائے ہوئے ہیں۔"

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۗ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۗ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ [5]

"یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نقصان ہی پہنچا سکتی ہے نہ نفع اور کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں یہی لوگ ہمارے سفارشی ہوں گے۔ (اے رسولؐ) تم (ان سے) کہو تو کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جس کو وہ نہ تو آسمانوں میں (کہیں) پاتا ہے اور نہ زمین میں؟ یہ لوگ جس چیز کو اس کا شریک بناتے ہیں، اس

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۵۴

[2] سورہ دخان آیت ۴۱

[3] سورہ مومن آیت ۳۳

[4] سورہ صافات آیات ۲۵،۲۶

[5] سورہ یونس آیت ۱۸

سے وہ پاک صاف اور برتر ہے۔''

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؁ [1]

''سرکشوں کا نہ تو کوئی سچا دوست ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی جس کی بات مان لی جائے۔''

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ؁ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ؁ [2]

ہمارے لیے (گمراہ لوگ) کوئی سفارشی اور مہربان دوست نہیں۔''

اس طرح کی دیگر آیات ایسی شفاعت کے وقوع کی نفی کرتی ہیں جو اس زمانے کے لوگ تصور کرتے تھے چاندی کی طرح صاف ہوں گے کہ جن کے خرمن سے مٹی کو ہٹا کر صاف کیا جاتا ہے۔

۲۴ قیراط سونے کا سکہ وہی ڈھیروں خاکی خرمن ہے کہ جو پہاڑ کے قلب میں معدنی خاک کی صورت میں موجود ہے۔لیکن کچھ کیمیاوی عملیات کے بعد یہ مٹی اپنے چہرے کا رنگ بدل لیتی ہے اور سونے کی شکل میں نمودار ہوجاتی ہے۔

قیامت کے دن صورِ مجسم اور مرئی اشباح بھی یہی حکم رکھتے ہیں۔ان سے مادی ظلمتوں اور طبیعی میل کچیل کو دور کیا جائے گا اور مجسم شکلوں اور اشباح کی حالت میں یہ جلوہ گر ہوں گے۔

بنابریں اس طرح کی جلوہ گری کوئی نئی اور اچنبھے کی بات نہیں، بلکہ وہ تو جو کچھ اس دنیا میں تھا اس کی ایک نمائش ہے۔

اس بیان سے واضح ہوا کہ مسئلہ تجسم اعمال کے ذریعے سے شفاعت والی آیات کو صرف اس قسم کی شفاعت کہ جس کا سارا کام اسی دنیا میں متحقق ہوتا ہے اور آخرت میں صرف اس کا فائدہ دکھائی دے گا، سے مربوط نہیں سمجھا جا سکتا اس لیے کہ آیات کا ظاہر یہ ہے کہ شفاعت قیامت کے دن انجام پائے گ [3] ی۔

اس کے علاوہ اور بھی اعتراضات ہیں کہ جنہیں ہم بیان کریں گے۔

---

[1] سورہ مومن آیت ۱۸

[2] سورہ شعراء آیت ۱۰۰، ۱۰۱

[3] ایسی شفاعت بھی ایک طرح کی تکوینی شفاعت ہے، کیونکہ ہادیوں اور آئمہ کے کام اور رہبری انسانی نفس پر اثر انداز ہوکر اسے علم و عمل کی دعوت دیتی ہے جس کا نتیجہ آتش جہنم سے نجات اور بلندتر درجے کی طرف ارتقا ہوتا ہے۔

شفاعت یا گناہوں کی مغفرت انبیاء کی درخواست کے نتیجے میں

اقوال عالم کے درمیان مشہور شفاعت اور دانشوروں کی اصطلاح میں معروف سفارش یہ ہے کہ ایک سفارشی کی وساطت گناہوں کی بخشش کا سبب بنے یا اس کے علاوہ اجر اور درجے کی بلندی کا باعث بھی ہوجائے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک مقرب شخص کی وساطت کیسے ایک گنہگار فرد کے نامۂ اعمال میں اس طرح کی تبدیلی کا باعث بنتی ہے؟ اس مطلب کی صداقت کی تصدیق کچھ مطالب کے بیان میں مضمر ہے کہ ہم آپ کی توجہ ذیل میں ان مطالب کی طرف مبذول کرتے ہیں:

ا۔ رحمت حق وسیع ہے

بہت ساری آیات واحادیث خداوند متعال کی وسیع رحمت کی گواہی دیتی ہیں اور اس کی رحمت (گناہوں کی بخشش اسی عظیم درخت کی ایک شاخ ہے) اس قدر وسیع ہے کہ کائنات کے تمام موجودات کو شامل ہے اور ہر موجود اپنی لیاقت واستعداد کے لحاظ سے اس رحمت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

جس وقت حاملانِ عرش الٰہی صاحبانِ ایمان افراد کے حق میں استغفار اور مغفرت طلب کرتے ہیں اور خدا کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ ان کو بخش دے تو مومنوں کے حق میں خدا سے مغفرت کی درخواست یوں بیان کرتے ہیں:

رَبَّنَا وَسِعۡتَ کُلَّ شَیۡءٍ رَّحۡمَۃً وَّعِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاتَّبَعُوۡا سَبِیۡلَکَ وَقِہِمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ ﴿۷﴾ (سورہ مومن: ۷)

''پروردگار! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز پر احاطہ کیے ہوئے ہیں، تو جن لوگوں نے (سچے) دل سے توبہ کرلی اور تیرے راستے پر چلے ان کو بخش دے اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچالے۔''

آیت کے معنی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حاملانِ عرش کہ وہ خود بارگاہِ خدا کی جانب سے سفارش کرنے والے ہیں۔ جب وہ خدا کی رحمت کو وسیع دیکھتے ہیں اور تمام موجودات کو اسے اپنے دائرے میں داخل کیے ہوئے دیکھتے ہیں تو پھر خدا کے حضور دعا کرتے ہیں کہ اپنی وسیع رحمت کی ایک شاخ جو بندوں کے گناہوں کی مغفرت اور ان کو جہنم کے عذاب سے نجات دینا ہے، اپنے ایسے بندوں کے سروں کے اوپر پھیلا دے جو اس سے بہرہ مند ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ایک اور آیت میں ایسے افراد کے بارے میں جو گناہان کبیرہ اور سزا آور گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں، یوں ارشاد فرمایا:

اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ [1]

''بے شک تیرا پروردگار وسیع اور کشادہ مغفرت کا مالک ہے۔

ایک اور آیت میں فرمایا:

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ [2]

''اگر وہ تم کو جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمہارا پروردگار وسیع اور کشادہ رحمت کا مالک ہے۔''

۲۔سوائے شرک ہر گناہ قابل بخشش ہے

رحمت خدا کی عظمت اور اس کی بزرگی کے لیے یہی کافی ہے کہ اس نے کفر اور شرک کے علاوہ ہر قسم کے گناہ قابل بخشش و مغفرت قرار دیے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ [3]

''خدا گناہ (بنام) شرک کو ہرگز معاف نہیں کرتا، ہاں اس کے علاوہ جس کے لیے چاہے بخش دے۔''

یہ آیت بتلا رہی ہے کہ خداوند متعال شرک کے علاوہ ہر گناہ کو بخش دے گا اور اس سے مراد وہ گناہ ہے جس کے بعد توبہ انجام نہ پائی ہو۔ یعنی خدا کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ شرک کے سوا ہر گناہ خواہ اس کے مرتکب نے توبہ بھی نہ کی ہو اسے معاف کرتا اور بخش دیتا ہے۔

یہ جو ہم نے عرض کیا کہ مراد ایسا گناہ ہے جس کے بعد توبہ نہ ہو یہ اس وجہ سے کہا ہے کہ اس سے مراد اگر ایسا گناہ ہو جس کے بعد توبہ اس کے ہمراہ ہو تو ایسی صورت میں شرک کو استثناء کرنا لغو اور صحیح نہ ہوتا اس لیے کہ اس صورت میں توبہ اور ایمان کے ہوتے ہوئے تو تمام گناہ یہاں تک کہ کفر و شرک بھی بخش دیے جائیں گے۔

لیکن یہ کہ گناہ شرک نہیں بخشا جائے گا تو یہ اس بناء پر ہے کہ اس گناہ کا ارتکاب کرنے والا اپنے آپ سے لیاقت و شائستگی کو سلب کرتا ہے اور اب قابل تطہیر نہیں ہے۔ وہ دوسری نجس العین موجودات کے مانند ہے کہ جس کو اگر سات سمندروں میں بھی دھولیا جائے تو بھی پاک نہیں ہوگا یا اس ڈھکے ہوئے برتن کی طرح ہے کہ اگر اسے سمندروں کی تہہ میں رکھ دیا جائے تو بھی اس کے اندر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پہنچ سکتا۔

البتہ یہ جو قرآن کا ارشاد ہے کہ خدا شرک کے علاوہ ہر قسم کے گناہ بخش دیتا ہے، اس سے مراد صرف یہ بتانا ہے کہ ہر گناہ بخشے جانے کے قابل ہے، ایسا نہیں کہ فعلی اور قطعی طور پر تمام گناہوں کی بخشش کی خبر دی جارہی ہو۔

---

[1] سورہ نجم آیت ۳۲

[2] سورہ انعام آیت ۱۴۷

[3] سورہ نساء آیت ۱۱۶

علاوہ ازیں یہ بخشش بھی اس شخص کے بارے میں ہے کہ جس کے لیے خدا چاہے (لن یشاء) اس بناء پر آیت کے معنی تجری اور جرات کا سبب نہیں بنتے۔ اس پہلو کی تشریح شفاعت پر وارد اعتراضات کے باب میں آپ ملاحظہ کریں گے۔

۳۔ انبیاء کی دعا بخشش کا سبب ہے

قرآن مجید سے استفادہ ہوتا ہے کہ اولیائے خدا اور اس کی بارگاہ کے محبوب بندوں کی دعا گناہ گار بندوں کی مغفرت و بخشش کے حصول کا سبب ہوتی ہے۔

اس بناء پر ہم دیکھتے ہیں کہ فرزندان یعقوبؑ جب اپنے کیے ہوئے افعال پر پشیمان ہوتے ہیں اور اپنے والد کی طرف متوجہ ہو کر عرض کرتے ہیں:

يٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيۡنَ ﴿۹۷﴾ [۱]

ابا جان! خدا سے ہمارے حق میں بخشش طلب فرمائیے، بے شک ہم خطا کار افراد تھے۔

حضرت یعقوبؑ بھی ان کی درخواست پر مثبت جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَـكُمۡ رَبِّىۡ‌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۹۸﴾ [۲]

”جلد ہی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں تمہارے لیے مغفرت طلب کروں گا۔ بے شک وہ بخشنے والا اور رحیم ہے۔“

یہ صرف حضرت یعقوبؑ نہیں کہ ان کی دعا گنہ گاروں کی مغفرت کا سبب بنے بلکہ خدا کچھ افراد کی اس بناء پر مذمت اور ملامت فرماتا ہے کہ کیوں پیغمبرؐ کے حضور شرفیاب نہیں ہوتے تا کہ پیغمبرؐ سے اپنے گناہوں کی مغفرت کے لیے درخواست کریں۔

ارشاد ہوا:

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذْ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۶۴﴾ [۳]

”جب ان لوگوں نے (نافرمانی کر کے) اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اگر تمہارے پاس چلے آتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسولؐ (تم) بھی ان کی مغفرت چاہتے تو بیشک وہ لوگ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔“

---

[۱] سورہ یوسف آیت ۹۷

[۲] سورہ یوسف آیت ۹۸

[۳] سورہ نساء آیت ۶۴

یہ دونوں آیات اور ان کے علاوہ کچھ اور آیات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ انبیاء اور بارگاہِ خدا کے مقرب بندوں کی دعا اس قدر موثر ہے کہ یہ کئی گناہ گار افراد کی مغفرت کا سبب ہوتی ہے۔

جب انبیاء کی دعا اس دنیا میں گناہوں کی بخشش کا سبب ہے اور خدا نے قطعی وعدہ دیا ہے کہ اگر وہ بدترین افراد (جیسے منافقین جن کی طرف دوسری آیت میں اشارہ ہوا) کے حق میں دعا کریں تو خداوند متعال کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمن پائیں گے تو یقینا قیامت میں بھی ان کی دعا ایسا اثر ضرور رکھے گی اس لیے کہ ان کی دعا کی قبولیت کی وجہ بارگاہِ الٰہی میں ان کا قرب معنوی تھا۔

۴۔ معنوی فیض کا ایک نظام ہے

اگر اس دنیا میں مادی فیض ایک مخصوص نظام پر مشتمل ہے اور انسانوں کی فطری ضروریات ایک طرح کے مادی علل واسباب کے ذریعے سے پوری ہوتی ہیں تو اسی طرح خدا کا معنوی فیض جیسے ہدایت، راہنمائی اور اس کی مغفرت وبخشش بھی ایک نظام کے تابع ہے جس کا ایک گوشہ ہمارے لیے معلوم اور واضح ہے۔ مثلاً خدا کا حکیمانہ ارادہ اس سے متعلق ہوا ہے کہ دنیا میں فیضانِ ہدایت اس کی جانب بھیجے ہوئے انبیاء کے وسیلے سے انسانوں تک پہنچے، اس لیے کہ انبیاء کے علاوہ کوئی بھی شخص خدا کے خطاب اور اس کے امر ونہی کا بلا واسطہ مخاطب قرار نہیں پاتا ہے۔

یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے نزولِ وحی کا بھی ایک نظام ہے جس کی جانب قرآن مجید (سورہ شوریٰ آیت ۵۱) میں ارشاد ہوا ہے۔

اس بناء پر کوئی مانع نہیں کہ خدا کی رحمت اور اس کی مغفرت بھی آخرت میں ایک نظام کے تابع ہو جس کا ایک گوشہ ہمارے لیے واضح ہے، یعنی خدا کی بخشش پاک ارواح ونفوس کے ذریعے ان گناہ گار لوگوں تک پہنچے جو اہلیت وشائستگی رکھتے ہوں جس طرح کہ دنیا میں خدا کی بخشش اور اس کے دیگر معنوی فیوض انبیاء کے وسیلے سے لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

۵۔ حقیقت شفاعت کیا ہے؟

حقیقت شفاعت اس کے سوا نہیں کہ خدا کی رحمت واسعہ اور اس کی بخشش اولیائے الٰہی جو کہ حاملانِ فیض اور رحمت کے وسیلے ہیں، کے ذریعے ان گنہ گار افراد تک پہنچتی ہے کہ جو بخشش کی اہلیت رکھتے ہیں۔

اگر یہ فیض کسی کے واسطے کے بغیر بھی ان افراد کو پہنچ سکتا تھا، لیکن خدا کا حکیمانہ ارادہ اس چیز کے ساتھ تعلق قائم کیے ہوئے ہے کہ اس کا معنوی فیض آخرت میں دنیا کی طرح اور اس کے دیگر مادی اور معنوی فیض کی طرح خاص اسباب اور معین علل کے تحت افراد تک پہنچے۔ اس بنا پر خدا کا ارادہ یہ ہے کہ کچھ افراد خدا کے واضح فرمان اور اذن سے قیامت کے دن اپنی دعا اور درخواست کے ذریعے کہ ان کی دعا کے گناہوں کو مٹانے اور مغفرت کے حصول میں تکوینی اثر کی کیفیت ہم پر واضح نہیں، خدا کی رحمت کو کچھ بندوں کے شامل حال کرائیں گے اور ان کو کیفر اور

سخت سزاؤں کے چنگال سے رہائی دلائیں گے۔

اس بات کی وجہ کہ فیض بخشش براہِ راست بندوں کے شامل حال نہیں ہوتا نیز یہ کہ خدا کا حکیمانہ ارادہ اس سے متعلق ہوا ہے کہ اس کے مادی اور معنوی دونوں قسم کے فیض دونوں جہانوں میں ایک خاص نظام کے تحت ہوں، یہ ہے کہ اولیاء کی دعا اور ان کی درخواست کو قبول کرنا بھی ایک قسم کی تکریم اور ان کے لیے ایک قسم کا احترام ہے۔

اولیائے خدا، نیک بندے، آسمانوں کے فرشتے اور حاملانِ عرش کہ جنہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ خدا کی اطاعت میں بسر کیا ہے اور بندگی کے دائرے سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکالا، اکرم و احترام کے مستحق ہیں۔ پس کون سا احترام اس سے بلند و بالاتر ہوگا کہ رحمت و مغفرت کے اہل بندوں کے حق میں ان کی دعا قبول کی جائے۔

٦۔ قیامت میں کام کا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے

قیامت کے دن عنانِ معاملہ خدا کے دستِ قدرت میں ہے۔ ہم ہر روز درج ذیل جملے کے ذریعے اسے یاد کرتے ہیں:

"مالک یوم الدین" جزا و سزا کا معاملہ خدا سے مربوط ہے اور اسے ہی حق حاصل ہے کہ کچھ مصلحتوں کے پیش نظر بعض افراد کی سزاؤں سے درگزر فرماتے ہوئے ان سزاؤں کو نظر انداز کرے۔

قرآن مجید اجر و سزا کے بارے میں بڑی کامل صراحت کے ساتھ خدا کی حکومت مطلقہ اور کسی کے دخل کے بغیر اس کے مالک ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور خدا کی توصیف مندرجہ ذیل جملوں کے ذریعے کرتا ہے:

وہ ایسا خدا ہے کہ کچھ مصلحتوں کی خاطر بندوں کے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ [1]

"خدا ان کے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کرتا ہے۔"

وہ ایسا خدا ہے کہ نیک افراد کے اعمال کو کچھ عوامل کی وجہ سے معدوم اور نابود کرتا ہے اور وہ اب ان اعمال سے کسی طرح کا فائدہ نہیں حاصل کر سکتے۔ ارشاد فرمایا:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ [2]

"ہم (دنیا میں) ان کے اعمال کی طرف توجہ کریں گے اور ان کے اعمال کو گویا اُڑتی ہوئی خاک بنا (کر برباد کر) دیں گے۔

---

[1] سورہ فرقان آیت ۷۰

[2] سورہ فرقان آیت ۲۳

یہ وہی حبط اعمال ہے کہ جس کی طرف دیگر آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔[۱]

وہ ایسا خدا ہے کہ گناہانِ کبیرہ سے پرہیز کو دیگر گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ [۲]

''اگر گناہانِ کبیرہ سے پرہیز کیا تو تمہارے گناہانِ صغیرہ سے درگزر کریں گے۔''

وہ ایسا خدا ہے کہ خوشخبری دیتا ہے کہ شرک اور کفر کے علاوہ سب گناہ قابل بخشش و مغفرت ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ [۳]

''خدا شرک کو نہیں بخشتا، لیکن دیگر تمام گناہوں کو جس کے لیے چاہے بخش دیتا ہے۔''

وہ ایسا خدا ہے کہ کبھی ایک نیک کردار کو دو برابر اور کبھی اسے دس گنا اجر عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ [۴]

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ اپنا اجر دوگنا لیتے ہیں۔''

نیز ارشاد فرمایا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ [۵]

''جو بھی اچھا کام کرے اس کے لیے دس گنا عوض ہے۔''

بہر حال وہ ایسا خدا ہے کہ کبھی تو عمل معدوم کو وجود بخشتا ہے اور ایسے کام پر کہ جس کو کسی نے انجام نہ دیا ہو، اجر دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝۲۱ [۶]

''وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد نے بھی ان کی پیروی کی ہے ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملحق

---

[۱] فاحبط اعمالهم سورہ محمد آیت ۹

[۲] سورہ نساء آیت ۳۱

[۳] سورہ نساء آیت ۴۸ و ۱۱۶

[۴] سورہ قصص آیت ۵۴

[۵] سورہ انعام آیت ۱۶۰

[۶] سورہ طور آیت ۲۱

کریں گے اور ان کے عمل سے کچھ بھی کم نہ کریں گے۔ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا۔''

مختصر یہ کہ قیامت میں عنانِ حکومت خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی مالک مطلق ہے اور بلا شریک فرمانروا ہے، جو چاہے انجام دیتا ہے اور جو حکم دینا چاہتا ہے وہ حکم دیتا ہے، البتہ وہ جو کام بھی کرتا ہے ایک مصلحت اور سبب کے تحت ہے جو اس کام کے انجام کا موجب بنتی ہے اور ان افعال میں سے ایک انبیاء و اولیاء اور اس کے مقرب بندوں کی شفاعت ہے جو کچھ شرائط کے تحت ہوگی......

۷۔ شفاعت ایک قسم کی تطہیر و پاکیزگی ہے

قرآن کے حوالے سے موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ دوسرے عالم (عالم برزخ) کی طرف کھلنے والے ایک دریچے کا نام ہے۔ وہاں کا طرزِ زندگی دنیاوی اندازِ زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں کچھ افراد عذاب میں مبتلا ہوں گے اور کچھ افراد نعمتوں سے استفادہ کریں گے۔ وہ بندے جنہوں نے خدا سے اپنا رابطہ منقطع نہ کیا ہو اور اس کی بارگاہ کے شفیعوں سے اپنا معنوی تعلق بھی محفوظ رکھا ہو وہ برزخ میں کسی حد تک اپنے برے اعمال کی سزا بھگتیں گے اور یہی سزائیں ان برے اعمال اور گناہوں سے پاک و پاکیزہ ہونے کا ایک مقدمہ اور پیش خیمہ ثابت ہوں گی۔ یہ افراد جب محشر میں قدم رکھیں گے تو اس تطہیر و پاکیزگی کی وجہ سے، جو عالم برزخ میں انہیں حاصل ہو چکی ہے، خدا کی مغفرت اور بخشش کے حصول کے لیے زیادہ آمادگی رکھتے ہوں گے۔

خدا کی مغفرت اور اس کی بخشش جو اس کی بارگاہ کے شفیعوں کے ذریعے ان افراد کے شامل حال ہوگی وہ بنیادی تطہیر اور گناہوں کے برے اثرات کے محو ہو جانے اور ان کی روح و نفس کے پاک ہونے کے علاوہ نہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ اولیائے خدا اس ولایت و اختیار کے تحت جو افراد کی روح و نفس پر ان کو حاصل ہے، پروردگارِ عالم کے حکم پر ان افراد کی تطہیر کر کے انہیں پاک و پاکیزہ بنا دیں گے۔ اس بناء پر پہلے عرض کیا کہ شفاعت ناتواں اور ضعیف بندوں کی مدد کے لیے با استطاعت افراد کے آگے آنے کے علاوہ کسی چیز کا نام نہیں۔

۸۔ فضل والی شفاعت

مناسب ہے کہ اس قسم کی شفاعت کا نام مغفرت والی شفاعت یا تفضلی شفاعت رکھا جائے اس لیے گناہوں کو بخش دینا اور اولیاء کی سفارش کو قبول کرنا خدا کی جانب سے بندوں کے لیے ایک تفضّل ہے۔

شفاعت کے کیے ہوئے تین معانی میں سے یہ معنی زیادہ مناسب ہیں اور شفاعت کو ثابت کرنے والی آیات اس معنی کے علاوہ کچھ اور مراد بتا بھی نہیں رہی ہیں۔ یہ معانی نزولِ قرآن کے وقت اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی عربوں کے درمیان مروج تھے کہ جب کوئی مجرم شخص کسی سے رابطہ کرتا کہ وہ حاکم یا قاضی کے پاس اس کے حق میں سفارش کرے تو اس کا نام شفاعت رکھ دیا کرتے تھے۔

عظیم عرب لغت شناس ''ابن فارس'' اپنی قیمتی کتاب لغت میں لکھتے ہیں:

"شفع فلان لفلان: اذا جاء ثانیه ملتمسا مطلبه و معینا له"[1]

''کہا جاتا ہے: فلاں نے فلاں کے حق میں سفارش کی، یعنی دوسرا شخص پہلے کی مدد کے لیے اٹھے اوراپنی درخواست کے ذریعے اس کی مدد کرے۔''

سوادؓ بن عازب جو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی ہیں، وہ حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے عرض کی کہ قیامت کے دن اُن کے شفیع ہو جائیں۔ اس سلسلے میں اس نے چند اشعار کہے جن میں سے ایک شعر یہ ہے:

"وكن لي شفيعا يوم لا ذو شفاعة
بمغن سواك عن سواد بن عازب[2]

''اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس دن تیرے غیر کی شفاعت انسان کو بے نیاز نہیں کرے گی اس دن آپ میرے (سواد بن عازب کے) شفیع ہو جائیں۔''

اس سخن ساز شاعر نے اپنے اس خالص عربی ذوق کے ذریعے شفاعت کو اپنی نجات کے لیے رسول اکرمؐ کی سفارش کے معنی ہی میں استعمال کیا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ذہن میں کچھ اور معنی آئے ہوں۔

قرآن کا ارشاد ہے:

فرشتے اور حاملانِ عرش شفیع ہیں۔ یا فرمایا:

قیامت کے دن کچھ افراد خدا کے اذن سے ایسے افراد کے حق میں شفاعت کریں گے جن کو خدا چاہے اور ان سے راضی ہو جائے۔

عرب معاشرہ کہ جس کی قومی اور مادری زبان عربی تھی وہ ان آیات سے ذہن میں مرتکز شدہ معنی کے علاوہ کچھ اور معنی نہیں سمجھتے تھے اور انہوں نے جان لیا کہ آخرت میں شفاعت وہی ہے جو اس دنیا کے لوگوں کے نزدیک مشہور ہے، اسی کی تعدیل شدہ صورت ہے۔ البتہ جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ لوگوں میں رائج سفارشات کی قبولیت یا ان کی رد کے لیے کوئی درست معیار نہیں ہے بلکہ جب بھی حاکم کو سفارش کی ضرورت مجرم کو سزا دینے سے زیادہ پڑ جائے تو اس صورت میں اس کی سفارش حاکم قبول کر لیتا ہے ورنہ اسے مسترد کر دیتا ہے۔

لیکن اسلام نے اس مذہبی نظریے کو قانون اور خاص شرائط کے تابع قرار دیا تاکہ تربیتی اور تعمیر حوالے سے بہت موثر اور مفید ہو اور افراد کی شفاعت کو بول کرنے کا کوئی رابطہ شفیع کے ساتھ اس کی کسی ضرورت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس کا اپنا ایک معیار ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ و مفردات کو عقلی اور نقلی شواہد کے بغیر اس کے خلاف تفسیر و تاویل کریں جو

---

[1] گویا علامہ مرحوم نے شرح تجرید کے ص ۲۶۲ (طبع صیدا) میں اس دانشور کے کلام کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[2] شفاعت سے مربوط کچھ اشعار کتاب ہذا کے باب دہم میں ذکر ہوں گے۔

عرف عام میں لوگ ان الفاظ سے معنی سمجھتے ہیں۔ لفظ شفاعت بھی منجملہ ان الفاظ میں سے ہے جو لوگوں کے درمیان رائج تھا۔ مشہور و معروف معنی کے علاوہ اپنے کسی اور معنی پر حمل کرنے کے لیے کوئی قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔

شفاعت کا نتیجہ

ا۔ شفاعت سزا ختم کرنا ہے، یا درجہ بڑھانا ہے یا دونوں ہیں؟

قرآن کی صحیح تفسیر کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مفسر اپنے آپ کو ذاتی عقائد اور پہلے سے قائم کردہ عقائد سے خالی کرے اور ایک آیت یا آیات جو کسی موضوع سے مربوط ہوں ان پر وقت سے پہلے فیصلہ قائم کیے بغیر غور و خوض کرے۔

ایک مفسر کے لیے سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ کچھ فلسفی یا کلامی نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے آیات کی تفسیر کرنے لگے کیوں کہ اس صورت میں قرآن کو اپنے شخصی نظریات پر منطبق کرنے کے علاوہ کوئی اور نتیجہ حاصل نہ ہوگا اور اس کے بدلے کہ قرآن اس کے لیے دلیل و رہنما بن جائے وہ خود قرآن کا رہنما بننے کی کوشش کرے گا۔

اس قسم کے افراد بجائے اس کے کہ پہلے اپنے نظریات و عقائد کو قرآن سے پرکھ لیتے اور قرآن کی آیات سے الہام لیتے انہوں نے قرآن کو اپنے پہلے سے قائم کردہ نظریات و خیالات پر پرکھنا شروع کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر اپنے مدعا کو معین کیا ہے اور عقیدہ بنا چکے ہیں، اس کے بعد اس کے لیے نقلی دلیل تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

فرقہ معتزلہ شفاعت سے مربوط آیات کے فہم میں اسی مشکل سے دوچار ہے کیونکہ انہوں نے شفاعت سے مربوط تمام آیات سے یہی نتیجہ لیا ہے کہ:

''اولیائے خدا کی شفاعت ایسے افراد سے مختص ہے کہ جنہوں نے خدا کی اطاعت کی ہے اور گناہوں سے اپنا دامن آلودہ نہ کیا ہے۔ یہ افراد باوجود یہ کہ بہشتی ہیں لیکن شفاعت کے پرتو میں زیادہ اجر حاصل کر کے درجہ کی بلندی کے مستحق ہوتے ہیں۔''

شفاعت کی اس قسم سے ہرگز انکار نہیں اور بالکل بعید نہیں کہ قیامت میں شفیعوں کی شفاعت کے ذریعے فرمانبردار اور پاک دامن ایسے ہوں یعنی شفاعت سبب ہو زیادہ اجر کے حصول کا جس کے نتیجے میں وہ درجے کی بلندی حاصل کریں۔

لیکن لغت عرب میں شفاعت کے رائج معنی اس قسم کے علاوہ ہیں۔ اسی طرح عوام اور متشرعہ کے نزدیک شفاعت سے متبادر معنی مذکورہ معنی کے غیر ہے۔

یہ مطلب قرآن کی آیات پر غور و خوض کرنے سے واضح ہوگا کیونکہ یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا ہے کہ آیاتِ شفاعت مذکورہ معنی بتلا رہی ہیں اور تو اور اس سے بڑھ کر یہ تو بالکل ہی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آیات اسی مذکورہ قسم پر منحصر ہیں کیونکہ شفاعت کے معنی وسیع ہیں۔ پاکدامن اور مطیع افراد کی شفاعت کرنا اس کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہوگا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ آیات شفاعت خواہ نفی والی یا ثابت کرنے والی ہوں انہوں نے قرآن میں ایک لہر پیدا کی ہے۔ انہوں نے بعض سفارشوں کی نفی کی ہے اور بعض دیگر شفاعات کو قبول کیا ہے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اس لہر کی سرحد پاکدامن افراد کے دائرہ سے باہر نہیں۔ یہ مطلب شفاعت سے متعلق تمام آیات (جو اس کتاب کے تیسرے حصے میں مرقوم ہیں) کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوگا۔

نظریۂ شفاعت کوئی ایسی چیز نہیں جو صرف قرآن کا ایجاد کردہ ہو بلکہ اسلام سے پہلے بھی دنیا والوں کے درمیان ایسا نظریہ موجود تھا۔ البتہ قابل ذکر یہ ہے کہ اسلام نے آکر اصل نظریہ کو قبول کیا مگر اس کے ٹیڑھے اور کج پہلوؤں کو ختم کر دیا۔

نظریہ شفاعت اور بزرگوں اور بارگاہ خدا کے مقرب بندوں کی سفارش کی امید زیادہ تر گناہ گاروں اور آلودہ افراد کے بارے میں ہے کیونکہ تاریخ میں بت پرستی میں آلودہ افراد اور پلید یہودی جو کسی قسم کے گناہ کے ارتکاب سے ہاتھ روکتے نہ تھے شفاعت پر اپنی نظر امید جما کر اپنے آپ کو شفیعوں کی شفاعت کی قبولیت کے خیال کے ذریعے مطمئن کیا کرتے تھے۔

قرآن نے ایسے ہی مسئلے میں فرمایا:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ [۱]

''کون ہے جو وہ اور اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے۔''

نیز انہی حالات و کیفیات کے بارے میں فرمایا:

وَلَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (انبیاء ۲۸)

''وہ ان افراد کے سوا کہ جن سے خدا راضی ہے کسی اور کی شفاعت نہیں کرتے۔''

اس فرض کے ہوتے ہوئے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ صالح بندوں کی شفاعت مطیع اور پاکدامن افراد کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ اس شفاعت کے ذریعے بیشتر اجر پائیں گے؟

مزید برآں وہ احادیث جو شفاعت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ سب معتزلہ کے نظریے کے خلاف ہیں۔

اسلامی محدثین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ادخرت شفاعتی لاهل الکبائر من امتی" [۲]

''میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے گناہانِ کبیرہ کے مرتکب افراد کے لیے ذخیرہ کیا ہوا ہے۔''

اس حدیث اور اس کے علاوہ دیگر احادیث کے ہوتے ہوئے جو مضمون کے لحاظ سے تواتر کی حد تک پہنچتی ہیں، شفاعت کو کیسے صرف

---

[۱] سورہ بقرہ آیت ۲۵۵

[۲] اس حدیث کا حوالہ کتاب کے آٹھویں حصے میں لکھ دیں گے۔

فرمانبردار افراد کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ایک دیرینہ نزاع کی تحقیق

معتزلہ اہل سنت عقائد کے علماء اور ان کے مذاہب میں سے ایک مذہب کے افراد ہیں جن کو ''وعیدیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

گناہانِ کبیرہ کے بارے میں ان کا ایک مخصوص نظریہ ہے جو سبب بنا کہ وہ دیگر اسلامی فرقوں سے دور ہو جائیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ علمائے اسلام کے درمیان اس بات پر اتفاق نظر ہے کہ گناہِ صغیرہ اور ایسے ہی گناہِ کبیرہ کا مرتکب اگر توبہ کر لے تو اسے بخش دیا جاتا ہے۔

لیکن یہ کہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کا بھی عفو اور بخشش کے قابل ہونا ان معنی میں ہے کہ اس کے لیے اس کی بخشش کا امکان پایا جاتا ہے نہ کہ وہ بخش بھی دیا گیا ہے۔ بہت ساری قرآنی آیات اس بات کی صحت اور پائیداری کی گواہی دیتی ہیں۔ [۱]

مگر معتزلہ کا اصرار ہے کہ گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔

انہوں نے اپنے عقیدے کے لیے قرآن کی چند آیات سے استدلال کیا ہے۔ اسلامی محققین نے اپنی کتابوں میں ان کے دلائل کو رد کر کے حقیقت کو واضح کیا ہے۔ [۲] اس بناء پر ہم اپنے آپ کو دلائل کے نقل کرنے اور ان کے لیے جواب دینے سے مستغنی سمجھتے ہوئے دامن سخن کو مختصر کرتے ہیں۔

لیکن یہ کہ قارئین محترم کسی حد تک حقیقت مطلب سے آگاہ ہو جائیں ہم مختصر طور پر فرقہ معتزلہ کے مشہور افراد کے کلمات کے بارے میں علمائے اسلام کے نظریات عرض کرتے ہیں۔

اسلام کے بزرگ علماء متعدد آیات کی گواہی کے ساتھ فرماتے ہیں:

''وہ لوگ جو گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہیں وہ اس صورت میں عذاب کے مستحق ہوں گے جب خدا کی عفو یا اولیائے خدا کی شفاعت ان کے شامل حال نہ ہوئی ہو لیکن اگر کچھ وجوہات کی بناء پر خدا کی عفو ان کے شامل حال ہو جائے یا خدا کی اجازت سے اولیاء اللہ نے ان کے حق میں شفاعت کی ہو تو اس صورت میں وہ عذاب الٰہی میں مبتلا نہ ہوں گے۔

وہ فرماتے ہیں: قرآن نے کئی مقامات پر بہت سارے گناہوں سے عفو اور ان کے بخشے جانے کا ذکر کیا ہے اگر چہ توبہ نہ بھی ہو، مثلاً:

۱۔ وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا

---

[۱] مثلاً آیت ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ (سورہ نساء ۴۸ و ۱۱۶) ترجمہ اور استدلال کی کیفیت ہم نے مبتلا عرض کی ہے۔)

[۲] کلام کی کتابیں مانند اوائل المقالات ص ۱۴، ۵۲ اور علامہ حلی کی شرح تجرید ص ۲۶۱ طبع صیدا اور شرح تجرید قوشجی ص ۵۰۱ ملاحظہ فرمائیے۔

تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲۵﴾ [۱]

''وہ ہے کہ جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو بخش دیتا ہے اور تمہارے کاموں کو جانتا ہے۔''

اس آیت میں توبہ کی قبولیت کو بیان کرنے کے بعد گناہوں کی بخشش کے مسئلے کو واوٴ عاطفہ کے ذریعے عطف کر کے فرمایا ہے ''ویعفو عن السیات'' عطف کا ظاہر یہ ہے کہ گناہ کا عفو ہونا توبہ والی صورت سے مربوط نہیں ہے ورنہ جملہ اول پر ''واوٴ'' کے ذریعے عطف نہ کیا جاتا۔

مزید برآں مفسرین فرماتے ہیں کہ قبولیت توبہ کے بعد گناہ ساقط اور ختم ہوجاتے ہیں۔ پس عفو اور بخشش کی حاجت بھی نہیں رہتی۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مسئلہ توبہ'' کے علاوہ ایک اور امر بنام عفو بھی موجود ہے جو گناہِ کبیرہ وصغیرہ دونوں پر حاوی ہے اور یہ جو معتزلہ کہتے ہیں کہ گناہِ کبیرہ معاف نہیں ہوں گے آیت کے اطلاق کے برخلاف ہے۔

۲۔ وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍؕ ﴿۳۰﴾ [۲]

''ہر قسم کا ناگوار امر جو تم تک پہنچے وہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے اور خدا بہت سارے گناہوں سے درگزر کرتا ہے۔''

بحث کا نکتہ ''ویعفوا عن کثیر'' کے جملے میں ہے کیونکہ اس جملے کا ظاہر یہ ہے کہ بہت سارے گناہوں کو معاف کرتا ہے اور یہ کہ بہت سارے گناہ کہا ہے تمام گناہ نہیں کہا۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ جملہ ایسی صورت کی طرف نگاہ کیے ہوئے ہے کہ گناہ گار کو توبہ کرنے کی توفیق حاصل نہ ہوسکی ہے اس لیے کہ توبہ کی صورت میں تو سب گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ۚ [۳]

''خدا گناہِ شرک کو نہیں بخشتا۔ شرک کے علاوہ جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔''

دوسرا جملہ عدم توبہ والی صورت بتلا رہا ہے کیونکہ توبہ کے ساتھ تو تمام گناہ یہاں تک کہ کفر وشرک کو بھی بخش دیا جاتا ہے۔

بناء بریں گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے خدا کی مغفرت اور بخشش کی امید رکھ سکتے ہیں۔ البتہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حتمی طور پر بخشے جائیں گے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ قطعی طور پر خدا کی عفو اور اس کی رحمت سے محروم ہوں گے۔

ان بیانات سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہ صرف یہ کہ عذاب میں ہمیشہ اور دائمی طور پر نہیں رہے گا بلکہ قطعی طور پر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ دوزخ کی آگ میں یقینی طور پر داخل ہوگا بلکہ ان افراد کو چاہیے کہ خوف ورجا اور بیم وامید کے ساتھ رہیں۔

بلکہ جب بھی گناہانِ کبیرہ کے مرتکب افراد نے اس طرح زندگی بسر کی ہو کہ اپنا ایمانی رابطہ خدا سے منقطع نہ کیا ہو اور اولیاء اللہ کے

---

[۱] سورہ شوریٰ آیت ۲۵

[۲] سورہ شوری آیہ ۳۰

[۳] سورہ نساء آیہ ۴۸ و ۱۱۶

ساتھ اپنا معنوی رابطہ محفوظ رکھا ہو تو اولیاء کی شفاعت سے محروم نہیں ہوں گے۔

یہ تھا ان افراد کے بارے میں علمائے اسلام کے نظریات کا خلاصہ۔

اس کے باوجود بعض گناہانِ کبیرہ بندوں کے معنوی رابطے پر اس طرح کی کاری ضرب لگاتے ہیں جو خدا اور اولیائے خدا کے ساتھ ان کے رابطے کو منقطع کر کے کچھ مدت کے لیے شفاعت کے لیے ہر طرح کی صلاحیت و شائستگی کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ عذاب میں ایک طرح کی تطہیر و تصفیہ کے بعد دوبارہ شفاعت کے اہل ہو جاتے ہیں۔

مگر وہ کون سے گناہ ہیں جو اس طرح کا برا اثر چھوڑ جاتے ہیں، اس مسئلے کے لیے اسلامی روایات و احادیث سے رجوع کیا جانا چاہیے اور پھر ان کا تعین کیا جائے۔

فرقہ معتزلہ کا خیال ہے کہ گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے ہمیشہ عذاب میں ہوں گے۔ انہوں نے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے چند ایسی آیات سے استدلال کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے مدعا پر ہرگز دلالت نہیں کرتی ہیں۔ ان کے دلائل سے آگاہ ہونے کے لیے عقائد کی مذہبی کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔[1] البتہ ان کی بہت ساری ادلہ شفاعت کی نفی کرنے والی آیات ہیں جن کا معنی اور موقف تیسرے حصے میں واضح کیا جائے گا۔

[1] شرح تجرید ص ۲۶۱، ۲۶۶ وغیرہ

شفاعت پر اعتراضات

ا۔ شفاعت پر بے جا تنقید

اب تک ہم حقیقت شفاعت اور اس کے تربیتی آثار سے پوری طرح آگاہ ہوئے اور یہ واضح ہوا کہ نظریہ شفاعت مذہبی تعلیمات میں سے ایک بنیادی ترین چیز ہے جو قرآن مجید میں وارد ہوئی ہے۔ کسی بھی منصف شخص کے لیے اس کی صحت واستواری میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

مگر یہی مذہبی اصول دیگر اصول وتعلیمات کی طرح ایک قسم کے شبہات و اعتراضات اور ناروا تنقیدوں کا نشانہ بنا ہے۔ البتہ ان تنقیدات میں سے بہت ساری تنقیدیں اصل موضوع پر توجہ نہ دینے کا نتیجہ ہیں۔

اس طرح کے اعتراضات سے ہرگز خائف و ہراساں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تمام مذاہب اور اقوام کے عقاید کی بنیاد مسئلہ خداشناسی سے تشکیل پاتی ہے جب کہ آج اس بنیادی نظریے پر بھی کئی اعتراضات اور شبہات کیے گئے ہیں۔ ان تمام اشکالات کا جواب دیا گیا ہے۔

ہم ان تمام اعتراضات کو الگ الگ عرض کر کے ان کا جواب دیں گے۔ صاحبانِ عقل حضرات سے ہماری صرف یہ استدعا ہے کہ کتاب کے اس باب پر پوری توجہ سے تحقیق کریں۔ [1]

۲۔ کیا عقیدۂ شفاعت لوگوں کی جرأت کا باعث ہے؟

شفیعان کی شفاعت پر امید رکھنا سبب بنتا ہے کہ گناہ گار افراد اپنے گناہ اور تجاوز کو جاری رکھیں اور روز بروز اپنے جرائم کے حجم میں اضافہ کرتے جائیں کیونکہ وہ لوگ اپنے زعم میں یہ تصور کرتے ہیں کہ سزا والے دن سفارش کرنے والے موجود ہیں جو ان کے حق میں سفارش کریں گے جس کے نتیجے میں خدا ان کے گناہوں کو بخش دے گا۔

مذکورہ سوال کا جواب

اس اعتراض پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت پر اعتراض کرنے والے نے بھی وہی کچھ سمجھ لیا ہے جو دینی معلومات سے اجنبی ایک عام آدمی کے ذہن میں آتا ہے۔ اس نے یہ تصور کیا ہے کہ شفاعت پر عقیدہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ افراد اولیائے خدا کی شفاعت پر اعتماد کر کے اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ کرتے ہیں۔ اس بناء پر اس نے یہ نیجہ لیا ہے کہ شفاعت پر عقیدہ رکھنا گناہوں کے انجام دینے میں

---

[1] اس حصے میں وہ اعتراضات جو شفاعت کے حوالے سے موجود ہیں ان کا وسیع پیمانے پر جائزہ لیا گیا ہے۔ میں اس حصے کے مطالعے کی قارئین محترم کو نصیحت کرتا ہوں اور اگر بعض مقامات پر مطلب کا معیار کچھ بلند ہو یا مشکل نظر آئے تو براہِ کرم اس مطلب کا دوبارہ مطالعہ فرمائیں۔

جرأت اور نیز ہمیشہ گناہ کرتے رہنے کا سبب بنتا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اس اعتراض وتنقید کا کئی طرح سے جواب دیا جاسکتا ہے:

۱۔ اگر مغفرت وبخشش کی امید کہ یہ عقیدۂ شفاعت کا نتیجہ ہے، لوگوں کے گناہ میں جرأت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہو تو پھر خدا نے اپنے بندوں کو اپنی رحمت واسعہ کی خبر کیوں دی ہے اور فرمایا: ''خدا شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔'' چنانچہ ارشاد ہوا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ [۱]

''خدا شرک کے سوا تمام گناہ بخش دے گا۔''

یہ جو فرماتا ہے کہ خدا تمام گناہوں کو بخش دے گا اس سے مراد بغیر توبہ کے گناہ بخشنا ہے۔ کیونکہ اگر مراد توبہ کے ساتھ بخشش ہو تو شرک کو مستثنیٰ کرنا صحیح نہ ہوتا۔ اس لیے کہ شرک بھی توبہ کے ساتھ جو کہ توحید کی طرف ایک بازگشت ہے، بخش دیا جاتا ہے۔

۲۔ اگر مغفرت کی امید باعث جرأت ہے تو خدا نے کیوں یہ خوشخبری دی ہے کہ اگر گناہان کبیرہ کبرہ سے اجتناب کرو گے تو ہم تمہارے گناہان صغیرہ کو بخش دیں گے۔ [۲] کیا ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ خدا سے عرض کریں کہ وہ ایسے ایک وعدے اور نوید کے ذریعے بندوں کو گناہِ صغیرہ کے ارتکاب کی جرأت کا سبب فراہم کر رہا ہے یا یہ کہ ہم اس خوشخبری کو بہت سارے افراد کے اپنے گناہوں سے منہ موڑ کر خدا کی جانب پلٹ آنے کا سبب قرار دیں؟

۳۔ اگر عقیدۂ شفاعت باعث جرأت ہے تو گناہ گاروں کی قبولیت توبہ کا عقیدہ اور اس چیز کی خوشخبری کہ خدا گناہ گاروں کی توبہ کو قبول کرتا ہے بھی گناہ گاروں کے لیے جرأت کا سبب ہونا چاہیے جب کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ دنیا کی تمام ملتوں کے درمیان گناہ گار افراد کے لیے توبہ اور پشیمانی نام کا ایک مسئلہ موجود ہے کہ خاص شرائط کے تحت ان کی ندامت قبول کی جاتی ہے اور وہ سزائیں جو ان کے لیے معین کی گئی تھیں وہ معاف کر دی جاتی ہیں۔ تو اب یہ کہنا چاہیے کہ دنیا کی ساری قوموں نے اس قانون کو منظور کر کے ان کے طغیان کو جاری وساری رکھنے کی تشویق کے اسباب فراہم کیے ہیں۔

مسئلہ توبہ اور یہ کہ گناہ گاروں کا اپنے کیے ہوئے پر نادم اور پشیمان ہونا مخصوص شرائط کے تحت اثر رکھتا ہے اور یہ اسلام کے درخشاں معارف میں سے ایک ہے جس کی متعدد مقامات پر قرآن نے لوگوں کو دعوت دی ہے۔ کبھی پورا مومن معاشرہ خواہشات کے طغیان کے نتیجے میں گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے ذیل کی آیت کے ذریعے توبہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ (تحریم ۸)

---

[۱] سورہ نساء آیات ۴۸، ۱۱۶

[۲] (اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ .... (نساء ۳۱) ''اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم تمہارے حساب سے ساقط کر دیں گے۔''

''اے صحابانِ ایمان! خدا کی طرف پلٹ آؤ اور توبہ کی راہ کو کہ جس میں دوبارہ گناہوں کی طرف بازگشت نہ ہو، اختیار کرو۔''

کیا آپ کا وجدان اجازت دیتا ہے کہ عقلائے عالم اور قرآن مجید نے جس مسئلہ توبہ کو اپنے سزا و جزا کے قوانین کے ضمن میں قرار دیا ہے اسے غلط قرار دیا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ ایسی خوشخبری گناہ گاروں کے لیے جرأت کا سبب بنتی ہے؟

البتہ شفاعت ان غلط معنی کے تحت کہ جو اسلامی حقائق سے دور اور ناواقف افراد کے ذہن میں مرکوز تھے اور جن کا عقیدہ تھا کہ شفاعت کے بل بوتے پر ہر قسم کا برا اور ناروا کام انجام دیا جاسکتا ہے، اس لحاظ سے نظریۂ شفاعت گناہ گاروں کے لیے جرأت اور بدبختی کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ لیکن شفاعت صحیح معنی کے مطابق اور یہ کہ کچھ گناہ گار جو گناہ اور سزا کے اعتبار سے کچھ مخصوص شرائط کے حامل ہوں وہ خدا کے ساتھ معنوی جوڑ اور اس ایمانی رابطے کے تحت جو اولیائے خدا کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہیں وہ لوگ قیامت میں اگر شفیعوں کی شفاعت کے دائرے میں داخل ہوجاتے ہیں تو یہ ہرگز گناہ کے لیے حوصلہ افزائی اور جرأت کی دعوت کا موجب نہیں ہے بلکہ تربیت کا وسیلہ اور گناہ گاروں کے لیے اپنے باقی ماندہ راستے سے بازگشت کا ذریعہ ہے۔

رجا و امید کے درخشاں اور مفید نتائج سے ہرگز غفلت نہ کی جائے، کیونکہ جب کوئی تصور کرلے کہ اس پر امید کا کوئی دریچہ بھی کھلا ہوا نہیں ہے تو وہ ہرگز اس راستے سے جس پر وہ چل رہا ہے، واپس نہ ہوگا۔ لیکن اگر گناہ گار جان لے کہ ابھی کچھ اسباب ہیں جو خاص شرائط کے تحت اس کی پریشانی کا مداوا کرسکتے ہیں اور اسے نجات دے سکتے ہیں تو ایسی صورت میں وہ سرکشی اور گناہ کے طرزِ عمل کو روک کر خدا کی جانب پلٹنے کی فکر میں لگ جائے گا۔ ان عوامل میں سے ایک عامل جو دل میں نورِ امید پیدا کرتا ہے، اولیائے خدا کی شفاعت کا عقیدہ ہے، وہ بھی مخصوص شرائط کے مطابق، یعنی اس صورت میں کہ خدا اسے اپنا رابطہ منقطع نہ کرے اور اس کے اولیاء سے اپنا معنوی رابطہ ختم نہ کرے تو ایسی صورت میں گناہ گار شخص اپنی پوری زندگی میں خدا اور اس کے اولیائے کیے ساتھ رابطہ کو محفوظ رکھنے کی فکر میں ہوگا اور ابتداء سے ہی کوشش کرے گا کہ اپنے پیچھے کی دیوار کو نہ گرائے۔

ایک ماہرِ نفسیات امید کی اہمیت اور مایوسی کے سنگین نقصانات کے بارے میں یوں لکھتا ہے: بہت سارے ناواقف لوگ انسانی پہلوؤں اور مذہبی مہر و شفقت پر توجہ نہیں دیتے ہیں۔ ان کا تعصب اس حد تک ہے کہ مذہب کے حوالے سے صرف اس کے آمرانہ پہلوؤں اور سزاؤں پر مشتمل وعدوں کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت بھول جاتے ہیں کہ اگر خدا نے دوزخ خلق کی ہے تو جنت بھی خلق کی ہے۔ یہ لوگ خدا کے عدل اور اس کے عفو و بخشش کو عمداً یا لاشعوری طور پر بھول جاتے ہیں۔ درحقیقت پروردگار کے بارے میں یہ غلط تصور رکھتے ہیں، ایسا رخ کہ گویا جس کا کام انسانوں کو صرف ہر گناہ اور چھوٹی سی خطا پر بھی سزا دینا ہے۔ خداوند متعال اور اس کے مذہبی احکام کے بارے میں ایسا غلط تصور باعث بنتا ہے کہ انسان ہر لمحے میں اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں سے جہنمی بنالے اور اذیت رساں اضطراب میں مبتلا ہوجاتے۔ اس بناء پر ہمیں اپنی اولاد کی تربیت کے معاملے میں کوشش کرنی چاہیے کہ سب سے پہلے ان کے ذہن میں مذہب کے جنتی پہلو کو اجاگر کریں، ان کو بلاوجہ مذہب اور خدا سے نہ ڈرائیں۔

حق بات یہ ہے کہ خدا کے تمام بندے جنت میں جائیں گے مگر وہ لوگ جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں اور توبہ وندامت اور گذشتہ کے جبران کی فرصت سے بھی انہوں نے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔

اگر عقاب ہے تو عفو وبخشش بھی ہے۔ اگر اپنی اولاد، بچوں اور جوانوں کو یوں تلقین کریں کہ چھوٹے سے گناہ اور خطا پر بھی ان پر جنت کا دروازہ بند ہوتا ہے تو ایسی صورت میں بعید نہیں ہے کہ ہماری اولاد اس غلط نتیجے پر پہنچے کہ اس خطا کی بناء پر جو اس سے سرزد ہوئی ہے، اب کسی کام کے نہیں رہے اور اب وہ جو کام بھی کر لیں خدا کے آخری فیصلے پر کسی طرح کا اثر نہیں کر سکتے۔ اس طرح کا ایک مایوس شخص ہر طرح کے احساس ذمہ داری کو بھلا دے گا اور کچھ بعید نہیں کہ اس مایوسی کی وجہ سے ہر طرح کے جرم کا ارتکاب کر بیٹھے۔ وہ لوگ جو مذہب کے حقیقی چہرے کو مسخ کرنے کے لیے توبہ وپشیمانی اور اپنے نفس کی اصلاح کے دروازے کو جوانوں پر بند کرتے ہیں وہ درحقیقت بارگاہِ الٰہی کی توہین کرتے ہیں کیونکہ حقیقی مذہب میں توبہ کرنے والوں کے لیے بہشت کے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں۔

ایک اور انداز سے جواب

وعدۂ شفاعت اور اس کی تبلیغ اس صورت میں ہر معصیت پر جرأت کا موجب ہے جب اس کے بارے میں حتمی طور پر اور بغیر کسی اجمال وتردید کے خوشخبری دی جائے، جبکہ قرآن نے شفاعت کو مشروط طور پر کچھ اجمالی انداز میں پیش کیا ہے۔ اب ان شروط اور ابہامات کا بیان ہوتا ہے، جو دائرے کی شکل میں شفاعت کو گھیرے ہوئے ہیں:

(الف) اگر وعدۂ شفاعت بطور قطعی اور کسی قید وشرط کے بغیر انجام پائے تو ایسی صورت میں ممکن ہے کہ ایسا خیال کیا جائے لیکن اگر اس خوشخبری کا انجام ایسی شرط سے مشروط ہو جس کا وجود مبہم اور مشکوک ہو تو ایسی صورت میں شفاعت کی خوشخبری ایسی جرأت کی حامل نہ ہوگی۔

کیونکہ جیسا کہ شفاعت سے متعلق آیات میں بیان کیا گیا کہ شفاعت کی انجام دہی اذن خدا کے ساتھ مشروط ہے اور جس کی شفاعت ہونی ہے اس سے خدا کو بھی راضی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ [۱]

''کون ہے جو خدا کے اذن کے بغیر شفاعت کرے؟''

اور پھر فرمایا:

وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی [۲]

[۱] سورہ بقرہ آیت ۲۵۵

[۲] سورہ انبیاء آیت ۲۸

''وہ ایسے افراد کے حق میں شفاعت کرتے ہیں جن سے خدا راضی اور خوش ہے۔''

اس لیے کہ قطعی طور پر کوئی بھی گناہ گار مطمئن نہیں ہوسکتا کہ خدا اپنی بارگاہ کے محبوب بندوں کو اجازت دے گا کہ وہ اس کے حق میں شفاعت کریں تا کہ اس اطمینان کے ناطے اسے جرأت اور سرکشی کا بہانہ مل جائے۔

مختصر یہ کہ شفاعت کو خدا کے اذن اور اس کی رضا سے مشروط کرنے نے افراد کے حق میں شفاعت کے ثابت ہونے کے بارے میں ایک خاص قسم کا ابہام پیدا کر دیا ہے کہ کوئی بھی شخص شفاعت کے اعتقاد سے گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

(ب) شفاعت نہ صرف شرط (اذن و رضا) کے حوالے سے مبہم ہے بلکہ اور پہلوؤں سے بھی مبہم ہے اور یہی ابہام سبب ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص شفاعت کی امید پر اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ نہ کر سکے۔ شفاعت کے دیگر مبہم پہلو درج ذیل ہیں:

۱۔ مجرم اور جرم کے اعتبار سے ابہام

جب بھی مجرم کی طرف انگلی اٹھا کر کہا جائے کہ تمام لوگ یا خاص اور معین افراد مشمول شفاعت الٰہی ہوں گے، یا جرم کی طرف اشارہ کر کے کہا جائے کہ فلاں گناہ میں مطلقات اور تمام افراد کے لیے عقاب نہیں ہوگا تو ایسی صورت میں اس طرح کی خوشخبری بندوں کے لیے جرأت کا سبب اور سرکشی کا بہانہ بن جائے گی اور خدا کے اوامر و نواہی کو بے اثر کر کے رکھ دے گی۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوؤں کو مبہم چھوڑ دیا جائے اور یہ واضح نہ ہو کہ شفاعت کن لوگوں یا کیسے گناہوں کے بارے میں موثر واقع ہوگی تو پھر کسی بھی گناہ کے انجام اور معصیت کے ارتکاب کی جرأت نہیں ہوگی۔

۲۔ وقت اور انجام عقوبت کے اعتبار سے ابہام

اگر فرض کیا جائے کہ مجرم و جرم کی نوعیت کا تعین ہو لیکن قبولیت شفاعت کے وقت کے بارے میں یا عذاب اور سزاؤں کی نوعیت کے بارے میں ابہام پایا جائے تو بھی ایسا وعدہ جرأت اور طغیان کا سبب نہ بنے گا۔

اتفاقاً قرآن میں نہ صرف مجرم اور جرم کو بطور مبہم بیان کیا گیا ہے اور اس بارے میں کوئی تفصیلات نہیں بتائی گئی ہیں بلکہ سزا کی اقسام اور یہ کہ شفاعت کے ساتھ کون سی قسم کی سزا شامل ہوگی، یہ بھی اجمالی طور پر مذکور ہے۔ نیز شفاعت کا وقت اور یہ کہ قبولیت شفاعت کے آغاز کا کون سا لمحہ ہے، یہ بھی مبہم طور پر وارد ہوا ہے۔

روزِ محشر بہت طویل دن ہے۔ آخرت کا ایک دن دنیا کے ہزار سال یا پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔[1] ایسے دن میں انسان کو

---

[1] (وَاِنَّ يَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ﴿۴۷﴾ (سورہ حج آیت ۴۷)

''تیرے پروردگار کے نزدیک ایک دن تمہارے ہزار سال کے برابر ہے۔''

فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ‌ۚ﴿۴﴾ (سورہ معارج آیت ۴))

مختلف جگہوں پر ٹھہرنا پڑے گا کہ بعض کا خوف وہراس عذاب کے درد سے کمتر نہیں ہے۔کوئی بھی گنہگار یہ نہیں جانتا کہ اگر شفاعت اس کے شامل حال ہوئی بھی تو کون سے لمحے میں یہ فیض اس کے نصیب ہوگا۔کیا حشر کے ابتدائی لمحات میں شفاعت اس تک پہنچے گی یا اس کی کچھ مدت گذرنے کے بعد، یا کچھ درد والم اور عذاب الٰہی کا مزہ چکھنے کے بعد؟

ان چار قسم کے ابہامات نے شفاعت کو رجا و امید کے ایک دریچے کی شکل دی ہے اور شفیعوں کی شفاعت کے اعتماد سے تمرد وعصیان کے خیال کو اذہان سے نکال دیا ہے۔

۳۔کیا قبولیت شفاعت خدا کے علم وارادہ میں تبدیلی کا باعث ہے؟[1]

اس میں کوئی بحث نہیں ہے کہ مجرم کے لیے عدالت الٰہی میں جس نوع کی بھی سزا معین ہو وہ عین عدل وانصاف ہوگا۔اسے مصلحت اور عدل الٰہی کے تقاضوں کے مطابق سمجھا جانا چاہیے۔اس صورت میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب بھی خدا کا پہلا حکم مجرم کے لیے عین عدل و انصاف اور مصلحت کے مطابق ہے تو اب کوئی دلیل نہیں ہے کہ شفاعت کے ذریعے اس مذکرہ حکم کو توڑ دیا جائے اس لیے کہ پہلے حکم کا نقص دو صورتوں سے خارج نہیں ہے:

یا تو بعد والا حکم مصلحت اور عدل الٰہی کے تقاضے کے مطابق ہے اور پہلا حکم عدل اور مصلحت کے برخلاف ہے۔اس فرض کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ یا خدا کو عادل جانیں اور معتقد ہو جائیں کے پہلے حکم کے عدل کے خلاف ہونے کے باوجود بھی اسے تصویب کیا ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس سے خدا کی ذاتِ مقدس کو منزہ سمجھنا چاہیے۔

۲۔ یا یہ کہ خدا کے علم کو کمزور اور اس کی پہلی تشخیص کو اشتباہ سمجھیں اور قائل ہو جائیں کہ خدا کا علم وارادہ دوسرے مصنف افراد کے علم و ارادے کی طرح قابل تغییر وتبدیل ہے۔یہ فرض بھی باطل ہے اس لیے کہ اس کا علم اس کے عین ذات ہے،اس کے علم میں تغییر سے اس کی ذات میں بھی تغییر اور تبدیلی کا ہونا لازم آتا ہے اور متغیر ہونے والی ذات دوسرے مادی موجودات کی طرح تبدیلی کی حالت میں ہوگی۔یہ بھی مقام ربوبیت کی شان کے خلاف ہے۔

اور اگر فرض کریں کہ پہلا حکم عین عدل ومصلحت تھا اور بعد والا حکم اس کے برخلاف ہے تو اس فرض کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ایک عادل و حکیم فرمانروا نہیں کیونکہ اس کے باوجود کہ وہ جانتا ہے کہ شفیع کی شفاعت کو قبول کرنا مصلحت کے خلاف اور انصاف کے تقاضوں کے برعکس ہے، مگر اس محبت کی بناء پر جو اسے شفیع کے ساتھ ہے یا اسکے ساتھ قائم شدہ ارتباط کو محفوظ رکھتے ہوئے پہلے حکم کو توڑ دیتا ہے اور اسے عدل کے قائم کرنے اور امور کو مصالح کے تحت انجام دینے کے اوپر ترجیح دی ہے۔

---

[1] المنار ج ۱ ص ۷

جواب: عقیدۂ شفاعت خدا کے علم وارادہ میں تبدیلی کا سبب نہیں۔

شفاعت کے صحیح معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم خدا میں تبدیلی نہیں آتی ہے بلکہ اگر تبدیلی ہے تو مجرم اور گناہ گار کے حوالے سے ہے۔ یعنی اس کا حال ایسا ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے رحمت الٰہی کا مستحق بن جاتا ہے جبکہ پہلے ایسی کیفیت وحالت میں نہیں تھا۔

مطلب کی وضاحت کے لیے بہتر ہے کہ گناہ گار کے حال کو نظر میں رکھیں جو ندامت و پشیمانی اور توبہ وخدا کی طرف بازگشت کی راہ کو اختیار کر چکا ہے۔ ایک ایسا شخص اس روحانی انقلاب سے پہلے عدالتِ الٰہی میں مجرم پہچانا گیا تھا اور عقاب کا مستحق تھا مگر توبہ اور اندرونی انقلاب اور خدا کی جانب بازگشت کے بعد اس کی کیفیت اور روح بدل چکی ہے، لہٰذا خدا کی رحمت واسعہ اس کے شامل حال ہوتی ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ انقلاب وتبدیلی اور تغیر ودگرگونی کہاں رونما ہوئی۔ کیا خدا کا علم وارادہ تبدیل ہوا یا یہ کہ مجرم کے حال میں تبدیلی آئی ہے؟ یقینی طور پر حقیقت دوسری صورت ہے۔ اس لیے چونکہ یہ شخص توبہ کے سائے میں اپنے اندر تبدیلی لا چکا ہے۔ اب یہ تائب شخص اپنے کیے ہوئے پر پشیمان ہے۔ یہ مصمم ارادہ کر چکا ہے کہ آیندہ ایسے گناہ کے نزدیک بھی نہ جائے گا۔ یہ شخص اب طغیان کرنے والا نہیں کہ جو خدا کے قہر وغضب اور عقاب کو پائمال کرے اور خواہش نفس کے علاوہ سب چیزوں سے غافل ہو جائے۔ چونکہ یہاں اب موضوع بدل گیا، لہٰذا طبیعی طور پر اس کے بارے میں حکم خدا بھی بدل جانا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہ خدا کے ہاں ازل سے ہی ہر گناہ گار کے بارے میں دو حکم، بالفاظ دیگر دو قسم کے ارادے تھے، اور ہر ایک اپنے ایک خاص موضوع کی طرف متوجہ تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کو نقص کرنے والا نہیں ہے بلکہ ہر ایک اپنے مقام پر اپنے ہی موضوع کے اعتبار سے صحیح ہے۔

۱۔ خدا کا حکیمانہ ارادہ اس سے متعلق ہوا ہے کہ ہر گناہ گار اور آلودہ شخص اپنے برے اعمال کی سزا بھگتے اور جب تک یہ حالت اس کے اندر باقی ہے کسی قسم کی رحمت ومغفرت کا اہل نہیں ہوگا۔

۲۔ خدا کا حکیمانہ ارادہ ایسے گناہ گار کے بارے میں کہ جس کے اندر روحانی انقلاب رونما ہو جائے اور توبہ اور خدا کی جانب بازگشت کی وجہ سے اس کا حال وکیفیت تبدیل ہو جائے اور عدالتِ الٰہی میں پہلی صورت سے اس میں واضح تبدیلی آ جائے تو یہ شخص خدا کی وسیع رحمت اور بخشش کا اہل ہو جائے گا۔

ارادوں کے مختلف ہونے کا سرچشمہ اور صحیح تر عبارت میں قوانین کے مختلف ہونے کی علت وہی مجرم کے حالات کا مختلف ہونا ہے۔ ہر ایک حالت ایک خاص حکم رکھتی ہے۔

ہاں البتہ خدا اول سے ہی جانتا ہے کہ کون سا مجرم توبہ اور بازگشت کی راہ کو اپنائے گا اور کون سا مجرم روحانی انقلاب اور شفاعت کے استحقاق سے محروم رہے گا۔

ہر حال میں علم خدا میں تبدیلی اور دگرگونی نہیں ہے۔ خدا کے علم واقعی میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو وہ موضوع کے حوالے سے ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ موضوع کے بدل جانے سے حکم بھی بدل جاتا ہے۔

واضح تر عبارت میں یوں کہ ان دو حکموں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے حکم کو توڑنے والا نہیں یا مصلحت کے مخالف اور عدل الٰہی کے مباین نہیں بلکہ ہر ایک اپنے مقام پر عین عدل و مصلحت ہے۔ ہر ایک اپنے ہی موضوع سے مخصوص ہے۔ درحقیقت ایک موضووع ہے جس کی دو حالتیں ہیں۔ ایک مجرم کے لیے ان دو مختلف حالتوں میں ایک ہی حکم سنانا عدل و انصاف کے خلاف ہوگا۔

ایک طالب علم جو اپریل میں پیچھے رہ جاتا ہے اور فیل ہو جاتا ہے اگر اپنی کمزوری گرمیوں میں دور کر لیتا ہے اور امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا بعد والا کام پہلے والے کام کے لیے نقض ہے۔ بلکہ یہاں دونوں قسم کے نتیجے کی تشخیص حقیقت اور عین انصاف کے مطابق ہے۔ البتہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر ایک حکم اپنے موضوع پر مصلحت عدالت کے عین مطابق ہے۔

بالکل اسی طرح شفاعت کے مسئلہ میں بھی ہے، کیونکہ گناہ گار شخص حالات اور دیگر ضائم کو مدنظر رکھے بغیر عقاب کا مستحق ہے جس کو قرآن اور احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر یہی شخص ایک اور حال میں مثلاً برزخ کی سختیاں برداشت کرنے اور روزِ قیامت کے خوف و ہراس کو تحمل کرکے جو کہ نفس و روح کی پاکیزگی اور تصفیہ کا ایک سبب ہے، اولیاء اللہ کی دعا و درخواست کے ضمیمہ کے ساتھ کسی اور حکم کا مستحق ہوتا ہے جس کا نتیجہ وہی مغفرت اور بخشش گناہ ہے اور ہرگز ان دونوں قسم کے محکموں کو دو عدالتوں کے ان دو حکموں کی طرح نہیں قرار دیا جا سکتا جن میں دوسری عدالت پہلی عدالت کے حکم کو ختم کر دیتی ہے۔ بلکہ اسے اس محکوم کے حکم کی طرح جاننا چاہیے جس نے شکایت کرنے والے کو راضی کرکے اپنے آپ کو سزا سے بچا لیا ہو۔

اصولاً ایک شخص پر دو حالتوں میں دو قسم کے حکم سنانا کئی مقامات پر دکھائی دیتا ہے۔ علماء اسلام کے ہاں ایک اصطلاح ہے، اوامر امتحانی کے نام سے، جو ایک وقت میں ثابت ہیں تو کسی اور وقت میں اٹھائے جاتے ہیں۔ دونوں حکم ہی عدل و انصاف کے مطابق ہیں۔ اس قسم کے امتحانی اوامر کا مقصد بندے کے باطن کی آزمائش اور اس کے مافی الضمیر کا اظہار ہوتا ہے۔[1] مثلاً ایک حاکم اپنے ماتحتوں کو آزمانے کے لیے کوئی حکم دیتا ہے۔ جب ان میں انجام حکم کی آمادگی کا احساس کرتا ہے، دیکھتا ہے کہ تمام یا بعض اس کام کے مقدمات کی خاطر جا چکے ہیں تو فوراً اپنا حکم بدل دیتا ہے اور اس پہلے حکم کی جگہ پر دوسرا حکم صادر کر دیتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو ذبح کرنے پر مامور ہوئے۔ جب حکم کی تعمیل کرنے کے لیے مقدمات آمادہ کر لیتے تو اس پہلے حکم کی جگہ پر ایک اور حکم آ گیا۔

یہاں پر دو مختلف حکم ایک ہی فرد (حضرت ابراہیم علیہ السلام) پر آ چکے ہیں، مگر دو حالتوں میں۔ اس میں کسی قسم کا کوئی اشکال بھی نہیں ہے۔

اس بناء پر کیا مانع ہے کہ مجرم کے لیے ایک وقت میں عقاب ثابت ہو اور بعد میں شفاعت کے وسیلے سے یہ عقاب محو ہو جائے، کیونکہ دو موضوعوں پر دو مختلف حکم یا ایک موضوع پر دو مختلف حالتوں میں دو حکموں کا آنا ممکن بلکہ ضروری ہے۔

---

[1] خدا کی جانب سے امتحانی اوامر بندے کے باطن کو معلوم کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ بندوں کے اندرونی کمالات کو قاطعیت تک پہنچانا مراد ہے۔ اس بات کی وضاحت کتاب ''سوالات و جوابات'' ص ۸۲-۷۵ ج ۳ میں ملاحظہ فرمائیے۔

مختصر کلام یہ کہ خدا کا علم اور اس کا ارادہ متزلزل نہیں ہوتا کہ جس کے بعد ایک نیا علم و ارادہ اس فعل سے متعلق ہو جائے۔ مثلاً ہم سب کو معلوم ہے کہ رات کے وقت سب جگہ تاریکی چھا جاتی ہے اور نور کے نہ ہونے کی وجہ سے ہماری آنکھیں چیزیں دیکھ نہیں سکتی ہیں۔ چنانچہ ہمیں علم ہے کہ رات کا وقت گزر جانے کے بعد سورج طلوع ہوتا ہے اور سب جگہ روشنی پھیل جاتی ہے۔ اس وجہ سے رات کو فقدانِ نور کے جبران کے لیے چراغ روشن کرتے ہیں اور جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اسے بند کر دیتے ہیں۔

یہاں پر ہمارے لے دو علم ہوئے۔ رات فاقد نور ہے اور دن منور ہے اور ان دو علموں کے مطابق دو کام اور دو ارادے کرتے ہیں۔ رات کو چراغ روشن کرتے ہیں اور دن کو اسے خاموش کیے دیتے ہیں۔

پس دوسرا علم ہرگز پہلے علم کا توڑنے والا اور اسے غلط قرار دینے والا نہیں ہے بلکہ ہر ایک علم اپنے موضوع کے حوالے سے صحیح اور درست علم ہے۔ یہ دونوں علم ہرگز اس کے مانند نہیں کہ ہم دور سے ایک سائے کو دیکھ کر پہلے خیال کریں کہ درخت ہے۔ جب تھوڑا نزدیک ہوئے تو پتہ چلا کہ غلطی پر تھے۔ وہ سایہ دار درخت نہیں تھا بلکہ ایک حیوان تھا اس لیے کہ اس مقام پر بعد والا علم پہلے علم کو غلط قرار دے رہا ہے۔

رات اور دن کے معاملے میں چونکہ یہاں پر موضوع دو ہیں، طبعی بات ہے کہ علم بھی دو ہوں گے۔ دو علوم کے مقابلے میں ارادے بھی دو قسم کے ہوں گے۔ ہر ایک اپنے لیے ایک خاص موضوع کا حامل ہوگا۔ اس بناء پر رات میں جو کہ ایک خاص موضوع ہے، چراغ روشن کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور دن جو ایک الگ موضوع ہے، اس میں چاہتے ہیں کہ چراغ کو خاموش کر دیں۔

اس مورد اور مثال میں ایسا نہیں ہے کہ ارادے بدل گئے ہوں بلکہ یہاں ابتدا سے ہی دو ارادے تھے اور ہر ایک اپنے ہی موضوع سے متعلق تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس مثال میں نہ علم بدلا ہے اور نہ ہی ارادہ، بلکہ یہ معلوم اور مراد ہے جس میں تعدد پیدا ہوا ہے جس کے نتیجے میں علم اور ارادے بھی متعدد ہو گئے ہیں۔

بالکل یہی بیان شفاعت کے مسئلے میں بھی جاری ہے۔ خدا ازل سے ہی جانتا تھا کہ فلاں انسان مختلف حالات رکھے گا، فلاں دن خاص شرائط و اسبا کا حامل ہوگا اور ان شرائط کے تحت اس کے بارے میں ایک خاص ارادہ کیا جائے گا۔ اس بناء پر ان شرائط کے مطابق خدا نے اس کے بارے میں ایک خاص ارادہ فرمایا۔ اسی طرح یہ بھی جانتا تھا کہ ایک اور دن اس کے یہ حالات و شرائط بدل جائیں گے اور سابقہ حالت کے برخلاف یہ ایک نئی حالت اختیار کرے گا۔ اس لحاظ سے اس کے بارے میں کسی اور چیز کا ارادہ فرمایا۔

لہٰذا نہ اس کے علم میں خطا ہے اور نہ ارادے میں تبدیلی بلکہ ہر علم اپنے موضوع کے حوالے سے صحیح اور حقیقت نما ہے اور ہر ارادہ اپنے موضوع کی نسبت حکمت اور مصلحت کے عین مطابق ہے۔

۴۔کیا قرآنی آیات امکان شفاعت کی گواہ ہیں، وقوعِ شفاعت کی نہیں؟ [۱]

شفاعت والی آیات سے قیامت کے دن امکانِ شفاعت کے علاوہ کسی اور بات کا استفادہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ آیات آخرت میں شفاعت کے متحقق ہونے کی گواہی ہرگز نہیں دیتی ہیں اس لیے کہ:

بعض قرآنی آیات میں شفاعت کی کلی طور پر نفی ہوئی ہے جیسے:

مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ ؕ [۲]

''اس دن نہ کسی قسم کا معاملہ اور نہ دوستی اور شفاعت کا وجود ہے۔''

فَمَا تَنۡفَعُہُمۡ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیۡنَ ﴿ؕ۴۸﴾ [۳]

''سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے کچھ کام نہ آئے گی۔''

بعض آیات میں شفاعت خدا کی اجازت اور اس کی رضا پر موقوف کی گئی ہے۔ [۴] اس قسم کے استثنات خدا کے اذن اور اس کی رضا کے تحقق کی دلیل نہیں کیونکہ بارہا اس قسم کا استثنا (مشیت اور اذن کا استثنا) مطلق نفی میں استعمال ہوتا ہوا ہے اور اس سے استثنا نے خارجی تحقق پیدا نہیں کیا ہے جیسے یہ آیات:

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ (اعلیٰ ۷-۶)

''جلد ہی تیرے لیے ہم قرآن پڑھیں گے تو بھولو گے نہیں مگر وہ جسے خدا چاہے۔''

یہ استثنا کہیں پر بھی متحقق نہیں ہوا۔ پیغمبرؐ نے قرآن میں ایک آیت بھی فراموش نہیں کی۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ؕ [۵]

''جب تک زمین و آسمان ہیں، اہل بہشت اس میں ہوں گے مگر جس وقت تیرا پروردگار چاہے گا۔''

---

[۱] المنار جلد ا ص ۳۰۷ سطر ۱۶

[۲] سورہ بقرہ آیت ۲۵۴

[۳] سورہ مدثر آیت ۴۸

[۴] جیسے مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ (سورہ بقرہ ۲۵۵)، مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ ؕ (سورہ یونس آیت ۳) اور اسی بناء پر کہ یہ آیت اصطلاحی شفاعت سے مربوط ہو۔ وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی (سورہ انبیاء آیت ۴۸)

[۵] سورہ ہود آیت ۱۰۷

یہ استثنا بھی کسی وقت متحقق نہیں ہوگا اور خدا اہل بہشت کو وہاں سے باہر نہیں نکالے گا، صرف یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ تمام افعال خدا کے ارادے اور مشیت سے وابستہ ہیں۔ مثلاً اگر پیغمبر قرآن بھولتا نہیں ہے یا جنت والے وہاں پر ہمیشہ کے لیے رہیں گے تو یہ سب کچھ خدا کی چاہت اور مشیت سے مربوط ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کام کی باگ ڈور خدا کے دست قدرت سے خارج ہو۔ دونوں آیتوں میں ایک صورت کو مستثنیٰ کر کے ذکر فرمایا ہے کہ اگر خدا چاہے تو پیغمبر نسیان کرے گا اور اہل بہشت بھی وہاں سے باہر ہوں گے، لیکن ہرگز خدا کی مشیت ایسے کام سے تعلق پیدا نہ کرے گی۔

کیا مانع ہے کہ شفاعت والی آیات کے استثنا بھی مذکورہ آیات کے استثنا کی طرح ہوں جو کہ پروردگار کی جانب سے ایسے اذن کے صدور کے امکان کی گواہی دے رہی ہوں۔ اس اذن کے واقع ہونے کے بارے میں نہ ہوں۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوگا کہ شفعیوں کی شفاعت کا امکان ہے، مگر قیامت میں اس کے لازمی طور پر وقوع پذیر ہونے کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔

مذکورہ سوال کا جواب

بعض وہ آیات جن کی روشنی میں اس اعتراض کے اثبات کے لیے استدلال کیا گیا ہے، ان کے بارے میں اسی کتاب کے تیسرے حصے میں کافی توضیح کی جا چکی ہے۔ یہ واضح ہو گیا تھا کہ یہ آیات روزِ آخرت میں شفاعت کے ہونے کی ہرگز نفی نہیں کرتی ہیں، اس لیے کہ وہ آیات جو بطور مطلق شفاعت کی نفی کرتی ہیں ایسی سفارشوں سے مربوط ہیں جن کا اعتقاد یہودی سماج اور دورِ جہالت کے عرب بت پرست رکھتے تھے۔ وہ تصور کرتے تھے کہ آخرت میں بھی اس دنیا کی طرح دوستی اور دوسری قسم کے تعلقات کے ذریعے عذاب الٰہی سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔

بعبارت دیگر اس طرح کی آیات صرف ایسی شفاعتوں سے متعلق ہیں جو خدا کی اجازت اور اس کے اذن کے بغیر واقع ہوں، اس قسم کی سفارشوں کی نفی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ قیامت میں بھی کلی طور پر کوئی شفاعت نہیں۔

وہ آیت جو سفارش کے فائدے کی نفی پر دلالت کرتی ہے وہ کچھ مخصوص مجرموں کے بارے میں ہے جو روزِ آخرت کا انکار کرتے تھے اور اصولِ اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ اس آیت سے قبل کی آیات اس مطلب کی شاہد ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾ حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾ [1]

''ہم قیامت کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے یہاں تک کہ ہم پر موت آ پڑی اور قیامت پر یقین کیا۔ اب سفارش کرنے والوں کی سفارش مفید واقع نہیں ہوگی۔''

---

[1] سورہ مدثر، آیات ۴۶ تا ۴۸

مسلم طور پر کافروں کے حق میں سفارش کے فائدے کی نفی صاحبانِ ایمان کے حق میں بھی نفی کی دلیل نہیں بن سکتی۔

اس تنقید میں اہم نکتہ اس کا تیسرا حصہ ہے کہ کیا اس طرح کا استثنا خدا کی جانب سے اذن کے صادر ہونے کی بھی دلیل ہے یا صرف امکان کی گواہی ہے؟ معترض یہ کہتا ہے کہ ان موارد میں امکان کے علاوہ کسی اور چیز کا استفادہ نہیں ہوتا ہے۔

عربی زبان کے قواعد کی طرف رجوع کرنے اور شفاعت والی آیات سے ملتی جلتی آیات میں ''الا'' کے موارد ِاستعمال پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ایسے استثنا وقوع (مستثنیٰ) پر گواہ ہیں نہ کہ اس کے امکان پر۔

دراصل شفاعت کے امکان و امتناع اور اس سے مربوط آیات کی تفسیر امکان کے حوالے سے کرنا اور یہ کہنا کہ شفاعت والی آیات کا مقصد اس کے امکان کو ثابت کرنا ہے، امتناع کے مقابلے میں تو یہ ان فلسفی ابحاث کے مانند ہے جو فلاسفہ کسی چیز کے امکان یا امتناع سے متعلق آپس میں کرتے ہیں۔ آیاتِ قرآن کو ایسے معنی پر حمل کرنا جو کہ عمومی اذہان سے بھی دور ہوں اصولِ تفسیر کے حوالے سے صحیح نہ ہوگا۔

قرآن فلسفے کی کتاب نہیں جو کسی چیز کے امکان یا امتناع سے بحث کرے۔[۱] قرآن زندگی اور اس کی تربیت کی کتاب ہے۔ اس کا ہدف ایسے امور کی تشریح کرنا ہے جس سے اس دنیا میں یا روزِ آخرت انسان سامنا کرے گا۔ ایسی کتاب کے لیے کہ جو ایک ایسا مشخص مقصد رکھتی ہے اس میں شفاعت کے امکان سے اس کے امتناع کے مقابلے میں بحث کرنا قرآنی ہدف سے خارج ہوگا۔

جو لوگ مذکورہ آیات کو خدا کی جانب سے اذن کے صدور کے امکان پر حمل کرتے ہیں وہ شفاعت کے تربیتی اور تعمیری پہلوؤں سے غافل اور بے خبر ہیں۔ اگر خداوند متعال نے شفاعت رکھی ہے اور اپنی کتاب میں اس کے بارے میں خبر دی ہے تو یہ اس کے تربیتی اور تعمیری اثرات کی خاطر ہے۔ وہ چیز جو گناہ گار کو تحرک اور قوت بخشتی ہو اور اسے برے کاموں سے روک سکتی ہو وہ اس کا قیامت کے دن شفاعت کے ہونے پر ہی اعتماد ہے نہ کہ اس کے امکان یا واقع ہونے یا نہ ہونے کا احتمال۔

درست ہے کہ مذکورہ دو آیتوں میں شفاعت کو خدا کے اذن پر موقوف کیا گیا ہے اور معترض کی نگاہ میں استثنا ایسے اذن کے متحقق ہونے کی دلیل نہیں مگر تیسری آیت[۲] میں شفاعت خدا کی رضا اور اس کے انتخاب پر معلق ہے اور اسے فعل ماضی کی صورت میں جو کہ اس کے متحقق ہونے پر دلالت کرتا ہے تعبیر لائی گئی ہے۔

شفاعت کے لیے کسی فرد کا انتخاب کرنا جب کہ اس کے شفیع کو خدا اجازت بھی نہ دے تو یہ امکان پذیر نہیں ہے۔

اس بنا پر رضا کے تحقق اور حصول شفاعت کے لیے ایک فرد کے انتخاب سے شفیعوں کے لیے خدا کے اذن کے حامل ہونے اور تحقق پانے کو کشف کیا جا سکتا ہے۔ خدا نے جب شفاعت کے حصول کے لیے کسی فرد کو منتخب کیا ہے تو اس کے ساتھ اپنے اولیاء کو اذن بھی دیا ہے کہ اس کے حق میں شفاعت کریں۔

---

[۱] مگر یہ کہ گفتگو کی بنیاد کو کسی چیز کا امکان یا امتناع تشکیل دے جیسے خدا کے شریک کی نفی کرنے والی آیات۔

[۲] وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (سورہ انبیاء آیت ۲۸)

ذیل کی آیت میں واضح طور پر فرمایا ہے وہ معبود جو خدا کی وحدانیت و یکتائی کی گواہی پوری آگاہی کے ساتھ دیتے ہیں (جیسے حضرت مسیح وغیرہ) حقیقت میں شفاعت کریں گے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ [۱]

''وہ لوگ جو خدا کے علاوہ عبادت و پرستش کے عنوان سے پکارے جاتے ہیں شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے، مگر وہ جو آگاہی کے ساتھ وحدانیت حق کی گواہی دے۔''

یہ آیت اس چیز کی حکایت کر رہی ہے کہ بعض لوگ خدا کی جانب سے شفاعت کے مالک ہوں گے اور ان کو اس حق کا سپرد کرنا خدا کی جانب سے صدورِ اذن کی گواہی ہے۔

لہٰذا شفاعت بعض افراد کے لیے سپرد شفاعت کر دینے سے جس کا آیت میں استثنا کیا گیا ہے، اس سے ہم استفادہ کرتے ہیں۔ شفاعت کے پہلے والے مراحل مثلاً شفاعت کی اجازت اور مورد شفاعت کے افراد کا انتخاب وغیرہ پورے ہو چکے ہیں۔

بعینہٖ یہی بیان اس آیت میں بھی جاری ہے۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ [۲]

''کوئی بھی شفاعت کا مالک نہ ہوگا مگر وہ جس کا خدا کے ہاں کوئی عہد ہو۔''

یہ آیت پوری صراحت سے کہتی ہے کہ کچھ افراد خدا کے ہاں عہد و پیمان رکھتے ہیں وہ شفاعت کے مالک ہوں گے۔ خدا کی جانب سے کسی ایک فرد یا بعض افراد کو شفاعت کے حق کا عطا ہونا اذن الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اگر ان آیات سے کہ جن میں شفاعت خدا کی اجازت پر موقوف ہوئی ہے اذن خدا کے تحقق کا استفادہ نہ کریں تو حتمی طور پر دوسری آیات سے جو کچھ افراد کے شفاعت کے لیے منتخب ہونے یا مخصوص افراد کے شفاعت کے مالک ہونے کی خبر دیتی ہیں، ان آیات سے اذن الٰہی کا تحقق حاصل ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ امکان کے مرحلے سے نکل کر مرحلہ تحقق پر قدم رکھ چکا ہے۔ پس ہرگز یہ تصور نہ کیا جائے کہ کسی شخص کو یا کچھ افراد کو مقام شفاعت کا مالک بنانا اس سے استفادہ کے واقع ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ خدا یہ مقام کسی کو عطا کرے لیکن اس سے استفادہ کی اجازت نہ دے، ایسا تصور وہ معنی سفطے ہے جو یہ بات سمجھا رہا ہے کہ خود اس کا متکلم افعالِ الٰہی کے حقیقت سے واقف نہیں ہے، اس لیے کہ یہ معنی ہی نہیں کہ خدا کسی کو ایک حق تفویض کرے مگر اسے کبھی بھی اجازت نہ دے کہ وہ شخص اس حق سے استفادہ کرے۔

---

[۱] سورہ زخرف آیت ۸۶

[۲] سورہ مریم آیت ۸۷

ایسی تفویض لغو اور بیہودہ ہو کے رہ جائیگی۔

اختتام میں دو نکتوں کا ذکر نا گزیر ہے۔

۱۔ اگر ہم آیت "سنقرئك فلا تنسى الا ماشا الله" میں استثنا کو امکان پر حمل کرتے ہیں، وقوع پر نہیں، تو یہ ایک اور دلیل کی وجہ سے ہے کیونکہ معلوم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطا و نسیان سے معصوم اور منزہ ہیں اور بعثت کا ہدف بھی ایسی وسیع عصمت کے بغیر متحقق نہیں ہوتا ہے۔ اس عقلی دلیل نے ہم کو یہ کہنے پر وادار کیا ہے کہ الا ماشاء الله سے مراد امکانِ نسیان ہے نہ کہ اس کا وقوع اور یہ استثنا کبھی بھی متحقق نہ ہوگا۔

اسی طرح اگر استثنا کی تفسیر "خالدين فيها ما دامت السموات والارض الا ماشاء ربك" والی آیت میں جنت سے نکل آنے کے امکان کے ساتھ کر رہے ہیں، اس کے واقع ہونے کے ساتھ نہیں، تو یہ ان آیات اور اسلام کے مسلم عقیدہ کی بناء پر ہے جو کہ اہل بہشت کے جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنے کو قطعی بناتا ہے۔

اگر یہ قرائن نہ ہوتے تو مذکورہ دونوں استثنا کی تفسیر امکان کے حوالے سے ہرگز نہ کرتے۔ یہ قرائن شفاعت سے مربوط آیات میں موجود نہیں اگر یہ نہ کہیں کہ قرائن اس تفسیر کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔

۲۔ یہ احتمال شفاعت کی روایات متواترہ کے ساتھ کسی طرح سے بھی سازگار نہیں اس لیے کہ شفاعت کے بارے میں احادیث اسلامی کا مفہوم اس کے تحقق کی شہادت دیتا ہے، جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں جس کو سنی اور شیعہ دونوں محدثین نے نقل کیا ہے، فرمایا:

"ادخرت شفاعتی لاهل الكبائر من امتی"[1]

''میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے گناہانِ کبیرہ کے مرتکب افراد کے لیے ذخیرہ کیا ہے۔

کیا اس جملے کا معنی یہ ہے کہ احتمال یہ ہے کہ میں شفاعت کروں اور احتمال ہے کہ نہ کروں؟

یا یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حدیث میں حتمی طور پر قیامت کے دن مذکورہ افراد کے حق میں اپنی شفاعت کی خبر دے رہے ہیں؟ یقینی طور پر دوسرے معنی مقصود ہیں۔

۵۔ کیا شفاعت سے مراد انبیاء کی تبلیغ کے نتیجے میں مومنوں کی نجات ہے؟

شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء نے خدا کے احکام کی تبلیغ کے ذریعے اور سعادت و نیک بختی کا راستہ دکھا کر بندوں کے لیے نجات کے مقدمات فراہم کیے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان ج ۱ ص ۱۰۴۔ طبرسی مرحوم اس مقام پر لکھتے ہیں کہ اس روایت کو تمام مسلمان مانتے ہیں۔

مندرجہ بالا سوال کا ایک جواب

پہلے عرض کیا گیا کہ شفاعت کے معنی میں سے ایک یہی ہے جو اس سوال میں خلاصے کے طور پر ذکر ہوا ہے، لیکن ہرگز کوئی دلیل نہیں ہے کہ شفاعت کے معنی اسی میں منحصر ہوں۔ یہ بات پہلے تفصیلی طور پر بیان کی جا چکی ہے، لہٰذا دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مگر اس مقام پر ہم ایک جملے کا اضافہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ جب بھی شفاعت کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء کی تبلیغ اور ہمارا ان کے دستور کے تحت عمل کرنا نجات کا ذریعہ ہے تو قرآن ایک وسیع بخشش کی خوشخبری کیوں دے رہا ہے جو توبہ اور عمل سے مربوط بھی نہیں بلکہ اس کی واحد شرط صرف خدا اور اصول وارکانِ اسلام پر ایمان لانا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ [1]

''خدا شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا اس سے کم تر کو بخش دے گا۔''

گذشتہ صفحات میں عرض کیا کہ یہ بخشش توبہ سے مربوط نہیں ورنہ تو شرک کو بھی توبہ کی صورت میں جو کہ وہی توحید کی طرف بازگشت ہے بخش دے جبکہ اس آیت میں شرک کا استثنا کیا اور اس کی نفی کی ہے۔ اس سے ہم سمجھ لیں کہ خدا خاص اور وسیع رحمت کا مالک ہے، کبھی اس کی رحمت بغیر توبہ یا عمل کی صاحبان ایمان افراد کے شامل حال ہوتی ہے۔

یہ خود ایک قسم کی شفاعت ہے جو اس شفاعت عملی سے جس کے انحصار کا دعویٰ اعتراض کرنے والے شخص نے کیا ہے سے کوئی ربط نہیں رکھتی۔

۶۔ کیا شفاعت سے متعلق آیات متشابہات قرآن میں سے ہیں؟ [2]

شفاعت کے متحقق اور واقع ہونے کے بارے میں کوئی عقلی دلیل موجود نہیں ہے اور اس سے مربوط آیات بھی متشابہ ہیں۔ آداب دین کا تقاضا یہ ہے کہ ان آیات کا علم خدا کے سپرد کر دیا جائے۔

جواب

آیات متشابہ وہ آیات ہیں جن کا واقعی معنی واضح نہ ہو اور شبہ اور احتمال کا حلقہ ان آیات کے حقیقی معنی کو گھیر لے، نتیجے میں آیت کے بنیادی معنی اس سے غیر کے مشتبہ ہو جائیں۔

متشابہ ان خصوصیات کے ساتھ شفاعت والی آیات میں نہیں پایا جاتا۔ آیات شفاعت میں سے ہر ایک آیت کا مطلب و مفہوم سیاق و سباق کو مدنظر رکھنے کے بعد پوری طرح واضح ہے۔ اگر آیات شفاعت کے تفسیر و تحقیق کے نیاز مند ہونے کو ان کے متشابہ ہونے کی علامت سمجھا

---

[1] سورہ نساء آیات ۴۸، ۱۱۶

[2] المنار جلد ا ص ۳۰۷

جائے تو یہ کہا جانا چاہیے کہ بہت ساری قرآن کی آیات متشابہ ہیں کیونکہ اکثر قرآنی آیات تحقیق وتشریح اور تفسیر کی محتاج ہیں۔

قرآن ایک آسمانی کتاب ہے جو تمام زمانے کے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہے اور ایسی کتاب کے مقصد نہائی تک رسائی تدبر وتفکر اور تفسیر کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

فقہائے اسلام احکام سے مربوط آیات میں کسی قدر تدبر وتفکر اور بحث وتحقیق کرتے ہیں اور بعض دفعہ تو ایک آیت کے ضمن میں ہی ایک پوری کتاب لکھ دیتے ہیں تو کیا اس طرح کی بحث وتحقیق آیات قرآن کے متشابہ ہونے کی دلیل ہے؟

علاوہ ازیں آیات متشابہ کو محض متشابہ ہونے کے جرم میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ انہیں آیاتِ محکم کی مدد سے جو کہ ''ام الکتاب'' ہیں، حل کیا جائے اور ان کے ابہام کو برطرف کیا جائے۔

ہم نے اس کتاب کے تیسرے حصے میں شفاعت سے مربوط تمام آیات کا چند مرحلوں میں ذکر کیا اور ایک دوسری کی مدد سے سب کا معنی واضح کیا۔ اب کاہے کے لیے ان آیات کی تفسیر میں تعجب سے انگشت بہ دندان ہو کر تجاہل سے کام لیں۔

اس قسم کے تجاہل کی علت سوائے روح وہابیت کے غلبے اور سلفی افکار جیسے ''ابن تیمیہ'' کی طرف میلان کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ انہوں نے اصل شفاعت کو صریح آیات کے حکم کی وجہ سے مانا تو ہے مگر اس اسلامی اصول سے صحیح استفادہ ہرگز نہیں کرتے۔

کبھی ممکن ہے کہ اس تجاہل کی وجہ ایک قسم کی مغرب کی تقلید ہو جو مصر کے عظیم مصنفین پر سایہ فگن ہوئی ہے اور اس بات کا باعث بنی ہے کہ بعض اسلامی اصول کی تفسیر غلط شکل میں کریں۔ اس قسم کی مغرب زدگی کے ثبوت کے لیے کچھ شواہد بھی ہیں، البتہ ہم فی الحال ان سے متعلق گفتگو نہیں کرتے۔

۷۔ کیا مجرموں یا جرم کے بیان کی تبعیض ناروا تبعیض ہے؟

جب بھی اولیاء کی شفاعت کے نتیجے میں تمام گناہ گاروں کے وہ تمام گناہ بخش دیے جائیں جو وہ کر گزرے تھے تو اس صورت میں گناہ گار کے لیے جو عقاب معین کیا گیا تھا وہ لغو اور بے ہودہ ہو جائے گا۔ مزید برآں عقاب کی تعیین کا ہدف بندوں کے اندر خوف پیدا کرنا ہے تا کہ وہ اپنے دینی وظائف کو انجام دیں جبکہ شفاعت کی صورت میں کسی طرح کا خوف نہ ہوگا جو فرائض الٰہی کے اجراء کا ضامن ہو۔

جب بھی شفاعت کا نتیجہ بعض گناہ گاروں کی عفو یا تمام گناہ گاروں کے لیے عفو، اگرچہ ایک خاص گناہ کے حوالے سے ہو تو ایسی شفاعت کا نتیجہ ایک قسم کی ناروا تبعیض ہوگا کیونکہ تمام افراد مجرم ہونے کے حوالے سے مساوی اور یکساں ہیں۔ اسی طرح گناہ بھی اس حوالے سے کہ سب عصیان وسرکشی ہیں اور طرز بندگی کے مخالف ہونے کے لحاظ سے آپس میں کوئی فرق نہیں رکھتے، پس کیوں بعض گناہ گار مستحق شفاعت قرار پائیں اور بعض اس سے محروم، یا بعض گناہ بخش دیے جائیں، جبکہ بعض معاف نہ کیے جائیں۔

ماحصل یہ کہ مجرم کا معنی یہ ہے کہ بندگی کی حدود سے تجاوز کر جائے اور آداب بندگی پر عمل نہ کرے۔ تمام مجرم افراد اس صورت میں مساوی ہیں۔ پس اس صورت میں کیوں بعض کو شفاعت شامل ہو جبکہ بعض دوسرے اس سے محروم رہیں؟

اس سوال کا جواب

درست ہے کہ تمام مجرم اور جرم بندگی کی حدود کو توڑنے کے اعتبار سے یکساں ہیں اور دونوں خدا کی نافرمانی کرتے ہیں، لیکن خود جرم کے مختلف مراتب ہیں۔ انہی مختلف مراتب کی بنا پر عذاب بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک دکاندار کے ایک رومال کو جلا دینا جرم اور گناہ ہے اور ایک کارخانے کو آگ لگانا بھی جرم اور نافرمانی ہے۔ مگر یہ کہاں اور وہ کہاں! اول کا جرمانہ اس کی قیمت کی ادائیگی ہے جبکہ دوسرے میں جلنے والی اجناس کی قیمت ادا کرنے کے ساتھ قید اور کبھی............

جس طرح جرم کے مختلف درجے ہوئے اسی طرح مجرم بھی باطن، دنائت و پستی و شرارت کے لحاظ سے مختلف درجات کے ہیں۔ اس صورت میں مجرموں اور جرائم کے درمیان فرق ناروا اور غیر منطقی تبعیض نہیں ہوگی۔

معترض نے صرف ایک نکتے پر توجہ دے کر کہا ہے کہ مجرم بطور مطلق بندگی کی حدود سے تجاوز کرتا ہے اور ہر جرم بھی حقوق الٰہی سے تجاوز ہے، پس کیوں مجرموں اور جرائم کے درمیان فرق ڈالا جائے؟

لیکن اس نے ایک نکتے سے غفلت برتی ہے۔ وہ یہ کہ درست ہے تمام مجرم اور تمام جرم اس میں (تجاوز کرنا بندگی کی حد سے) شریک اور مساوی ہیں مگر جرم کے مراتب اور ان کے اسباب و اثرات کے حوالے سے یکساں نہیں ہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے درج ذیل مثال پر توجہ دیں: دنیا کے تمام نور، خواہ ایک چراغ والا نور ہو یا دس چراغوں والا، یہاں تک کہ دس ہزار چراغوں والا نور بھی خود روشن ہیں اور ارد گرد کے ماحول کو بھی روشن کرنے میں شریک اور مساوی ہیں۔ لیکن ایک مرکز نور جو دس ہزار شمع کے برابر نور آزاد کرتا ہو وہ ایک سو شمع تک نور آزاد کرنے والے مرکز سے کئی گنا زیادہ ہوگا۔ نور اپنے درجات کے اعتبار سے مختلف ہونے کی بنا پر آثار میں بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک شعاع دس میٹر تک روشنی کرتی ہے تو دوسری شعاع سو میٹر کے فاصلے تک نور برساتی ہے۔ یہ دونوں نہ صرف درجہ اور اثر کے اعتبار سے مختلف ہیں بلکہ نور پیدا کرنے والے مرکز کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں۔ وہ مرکز جو سو میٹر کے فاصلے تک روشن کر سکتا ہو وہ یقیناً دس میٹر کے فاصلے تک روشن کرنے والے مرکز سے قوی ہوگا۔

بعینہ یہی بات جرم کی علتوں (روحیہ) اور خود جرم اور اس کے معاشرے پر اثرات کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

اس جوان کا جذبہ جو صرف نامحرم کی طرف نگاہ کرتا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی اقدام نہیں کرتا، حتمی طور پر اس جوان کے جذبات سے بہت مختلف ہے جو عفت کے منافی بدترین افعال انجام دیتا ہے اور اپنے ان گندے اور پلید مقاصد کو انجام دینے میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں دیکھتا ہے۔

جذبات اور گناہ کے عوامل مختلف ہونے کی بناء پر خود جرم بھی مختلف قسم کے ہوں گے۔ ایک شخص کا گناہ لوگوں کے ناموس کی طرف ایک نظر اور سطحی تجاوز ہے جبکہ دوسرے کا گناہ لوگوں کے ناموس پر زیادتی اور تجاوز کرنا ہے۔

یہ بات بن کہے واضح ہے کہ جذبات اور خود جرم کے اختلافِ درجات کی بناء پر گناہ کے مرتکب اشخاص بھی اس کے مختلف زیاں آور آثار

کے لحاظ سے مختلف ہوں گے اور لوگوں کی ناموس پر تجاوز کا ضرر اور مفسدہ ہرگز لوگوں کی بیٹیوں کی طرف نظر اٹھانے کے مفسدے کے برابر نہیں۔

اس بنا پر اگر بعض گناہ گار اور بعض گناہوں کی شفاعت ہوگی اور بعض دوسرے اس سے محروم ہوں گے تو یہ ناروا تبعیض اور غیر عقلی کام نہیں ہوگا۔

یہاں پر اس قسم کی تبعیض کی جو درحقیقت تبعیض ہی نہیں بلکہ فرق ہے کچھ اور انداز سے تفسیر کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ جب بھی کچھ ایسے افراد کی شفاعت ہو جائے جو اس کے اہل اور دوسروں پر ترجیح نہیں رکھتے تھے، اس کے باوجود ان کی مدد کی جائے اور دوسروں پر ان افراد کو مقدم کیا جائے تو یقیناً یہ کام ایک طرح کی ناروا تبعیض ہوگی، لیکن بعض گناہ گاران معنوی روابط کی بدولت جو خدا سے رکھے ہوئے تھے اور اس ایمانی تعلق کی بناء پر جو اولیاء اللہ سے برقرار کیے ہوئے تھے، قیامت میں شفیعوں کی ان کو مدد ہو جائے تو اس صورت میں شفاعت عین عدل و انصاف اور دنیا میں اس کی نوید تربیت اور اپنی باقی ماندہ زندگی میں خدا کی جانب بازگشت کا ذریعہ ہوگی کیونکہ اس صورت میں برتری کا معیار اور یہ کہ بعض کی شفاعت ہو جانا اور بعض کا اس سے محروم رہ جانا، ان افراد کی اسی اہلیت اور معنوی پہلو کی بناء پر ہے۔ وہ لوگ کہ جو خدا سے اپنا رشتہ محفوظ کیے ہوئے ہیں اور اولیائے خدا کے ساتھ بھی معنوی تعلق قائم کیے ہوئے ہیں، وہ خدا کے اولیاء کی شفاعت کے دائرے میں داخل ہوں گے۔ مگر وہ لوگ جن میں یہ دونوں شرطیں موجود نہ ہوں وہ بارگاہ خدا سے دور ہونے اور اولیائے حق کے ساتھ بھی تعلق نہ رکھنے کی وجہ سے شفاعت کے اہل اور مستحق نہیں ہوں گے۔ یہ کام ناروا اور غلط تبعیض بھی نہیں ہوگی۔

اس مطلب کی وضاحت وہ امتیازات ہیں جن کا مشرک اور غیر مشرک کے بارے میں قرآن مجید قائل ہوا ہے، جیسا کہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ [1]

''خدا شرک کو نہیں بخشتا اس سے کم والے کو بخشتا ہے۔''

یہ آیت جو مشرک اور غیر مشرک کے درمیان فرق ڈالتی ہے تو بہ والے مرحلے سے مربوط نہیں کیونکہ اگر تو بہ سے مربوط ہوتی تو قرآن مشرک اور غیر مشرک کے درمیان فرق کا قائل نہ ہوتا اور دونوں قسم کے افراد تو بہ اور دامن توحید کی طرف پلٹنے کی بنا پر بخش دیے جاتے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا کی رحمت واسعہ مشرک کے شامل حال کیوں نہیں ہوتی جب کہ اس کی رحمت غیر مشرک کو اپنے دائرے میں داخل کرتی ہے؟ جواب دیا جائے گا اس لیے کہ مشرک خدا سے اس قدر دور ہے کہ اس نے خدا سے تمام رشتے منقطع کیے ہیں۔ وہ اس کی رحمت کے سائے سے باہر نکل چکا ہے جب کہ غیر مشرک نے خدا کے ساتھ اپنے کچھ رشتوں کو محفوظ کیا ہوا ہے۔

قرآن مجید نے گناہانِ کبیرہ سے پرہیز کو گناہان صغیرہ کا کفارہ قرار دیا ہے اور ارشاد فرمایا:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ [2]

---

[1] سورہ نساء آیات ۴۸، ۱۱۶

[2] سورہ نساء آیت ۳۱

"اگر گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرو گے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں سے درگزر کریں گے۔"

مذکورہ بیان پر غور کرنے سے حقیقت واضح ہوگی کیونکہ وہ جو گناہان کبیرہ سے اجتناب کرتا ہے اس نے خدا کے ساتھ اپنے روابط کے ایک بڑے حصے کو محفوظ رکھا ہے اور صرف کچھ لمحات کے لیے خدا سے غافل ہوا ہے تو ہرگز ایسے شخص کا اس فرد کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا جو گناہانِ کبیرہ اور برائی میں غرق ہے۔ دونوں کو یکساں قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۸۔ کیا سنن الٰہی ایک طرح کی ہیں؟

خدا کی روش اور سنت اس پر جاری ہوئی ہے کہ اپنے افعال یکساں اور بلا استثنا جاری کرے۔ عالم اسباب میں بھی یہی سنت جاری ہے۔ خدا کا ارشاد ہے:

هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾[1]

"یہ میری سیدھی راہ ہے کہ تم میرے بندوں پر غلبہ نہ کرو گے، مگر گمراہوں پر کہ جو تیری (شیطان کی) پیروی کر چکے ہیں۔"

آیت کا پہلا جملہ "ھذا صراط علی مستقیم" اس کا گواہ ہے کہ خدا کی سنت مسلسل ایک جیسی اور یکساں ہے۔ اور نیز ارشاد فرمایا:

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾[2]

خدا کی سنت اور سلیقے کے لیے کوئی تبدیلی اور تحویل نہیں ہے۔

بنابریں بعض مجرموں کو بخش دینا یا بعض گناہوں کو معاف کر دینا خدا کی سنت میں ایک طرح کی تبدیلی اور تغییر ہے جبکہ خدا کی سنت کو ایک طرح کا ہونا چاہیے تھا۔

آٹھویں سوال کا جواب

خدا کی مغفرت اور وسیع رحمت جو مخصوص شرائط کے تحت گناہ گاروں کے شامل حال ہوتی ہے، یہ خود خدا کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے اور پروردگار عالم کے تغییر ناپذیر طریقوں میں سے ایک ہے۔ جس طرح خدا نے عذاب وعقاب کا وعدہ دیا ہے اسی طرح اپنے گناہ گار بندوں کو کچھ شرائط کے تحت مغفرت اور بخشش کا وعدہ بھی دیا ہے۔ پس ان میں سے ایک کو تو سنت الٰہی اور دوسری کو اس کی سنت اور طریقے کے خلاف

---

[1] سورہ حجر آیات ۴۱۔۴۲

[2] سورہ فاطر آیت ۴۳

اقدام ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ دونوں مخصوص شرائط کے تحت اس کی تغییر ناپذیر سنن اور ہمیشہ کے طریقوں میں سے شمار ہوتے ہیں۔

اعتراض کرنے والے نے خیال کیا ہے کہ عذاب وعقاب دینا اصلی سنت ہے مگر شفاعت کے ذریعے عفو اور مغفرت قانون میں ایک قسم کا استثنا ہے جبکہ ان میں سے کوئی ایک بھی دوسری کی نسبت استثنائی پہلو نہیں رکھتی، بلکہ ہر ایک حتمی قوانین میں سے ہے جو اپنے ہی مقام پر اجراء ہوتے ہیں۔

دراصل یہ کہ خدا کے قوانین اور طریقوں میں ردو بدل نہیں ہوتا اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا عرصہ وجود میں ایک فعل سے زیادہ انجام نہیں دیتا جبکہ اس نے خود اپنی کتاب میں یوں تعارف کرایا ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿٢٩﴾[1] ''ہر دن اس کے لیے ایک مخصوص کام اور شان ہے۔''

ایسے ہی قرآن میں اپنا یوں تعارف کرایا ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿٣٩﴾[2]

''جو چاہتا ہے محو کرتا ہے اور جو چاہتا ہے ثبت کرتا ہے اور ام الکتاب (لوح محفوظ) اس کے پاس ہے۔''

اس وجہ سے ہم جہان آفرینش میں خدا کے طرح طرح کے جلوے اور تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

وہ خدا جو حیات و زندگی عطا کرتا ہے وہی موت دینے والا ممیت بھی ہے۔ جب رؤف ورحیم ہے تو قاہر اور انتقام لینے والا بھی ہے۔ البتہ ہر ایک معین مقام اور مخصوص شرائط کے تحت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک خدا کی اصلی سنت ہو اور دوسری چیز خدا کے قانون میں استثنا کے عنوان سے ہو۔

جس طرح توبہ کے سائے میں گناہ سے عفو کرنا خدا کی استوار اور خلل ناپذیر سنتوں میں سے ایک ہے اسی طرح اپنے اولیاء کی شفاعت کی خاطر گناہوں کو بخش دینا بھی اس کے لطف خاص اور مہربانی کے مظاہر میں سے ہے جو کسی بھی وقت تغییر اور خلل کو قبول نہیں کرتے۔

اسلامی فلاسفہ اور عرفاء کہتے ہیں: خدا کے کاموں میں سے ہر کام اور اس کی تجلیات میں سے ہر تجلی اس کی صفات میں سے کسی ایک سے مربوط ہے۔ وہ شافی کے نام سے بیماروں کو شفا عطا کرتا ہے۔ قاہر کے نام سے ستمگروں کو ذلت سے دوچار کرتا ہے۔ منتقم کے نام سے تجاوز کرنے والوں کو عقاب کرتا ہے۔ ہر نام اپنا ایک خاص جلوہ رکھتا ہے۔

اصمعی کہتے ہیں: میں حجاز کے بیابان میں ایک بادیہ نشین عورت کے پاس زبانی قرآنی تلاوت کر رہا تھا۔ میں نے حد سرقت (چوری کی سزا) سے مربوط آیت کو یوں پڑھا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ

---

[1] سورہ رحمن آیت ۲۹

[2] سورہ رعد آیت ۳۹

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ [1]

''چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو یہ خدا کی طرف سے ایک انتقام ہے اور ان کے کیے دھرے کے بدلے ایک سزا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔''

اچانک اس بادیہ نشین عورت نے میری طرف دیکھ کر کہا:

"لو كان غفوراً رحيما لما امر بقطع ايديهما"

''اگر خدا بخشنے والا مہربان ہوتا تو ہرگز ان کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم نہ دیتا۔''

میں نے فوراً قرآن کھولا اور دیکھا کہ میں نے غلطی کی ہے۔ آیت کا آخر ''غفور رحیم'' نہیں بلکہ ''عزیز حکیم'' ہے جس کے معنی ایسے قدرت مند کے ہیں جو اپنے کام حکمت کے تحت انجام دیتا ہے۔ اس مقام پر سازگار نہیں ہے کہ خدا غفور و رحیم کے نام سے تجلی کرے کیونکہ تباہی مچانے والے چور پر حد جاری کرنے کا مقام خدا کے بخشش و کرم کے مقام کے مناسب نہیں ہے بلکہ یہ مقام اس کے عزیز اور حکیم کے نام کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

درحقیقت حکماء و عرفاء نے اپنی کتابوں میں اس عورت کا جو ذکر کیا ہے اس نے ایک مختصر سے جملے کے اشارے سے بتانا چاہا ہے کہ یہ مقام غفور و یا رحیم کے نام سے جلوہ دکھانے کا نہیں ہے بلکہ یہ مقام عزیز و حکیم کے نام سے تجلی دکھانے کا ہے تا کہ سننے والا جان لے کہ خدائے رؤف و مہربان حکم دیتا ہے کہ چور کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں تو یہ خدا کے بخشش کے مقام سے منافات نہیں رکھتا کیونکہ وہ سنت اپنی جگہ پر ایک مقام رکھتی ہے اور یہ سنت بھی اپنے لیے ایک جگہ اور مقام کی حامل ہے۔

آخر میں ہم ایک نکتے کی یاد دہانی ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ "هذا صراط علی مستقيم" یہ میرا سیدھا راستہ ہے۔'' والی آیت سے یہ استدلال کرنا کہ خدا کی سنتیں اور اس کے طریقے یکساں اور ایک طرح کے ہیں، درست نہیں ہے اس لیے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ میری راہ سدھی اور درست ہے اور شیطان کا راستہ منحرف اور ٹیڑھا ہے۔ چنانچہ آیت کا ذیل اسی بات کی شہادت دیتا ہے۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ [2]

''میرے بندوں پر تیرا قابو نہیں مگر گمراہ لوگوں کے جو تیری پیروی کر چکے ہیں اور دوزخ ان سب کی وعدہ گاہ ہے۔''

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۳۸

[2] سورہ حجر آیات ۴۲-۴۳

درحقیقت اس آیت کے معنی ایک اور آیت کے مانند ہیں کہ جس میں فرمایا:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ [۱]

''اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے۔ اسی کی پیروی کرو نہ دوسرے راستوں کی پیروی کرو جو تم کو خدا کی راہ سے متفرق کرتے ہیں۔''

یہ آیات ہرگز جہانِ تکوین اور تشریع میں خدا کی سنتوں کے یکساں اور ایک طرح کے ہونے کے بارے میں نہیں بتا رہی ہیں بلکہ ان کا مطلب کچھ اور ہے۔

۹۔ کیا شفاعت ایک طرح کی بہانہ تراشی اور پارٹی بازی کا ذریعہ ہے؟

شفاعت کی خوشخبری اور یہ کہ خدا کے کچھ پاک بندے کچھ گناہ گار بندوں کے حق میں شفاعت کریں گے اور ان کی سفارش سبب بنے گی کہ خدا ان بندوں کی خطاؤں سے درگزر کرے، یہ تو ایک دنیاوی پارٹی بازی اور وسیلہ تراشی کے مانند ہے جس سے ذاتِ مقدس پروردگار کو منزہ سمجھا جائے۔ آپ کہتے ہیں گویا آخرت بھی اس دنیا کی طرح ہے کہ جس کی پارٹی مضبوط اور طاقتور ہوگی اسے اپنے کردار کے عقاب سے نجات مل جائے گی اور وہ لوگ جو کوئی وسیلہ اور سفارش حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ ضرور اپنے اعمال کی سزا جھیلیں گے۔

جواب

اگر حقیقت شفاعت یہ ہو کہ گناہ گار آخرت میں اسی دنیا کی طرح اپنی جانب سے وسیلہ منتخب کرے، وہ وسیلہ بھی کسی شرط کا لحاظ کیے بغیر اس کی استدعا قبول کرے اور اس مقام و منزلت کے سائے میں جو بارگاہ خدا میں اسے حاصل ہے، ایسے مجرم کے حق میں عفو اور مغفرت حاصل کرے، تو اس قسم کی شفاعت وہی بے انصافی اور پارٹی بازی ہے کہ جس سے بارگاہِ پروردگار کو پاک و منزہ سمجھنا چاہیے۔

یہ وہی باطل شفاعت ہے جو مشرکین عرب بتوں کے بارے میں خیال کیا کرتے تھے کیونکہ وہ بتوں کو بارگاہ الٰہی میں موثر سمجھتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تعریف و پرستش کے ذریعے ان کی رضا حاصل کی جاسکتی ہے اور ان بتوں کو متاثر کر کے ان سے سفارش کروائی جاسکتی ہے۔ وہ یوں کہتے تھے:

هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ [۲]

---

[۱] سورہ انعام آیت ۱۵۳

[۲] سورہ یونس آیت ۱۸

''وہ خدا کی بارگاہ میں ہمارے شفیع ہیں۔''

نیز وہ کہتے تھے:

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى ؕ [1]

''ہم ان کی اس لیے پوجا کرتے ہیں تا کہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک کردیں۔''

قرآن مجید نے شدت سے اس قسم کی شفاعت کو مسترد کیا ہے اور پہلی آیت کے ذیل میں فرمایا ہے:

قُلۡ اَتُنَبِّـُٔوۡنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۸﴾ [2]

''کہو اے رسولِ گرامیؐ! کیا تم خدا کو اس چیز سے آگاہ کرتے ہو جو زمین و آسمانوں میں نہیں؟ جس چیز کو خدا کا شریک خیال کرتے ہو اس سے وہ منزہ ہے۔''

خلاصہ یہ کہ شفاعت کے یہ معنی کہ کام بندے کی جانب سے شروع ہو اور خدا پر ختم ہو جائے اور شفاعت میں کسی طرح کی شرط یا قید موجود نہ ہو، یہ ایک باطل معنی ہے جس کو پروردگار کی ذات کے ساتھ منسوب کرنا درست نہیں کہ جس کے ارادے کے سوا کوئی بھی ارادہ حاکم و نافذ نہیں اور زمام کار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اس طرح کی شفاعت پر عقیدہ رکھنے کی وجہ اخروی شفاعت کے دنیاوی سفارشوں پر قیاس کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دنیاوی سفارشوں میں معاملہ اس طرح ہے کہ ایک مجرم شخص کسی سفارشی کو پکڑ لیتا ہے اور اس کو آمادہ کرتا ہے کہ حاکم وقت کہ جس کے ہاتھ میں زمام کار ہے اس سے رابطہ کرے اور اپنے اثر و رسوخ سے جو اس حاکم کے ادارے میں اس کو حاصل ہے، وہ حاکم کو مجبور کرتا ہے کہ مجرم کے جرم کو معاف کر دے اور اس کے حق میں قانون کے اجراء سے صرف نظر کرے۔

درحالیکہ قیامت میں شفاعت کا مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں پر عادل حاکم (خدائے متعال) ان مصلحتوں کے تحت جن کو وہ خود جانتا ہے اپنے اولیاء کو ابھارتا ہے کہ ان گناہ گار بندوں کہ جن میں شفاعت کی اہلیت موجود ہے اور جنہوں نے خدا سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا ہے نیز اولیائے خدا سے بھی اپنا ایمانی ناطہ محفوظ رکھا ہے ان کے حق میں شفاعت کریں تا کہ وہ خدا کی رحمت اور عفو و بخشش کے دائرے میں داخل ہو جائیں۔

ممکن ہے یہاں سوال ہو کہ جب شفاعت کا ہدف یہ ہے کہ گناہ گار افراد کو رحمت حق اور اس کی بخشش شامل ہو جائے تو خدا یہ کام براہ

---

[1] سورہ زمر آیت ۳

[2] سورہ یونس آیت ۱۸

راست کیوں نہیں کرتا؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ خدا کی سنت اور اس کی حکیمانہ ارادہ اس سے متعلق ہو گیا ہے کہ وہ اپنی مادی اور معنوی نعمتوں کو اسباب وعلل کے ذریعے سے بندوں تک پہنچائے مثلاً ایک شخص سورج کی حیات بخش شعاعوں کے ذریعے نشوونما پاتا ہے جب کہ خدا ایسا سبب پیدا کیے بغیر بھی نشوونما کی نعمت اس کے ہاتھ میں دے سکتا تھا۔ اسی طرح خدا انسانوں کو انبیاء کے ذریعے اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہے اور خدا کی نعمت ہدایت پیغمبروں کے ذریعے انسانوں تک پہنچتی ہے جبکہ خدا کے لیے ممکن تھا کہ اپنی ہدایت کی نعمت پیغمبروں کو بھیجے بغیر انسانوں کے لیے عام کر دے جب کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ تمام فیوض و برکات خاص اسباب کے تحت ہم تک پہنچتے ہیں۔

اس بناء پر کہ خدا کا حکیمانہ ارادہ اس سے متعلق ہوا ہے کہ وہ اپنی تمام مادی اور معنوی برکات کو ان اسباب کے تحت جن کو وہ خدا خلق کرتا اور بھیجتا ہے، انہی کے ذریعے بندوں تک پہنچائے۔ اس وجہ سے یہ تمام نعمتیں ایک قسم کے مادی اور معنوی نظام کے تحت انسان تک پہنچتی ہیں۔ آخرت میں بھی معاملہ اسی قسم کا ہے۔ شفاعت خدا کی وسیع مغفرت و بخشش کے سوا کوئی شے نہیں۔ اسی وجہ سے جب بھی اس کی نسبت خدا کی طرف دی جائے تو اسے مغفرت اور درگزر کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر اسباب اور علتوں کی طرف نسبت دی جائے جو کہ اولیائے الٰہی ہیں تو اس وقت شفاعت نام دیا جاتا ہے۔

رحمت خدا انسان تو کیا تمام ذراتِ جہان کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ فرشتے جو صاحبانِ ایمان کے حق میں طلب مغفرت کرتے ہیں ان کا شعار یہ ہے:

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا [1]

''اے خدا تیرا علم اور رحمت ہر چیز پر چھائے ہوئے ہیں۔''

قرآنی آیات معنوی نظام کی گواہی دیتی ہیں

قرآنی آیات کی تحقیق سے یہ پوری طرح استفادہ ہوتا ہے کہ خدا کی رحمت کی وسعت اور اس کی مغفرت کا ایک مخصوص نظام ہے۔ خدا کے حکم سے ہی اس نظام کا معنوی فیض بندگانِ خدا تک پہنچتا ہے۔

قرآن مجید پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ ایسے افراد جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ان کے حق میں دعا اور مغفرت طلب کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۖ [2]

''ان کے بارے میں دعا کرو ان کے حق میں تیری دعا سکون کا باعث ہے۔''

---

[1] آیت کا آغاز یوں ہے وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ (سورہ مومن آیت ۷)

[2] سورہ توبہ آیت ۱۰۳

قرآن گناہ گاروں کو دستور دیتا ہے کہ پیغمبرؐ کے حضور جائیں اور آپؐ سے درخواست کریں کہ ان کے حق میں طلب مغفرت کریں تا کہ خدا ان کے گناہوں سے درگزر فرمائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا﴿۶۴﴾ [۱]

''جب بھی وہ اپنے نفس پر ظلم کریں، پھر تمہارے پاس آجائیں اور وہ خود بھی خدا سے طلب مغفرت کریں اور پیغمبر بھی ان کے حق میں بخشش طلب کرے تو وہ خدا کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے۔''

اگر خدا کا ارادہ اس سے تعلق پیدا کرتا کہ اس کی مغفرت بغیر کسی خاص نظام کے بندوں تک پہنچتی تو پھر خدا اپنے رسولؐ کو یہ حکم کیوں دیتا کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے فراد کے حق میں دعا کریں، گناہ گاروں کو یہ دستور کیوں دیتا کہ پیغمبرؐ کے پاس جائیں اور آپؐ سے اپنی بخشش کے لیے درخواست کریں؟

یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ رحمت خدا ایک خاص نظام اور اسباب کے تحت ہے کہ ان میں سے ایک پیغمبرؐ کی دخالت اور دوسرا سبب اولیاء اللہ ہیں تا کہ اس راہ سے گناہ گاروں یا اس کے کچھ بندوں تک فیض پہنچے۔

دوسری آیت میں صاحبانِ ایمان کو حکم دیا جاتا ہے کہ خدا کی مغفرت کو حاصل کرنے کے لیے وسیلے کو تلاش کریں جیسا کہ ارشاد فرمایا:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ [۲]

''اے صاحبانِ ایمان! خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو اور ایسے وسیلے کو تلاش کرو جو تم کو رضائے الٰہی تک پہنچائے۔''

یہ آیات اور اس کے علاوہ دیگر آیات پورے طور پر یہ بتلا رہی ہیں کہ خدا کی معنوی نعمتوں اور اس کی وسیع رحمت کا ایک خاص نظام ہے جو ضروری ہے اس راہ سے اس کے بندوں تک پہنچے۔

اس بناء پر اب ہم تعجب نہیں کریں گے کہ قیامت کے دن خدا کی بخشش اولیاء کے طریق سے ہی کیوں ہم تک پہنچتی ہے۔ اولیائے خدا بھی لازماً اس کے اذن سے ہی گناہ گاروں کے بارے میں شفاعت کریں گے تا کہ خدا کا لطف اور اس کی عنایت ان کے شامل حال ہو جائے۔

علاوہ ازیں قبولیت دعا اور قیامت میں اولیائے الٰہی کی درخواست کو منظور کرنا خدا کی بارگاہ کے محبوب اور معزز بندوں کا ایک طرح کا اکرام اور احترام ہے، ان کی درخواست قبول کرنا ان کے مقام کا تعارف کروانا ہے۔

---

[۱] سورہ نساء آیت ۶۴

[۲] سورہ مائدہ آیت ۳۵

اس کے علاوہ شفاعت کی پہلی شرط یہ ہے کہ گناہ گار شخص خدا سے اپنا تعلق منقطع نہ کرے اور اس کا ایمانی اور روحانی رابطہ اولیاء اللہ سے محفوظ ہو۔ خدا اور اسکے اولیاء کے ساتھ رابطہ کے برقرار رکھنے کی بنا پر یہ خدا کی زیادہ سے زیادہ رحمت کا مستحق ہوگا۔ اب اس فرق کا نام اپنی پارٹی کونوازنا نہیں ہوسکتا۔

ہمیں ہرگز شک وشبہ نہیں کرنا چاہیے کہ ناقص کا کامل کے ساتھ رابطہ یا جاہل کا عالم کے ساتھ یا ایک سادہ کام کرنے والے کا ماہر کار کے ساتھ رابطہ لاشعوری طور پر ان کے تکامل کا باعث ہے۔ اس بناء پر اس قسم کے گنہگاروں کا جو خدا سے اور اسکے اولیاء سے رابطہ ہے وہ دوسرے افراد کی نسبت تکامل اور برتری کا موجب بنتا ہے۔ اسی بناء پر وہ خدا کے زیادہ لطف اور رحمت کے اہل بن جاتے ہیں۔

دنیوی اور اُخروی شفاعت میں فرق

۱۔ اخروی شفاعتوں میں معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور خدا ہی اس کام کا سرچشمہ ہے، وہی ہے جو شفیع کو ترغیب دیتا ہے جو کمال ومقام اسے حاصل ہے اس کے نتیجے میں خدا اس کو شفاعت کا حق عطا فرماتا ہے اور اس شفیع کے ذریعے اپنی رحمت ومغفرت کو بندوں کے شامل حال کرتا ہے لیکن دنیوی سفارشوں میں مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ مجرم سفارشی کو اکساتا ہے اور اگر مجرم اسے نہ ابھارتا تو وہ ہرگز سفارش کے بارے میں اقدام نہ کرتا۔ اگر قرآن مجید حکم دے رہا ہے کہ گناہگار لوگ اس دنیا میں پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوجائیں اور آپ کو دعا اور طلب مغفرت کے لیے آمادہ کریں تو یہ کام بھی براہ راست خدا کی جانب سے ہی شروع ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ہم کو حکم دیتا ہے کہ ہم ایسا کریں۔ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا تو ہم پیغمبرؐ کی طرف ہرگز نہ جاتے اور اگر جاتے بھی تو خدا کے حکم کے بغیر کوئی اثر نہ ہوتا۔

۲۔ صحیح شفاعتوں میں شفیع مقام ربوبیت کے زیر اثر قرار پاتا ہے جب کہ باطل شفاعتوں میں صاحبِ قدرت شفیع کی باتوں کے زیر اثر آجاتا ہے اور خود شفیع مجرم کے زیر اثر۔

۳۔ دنیوی سفارشیں صرف قانون میں امتیاز ہیں اور شفیع کا اثر ونفوذ قانون بنانے والوں یا قانون کا اجراء کرنے والوں کو مغلوب کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قانون اپنی طاقت صرف ضعیف اور ناتواں افراد پر ظاہر کرتا ہے جب کہ اخروی شفاعتوں میں کوئی بھی شخص اپنی طاقت خدا پر لاگو نہیں کرتا اور قانون کو روکتا نہیں، بلکہ شفاعت خدائے مہربان کی وسیع رحمت اور لامحدود مغفرت ہے جس کا سرچشمہ خدا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ شفاعت کے ذریعے ان افراد کو جن میں تطہیر اور پاک ہونے کی قابلیت ہے، ان کو پاکیزہ بنادے۔

وہ لوگ جو شفاعت سے محروم ہوں گے یہ اس لحاظ سے نہیں ہے کہ خدا کے قانون میں امتیاز ہے بلکہ وہ لوگ خدا کی مغفرت اور وسیع رحمت کی قابلیت ہی نہیں رکھتے ہیں، اس لیے چاہیے کہ وہ اسی حال پر باقی رہیں۔

بعض دانشوروں کے مطابق خدا کی رحمت ایک تاجر کی تجوری یا بینک کے مانند نہیں جو خالی ہوجائے بلکہ دوسرے شخص میں قابلیت اور استعداد ہونا چاہیے تا کہ رحمت خدا اس تک پہنچ سکے۔ اگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ [۱]

''خدا مشرکوں کو نہیں بخشتا ہے۔''

تو یہ اس بنا پر ہے کہ مشرک کا دل ایک بند برتن کی مانند ہے کہ اگر سات سمندروں میں بھی اسے ڈبو یا جائے تو بھی اس کے اندر تک پانی نہیں پہنچے گا یا پھر ایک شوردار زمین کے مانند ہے جس پر جتنی بھی بارش برسے سوائے خش وخاشاک کے کچھ نہیں اُگتا۔

قرآن تاکید کرتا ہے کہ اولیائے خدا کی شفاعت ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو خدائے جہان کی خوشنودی حاصل کر چکے ہوں۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى [۲]

''ان افراد کے حق میں شفاعت کریں گے جن کو خدا کی رضا حاصل ہے۔''

یہ اس لیے ہے کیونکہ خدا جانتا ہے کہ کون سا شخص اس کے معنوی فیض اور رحمت واسعہ کا اہل ہے اور کون سا شخص یہ اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ بقولِ سعدیؔ

گر خواجہ شفاعت نکند روزِ قیامت
باید کہ زمشاطہ نرنجیم کہ زشیم

(اگر آقا ہی قیامت میں شفاعت نہ کرے تو پھر مشاطہ سے بدصورتی کا کیا گلہ کرنا)

نہ صرف مشرک افراد خدا کی رحمت واسعہ اور اس کے اولیاء کی شفاعت سے محروم ہوں گے بلکہ وہ لوگ جو زیادہ آلودگیوں کی وجہ سے خدا کی مغفرت کی اہلیت نہیں رکھتے، ممکن ہے کہ وہ بھی اس کی درگاہ کے شفیعوں کے ذریعے لطف الٰہی تک نہ پہنچ سکیں۔

یہاں تک ان تمام اعتراضات کی تحقیق کی گئی جو شفاعت کے بارے میں کیے گئے تھے یا ممکن تھا کیے جائے۔ یہ واضح ہوا کہ ان اعتراضات میں سے کوئی ایک بھی مضبوط اساس اور بنیاد نہیں رکھتا۔ ان میں سے اکثر اسلام کے مسلم اصول ونظریات کے بارے میں غلط طرزِ تفکر پر مبنی ہیں۔ ہم اس حصے کے خاتمے پر اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ استادِ بزرگوار حضرت علامہ طباطبائی روحی فداہ کی ان تھک کوششوں کا شکریہ ادا کریں اس لیے کہ انہوں نے ان اشکالات میں سے بیشتر کو اپنی تفسیر میں جمع کر کے تفصیلی طور پر ان کا تجزیہ وتحلیل کیا ہے۔ راقم نے بھی استاد بزرگوار کی تحریر کے دیگر شائقین کی طرح اس حصے میں استاد کے علمی خرمن سے حداکثر استفادہ کیا ہے اور انہیں اس انداز سے صفحات میں بیان کیا ہے جو نوجوانوں کی فکری سطح اور ذوق کے مطابق ہو۔ [۳]

---

[۱] سورہ نساء آیت ۴۸ و ۱۱۶

[۲] سورہ انبیاء آیت ۲۸

[۳] المیزان ج ۱ ص ۱۶۴۔۱۷۱

بیجا تنقید

بعض نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ جب بھی اسلامی مباحث میں سے کسی بحث میں وارد ہوتے ہیں ''نو آوری'' کے نام سے گفتگو کو اس کے سیدھے راستے سے منحرف کرتے ہیں۔ اس لیے قارئین کے لیے کم و بیش الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ اس بناء پر یہ لوگ کسی گفتگو کے متن میں جب اپنی ٹانگ اڑانے کی گنجائش نہیں پاتے ہیں تو اس وقت کوشش کرتے ہیں کہ کسی اور مطلب کو ملا کر قاری کے ذہن میں شبہ پیدا کریں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

''کتاب توحید و یکتا پرستی'' کے مصنف شفاعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''شفاعت کا مسئلہ دین کے اہم مسائل میں سے ایک ہے اور دین مبین اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔'' پھر شفاعت سے مربوط بہت ساری آیات نقل کی ہیں۔ اس طرح جیسے کہ ہم نے ''شفاعت قرآن کی نگاہ میں'' کی بحث سے نتیجہ لیا تھا وہ بھی نتیجہ لیتا ہے کہ ''شفاعت ثابت ہے لیکن اس شفاعت پانے پر خدا کے راضی ہونے اور خدا کے شفیع کو اجازت دینے کی شرط کے ساتھ۔''

یہاں تک تو کوئی نئی بات نہیں لی ہے، بلکہ شیعہ و سنی علماء نے جو کچھ اس باب والی آیات سے استفادہ کیا تھا وہی ذکر کیا گیا ہے۔

لیکن دو صفحے بعد لکھتا ہے:

''اب ہم دیکھیں کہ شفاعت کیا ہے؟ شفاعت گناہ گار کے گناہ سے درگزر کرنے کی درخواست کا نام ہے اور دینی اصطلاح میں شفاعت عبارت ہے اس سے کہ بعض صالح بندے گناہ گار افراد کے عقاب سے درگزر کرنے اور معصیت کاروں کو معاف کرنے کے لیے خدا سے درخواست کریں۔ یہ عقیدہ جس نے اہل دین کو بہت نقصان پہنچایا ہے ایک قسم کی تحریف ہے جو کاہنوں کی تعلیمات میں سے ہے اور اس خاطر ہے کہ لوگوں کے نزدیک ان کی کوئی عزت و وقار ہو۔ اس لیے انہوں نے شفاعت کے یہ معنی کیے ہیں اور اپنے لیے اس مقام کے قائل ہوئے ہیں۔'' [1]

اس کے مصنف سے پوچھا جائے کہ آپ خود تصریح کر رہے ہیں کہ شفاعت دین مبین اسلام کے مسلمات میں سے ہے اور قرآن مجید سے خدا کی رضا اور شفاعت کرنے والے کو اذن خدا کی شرط کے ساتھ شفاعت کا ہونا ثابت بھی ہے، تو پھر اب کیسے آپ کہہ رہے ہیں کہ شفاعت کے عقیدے نے اہل دین کو سنگین نقصان پہنچایا ہے اور یہ کاہنوں کی تعلیمات کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے؟

کیا یہ تناقض گوئی کے سوا کچھ اور ہے؟

اس کے بعد اضافہ کرتا ہے کہ ''رسول اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہؐ! آپؐ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق بندہ کون سا ہے؟ فرمایا: میری شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو صمیم قلب سے لا الہ الا اللہ کہے۔'' پس حضورؐ نے شفاعت کے حصول کے لئے سب

---

[1] توحید عبادت و یکتا پرستی ص ۱۳۰ تا ۱۳۸

سے بڑا سبب صرف توحید خالص کو قرار دیا ہے۔ یہ بالکل اسکے برعکس ہے جو مشرکین کہتے ہیں:

''اس وقت شفاعت کو پہنچو گے جب انبیاء کو اپنا شفیع قرار دو گے اور خدا کے علاوہ ان سے بھی دوستی رکھے ہو گے۔''

غور کیجیے کہ موصوف نے اس جملے میں دو نکتے ذکر کیے ہیں:

۱۔ اگر یہ کہیں کہ انبیاء کے ساتھ موالات اور دوستی شفاعت پانے میں موثر ہے تو یہ بات توحید اور لا الہ الا اللہ کہنے کے ساتھ منافات رکھتی ہے۔

۲۔ جو شخص پیغمبرؐ کو اپنا شفیع قرار دے وہ مشرک ہے۔

ان دو باتوں کے جواب کے لیے ہم آپ کی توجہ ذیل کے مراحل کی طرف مرکوز کرتے ہیں۔

اول: قرآن مجید ہم کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان کے ساتھ دوستی اور محبت کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ [1]

''جو بھی خدا اور اس کے رسول اور ان کو جو ایمان لائے ہیں دوست رکھے (وہ خدا کی جماعت میں سے ہے) اور خدا کی جماعت یقیناً غالب آنے والی ہے۔''

دوم: واضح ہے کہ جو شخص خدا اور رسولؐ اور صاحبانِ ایمان کو دوست رکھتا ہو وہ اس آیت کے حکم سے ''حزب اللہ'' میں شامل ہے۔ خدا ایسے گروہ کے افراد سے راضی ہے۔ وہ لوگ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ [2] ارْتَضٰى کی آیت کے حکم سے شفاعت نہیں کرتے مگر ان کے لیے کہ جن سے خدا راضی ہو وہی شفاعت کے اہل قرار پائیں گے۔ پس پیغمبرؐ کے ساتھ انسان کی دوستی اس کی شفاعت میں اثر رکھتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوستی احکام اسلام اور شریعت پر عمل اور گناہوں سے بچنے کا سبب بنتی ہے۔ ایسا شخص حتمی طور پر شفاعت کا اہل قرار پائے گا۔ رسولِ اکرم کے ساتھ محبت ایک راستے کی حیثیت رکھتی ہے، یعنی اس راہ سے گزر کر ہی ہم فرائض کی انجام دہی اور احکام دین پر عمل کرنے کی منزل تک پہنچتے ہیں اور سچی محبت کبھی بھی محبوب کی آرزو پر عمل سے الگ نہیں۔ کیا اس سوال کا مقام نہیں کہ ہم اس لکھنے والے سے دریافت کریں کہ شفاعت میں رسول اکرمؐ کی دوستی کے اثر کا قعیدہ توحید کے کیسے منافی ہو گیا۔ حالانکہ آپ کی دوستی کا اثر تو خود قرآن سے معلوم ہو رہا ہے؟

یہ جو کہہ رہے ہیں کہ ہم نے کی پیغمبر کو اپنا شفیع ماننا تو شرک ہے، یہ انہی وہابیوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ صالح بندوں کے لیے شفاعت ثابت ہے لیکن غیر خدا سے یہ طلب نہ کی جائے۔ اگر غیر خدا سے شفاعت طلب کی تو مشرک ہو جاؤ گے۔

ہم اس کتاب کے ساتویں حصے میں معصوم پیشواؤں سے شفاعت طلب کرنے کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ تحقیق کریں گے اور واضح کریں گے کہ ایسی درخواست شرک سے کسی طرح کا ربط نہیں رکھتی ہے۔

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۵۶

[2] سورہ انبیاء آیت ۲۸

پھر وہ لکھتے ہیں:

''واضح تر بیان میں 'شرکیہ' کا بھی شفاعت کے بارے میں عقیدہ وہی ہے جو عوام رکھتے ہیں کہ وہ انبیاء و اولیاء کی عبادت کرتے ہیں اوران کے سامنے خضوع وخشوع کرتے اور ان عزاداری کی مجالس میں گریہ وزاری کرتے ہیں، اپنے دل میں ان کی محبت کو جگہ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ہزاروں برے کام ان سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کل قیامت میں ان کی شفاعت کے مستحق ہوں گے۔ یہ مشرکوں کا عقیدہ ہے جو نیک عمل کا کبھی بھی سہارا نہیں لیتے تھے۔''[1]

جواب میں ہم کہتے ہیں کہ واضح ہے کہ ایک ملت کے عقائد کی تشریح کا معیار اس ملت کے ممتاز اور صف اول کے علماء اور دانشوروں کی تصنیفات میں، نہ اس ملت کے عوام کے عقائد۔ اس لیے کہ ہر ملت کے عوام غالباً اپنے اصلی عقائد کو کچھ اوہام وخیالات کے ساتھ مخلوط کر کے صحیح اور باطل کی ایک معجون بنا لیتے ہیں۔ اس بناء پر حق یہ تھا کہ مذکورہ مصنف حقیقت شفاعت کو ان اصلی اسلامی کتابوں میں سے جو تحریف سے محفوظ رہ گئی ہیں، اخذ کرتا اور پھر اس کے بارے میں فیصلہ کرتا۔ مزید براں یہ کہاں اور کب دیکھا گیا ہے کہ عوام میں سے کوئی ایک شخص بھی انبیاء و اولیاء کی عبادت و پرستش کرتا ہو؟ یہ کیسا افتراء ہے جو مسلمانوں پر باندھا گیا ہے!

ہم قارئین محترم سے بھی سوال کرتے ہیں کہ کیا انبیاء و اولیاء کی محبت دل میں بسانا گناہ ہے؟ کیا اولیائے خدا کے ساتھ دوستی، جو غالباً انسان کو شریعت پر عمل کرنے کی طرف چلاتی ہے اور نجات کا موجب ہوتی ہے، شرک ہے؟ کیا اولیائے خدا کی خوشی اور سرور کے ایام میں محافل جشن منعقد کر کے اظہارِ عقیدت کرنا اور ان کے ایامِ غم میں مجالس عزا اور گریہ کرنا وہ بھی صحیح پروگرام کے تحت کیا شرک ہے؟ کیا مسلمان کسی صورت میں بھی عمل صالح کا سہارا نہیں لیتے صرف اور صرف شفاعت پر امید لگائے بیٹھے ہیں؟

اس کے بعد وہ اپنے کلام کے اختتام پر لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ شفاعت کے حوالے سے شرکیہ کے عقائد سے نجات پانے کے لیے تین اصول کو مدنظر رکھنا چاہیے:

اول: خدا کی اجازت کے بغیر شفاعت محال ہے۔

دوم: خدا شفاعت کی اجازت نہیں دیتا مگر یہ کہ قولاً اور فعلاً شفاعت پانے والے سے خدا راضی ہو۔

سوم: وہ قول وفعل جس سے خدا راضی ہے عقائد شرکیہ سے دور توحید خالص اور اتباع رسولؐ اور آپؐ کی سنت پر عمل ہے۔ پس اگر مذکورہ بالا شرائط جمع نہ ہوں تو شافعین کی شفاعت بے فائدہ ہے۔''[2]

اگر آپ نے اس کتاب کی گذشتہ ابحاث خصوصاً ''شفاعت اسلامی دانشوروں کی نظر میں'' والے حصے کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ وہ تین شرائط جو اس مصنف نے شفاعت کے لیے بیان کی ہیں یہ کوئی نئی نہیں ہیں جن کا صرف موصوف نے قرآن سے استفادہ کیا ہو،

---

[1] توحید عبادت ویکتا پرستی ص ۱۳۹۔۱۴۰

[2] توحید عبادت ویکتا پرستی ص ۱۳۹۔۱۴۰

بلکہ تمام علماء نے ہمیشہ قرآن سے تمسک کر کے ان تین شرائط کا ذکر کیا ہے اور درج ذیل آیات کو اپنی بات کا شاہد قرار دیا ہے:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ [1]

''کون ہے کہ اس کی (خدا) اجازت کے بغیر شفاعت کرے۔''

وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی [2]

''وہ جن سے خدا راضی ہے ان کے علاوہ کسی اور کی شفاعت نہیں کرتے۔''

فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِیۡنَ ﴿۱۰۰﴾ [3]

''مشرکین کہیں گے کہ ہمارے لیے کوئی شفاعت کرنے والا نہیں۔''

اس کے علاوہ ان کے کلام میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ ایک اعتراض بھی ہے اس لیے کہ اس نے کہا ہے کہ ''وہ عمل جو خدا کو راضی کرنے والا ہے............اتباعِ رسولؐ اور آپ کی سنت سنیہ ہے۔''

اس صورت میں کہ اگر مبلغ تشیع کا معتقد ہو تو آئمہ معصومین کی پیروی کی اتباع رسولؐ اور آپؐ کی سنت سنیہ کے ساتھ اضافہ کرے اس لیے کہ جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ ''حدیث ثقلین'' [4] اور ''حدیث سفینہ نوح'' [5] اور دیگر بہت ساری احادیث نیز قرآن مجید [6] کے حکم سے بھی ائمہ معصومین کی اطاعت بھی رسول اکرمؐ کی اطاعت کے ہمراہ ہے اور آئمہؑ کی اطاعت کے بغیر رسولؐ خدا کی اطاعت بھی متحقق نہ ہوگی۔

اس مصنف کی تحریر کے دیگر حصے من جملہ ان میں سے یہ کہ شفاعت لوگوں کے لیے سبب غرور اور ذمہ داری کی انجام دہی سے دور بھاگنے کا موجب ہوتی ہے۔ اس کا جواب پہلے حصے میں سادہ اور مستدل بیان سے دیا گیا ہے۔ لہٰذا تکرار کی حاجت نہیں۔

اور یہ کہ وہ لکھتے ہیں:

''کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ خدا کی جانب سے اوامر و نواہی لے کر آئیں اور کہیں کہ ضرور اوامر کو انجام دو اور نواہی کو ترک

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۲۵۵

[2] سورہ انبیاء آیت ۲۸

[3] سورہ شعراء آیت ۱۰۰

[4] ''انی قارك فیكم الثقلین كتاب الله وعترتی۔''

[5] ''مثل اهل بیتی كمثل سفینة نوح من ركبها نجی ومن تركها غرق''

[6] یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ سورہ نساء آیت ۵۹

کرو، لیکن اگر ایسا نہ کیا تو میں تمہاری شفاعت کروں گا.........."[1]

اس کلام کا جواب بھی کتاب کے پہلے حصے میں "شفاعت کے تعمیری و تربیتی آثار" کے عنوان کے ذیل سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ "گناہ کرو تا کہ میں شفاعت کروں" بلکہ تمام مسلمان کہتے ہیں کہ معصوم پیشواؤں نے فرمایا ہے کہ گناہ کے نزدیک بھی مت جاؤ اور سب سے چھوٹے گناہ سے بھی بالکل پرہیز کرو، اس کے ساتھ ساتھ رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا۔

مختصر یہ کہ جب ہم شفاعت سے متعلق اس مصنف کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کے کلام کے صحیح حصے تو وہی ہیں جن کو اہل تشیع کے اکابر علماء اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں اور کوئی نئی بات اس نے بیان نہیں کی جبکہ موصوف کے باقی مطالب صحیح بنیاد ہی نہیں رکھتے۔

اس مقام پر یہ یاددہانی ضروری ہے کہ کتاب "توحید عبادت و یکتا پرستی" کا کچھ حصہ کتاب "فتح المجید" تالیف شیخ عبدالرحمن بن حسن بن محمد بن عبدالوہاب کا ترجمہ ہے جو ۱۲۸۵ھ میں انتقال کر گیا، یہ کتاب کئی بار سعودی عرب میں شائع ہو چکی ہیں لیکن افسوس کہ مذکورہ مصنف نے اس کتاب کا نام تک نہیں لیا ہے۔

۱۔ سچے شفیعوں سے شفاعت کی درخواست

ایسے سچے شفیعوں سے شفاعت کی درخواست کرنا جن کا شفیع ہونا قرآن و حدیث کے حوالے سے حتمی اور یقینی ہے کیا حکم رکھتا ہے؟

رسول اکرمؐ کے زمانے سے لے کر بعد کے زمانوں تک مسلمان سچے شفیعوں سے شفاعت کی درخواست کرتے رہے ہیں اور مسلسل ان سے حیات و ممات دونوں حالت وں میں شفاعت کی درخواست کیا کرتے تھے۔ ایسی درخواست کو اسلامی علماء میں سے کسی ایک نے بھی اسلام کے مبانی و اصول کے خلاف نہیں قرار دیا۔

یہاں تک کہ ساتویں صدی اسلامی میں ابن تیمیہ نے اس دنیا میں قدم رکھا اور ایک مخصوص طرزِ فکر سے اس مسئلے اور مسلمانوں کے درمیان رائج بہت ساری سنتوں اور اطوار کی مخالفت کی۔ اس کے چند صدیوں بعد محمد بن عبدالوہاب نجدی نے دوبارہ مخالفت کا پرچم بلند کیا اور مکتب ابن تیمیہ کو شدت کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا اور مقامی شیوخ و قبائل کی طاقت کی مدد سے اعراب نجد کے درمیان اپنے انحرافی افکار کو عام کیا لیکن سرزمین نجد اور اس کے بدوی قبائل سے ہرگز ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے باوجود کہ قبائل نجد کے شیوخ جن میں سے خاندانِ آل سعود اس کے افکار و نظریات کی برابر حمایت کرتے تھے اور ان افکار کی ترویج کے لیے انہوں نے خونریز لڑائیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ نیز دیگر اسلامی فرقوں کو کافر قرار دے کہ غارت گری بھی کرتے رہے۔ نزدیک کے علاقوں بالخصوص خطہ عراق پر کئی بار حملہ کر کے انہوں نے قتل عام کیا۔ ان تمام (حملوں اور لوٹ مار) کے باوجود محمد بن عبدالوہاب کی وفات سے جو ۱۲۰۷ یا ۱۲۰۶ میں ہوئی۔ ۱۲۴۰ ہجری قمری تک یہ افکار نجد کے صحراؤں سے آگے قدم نہ بڑھا سکے۔

---

[1] یکتا پرستی ص ۱۰۸-۱۱۶

لیکن مکہ و مدینہ پر خاندانِ سعود کے غلبہ پانے کے بعد جو ابتدا سے ہی اس مکتب کے حامی تھے، رفتہ رفتہ اس قسم کا طرزِ تفکر عسکری طاقت کے بل بوتے پر حرمین شریفین اور عرب کے دیگر خطوں میں عام ہونے لگا۔ کتابوں کے شائع ہونے اور عرب معاشرے میں عقائد وہابیت کو جگہ دینے کی وجہ سے طرزِ تفکر وہابیت کی رفتہ رفتہ نشوونما اس مکتب کی ترویج شروع کی اور مصر کے جرائد و مطبوعات میں باقاعدہ طور پر ان عقائد کا دفاع شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ ان کے عقائد مصر جو کہ افکار اور ذرائع ابلاغ کے حوالے سے بہت قوی اور مضبوط ہے، اس کی مطبوعات کے ذریعے دیگر اسلامی ممالک میں بھی پھیلنے لگے۔ فطری امر ہے کہ اس کے دوران ایران بھی اس ماجرا سے محفوظ نہ رہا اور بعض کو اپنے زیر اثر لے لیا اور استادِ ازل نے ان کو جو کہنے کا دستور دیا تھا انہوں نے بھی وہی کچھ کہا اور ان افکار کی نقل کرنے کے بعد انہیں اصل بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کیا۔

اس بنا پر راقم نے بھی اپنا فریضہ سمجھا ہے کہ شفاعت کی گفتگو کے ضمن میں فرقہ وہابی اور دیگر اسلامی مکاتب فکر کے درمیان اس مسئلہ میں موجود اختلاف کی طرف اشارہ کرے اور بالکل غیر جانب دار رہ کر علمی نکتہ نگاہ سے مسئلے کی تحقیق کرے۔

دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ وہابیوں کے اختلافات میں سے ایک اختلافی نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے مسلمانوں کی طرح شفاعت کو ایک اسلامی اصول کے عنوان سے مانا تو ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ قیامت کے دن شفیع امت کے گناہ گار افراد کی شفاعت کریں گے۔ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ ''ہمیں ہرگز حق نہیں پہنچتا ہے کہ اس جہان میں ان سے شفاعت طلب کریں۔ اس مسئلہ میں ان کی گستاخی کا یہ عالم ہے کہ قلم کی عفت ان کی باتیں نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ آپ کی نظروں کے حوالے کیے دیتے ہیں:

قیامت کے دن پیغمبر اسلامؐ، دیگر انبیائؑ، فرشتے اور اولیاء کو شفاعت کا حق تو ہے، لیکن شفاعت کو اس کے اصلی مالک اور اس کی اجازت دینے والے سے ہی طلب کیا جائے جو کہ خدا ہے اور یوں کہنا چاہیے:

''اے خدا! پیغمبرؐ اور اپنے دیگر صالح بندوں کو قیامت کے دن ہمارے شفیع قرار دے، لیکن ہم کو حق نہیں ہے کہ کہیں: اے خدا کے پیغمبرؐ تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے حق میں شفاعت فرما، اس لیے کہ شفاعت ایک ایسی چیز ہے جو صرف خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اگر ایسی چیز پیغمبر سے برزخ میں طلب کی تو مشرک ہو جائیں گے۔[1]

وہابیوں نے اولہ خمسہ کے ذریعے سچے شفیعوں سے شفاعت طلب کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ شفاعت کی درخواست کرنے والے

---

[1] رسالہ دوم ''الہدیۃ السنیۃ''، ص ۴۲ کی عبارت کا متن ایسا ہے۔ پیغمبرؐ اور اولیاء کے لیے شفاعت کے مقام کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ کہنا چاہیے: "اللهم شفيع نبينا محمدا فينا يوم القيامة اواللهم شفيع فيناعبادك الصالحين اور ملائكتك اونحو ذالك مما يطلب من الله لا منهم فلايقال يا رسول الله اويأولى الله اسالك الشافعة اوغيرها ممالا يقدر عليه الا الله فاذا طلب ذالك في ايام البرزخ كان من اقسام الشرك۔"

کو شرک اور اس کے عمل کو شرک قرار دیتے ہیں۔

ہم ان کی ادلہ کی تحقیق سے پہلے خود مسئلہ کو کتاب وسنت اور عقل کی روشنی میں زیر بحث لاتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہم اس گفتگو میں غلط خیالات سے محفوظ رکھے۔

۲۔ اولیائے خدا سے شفاعت طلب کرنے کے جواز پر ادلہ

۱۔ شفاعت کی درخواست وہی دعا کی درخواست ہے۔

پیغمبر اکرمؐ اور دیگر سچے شفیعوں کی شفاعت بارگاہِ الٰہی میں ان کے دعا کرنے کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں۔ اس مقام ومنزلت کے بدلے جو خدا کی بارگاہ میں ان کو حاصل ہے، (اس بناء پر) اس دعا کے نتیجے میں جو وہ گناہ گاروں کے حق میں کرتے ہیں خدائے مہربان اپنا وسیع لطف وکرم گناہ گار بندوں کے شامل حال کرتا ہے اور ان کو بخش دیتا ہے۔ مومن بھائی سے دعا کے لیے درخواست کرنا بھی ایک پسندیدہ امر ہے چہ جائیکہ نبی اکرمؐ سے ایسی استدعا کی جائے۔ اس کی صحت پر تو علمائے اسلام میں سے کسی ایک حتی کہ خود وہابیوں نے بھی شک نہیں کیا ہے۔

البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ محشر کے تمام مرحلوں میں حقیقت شفاعت بارگاہ الٰہی میں دعا ہی ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے واضح معنی میں سے ایک دعا ہی ہے اور وہ لوگ جو کہتے ہیں:

"یا وجیها عند الله اشفع لنا عند الله"

''اے وہ کہ جس کو خدا کی بارگاہ میں مقام ومرتبہ حاصل ہے، خدا کے حضور ہمارے حق میں شفاعت فرما۔''

وہ یہی معنی مراد لیتے ہیں:

نظام الدین نیشاپوری آیت وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا [1] کی تفسیر مقاتل سے یوں نقل کرتے ہیں کہ شفاعت درحقیقت مسلمان کے لیے دعا کرنا ہی ہے۔

رسول اکرمؐ سے منقول ہے کہ جو شخص بھی اپنے مسلمان بھائی کے لیے اس کے پیچھے دعا کرے تو وہ دعا مستجاب ہوگی اور ایک فرشتہ کہے گا کہ تمہارے لیے بھی ایسا ہی ہوگا۔

ابن تیمیہ ان افراد میں سے ہے جو زندہ شخص سے دعا کی درخواست کو صحیح مانتے ہیں۔ اس بنا پر شفاعت کی درخواست پیغمبر اور اولیاء سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وہ مومن جس کی بارگاہِ خدا میں قدر ومنزلت ہے، اس سے ایسی درخواست کی جا سکتی ہے۔

فخر رازی بھی ان افراد میں سے ہیں کہ جنہوں نے شفاعت کی تفسیر بارگاہِ الٰہی میں دعا و ستائش کے ساتھ کی ہے۔ وہ آیت

---

[1] سورہ نساء آیت ۸۵۔ عبارت مقاتل یہ ہے "الشفاعة الا الله انما هي الدعوة لمسلم"

"ويستغفرون للذين امنوا ربنا وسعت كل شيء رحمة" [۱] کی تفسیر میں کہتے ہیں: یہ آیت گواہی دیتی ہے کہ حاملانِ عرش کی شفاعت صرف گناہ گاروں کے بارے میں ہے۔[۲] اسی طرح پیغمبرؐ اور دیگر انبیاء کی شفاعت بھی انہی افراد کے بارے میں ہے کیونکہ خدا پیغمبرؐ سے یہ فرماتا ہے:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ [۳]

''اپنے اور صاحبان ایمان بندوں کے گناہوں کے بارے میں مغفرت طلب کرو۔''

حضرت نوحؑ نے اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے، ان لوگوں کے لیے جو آپ پر ایمان لائے اور قیامت تک آنے والے تمام مومنوں کے لیے مغفرت طلب کی۔ شفاعت سے متعلق اپنی رسالت کو انہوں نے اس طرح پورا کیا ہے۔[۴]

فخر رازی کا یہ بیان اس بات کا گواہ ہے کہ انہوں نے شفاعت کو گناہ گار کے حق میں شفیع کی دعا ہی قرار دیا ہے اور شفاعت کی درخواست کو دعا کی درخواست ہی سمجھا ہے۔

اسلامی احادیث میں اس بات پر واضح اشارات ملتے ہیں کہ مسلمان کے حق میں مسلمان کی دعا شفاعت ہے۔

ابن عباسؓ پیغمبر اسلامؐ سے نقل کرتے ہیں:

"ما من رجل مسلم يموت فيقوم على جنازته اربعون رجلا لايشركون بالله شيئا الله شفعهم الله فيه"

''جب بھی کوئی مسلمان مرجائے اور اس کے جنازے پر چالیس افراد جو شرک نہ کرتے ہوں نماز پڑھ لیں تو خدا اس کے حق میں ان کی شفاعت (دعا) کو قبول فرماتا ہے۔''[۵]

اس حدیث میں دعا کرنے والے کا تعارف شفیع کے عنوان سے ہوا ہے۔ ایک اور حدیث میں یوں فرماتے ہیں: جب بھی سوا افراد کسی

---

[۱] حاملانِ عرش صاحب ان ایمان کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا تیری رحمت ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (سورۂ مومن آیت ۷)

[۲] کیونکہ آیت کا آخر "وقهم عذاب الجحيم" ہے (ان کو عذاب جہنم سے محفوظ رکھ)

[۳] سورہ محمد آیت ۱۹

[۴] سورہ نوح آیت ۲۸

[۵] صحیح مسلم جلد ۳ ص ۵۴

جنازے پر نماز پڑھ لیں اور وہ اس میت کے حق میں شفاعت کریں (دعا کریں) تو خدا ان کی شفاعت قبول فرماتا ہے۔[1]

اب اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے چالیس باوفا دوستوں سے کہہ دے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے جنازے پر نماز پڑھنے کے لیے آجائیں اور اس کے حق میں دعا کریں تو درحقیقت اس نے اپنے دوستوں سے شفاعت طلب کی اور خدا کے بندوں کی شفاعت کے لیے مقدمہ (جواز) فراہم کیا ہے۔

۳۔اسلامی احادیث اور صحابہؓ کی سیرت

معروف محدث ترمذی جو کہ اہل سنت کی صحاح ستہ میں سے ایک کے مصنف ہیں، وہ انسؓ سے روایت کرتے ہیں:

"سالت النبی ان یشفع لی یوم القیامة فقال انا فاعل قلت فاین اطلبك فقال علی الصراط......"[2]

''انسؓ کہتے ہیں: میں نے پیغمبر اکرمؐ سے یہ درخواست کی کہ قیامت کے دن میرے حق میں شفاعت فرمائیں۔ آپؐ نے قبول فرمالیا اور ارشاد فرمایا کہ شفاعت کروں گا (تو) میں نے عرض کی ''میں آپ کو کہاں پاؤں گا؟'' فرمایا ''صراط'' کے کنارے............''

انسؓ پیغمبر اکرمؐ سے شفاعت کی درخواست کرتے ہیں اور آپ اسے قبول فرمالیتے ہیں۔انس کے ذہن میں ہرگز ایسا اعتراض نہیں آیا اور رسولِ اکرمؐ بھی نہ صرف اسے اس بات سے منع نہیں فرماتے بلکہ اسے عمل کی نوید سناتے ہیں۔

سوادؓ بن عازت اصحاب رسولؐ میں سے ہیں وہ کچھ اشعار کے ضمن میں حضورؐ سے شفاعت کی درخواست کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

فکن لی شفیعا یوم لا ذوشفاعة
بمغن فتیلا عن سواد بن عازب

''اے رسولِ گرامیؐ! قیامت کے دن میرے شفیع بن جائیے جس دن دوسروں کی شفاعت مجھ (سواد بن عازب) کی حالت زار کے لیے مفید اور سود مند نہ ہو سکے گی۔''

قبیلہ حمیر کا ایک شخص جس کا نام ''تبع'' تھا رسولِ اکرمؐ کی ولادت سے پہلے سن چکا تھا کہ عنقریب خدا کی جانب سے ایک پیغمبر سرزمین عرب میں مبعوث ہوگا۔اس نے اپنی موت سے پہلے ایک خط تحریر کر لیا اور اپنے عزیزوں سے درخواست کی کہ اگر ایک دن ایسا پیغمبر مبعوث رسالت ہو جائے تو میرا خط ان تک پہنچا دینا۔اس خط میں یہ تحریر تھا:

---

[1] صحیح مسلم جلد ۳ ص ۵۳

[2] کشف الارتیاب ص ۲۶۳ نقل از سنن ترمذی

"وان لم اورکك فاشفع لی یوم القیمة ولاتنسنی"

''اگر میری عمر وفا نہ کرے اور آپ کو پانے سے پہلے موت آ جائے تو آخرت میں میرے حق میں شفاعت فرمایئے گا اور مجھ کو فراموش نہ کیجیے گا۔''

جب یہ خط رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا:

"مرحبا بتبع الاخ الصالح"

''آفرین ہو میرے نیک بھائی تبع پر۔''

اگر پیغمبرِ اکرمؐ سے شفاعت کی درخواست شرک ہوتی تو پیغمبرؐ سے ہرگز اپنا بھائی قرار نہ دیتے اور تین مرتبہ اس کی تعریف نہ کرتے۔

ابن تیمیہ جو سچے شفیعوں سے شفاعت کی درخواست کو شدت سے جھٹلاتے ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''زیارۃ القبور'' میں پیغمبرِ اکرمؐ سے ایک حدیث درج ذیل شرح کے ساتھ نقل کی ہے:

ایک اعرابی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ''روح نکلنے کے قریب ہے اور بھوک نے ہمیں مار ڈالا ہے، ہمارے جانور نابود ہو چکے ہیں۔'' اس کے بعد یہ دو جملے کہے:

۱۔ "فادع لنا فانا نستشفع بالله علیك"

''میں خدا کو تیرے ہاں شفیع قرار دیتا ہوں۔''

۲۔ وبك علی الله"

''اور تجھے بھی خدا کی بارگاہ میں اپنا شفیع قرار دیتا ہوں۔''

پیغمبرِ اکرمؐ نے اس کے دونوں جملوں میں سے صرف پہلے جملے کو غلط قرار دیا کیونکہ یہ کوئی معنی نہیں رکھتا کہ خدا کو پیغمبرؐ کے حضور شفیع قرار دیا جائے اس لیے کہ خدا ہرگز اپنے بندوں سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا تا کہ ایک انسان کے پاس دوسرے انسان کے لیے شفیع بن جائے اس لیے کہ شفیع ہونے کے معنی دوسرے سے التجا و درخواست کرنے کے ہیں، بلکہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی چاہیے کہ مخلوق اس کی بارگاہ میں خدا ہی کو شفیع قرار دیں۔ اس بناء پر پیغمبرِ اکرمؐ نے تسبیح کے بعد یوں ارشاد فرمایا:

"ویحك ان الله لا یستشفع به علی احد من خلقه شان الله اعظم من ذالك"[1]

''تف ہو تجھ پر، خدا کی شان اس سے بالا ہے کہ اسے کسی (مخلوق) کے سامنے شفیع قرار دیا جائے۔''

---

[1] زیارۃ القبور ص ۱۵۵

اس بیان سے استفادہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف پہلے جملے کو غلط قرار دیا ہے جبکہ دوسرے جملے کو کہ جس میں درخواست کی تھی کہ اس کے حق میں شفاعت فرمائیں صحیح اور حکم قرار دیا ہے۔

احمد بن حنبلؒ اور ترمذیؒ دونوں مشہور محدثین نے ''عثمان بن حنیف'' نامی صحابی سے روایت کی ہے کہ ایک شخص جو آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا تھا سرکار دو عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعا کی درخواست کر کے آنحضرتؐ سے یوں عرض کرنے لگا:

"ادع الله ان يعافيني"

''خدا سے دعا کیجیے وہ مجھے تندرستی عطا کرے۔''

پیغمبر اکرمؐ نے اسے دعا اور آزمائش کے وقت صبر کرنے میں مخیر قرار دیا۔

پیغمبر اکرمؐ نے اسے حکم دیا کہ صحیح وضو کرے اور مخصوص دعا کے ذریعے خدا کو پکارے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ یوں اس کی پریشانیاں برطرف ہو گئیں۔[۱]

اگر پیغمبرؐ سے دعا طلب کرنا جائز نہ ہوتا تو رسول اکرمؐ اعرابی کی باتوں پر سکوت فرماتے۔

اس قسم کی احادیث سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کے صحابی آپؐ کی رحلت کے بعد آپ کی پاک روح سے شفاعت طلب کیا کرتے تھے۔ نمونے کے طور پر:

۱۔ جب امیر المومنین حضرت علی پیغمبر اکرمؐ کے غسل وکفن سے فارغ ہوئے تو آپؐ کے چہرہ مبارک سے کفن ہٹا کر عرض کیا:

"بابي انت و امي طبت حيا و طبت ميتا...... واذكر عند ربك......"[۲]

''میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں پاک و پاکیزہ تھے۔ اپنے پروردگار کے ہاں ہمیں یاد فرمائیے گا۔''

۲۔ جس وقت رسولِ اکرمؐ رحلت فرما گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے آ کر آپؐ کا چہرۂ مبارک کھولا اور بوسے دے کر کہا: ''میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ آپؐ موت اور زندگی دونوں حال میں پاک و پاکیزہ تھے۔ اپنے پروردگار کے حضور ہماری یاد فرمائیے اور ہمیں یاد رکھیے۔[۳]

کشف الارتیاب کے مولف ص ۲۶۵ پر زرقانی سے شرح مواہب سے نقل کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی دعا کے وقت یہ کہے:

---

[۱] مسند احمد ج ۴ ص ۱۳۸، صحیح ترمذی کتاب دعوت ص ۱۱۸

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۲۳۰ طعبدہ

[۳] کشف الاتیاب دعوت ص ۱۱۸۔ خلاصۃ الکلام سے نقل کیا گیا ہے۔

"اللهم انی استشفع بنبیك یا نبی الرحمة اشفع علی عند ربك"

''پروردگار! میں تیرے پیغمبرؐ کو اپنا شفیع قرار دیتا ہوں۔ اے پیغمبر رحمتؐ میرے حق میں اپنے پروردگار کے حضور شفاعت فرما۔''

تو ایسے شخص کی دعا قبول ہوتی ہے۔

یہ سب اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ طلب شفاعت کے حوالے سے شفیع کی حیات و موت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ''نعوذ باللہ'' کسی شفیع سے اس کی موت کی حالت میں شفاعت کی درخواست شرک ہو تو ایسی صورت میں حیات کے وقت بھی شرک شمار ہونا چاہیے۔ اس مسئلہ میں شفیع کی حیات اور اس کی موت کوئی اثر نہیں رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں اسلام کے اکابر علماء زیارت پیغمبر اکرمؐ کے آداب سے متعلق کتب میں یہ تذکرہ کرتے ہیں کہ ہم کہیں:

"جئناك لقضاء حقك...... والاستشفاع بك فليس لنا يارسول الله شفيع غيرك فاستغفر لنا و اشفع لنا"

''اے خدا کے پیغمبرؐ! ہم آپ کی زیارت کو آئے ہیں تا کہ آپ کا حق ادا کریں اور آپ سے شفاعت طلب کریں۔ یارسول اللہ آپ کے سوا کوئی ہمارا کوئی شفیع نہیں جو ہمارے حق میں شفاعت کرے۔''

ان آیات و روایات پر توجہ دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ سے شفاعت کی درخواست کا مسئلہ ایک جاری سنت اور ایک بدیہی مسئلہ کی صورت میں رہا ہے جس کے بارے میں ہرگز شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب کے آخر میں آپ پڑھیں گے کہ حضورؐ کی رحلت کے بعد صحابہ نے دعا کی درخواست کی ہے۔ اگر آپ کی رحلت کے بعد دعا کی درخواست کرنا صحیح ہے تو پھر طلب شفاعت کرنا جو کہ دعا کی درخواست کرنے کی ایک قسم ہے یہ بھی صحیح ہوگی۔

۳۔ قرآن اور طلب شفاعت

قرآنی آیات گواہی دیتی ہیں کہ لوگوں کے حق میں پیغمبر اکرمؐ کا مغفرت طلب کرنا بالکل موثر اور مفید ہے۔ جیسے درج ذیل آیات بتلا رہی ہیں:

۱۔ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ [1]

''اپنے اور صاحبانِ ایمان کے گناہوں کی بخشش کے لیے طلب مغفرت کریں۔''

---

[1] سورہ محمد آیت ۱۹

۲۔ وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ ؕ [1]

''ان کے حق میں دعا کیجیے کیونکہ آپ کی دعا ان کے لیے باعث سکون ہے۔''

جب پیغمبرؐ کی دعا انسانوں کے لیے اس طرح کا فائدہ رکھتی ہے تو کیا مانع ہے کہ آپؐ کو کسی انسان کے حق میں دعا کرنے کے لیے پکارا جائے۔ دعا کی درخواست بھی درخواست شفاعت کے سوا کوئی اور شے نہیں ہے۔

۳۔ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۶۴﴾ [2]

''اگر وہ اپنے نفسوں پر ظلم کر کے تمہارے پاس حاضر ہوتے ہیں اور خدا سے طلب مغفرت کرتے اور پیغمبرؐ بھی ان کے حق میں استغفار کرتے تو خدا کو توبہ قبول کرنے والا رحیم پاتے۔''

یہ جو فرمایا ہے ''جاء وك'' (وہ تمہاری طرف آتے) اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آئیں اور پیغمبرؐ سے دعا اور مغفرت کی درخواست کریں۔ اگر یہ مراد نہ ہوتا تو ان کا آپ کے پاس حاضر ہونا فضول تھا۔ پس حضورؐ کی خدمت میں شرفیاب ہونا اور آپؐ سے درخواست کرنا ہی روحانی انقلاب کی دلیل ہے جو دعا کی قبولیت کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔

یہ آیات آشکارا طور پر گواہی دیتی ہیں کہ اگر گناہ گار افراد، جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں اور آپؐ سے درخواست کریں کہ ان کے حق میں دعا اور بخشش طلب کریں تو اس صورت میں خدا ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔

اس آیت کے حکم کے مطابق مناسب ہے کہ گناہ گار لوگ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپؐ سے اپنے حق میں دعا اور طلب مغفرت کی درخواست کریں۔ پیغمبرؐ سے دعا کے لیے کہنا شفاعت کی درخواست کے سوا اور کوئی شے نہیں پہلے عرض کیا گیا کہ حقیقت شفاعت یا اس کا کچھ حصہ پیغمبرؐ اور دیگر سچے شفیعوں سے دعا کی درخواست کرنا ہی ہے۔

اگر پیغمبرؐ سے شفاعت کے لیے درخواست کرنا واقعاً شرک اور گناہ ہوتا تو خدا ایسا دستور نہ دیتا۔

۴۔ قرآن مجید فرزندانِ یعقوبؑ سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے درخواست کی کہ وہ ان کے حق میں طلب مغفرت کریں۔ حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کی درخواست قبول کی اور اپنے وعدے پر عمل فرمایا [3]۔

---

[1] سورہ توبہ آیت ۱۰۳

[2] سورہ نساء آیت ۶۴

[3] سورہ یوسف آیت ۹۷: قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـئِيۡنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّيۡ ؕ ''کہا ابا جان! ہمارے حق میں بخشش طلب کریں ہم خطاء کار تھے۔ انہوں نے بھی کہا عنقریب تمہارے میں طلب مغفرت کروں گا۔

یہ سب آیات بتلا رہی ہیں کہ پیغمبرؐ اور دیگر صالح بندوں سے دعا کے لیے کہنا اسلامی اصولوں کے حوالے سے ادنیٰ سا اعتراض بھی نہیں رکھتا۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ یہ آیات اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ حیاتِ پیغمبرؐ میں آپؐ سے شفاعت کی درخواست کی جا سکتی ہے جب کہ ہماری گفتگو آپؐ کی رحلت کے بعد والے مسئلے سے مربوط ہے تو لازم ہے کہ توجہ دی جائے کہ ان آیات سے استدلال کا ہدف یہ ہے کہ ہم ثابت کریں کہ پیغمبر اور دیگر اولیائے خدا سے ایسی درخواست کرنا شرک اور مبانی اسلام کے خلاف نہیں ہے۔

کیونکہ اگر شرک ہوتا تو حیات و ممات سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ البتہ یہ کہ ایک مردہ سے شفاعت طلب کرنا کیا فائدہ رکھتا ہے، یہ ایک الگ سوال ہے کہ ہم وہابیوں کے استدلالات کے بیان کے دوران اس کا جواب بھی دیں گے۔

خود صحیح بخاری میں ایک باب اس عنوان سے موجود ہے کہ

"اذا استشفعوا الی الامام لیستسقی لھم لھم یردھم"

''جب لوگ خود امام سے شفاعت کی درخواست کریں کہ ان کے لیے بارش طلب کریں تو ان کی درخواست مسترد نہیں کرنا چاہیے۔''

نیز ایک اور باب

"اذا ستشفع المشرکون بالمسلمین عند القحط"[1]

''جس وقت مشرکین قحط کے موقع پر مسلمانوں سے شفاعت طلب کریں'' کے نام سے موجود ہے۔

۳۔ شفاعت کو حرام سمجھنے والوں کی دلیلیں

اب وقت آچکا ہے کہ ہم مخالف کی دلیلوں کا غور سے مطالعہ کریں۔ انہوں نے مختلف دلیلوں سے شفیعوں سے اس دنیا میں شفاعت کی درخواست کو حرام قرار دیا ہے۔ ان کی دلیلیں یہ ہیں:

شفاعت کی درخواست شرک ہے

انبیاء و اولیائے خدا دنیا میں شفاعت کا حق نہیں رکھتے ہیں، بلکہ یہ حق ان کے لیے صرف آخرت میں حاصل ہے جو شخص بھی خدا کے بندوں میں سے کسی بندے کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دے اور اس کو پکارے کہ وہ اس کے حق میں شفاعت کرے تو یہ شخص عبادت

---

[1] ان دونوں ابواب کی روایات گواہی دیتی ہیں کہ مسلمانوں کا طریقہ یہ تھا کہ مخصوص مواقع پر امام یا دیگر مسلمانوں کے پاس آتے اور ان سے درخواست کرتے کہ وہ خدا سے ان کے لیے بارانِ رحمت طلب کریں۔ ایسی درخواست کا نام سوائے طلب شفاعت کے اور کچھ نہیں۔ صحیح بخاری چاپ ۱۳۱۴ ج ۲ ص ۲۹-۳۰ پر مراجع فرمائیں۔

میں شرک کے گناہ میں مبتلا ہوا ہے۔

ہم کو چاہیے کہ کہیں "الھم اجعلنا ممن تنالہ شفاعۃ محمد" اے خدا! ہم کو ان لوگوں میں سے قرار دے جن کو محمدؐ کی شفاعت نصیب ہوگی۔ ہمیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کہیں:

"یا محمد اشفع لنا عنداللہ"

''اے محمدؐ آپ ہمارے میں عنداللہ شفاعت فرمائیے۔''

درست ہے کہ خدا نے پیغمبر اکرمؐ کو حق شفاعت عطا کیا ہے، لیکن ہم کو بھی ان سے شفاعت طلب کرنے سے منع کیا ہے بلکہ ہم کو چاہیے کہ شفاعت فقط خدا سے طلب کریں جس نے آپؐ کو شفاعت کا حق عطا کیا ہے۔

جواب

''عبادت میں توحید'' بمقابلہ ''پرستش میں شرک'' ارکانِ توحید میں سے ایک ہے جس کی طرف قرآن میں خاطر خواہ اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن جانِ کلام یہ ہے کہ کیا ہر طرح کی دعوت، کسی کو پکارنا اور اس سے کوئی چیز طلب کرنا عبادت اور پرستش ہے یا یہ کہ پرستش کے کچھ خاص معنی ہیں جو کہ اس دعوت اور طلب کو کہتے ہیں جو انتہائی ذلت و خضوع کے ساتھ اس شخص سے ہو کہ جس کو وہ پکارنے اور خضوع کرنے والا دنیا و آخرت کے امور میں فاعل مختار اور بے منازع تصرف کرنے والا سمجھتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے سے اس شکل میں کوئی چیز طلب کرے تو کہا جاتا ہے کہ اس شخص نے اس کی پرستش کی ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ ''لفظ عبادت'' عربی زبان میں خضوع و اطاعت اور ذلت و انقیاد کے معنی میں ہے مگر بنا کہے یہ واضح ہے کہ ہر قسم کے خضوع و اطاعت کو شرک نہیں کہتے، کیونکہ اس کلام کا لازمہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے آج تک کے تمام انسان مشرک اور کافر ہوں اس لیے کہ ہر شخص نے اپنی زندگی میں اپنے سے بلند مقام والے کے لیے خضوع کیا اور اس کی اطاعت کی ہے۔ مسلسل ہر زمانے میں اولاد، ملازمین، مزدور اور سپاہی، باپ، سردار، مالک اور کمانڈر کے مطیع رہے ہیں اور ان کے سامنے خضوع کرتے رہے ہیں۔

خدا نے حکم دیا ہے کہ اولاد والدین کے لیے اپنی طرف سے کمال خضوع و انکساری کا مظاہرہ کرے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاخۡفِضۡ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحۡمَةِ[1]

اسی طرح خدا نے عورتوں پر ان کے شوہروں کی اطاعت واجب کر دی ہے، یہاں تک کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:[2] اگر ایک شخص شوہروں کو سجدہ کریں۔

---

[1] سورہ اسراء آیت ۲۴

[2] لو امرت احداً بالسجود والاحد لامرت الزوجۃ بالسجود لزوجھا

خدا نے حکم دے رکھا ہے کہ ہم رسولؐ اور فرماں رواؤں کی اطاعت کریں۔ خدا نے ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ہی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ [1]

''خدا، رسولؐ اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو۔''

بنابریں ہم کو حق حاصل نہیں کہ کسی انسان کے سامنے ہر قسم کے خضوع اور اس کی اطاعت کو عبادت یا پرستش کا نام دیں۔ یا کسی انسان سے کسی بھی چیز کی درخواست یا پکارنے کو اس کی پرستش قرار دیں بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عبادت کے معنی اپنی حاجت روائی کے لیے کسی کو دنیاوی اور اخروی امور میں فاعل علی الاطلاق سمجھ کر انتہائی انکساری اور خضوع کے ساتھ درخواست کرنا ہے۔ جب بھی کسی شخص سے اس طرح کوئی چیز طلب کی جائے اور وہ شخص غیر خدا ہو تو ایسا کام شرک اور دوگانگی ہوگا۔

البتہ بعض دفعہ لسانِ شرع میں بطور مجاز اور مبالغہ کے عنوان سے کسی کی مطلق پیروی کرنے اور اس کی مطلق اطاعت کرنے کو عبادت اور پرستش کہا گیا ہے۔ مثلاً

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ [2]

''کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے، کیا تم اس پر وکیل ہو؟''

اس آیت میں خواہشات نفس کی اطاعت کو ایک طرح کی خواہش پرستی کہا گیا ہے۔ گویا خواہشاتِ نفس انسان کا معبود اور خود وہ ان کا پوجنے والا عابد ہے۔

قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کی مذمت کرتا ہے کہ وہ اپنے علماء اور راہبوں کو خدا قرار دیتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ [3]

''انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو خدا قرار دیا ہے۔''

یہ بات بن کہے واضح ہے کہ عیسائی معاشرہ ہرگز ان دو گروہوں کی پرستش نہیں کرتا تھا بلکہ ان کے دستور کی بلاچوں و چرا پیروی کرتا تھا۔ قرآن نے ایسی اطاعت و پیروی کو ان کی پرستش اور خود ان کو (احبار ور ہبان کو) بعنوان رب متعارف کروایا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ:

---

[1] سورہ نساء آیت ۵۹

[2] سورہ فرقان آیت ۴۳

[3] سورہ توبہ آیت ۳۱

"من اصغی الی ناطق فقد عبده فان کان ینطق عن الله فقد عبد الله و ان
کان ینطق عن غیر الله فقد عبد غیر الله"[1]

''جو بھی کسی کہنے والے کی بات پر کان دھرے اور اس کی پرستش کرے، پس اگر وہ متکلم خدا کی بات کر رہا ہو تو
اس سننے والے نے خدا کی عبادت کی اور اگر غیر خدا کی بات کر رہا ہو تو اس نے غیر خدا کی پرستش کی۔''

واضح ہے کہ اس طرح کی تعبیرات ایک قسم کی مجاز گوئی اور مطلب کی اہمیت بتانے کے لیے مبالغہ کے طور پر ہیں۔ عبادت کے حقیقی معنی جو شرک و توحید کا معیار ہے، یہ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ عرف عام میں ان افراد کو جو جنسی جذبات یا کھانے پینے میں افراط سے کام لیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ فلاں شہوت پرست ہے یا پیٹ کا پجاری ہے۔ بعینہٖ یہی تعبیر عربی زبان میں بھی موجود ہے۔ کہا جاتا ہے: ''عبد الشهوة، عبد البطن''

بناء بریں عبادت کے حقیقی معنی وہ کام ہے جسے غیر خدا کے لیے انجام دینا حرام ہے جو اس کا مجازی معنی ہے وہ غیر خدا کے لیے عبادت کے حرام ہونے کے دائرے سے خارج ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ مطلق خضوع اور احترام پر پرستش نہیں بلکہ انتہائی انکساری کے ہمراہ لازم ہے کہ عمل بھی اس طرح ہو کہ خضوع کرنے والا اس کو دنیا و آخرت کے کاموں کا حقیقی مالک سمجھے۔ یہی ہے کہ خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے لیے سجدہ کریں۔ اسی طرح حضرت یعقوبؑ نے اپنی اہلیہ اور بیٹوں کو لے کر یوسفؑ کے لیے سجدہ کیا۔ اگر حقیقت مطلق خضوع، یہاں تک کہ سجدے کی شکل میں بھی پرستش ہوتا تو خدا فرشتوں کو ہرگز حکم نہ دیتا کہ ایسے شرک و کفر کے مرتکب ہو جائیں، حضرت یوسفؑ جیسا معصوم نبی ہرگز اسے انجام نہ دیتا اس لیے کہ خدا کی ذات مقدس اور انبیاء اس سے منزہ تر ہیں کہ قبیح کام کرنے کا حکم دیں یا خود اس کے مرتکب ہوں۔

ہاں اسلام کے مقدس آئین میں کسی شخص کے لیے بھی سجدہ حتی کہ مثلاً حضرت یعقوبؑ کا سجدہ حضرت یوسفؑ کے لیے جائز نہیں اور یہ ممانعت اس بنا پر نہیں ہے کہ کفر و شرک ہے بلکہ یہ شرک نہ ہونے کے باوجود کسی اور سبب کی خاطر حرام قرار دیا گیا ہے۔

لفظ دعا کی داستان بھی بالکل کلمہ عبادت کی طرح ہے۔ ہم سب کو علم ہے کہ دعا کے حقیقی معنی پکارنے کے ہیں۔ کبھی بھی کسی شخص کو ایک کام کے انجام دینے کی خاطر پکارنا حرام نہیں ہے، بلکہ حیات انسان کی بنیاد ہی تعاون، اشتراک عمل اور ایک دوسرے سے مدد کی درخواست پر رکھی گئی ہے۔

مگر یہی لفظ بعض دفعہ ایک خاص معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک شخص کو اس خیال سے انتہائی انکساری کے ساتھ پکارنا کہ وہ دنیا و آخرت کے امور کا مالک اور جہانِ آفرینش کا فاعل کل ہے۔ یقینی طور پر کسی شخص سے کام کے لیے اس طرح درخواست کرنا عبادت کی صورت و شکل اختیار کرتا ہے اور یہ حرام ہے۔

---

[1] سفینۃ البحار مادہ ''عبد''

قرآن مجید اور اسلامی احادیث میں بعض دفعہ لفظ دعا کو جو کہ وسیع معنی رکھتا ہے، صرف عبادت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ [1]

''مجھے پکارو تا کہ تمہاری پکار کا جواب دوں۔ وہ لوگ جو میری عبادت کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور تکبر کرتے ہیں وہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ ''الدعاء مخ العبادة'' دعا عبادت کا مغز اور اس کی روح ہے۔ ان دو ابحاث کا نتیجہ یہ نکلا کہ کلمہ عبادت کے حقیقی معنی پرستش کے ہیں اور کبھی دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، لہٰذا اس مورد میں یہ بہانہ بنا کر کہ لفظ عبادت استعمال ہوا ہے، اسے ہرگز حرام نہیں کہنا چاہیے۔

لفظ دعا و مغفرت لفظ عبادت کے برعکس ہے۔ یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو کہ شرعاً جائز بھی ہے لیکن کبھی کبھار یہ ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے جو عبادت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

اس بیان کے ملاحظے سے اعتراض کا جواب واضح ہو گیا، اس لیے کہ توحید کئی اقسام رکھتی ہے۔ ان میں سے تین قسموں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ توحید ذات

خدا کی ذات مقدس ایسی ہے کہ جس کا کوئی شریک و ہمتا نہیں۔ اس کے مقابلے میں خدا کے دو ہونے کا عقیدہ ہے جو کہ ذات میں شرک کہلاتا ہے۔

۲۔ توحید افعال

یہ کہ کائنات کا حقیقی موثر ایک ہی ہے اور ہر موجود جو خصوصیت و اثر بھی رکھتا ہے وہ خدا کا عطا کردہ ہے۔ آگ کا جلانا، شمشیر کا کاٹنا، خورشید کی درخشانی، گل کی زیبائی، دواؤں کا اثر بخشنا............ سب خدا کی جانب سے اور اس کے فرمان کی بنا پر ہیں۔

کائنات میں کوئی بھی موجود اپنے کام میں مستقل نہیں۔ تمام خدا سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ ساری کائنات میں مستقل تاثیر خدا کی ذات پاک کو حاصل ہے یہاں تک کہ انسان بھی جو کہ اپنے کاموں اور دیگر سرگرمیوں میں اختیار رکھتا ہے، ہر کام کے انجام دینے کی طاقت خدا ہی

[1] سورہ مومن آیت ٦٠

سے لیتا ہے۔

۳۔توحید عبادت

یہ ہے کہ ہم سوائے خدا کی ذات کے کسی اور کو عبادت اور پرستش کا اہل نہ سمجھیں۔ کائنات کے موجودات میں سے ہر ایک پتھر، لکڑی، ماہ وخورشید، جاندار اور انسان یہاں تک کہ انبیاء واولیاء جو کائنات میں کمال کے اعلیٰ ترین مظہر ہیں، بندگی اور پرستش کے اہل نہیں ہیں کیونکہ پرستش کی حد تک خضوع کا معیار اور علت وہی کمال ذاتی ہے جو صرف خدا کے لیے ثابت ہے۔ اس کے سوا کوئی موجود ذاتی کمال نہیں رکھتا بلکہ ہر چیز جو کچھ رکھتی ہے وہ خدا کی جانب سے عطا ہوا ہے۔

اس اصول پر توجہ کے ساتھ ہم حقیقت شفاعت یا اولیائے خدا سے درخواست شفاعت کے بارے میں کچھ تحقیق کریں گے۔ قیامت میں حقیقت شفاعت اس کے سوا نہیں کہ خدا کا فیض اور اس کی وسیع رحمت اولیائے خدا کے ذریعے گناہ گار بندوں تک پہنچے۔ جس طرح اس جہان میں خدا کا مادی فیض کچھ علل وطبیعی اسباب کے ذریعے انسانوں تک پہنچتا ہے اسی طرح مغفرت وبخشش جو کہ قیامت میں بندوں کے لیے خدا کا عالی ترین معنوی فیض ہے، کچھ خاص اسباب کے ذریعے گناگاروں تک پہنچے گا۔ ایسے مادی ومعنوی اسباب پر عقیدہ رکھنا کہ جن کی سببیت وتاثیر اور کارکردگی وفعالیت خدا کے حکم اور اسی کے حکیمانہ ارادہ سے انجام پاتی ہے اور اسی طرح ان سے شفاعت کی درخواست توحید کے تینوں مراحل میں سے کسی کے ساتھ بھی منافات نہیں رکھتی۔

اس لیے کہ اولیاء سے شفاعت طلب کرنا سبب نہیں ہوتا ہے کہ ہم دو خدا مان رہے ہیں یا کسی موجود کو تاثیر واضافہ میں مستقل تصور کر رہے ہیں یا کسی کی بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈال کر اسے معبود سمجھ کر اس کی پوجا کر رہے ہیں۔ جب خداوند تعالیٰ بھی قیامت کے دن اپنے اولیاء کو اذن دے کہ وہ گناہگاروں کے حق میں شفاعت کریں تو ہرگز اس نے انہیں اپنا شریک نہیں بنالیا۔

جب بھی خدا کے بندے اس کے اولیاء سے درخواست کریں کہ وہ ان کے حق میں شفاعت کریں اور کم سے کم شفاعت یہ ہے کہ وہ خدا سے طلب کریں کہ ان کے گناہوں سے درگزر فرمائے تو ان اولیاء کی کسی بھی عنوان سے پرستش نہیں کی گئی اور انہیں معبودیت اور پرستش کا مستحق نہیں سمجھا گیا کیونکہ ان سے شفاعت کی درخواست انتہائی انکساری وخضوع کی صورت میں نہیں تھی۔ یہ بندے ہرگز ان سچے شفیعوں کو زمام امور کا مالک نہیں سمجھتے ہیں۔

دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی سوال کرنے کو اس کی عبادت وپوجا نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اس صورت میں سوال کی دو حالتیں ہیں کیونکہ جس سے سوال کیا جارہا ہے یا تو وہ انسان کی درخواست کو پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے یا نہیں۔ پہلی صورت میں ایسے کام کی درخواست بالکل عاقلانہ ہے اور یہ ایک قسم کے وسیلہ کی طلب ہے کہ جس کی طرف عقل وشرع دونوں نے دعوت دی ہے، جبکہ دوسری صورت میں ایسی درخواست ایک احمقانہ کام ہے جس سے عاقل افراد کو اس لحاظ سے کہ وہ عاقل ہیں، دوری اختیار کرنا چاہیے۔

فرض کیجیے ایک شخص غلطی سے کنوئیں میں گر گیا ہے۔ اگر یہ شخص ان افراد سے مدد طلب کرے جو کنوئیں کے پاس سے گزر رہے

ہیں اور کہے کہ مجھے کسی رسی کے ذریعے بچاؤ تو اس طرح پکارنا اور درخواست کرنا بالکل معقول اور صحیح ہوگا۔ لیکن اگر کنوئیں کے ارد گرد لگے ہوئے پتھروں سے اس طرح کی مدد طلب کرے تو اس کی یہ درخواست بے ہودہ ہوگی اور ہرگز اس کا نام عبادت و پرستش نہ ہوگا۔

مختصر یہ کہ شفاعت خواہی کو جس طرح سے بھی تقسیم کریں اس کا شرک اور غیر خدا کی پرستش کے ساتھ ذرا سی بھی تعلق نہیں ہوگا۔

قرآن مجید دستور دیتا ہے کہ صاحبانِ ایمان وسیلہ تلاش کریں۔ ارشاد ہوا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ [1]

''اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔''

واضح ہے کہ یہاں مادی امور اور دنیاوی معیشت کے لیے وسیلہ خواہی مراد نہیں ہے کیونکہ یہ کام کچھ زیادہ دشوار اور پیچیدہ نہیں جس کے لیے اتنی تاکید سے حکم دینے کی ضرورت پڑ جائے۔ بلکہ مراد معنوی اور تقویٰ کے امور میں ان کے وسیلہ سے تمسک کرنا ہے۔ دوسری جانب وسیلے کو کسی مورد میں مشخص نہیں کیا ہے لہٰذا طبیعی ہے کہ ہر قسم کا وسیلہ جو اصول اسلام اور اس کے موازین سے منطبق ہوتا ہو وہ آیت کے دائرے میں داخل ہے۔ اس کی تلاش میں نکلنا چاہیے۔ ان وسائل میں سے ایک اولیائے خدا سے دعا کے لیے درخواست کرنا ہے جو رد اور ٹھکرائی نہیں جاتی۔ کیا یہ معقول ہے کہ وہ قرآن کہ جس کی بنیاد شرک اور یر خدا کی بندگی کے مقابلے پر ہو وہ لوگوں کو اسی (شرک و بندگی غیر خدا) کی طرف بلائے؟

اس بات کی توضیح کی قرآن کی صریح آیات واضح طور پر گواہی دیتی ہیں کہ وہ لوگ جو حق وحقیقت کی گواہی دیتے ہیں قیامت میں وہ شفاعت کریں گے، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝٨٦ [2]

''وہ لوگ جو غیر خدا کی پوجا کرتے ہیں اپنے معبودوں کی شفاعت سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے مگر وہ لوگ جو حقیقت توحید کی گواہی دیتے ہیں اور اس کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔''

لفظ الا جو کہ حروف استثنا میں سے ہے ان افراد کی شفاعت کرنے پر واضح طور پر گواہ ہے جو خدا کی وحدانیت پر گواہی دیتے ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب جبکہ خدا نے اپنے بعض اولیاء کو ایسا حق عطا فرمایا ہے اور ان کو اجازت دی ہے کہ وہ شفاعت کریں تو اس میں کیا اشکال ہے کہ ایک گناہگار ایسے شخص سے طلب شفاعت کرے جس کو خدا کے اذن سے شفاعت کا حق حاصل ہے۔ اس صورت میں جب بھی درخواست کرنے والا شفاعت کی شرائط کا حامل ہو اور اس کا شمار ان لوگوں میں ہو کہ جنہیں خدا نے شفاعت کرنے کی اجازت دی ہے تو

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۳۵

[2] سورہ زخرف آیت ۸۶

اس کی دعا قبول ہوگی، اگر اس صورت کے علاوہ ہو تو مسترد کر دی جائے گی۔

فرقہ وہابی کا رئیس ایک مضحکہ خیز جملہ کہتا ہے: ''خداوند تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو شفاعت کا حق دیا ہے مگر ہم کو ان سے درخواست کرنے سے روکا بھی ہے۔ [1]

اولاً:

خداوند تعالیٰ نے کس آیت میں ہم کو سچے شفیعوں سے شفاعت کی درخواست کرنے سے روکا ہے؟ اگر یہ منع اس وجہ سے ہے کہ ایسی درخواست شرک ہے تو ہم نے واضح طور پر ثابت کیا ہے کہ ایسی درخواست کسی طرح بھی اس کی عبادت و پرستش نہیں اور اگر کسی اور پہلو سے ہے تو ہم بعد میں اس پر گفتگو کریں گے۔

ثانیاً:

یہ کام ایک طرح کی تناقض گوئی ہے کیونکہ اگر خدا نے اپنے اولیاء کو ایسا حق دیا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ دوسرے لوگ اس حق سے فیض حاصل کریں۔ مگر کیا اس طرح صحیح ہے کہ ان افراد سے کہا جائے کہ یہ حق جو تمہارے فائدہ اٹھانے کے لیے اولیائے خدا کو دیا گیا ہے تم کو حق حاصل نہیں ہے کہ ان سے استفادہ کرنے کے لیے درخواست کرو؟

۴۔ کیا مشرکین کا شرک بتوں سے شفاعت طلب کرنے کی وجہ سے تھا؟

اولیائے خدا سے شفاعت طلب کرنے کو حرام قرار دینے کے لیے وہابیوں کی دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے حجاز کے بتوں پرستوں کو مشرک کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بتوں سے شفاعت طلب کیا کرتے، ان کے سامنے گریہ وزاری کرتے اور سفارش کے لیے درخواست کرتے تھے۔ چنانچہ ذیل کی آیت اس پر گواہی دیتی ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ [2]

''وہ ایسی مخلوقات کی پوجا کیا کرتے ہیں جو ان کو کوئی فائدہ و نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ کہتے ہیں کہ یہی بت خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔''

---

[1] کشف الارتیاب ص ۲۴۱ نقل از کتاب ''کشف الشبہات'' محمد بن عبدالوہاب ص ۶۲

[2] سورہ یونس آیت ۱۸

لہٰذا غیر خدا سے ہر طرح کی شفاعت طلب کرنا شرک اور اس شفیع کی پوجا شمار ہوگی۔

جواب

یہ آیت ان کے مطلب پر ذرا سی بھی دلالت نہیں کرتی ہے۔ اگر قرآن ان بت پرستوں کو مشرک کہتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بتوں سے طلب شفاعت کرتے تھے، بلکہ ان کے مشرک ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ بت وں کی پوجا کرتے تھے تا کہ اس کے بدلے میں بت ان کی شفاعت کریں۔

اس کی توضیح کہ بت پرست لوگ دو کام انجام دیتے تھے:

۱۔ بتوں کو بارگاہ الٰہی میں نفوذ رکھنے والے سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ان بتوں کی پوجا کر کے ہی ان کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا نے اس حقیقت کو ذیل کے جملے میں بیان فرمایا ہے:

"و یعبدون من دون اللہ ما لا یضرھم ولا ینفعھم"

خدا کے علاوہ مخلوقات کی عبادت کرتے تھے جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ۔ اس بنا پر وہ لوگ مشرک تھے۔

۲۔ ان پر آس لگائے ہوئے تھے اور ان سے فشفاعت طلب کیا کرتے تھے۔ خدا نے اس بات کو بھی ذیل کے جملے میں بیان فرمایا ہے:

"وہ یقولون ھولاء شفعاونا"

''وہ کہتے تھے کہ بت خدا کی بارگاہ میں ان کے سفارشی ہیں۔''

چونکہ بت اپنے ماننے والوں کی حاجت روائی پر قادر نہیں تھے اس بنا پر ان سے شفاعت طلب کرنا ایک احمقانہ کام تھا نہ کہ شرک۔

آیت کے معنی پر غور کرنے سے اور یہ کہ مشرکین بتوں کے متعلق دو کام انجام دیتے تھے، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے مشرک ہونے کی وجہ وہی بتوں کی پوجا تھی نہ کہ ان سے شفاعت طلبی۔ اگر بتوں سے شفاعت طلب کرنا حقیقت میں ان کی عبادت ہوتی تو پھر کوئی دلیل نہیں ہے کہ "ویعبدون" کے جملے کے علاوہ بھی ایک جملہ مانند "ویوقولون ھولاء شفعائونا" لایا جاتا۔

آیت میں یہ دو جملے عطف کی صورت میں آئے ہیں اور اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ بتوں کی پوجا کا مسئلہ شفاعت طلبی کے موضوع سے جدا ہے۔ بتوں کی پوجا شرک اور دوئی کی علامت ہے جبکہ پتھر اور لکڑی سے شفاعت طلب کرنا بیوقوفی کا کام اور علم و منطق سے دور ایک حرکت ہے۔

یہ آیت ہرگز یہ دلالت نہیں کر رہی کہ بتوں سے شفاعت طلب کرنا ان کی پوجا ہے چہ جائیکہ اولیائے حق اور بارگاہ الٰہی میں محبوب بندوں سے شفاعت طلب کرنا ان کی پرستش کہلائے۔

۵۔کیا غیر خدا سے حاجت روائی کے لیے درخواست کرنا حرام ہے؟

اولیائے خدا سے شفاعت طلب کرنے کی حرمت پر وہابیوں کی تیسری دلیل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے واضح حکم کے تحت ہمیں مقام دعا میں غیر خدا کو نہیں پکارنا چاہیے اور غیر خدا سے شفاعت کے لیے درخواست کرنا غیر خدا سے حاجت روائی کے لیے ایک قسم کی درخواست کرنا ہے۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے:

فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾[1]

''خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔''

جب غیر خدا کو پکارنا حرام ہے اور دوسری جانب سے اولیائے خدا کے لیے شفاعت کا حق بھی ثابت ہو تو اس کے جمع کی راہ یہی ہے کہ ہم اولیاء کی شفاعت خدا سے طلب کریں نہ کہ خود اولیاء سے۔

اس بات پر گواہ کہ اس طرح کی پکار عبادت و پرستش ہے ذیل والی آیت ہے:

اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ ﴿۶۰﴾[2]

''مجھے پکارو تا کہ تمہیں جواب دوں۔ وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں جہنم میں جائیں گے۔''

غور کیجیے کہ آیت کے اول میں دعوت اور آخر میں لفظ عبادت استعمال ہوا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دعوت اور عبادت کا مفہوم ایک ہے۔

ارشاد القلوب اور دیگر اخلاقی کتابوں میں وارد ہوا ہے کہ:

''الدعاء مخ العبادة''[3] دعا عبادت کی روح ہے۔

---

[1] سورہ جن آیت ۱۸

[2] سورہ مومن آیت ۶۰

[3] ارشاد القلوب دیلمی ص ۱۳۵

مذکورہ بالا سوال کا جواب

اولاً:

غیر خدا کو پکارنے کی حرمت سے مراد "فلا تدعوا" کے جملے میں مطلق پکارنا اور درخواست کرنا نہیں بلکہ پکار کے حرام ہونے سے مقصود غیر خدا کی عبادت کا حرام ہونا مراد ہے۔ آیت کا پہلا حصہ اس مطلب کی گواہی دیتا ہے کہ "وان المساجد الله"۔ یہ جملہ اس چیز کی دلیل ہے کہ آیت میں پکارنے سے مراد ایک مخصوص پکار ہے جو عبادت کا لازمہ ہے اور وہ انتہائی تواضع وخضوع سے کسی کے سامنے اس عقیدے سے کھڑا ہونا کہ وہ جہان اور خلقت کا حاکم مطلق ہے۔[1] یہ قیود اس شخص سے درخواست شفاعت میں موجود نہیں کہ جس کو خدا نے ایسا حق دے رکھا ہو کہ اس کے اذن سے شفاعت کرے۔

ثانیاً:

وہ چیز جو آیت میں حرام قرار دی گئی ہے یہ ہے کہ ہم کسی کو خدا کے ساتھ پکاریں اور اسے خدا کے درجے پر سمجھیں۔ چنانچہ "مع الله" کا لفظ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ اگر کوئی پیغمبر اکرمؐ سے یہ درخواست کرے کہ آپؐ اس کے حق میں دعا کریں تا کہ خدا اس کے گناہ بخش دے یا اس کی حاجت پوری کرے، تو اس بندے نے ہرگز خدا کے ساتھ کسی اور کو نہیں پکارا ہے بلکہ اس طرح پکارنا تو حقیقت میں خدا کو پکارنا ہی ہے۔

اگر بت سے حاجت روائی کے لیے درخواست کو بعض آیات میں شرک کہا گیا ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ وہ بتوں کو اپنی مرادوں کے پورا کرنے پر قادر سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے تنقید کے مقام پر اس طرح کے نظریات کے متعلق یوں فرمایا:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ﴿۱۹۷﴾[2]

"تم لوگ جو خدا کے علاوہ بتوں کو اپنا معبود پکارتے ہو وہ (بت) تو تمہاری اور حتیٰ کہ اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے۔"

نیز ارشاد فرمایا:

---

[1] درحقیقت آیت کے معنی یوں ہیں "فلا تعبدوا مع الله احداً"، چنانچہ دوسری آیت میں فرمایا "ولا یدعوا مع الله الھا اخر"

[2] سورہ اعراف آیت ۱۹۷

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ [1]

”خدا کے علاوہ جن کو تم پکارتے ہو وہ تمہاری طرح بندے ہیں۔“

خلاصہ یہ کہ مشرکین بتوں کو غیر معمولی قدرت کا حامل تصور کرتے تھے، اس لیے انتہائی انکساری اور خضوع سے ان کے سامنے جھکتے اور حاجت پیش کرتے تھے۔ ان بتوں کو وہ جہان خلقت میں مطلق تصرف کرنے والا فاعل سمجھتے تھے۔ بے شک اس طرح سے حاجت روائی کے لیے درخواست کرنا قطعاً حرام اور بت پرستی کہلائے گی، لیکن اس شخص سے درخواست کرنا شفاعت کے لیے کہ جس کو خدا نے اس کا حق اور مقام عطا کیا ہے، اس شرط سے جدا ہے۔

ثالثاً:

گفتگو کے آغاز میں ہم نے عرض کیا تھا کہ دعوت کے کچھ وسیع معنی اور مفہوم ہیں۔ یہ کبھی مجاز کے طور پر عبادت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً آیت [2] یا وہ حدیث [3] کہ معترض نے جس کے ذریعے استدلال کیا ہے، اس صورت میں کہ ایسے جزئی استعمالات مجازی طور پر ہوں تو یہ دلیل نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ دعوت (پکارنے) کو عبادت کہہ دیں اور کسی سے معقول طریقے سے کی ہوئی حاجت روائی کے لیے درخواست اور دعا پر بھی شرک کا حکم لگا دیں۔

٦۔ کیا شفاعت خدا سے مختص حق ہے؟

درج ذیل آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شفاعت خدا کا حق ہے۔ پس اس صورت میں غیر سے شفاعت کی درخواست کے کیا معنی؟ وہ آیت یہ ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ [4]

”بلکہ انہوں نے خدا کے علاوہ کچھ شفیع بنا لیے ہیں تم کہہ دو، اگر وہ شفیع کسی چیز کے مالک نہ ہوں اور کچھ سوجھ بوجھ بھی نہ رکھتے ہوں (تو کیسے تمہارے شفیع ہو سکتے ہیں) تم کہہ دو کہ شفاعت کا پورا حق خدا کو حاصل ہے۔“

---

[1] سورہ اعراف آیت ۱۹۴

[2] ”اعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون......“

[3] ”الدعا مخ العبادة“

[4] سورہ زمر آیت ۴۴

مذکورہ سوال کا جواب

"للہ الشفاعة جمیعا" کے جملے سے مراد یہ نہیں کہ صرف خدا شفاعت کرتا ہے، دوسرے کو شفاعت کا حق ہی نہیں کیونکہ شک نہیں کہ خدا کسی بھی وقت کسی کے حق میں دوسرے کے پاس شفاعت نہیں کرتا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خدا اصل شفاعت کا مالک ہے اور کوئی بھی شخص خدا کی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں کرسکتا۔ دوسروں کی شفاعت خدا کی اجازت اور اس کی رضا سے وابستہ ہے۔ خدا اس حق اور مقام کا بالاصلات مالک ہے اور وہی ہے جو دوسروں کو شفاعت کا حق عطا کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شفاعت خدا کی ملکیت ہے، نہ کہ ان بتوں کی جو شعور نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی چیز کے مالک ہوتے ہیں۔

واضح الفاظ میں یوں کہ شفاعت کا مالک وہ ہوتا ہے کہ جو عقل وادراک اور امکان کے لحاظ سے کسی چیز کا مالک ہو جائے تا کہ اسی عقل و ادراک کے ذریعے گناہگار سے اس کی درخواست سنے اور اسے بالاتر مقام تک پہنچادے۔ نیز حق شفاعت کا مالک بھی ہو سکے اور اس حق سے استفادہ کرے جبکہ ان کے بت جن کی وہ لوگ پوجا کرتے ہیں، مذکورہ دونوں شرطوں سے خالی ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

"قل اولو کانو الا یملکون شیئا و لا یعقلون قل اللہ الشفاعة جمیعا"

یہ آیت صحیح شفاعتوں سے متعلق کچھ نہیں بتا رہی کہ جن میں شفیع عقل وکمال کے حوالے سے بڑے عظیم درجے پر فائز ہو اور اس حق کی ملکیت کی اہلیت اسے خدا کی اجازت سے حاصل ہو۔

استدلال کرنے والا آیت کے صرف ایک جملے کو دیکھتا ہے جبکہ صدرِ آیت سے غافل رہا ہے۔ صدرِ آیت پر غور کرنے سے استدلال کا بے بنیاد ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

۷۔ کیا مردے سے شفاعت کی درخواست کرنا لغو ہے؟

ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اولیائے خدا سے دنیا میں شفاعت کے لیے درخواست کرنا مردہ سے حاجت روائی کے لیے درخواست کے مترادف ہے جو کہ قوت سماعت نہیں رکھتا اور وہ آیات واحادیث کہ جن سے اس حصے کے آغاز میں اولیائے الٰہی سے طلب شفاعت کے صحیح ہونے پر استدلال کیا گیا وہ سب ان اولیاء اللہ کی حیات سے مربوط ہیں۔ مگر ہماری گفتگو فی الحال امت کے ان نیک افراد سے شفاعت کے لیے درخواست کے مسئلہ پر ہے جو زیر خاک سو چکے ہیں۔ اب صحیح ہے کہ ہم ان کی قبروں کے نزدیک کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ اے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) "میرے حق میں شفاعت فرما؟"

مردہ کی شفاعت سے متعلق جواب

یہ گروہ دیگر اسلامی فرقوں کو غلط قرار دینے میں شک کے دروازے سے داخل ہوتا ہے اور توحید کی طرفداری کے نام سے دوسروں کو کافر بنانے پر تلا ہوا ہے۔ لیکن انہوں نے اس استدلال میں گفتگو کا انداز بدل دیا ہے اور اولیاء کی طرف متوجہ ہونے کے مسئلے کو لغو قرار دیا ہے مگر وہ لوگ ایک نکتے سے غافل ہیں کہ اولیائے الٰہی نقلی و عقلی دلیلوں کے حوالے سے زندہ ہیں۔

یہ اعتراض اس کی علامت ہے کہ معترض انسان کے انتقال کے بعد اس کی روح کی حاتا اور اس کے تجرید و بقاء سے واقف نہ تھا اور موت کو اس نے انسان کے لیے محض فنا اور نابود ہونا تصور کیا ہے، درآں حالیکہ عقلی و نقلی دلیلیں اس کے برعکس گواہی دے رہی ہیں۔

اولاً:

بدن سے جدا ہونے کے بعد نفس مادہ سے مجرد ہوتا ہے اور اس کی جسم سے بے نیازی تقاضا کرتی ہے کہ انسان کی روح اس کی موت کے بعد بھی باقی رہے اور مخصوص زندگی اور ادراک کی حامل ہو۔ اسلام کے اکابر فلاسفہ نے دس دلیلوں سے روح کی بقاء اور جسم پر اس کی برتری کو ثابت کیا ہے جس سے کسی بھی مصنف مزاج آدمی کے لیے شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ثانیاً:

قرآنی آیات موت کے بعد بھی حیات کے جاری رہنے پر گواہی دیتی ہیں، مثلاً یہ آیات:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ [1]

''وہ لوگ جو خدا کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس سے رزق پاتے ہیں۔''

اگر ''یرزقون'' کا جملہ نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہم احتمال دیتے کہ اس سے مراد ان کی اجتماعی حیات ہے جو ان کے مرنے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں ایک عظیم جگہ پاتی ہے اور بدستور محافل و مجالس میں ان کا نام لیا جاتا ہے مگر یہ جملہ اس سے مانع ہے کہ ہم شہیدوں کی حیات کی تفسیر اس طرح کریں، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقی اور واقعی حیات کے ساتھ ساتھ رزق بھی پاتے ہیں، اگرچہ اس جہان کے رزق کی حقیقت اس کے دوسرے امور کی طرح ہمارے لیے روشن نہیں ہے۔

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۱۶۹

راہ حق کے شہیدوں کی واقعی حیات کے لیے ثبوت یہ ہے کہ قرآن ان کو زندہ کہنے کے بعد یوں توصیف کرتا ہے:

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ (آل عمران ۱۷۰)

''وہ لوگ خدا کے عطا کیے ہوئے فضل و کرم پر خوشحال ہیں اور وہ لوگ جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہوئے انہیں یہ بشارت دیتے ہیں کہ ان کے لیے غم و اندوہ نہیں ہے۔''

آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ شہدائے راہِ حق اس جہان میں ان لوگوں کے بارے میں کہ جنہوں نے ابھی تک جامِ شہادت نوش نہیں کیا یا طبیعی موت کے ذریعے ان سے ملحق نہیں ہوئے، ان کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

"ولا تحزنوا ولا تخافوا"

''غم و حزن نہ کرو اور ڈرو مت۔''

وہ شخص جو اپنے دوستوں کو ایسا جملہ کہنے کی طاقت رکھتا ہو کیا شفاعت کے لیے درخواست کرنے والوں کے حق میں خدا سے مغفرت و بخشش طلب کرتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ:

"اللهم اغفر لفلان"

''اے خدا فلاں کو معاف فرما؟''

اگر شہید راہ حق خداوند تعالیٰ سے کسی کے لیے مغفرت کی درخواست کر سکتا ہے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جو سرکارِ عالم، انسانوں کے عظیم رہبر اور شہدا ئکے پیشوا ہیں کیا آپؐ ایسے کام کے لیے خدا سے درخواست نہیں کر سکتے؟

عجیب بات ہے کہ وہ پیغمبرؐ جو قیامت کے دن امت پر شاہد اور ان کے اعمال کے گواہ ہوں وہ کیسے ان کے اعمال سے بے خبر ہیں اور ان کی باتوں کو نہیں سنتے۔

قرآن مجید پیغمبرؐ کو امت کے اعمال پر شاہد بتا رہا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ [1]

''کیا ہوگا کہ جس وقت ہم ہر گروہ سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے بھی ان کا گواہ بنا کر لائیں گے۔''

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ پیغمبرؐ کسی کے اعمال سے مطلع ہوئے بغیر یا کم از کم کسی گروہ کے ایمان و کفر سے مطلع ہوئے بغیر گواہی دے دیں؟ مسلم ہے کہ اس طرح نہیں ہے۔

---

[1] سورہ نساء آیت ۴۱

پیغمبرؐ کی گواہی اور شہادت کا دائرہ کار صرف آپؐ کے زمانے کے لوگوں تک منحصر نہیں ہے کیونکہ قرآن نے آپؐ کو اس صفت کے ساتھ ساتھ ایسے دو اور اوصاف ''بشیر ونذیر'' کے ساتھ بھی متصف کیا ہے، درحالا یکہ وہ دو صفتیں عمومی ہیں کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۴۵ [۱]

''اے پیغمبرؐ ہم نے تمہیں شاہد و بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

کیا یہ احتمال دیا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انذار ان کے ہی زمانے محدود ہو کیسے یہ دو صفات تو عمومی ہوں مگر آپؐ کی گواہی کی صفت خصوصی رنگ اختیار کر لے۔ [۲]

۲۔ وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝۱۰۰ [۳]

''اس دنیا کے بعد قیامت تک ان کے لیے ایک عالم برزخ ہے۔''

یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں کہی گئی جو اپنی موت کے وقت دنیا کی طرف واپسی کی درخواست کرتے تھے اور کہتے تھے:

''رب ارجعونی تعلی اعمل صالحاً''

''اے خدا مجھے دوبارہ اس دنیا میں لوٹا دے تاکہ میں نیک عمل کروں۔''

قرآن اس درخواست کو مسترد کرنے کے بعد مذکورہ آیت کا ذکر کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں زندگی کا دروازہ بالکل بند ہو چکا ہے اور دوسری دنیا جو دو جہان کے درمیان کا برزخ ہے، اس کا دروازہ کھل چکا ہے۔ اس جہان میں رہائش کے لیے سامان فراہم کیا جانا چاہیے۔

پس یہ آیت دوسرے جہان میں برزخی رنگ میں حیات کے جاری رہنے کی روشن دلیلوں میں سے ہے اور حیات علم وادراک اور قدرت وتوانائی کے ساتھ ہوتی ہے۔

فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۴۶ (سورہ مومن: ۴۶)

''ان کو صبح وشام آگ میں جھونک دیا جائے گا اور قیامت کے دن (فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) آلِ فرعون کو شدید ترین عذاب میں مبتلا کرو۔

---

[۱] سورہ احزاب آیت ۴۵

[۲] اہداء الحقیر ۱۰۱

[۳] سورہ مومن آیت ۱۰۰

یہ آیت بتارہی ہے کہ آل فرعون کو قیامت سے پہلے بھی صبح و شام آگ میں جھونکا جاتا ہے۔آگ میں پھینکنا چونکہ ان کو عذاب دینے کی خاطر ہے۔لہٰذا طبیعی طور پر چاہیے کہ وہ روح و نفس رکھتے ہوں تا کہ آگ کا مزہ چکھ سکیں۔

اس بنا پر چاہیے کہ برزخ میں انسان کی روح ایک خاص بدن کی حامل ہو جو لباس کی طرح روح کو پہنایا جائے اور بدن کے ذریعے عذاب دیا جائے۔

مادی سزاؤں مثلاً آگ کے ذریعے عذاب دینے میں دنیاوی یا برزخ والا بدن لباس کے مانند ہے۔جب بھی مقصد یہ ہو کہ کسی شخص کو لکڑی کے ذریعے اسطرح مارا جائے کہ اس کا جسم مجروح نہ ہو تو اس کے جسم کو لباس سے چھپا لیا جاتا ہے اور پھر لکڑی سے مارا جاتا ہے۔بدن بھی دونوں جہان میں یہ کردار ادا کرتا ہے کیونکہ روح مجرد کا جب تک بدن سے تعلق پیدا نہ ہو آگ کے ذریعے عذاب دینے کے قابل نہیں۔اس وجہ سے روح کے لیے ایک بدن کی ضرورت ہے تا کہ اس بدن کے ساتھ متحد ہونے اور وہ رابطہ جو بدن کے ساتھ رکھتی ہے اس کے ذریعے سے اُسے عذاب دیا جائے۔

موت کے بعد بھی مومن و کافر دونوں کی حیات کے دائمی ہونے کے بارے میں اسلامی احادیث بہت زیادہ ہیں۔تمام مسلمان محدثین نقل کرتے ہیں کہ ''جنگ بدر'' میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور مشرکین اپنے ستر افراد قتل کرانے کے بعد فرار ہو گئے تو مشرکین کے مقتولین کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر ایک کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا:

''جس چیز کا خدا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اُسے حق پایا۔کیا تم نے بھی اپنے لیے خدا کے وعدے کو صحیح اور سچا پایا ہے''؟

اس موقع پر بعض مسلمانوں نے آپؐ سے عرض کی کہ وہ آپؐ کی بات سنتے اور سمجھتے ہیں؟

حضرتؐ نے فرمایا: ''ہاں''[1]

مسلمان محدثین نے ''زیارتِ پیغمبرؐ'' کے باب میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

ما من احد یسلم علی الا رد اللہ روحی حتی ارد علیہ السلام

''جو بھی مجھ پر سلام کہے خدا میری روح کو پلٹا دیتا ہے تا کہ اس کے سلام کا جواب دوں''

اور نیز نقل کرتے ہیں:

ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام

''خدا کی جانب سے کچھ فرشتے مقرر ہیں کہ جن کو حکم ہے کہ روئے زمین پر چلتے رہیں اور میری اُمت کے سلام کو مجھ تک پہنچائیں''

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ا،ص ۶۳۹

اس مورد میں روایات اور احادیث اس حد تک ہیں کہ جن کے عشر عشیر کو نقل کرنا بھی ہمارے امکان میں نہیں ہے۔[1]

اگر اولیائے الٰہی اور راہِ حق کے شہداء موت کے بعد بھی زندہ جاوید نہیں ہیں تو کیوں قرآن مجید عظیم شخصیتوں پر سلام و درود بھیجتا ہے۔

مثلاً:

۱۔ سلام علی نوحٍ فی العالمین

۲۔ سلام علی ابراھیم

۳۔ سلام علی موسیٰ و ھرون

۴۔ سلام علی ال یاسین

۵۔ و سلام علی المرسلی[2]ن

کیا ہوسکتا ہے کہ یہ ساری تاکید اور متواتر روایات کو مردود سمجھا جائے جن کو سنی و شیعہ دونوں فرقوں کے مسلمان محدثین نے زیارتِ اہلِ قبور، زیارتِ انبیاء و اولیاء و صلحا کے بارے میں نبی اکرمؐ اور پاکیزہ پیشواؤں سے نقل کیا ہے اور ان میں سے اکثر روایات میں ہم اس گروہ کے ساتھ خطاب کی صورت میں کلام کرتے ہیں۔ اور کہا جائے کہ اسلام کے لائحہ عمل میں زیارتِ قبور، شہداء اولیاء اور صلحاء و پاک افراد کو خطاب کرنے کے نام سے کوئی دستور موجود نہیں، جبکہ دسیوں کتابیں اور احادیث جو اس مسئلے میں موجود ہیں، وہ بے بنیاد ہوں۔

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ[3]

کیا قرآن مردوں کو قابل تفہیم نہیں سمجھتا؟

قرآن مجید واضح طور پر بتا رہا ہے کہ مردے کچھ سمجھتے نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝[4]

''ہم مردوں اور بہروں کو جو تمہاری بات نہیں سن سکتے نہیں سمجھا سکتے (اور ان کی ہدایت نہیں کر سکتے ہو)

قرآن اس آیت میں مشرکوں کو مردوں کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے اور بتلا دیتا ہے کہ جس طرح مردہ سمجھ نہیں سکتا اسی طرح اس گروہ کو سمجھانا

[1] مرحوم سید محسن عاملی کتاب کشف الارتیاب ص ۱۱۰، ص ۱۱۳ میں ان روایات میں سے کچھ ذکر کیا ہے۔

[2] سورہ صافات آیات ۷۹، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۳۰ اور ۱۸۱

[3] سورہ کہف آیت ۵

[4] سورہ نمل آیت ۸۰

بھی تمہارے بس میں نہیں ہے۔ اگر مردے بات کرنے کے اہل ہوتے اور قوت سماعت رکھتے ہوئے تو مردہ دل مشرکوں کو مردوں سے تشبیہ دینا صحیح نہ ہوتا۔

الْاَمْوَاتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝۲۲ [1] ۲

''خدا جس کو چاہتا ہے اسے سمجھا دیتا ہے اور تم ان لوگوں کو جو قبروں میں ہیں اپنی بات نہیں سنا سکتے ہو''

اس آیت سے استدلال کا طریقہ بھی پہلی آیت کے استدلال کی طرح ہے۔ دونوں آیتیں دلالت کرتیں ہیں کہ مردوں کو سنانا اور سمجھانا ممکن نہیں ہے اور چونکہ مشرکین بھی ان سے ملتے جلتے ہیں اس لیے انہیں سمجھانا بھی عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔

اس بنا پر مردہ شخص سے شفاعت کے لیے درخواست کرنا ایک جماد چیز سے درخواست کرنے کے مترادف ہوگا۔

گذشتہ اعتراض کا جواب

مذکورہ دونوں آیتوں سے استدلال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ ان دو آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ اے پیغمبرؐ آپ کبھی بھی حقیقی اور مجازی مردوں کو سنا اور سمجھا نہیں سکتے ہو۔ حالانکہ ان دونوں آیتوں کا مقصد یہ نہیں بلکہ ان کا مقصود یہ ہے کہ آپ غیبی طاقت سے مدد لیے بغیر خود مستقل طور پر مردوں کو خواہ حقیقی مردے ہوں یا مجازی سمجھا نہیں سکتے ہو، اور جب تک خدا کا ارادہ اور مشیت ساتھ نہ ہو آپ میں سمجھانے کی قدرت بھی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ ہم کہیں کہ پیغمبر کلی طور پر مردوں کو سمجھانے کی قوت نہیں رکھتے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآنی آیات کے حوالے سے یہ چاہتے تھے کہ تمام لوگ نیک راستے کی ہدایت پائیں۔ آپؐ کی انسانوں کے بارے میں یہ خواہش آپؐ کے اندر یہ آرزو پیدا کرتی تھی۔ دوسری جانب ہدایت و گمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے اور جب تک خدا کی مشیت کسی کی ہدایت سے متعلق نہ ہو لوگوں کی ہدایت بھی امکان پذیر نہ ہوگی۔ قرآن خدا کے ارادہ کی مکمل دخالت کے اثبات کے لیے اور یہ کہ یہ کام صرف خدا کے ہاتھ میں ہی ہے، پیغمبر ہدایت و گمراہی کے مالک نہیں۔ بعض جگہوں پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ [2]

''جس کو تم چاہو ہدایت نہیں کر سکتے ہو بلکہ خدا جس کو چاہتا ہے اس کی ہدایت کرتا ہے [3]۔

---

[1] سورۂ فاطر آیت ۲۲

[2] سورہ قصص آیت ۵۶

[3] اگر فرد میں ہدایت کی اہلیت موجود ہو تو حتمی طور پر خدا کی مشیت اس کے ساتھ متعلق ہوگی۔ اسی طرح کی آیات سے فرقہ جبریہ کے مفاد کا استفادہ نہیں کیا جانا چاہیے۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ [1]

''جتنا بھی زور لگاؤ اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے''

یہ دونوں آیتیں اور اسی طرح گذشتہ دو آیات کہ جن کے ذریعے معترض نے استدلال کیا ہے یہ صرف اتنا بتا رہی ہیں کہ ہدایت کا کام صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس سلسلے میں صرف انبیاء کی خواہش کافی نہیں ہے۔ حقیقی ہادی، دلوں کو بدل دینے والا اور روحوں کو روشنی بخشنے والا صرف خدا ہے۔

چنانچہ ایک اور آیت میں عمومی طور پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ [2]

''تیرے اختیار میں کوئی کام نہیں ہے بلکہ خدا ہی یا ان کی توبہ قبول کرے گا یا عذاب دے گا''

اس مطلب کا واضح ثبوت کہ آیات کا مفہوم یہ نہیں کہ پیغمبر کلی طور پر مردوں کو سمجھانے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ یہ آیات یہ بتلا رہی ہیں کہ اے رسولؐ تم خدا کی مشیت کے بغیر لوگوں کے بارے میں، خواہ وہ حقیقی مردے ہوں یا مجازی، کچھ بھی کام انجام نہیں دے سکتے ہو، خود وہی دوسری آیت ہے کیونکہ اس آیت میں اس سے پہلے کہ کہے: ''وما انت بمسمع من فی القبور'' (تم مردوں کو سمجھا نہیں سکتے) یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ''ان اللہ یسمع من یشاء'' (خدا ہی ہے کہ جس کو چاہتا ہے سمجھا لیتا ہے)

اس آیت میں تفہیم الٰہی کو مطلق طور پر اور بغیر کسی قید کے ذکر کرنے کے بعد پیغمبرؐ سے فرمایا گیا ہے کہ آپؐ مردوں کو سمجھا نہیں سکتے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت پیغمبر اکرمؐ کے مستقل طور پر صاحب اختیار ہونے کی نفی کرتی ہے اور یہ بیان کر رہی ہے کہ آپؐ خدا کی مشیت کے بغیر کوئی کام بھی انجام نہیں دے سکتے۔ نہ صرف آپؐ مردوں کو سمجھا نہیں سکتے بلکہ زندوں کو بھی مشیت الٰہی کے بغیر راہ راست کی ہدایت نہیں کر سکتے۔

یہ مطلب اس کے برعکس ہے کہ کہا جائے کہ مردے سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ خدا بھی چاہ لے کہ پیغمبرؐ کسی مردے کو سمجھا لے۔

فرض کریں کہ اعتراض کرنے والے کا اعتراض صحیح ہو اور اس مقصد سے جو آیت کے لیے بیان کیا ہے صرف نظر بھی کریں تو آیت کا نتیجہ یہ ہے کہ مردے اور وہ لوگ جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں یعنی وہ بدن جو زمین میں سو چکے ہیں قابل تفہیم نہیں ہیں اور ہر جسم سے روح جدا ہو گئی ہو وہ فہم و ادراک کے دائرے سے باہر ہوتا ہے اور جمادات کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن توجہ دی جائے کہ ہمارے مخاطب قبروں میں سوئے ہوئے اجسام نہیں ہیں، بلکہ ہم ان پاک و زندہ ارواح جو کہ عالم برزخ میں برزخی اجسام کی صورت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور بقول قرآن کریم وہ زندہ اور حیّ ہیں اُن سے کلام کرتے ہیں اور اُن سے شفاعت کے لیے درخواست کرتے ہیں نہ کہ خاک

---

[1] سورہ یوسف: ۱۰۳

[2] سورہ آل عمران: ۱۲۸

میں سوئے ہوئے بدن سے۔

اگر مردے اور زیر خاک خوابیدہ جسم سمجھ بوجھ سے عاری ہیں تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ ان کی طیب و پاکیزہ ارواح اور نفوس جو قرآن کی نص کے تحت دوسری دنیا میں زندہ ہیں اور رزق کھاتے ہیں، وہ بھی قابل تفہیم نہ ہوں۔

اگر ہم سلام کہتے ہیں یا شفاعت طلب کرتے ہیں یا اُن سے کلام کرتے ہیں۔تو ہمارا سروکار ان پاک اور زندہ ارواح سے ہے نہ کہ زمین میں پوشیدہ اجسام سے۔اگر ہم ان کی قبر کی زیارت اور خاک اور خانہ وکاشانہ کی زیارت کو جاتے ہیں تو یہ اس کی خاطر ہے کہ ہم اس طرح سے اپنے اندر آمادگی پیدا کرنا چاہتے ہیں تا کہ اُن کے ساتھ روحانی ارتباط قائم کیا جائے یہاں تک کہ اگر ہم جان بھی لیں کہ ان کے بدن خاک میں بدل گئے ہیں (اگرچہ اسلامی روایات اس کے برخلاف گواہی دیتی ہیں) تب بھی اس قسم کے حالات پیدا کر دیتے ہیں تا کہ اسطرح اُن ارواح پاکیزہ سے ارتباط کے لیے آمادگی کر سکیں۔

اولیائے خدا صلحاء اور پاکیزہ بندوں کی قبور کی زیارت بہت تربیتی اور اجتماعی فوائد رکھتی ہے۔

تمام عقلائے عالم اپنی ملت وملک کے رہبروں اور بزرگوں کی قبور کی زیارت کو جاتے ہیں، اُن کی قبروں پر گل نچھاور کرتے ہیں اگرچہ خدا اور عالم آخرت کے قائل نہ بھی ہوں۔لیکن اولیاء وصلحاء کی جہانِ دیگر میں حیات وزندگی پر عقیدہ رکھنے والے افراد کی نظر میں اُن کی قبروں پر حاضر ہونے کے فوائد میں سے ایک فائدہ ان اولیاء کی ارواح ونفوس کے ساتھ رابطہ کرنے کی آمادگی ہے۔بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے کئی اور فوائد بھی ہیں صرف یہ ایک فائدہ ہی نہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ کی سیرت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ آپؐ کی رحلت کے بعد مسلسل آپؐ کی روح مقدس سے دعا کے لیے درخواست کیا کرتے تھے اور اسے شرک کے مترادف اور آپؐ کی رحلت وموت کے منافی نہیں سمجھتے تھے۔

ہم یہاں پر دو موارد کو جو اہل سنت کی کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں، نقل کرتے ہیں۔ہم نے اگر رسول اکرمؐ کی روح مبارک سے دعا کے لیے درخواست کو جائز قرار دے دیا تو اُن سے طلب شفاعت بھی جو کہ دعا کی ایک شاخ ہے، جائز ہوگی۔

ا۔ ایک شخص حضرت عثمانؓ کے دور حکومت میں کئی مرتبہ اپنے کام کی خاطر اُن کے پاس گیا لیکن کامیاب نہ ہوا۔اس نے ایک دن عثمان بن حنیف کو دیکھا اور ان کے سامنے اپنا مسئلہ ذکر کیا تو انہوں نے اُس سے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ کر یہ کہنے کو کہا:

اللهم انی اسئلك و اتوجه الیك بنبینا محمد نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بك الی ربك لتقضی حاجتی

''اے خدا میں تجھے پکار رہا ہوں اور تیرے پیغمبر رحمتؐ (محمدؐ) کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوا ہوں۔

اے پیغمبر رحمتؐ! میں تیرے وسیلے سے تیرے پروردگار کی طرف رخ کر رہا ہوں تا کہ میری حاجت پوری ہو جائے۔

اس شخص نے یہ کام انجام دیا اور خلیفہ کے پاس گیا تو اس کی حاجت پوری ہوگئی۔ اس کے بعد عثمان بن حنیف سے ملاقات کی اور اُن سے دعا کی سند مانگی تو انہوں نے کہا کہ میں چند لوگوں کے ساتھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا ایک شخص آیا۔ اُس نے آپؐ سے دعا کے لیے درخواست کی۔ پیغمبر اکرمؐ نے یہی کام جو میں نے تم کو سکھایا ہے اُسے سکھایا۔[1]

یقینی طور پر ''لتقضی حاجتی'' کے جملے کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی دعا کے صدقے میں میری حاجت روائی ہو، کیونکہ آپؐ کی دعا قبول کی جاتی ہے۔

۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت عبدالمطلب کی صاحبزادی حضرت صفیہؓ نے آپؐ کے سوگ میں ایک مرثیہ پڑھا ہے جس کو سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے۔ اس مرثیہ کا ایک بیت یہ ہے:

الا یا رسول اللہ انت رجاؤ نا

و کنت بنا براً و لم تك جافیاً

''(اے خدا کے رسول آپؐ ہماری امید ہیں اور ماضی میں بھی آپ ہم پر مہربان تھے اور جفا کار نہ تھے''

''انت رجاؤ نا'' کے جملے سے مراد اس کے سوا نہیں کہ ہمیں تمہاری شفاعت اور دعا کی تمنا ہے اور ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے حق میں دعا اور شفاعت کیجیے۔[2]

آخر میں ہم ایک نکتہ عرض کرتے ہیں اور وہ یہ کہ آیات و روایات جو اس حصے میں ہم نے ذکر کی ہیں اس مطلوب کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کیونکہ تمام اسلامی فرقوں کے حوالے سے بھی یہ مسئلہ اتفاقی ہے لہٰذا ہم اس سے زائد اس مسئلے کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے۔ اسی بناء پر ان روایات کو نقل نہیں کرتے جو شیعہ کتابوں میں شفاعت کی طلب کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

اس امر کا مخالف صرف وہابی فرقہ ہے اور وہ بھی شرک و پرستش اور درخواست کے بے ہودہ ہونے کے بہانے بنا کر۔ سب کا پہلے جواب دیا جا چکا ہے۔

وہ چیز جو قابل افسوس ہے یہ ہے کہ وہابی حضرات ہر وہ کام کہ جس سے کسی انسان یا مسلمان کے احترام کی بو آ رہی ہو فوراً اس پر شرک کی تہمت لگا کر اسی بہانے سے اس سے روک دیتے ہیں۔

پیغمبرؐ سے دعا اور شفاعت کے لیے درخواست کرنے کے اس مورد کو حیات پیغمبرؐ کے وقت جائز اور اسے توحید کے منافی نہیں سمجھتے

[1] وفاالوفاء ج ۲، ص ۸۹، کشف الارتیاب، ص ۳۱۱

[2] کشف الارتیاب، ص ۳۱۲

ہیں۔لیکن اس مسئلے کو آپؑ کی موت کے زمانے میں شرک اور صحیح توحید کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ وہ اس بات کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ پیغمبرؑ کی حیات اور آپؐ کی موت توحید اور شرک کے حوالے سے عمل کی ماہیت تبدیل نہیں کرتی۔

ایک شیعہ شخص جو اپنے پیشواؤں کی پاکیزگی اور ان کے خطا واشتباہ سے منزہ ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے جس وقت اصلی زیارتوں اور وہ دعائیں جو ائمہ معصومین سے صحیح اسناد کے ساتھ نقل ہوئی ہیں ان کی طرف نگاہ کرتا ہے تو اولیائے خدا سے شفاعت طلب کرنے کا مسئلہ اس کے سامنے ایک بدیہی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔اسکے مشروع و مستحب ہونے کے بارے میں وہ اپنے اندر کسی شک وشبہ کو راہ تک نہیں دیتا۔

اسلامی احادیث میں شفاعت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے برحق جانشینوں نے قرآن مجید کی پیروی کرتے ہوئے اپنے کلام میں شفاعت کا ذکر فرمایا ہے اور اسے ایک ایسے مسلم اسلامی اصول کے طور پر بیان فرمایا ہے جس کی کچھ حدود اور شرائط ہیں۔

شفاعت سے مربوط روایات اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں چند صفحات میں جمع کیا جا سکے۔ ہم نے اس حصے میں اس بات کی احادیث میں سے صرف ایک سو احادیث کا انتخاب کر کے ان کو نقل کیا ہے۔ چونکہ یہ روایات مسئلہ شفاعت کو ثابت کرنے میں قطعی اور متواتر ہیں لہٰذا ان کی سند پر بحث کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ ہاں اگر کوئی روایت کسی ایسے نکتے کی حامل ہو جو دوسری احادیث میں موجود نہ ہو تو اس نکتے کا ثبوت اس روایت کی سند کی صحت کے ثبوت سے وابستہ ہوگا۔

ہم نے ان سو روایات میں سے پنتالیس روایات اہل سنت کی کتابوں سے جو کہ سب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں اور پچپن روایتیں کتب شیعہ سے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امیر المومنین علیہ السلام اور آپؑ کے معصوم فرزندوں سے مروی ہیں منتخب کی ہیں۔

روایات کے انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ طویل روایات کے ذکر کرنے، نیز وہ روایات جو آخرت میں شفاعت کے مسئلے سے مربوط نہیں یا وہ روایات کہ جن کا متن شرح وتوضیح کا محتاج ہے یا بسا اوقات ان کا متن کسی پہلو سے اشکال رکھتا ہے، ان کو ذکر کرنے سے گریز کیا جائے۔ضمناً انتخاب شدہ روایات بھی بعض دفعہ تلخیص شدہ ہیں اور صرف وہی حصہ کہ جو مقام بحث سے مربوط تھا ذکر ہوا ہے۔اس کے باوجود کوشش کی گئی ہے کہ اس باب کی تمام روایات کے مضامین کو ان سو احادیث میں جمع کیا جائے تاکہ روایات سے نتیجہ لینے میں کوئی نقص باقی نہ رہے۔روایات کے ترجمہ میں ہدف یہ رہا ہے کہ حدیث کا معنی مفہومی طور پر لکھا جائے اگرچہ تحت اللفظی ترجمہ سے باہر ہو۔

شفاعت کے بارے میں

۱۴۵ احادیث نبویؐ اہلِ سنت کی کتابوں سے

۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لکل نبی دعوۃ مستجابۃ فتعجل کل نبی دعوتہ و انی اختبات دعوتی شفاعۃ لامتی فھی نائلۃ من مات منھم لایشرک باللہ شیئاً[۱]

''خداوند متعال نے ہر پیغمبر کے لیے ایک مقبول دعا قرار دی ہے۔ گذشتہ انبیاء نے اسی دنیا میں اس سے استفادہ کیا، مگر میں نے اس دعا کو آخرت میں اپنی امت کے لیے شفاعت کرنے کی خاطر محفوظ کیا ہے اور میری شفاعت امت کے ان افراد کو نصیب ہوگی جو ایمان کی حالت میں مرجائیں اور مشرک نہ ہوں۔'' (کیونکہ شرک شفاعت سے مانع ہے)

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اعطیت خمساً ... واعطیت الشفاعۃ فاوخرتھا لامتی فھی لمن لایشرک باللہ شیئاً[۲]

''خدا نے مجھے پانچ امتیاز عطا فرمائے ہیں...... ان میں سے ایک شفاعت ہے کہ جسے میں نے اپنی امت کے لیے ذخیرہ کیا ہوا ہے۔ شفاعت ان لوگوں کے لیے ہے جو مشرک نہ ہوں۔''

۳۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

[۱] سنن ابن ماجہ جلد ۲ ص ۱۴۴۰ اور درج ذیل کتابوں میں اسی عبارت میں یا مختصر فرق کے ساتھ آپ ملاحظہ فرمائیں گے: مسند احمد، ج ۱، ص ۲۸۱، موطا مالک، ج ۱، ص ۱۶۶، سنن ترمذی ج ۵ ص ۲۲۸، سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۸، صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۳۰، صحیح بخاری ج ۸ و ج ۹ ص ۱۷۰۔

[۲] مسند احمد ج ۱، ص ۳۰۱ اور اسی عبارت میں یا تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ذیل کی کتابوں میں ملاحظہ ہو: سنن نسائی جلد ۱ ص ۱۸۲، سنن دارمی ج ۱ ص ۳۲۳ و ج ۲ ص ۲۲۴، صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۱-۱۱۹، مسند احمد ج ۴ ص ۴۱۶)

"شفاعتی نائلة ان شاء الله من مات لایشرك بالله شیئاً"۔[1]

''میری شفاعت خدا کی مشیت کے تحت ان لوگوں کو پہنچے گی جو دنیا سے ایمان کی حالت میں چلے جائیں اور مشرک نہ ہوں۔''

۴۔ رسولِ گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"قوله عسی ان یبعثك ربك مقامات محمودا هو المقام الذی اشفع لامتی فیه۔"[2]

''مقام محمود جو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۹ میں ہے وہی مقام ہے کہ جس میں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا۔''

۵۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انا اول شافع و اول مشفع"[3]

''میں شفاعت کرنے والا پہلا شخص ہوں گا اور پہلا شخص ہی ہوں گا کہ جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

۶۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"شفاعتی لمن شهد ان لا اله الا الله مخلصا یصدق قلبه لسانه و لسانه قلبه"[4]

''میری شفاعت اس کے لیے ہے جو خدائے واحد پر ایمان رکھتا ہو، اس کی زبان اور دل ایک ہوں۔''

۷۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] مسند احمد ج ۲ ص ۴۲۶

[2] مسند احمد ج ۲ ص ۵۲۸، تھوڑے فرق کے ساتھ ج ۲ ص ۴۴۴ و ص ۴۷۸ اور سنن ترمذی ج ۴ ص ۳۶۵ میں موجود ہے۔

[3] سنن ترمذی ج ۵ ص ۲۴۸، سنن دارمی ج ۱ ص ۲۶۔۲۷

[4] مسند احمد ج ۲ ص ۳۰۷ و ص ۵۱۸

"ان شفاعتی یوم القیامة لا هل الکبائر من امتی" [۱]

''قیامت کے دن میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لیے ہوگی جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں۔''

۸۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"رایت ما تلقی امتی بعدی (ای من الذنوب) فسالت الله ان یولینی شفاعة یوم القیامة فیهم ففعل..." [۲]

''جب میں نے یہ دیکھا کہ میری امت میرے بعد گناہوں سے آلودہ ہو جائے گی تو میں نے خداوند متعال سے دعا کی کہ مجھے مقام شفاعت عطا فرمائے تا کہ قیامت کے دن ان کی شفاعت کروں۔ خدا نے بھی میری دعا قبول فرمائی۔''

۹۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اسعد الناس بشفاعتی یوم القیامة من قال لا اله الا الله خالصا من قلبه او نفسه" [۳]

''قیامت کے دن سب سے زیادہ وہ شخص میری شفاعت سے بہرہ مند ہوگا جو دل اور خلوص سے خدا پر ایمان رکھتا ہو۔''

۱۰۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"انا اول شافع فی الجنة" [۴]

''میں پہلا فرد ہوں جو بہشت میں شفاعت کروں گا۔''

---

[۱] سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۱ اور ذیل کی کتابوں میں کچھ فرق کے ساتھ یہی عبارت موجود ہے۔ مسند احمد ج ۳ ص ۲۱۳، سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۵۳۷، سنن ترمذی ج ۴ ص ۴۵

[۲] مسند احمد ج ۶ ص ۴۲۸

[۳] صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۶

[۴] صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۳۰، سنن دارمی ج ۱ ص ۲۷

۱۱۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"شفاعتی لکل مسلم." [۱]

''جو بھی مسلمان ہو وہ میری شفاعت سے بہرہ مند ہوگا۔''

۱۲۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اذا كان يوم القيامة كنت امام النبيين و خطيبهم وصاحب شفاعتهم غير فخر." [۲]

''جب قیامت آئے گی تو میں انبیاء کا امام اور ان کا خطیب ہوں گا نیز ان کی شفاعت کا مالک ہوں گا، مگر ان درجات کا حامل ہونے کی وجہ سے کسی پر فخر نہیں کرتا ہوں۔''

۱۳۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انا سيد ولد ادم ... واول شافع و اول مشفع و لا فخر ..." [۳]

''میں اولادِ آدمؑ کا سردار ہوں ...... اور پہلا شفاعت کرنے والا اور اولین فرد ہوں کہ جس کی شفاعت قبول کی جائے گی، مگر ان درجات کے ہونے پر میں کسی پر فخر نہیں کرتا۔''

۱۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انی لارجو ان اشفع يوم القيامة عدو ما على الارض من شجرة و مدرة" [۴]

''مجھے امید ہے کہ میں قیامت کے دن درختوں اور روئے زمین پر موجود ڈھیلوں کی تعداد کے برابر مسلمانوں کی شفاعت کروں گا۔''

۱۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[۱] سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۴

[۲] سنن ترمذی ج ۵ ص ۲۴۷، سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۳

[۳] سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۰ اور ذرا سا فرق کے ساتھ صحیح مسلم ج ۷ ص ۵۹ و مسند احمد جلد ۲ ص ۵۴۰

[۴] مسند احمد ج ۵ ص ۳۴۷

"لیخرجن قوم من امتی من النار بشفاعتی یسمعون الجهنمیین"۔[1]

''میری امت کا ایک گروہ میری شفاعت کی وجہ سے آتش جہنم سے باہر آئے گا۔ اسی وجہ سے وہ ''جہنمیان'' کے نام سے پکارا جائے گا۔'' یعنی وہ لوگ جو اہل جہنم تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے نتیجے میں نجات پا گئے۔

۱۶۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

"خیرت بین الشفاعة و بین ان یدخل نصف امتی الجنة فاخترت الشفاعة لا نها اعم و اکفی اترونها للمتقین لا و لکنها للمذنبین الخطائین المتلوثلین۔"[2]

''مجھے دو امر میں اختیار دیا گیا (۱) شفاعت (۲) یہ کہ میری امت میں نصف بہشتی ہوں۔ پس میں نے شفاعت کو اختیار کیا کیونکہ اس کا دامن وسیع اور میری امت کی نجات کے لیے کافی تھا۔ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ شفاعت پرہیزگاروں کے لیے ہے؟ نہیں، بلکہ ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہگار، خطاکار اور آلودہ ہوں گے۔''

۱۷۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں:

"صلی رسول الله لیلة فقرأ بایة حتی اصبح یرکه بهاویسجد بها: "ان تعذبهم فانهم عبادك و ان تغفرلهم فانك انت العزیز الحکیم" فلما اصبح قلت یا رسول الله مازلت تقرء هذه الایة حتی اصبحت ترکع بها و تسجدبها قال: انی سئلت ربی عزوجل الشفاعة لامتی فاعطانیها فهی نائلة ان شاء الله لمن لایشرك بالله عزوجل شیئا۔"[3]

---

[1] سنن ترمذی ج ۴ ص ۱۱۴ و سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۳ اور مختصر فرق کے ساتھ مسند احمد ج ۴ ص ۴۳۴ و سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۵۳۷۔ شاید حدیث کا ترجمہ ہو کہ (میری امت کے کچھ لوگ جو ''جہنمیان'' کے نام سے موسوم ہوں گے میری شفاعت کے نتیجے میں جہنم کی آگ سے آزاد ہو جائیں گے)

[2] سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۱

[3] مسند احمد ج ۵، ص ۱۴۹

''ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح تک نماز پڑھتے رہے، رکوع وسجود کرتے رہے اور مسلسل سورۂ مائدہ کی ۱۱۸۔ویں آیت تلاوت فرماتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں اپنے پروردگار عزوجل سے اپنی امت کے لیے شفاعت طلب کررہا تھا۔ خدا نے میری دعا قبول فرمائی۔ پس میری شفاعت خدا کی چاہت پر ان لوگوں کو پہنچے گی جو مشرک نہ ہوں اور خدا پر ایمان رکھتے ہوں۔''

۱۸۔ پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

''یشفع النبیون والملائکة والمومنون فیقول الجبار بقیت شفاعتی۔'' [۱]

''انبیاء وفرشتے اور مومنین شفاعت کریں گے۔ تب خداوند متعال فرمائے گا کہ میری شفاعت باقی رہ گئی ہے۔''

یعنی ان میں سے کچھ وہ لوگ جو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے نجات نہ پا سکے ہوں، دوبارہ رحمت الٰہی ان کو شامل ہوگی۔

۱۹۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ان اللہ یخرج قوما من النار بالشفاعة۔'' [۲]

''خدا کچھ لوگوں کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے ذریعے جہنم کی آگ سے نجات دے گا۔''

۲۰۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''یشفع یوم القیامة الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء۔'' [۳]

''قیامت کے دن بالترتیب انبیاء، ان کے بعد علماء اور پھر راہِ حق کے شہداء شفاعت کریں گے۔''

۲۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

''فاذا فرغ اللہ عزوجل من القضاء بین خلقه واخرج من النار من یرید ان یخرج امر اللہ الملائکة و الرسل ان تشفع فیعرفون بعلا ماتهم ان

[۱] صحیح بخاری ج۹ ص ۱۶۰ اور کچھ فرق کے ساتھ مسند احمد ج ۳ ص ۹۴ میں

[۲] صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۲۲ اور مختصر فرق کے ساتھ صحیح بخاری کی جلد ۸ ص ۱۴۳ میں

[۳] سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۳

النار تاکل کل شیء من ابن آدم الا موضع السجود"۔[1]

''جب خدا بندوں کے درمیان فیصلے سے فارغ ہو جائے گا، جن کو جہنم سے نکالنا چاہے گا تو فرشتوں اور پیغمبروں کو ان کی شفاعت کرنے کے بارے میں امر کرے گا اور وہ لوگ جن کی شفاعت ہونی چاہیے ان کی ایک علامت ہوگی۔ وہ اسی علامت سے پہچانے جائیں گے۔ وہ علامت یہ ہے کہ چونکہ وہ لوگ اہل سجدہ و نماز تھے اس لیے دوزخ کی آگ ان کی پیشانیوں کو نہیں جلا سکتی۔''

۲۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"فیوذن للملائکة و النبیین و الشھداء ان یشفعوا فیشفعون و یخرجون من کان فی قلبه ما یزن ذرة من ایمان۔"[2]

''پس اجازت دی جائے گی کہ فرشتے، انبیاء اور شہداء شفاعت کریں۔ تب وہ شفاعت کریں گے اور ہر وہ شخص جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان ہوگا وہ آتش جہنم سے باہر نکال لیا جائے گا۔''

۲۳۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اذا میز اھل الجنة و اھل النار فرض اھل الجنة الجنة و اھل النار النار قامت الرسل فشفعوا۔"[3]

''جب اہل بہشت و دوزخ علیحدہ ہوں گے تو اہل بہشت جنت میں اور دوزخی جہنم میں داخل ہوں گے۔ اسی اثناء میں انبیاء شفاعت کریں گے۔''

۲۴۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"یشفع الانبیاء فی کل من کان یشھدان لا اله الا الله مخلصا فیخرجونھم منھا"[4]

---

[1] سنن نسائی ج ۲ ص ۱۸۱

[2] مسند احمد ج ۵ ص ۱۴۳ اختصار کے ساتھ

[3] مسند احمد ج ۳ ص ۳۲۵

[4] مسند احمد ج ۳ ص ۱۲

''انبیاء ان لوگوں کے حق میں جو اخلاص کے ساتھ خدا کی وحدانیت پر گواہی دیتے تھے شفاعت کریں گے اور ان کو جہنم سے باہر نکالیں گے۔''

۲۵۔ "انه (ص) ذکر الشفاعة فقال ان الناس یعرضون علی جسر جهنم...... و بجنبتیه الملائکة یقولون اللهم سلم سلم......" [۱]

''رسولِ خداؐ نے مسئلہ شفاعت کا ذکر فرمایا اور فرمایا: ''جب لوگ جہنم کے پل سے گزرنا چاہیں گے تو وہ فرشتے جو پل کے دونوں طرف ہیں ان کے حق میں دعا کریں گے (اور شفاعت کریں گے) کہ اس خطرناک منزل سے سلامتی کے ساتھ گزر جائیں۔''

۲۶۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

"اما اهل النار الذین هم اهلها فلا یموتون فیها و لا یحیی ولکن الناس اصابتهم نار بذنوبهم او بخطایاهم فاما تتهم اماتة حتی اذا کانوا فحما اذن فی الشفاعة فیخرجون ضبائر ضبائر" [۲]

''مگر وہ لوگ جو مشرک اور جہنمی ہیں کہ ہمیشہ وہاں پر رہیں گے نہ تو وہ مریں گے اور نہ زندہ ہوں گے، مگر وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھتے تھے، لیکن اپنے گناہوں اور خطاؤں کی وجہ سے آتش جہنم میں مبتلا ہوئے ہیں وہ مدتوں جہنم میں رہیں گے تب شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔ پھر شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے نتیجے میں وہ لوگ گروہ گروہ ہو کر آتش جہنم سے رہائی پائیں گے۔''

۲۷۔ پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

"فیشفعون حتی یخرج من قال لا اله الا الله ممن فی قلبه میزان شعیرة۔" [۳]

---

[۱] مسند احمد ج ۳ ص ۲۶

[۲] مسند احمد ج ۳ ص ۷۹ اور مختصر فرق کے ساتھ ذیل کی کتب میں دیکھیے۔ سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۱ اور سنن دارمی ج ۲ ص ۳۳۲ نیز مسند احمد ج ۳ ص ۵

[۳] مسند احمد ج ۳ ص ۳۴۵

''اس وقت ان کی شفاعت ہوگی یہاں تک کہ وہ ہر شخص کہ جس کے دل میں جو کہ دانہ برابر بھی ایمان ہو جہنم کی آگ سے نجات پائے گا۔''

۲۸۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یشفع الشهید فی سبعین انساناً من اهل بیته"[1]

''راہ خدا کا شہید اپنے اقرباء میں سے ستر افراد کے حق میں شفاعت کرے گا۔''

۲۹۔ حضرت علی علیہ السلام رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

"من تعلم القرآن (من قرأ القران) فاستظهره فاحل حلاله و حرم حرامه ادخله الله به الجنة و شفعه فی عشرة من اهل بیته کلهم قد وجبت له النار"[2]

''جو شخص قرآن سیکھے (جو شخص قرآن پڑھے) اور اسے حفظ کرے، اس کے حلال کو حلال اور حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھے (قرآن کے احکام پر عمل کرے) تو خدا اُسے اہل قرآن ہونے کی بناء پر بہشتی قرار دے گا اور اس کے دس عزیز و اقارب کے حق میں اس کی شفاعت قبول فرمائے گا جو جہنم کی آگ کے مستحق تھے۔''

۳۰۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"اذا بلغ الرجل التسعین غفر الله ما تقدم من ذنبه و ما تاخر و سمی اسیر الله فی الارض و شفع فی اهله"[3]

''جب ایک انسان (مومن) نوے سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور عزیز و اقارب کے حق میں اس کی شفاعت کو بھی قبول فرماتا ہے۔''

۳۱۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۵ اور مختصر فرق کے ساتھ ایک حدیث کے ضمن میں مسند احمد ج ۴ ص ۱۳۱ اور ترمذی ج ۳ ص ۱۰۶ میں بھی موجود ہے

[2] سنن ترمذی ج ۴ ص ۲۴۵، سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۷۸، مسند احمد ج ۱ ص ۱۴۸ و ص ۱۴۹

[3] مسند احمد ج ۲ ص ۸۹ اور مختصر فرق کے ساتھ ج ۳ ص ۲۱۸ میں یہی عبارت موجود ہے۔

"لیدخلن الجنة بشفاعة رجل من امتی اکثر من بنی تمیم..."[۱]

''میری امت کے ایک شخص کی شفاعت کے نتیجے میں قبیلہ بنی تمیم کی تعداد میں وہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے۔'' (قبیلہ بنی تمیم کی تعداد بہت زیادہ تھی)

۳۲۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان من امتی لمن یشفع لاکثر من ربیعة و مضر......"[۲]

''میری امت میں ایسے افراد موجود ہیں جو قبیلہ ربیعہ و مضر کی تعداد سے زیادہ تعداد والی ایک جماعت کی شفاعت کریں گے۔'' (ربیعہ و مضر عرب کے دو بہت بڑے قبیلے تھے)

۳۳۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لیدخلن الجنة بشفاعة رجل لیس بنبی مثل الحیین اومثل احد الحیین ربیعة و مضر......"[۳]

''ایک شخص کی شفاعت کے نتیجے میں جو کہ نبی بھی نہیں، دو قبیلے ربیعہ و مضر کی تعداد کے برابر یا ہر دو قبیلوں کی مجموعی تعداد کے برابر افراد جنت میں داخل ہوں گے۔''

۳۴۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان الرجل من امتی لیشفع للفئام من الناس فیدخلون الجنة وان الرجل یشفع لقبیلة و ان الرجل لیشفع للعصبة و ان الرجل لیشفع للثلاثة و للرجلین و للرجل"[۴]

''میری امت میں سے ایک شخص لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے حق میں شفاعت کرے گا۔ وہ لوگ ایک اور قبیلے کی شفاعت کریں گے، ایک شخص اپنے رشتہ داروں کی، ایک اور شخص تین افراد کی، ایک اور شخص دو افراد کے لیے

---

[۱] سنن دارمی ج ۲ ص ۳۲۸، سنن ترمذی ج ۴ ص ۴۶، سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۴۴۴، مسند احمد ج ۳ ص ۴۷۰ و ج ۵ ص ۳۶۶

[۲] مسند احمد ج ۴ ص ۲۱۲ نیز اسی صفحے میں ذرا سے فرق کے ساتھ یہی عبارت موجود ہے۔

[۳] مسند احمد ج ۵ ص ۲۵۷

[۴] مسند احمد ج ۳ ص ۲۰ اور مختصر فرق کے ساتھ مسند احمد کی ج ۳ ص ۶۳ و سنن ترمذی ج ۴ ص ۴۶ میں موجود ہے۔

جبکہ بعض ایک آدمی کے حق میں شفاعت کریں گے۔'' یعنی جو بھی خدا کے نزدیک تر ہوگا وہی بیشتر شفاعت کرے گا۔

۳۵۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"یصف الناس (اهل الجنة) صفوفاً فیمر الرجل من اهل النار علی الرجل فیقول یا فلان اماتذکر یوم استقیت فستقیتك شربة قال فیشفع له و یمر الرجل فیقول اماتذکر یوم ناولتك طهوراً فیشفع له۔"[۱]

''اہل بہشت صفیں بنا کر کھڑے ہوں گے تو اس اثناء میں ایک جہنمی بہشت والے کے پاس سے گزرے گا اور اس سے کہے گا: ''کیا تمہیں یاد ہے کہ ایک دن تو نے پانی طلب کیا اور میں نے تمہیں سیراب کیا تھا (پس یہاں تو میری مدد کر) اس موقع پر وہ شخص جو اہل بہشت میں سے ہے اس کے حق میں شفاعت کرے گا۔ اسی طرح ایک اور جہنمی جنت والے کے نزدیک سے گزرے گا اور اس سے کہے گا کہ کیا تمہیں یاد ہے کہ ایک دن میں نے تم کو وضو کے لیے پانی دیا تھا (یہاں میری مدد کر) پس وہ شخص اس کی شفاعت کرے گا۔''

۳۶۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

"لایصبر علی لا وائها (ای المدینة) و شدتها الا کنت له شفیعا او شهیداً یوم القیامة[۲]

''جو شخص مدینہ میں رہ کر بھوک اور سختیوں پر صبر کرے گا تو میں قیامت کے دن اس کا شفیع یا گواہ ہوں گا۔''

یعنی اگر گناہگار ہو تو اس کا شفیع اور اگر فرماں بردار ہو تو اس کا گواہ ہو جاؤں گا۔

۳۷۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث کے ضمن میں منقول ہے:

"قال لخادمه ما حاجتك" قال: حاجتی ان تشفع لی یوم القیامة قال و

---

[۱] سنن ابن ماجہ ج ۲ ص ۱۲۱۵

[۲] موطا مالک ج ۲ ص ۲۰۱، مسند احمد ج ۲ ص ۱۱۹ و ص ۱۳۳ اور اسی کتاب کی دیگر چند جگہوں پر یہ عبارت موجود ہے۔

من دلك على هذا قال ربي قال اما فاعنى بكثرة السجود"[1]

''آپؐ نے اپنے خادم کو ارشاد فرمایا کہ تیری کیا حاجت ہے؟ اس نے عرض کی ''میری حاجت یہ ہے کہ قیامت کے دن آپؐ میری شفاعت فرمایئے۔'' فرمایا: ''یہ بات تم کو کس نے سکھائی؟'' کہا: ''میرے پروردگار نے'' (میرے دل میں القا کیا) فرمایا: ''پس سجدوں کی کثرت سے اس کام میں میری مدد کر۔''

یعنی تیری عبادت موجب بنتی ہے کہ میں آسانی سے تیری شفاعت کرسکوں۔

۳۸۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من صلى على محمد و قال اللهم انزله المقعد المقرب عندك يوم القيامة وجب له شفاعتي۔"[2]

''جو شخص بھی مجھ پر درود وسلام بھیجے اور کہے، اے خدا! اسے قیامت کے دن اپنے نزدیک قرب عطا فرما تو اس کے لیے مجھ پر شفاعت واجب ہوگی۔''

یعنی ضرور اس کی شفاعت کروں گا۔

۳۹۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من قال حين يسمع النداء "اللهم رب هذه الدعوة التامة و الصلوة القائمة ات محمدا الوسيلة و الفضيلة و ابعث مقاماً محمودا الذى وعدته حلت له شفاعتي يوم القيامة۔"[3]

''جو شخص بھی اذان سنتے وقت یہ دعا پڑھے ''اللّٰھم رب......الخ'' تو مجھ پر لازم ہوتا ہے کہ روزِ قیامت اس کے حق میں شفاعت کروں۔''

۴۰۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] مسند احمد ج ۲ ص ۵۰۰ اور ذرا فرق کے ساتھ ج ۴ ص ۹۵ میں بھی موجود ہے۔

[2] مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۸

[3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۹ اور مختصر فرق کے ساتھ ذیل کی کتابوں میں موجود ہے۔ مسند احمد ج ۳ ص ۳۵۴، سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۱۲۴، سنن ترمذی ج ۱ ص ۱۳۶، سنن نسائی ج ۲ ص ۲۲، سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۱۲۶

"اذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل ما يقول ثم صلوا علی فانه من صلی علی صلوة صلی الله عليه عشرا ثم سلوا الله عزوجل لی الوسيلة... فمن سال الله لی الوسيلة حلت عليه الشفاعة." [۱]

''جب موذن کی آواز سنو تو جو کچھ وہ کہتا ہے تم بھی کہو (اذان کے جملوں کو دہراؤ) پھر مجھ پر درود بھیجو، کیونکہ جو بھی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے خدا دس مرتبہ اس پر درود اور رحمت نازل کرتا ہے۔ اس کے بعد خدا سے میرے لیے مقام وسیلہ (کہ یہ ایک بلند مقام ہے) طلب کرو۔ جو شخص بھی میرے لیے یہ مقام طلب کرے گا میری شفاعت اس کو پہنچے گی۔''

۴۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من غش العرب لم يدخل فی شفاعتی ولم مودتی." [۲]

''جو شخص بھی عربوں (عرب مسلمانوں) کے ساتھ خیانت کرے میری شفاعت سے محروم ہو جائے گا اس کو میری دوستی بھی فائدہ نہ دے گی۔''

۴۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان اللعانين لا يكونون شهداء و لا شفعاء يوم القيامة." [۳]

''زبان سے برا بھلا کہنے والے اور گالی گلوچ دینے والے لوگ قیامت کے دن کسی کے حق میں شفاعت نہیں کر سکتے۔ نیز کسی کے گواہ بھی نہیں بن سکتے۔''

۴۳۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تعلموا القران فانه شافع لاصحابه يوم القيامة." [۴]

''قرآن سیکھو، کیونکہ قیامت کے دن اہل قرآن کی شفاعت کرتا ہے۔''

---

[۱] سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۱۲۴، صحیح مسلم ج ۲، ص ۴، سنن ترمذی ج ۵ ص ۲۴۶ و ص ۲۴۷، سنن نسائی ج ۲ ص ۲۲ اور مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۸

[۲] مسند احمد ج ۱ ص ۷۲

[۳] مسند احمد ج ۲ ص ۴۴۸ اور صحیح مسلم ج ۸ ص ۲۴

[۴] مسند احمد ج ۵ ص ۲۵۱ اور مختصر فرق کے ساتھ ج ۵ کے ص ۲۴۹ میں بھی موجود ہے۔

۴۴۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان سورة من القران ثلاثین اية شفعت لرجل حتی غفر له وهی تبارك الذی بیده الملك"[1]

''سورہ تبارک کہ جس کی تیس آیات ہیں اس شخص کے لیے (جو اس کی تلاوت کرے) شفاعت کرے گی تا کہ اسے بخش دیا جائے۔''

۴۵۔ پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الصیام والقران یشفعان للعبد یوم القیامة۔ یقول الصیام ای رب منعته الطعام و الشهوات بالنهار فشفعنی فیه و یقول القران منعته النوم باللیل فشفعنی فیه قال فیشفعان"[2]

''روزہ اور قرآن اس شخص کی کہ جس نے روزہ رکھا ہو اور راتوں کو قرآن کی تلاوت کی ہو شفاعت کرتے ہیں۔ روزہ کہے گا کہ اے خدا میں نے اس شخص کو دن کے وقت غذا کھانے اور شہوات سے روکا۔ پس اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما اور قرآن کہے گا میں نے اس آدمی کو رات کی نیند سے باز رکھا۔ پس اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرما۔ اس شخص کے حق میں دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

یہ تھیں وہ پینتالیس روایات جو اہل سنت کی معتبر ترین احادیث کی کتابوں سے منتخب کی گئیں۔ یہ تمام روایات آنحضرتؐ کے اصحاب کے واسطے ہی سے آپؐ سے روایت کی گئی ہیں۔

---

[1] مسند احمد ج ۲ ص ۱۹۹ و ص ۳۲۱ اور سنن ترمذی ج ۴ ص ۲۳۸

[2] مسند احمد ج ۲ ص ۱۷۴

شفاعت سے متعلق کتب شیعہ سے پچپن ۵۵ روایات

پہلے وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں، ہم نقل کرتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انی لاشفع یوم القیامة فاشفع و یشفع علی فیشفع و یشفع اهل بیتی فیشفعون"[۱]

''میں قیامت کے دن شفاعت کروں گا اور میری شفاعت قبول ہوگی۔ علیؑ بھی شفاعت کریں گے ان کی شفاعت بھی قبول ہوگی۔ میرے اہل بیت بھی شفاعت کریں گے ان کی شفاعت بھی قبول کی جائے گی۔''

۲۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اعطیت خمساً... اعطیت الشفاعة"[۲]

''خدا نے مجھے پانچ امتیاز عطا کیے ہیں...... ان میں سے ایک شفاعت ہے۔''

۳۔ حضرت ابوذرؓ اور سلیمانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

"قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم اعطانی مسالة فادخرت مسالتی لشفاعة المومنین من امتی یوم القیامة ففعل ذالك۔"[۳]

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خدا نے مجھے ایک مقبول دعا (کا شرف) عطا کیا۔ پس میں نے اسے قیامت کے دن اپنی امت کے صاحبانِ ایمان افراد کے حق میں شفاعت کی خاطر ذخیرہ کیا اور خداوند متعال نے بھی اسے قبول فرمالیا۔''

---

[۱] مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۱۵ اور مختصر فرق کے ساتھ مجمع البیان ج ۱ ص ۱۰۴ پر بھی موجود ہے۔

[۲] من لایحضرہ الفقیہ ج ۱ ص ۱۵۵

[۳] امالی شیخ طوسی ص ۳۶

۴۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ان من امتی من سیدخل اللہ الجنة بشفاعة اکثر من مضر" [۱]

''میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو قبیلہ مضر کی تعداد سے زیادہ افراد کی شفاعت کریں گے۔''

(قبیلہ مضر عرب کا ایک کثیر تعداد قبیلہ تھا)

۵۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انما شفاعتی لاهل الکبائر من امتی" [۲]

''بے شک میری شفاعت میری امت کے ان افراد کے لیے ہوگی جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں۔''

۶۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الشفعاء خمسة القران والرحم والامانة و نبیکم و اهل بیت نبیکم" [۳]

''شفاعت کرنے والے پانچ ہیں: ۱۔قرآن، ۲۔صلہ رحم، ۳۔امانت، ۴۔رسول اکرمؐ، ۵۔اہل بیت علیہم السلام''

۷۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یقول الرجل من اهل الجنة یوم القیامة ای رب عبدك فلان سقانی شربة من ماء فی الدنیا فشفعنی فیه فیقول اذهب فاخرجه من النار فیذهب فیتجسس فی النار حتی یخرجه منها" [۴]

''قیامت کے دن اہل بہشت میں سے ایک کہے گا: ''اے خدا فلاں شخص جو جہنم میں ہے اس نے دنیا میں ایک دفعہ مجھے پانی پلایا ہے پس مجھے اس کا شفیع قرار دے۔ خطاب ہوگا: جاؤ اور اسے آگ سے باہر نکال دو۔ وہ

---

[۱] مجمع البیان ج ۱۰ ص ۳۹۲

[۲] من لایحضرہ الفقیہ ج ۳ ص ۳۷۶

[۳] مناقب جلد ۲ ص ۱۴

[۴] مجمع البیان ج ۱۰ ص ۳۹۲

جائے گا اور اُسے تلاش کرے گا تا کہ اُسے پانے کے بعد آتش جہنم سے نجات دے۔''

۸۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ادخرت شفاعتی لاهل الکبائر من امتی"[۱]

''میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے ان گناہگار افراد کے حق میں ذخیرہ کیا ہے جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔''

۹۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ فرمایا:

"ان ادنی المومنین شفاعة لیشفع فی اربعین من اخوانه"[۲]

''مومنین میں سے وہ جو سب سے کم تر شفاعت کرنے والا ہوگا وہ اپنے چالیس برادرانِ دینی کی شفاعت کرے گا۔''

۱۰۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"ایما امرأة صلت فی الیوم واللیلة خمس صلوة وصامت شهر رمضان و حجت بیت الله الحرام و زکت مالها واطاعت زوجها دوالت علیا بعدی وخلت الجنة بشفاعة بنتی فطامة"[۳]

''جو عورت اپنی نماز پنجگانہ پڑھے، ماہِ رمضان کے روزے رکھے، استطاعت کی صورت میں خانہ خدا کی زیارت (حج) کو جائے، اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرے، اپنے شوہر کی اطاعت کرے اور میرے بعد علیؑ کو اپنا امام مانے ایسی عورت میری بیٹی فاطمہؑ کی شفاعت کے ذریعے جنت میں داخل ہوگی۔''

امیر المومنین علیہ السلام سے چند احادیث

۱۱۔ مولا علیؑ نے ایک حدیث میں فرمایا:

---

[۱] مجمع البیان ج ۱ ص ۱۰۴۔ طبرسی مرحوم اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ ایک ایسی روایت ہے کہ جسے تمام مسلمان مانتے ہیں۔

[۲] مجمع البیان ج ۱ ص ۱۰۴

[۳] امالی صدوق ص ۲۹۱

"لنا شفاعة ولاهل مودتنا شفاعة"[1]

''ہم شفاعت کریں گے اور ہمارے دوست بھی شفاعت کریں گے۔''

۱۲۔ فرمایا مولا علیؑ نے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ثلاثة يشفعون الى الله عزوجل فيشفعون الانبياء ثم العلماء ثم الشهداء"[2]

''تین گروہ ہیں جو خدا کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے اوران کی شفاعت قبول بھی ہوگی۔ ۱۔انبیاء، ۲۔علمائے دین، ۳۔راہِ خدا کے شہداء''

۱۳۔ مولا علیؑ نے اپنے فرزند محمد بن الحنفیہ کو نصیحت فرمائی کہ:

"اقبال من متنصل عذره فتنالك الشفاعة"[3]

''اس آدمی کی معذرت قبول کر جو تجھ سے عذرخواہی کرے تا کہ شفاعت تیرے نصیب ہو۔''

۱۴۔ حضرت علیؑ نے فرمایا:

"اعملوا انه (اى القران) شافع و مشفع و قائل و مصدق و انه من شفع له القران يوم القيامة شفع فيه"[4]

''جان لو کہ قرآن ایسا شفاعت کرنے والا ہے کہ جس کی شفاعت قبول ہوگی اور ایسا کہنے والا ہے کہ جس کے کلام کی تصدیق ہوگی۔قرآن روزِ آخرت جس کے حق میں بھی شفاعت کرے اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

۱۵۔ مولا علیؑ نے فرمایا:

"قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم : اذا قمت المقام المحمود تشفعت فى اصحاب الكبائر من امتى فيشفعنى الله فيهم والله لا

[1] خصال صدوق ص ۶۲۴

[2] خصال صدوق ص ۱۵۶

[3] من لا یحضرہ الفقیہ ج ۴ ص ۲۷۹

[4] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۱

تشفعت فیمن اذی ذریتی"[۱]

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب مقام محمود (مقام شفاعت) پر کھڑا ہوگا تو اپنی امت کے ان افراد کے بارے میں شفاعت کروں گا جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوئے تھے۔ خدا ان کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائے گا۔ خدا کی قسم جنہوں نے میری ذریت اور میرے خاندان کو اذیت پہنچائی ہوئیں ان کی شفاعت نہ کروں گا۔''

حضرت امام حسنؑ سے ایک حدیث

۱۶۔ حضرت امام حسنؑ فرماتے ہیں:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال فی جواب نفر من الیھود سالوہ عن مسائل: و اما شفاعتی ففی اصحاب الکبائر ماخلا اھل الشرك و الظلم۔"[۲]

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند یہودیوں کو ان کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: میری شفاعت ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں سوائے شرک اور ظلم کے (کہ یہ دونوں شفاعت سے مانع ہیں)۔''

حضرت امام حسینؑ سے ایک حدیث

۱۷۔ حضرت امام حسین علیہ السلام سے مروی ہے کہ مدینہ سے نکلتے وقت (کربلا کے واقع میں) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امامؑ کو خواب میں فرمایا:

"حبیبی یا حسین کانی اراك عن قریب مرملا بدمائك مذبوحا بارض کربلا علی ایدی عصابة من امتی و انت مع ذالك عطشان لاتسقی وظمان لاتردی و ھم ماذالك یرجون شفاعتی لا انالھم اللہ شفاعتی یوم

[۱] امالی صدوق ص ۱۷۷

[۲] خصال ص ۲۵۵

القیامة۔"[1]

''اے میرے لال حسینؑ گویا تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ عنقریب تم اپنے ہی خون میں غلطاں ہوگے اور زمین کربلا میں تشنہ لب میری امت کے ایک گروہ کے ہاتھوں شہید ہو جاؤ گے۔ یہ لوگ اپنے اس عمل کے باوجود میری شفاعت کی تمنا رکھتے ہیں۔ خدا ان کو میری شفاعت نصیب نہ کرے گا۔''

حضرت امام سجادؑ سے چند احادیث

۱۸۔ صحیفہ سجادیہ کی دوسری دعا میں یوں مذکور ہے:

"عرفه فی اهله الطاهرین و امته المومنین من حسن الشفاعة اجل ماوعدته"[2]

''ان کے اہل بیت اطہار اور مومنین کی جماعت کے بارے میں جس قابل قبول شفاعت کا تو نے اُن سے وعدہ فرمایا ہے اس وعدہ سے بڑھ کر انہیں عطا فرما۔''

۱۹۔ ایک اور دعا میں امامؑ فرماتے ہیں:

"اللهم صلی علی محمد وال محمد و شرف بنيانه و عظم برهانه و ثقل ميزانه و تقبل شفاعته۔"[3]

''اے خدا محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود بھیج اور ان کا درجہ بلند، اُن کے برہان کو عظیم اور انکے ترازو کو سنگین فرما اور ان کی شفاعت قبول فرما۔''

۲۰۔ ایک اور دعا میں فرماتے ہیں:

"فانی لم اتك ثقة منی بعمل صالح قدمته و لا شفاعة مخلوق رجوته الا

---

[1] مکاتیب الائمۃ ج ۲ ص ۴۱

[2] دعا دوم صحیفہ سجادیہ

[3] صحیفہ سجادیہ دعا ۴۲

شفاعة محمد و اهل بیته علیه و علیهم سلامك"[۱]

''اے پروردگار! میں جو تیری بارگاہ میں آیا ہوں اپنے کسی کیے ہوئے نیک عمل و کردار پر اعتماد کر کے نہیں آیا ہوں اور نہ سوائے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی شفاعت کے کسی مخلوق کی شفاعت پر اُمید کر کے آیا ہوں۔''

۲۱۔ ایک اور دعا میں ارشاد فرمایا:

"الهی لیس لی وسیلة الیك الا عواطف رأفتك ولا ذریعة الیك الا عوارف رحمتك و شفاعة بنبیك نبی الامة"[۲]

''اے خدا! تیری بارگاہ میں سوائے تیری مہربانی و توجہ کے میرا کوئی وسیلہ نہیں اور تیری بخشش وعنایت اور تیرے پیغمبر جو پیغمبرِ رحمت ہیں، کی شفاعت کے سوا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔''

۲۲۔ ایک اور دعا میں فرمایا:

"صل علی محمد و آله و اجعل توسلی به شافعاً یوم القیامة نافعا انك انت ارحم الراحمین۔"[۳]

''بارِالٰہا! محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود بھیج اور میرے اُن سے توسل کو میرا شفیع قرار دے تاکہ قیامت کے دن میرے لیے سودمند ہو تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔''

حضرت امام باقرؑ سے چھ احادیث

۲۳۔ امام باقرؑ نے فرمایا:

"ان لرسول الله صلی الله علیه وآله وسلم شفاعة فی امته"[۴]

''بے شک رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی امت کے حق میں شفاعت ثابت ہے۔''

۲۴۔ آپؑ نے مزید فرمایا:

---

[۱] صحیفہ سجادیہ دعا ۴۸

[۲] ملحقات صحیفہ ص ۲۵۰ چاپ اسلامیہ

[۳] ملحقات صحیفہ ۲۲۹

[۴] محاسن برقی ص ۱۸۴

"من تبع جنازة مسلم اعطی یوم القیامة اربع شفاعات..."[۱]
''جو شخص کسی مسلمان کی تشیع جنازہ کرے قیامت کے دن اسے چار شفاعتوں کا حق دیا جائے گا۔''

۲۵۔ امام باقر علیہ السلام نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"یشفع الرجل فی القبیلة و یشفع الرجل لا هل البیت و یشفع الرجل للرجلین علی قدر عمله فذالك المقام المحمود"[۲]
''ہر شخص اپنے عمل کے تحت شفاعت کرے گا۔ممکن ہے ایک شخص ایک قبیلہ کی شفاعت کرے یا صرف اپنے عزیز و اقارب کی شفاعت کرے یا دو افراد کی شفاعت کرے اور یہ شفاعت کرنا وہی مقام محمود ہے (قرآن میں جس کا ذکر ہوا ہے)۔''

۲۶۔ حضرت امام باقرؑ نے ایک حدیث میں فرمایا:

"ان اونی المومنین شفاعة لیشفع لثلاثین انساناً فعنند ذالك یقول اهل النار فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم"[۳]
''ایک مومن جو سب سے کم تر شفاعت کرے گا وہ تیس افراد کی شفاعت ہوگی۔ جب اہل جہنم یہ شفاعت دیکھیں گے تو سورہ شعراء کی ایک سو ایک والی آیت پڑھیں گے جس میں ارشاد ہوتا ہے (پس ہمارا کوئی شفاعت کرنے والا نہیں......)۔''

۲۷۔ بشر بن شریح بصری جو کہ اہل سنت میں سے ہے کہتا ہے کہ میں نے امام محمد باقرؑ سے عرض کی:

"اية اية فی کتاب الله ارجی؟ قال ما یقول فیها قومك قال قلت یقولون "یاعبادی الذین اسرفوا علی انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله" قال: لکنا اهل البیت لا نقول ذالك قال قلت فای شیء تقولون فیها قال تقوی و لسوف یعطیك ربك فترضی۔ الشفاعة والله الشفاعة والله

---

[۱] تہذیب ج۱ ص ۴۵۵
[۲] مناقب جلد ۲ ص ۱۴
[۳] کافی ج ۸ ص ۱۰۱ اور اسی مضمون کے قریب ایک روایت تفسیر فرات کوفی کے ص ۱۰۸ میں بھی ہے۔

الشفاعة۔"[1]

''قرآن مجید کی کون سی آیت سب سے زیادہ لوگوں کو امید دلاتی ہے؟'' حضرتؑ نے فرمایا: ''تمہارے علماء اس مسئلے میں کیا کہتے ہیں؟'' اس نے کہا ''سورۂ زمر کی تہترویں آیت (یاعبادی الذین...) (اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔)'' حضرت نے فرمایا: ''لیکن ہم اہل بیت رسالت یہ نہیں کہتے۔'' اس نے پوچھا: ''تو پھر آپؑ کیا کہتے ہیں؟'' حضرتؑ نے فرمایا: ہم کہتے ہیں: "ولسوف یعطیك ربك فترضی قیامت کے دن خدا تم کو اس قدر عطا کرے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے، خدا کی قسم اس سے مراد شفاعت ہے، خدا کی قسم شفاعت ہے۔''

۲۸۔ دخل مولی لا امراة علی بن الحسینؑ علی ابی جعفرؑ۔ قال له ابو ایمن فقال یغرون الناس فیقولون شفاعة محمد صلی الله علیه وآله وسلم۔ قال: فغضب ابو جعفرؑ حتی تربد جهه ثم قال ویحك یا ابا ایمن اغرك ان عف بطنك و فرجك اما والله لوقد رایت افزاع یوم القیامة لقد احتجت الی شفاعة محمد صلی الله علیه وآله وسلم ویك وهل یشفع الا لمن قد وجبت له النار۔"[2]

''ایک شخص بنام ابوایمن امام محمد باقر کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے ان کو مغرور بنایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت ہم کو نجات دے گی (جبکہ ہر شخص کو اپنے عمل پر توقع رکھنی چاہیے) امامؑ اس طرح ناراض ہوئے کہ آپؑ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس شخص سے فرمایا: لف ہو تجھ پر اے ابوایمن یہ کہ تم نے صرف اپنے پیٹ اور شرمگاہ کو بچایا ہے اور ان کے ذریعے گناہ نہ کرنے پر مغرور ہو گئے ہو۔ خدا کی قسم اگر قیامت کے خوفناک مناظر کو دیکھ لیا ہوتا تو جان لیتے کہ تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے محتاج ہو۔ وائے ہو تجھ پر کیا جو جہنم کا مستحق ہوا ہے اس کے سوا کسی کی شفاعت ہوتی ہے؟''

---

[1] تفسیر فرات کوفی ص ۱۸

[2] محاسن برقی ص ۱۸۳

حضرت امام صادقؑ سے چند احادیث

۲۹۔ حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے:

"والله لنشفعن لشیعتنا والله لنشفعن لشیعتنا والله لنشفعن لشیعتنا حتی یقول الناس: فمالنا من شافعین ولا صدیق حمیم۔"[۱]

''خدا کی قسم ہم اپنے شیعوں کی شفاعت کریں گے، خدا کی قسم ہم ان کی شفاعت کریں گے۔ خدا کی قسم ہم ان کے حق میں شفاعت کریں گے، یہاں تک کہ اہل جہنم بول اٹھیں گے پس ہمارے لیے کوئی شفاعت کرنے والا نہیں......۔''

۳۰۔ حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"لکل مومن خمس ساعات یوم القیامة یشفع فیها"[۲]

''ہر مومن کے لیے قیامت میں پانچ گھنٹے ہیں اور ان پانچ گھنٹوں میں وہ شفاعت کرے گا۔''

۳۱۔ حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"شفاعتنا لاهل الکبائر من شیعتنا و اما التائبون فان الله عزوجل یقول ما علی المحسنین من سبیل"[۳]

''ہماری شفاعت ان شیعوں کے لیے ہے جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے گناہوں سے توبہ کی ہو (نیک لوگ ہیں اور ان پر کوئی اعتراض نہیں) ان کے بارے میں خدائے متعال سورۂ توبہ کی آیت ۹۱ میں ارشاد فرماتا ہے: "ما علی المحسنین من سبیل" ''نیکوکاروں کے اوپر کسی طرح کا کوئی اعتراض نہیں۔''

۳۲۔ امام صادقؑ کا ارشاد ہے:

"من انکر ثلاثة اشیاء فلیس من شیعتنا: المعراج و المسائلة فی

---

[۱] مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۱۴

[۲] صفات الشیعہ صدوق ص ۱۸۱، حدیث ۳۷

[۳] من لا یحضرہ الفقیہ ج ۳ ص ۳۷۶

البقرو الشفاعة۔"[1]

''جو شخص تین چیزوں کا انکار کرے وہ ہمارے شیعوں میں سے نہیں۔ ا۔ معراج، ۲۔ قبر میں سوال، ۳۔شفاعت۔''

۳۳۔ معاویہ بن عمار کہتے ہیں:

"قل من ذالذی یشفع عندہ الا باذنه قال نحن اولئك الشافعون۔"[2]

''میں نے امام صادقؑ سے آیت الکرسی کے اس جملے (کون ہے جو خدا کی اجازت کے سوا اس کے ہاں شفاعت کرے) کے بارے میں پوچھا۔ آپؑ نے فرمایا: ''وہ شفاعت کرنے والے ہم ہیں (جو خدا کی اجازت سے شفاعت کرتے ہیں)۔''

۳۴۔ امام صادقؑ سے پوچھا گیا:

"عن المومن هل یشفع فی اهله قال نعم المومن یشفع فیشفع۔"[3]

''کیا مومن اپنے عزیز و اقارب کے حق میں شفاعت کر سکتا ہے؟'' فرمایا: ''ہاں مومن شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

۳۵۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

"اذا کان یوم القیامة نشفع فی المذنب من شیعتنا فاما المحسنون فقد نجاهم الله"[4]

''قیامت کے دن ہم اپنے گنہگار شیعوں کی شفاعت کریں گے جبکہ نیکوکاروں کو خدا نے نجات دی ہے (انہیں شفاعت کی ضرورت نہیں)۔''

۳۶۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

---

[1] امالی صدوق ص ۱۷۷

[2] تفسیر عیاشی ج ۱ ص ۱۳۶ اور مختصر فرق کے ساتھ محاسن برقی ص ۱۸۳ میں بھی ہے۔

[3] محاسن برقی ص ۱۸۴

[4] فضائل الشیعہ صدوق ص ۱۵۹ حدیث ۴۵

"نمجد ربنا و نصلی علی تبینا و نشفع لشیعتنا فلا یرونا ربنا."[۱]

''میں اپنے پروردگار کی تمجید کرتا ہوں اور پیغمبروں پر درود بھیجتا ہوں اور اپنے شعیوں کی شفاعت کرتا ہوں۔ ہمارا پروردگار ہماری شفاعت رد نہیں کرے گا۔''

۳۷۔ امام مالک صادقؑ کا ارشاد ہے:

"ان المومن لیشفع لحمیمه الا ان یکون ناصبا ولو ان ناصبا شفع له کل نبی مرسل ولملك مقرب ما شفعوا۔"[۲]

''مومن اپنے دوست کے حق میں شفاعت کرے گا، مگر یہ کہ اس کا دوست دشمن اہلبیت ہو کہ اگر تمام مرسل انبیاء اور خدا کے مقرب فرشتے ناصبی اور دشمن اہل بیت کے لیے شفاعت کریں تو بھی ان کی شفاعت نہیں سنی جائے گی۔''

۳۸۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

"ان الجار لیشفع لجاره و الحیم لحمیمه ولو ان المئاکة المقربین والانبیاء المرسلین شفعوا فی ناصب ما شفعوا."[۳]

''ہمسایہ اپنے ہمسائے کی اور رشتے دار اپنے رشتے دار کی شفاعت کرے گا۔ لیکن اگر ناصبی اور اہلبیت طہارت و عصمت کے دشمن کی شفاعت خدا کے مقرب فرشتے اور انبیاء بھی کریں تو ان کی شفاعت قبول نہ کی جائے گی۔''

۳۹۔ ابان بن تغلب نے یا امام صادقؑ سے روایت کی ہے:

"ان المومن لیشفع یوم القیامة لاهل بیته فیشفع فیهم حتی یبقی خادمه فیقول فیرفع سبابتیه یارب خویدمی کان یقینی الحرو البرد فیشفع فیه۔"[۴]

---

[۱] محاسن برقی ص ۱۸۳۔ یہی روایت بحارج ۸ ص ۴۱ میں کتاب کافی سے امام کاظمؑ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے۔

[۲] ثواب الاعمال ص ۲۵۱

[۳] محاسن برقی ص ۱۸۴

[۴] بحارج ۸ ص ۵۶ و ص ۶۱ نقل از اختصاص مفید اور تفسیر عیاشی کچھ مختصر عبارت کے ساتھ۔

''مومن قیامت کے دن اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے حق میں شفاعت کرے گا یہاں تک کہ اس کا خادم باقی رہ جائے گا۔ اس وقت اپنی دونوں شہادت والی انگلیاں بلند کرکے کہے گا: ''اے خدا میرے خادم نے مجھے گرمی اور سردی سے بچایا تھا۔ پس خادم کے حق میں بھی اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

۴۰۔ امام صادقؑ ایک رسالے میں جو آپؑ نے اپنے اصحاب کے لیے تحریر فرمایا تھا یوں مرقوم فرماتے ہیں:

"واعلموا انه ليس يغني عنكم من الله احدمن خلقه شيئا لاملك مقرب ولانبي مرسل ولامن دون ذالك فمن سره ان ينفعه شفاعة الشافعين عندالله فليطلب الى الله ان يرضى عنه۔" [۱]

''جان لو کہ کوئی بھی شخص تمہیں نفع نہیں پہنچا سکتا، نہ خدا کا مقرب فرشتہ، نہ اس کا مرسل پیغمبر اور نہ دوسرے لوگ۔ پس جو شخص چاہتا ہے کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اس کے لیے فائدہ مند ہو تو وہ خدا سے طلب کرے کہ اس پر راضی ہو۔''

یعنی نیک کام انجام دے تا کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اسے شامل ہو۔

۴۱۔ امام صادقؑ نے فرمایا:

"اذا كان يوم القيامة بعث الله العالم و العابد فاذا وقفابين يدى الله عزوجل قيل للعابد انطلق الى الجنة و قيل للعالم قف تشفع للناس بحسن تاديبك لهم۔" [۲]

''قیامت کے دن خدا عالم و عابد دونوں کو اپنی بارگاہ میں محشور کرے گا۔ اس وقت عابد سے کہا جائے گا کہ جنت میں چلا جا جبکہ عالم سے کہا جائے گا: ٹھہر واور جن کی تم نے تربیت کی ہے اور تعلیم دی ہے ان کی شفاعت کرو۔''

۴۲۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"لايملكون الشفاعة الا من اتخذ عندالرحمن عهداً" کی تفسیر میں فرمایا:

---

[۱] کافی ج ۸ ص ۱۱

[۲] بحار ج ۸ ص ۵۶ نقل از عیون اخبار الرضا۔ شاید روایت کے معنی ہوں ''ٹھہر واوران زحمتوں کے صلے میں جو دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لیے تحمل کی ہیں لوگوں کی شفاعت کرو۔''

"لا یشفع و لا یشفع لھم و لا یشفعون ان من اذن لہ بولایۃ امیر المومنین و الائمۃ من بعدہ فھو العھد عند اللہ۔" [1]

"کوئی شفاعت نہ کرے گا اور نہ کسی کی شفاعت ہوگی اور نہ ہی کسی کی شفاعت قبول کی جائے گی مگر یہ کہ وہ امیر المومنینؑ اور آپؑ کے معصوم فرزندوں کی ولادیت کا دم بھرتا ہو۔ یہی اللہ کا عہد ہے۔"

۴۳۔ امام جعفر صادقؑ نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"یا معشر الشیعۃ فلا تعودون تتکلون علی شفاعتنا فواللہ لاینال شفاعتنا اذا رکب ھذا (زنا مورد بحث بودہ) حتی یصیبہ الم العذاب ویری ھول جھنم۔" [2]

"اے ہمارے شیعو! ہماری شفاعت کے سہارے پر گناہ نہ کرو کیونکہ خدا کی قسم ہماری شفاعت ان افراد کو نہیں پہنچے گی جو (مثلاً) زنا کے مرتکب ہوئے ہوں گے مگر اس وقت جب (ایک عرصہ) خدا کے دردناک عذاب کا مزہ چکھ چکے ہوں گے اور جہنم کا خوف و ہراس دیکھ چکے ہوں گے۔"

۴۴۔ امام صادقؑ سے پوچھا گیا:

"عن المومن ھل لہ شفاعۃ قال نعم فقال لہ رجل من القوم ھل یحتاج المومن الی شفاعۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یومئذ قال نعم ان للمومنین خطایا و ذنوبا و مامن احد الا یحتاج الی شفاعۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یومئذ..." [3]

"کیا مومن شفاعت کرے گا؟" فرمایا "ہاں"۔ اس کے بعد اہل سنت میں سے ایک شخص نے آپؑ سے دریافت کیا کہ کیا مومن انسان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا محتاج ہے؟ آپؑ نے ارشاد فرمایا: "ہاں اس لیے کہ مومن سے گناہ اور خطا سرزد ہو سکتے ہیں۔ تمام لوگ قیامت کے دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ

---

[1] تفسیر قمی ص ۴۱۷

[2] کافی ج ۵ ص ۴۶۹ اور من لایحضرہ الفقیہ ج ۴ ص ۳۸

[3] تفسیر عیاشی ج ۲ ص ۳۱۴

وسلم کی شفاعت کے محتاج ہیں۔''

۴۵۔ حضرت امام جعفر صادقؑ یا امام محمد باقرؑ سے منقول ہے:

"فی قوله عسی ان یبعثك ربك مقاما محموداً قال هی الشفاعة"[1]

سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۹ کی تفسیر میں فرمایا: ''وہ مقام محمود جس کا وعدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا وہ مقام شفاعت ہے۔''

حضرت امام کاظمؑ سے چند احادیث

۴۶۔ ابی بصیر کہتے ہیں:

"قال ابو الحسن الاول علیه السلام انه لما حضر ابی الوفاة قال لی یا بنی انه لاینال شفاعتنا من استخف بالصوه"[2]

''ساتویں امامؑ نے فرمایا: ''میرے پدر بزرگوار امام صادقؑ نے اپنی رحلت کے وقت مجھ سے فرمایا: اے فرزند! ہماری شفاعت اسے نہیں پہنچے گی جو نماز کو سبک سمجھتا ہے۔''

۴۷۔ امام کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

"کان رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم : لاتستخفوا بفقراء شیعة علی فان الرجل منهم لیشفع لعدد ربیعة و مضر[3]

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علیؑ کے فقیر اور تنگدست شیعوں کو حقیر اور پست نہ سمجھو۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک قبیلہ ربیعہ اور مضر دونوں کی تعداد کے برابر افراد کی شفاعت کرے گا۔ (ربیعہ اور مضر عرب کے دو بڑے قبیلے تھے)۔''

۴۸۔ فرمایا امام کاظم علیہ السلام نے:

---

[1] تفسیر عیاشی ج ۲ ص ۳۱۴

[2] کافی جلد ۳ ص ۲۷۰، ج ۶ ص ۴۰۱، تہذیب ج ۹ ص ۱۰۷ اور کچھ فرق کے ساتھ ''من لایحضرہ الفقیہ'' ج ۱ ص ۱۳۳ اور یہی روایت تہذیب ج ۹ ص ۱۰۶ میں کچھ فرق کے ساتھ امام صادقؑ کے حوالے سے رسول اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے۔

[3] بحارالانوار ج ۸ ص ۵۹ چاپ جدید۔ کچھ فرق کے ہمراہ امالی طوسیؒ ص ۱۶۳ اور بشارۃ المصطفیٰ ص ۵۵ میں موجود ہے۔

"شیعتنا الذین یقیمون الصلوة و یوتون الزکوة و یحجون البیت الحرام و یصومون شهر رمضان ویوالون اهل البیت و یتبرون من اعدائهم...... وان احدهم لیشفع فی مثل ربیعة و مضر فیشفعه الله فیهم لکرامته علی الله عزوجل۔"[1]

''ہمارے شیعہ وہ ہیں جونماز ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، حج بیت الحرام بجالاتے ہیں، ماہِ رمضان کے روزے رکھتے ہیں، اہل بیت رسالتؐ کے دوست ہیں، ان کے دشمنوں سے بیزاری رکھتے ہیں۔ بے شک ان میں سے (بعض) قبیلہ ربیعہ ومضر کی تعداد کے برابر افراد کی شفاعت کریں گے۔ خدا ان کی شفاعت قبول کرے گا، کیونکہ وہ خدا کے نزدیک صاحب عزت ہیں۔''

امام ہشتم علیہ السلام سے چار حدیثیں

۴۹۔ امام رضاؑ مولا علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ:

"من کذب بشفاعة رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم لم تنله"[2]

''جو شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کو جھٹلائے اور اس پر عقیدہ نہ رکھے تو آنحضرتؐ کی شفاعت اس کو نہ پہنچے گی۔''

۵۰۔ امام رضاؑ فرماتے ہیں:

"مذنبو اهل التوحید لایخلدون فی النار و یخرجون منها و الشفاعة جائزة لهم"[3]

''وہ گنہگار بندے جو موحد اور خدا کی معرفت رکھتے ہیں ہمیشہ کے لیے آتش جہنم میں نہ رہیں گے، بلکہ کچھ عرصہ بعد دوزخ کی آگ سے باہر نکال لیے جائیں گے۔ ان کی شفاعت ممکن ہے۔''

---

[1] صفات الشیعہ ص ۱۶۴ حدیث پنجم

[2] عیون اخبار الرضا ج ۲ ص ۶۶

[3] عیون اخبار الرضا ج ۲ ص ۱۲۵

۵۱۔ امام رضا علیہ السلام اپنے آباء سے اور انہوں نے امیر المومنین علیہ السلام سے اور آپؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرمایا کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اربعة انا لهم شفيع يوم القيامة المكرم لذريتي و القاضي لهم حوائجهم والساعي في امورهم عندما اضطر وا اليه والمحب لهم بقلبه ولسانه۔"[1]

''چار قسم کے افراد ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا شفیع ہو جاؤں گا:

۱۔ وہ شخص جو میری ذریت و اولاد کی عزت اور ان کا احترام کرے۔

۲۔ وہ شخص جو ان کی حاجتوں کو پورا کرے۔

۳۔ وہ شخص جو ان کے کام انجام دینے کے لیے سعی اور کوشش کرے جب وہ اس کام کے محتاج اور مضطر ہوں۔

۴۔ اور وہ شخص جو ان کو دل و زبان دونوں سے دوست رکھے۔''

۵۲۔ امام ہشتمؑ اپنے آباء سے اور انہوں نے امیر المومنینؑ کے ذریعے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے:

"من لم يومن بشفاعتي فلا اناله شفاعتي ثم قال (عليه السلام) انما شفاعتي لاهل الكبائر من امتي فاما المحسنون فما عليهم من سبيل قال الحسين بن خالد فقلت للرضا (عليه السلام) يا بن رسول الله فما معنى قول الله عزوجل "ولا يشفعون الا لمن ارتضى" قال لا يشفعون الا لمن ارتضى الله دينه۔"[2]

''جو شخص بھی میری شفاعت پر ایمان نہ رکھتا ہو میں اس کی شفاعت نہیں کروں گا۔'' اس کے بعد فرمایا: ''میری شفاعت میری امت کے ان افراد کے لیے ہے جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے۔ نیک افراد تو خود اہل نجات ہیں۔''

حسین بن خالد کہتے ہیں کہ میں نے امام رضا علیہ السلام سے عرض کی: ''یا بن رسولؐ اللہ! آیت "لا یشفعون الا لمن ارتضی" (وہ شفاعت نہیں کرتے مگر جس سے خدا راضی ہو اس کے لیے) کے معنی کیا ہیں؟'' حضرتؑ نے

---

[1] عیون اخبار الرضاج ۲ ص ۲۴ اور کچھ فرق کے ساتھ ''بشارۃ المصطفیٰ'' کے صفحہ ۱۴۰ میں بھی موجود ہے۔

[2] امالی صدوق ص ۵

فرمایا: ”اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شفاعت نہیں کرتے سوائے اس کے لیے کہ جس کا دین خدا کے ہاں خوشنودی اور پسندیدہ بن جائے۔(اور مسلمان جتنا بھی گناہگار ہو اس کا دین تو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوتا ہے)۔“

دسویں امامؑ سے ایک جملہ

۵۳۔ دسویں امامؑ زیارت جامعہ میں فرماتے ہیں:

"ولكم المودة الواجبة والدرجات الرفيعة والمقام المحمود والمقام المعلوم عندالله عزوجل والجاه العظيم و الشان الكبير والشفاعة المقبولة" [۱]

”تمہاری (ائمہ طہار کی) وہ مودت ہے جسے قرآن واجب قرار دیتا ہے اور خدا کے نزدیک تمہارے لیے بلند درجات، مقام محمود اور مقام معلوم اور بڑی قدر و منزلت اور شفاعت مقبولہ ہے۔“

۵۴۔ امام حسن عسکریؑ سے ایک حدیث

امام حسن عسکریؑ اور حضرت امیر المومنینؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:

"لايزال المومن يشفع حتى يشفع فى جيرانه و خلطائه ومعارفه" [۲]

”مومن متواتر شفاعت کرے گا یہاں تک کہ اس کے ہمسایوں، دوستوں اور جان پہچان والوں سب کے حق میں اس کی شفاعت قبول ہو گی۔“

امام زمانہ (عج) سے ایک جملہ

۵۵۔ امام زمانہ (عج) اس درود میں جو آپؑ کی جانب سے پہنچا ہے فرماتے ہیں:

"اللهم صلى على سيد المرسلين و خاتم النبيين و حجة رب

---

[۱] من لا یحضرہ الفقیہ ج ۲ ص ۶۱۶

[۲] بحار الانوار ج ۸ ص ۴۴ چاپ جدید

العالمین...... المرتجی للشفاعة"[1]

''بارِالٰہا! سید المرسلین اور خاتم النبیین، رب العالمین کی حجت............اور وہ جس کی شفاعت کی امید ہے اس پر درود بھیج۔''

شفاعت کی روایات سے متعلق کچھ وضاحت

۱۔ روایات سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومینؑ نہیں چاہتے ہیں کہ ان احادیث کے سہارے لوگ گناہوں اور معصیت کے ارتکاب میں جرأت مند ہو جائیں اور شفاعت کی امید دلا کر ان میں گناہوں میں مبتلا ہونے کی جرأت پیدا کریں، بلکہ ان احادیث سے مراد ایک حقیقت کا بیان ہے جو موت کے بعد والے عالم میں متحقق ہوگی۔ اس بناء پر بعض روایات میں اس کی تصریح یا اشارہ ہوا ہے کہ لوگوں کو شفاعت پر بھروسہ کر کے اپنے دامن کو گناہوں سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے اور دینی فرائض انجام دینے میں سرکشی و نافرمانی نہیں کرنا چاہیے۔ حدیث ۲۱، ۲۶، ۲۷، ۴۳، ۵۵، ۷۳، ۸۵، ۸۸ اور ۹۱ ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ دوسری اور سینتالیسویں روایت جس کو شیعہ اور سنی دونوں فریقوں نے نقل کیا ہے، ان دونوں روایتوں میں مسئلہ شفاعت کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات (امتیازات) میں سے شمار کیا گیا ہے، درحالیکہ دیگر روایات میں تمام انبیاء کا بھی شفیع کے عنوان سے تعارف کیا گیا ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات کو یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ کہا جائے کہ وہ مقام شفاعت جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے اس میں ایک ایسی عمومیت ہے کہ یہ آپؐ کے عمومی امتیازات میں سے ایک ہے یعنی خصوصی مواقع میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفاعت کر سکتے ہیں جب کہ دوسرے تمام انبیاء کو شفاعت کرنے کی اجازت نہیں۔ مختصر یہ کہ چونکہ آنحضرتؐ کا مرتبہ تمام انبیاء سے بلند ہے لہٰذا آپؐ کا مقام شفاعت بھی تمام سے بالاتر اور وسیع ہوگا۔ اس بناء پر بارہویں حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جب قیامت قائم ہوگی تو میں انبیاء کا پیشوا، اُن کا خطیب اور ان کی شفاعتوں کا مالک ہو جاؤں گا۔''

۳۔ یہ کہ مومنین کی شفاعت سے متعلق جو مختلف عبارتیں ذکر ہوئی ہیں جیسا کہ بعض عبارتوں میں ہے کہ مومن عرب کے دو بڑے قبیلے کی تعداد سے زیادہ افراد کی شفاعت کرے گا (حدیث ۳۲) یا بعض روایات میں یوں ہے کہ ایک بڑے قبیلے (حدیث ۳۱) سے زیادہ کی تعداد اور بعض عبارتوں میں ایک قبیلہ (دیث ۳۴) بعض میں چالیس افراد (حدیث ۵۴)، بعض میں تیس افراد (حدیث ۷۱)، بعض میں دس (حدیث ۲۹) اور بعض میں دو یا ایک فرد کی شفاعت کا ذکر ہوا ہے۔ گویا یہ ایمان کے درجات اور نیک اعمال کی کمی بیشی کی خاطر ہے۔ چنانچہ ہم سترویں روایت میں پڑھتے ہیں:

"یشفع الرجل فی القبیلة و یشفع الرجل لاھل البیت ویشفع الرجل للرجلین علی قدر عمله"

---

[1] مصباح المتہجد شیخ طوسی (قدس) ص ۲۸۴

اور درحقیقت کہا جائے کہ:

ہر کہ دریان بزم مقرب تراست
جام شفاع (عت) بیشترش می دہند

(اس محل میں جو بھی زیادہ مقرب ہے اسے جام شفاعت زیادہ دیا جائے گا۔)

۴۔ یہ کہ کچھ روایات میں ہم نے دیکھا کہ روزہ، امانت، تقوی، محمد و آل محمدؐ پر درود و صلوات بھیجنا، قرآن کی تلاوت اور رسول اکرمؐ سے توسل انسان کے حق میں شفاعت کرتے ہیں، تجسم اعمال کی بناء پر اس کے معنی بھی بہت واضح ہیں، مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

۵۔ بعض روایات مثلاً (حدیث ۸۹) میں یہ ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے محتاج ہیں۔ اس کے مقابلے میں بعض روایات جیسے (حدیث ۷۶، ۸۰ اور ۹۷) سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو گناہگار نہ ہوں یا گناہ سے توبہ کر چکے ہوں تو وہ بغیر شفاعت کے اہل نجات ہیں۔ ان دونوں طرح کی روایات کو آپس میں یوں جمع کیا جا سکتا ہے کہ ہم کہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو طرح کی شفاعت کے مالک ہیں۔

الف) ایک شفاعت وہ جس کا دائرہ عام اور وسیع ہے یہاں تک کہ انبیاء کو بھی شامل ہے۔ یعنی تمام لوگ حتیٰ کہ انبیاء بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسط سے رحمت الٰہی سے بہرہ مند ہوں گے۔ اس کا نتیجہ درجہ کی بلندی اور بلند مقامات تک رسائی ہوگا۔ اس معنی میں شفاعت سب کے بارے میں متصور ہے۔

ب) شفاعت خاص معنی میں جو گناہ گاروں سے مربوط ہے جو اپنے گناہ پر توجہ دیے بغیر دنیا سے کوچ کر گئے ہوں اور واضح ہے کہ نیک بندے اور وہ لوگ جو گناہ نہ کرتے تھے یا اگر گناہ کیا بھی تھا تو توبہ کی ہے تو ایسے بندے شفاعت کے بغیر جنت میں داخل ہوں گے، بلکہ جیسا کہ روایات سے استفادہ ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ دوسرے افراد کے حق میں بھی شفاعت کریں گے۔

۶۔ شفاعت کی روایات چار قسم کی ہیں:

پہلی قسم: ایسی روایات ہیں جو بتا رہی ہیں کہ شفاعت باعث ہوتی ہے کہ گناہگار شخص کو جہنم داخل کرنے سے معاف کیا جائے گا۔

دوسری قسم: ایسی روایات ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ شفاعت موجب ہوتی ہے کہ وہ گناہگار جو جہنم جا چکا ہے وہ جہنم سے نجات پالے۔

تیسری قسم: کچھ ایسی روایات ہیں جن سے استفادہ ہوتا ہے کہ بعض گناہگاروں کو جہنم میں کچھ مدت پڑے رہنے کے بعد اجازت دی جائے گی کہ شفیع اُن کے حق میں شفاعت کریں۔ (روایت ۲۶ ملاحظہ ہو)

چوتھی قسم: کچھ ایسی روایات ہیں جو بتا رہی ہیں کہ کچھ لوگوں کو قطعاً شفاعت نہ ہوگی اور ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ عذاب اور جہنم میں رہیں۔

لہٰذا وہ روایات جو کہتی ہیں کہ جو شخص ذرہ بھر بھی ایمان رکھتا ہو اس کی شفاعت ہوگی، ان روایات کے منافی نہیں جو بتا رہی ہیں کہ جو شخص مثلاً نماز کو خفیف سمجھے اس کی شفاعت نہ ہوگی، کیونکہ جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو آخر کار اس کی شفاعت ہوگی، لیکن ممکن ہے کہ کئی سال بعض گناہوں

اور خطا کاریوں کی وجہ سے بندہ عذاب میں رہے تب اجازت دی جائے گی کہ اس کی شفاعت کر لی جائے۔

۷۔　بعض روایات جنہیں اس حصے میں بیان نہیں کیا گیا تھام مسلمان ان کو مانتے ہیں اور واضح ہے کہ ایسی روایات ہر منصف شخص کے لیے باعث اطمینان ہیں۔ مثلاً طبرسی مرحوم مجمع البیان جلد نمبر ا ص ۱۰۴ میں "ادخرت شفاعتی لاهل الکبائر من امتی" والی حدیث جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے، کے بارے میں لکھتے ہیں: اس روایت کو تمام مسلمانوں (سنی وشیعہ) نے قبول کیا ہے۔

۸۔　پس ان روایات پر غور کرنے اور مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ روایات ان مطالب کی تفصیل ہیں جو قرآن مجید کی آیات میں اجمالاً بیان ہوئے ہیں۔ (قرآن کے حوالے سے شفاعت کی بحث کی طرف رجوع فرمائیے) اور وہ روایات جن کے مضامین کی قرآن مجید تاکید کرے ان کی سند پر بحث کی احتیاج نہیں رہتی۔ خصوصاً اس مقالے میں ہم ان جزئیات کے اثبات کے درپے نہیں ہیں جو ان روایات میں ذکر ہوئی ہیں۔

۴۔ روایاتِ شفاعت کے مآخذ

اختتام میں لازم ہے کہ ہم ان کتابوں کے نام اور ان کی خصوصیات تحریر کریں جن سے ان احادیث کو لیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو کہ یہ روایات شیعہ اور سنی دونوں فریقوں کی پہلے درجہ کی معتبر کتابوں سے نقل کی گئی ہیں۔

شیعہ کتب

۱۔	کافی	تالیف محمد بن یعقوب کلینی	متوفی ۳۲۸ھ	چاپ اخوندی
۲۔	من لا یحضرہ الفقیہ	تالیف شیخ صدوق	متوفی ۳۸۱ھ	چاپ نجف
۳۔	تہذیب الاحکام	تالیف شیخ طوسی	متوفی ۴۶۰ھ	چاپ نجف
۴۔	صفات الشیعہ	تالیف شیخ صدوق	متوفی ۳۸۱ھ	چاپ نجف
۵۔	فضائل الشیعہ	تالیف شیخ صدوق	متوفی ۳۸۱ھ	چاپ نجف
۶۔	ثواب الاعمال	تالیف شیخ صدوق	متوفی ۳۸۱ھ	چاپ غفاری
۷۔	امالی	تالیف شیخ صدوق	متوفی ۳۸۱ھ	چاپ قم
۸۔	عیون اخبار الرضا	تالیف شیخ صدوق	متوفی ۳۸۱ھ	چاپ قم
۹۔	خصال	تالیف شیخ صدوق	متوفی ۳۸۱ھ	چاپ غفاری
۱۰۔	امالی	شیخ طوسی	متوفی ۴۶۰ھ	چاپ قدیم
۱۱۔	تفسیر علی بن ابراہیم قمی		تیسری صدی	چاپ خشتی
۱۲۔	تفسیر عیاشی		تیسری صدی	چاپ قم

۱۳۔	نہج البلاغہ مولا علیؑ	تالیف سید رضی	متوفی ۴۰۶ھ	چاپ مصر مع شرح عبدہ
۱۴۔	تفسیر مجمع البیان	تالیف شیخ طبرسی	متوفی ۵۴۸ھ	چاپ اسلامیہ
۱۵۔	مناقب ابن شہر آشوب		متوفی ۵۸۸ھ	چاپ نجف
۱۶۔	بشارۃ المصطفیٰ	تالیف عماد الدین طبری	چھٹی صدی	چاپ دوم نجف
۱۷۔	محاسن برقی		تیسری صدی	چاپ تہران
۱۸۔	تفسیر فرات کوفی		تیسری صدی	چاپ نجف
۱۹۔	اختصاص	تالیف شیخ مفید	موفّی ۴۱۳ھ	چاپ تہران
۲۰۔	صحیفہ سجادیہ	ادعیہ حضرت سجادؑ		چاپ آخوندی
۲۱۔	مصباح المتہجد	تالیف شیخ طوسی	متوفی ۴۶۰ھ	چاپ قدیم

اس طرح شیعہ کتب سے ہمارے مآخذ تیسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک مربوط ہیں۔

کتب اہل سنت

۲۲۔	صحیح بخاری	تالیف محمد بن اسماعیل بخاری	متوفی ۲۵۶ھ	چاپ کتاب الشعب ۹ جزء ۳ مجلدات میں
۲۳۔	صحیح مسلم		متوفی ۲۶۱ھ	چاپ مصر ۱۳۳۴ھ ق ۸ جزء دو مجلدات میں
۲۴۔	مسند احمد حنبل		متوفی ۲۴۱ھ	چاپ مصر ۶ جلدیں
۲۵۔	سنن ترمذی		متوفی ۲۷۹ھ	چاپ ۱۳۸۴ھ ق ۵ جز ۳ مجلدات میں
۲۶۔	سنن دارمی		متوفی ۲۵۵ھ	چاپ دمشق ۱۳۴۹ھ ق دو جلدیں
۲۷۔	سنن ابن ماجہ		متوفی ۲۷۳ھ	چاپ مصر ۱۳۷۲ھ دو جلدیں
۲۸۔	سنن نسائی		متوفی ۳۰۳ھ	چاپ اول ۸ جزء ۴ مجلدات میں
۲۹۔	سنن ابی داؤد		متوفی ۲۷۵ھ	چاپ اول دو جلدیں
۳۰۔	موطا مالک		متوفی ۱۷۹ھ	چاپ مصر ۱۳۷۰ھ دو جز ایک جلد میں

اسی طرح اہل سنت کی کتب سے ہمارے مآخذ دوسری صدی سے چوتھی صدی تک مربوط ہیں۔

اس باب کی ان احادیث کی اسناد پر بحث کرنا اس کتاب کے ہدف سے باہر ہے مگر احادیث کے متن کے اعتبار سے محکم ہونے اور ان کی کثرت نیز شیعہ و سنی کی معتبر کتب سے نقل کرنے کی وجہ سے، ہم اس بات سے بے نیاز ہیں کہ ان روایات کی سند پر گفتگو کی جائے۔

قرآن وحدیث کی نظر میں

شفاعت کرنے والے اور شفاعت پانے والے

اس قسم کی گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ شفیع کی معرفت اور ان افراد کی خصوصیات جو دائرہ شفاعت میں داخل ہوں گے، کی پہچان کے ساتھ ہم جان لیں کہ قرآن اور اسلامی احادیث میں شفاعت بہت دقیق ہے۔ شفاعت پر عقیدہ ہرگز گناہ کرنے کی جرأت کا ذریعہ نہیں بنتا ہے، بلکہ یہ عقیدہ سبب ہوتا ہے کہ کسی حد تک اپنے آپ کو آلودگیوں سے بچایا جائے تاکہ شفاعت کی راہیں مسدود نہ ہوں۔

توجہ کریں کہ وہ شفیع جن کو ہم اس حصے میں پہچان لیں گے ان میں سے بعض کی شفاعت کا طریقہ بعض دوسروں سے بالکل جدا ہے۔ مثلاً بارگاہِ الٰہی میں انسان کے لیے اولین شفاعت کرنے والی چیز خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری ہی ہے اور مسلّم ہے کہ اطاعت والی شفاعت کا اندازہ انبیاء اولیائے خدا کی شفاعت کے طریقے سے مختلف ہے۔

لیکن دونوں قسم کی شفاعتوں کا نتیجہ بندوں کے گناہوں کی بخشش اور ان کا تکامل ہے۔ اس بناء پر روایات میں ان تمام کو شفیع اور شفاعت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم اسلامی احادیث کی پیروی میں ان کو اس بات میں اسی عنوان کے تحت ذکر کرتے ہیں اگرچہ ان میں سے بعض اصطلاحی معنی کے لحاظ سے شفیع نہ بھی ہوں۔

بارگاہِ الٰہی کے شفیع

۱۔ اطاعتِ خدا

مولا علیؑ فرماتے ہیں:

"فاجعلو اطاعة الله...... شفيعا لدرك طلبتكم......"

''اپنی حاجتوں کے حصول کے لیے (یعنی دنیا و آخرت کی سعادت اور نیک بختی) خدا کی اطاعت کو اپنا شفیع قرار دو۔'' [1]

---

[1] نہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۹۹ خطبہ ۱۹۳

۲۔توبہ اور خدا کی طرف پلٹنا

مولا علیؑ فرماتے ہیں:

"لاشفیع انجح من التوبه"[۱]

"توبہ سے بڑھ کر مقبول کوئی شفیع نہیں۔"

"لاشافع انجح من الاعتزار"[۲]

"معذرت خواہی سے بڑھ کر کوئی شفیع نہیں۔"

اس طرح کی روایات سے بخوبی استفادہ کیا جاتا ہے کہ انسان کو تمام چیزوں سے بڑھ کر خدا کی اطاعت میں کوشش کرنا چاہیے اور اگر اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو تو توبہ واستغفار کرے، اپنے عمل کو اپنے لیے سب سے بڑا شفاعت کرنے والا سمجھے، ایسا نہ ہو کہ شفاعت کے عقیدے کے بہانے اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ کرے اور مذہبی فرائض انجام دینے میں کوتاہی کرے۔

۳۔رسولِ گرامی اسلامؐ

قرآن مجید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرکے فرماتا ہے:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝٥[۳]

"قیامت کے دن تمہارا پروردگار تمہیں اس قدر عطا کرے گا (اور گناہ گاروں کو تمہارے سپرد کردے گا) کہ تم راضی ہو اور خوشنود ہو جاؤ گے۔"

نیز قرآن مجید آنحضرتؐ کو خطاب کرکے فرمارہا ہے:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ۝٧٩[۴]

"رات کے ایک حصے میں نماز نافلہ پڑھنے کے لیے بیدار ہوتا کہ تمہارا پروردگار تم کو مقام شفاعت پر پہنچا دے۔"

---

[۱] نہج البلاغہ جلد ۳ ص ۲۴۲

[۲] غرر الحکم ودرر الحکم آمدی ج ۶ ص ۳۸۵ طبع دانشگاہ

[۳] سورہ الضحیٰ آیت ۵

[۴] سورۂ اسراء آیت ۷۹

نیز بعض اور آیات مثلاً سورۂ نساء آیت ۶۴، سورۂ مریم آیت ۸۶، سورہ زخرف آیت ۸۶ اور سورۂ منافقون کی آیت ۵ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شفیع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی وضاحت گذشتہ ابواب میں گزر چکی ہے۔

قرآنی آیات کے بعد بہت ساری روایات من جملہ مذکورہ روایات میں سے روات ۵۲ میں رسولِ اکرمؐ کے شفیع ہونے کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ہم یہاں ان روایات میں سے ایک پر اکتفا کرتے ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ادخرت شفاعتی لاهل الکبائر من امتی" [۱]

''میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے گناہانِ کبیرہ کے مرتکب افراد کی خاطر ذخیرہ کیا ہے۔''

۴۔ امیر المومنینؑ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انی لاشفع یوم القیمة فاشفع ویشفع علی فیشفع..." [۲]

''میں قیامت کے دن شفاعت کروں گا اور میری شفاعت قبول ہوگی۔ علیؑ بھی شفاعت کریں گے ان کی شفاعت بھی قبول ہوگی............۔''

مولا علیؑ نے فرمایا:

"لنا شفاعة ولاهل مودتنا شفاعة" [۳]

''ہم شفاعت کریں گے اور ہمارے دوست بھی شفاعت کریں گے۔''

نیز ۵۶، ۶۵ والی روایات کے تحت عنوان اہلبیت مذکور ہیں ان کی طرف رجوع کیجیے۔

۵۔ فاطمہ زہراؑ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[۱] مجمع البیان ج ۱ ص ۱۰۴۔ نیز ذیل روایات کی طرف رجوع کیجیے۔ ایک سے ۱۷ تک، ۳۶ سے ۴۰ تک، ۴۶ سے ۴۸ تک، ۵۰ سے ۵۳، ۵۸، ۶۵، ۶۷ سے ۶۹، ۷۲ اور ۷۳

[۲] مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۱۵

[۳] خصال صدوق ص ۶۲۴

"ایما امرأة صلت فی الیوم واللیلة خمس صلٰوة وصامت شهر رمضان و حجت بیت الله الحرام و زکت مالها واطاعت زوجها ووالت علیا بعدی دخلت الجنة بشفاعة ابنتی فاطمة......"[1]

''وہ عورت جو اپنی یومیہ نماز ادا کرے، ماہِ رمضان کے روزے رکھے، استطاعت کی صورت میں حج بیت اللہ کرے، اپنے مال کی زکوٰۃ دے، اپنے شوہر کی اطاعت کرے اور میرے بعد علیؑ کو اپنا امام مان لے تو ایسی عورت میری بیٹی فاطمہؑ کی شفاعت کے ذریعے بہشت میں داخل ہوگی۔''

نیز روایات ۵۱ و ۵۶ کی طرف رجوع فرمائیے۔

٦۔ مولا علیؑ اور فاطمہؑ زہرا کے گیارہ معصوم فرزند علیہم السلام

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روایت میں فرمایا:

"ویشفع اهلبیتی فیشفعون"[2]

''میرے اہل بیت شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی۔''

نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الشفاعة خمسة......ونبیکم واهل بیت نبیکم"[3]

''شفاعت کرنے والے پانچ افراد ہیں............(۴) آپ کا پیغمبرؐ (۵) اہلبیت پیغمبرؐ''

اسی طرح روایات نمبر ۵۶، ۸۰ اور ۹۱ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلبیت پیغمبرؐ سے مقصود ائمہ معصومینؑ ہیں جو مقام شفاعت کے مالک ہیں۔[4]

---

[1] امالی صدوق ص ۲۹۱

[2] مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۱۵، مجمع البیان ج ۱ ص ۱۰۴

[3] مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۱۴

[4] شفاعت سے مربوط آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیات مانند آیت ۸۶ سورہ زخرف اور سورہ مریم کی آیت ۸۷ سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں کہ حضرت علیؑ و حضرت زہراؑ اور آپؐ کے گیارہ فرزند معصومؑ مقام شفاعت کے مالک ہیں۔

۷۔ انبیاء خدا

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ [۱]

''اور انہوں نے کہا کہ خدا نے اپنے لیے فرزند اختیار کیا ہے (وہ لوگ جن کے بارے میں انہوں نے گمان کیا ہے کہ وہ یعنی فرشتے اور حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں) وہ تم خدا کے مکرم بندے ہیں اور وہ خدا کے کلام پر ہرگز سبقت نہیں کرتے۔ خدا کے فرمان پر عمل کرتے ہیں۔ خدا ان کے آگے اور پیچھے سے آگاہ ہے اور وہ سوائے اُن کے جن سے خدا راضی ہے کسی اور کی شفاعت نہیں کرتے۔''

چونکہ حضرت عیسیٰؑ ان بندوں میں سے ہیں جن پر عیسائیوں نے فرزند خدا ہونے کا گمان کیا اس بناء پر وہ اس آیت کے مصادیق میں سے ہیں جو مقام شفاعت کے مالک ہیں۔

نیز پروردگارِ عالم نے ارشاد فرمایا:

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ [۲]

''اور خدا کے سوا جن کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں (مثلاً بت، فرشتے اور حضرت عیسیٰؑ) وہ تو سفارش کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ مگر (ہاں) جو لوگ سمجھ بوجھ کر حق بات (توحید) کی گواہی دیں۔''

واضح ہے کہ ''من شھد بالحق و ھم یعلمون'' کے روشن مصادیق میں انبیاء خدا ہیں۔ لہٰذا یہ آیت تمام انبیاء خصوصاً حضرت عیسیٰؑ کو شفیع ہونے کے حوالے سے متعارف کرتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[۱] سورۂ انبیاء آیت ۲۶ تا ۲۸

[۲] سورہ زخرف آیت ۸۶

"یشفع الانبیاء فی کل من کان یشھد ان لا الہ الا اللہ مخلصا"[۱]

''انبیاء ان لوگوں کی شفاعت کریں گے جنھوں نے اخلاص کے ساتھ خدا کی وحدانیت پر گواہی دی ہو۔''

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"ثلاثۃ یشفعون الی اللہ عزوجل فیشفعون: الانبیاء......"[۲]

''تین طرح کے لوگ ہیں جو خدا کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت مقبول ہوگی............

(۱) انبیا............۔''

نیز درج ذیل نمبر کی روایات ملاحظہ فرمایئے: ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳۔

۸۔فرشتے

اس کے علاوہ سورہ انبیاء کی آیات ۲۶ تا ۲۸ اور سورۂ زخرف کی آیت ۸۶ جو پہلے گزر چکی ہیں اور سورہ نجم کی آیت ۲۶، نیز کچھ روایات بھی فرشتوں کے شفیع ہونے کے بارے میں بتا رہی ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یشفع النبیون والملائکۃ......"[۳]

''پیغمبر اور فرشتے اور............شفاعت کریں گے۔''

۲۱، ۲۲ اور ۲۵ نمبر والی روایات بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں۔

۹۔شہدائے راہِ خدا و دین

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یشفع یوم القیامۃ الانبیاء ثم العلماء ثم الشھداء"[۴]

''قیامت کے دن انبیاءؑ، علمائے دین اور راہِ خدا کے شہداء شفاعت کریں گے۔''

---

[۱] مسند احمد ج ۳ ص ۱۲

[۲] خصال صدوق ص ۱۵۶

[۳] صحیح بخاری ج ۹ ص ۱۶۰

[۴] سنن ابن ماجہ ج ۳ ص ۱۴۴۳

نیز فرمایا:

"یشفع الشهید فی سبعین انساناً من اهل بیته"[1]

"راہ خدا کا شہید اپنے رشتہ داروں میں سے ستر افراد کی شفاعت کرے گا۔"

روایات نمبر ۲۰، ۲۲، ۲۸، اور ۵۷ بھی راہ خدا کے شہیدوں کے شفیع ہونے کی تصریح کر رہی ہیں۔

۱۰۔ دانشور اور علمائے دین

مولا علیؑ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

"ثلاثة یشفعون الی الله عزوجل فیشفعون الانبیاء ثم العلماء ثم الشهداء"[2]

"تین طرح کے افراد ہیں جو بارگاہِ خدا میں شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ (۱) انبیاء، (۲) علمائے دین، (۳) شہدائے راہِ خدا۔"

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"اذا کان یوم القیمة بعث الله العالم و العابد فاذا وقفا بین یدی الله عزوجل قیل للعابد انطلق الی الجنة و قیل للعالم قف تشفع للناس بحسن تادیبك بهم"[3]

"روزِ قیامت عالم و عابد دونوں حشر میں لائے جائیں گے اور جب بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہوں گے تو اس وقت عابد سے کہا جائے گا کہ جنت کو روانہ ہو جاؤ جب کہ عالم کو کہا جائے گا "ٹھہرو اور جن کی تم نے تربیت اور ہدایت کی ہے ان کے حق میں شفاعت کرو۔"

نیز روایت نمبر ۲۰ پر بھی غور کیجیے۔

---

[1] سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۵

[2] خصائل صدوق ص ۱۵۶

[3] بحار ج ۸ ص ۵۶

۱۱۔قرآن سیکھنے اور حفظ کرنے والے جو عمل بھی کرتے ہوں

حضرت علیؑ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں:

"من تعلم القران فاستظهره فاحل حلاله و حرم حرامه ادخله الله به الجنة و شفعه فی عشرة من اهل بیته کلهم قد وجبت له النار"[۱]

''وہ شخص جو قرآن سیکھے، حفظ کرے، قرآن کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھے (تعلیماتِ قرآن کا پابند ہو) تو خدا اس کو اہل قرآن ہونے کی بنا پر جنت والوں میں سے قرار دے گا اور اپنے ایسے دس رشتہ داروں کے حق میں اس کی شفاعت قبول فرمائے گا جو آتش دوزخ کے مستحق تھے۔''

۱۲۔اقرباء:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الشفعاء خمسة...... والرحم"

''شفاعت کرنے والے پانچ طرح کے ہیں............ان میں سے ایک اقرباء ہیں۔''

امام صادقؑ نے فرمایا:

"یشفع الحمیم الحمیمه"[۲]

''قریبی اپنے قریبی کی شفاعت کرے گا۔''

۱۳۔ہمسائے

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

---

[۱] سنن ترمذی ج ۴ ص ۲۴۵

[۲] مناقب ج ۲ ص ۱۴ روایت کا متن مکمل طور پر حصہ روایات میں ۵۱ نمبر میں نقل ہوا ہے۔

"ان الجار یشفع لجارہ"[1]

''ہمسایہ اپنے ہمسائے کے حق میں شفاعت کرے گا۔''

نیز روایت نمبر ۹۲ بھی اسی امر کی تاکید کرتی ہے۔

۱۴۔صاحبانِ ایمان،شیعہ

شفاعت سے مربوط بہت ساری روایات میں مختلف انداز سے مومنوں اور شیعوں کے شفیع ہونے کی تصریح کی گئی ہے۔تقریباً ۱۶ روایات ہیں جنہیں حصہ روایات میں ذیل کے نمبروں کے تحت عرض کیا گیا: ۱۸، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۵۴، ۷۹، ۸۴، ۸۸، ۹۲اور ۹۳۔

ہم یہاں پر ان میں سے صرف ایک کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں۔

امام صادقؑ سے پوچھا گیا:

"عن المومن هل یشفع فی الهله قال: نعم المومن یشفع فیشفع"[2]

''کیا مومن اپنے رشتہ داروں کی شفاعت کرسکتا ہے؟'' آپ نے ارشاد فرمایا:''ہاں مومن شفاعت کرے گا اور اس کی شفاعت قبول بھی ہوگی۔''[3]

۱۵۔قرآن مجید

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تتعلموا القران فانه شافع لاصحابه یوم القیمة"[4]

''قرآن سیکھو کیونکہ قرآن قیامت کے دن اپنے قاری کی شفاعت کرتا ہے۔''

حضرت علیؑ نے فرمایا:

---

[1] محاسن برقی ص ۱۸۴۔واضح ہے کہ ایسا رشتہ دار یا ہمسایہ ہی اپنے رشتہ دار اور ہمسائے کے حق میں شفاعت کرسکتا ہے جو خود بھی صاحب ایمان ہو۔

[2] محاسن برقی ص ۱۸۴

[3] بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ایسے اوصاف وافعال ہیں کہ اگر مومن ان سے آلودہ ہوجائے تو شفیع ہونے کے مقام سے محروم ہوگا۔ رجوع فرمایئے حدیث نمبر ۴۲ پر۔

[4] مسند احمد ج۶ ص ۴۴۸

"اعلموا ان القران شفاع و مشفع... وانه من شفع له القران يوم القيمة شفع فيه" [1]

''جان لو کہ قرآن ایسا شفیع ہے جس کی شفاعت قبول ہوگی...... اور قیامت کے دن جس کی بھی قرآن شفاعت کرے اس کے حق میں شفاعت قبول ہوگی۔''

نیز روایات نمبر ۴۴ اور ۴۵ کی طرف رجوع فرمایئے۔

۱۶۔امین ہونا

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الشفعاء خمسة القران و الرحم ولامانة......" [2]

''شفاعت کرنے والے پانچ گروہ ہیں: ۱۔قرآن ۲۔عزیز و اقارب، ۳۔امین ہونا......''

۱۷۔رسول اکرمؐ سے توسل

امام زین العابدین ایک دعا میں یوں فرماتے ہیں:

"صلی علی محمد و اله واجعل توسلی به شافعا یوم القیامة نافعا انك انت ارحم الراحمین" [3]

''خداوند! محمد وآل محمد پر درود بھیج اور روزِ قیامت ان کے ساتھ میرے توسل کو میرا شفیع قرار دے تا کہ مجھے نفع ملے تو سب سے بڑھ کر مہربان ہے۔''

۱۸۔روزہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۱

[2] مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۱۴

[3] ملحقات صحیفہ سجادیہ ص ۲۲۹

"الصیام والقران یشفعان للعبد یوم القیمة، یقول الصیام ای رب منعته الطعام والشھوات بالنھار فشفعنی فیه......"[۱]

''روزہ اور قرآن اس شخص کے حق میں شفاعت کریں گے کہ جس نے روزہ رکھا ہو اور راتوں کو قرآن کی تلاوت کی ہو۔ روزہ کہے گا: پروردگار میں نے اس شخص کو دن میں غذا کھانے اور شہوات سے روکے رکھا ہے پس اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما............''

۱۹۔ محمدؐ وآلِ محمدؐ پر درود بھیجنا

صحیفہ سجادیہ کی اکتیسویں دعا میں امام سجادؑ سے اس طرح منقول ہے:

"صلی علی محمد واله صلوة تشفع لنا یوم القیامة و یوم الفاقة الیك"[۲]

''اے خدا! محمدؐ وآل محمدؐ پر درود بھیج، ایسا درود جو قیامت کے دن اور تیری طرف محتاج ہونے کے دن ہمارے حق میں شفاعت کرے۔''

۲۰۔ خداوند متعال شفاعت کرتا ہے

کچھ روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کے بعد خداوند متعال خود گنا ہگاروں کی شفاعت کرے گا اور ان کو عذاب سے نجات دے گا۔

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یشفع النبیون والملائکة و المومنون فیقول الجبار بقیت شفاعتی......"[۳]

''انبیاء فرشتے اور مومنین شفاعت کریں گے۔ اس اثناء میں خدا ارشاد فرمائے گا: میری شفاعت باقی رہ گئی ہے، یعنی کچھ گناہ گار جو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے بھی نجات نہ پاسکیں گے وہ رحمت الٰہی کے

---

[۱] مسند احمد ج ۲ ص ۱۷۴

[۲] صحیفہ سجادیہ ص ۱۶۵

[۳] صحیح بخاری ج ۹ ص ۱۶۰

مشمول ہوں گے۔"

دعائے ابوحمزہ ثمالی جو امام سجادؑ سے نقل ہوئی ہے اس میں یہ جملہ نظر آتا ہے:

"حبى لك شفيعى اليك"

"تجھ سے میری دوستی تیرے حضور میرے لیے شفیع ہے۔"

"...... اللهم صل على محمد و اله وشفع فى خطاياى كرمك...... اللهم لا شفيع لى اليك فيشفع لى فضلك......"

"اے خدا! محمدؐ وآل محمدؐ پر درود بھیج اور اپنے کرم کو میرے گناہوں کا شفیع قرار دے............ اے خدا! میرا کوئی شفیع نہیں، تو اپنے فضل کو میرے لیے شفیع قرار دے۔"

اسی طرح کی روایات اور دعاؤں سے استفادہ ہوتا ہے کہ درست ہے کہ خدا اور اس کے فضل وکرم کو شفیع وسفارش کرنے والے کا نام دیں۔ نیز "قل الله الشفاعة جميعا" اور اس کے مانند دوسری آیات گواہی دیتی ہی کہ شفاعت کا مالک خدا ہے اور ہر شخص یا ہر چیز اگر کسی شخص کے بارے میں شفاعت کرتی ہے تو یہ مقام اسے خدا نے عطا کیا ہے۔ پس اصلی شفیع خود خدا ہے۔[1]

کن لوگوں کی شفاعت ہوگی؟

قرآن مجید کی "لايشفعون الا لمن ارضى" جیسی آیات اور وہ روایات جن کا مطالعہ "احادیث اسلامی میں شفاعت" کے عنوان سے ہم نے کیا ان سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ سارے لوگ جو خدا پر ایمان رکھتے ہوں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیت سے عداوت نہ رکھتے ہوں وہ دائرہ شفاعت میں داخل ہوں گے۔ البتہ بعض افراد اپنے نیک کاموں کی بدولت جلدی خدا کی اس رحمت سے بہرہ مند ہوں گے، بعض دیر سے، لیکن ہر صورت میں اس رحمت کا دریچہ ان کے لیے کھول دیا جائے گا۔

یہ جو کچھ روایات میں پڑھتے ہیں کہ جو شخص بھی ذرہ برابر ایمان رکھتا ہو اس کی شفاعت ہوگی، جب کہ کچھ اور روایات میں ہمیں نظر آتا ہے مثلاً نماز کو خفیف سمجھنا، خیانت، زنا اور ستم، شفاعت کے لیے مانع ہیں۔ ان دونوں طرح کی روایات میں جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا تھا کہ کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ دوسرے گروہ والی روایات کا مقصود یہ ہے کہ یہ گناہ باعث ہوتے ہیں کہ انسان مدتوں عذاب میں مبتلا رہے اور شفاعت سے محروم ہوجائے۔ ایسا نہیں ہے کہ قطعاً اس کی شفاعت نہ ہوتی ہو، جبکہ پہلے والے گروہ والی روایات بتارہی ہیں کہ جو شخص بھی خدا پر ایمان رکھتا ہو

---

[1] نیز ایک روایت میں وارد ہوا ہے کہ سقط شدہ قیامت کے دن اپنے ماں باپ کے حق میں شفاعت کرے گا اور کہے گا جب تک وہ (والدین) جنت میں نہ جائیں میں بہشت میں داخل نہ ہوں گا۔ المیزان ج ۱ ص ۱۸۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

اور اس کا دین خدا کے لیے پسندیدہ اور خدا اس سے راضی ہو تو سرانجام شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اس کی نجات کا موجب ہوگی۔

لیکن کفر اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؑ کے اہل بیت سے عداوت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو بطور کلی شفاعت سے محروم کرتی ہے۔

وہ بندے جن کی شفاعت نہ ہوگی

۱۔ کافر کی شفاعت نہ ہوگی

جیسا کہ ''قرآن کی نگاہ میں شفاعت'' کے باب میں گزرا کہ سورہ اعراف کی آیت ۵۳ اور سورۂ شعراء کی آیات ۹۸ سے ۱۰۱ تک، نیز سورۂ مدثر کی آیت ۴۶ سے استفادہ ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کافر و مشرک کی شفاعت نہ ہوگی اور شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہی کوئی فائدہ نہ دے گی۔ بہت ساری روایات میں بھی اس امر کی تصریح کی گئی ہے۔

امام حسنؑ فرماتے ہیں:

"ان النبی (ص) قال فی جواب نفر من الیهود سالوه عن مسائل: و اما شفاعتی ففی اصحاب الکبائر ما خلا اهل الشرك و الظلم"[۱]

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند یہودیوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: میری شفاعت ان لوگوں کے حق میں ہوگی جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوئے تھے سوائے ظلم اور خدا کے لیے شریک قرار دینے کے گناہ کے (کیونکہ یہ دونوں شفاعت کے لیے مانع ہیں) آٹھویں امام سے دریافت کیا گیا کہ وَلَا يَشْفَعُونَ ۙ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ [۲] (اور شفاعت نہیں کرتے مگر اس کے لیے جس سے خدا راضی ہو) والی آیت کے کیا معنی ہیں؟

فرمایا: ''معنی یہ ہیں کہ سوائے ان لوگوں کے کہ جن کا دین خدا کے لیے پسندیدہ اور اس کی رضا پر ہو کسی اور کی شفاعت نہیں کرتے۔ (واضح ہے کہ مشرک اور کافر کا دین خدا کا پسندیدہ دین نہیں)۔

نیز وہ روایات جو ''احادیثِ اسلامی میں شفاعت'' کے حصے میں ان نمبروں کے تحت درج ہوئی تھیں، ۱، ۲، ۳، ۶، ۹، ۱۷، ۲۱، ۲۲، ۲۴ اور ۲۷۔ ان میں بھی ہم نے پڑھا کہ یہ روایات اسی موضوع (کافر کی شفاعت نہ ہوگی) کی طرف اشارہ کررہی ہیں رجوع فرمائیے۔

---

[۱] خصال صدوق ص ۲۵۵

[۲] سورہ انبیاء آیت ۲۸

۲۔ستمگر کی شفاعت نہ ہوگی

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿١٨﴾ [۱]

''ظالموں کے لیے کوئی دوست اور ایسا شفیع نہیں جس کی شفاعت قبول کی جائے۔''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اما شفاعتی ففی اصحاب الكبائر خلا اهل الشرك والظلم" [۲]

''میری شفاعت ان لوگوں کے لیے ہے جو شرک اور ظلم کے علاوہ گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہو گئے ہوں۔'' (یہ دو گناہ شفاعت کے لیے مانع ہیں)۔

۳۔ خاندانِ رسالت کے دشمن کی شفاعت نہ ہوگی

امام صادقؑ نے فرمایا:

"لو ان الملائكة المقربين والا نبياء المرسلين شفعوا فی ناصب ماشفعوا" [۳]

''اگر خدا کے سارے مقرب فرشتے اور تمام مرسل انبیاء یعنی وہ شخص جو خاندان عصمت وطہارت سے عداوت رکھتا ہوگی شفاعت کریں تو ان کی شفاعت (بھی) قبول نہیں کی جائے گی۔''

نیز روایات نمبر ۶۲، ۸۲، ۸۷ اور ۹۷ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

۴۔وہ لوگ جو فرزندانِ رسول اکرمؐ کو تکلیف پہنچائیں وہ شفاعت سے محروم ہیں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اذا قمت المقام المحمود تشفعت فی اصحاب الكبائر من امتی

---

[۱] سورۂ مومن آیت ۱۸

[۲] خصال صدوق ص ۳۵۵

[۳] محاسن برقی ص ۱۸۴

فیشفعنی اللہ فیھم واللہ لا تشفعت فیمن اذی ذریتی"[1]

''جب میں مقام شفاعت پر کھڑا ہو جاؤں گا تو اپنی امت کے گناہگاروں کے لیے شفاعت کروں گا۔ خدا میری شفاعت قبول کرے گا۔ خدا کی قسم ان لوگوں کے لیے کہ جنہوں نے میری ذریت اور فرزندوں کو اذیتیں پہنچائی ہوں میں ان کی شفاعت نہیں کروں گا۔''

نیز روایت نمبر ٦٢ کی طرف رجوع فرمائیے۔

۵۔ وہ لوگ جو شفاعت پر عقیدہ نہ رکھیں وہ شفاعت سے محروم ہیں

آٹھویں امامؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"من کذب بشفاعة رسول اللہ ﷺ لم تنله"[2]

''جو شخص رسولِ خداؐ کی شفاعت کو جھٹلائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت اس کو نہ پہنچے گی۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"من لم یومن بشفاعتی فلا اناله شفاعتی"[3]

''جو شخص بھی میری شفاعت پر ایمان نہ رکھتا ہو تو میری شفاعت اس کو نہ پہنچے گی۔''

٦۔ خائن کی شفاعت نہ ہوگی

رسول اگرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"من غش العرب لم یدخل فی شفاعتی"[4]

''جو شخص بھی عربوں (عرب کے مسلمانوں) کے ساتھ خیانت کرے وہ میری شفاعت کے دائرے میں داخل نہ ہوگا۔''

---

[1] امالی صدوق ص ١٧٧

[2] عیون اخبار الرضا ج ٢ ص ٦٦

[3] امالی صدوق ص ۵

[4] مسند احمد ج ١ ص ٧٢۔ واضح رہے کہ عرب مثال کے طور پر ذکر ہوا ہے۔

۷۔ بعض گناہ ایسے ہیں کہ جن کے مرتکب افراد مدتوں عذاب پانے کے بعد شفاعت پائیں گے

امام صادقؑ ایک حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"فواللہ لاتنال شفاعتنا اذا رکب ھذا (یعنی الزنا) حتی یصیبہ الم العذاب ویری ھول جھنم۔"[1]

''خدا کی قسم ہماری شفاعت اس تک نہ پہنچے گی جو زنا کا مرتکب ہوا ہو ہاں مگر اس وقت جب خدا کے دردناک عذاب کا مزا چکھ چکا ہو اور جہنم کے خوف وہراس کو دیکھ لے۔''

۸۔ جو شخص نماز کو اہمیت نہ دے اس کی شفاعت نہ ہوگی

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

"لاینال شفاعتنا من استخف بالصلوٰۃ۔"[2]

''جو شخص نماز کو سبک سمجھے وہ ہماری شفاعت سے محروم ہوگا۔''

۹۔ کوئی ذرہ برابر ایمان بھی رکھتا ہو تو سرانجام اس کی شفاعت ہوگی

پیغمبر گرامیؐ نے ایک حدیث کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

"فیوذن للملائکۃ و النبیین والشھداء ان یشفعوا فیشفعون و یخرجون من کان فی قلبہ مایزن ذرۃ من ایمان۔"[3]

''پس اجازت دی جائے گی کہ فرشتے، انبیاء اور شہدا شفاعت کریں تو اس وقت وہ شفاعت کریں گے اور جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان بھی ہوگا اسے جہنم سے نکال لیں گے۔''

---

[1] کافی ج ۵ ص ۴۶۹

[2] کافی ج ۳ ص ۲۷۰ اور ج ۶ ص ۴۰۱ و تہذیب ج ۹ ص ۱۰۷

[3] مسند احمد ج ۵ ص ۴۳

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:

"فیشعون حتی خرج من قال لا اله الا الله ممن فی قلبه میزان شیعرة"۔[1]

''اس وقت ان کی شفاعت ہوگی یہاں تک کہ ہر وہ شخص کہ جس کے دل میں جو کے دانہ برابر بھی حقیقی ایمان ہو جہنم سے نجات پائے گا۔''

۱۰۔ جو کوئی امیر المومنینؑ اور دیگر ائمہ معصومینؑ کی ولایت کا قائل نہ ہو اس کی شفاعت نہ ہوگی

حدیث نمبر ۹۶ ملاحظہ فرمایئے۔

اشکال:

"ولا یشفعون الا لمن ارتضی" کی آیت بتا رہی ہے کہ شفاعت ان لوگوں کے لیے ہے جن سے خدا راضی وخوشنود ہو جبکہ جو شخص گناہوں میں مبتلا ہوا ہو خدا کی رضا اس کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ وہ شفاعت سے بھی کوئی نفع نہ پا سکے گا۔

جواب:

شفاعت والی تمام روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ گناہگار لوگ مشمول شفاعت ہوں گے۔ خصوصاً یہ روایت کہ "اوخرت شفاعتی لاھل الکبائر من امتی" امین الاسلام طبرسی مرحوم کے قول کے تحت یہ روایت تمام مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول ہے۔''[2]

لہٰذا چاہیے کہ روایات کو "ولا یشفعون الا لمن ارتضی" کی آیت کی تفسیر قرار دیا جائے اور جیسا کہ آٹھویں امامؑ سے آیت کی تفسیر میں وارد ہوا ہے اس کے تحت ہم کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی کے حصول سے مراد یہ ہے کہ انسان کا دین خدا کا پسندیدہ ہو یعنی وہ شخص مشرک، کافر، ناصبی اور رسولِ اکرمؐ اور آپؐ کے اہلبیت کا دشمن نہ ہو۔

---

[1] مسند احمد ج ۳ ص ۳۴۵

[2] مجمع البیان ج ۱ ص ۱۰۴

وہ کام جو فوری شفاعت کے موجب ہیں

۱۔ایمان وتوحید میں اخلاص

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اسعد الناس بشفاعتی یوم القیامۃ من قال لا الہ الا اللہ خالصا من قلبہ"[۱]

''قیامت کے دن سب سے زیادہ وہ لوگ میری شفاعت سے سعادت مند ہوں گے جو دل اور اخلاص کے ساتھ خدا پر ایمان رکھتے ہوں۔''

۲۔اہل نماز وسجود ہونا

پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے کہ جو آپؐ سے شفاعت کی درخواست کیا کرتا تھا فرمایا:

"اما فاعنی بکثرۃ السجود"[۲]

''تم کثرت سجود سے میری مدد کرو۔'' (تیرا سجدہ اور عبادت باعث ہوگی کہ میں بہتر طور پر تیری شفاعت کرسکوں۔''

نیز روایت ۳۷ کی طرف رجوع فرمایئے۔

۳۔رسولِ خداؐ پر درود بھیجنا اور خدا سے آپ کے لیے شفاعت جیسے درجاتِ عالیہ کی درخواست کرنا

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"من صل علی محمد وقال اللھم انزلہ المقعد المقرب عندك یوم

---

[۱] صحیح بخاری ج ۱ ص ۳۶

[۲] مسند احمد ج ۳ ص ۵۰۰

القيامة وجبت له شفاعتی".[١]

"جو کوئی مجھ پر درود بھیج دے اور کہے اے خدا! ان کو قیامت کے دن اپنے مقام قرب میں جگہ عطا فرما تو اس کے بارے میں مجھ پر شفاعت واجب ہوگی۔"

۴۔قرآن سیکھنا، حفظ کرنا اور پڑھنا

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تعلموا القران فانه شفاع لاصحابه یوم القیمة".[٢]

"قرآن سیکھو، کیونکہ قرآن روزِ قیامت اپنے قاری کی شفاعت کرے گا۔"

نیز ۲۹، ۴۴، ۴۵، اور ۵۹ والی روایات کی طرف رجوع کیجیے۔

۵۔دینی فرائض کا انجام دینا

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"ايما امرأة صلت فی اليوم والليلة خمس صلوة وصامت شهر رمضان وحجت بيت الله الحرام وزكت مالها واطاعت زوجها ووالت علينا بعد دخلت الجنة بشفاعة ابنتی فاطمة".[٣]

"جو کوئی عورت اپنی نماز پنجگانہ ادا کرے، ماہ رمضان کے روزے رکھے، استطاعت کی حالت میں خانہ خدا کی زیارت کرے، اپنی زکوٰۃ ادا کرے، اپنے شوہر کی اطاعت کرے اور میرے بعد علیؑ کو اپنا امام مان لے تو ایسی عورت میری بیٹی فاطمہ علیہا السلام کی شفاعت سے بہشت میں داخل ہوجائے گی۔"

نیز پینتالیسویں روایت بھی ملاحظہ فرمایئے۔

---

[١] مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۸

[٢] مسند احمد ج ۵ ص ۲۵۱

[٣] امالی صدوق ص ۲۹۱

٦۔اولادِ رسولؐ سے دوستی اور اُن کی خدمت واحترام

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اربعة انا لهم شفيع يوم القيمة المكرم لذريتي والقاضی لهم حوائجهم والساعي في امورهم عندما اضطروا اليه والمحب لهم بقلبه ولسانه"[1]

''میں چار قسم کے افراد کی روزِ قیامت شفاعت کروں گا۔(١) وہ شخص جو میری اولاد وذریت کا احترام اوران کی عزت کرے۔(٢) وہ شخص جو اُن کی حاجت روائی کرے۔(٣) جو کوئی اُن کے کام انجام دینے میں سعی و کوشش کرے اس وقت جب وہ اس کام کے انجام دینے میں مجبور ومحتاج ہوں۔(٤) جو کوئی زبان ودل سے ان کو دوست رکھے۔''

٧۔اہل ایمان سے دوستی اوران کے ساتھ معاشرت

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"لايزال المومن يشفع حتى يشفع في جيرانه و خلطائه و معارفه۔"[2]

''مومن مسلسل شفاعت کرے گا یہاں تک کہ اس کی شفاعت ہمسایوں اور دوست احباب کے بارے میں بھی قبول کی جائے گی۔''

نیز روایت نمبر ٩١ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

٨۔اہل ایمان کی خدمت کرنا

روایات نمبر ٣٥، ٥٧ اور ٨٤ کی طرف رجوع کیجیے۔

---

[1] عیون ابخار الرضا ج ٢ ص ٢٤

[2] بحار ج ٨ ص ٤٤ جدید چاپ

۹۔عذر خواہی کرنے والے کو بخش دینا

مولا علیؑ اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو ارشاد فرماتے ہیں:

''ایسے شخص کی معافی جو تجھ سے عذر خواہی کرے قبول کرتا کہ تجھے شفاعت نصیب ہو۔''[۱]

۱۰۔ایک اسلامی مرکز میں زندگی اور مشکلات اور سختیوں پر صبر

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

''جو کوئی شہر مدینہ میں رہے اور اس کے فاقوں اور سختیوں پر صبر کرے تو قیامت کے دن میں اس کی شفاعت کروں گا۔''[۲]

ہم خاتمے میں اس نکتے کو دوبارہ عرض کرتے ہیں جو آغاز میں کہہ چکے تھے، وہ یہ کہ:

انسان کا سب سے پہلا شفیع اس کا عمل ہے۔لہٰذا ہر چیز سے بڑھ کر احکامِ اسلام پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔عقیدۂ شفاعت گناہوں میں مبتلا ہونے کا بہانہ نہیں ہونا چاہیے۔

توبہ اور خدا کی بیکراں رحمت

توبہ من جملہ ان موضوعات میں سے ہے جو علم کلام سے بھی مربوط ہے اور علم تفسیر سے بھی۔بعض جہالت سے یہ مسئلہ فقہی بھی ہے، جبکہ علماء اخلاق بھی اس بارے میں بحث و گفتگو کرتے ہیں۔متکلمین نے بھی کہیں کہیں وعدہ وعید اور جزا و سزا کے عناوین کے ضمن[۳] میں اور کہیں معاد کی بحث میں مستقل طور پر اس سے بحث کی ہے۔[۴]

اس کی وضاحت کے لیے چند ایک مطالب کو ذکر کرتے ہیں:

---

[۱] من لایحضرہ الفقیہ ج ۴ ص ۲۷۹

[۲] موطا مالک ج ۲ ص ۲۰۱

[۳] نوبختی نے یاقوت میں (انوار الملکوت ص ۱۷۶) مفید نے اوائل المقالات ص ۹۹ اور ابن میثم بحرانی نے قواعد المرام ص ۱۵۷ اور ص ۱۵۸ میں یہ بحث کی ہے۔

[۴] تجرید الاعتقاد (کشف المراد، ص ۲۶۳)

ا۔توبہ،لغت اور شریعت کی اصطلاح میں

توبہ،تاب، یتوب کا مصدر ہے۔

لغت عرب میں ''توب'' رجوع کے معنی میں ہے اور چونکہ توبہ کرنے والا شخص اپنے گناہ سے نادم ہوکر خدا کی طرف پلٹ آتا ہے لہٰذا عرب کہتے ہیں "تاب من ذنبہ" یعنی "رجع من ذنبہ" (اپنے گناہ سے پشمان ہوکر لوٹ آیا) اور جب خدا اس کی توبہ قبول کرتا ہے اور اپنی رحمت بیکراں کا رُخ اس کی طرف موڑ تا ہے تو کہا جاتا ہے: "تاب علیہ" یعنی "رجع الیہ بالرحمة" خدا نے اپنی وسیع رحمت سے اس کی طرف توجہ فرمائی۔[1]

جب کہنے کا مقصد یہ ہو کہ بندہ نے خدا کی طرف رجوع کیا تو اس وقت یہ لفظ ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَتُوۡبُوۡۤا اِلٰى بَارِئِكُمۡ (بقرہ ۵۴)

''اپنے خدا کی طرف لوٹ آؤ۔'' یا

وَّاَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ (ھود ۳)

''اپنے خدا سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف لوٹ آؤ۔''

لیکن جب مقصود یہ ہو کہ خدا نے بندے کی طرف رجوع کیا اور اس کی توبہ قبول کی تو اس وقت ''علیٰ'' استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت آدمؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ۝۳۷

(بقرہ ۳۷)

''آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے، پھر خدا نے نظر رحمت سے اس کی طرف رجوع کیا کیونکہ وہ توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدۡ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِىِّ وَالۡمُهٰجِرِيۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ فِىۡ سَاعَةِ

[1] آئندہ بحث میں ہم وضاحت کریں گے کہ اپنی رحمت بیکراں کے ساتھ خدا کا بندے کی طرف رجوع کرنا توبہ سے پہلے بھی ہے اور توبہ کے بعد بھی، یہاں چونکہ توبہ کے معنی بیان کرنا مقصود ہے، لہٰذا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔

الْعُسْرَةِ (توبہ ۱۷۷)

''خدا نے پیغمبرؐ، مہاجرین اور انصاری کی طرف اپنی بیکراں رحمت سے توجہ کی، جنہوں نے سخت ترین حالات میں اس کی پیروی کی۔''

بنابراین لفظ توبہ، بازگشت اور لوٹنے کے معنی میں ہے، اگر بندے کے بارے میں استعمال ہو تو معنی ہوگا کہ وہ گناہوں سے منہ موڑ کر خدا کی طرف لوٹ آیا[1] اور اگر خدا کے بارے میں استعمال ہو تو معنی یہ ہوگا کہ خدا نے اپنی رحمت بیکراں کا رُخ بندے کی طرف پلٹایا۔[2]

یہاں تک کہ آپ کو توبہ کے لغوی معنی کا پتہ چل گیا۔ اب ہم علماء (تفسیر، اخلاق، کلام) کی طرف سے کی گئی توبہ کی اصطلاح تعاریف کو ذکر کرتے ہیں۔

علمائے اسلام نے توبہ کی مختلف تعاریف ذکر کی ہیں۔ ان تمام تعاریف کے مجموعی جائزے سے ایک بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ توبہ کی حقیقت ناپسندیدہ اور برے عمل سے ندامت و پشیمانی، نیز دوبارہ اس عمل کی طرف نہ جانے پر محکم ارادے سے عبارت ہے۔[3]

اس کی تحلیل وتوضیح میں کہا جاسکتا ہے کہ وقوع توبہ کے سلسلے میں تین چیزیں ضروری ہیں:

۱۔ اس عمل کے برے اثرات سے آگاہی ہو جو دنیا و آخرت میں اس پر مرتب ہوں گے۔

۲۔ وہ برا کام جو اس نے انجام دیا ہے اس پر صدق دل سے پشیمان ہو اور طبعی بات ہے کہ ایسی پشیمانی مذکورہ علم وآگاہی سے ہی پیدا ہو سکتی ہے، ورنہ برے اثرات کا اگر اسے علم نہ ہوتا تو ہرگز اسے پشیمانی نہ ہوتی۔

۳۔ گذشتہ عمل سے پشیمانی کے وقت وہ اسے دوبارہ بجالانے سے منصرف ہو جاتا ہے (اور آئندہ کے لیے اسے ترک کر دینے کا محکم ارادہ کر لیتا ہے)

ابھی دیکھنا ہے کہ توبہ کی حقیقت کیا ہے اور مذکورہ امور میں کون سا امر اس کی حقیقت کو تشکیل دیتا ہے، اور ان میں سے کون سی صورت سبب یا نتیجہ ہے؟

توبہ کی حقیقت وہی عمیق اور گہری ندامت و پشیمانی ہے جو انسان کی روح پر چھا جاتی ہے۔ گناہ کے برے اثرات کا علم اور محجوب

---

[1] توبہ کی یہ قسم عام انسانوں کے لیے ہے جو گناہ سے پاکیزگی کی طرف آتے ہیں جبکہ توبہ کے دیگر مراحل اس سے مختلف ہیں جو آئندہ ذکر ہوں گے۔

[2] ''تواب'' اگر خدا کی صفت ہو تو معنی ہے زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور اگر بندے کی صفت ہو تو معنی یہ بنتا ہے ''زیادہ توبہ کرنے والا''

[3] طبرسی اس سلسلے میں فرماتے ہیں: «اصل التوبه الرجوع و حقیقتها الندم علی القبیح مع العزم علی ان لا یعود الی مثله» (مجمع البیان جلد ۲ ص ۲۱) علامہ حلی شرح تجرید میں فرماتے ہیں: «التوبة هی الندم علی المعصیة لکونها معصیة والعزم علی ترك المعاودة فی المستقبل» (کشف المراد ص ۲۶۳)

(اللہ) سے دوری اس ندامت و پشیمانی کا سبب بنتے ہیں اور نتیجتاً توبہ محقق (واقع) ہوتی ہے۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے، وہ یہ کہ ندامت کی علت تو اثرات گناہ کا علم ہے، لیکن برے عمل کو دوبارہ بجا نہ لانے پر عزم محکم ندامت میں ہی پنہاں ہے اور شاید یہ کوئی تیسری چیز نہ ہو، کیونکہ اگر آئندہ اس برے کام کے ترک کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو درحقیقت اسے اپنے گذشتہ عمل پر ندامت ہی نہیں ہے، اس لیے کہ گناہ گذشتہ ہو یا آئندہ، دونوں قبیح اور قابل نفرت ہیں اور اثرات کے لحاظ سے یکساں ہیں۔

اس بارے میں مرحوم نراقی نے بہت خوبصورت بات کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''(اثرات گناہ کا) گذشتہ علم توبہ کے لیے مقدمہ ہوتا ہے، جبکہ اس کو دوبارہ بجا نہ لانے کا عزم توبہ کے ثمرات میں شمار ہوتا ہے۔''[1]

۲۔ تشریع توبہ کی علت

توبہ کے تحلیل و تجزیہ میں ایک مسئلہ اس کی علت تشریع ہے، کیونکہ قرآن مجید نے مسئلہ توبہ کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور تمام گناہگاروں کو اپنے گذشتہ اعمال سے ندامت اور خدا کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی ہے، چنانچہ اس صلائے عام میں ارشاد ہے:

قُلۡ يٰعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿۵۳﴾[2]

''کہہ دو اے میرے بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے! اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ بیشک اللہ تو سارے گناہ ہی معاف کر دیتا ہے۔ بتحقیق وہ بخشنے والا رحیم ہے۔''

درست ہے کہ ان آیات میں تمام گناہ بخشنے کی بات ہوئی ہے اور توبہ کا ذکر نہیں ہوا، لیکن قرآنی مفاہیم کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گناہوں کی بخشش بعض عوامل کی وجہ سے ہوتی ہے اور ان میں سب سے زیادہ توبہ و ندامت ہے اور توبہ کی نسبت دیگر عوامل کی دخالت اس میں بہت کم ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَتُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِيۡعًا اَيُّهَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۱﴾[3]

''اے ایمان والو، سب اللہ کے حضور توبہ کرو تا کہ فلاں پا جاؤ۔''

---

[1] جامع السعادات جلد ۳، ص ۵۰

[2] سورہ زمر، آیت ۵۳

[3] سورہ نور، آیت ۳۱

توبہ سے مقصود، یعنی خدا کی طرف توجہ صرف گناہ و برائی سے ندامت میں منحصر نہیں، بلکہ جیسا کہ ہم بعد میں وضاحت کریں گے، انبیاء اور اولیاء کا خدا کی طرف رجوع (توبہ) کرنا ایک اور شکل میں ہے، لیکن یہ آیت ایک ہمہ گیر دعوت میں توبہ کو ایک اصل کلی کے طور پر پیش کرتی ہے۔

ایسے وعدے اور وسعت لطف کی وجہ سے بعض لوگ مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ قبولیت توبہ ا اعلان ایک طرف برائی اور گناہ کی طرف دعوت دینا ہے۔ لوگ یہ خیال کرتے ہوئے کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے اپنی عمر کا ایک حصہ خدا کی نافرمانی اور گناہ میں گزاریں گے۔

البتہ مذکورہ اعتراض صرف تشریع توبہ سے مختص نہیں، بلکہ یہ ناپختہ فکر اس عمل کے بارے میں ہوسکتی ہے جسے اسلام نے گناہوں کی بخشش کا ذریعہ قرار دیا ہے، چنانچہ شفاعت کے مخالفین نے بھی اسے دلیل بنایا ہے۔ ہم شفاعت کی بحث میں رازِ تشریع اور اس کے اثرات کی حدود کے بارے میں الگ سے گفتگو کریں گے۔ یہاں ہم صرف تشریع توبہ کی علت کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں۔

اعتراض کا جواب

امید و رجا انسان کی تربیت کے لیے موثر عوامل میں سے ہے اور مقصد تک پہنچنے کے لیے انسان کی روحانی طاقتوں کو مجتمع کرتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں یاس و نا اُمیدی روحانی قوتوں کو سستی اور جمود کا شکار کر دیتی ہے اور آخر کار انسان کو تباہی کے کنارے پہنچا دیتی ہے۔

روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک مقام سے گزرے۔ دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی پودا لگانے میں مصروف ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بوڑھے آدمی کی اس جدوجہد سے حیران ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس سے امید و رجا واپس لے لے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی۔ نتیجے کے طور پر بوڑھے آدمی نے کام سے ہاتھ اٹھا لیا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دوبارہ چاہا کہ امید و رجا اس کو لوٹا دے۔ اچانک زندگی کی ایک نئی لہر اس بوڑھے انسان کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ اٹھا اور ایک نئے جذبے اور شوق سے پودا کاشت کرنے میں مشغول ہو گیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ ایسا کیوں ہوا تو اس نے بتایا کہ یہ نا اُمیدی اور اُمید کے پیدا ہونے کی وجہ سے ہے۔[1]

ہم اس حدیث کی صحت سے آگاہ نہیں لیکن بہر حال یہ اس حقیقت کو روشن کرتی ہے کہ اُمید اور رجا کا حرکت اور کوشش کے ساتھ اور یاس و نا امیدی کا موت جیسے جمود کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جوان جو اپنے مستقبل سے پر امید ہے اپنی کوششیں جاری رکھتا ہے لیکن جونہی وہ اپنی کامیابی سے مایوس ہو جاتا ہے ایک طرف ہو بیٹھتا ہے اور بعض اوقات تو ایسے جوان خودکشی کر بیٹھتے ہیں۔

قرآن مجید رحمت الٰہی سے امید اور اس کے عذاب سے خوف کو انبیاء علیہم السلام کی اعلیٰ ترین صفات میں سے شمار کرتا ہے اور ہمیشہ ان کے اندر اُمید اور خوف کا امتزاج رہتا تھا۔ جہاں انہیں دوزخ کا ڈر رہتا وہاں جنت کی بھی امید ہوتی تھی۔ قرآن کریم اس بارے میں ان کو یوں

---

[1] سفینۃ البحار ج ۱، مادہ رجا

توصیف کرتا ہے:

وَيَدۡعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوۡا لَنَا خٰشِعِيۡنَ۝۹۰ [۱]

''وہ رحمت کی امید و اشتیاق اور ناراضگی و عذاب سے خوف کے عالم میں خضوع و خشوع کے ساتھ ہمیں پکارتے ہیں۔''

آپ تمام آیات قرآن کو ملاحظہ فرمائیں جہاں بھی دوزخ اور عذاب کا ذکر آیا ہے جنت اور نعمت کا ذکر بھی ساتھ آیا ہے۔ یہ ساتھ ساتھ ذکر اس لیے ہے کہ تربیتی نکتہ نظر سے صرف خوف اور ڈر کا ایجاد کرنا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ رجا اور امید کو بھی پروان چڑھانا چاہیے اور لوگوں سے کہا جانا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے پاس جہنم ہے تو جنت بھی ہے تاکہ وہ برائیوں کی طرف نہ جائیں بلکہ ان سے دوری اختیار کریں، اگر کسی دن ارتکاب کر بھی لیں تو اس کی وسیع رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ لوگ خدا کے عذاب سے ڈر وخوف کے ساتھ اس کی رحمت سے بھی امید رکھیں۔

قرآن حکیم انبیاء الٰہی کا تعارف خوف و رجا کے منادیوں کی حیثیت سے کرواتا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ [۲]

''لوگ ایک ہی امت تھے۔ پس اللہ نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبروں کو معبوث کیا۔''

یہاں تک انسان کی خودسازی میں امید کا کردار اجمالی طور پر واضح ہوا۔ یہ مسئلہ اتنا روشن ہے کہ مزید توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔ جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ توبہ قبول کرنے کا وعدہ چند شرائط کے ساتھ گناہگاروں کے دل میں امید پیدا کرنے کا موجب ہے اور وہ یہ کہ اپنے مستقبل میں تجدید نظر کریں، گمراہی سے نکل آئیں اور نافرمانی سے باز آجائیں۔ توبہ ہرگز دینی زندگی میں گناہ اور نافرمانی کی تشویق کا سبب نہیں بنتی ہے۔

اور اب اس کی وضاحت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر انسان (اس سے مراد عام انسان ہیں نہ معصوم اولیاء الٰہی) اپنے سفر زندگی میں نفسانی اور جبلی خواہشات کی سرکشی کے باعث کچھ نافرمانیوں اور گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر سزا اس کے نامہ اعمال میں لکھی جائے گی۔ اب اگر یہ انسان توبہ کا دروازہ بند پائے تو وہ یوں سوچے گا کہ اب جب کہ میرا انجام عذابِ الٰہی اور سزا کے سوا کچھ نہیں پھر کیوں میں باقی زندگی میں نفسانی لذتوں اور خواہشات کی تکمیل سے باز ہوں۔ اب جبکہ اہل دوزخ میں سے ہوں پھر کیوں آئندہ زندگی میں گناہوں کی لذت نہ اٹھاؤں۔ یہ انسان بدون شک ایسے یقین کے ساتھ کبھی بھی اپنی اصلاح کی فکر نہیں کرے گا اور اپنی نافرمانیوں کو جاری رکھے گا اور ساتھ ہی اپنی زبان پر اس کہاوت کو بھی

---

[۱] سورہ انبیاء ۹۰

[۲] سورہ بقرہ آیت ۲۱۳

دہرائے گا'' آب کہ از سر گذشت چہ یک وجب، چہ صد وجب، چہ یک نی، چہ صد نی۔''یعنی پانی جب سر سے گزر جائے تو چاہے ایک بالشت ہو یا سو بالشت ہو۔''

لیکن اگر یہی انسان توبہ پر ایمان رکھتا ہو اور وہ یہ باور کر لے کہ سزا و عذاب دینے کے علاوہ گناہگاروں کے لیے ایک سنت الٰہی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر وہ باقی زندگی میں دوبارہ گناہ اور نافرمانی نہ کرنے کا پختہ عزم کر لیں اور الٰہی قانون کی خلاف ورزی کو ترک کر دیں تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ ان کے تمام گذشتہ گناہوں کو معاف کر دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا انجام صالح اور پاکیزہ افراد کے ساتھ ہوگا۔ اس صورت میں وہ گناہ اور نافرمانی سے دست کش ہو کر اصلاح اور تقویٰ کی طرف رُخ کرتے ہیں۔

ایسا نورِ امید انسان کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی رفتارِ زندگی بدل جاتی ہے اس کا مستقبل ماضی سے مختلف ہو جاتا ہے اور وہ پرانے طور طریقوں سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ توبہ نہ صرف گناہ کی طرف رغبت کا باعث نہیں بلکہ گناہ اور نافرمانی میں کمی کا سبب ہے۔ گناہوں سے آلودہ ہزاروں افراد اس ذریعے سے بقیہ زندگی میں پاکیزگی اور پرہیزگاری سے وابستہ ہو گئے ہیں اور گناہوں کے بوجھ سے ہلکے ہو گئے ہیں۔

اگر آپ دنیا میں جیل خانوں کے قوانین پر نظر دوڑائیں، آپ ایسے افراد کو دیکھیں کہ جنہیں عمر قید یا طویل عرصے کی قید کی سزا سنائی گئی ہو، آپ سزا کے اس قانون کے ساتھ جیل خانوں پر لاگو اصول کو بھی ملاحظہ فرمائیں گے اور وہ یہ ہے کہ جیل خانہ جات کے غیر جانبدار عہد یداروں پر اگر قیدی کی ندامت اور پشیمانی آشکار ہو جائے اور وہ جان لیں کہ وہ اپنے جرم پر خلوص کے ساتھ شرمندہ ہے تو وہ متعلقہ اتھارٹی سے اس کی معافی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اب اگر ایسا اصول موجود نہ ہو اور قیدی جانتا ہو کہ اس کی ندامت اور شرمندگی اس کے انجام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لا سکتی ہے تو نہ صرف وہ اپنی عادت کو تبدیل نہیں کرے گا، بلکہ بعض اوقات منتظمین کے لیے دردِ سر بن جائے گا۔

بعض آیات کریمہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتمام حجت کا اگر ایک ستون عذاب سے ڈرانا ہے تو دوسرا ستون خوشخبری اور بشارت دینا ہے۔

اس سلسلے میں قرآن یوں فرماتا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ [1]

''بشارت دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے گئے تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کا خدا پر کوئی عذر باقی نہ رہے۔''

مذکورہ گمان (کہ توبہ نافرمانی کرنے والوں کے لیے سبز چراغ روشن کرنے کے مترادف ہے) اس صورت میں دلیل بن سکتا ہے جب

[1] سورہ نساء آیت ۱۶۵

توبہ تمام صورتوں اور تمام شرائط میں انسان کے لیے سرمایہ نجات ہو جبکہ توبہ کی بہت سی شرائط ہیں کہ بعض اوقات ان میں سے بعض شرائط کا گناہگار انسان کے لیے پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں ایک گناہگار انسان جب شرائط کے حصول کا امکان موجود نہ ہو تو وہ کس طرح توبہ کی امید پر گناہ کر سکتا ہے اور قوانین الٰہی کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔ چہ بسا ان شرائط میں سے بعض مستقل میں ناممکن ہو جائیں۔

توبہ کی ان تکوینی شرائط میں سے ایک بقاء حیات ہے۔ کسی بھی گناہگار کو اپنی زندگی کا یقین نہیں ہے۔ پھر ایسا کیونکر ممکن ہے کہ وہ توبہ کی امید پر گناہ کا ارتکاب کرے۔

ہاں، کبھی بعض مجرم افراد توبہ کی امید پر گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دراصل ایسے افراد اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ ان پر اگر توبہ کا دروازہ بند بھی ہوتا تب بھی وہ گناہوں سے باز نہ آتے۔ لیکن ظاہری طور پر وہ توبہ اور خدا کی طرف بازگشت کی بات کرتے ہیں۔

اصولاً ہر صحیح اصول سے سوء استفادہ ممکن ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسا قانون نہ بنایا جائے اور تربیت کرنے والے اس سے استفادہ نہ کریں۔

ہمارے سامنے یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسانوں کی اکثریت اپنی زندگی میں گناہ اور خطا سے پاک نہیں ہے۔ نیک اور صالح افراد کی تعداد بہت کم ہے اور ان کو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے۔ آخر کار ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ گناہ کو فرد اور معاشرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا چاہے توبہ کا دروازہ انسانوں پر بند ہو جائے یا کھلا رہے۔ ایسے حالات میں توبہ کی تشریع کا قانون انسان کی سعادت کے لیے مددگار ہے نہ کہ اس کی شقاوت و بدبختی کا سبب۔

ہاں اگر باب توبہ بند ہونے کی صورت میں فرد اور معاشرہ گناہوں سے محفوظ رہتا اور توبہ ان کے لیے گناہ کا سبب بنتی تو ہرگز ایسا قانون نہ بنتا، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ انسان چند حدود ناشناس جبلتوں INSTINCTS کے ساتھ خلق کیا گیا ہے۔ زیادہ تر اس کی فکر، سوچ اور بلند نظری پر نچلی سطح کے میلانات غالب ہیں اور یہ بات انسان کے اندر ایک ایسی رکاوٹ ہے جس سے اجتناب ناممکن ہے۔ اس حالت میں توبہ کا قانون گناہ کی پیدائش اور اس میں اضافے کا موجب نہیں بنتا بلکہ شہوتوں کی قید سے رہائی بدبختی اور شقاوت سے نجات کی امید دلاتا ہے۔

اس تجزیہ وتحلیل کے ذریعے ہم قانونِ توبہ کے ایک اہم راز سے آگاہ ہوئے۔ بہت مناسب ہے کہ چند ایسی روایات جن میں اس حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہاں پر ہم ذکر کریں۔

۱۔ محمد بن مسلم نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص گناہ کرے اور توبہ کرے، پھر توبہ کو توڑ دے اور گناہ کا مرتکب ہو، پھر توبہ کرے تو کیا اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی توبہ قبول فرمالے گا؟

امام علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہر وقت مومن طلبِ مغفرت اور توبہ کے ساتھ خدا کی طرف رجوع کرے خدا بھی مغفرت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ خدا معاف کرنے والا اور مہربان ہے، توبہ کو قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر کرتا ہے۔ پھر فرماتا:

"فایاك ان تقنط المومنین من رحمة الله"[1]

"مبادا تم (خبردار کہیں) مومنین کو رحمتِ الٰہی سے مایوس کر دو۔"

۲۔ امیر المومنین علی علیہ السلام کلماتِ قصار میں یوں فرماتے ہیں:

"الفقیه کل الفقیه من لم یقنط الناس من رحمة الله ولم یویسهم من روح الله ولم یومنهم من مکر الله"۔[2]

"سمجھ دار اور باکمال انسان وہ ہے جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ کرے اور خدا کے لطف و کرم سے مایوس نہ کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ناگہانی عذاب سے بھی مطمئن نہ کرے۔"

اس حدیث میں تربیت کے دو عامل خوف اور رجا پر پوری توجہ دی گئی ہے۔ وہ لوگ جو صرف اُمید پر بھروسہ کرتے ہیں یہودی یا یہودی صفت ہیں کہ رحمت کی امید پر بڑے سے بڑا گناہ کرنے سے گریز نہیں کرتے اور وہ لوگ جو صرف خوف و ڈر اور غضبِ الٰہی کی طرف توجہ رکھتے ہیں وہ مایوس افراد ہیں اور یہ عنصر ان کے لیے ذریعہ نجات نہیں بن سکتا۔

۳۔ "زہری" اموی دربار کے علماء میں سے تھا۔ ایک دن اُس نے کسی شخص کی سزا کا فیصلہ صادر کیا۔ وہ شخص سزا کے دوران مر گیا۔ زہری اس واقعے سے وحشت زدہ ہو گیا۔ گھر بار اور شہر چھوڑ کر ایک غار میں جا کر پناہ لی۔ نو سال تک وہاں رہا یہاں تک کہ ایام حج میں امام سجاد علیہ السلام کی خدمت میں شرفیاب ہوا۔ امام علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

"انی اخاف من قنوطك مالا اخاف من ذنبك"[3]

"میں تمہیں اس گناہ سے زیادہ جس کے تم مرتکب ہوئے ہو، خدا کی رحمت سے مایوسی و ناامیدی سے ڈراتا ہوں۔"

پھر فرمایا:

"تم مقتول کی دیت اس کے ورثا کو ادا کرو اور اپنے اور خاندان کی طرف واپس چلے جاؤ اور اپنے دینی امور پر عمل کرو۔"

---

[1] بحارالانوار ج ۶ باب ۲ روایت ۱۷

[2] نہج البلاغہ کلماتِ قصار نمبر شمار ۹۰

[3] بحارالانوار ج ۶۴ ص ۲۳۱ علامہ مجلسی نے اس روایت کو مناقب ابن شہر آشوب سے نقل کیا ہے۔ البتہ مذکورہ داستان تھوڑے سے فرق کے ساتھ مجموعہ ورام میں بھی نقل ہوئی ہے۔

امام علیہ السلام کی امید افزا گفتگو سے زہری کے تاریک اور مردہ دل میں نورِ امید چمک اٹھا اور اس نے سکوت و گوشہ نشینی سے نجات پالی۔ اس کے بعد سے وہ امام چہارم حضرت سجاد علیہ السلام کے حلقہ اصحاب میں شامل ہو گیا۔

۳۔ کیا گناہ سے توبہ واجب ہے؟

ہم نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ توبہ پر مختلف زاویوں سے بحث ہو سکتی ہے۔ ان بحثوں میں سے توبہ سے مربوط ایک بحث، جو درحقیقت اس کا فقہی پہلو ہے، توبہ کا وجوب کبھی توبہ کا ضروری ہونا ہے۔ توبہ کے وجوب پر کبھی عقلی اور کبھی نقلی حوالے سے یعنی کتاب و سنت کی نظر سے بحث کی جاتی ہے۔

عقلی لحاظ سے توبہ کا وجوب روشن اور مسلم ہے۔ علامہ نراقی مرحوم کے بقول جس نے بھی وجوب اور توبہ کے معنی کو سمجھ لیا وہ توبہ کے عقلی لحاظ سے وجوب کے بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتا کیونکہ توبہ سعادت کا سرمایہ اور دائمی عذاب سے نجات کا وسیلہ ہے۔ عقل ہر انسان کو سعادت و خوش بختی کے حصول اور بدبختی سے دوری کا حکم دیتی ہے۔ اس مسئلہ میں کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیے حتی کہ اشاعرہ جو "عقل عملی" کی روشنی میں عقلی احکام کے منکر ہیں، اگر وہ غور و فکر کریں اور اپنے انجام کا توبہ اور ترک توبہ کی نظر سے جائزہ لیں تو ان کو اپنے اندر سے وجوب توبہ پر فطرت کی آواز سنائی دے گی۔"[1]

البتہ شرعی نکتہ نظر سے ظاہر آیات و روایات توبہ کے وجوب پر شاہد ہیں کیونکہ اس کا حکم خصوصی تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے، مثلاً:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٣١﴾[2]

"اے ایمان والو! تم سب توبہ و انابت کے ساتھ اللہ کی طرف لوٹ آؤ تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ[3]

"اے ایمان والو خالص توبہ (ہر قسم کی مادی اغراض سے پاک) کے ساتھ خدا کی طرف لوٹ آؤ شاید تمہارا رب تمہاری برائیوں کو چھپا دے۔"

---

[1] محقق طوسیؒ نے وجوب توبہ کی عقلی دلیل کو یوں ذکر کیا ہے: "والتوبة واجبةٌ لدفعها الضرر" توبہ واجب ہے کیونکہ یہ دفع ضرر کا موجب ہے۔

[2] سورہ نور آیت ۳۱

[3] سورہ تحریم آیت ۸

پہلی آیت میں اہم نکتہ یہ ہے کہ فلاح کو توبہ کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ توبہ کے بغیر فلاح ممکن نہیں۔ کیا کوئی عاقل انسان فلاح و کامیابی کے حصول کی ضرورت پر شک کر سکتا ہے؟ مذکورہ مطلب درحقیقت وجوب توبہ پر عقلی دلیل ہے۔

۴۔ کیا توبہ واجب فوری ہے؟

توبہ کی فقہی ابحاث میں سے ایک بحث اس کا وجوب فوری ہے۔ یہاں پر عقل توبہ کا فوری حکم دیتی ہے کیونکہ موت کا سایہ ہر وقت انسان کے سر پر منڈلا رہا ہے اور کسی انسان کو بھی اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں یقین نہیں ہے۔ بہت دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ناگہانی اموات قوی انسانوں کو بھی آلیتی ہیں۔

اس صورت میں عقل حفظ ماتقدم کے طور پر توبہ کا فوری حکم دیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن واضح طور پر فرماتا ہے کہ ''گناہگار انسان کی دم مرگ ندامت اور شرمندگی قابل قبول نہیں ہے۔''[۱] چونکہ انسان اپنی موت کی گھڑی کو نہیں جانتا تو اسے چاہیے کہ وہ توبہ کرنے میں جلدی کرے جو اس کی نجات اور فلاح کی ضامن ہے، ممکن ہے کسی بھی وقت وہ موت کا لقمہ بن جائے اور توبہ اور ندامت اس کے لیے ثمر بخش نہ رہے۔

لیکن کیا شرعی نکتہ نظر سے بھی اس کا وجوب فوری ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں عقلی حکم کی موجودگی میں دلیل شرعی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر کتاب و سنت میں اس کی دلیل موجود ہو تو وہ درحقیقت عقلی حکم کی تاکید ہوگی۔

یہ مطلب حضرت علی علیہ السلام کے حکیمانہ جملات میں کبھی اشارے اور کبھی صراحت کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے بعض کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

"فاتقی عبد ربه، نصح نفسه و قدم توبته و غلب شهوته فان اجله مستورٌ عنه و امله خادعٌ له والشیطان موکل به یزین له و المعصیة لیرکبها و یمنیه التوبة لیسوفها، اذا هجمت نیته علیه اغفل مایکون عنها"[۲]

''پرہیزگار انسان وہ ہے جو اپنا خیر خواہ ہو، توبہ کرنے میں سبقت سے کام لے، اپنی شہوت پر غلبہ حاصل کرے، کیونکہ اس کی موت اس سے پوشیدہ اور پنہاں ہے، خواہشات اس کو دھوکا دیتی ہیں، شیطان گناہوں کو اس کی

---

[۱] سورۂ نسا آیت ۱۸ (وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ)

[۲] نہج البلاغہ۔ خطبہ ۶۴، نیز خطبہ ۱۸۳، اور مکتوب نمبر ۳۱ کی طرف رجوع کیا جائے۔

نظروں میں خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے تا کہ وہ ان کا ارتکاب کرے۔ شیطان توبہ کی امید کو اس کے دل میں تقویت دیتا ہے تا کہ وہ اس کو تاخیر میں ڈال دے اور جب موت اس کے سرہانے آن پہنچے تو وہ توبہ کرنے سے غافل ہو۔''

نیز آپؑ اپنے کلمات قصار میں فرماتے ہیں:

"ولا کن ممن یرجوا الاخرۃ بغیر عمل ویرجی التوبۃ بوطل الامل"[۱]

''ایسے لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو بغیر عمل کے آخرت میں سعادت کی امید لگائے بیٹھے ہیں اور لمبی امیدوں کے سہارے توبہ کو التوا میں ڈالے ہوئے ہیں۔''

۵۔ کیا ترک توبہ گناہ ہے؟

اشاعرہ کی بعض کلامی کتب میں یہ ملتا ہے کہ معتزلہ توبہ کے وجوب کو امر مولوی سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ترک توبہ کا لازمہ جداگانہ گناہ ہے اور اس میں تاخیر دوسرا گناہ ہوگا۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص توبہ نہ کرے یا توبہ کو چند دن تک التوا میں ڈال دے تو اس گناہ کی سزا کے علاوہ جس کا وہ مرتکب ہوا ہے توبہ کو ترک کرنے اور اس میں تاخیر کی وجہ سے ایک اور سزا کا مستحق ہوگا۔

لیکن یہ فکر اس صورت میں درست ہے جب توبہ خود دیگر واجبات کے ساتھ ساتھ ایک الگ واجب ہو اور شارع مقدس نے مولویت کی حالت میں جس طرح نماز کا حکم دیا ہے اسی طرح توبہ کا بھی حکم دے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں سزا کے متعدد ہونے کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر توبہ کا حکم طریق کا بیان کرنا اور راہنمائی کرنا ہو تب اس کی مخالفت ایک نصیحت کی مخالفت ہے کہ جس کا نتیجہ اسی گناہ کے برے اثرات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر ایک ڈاکٹر زکام کے مریض کو اچار کھانے سے منع کرے لیکن مریض مخالفت کرے تو اس کا اثر بیماری کے طول پکڑنے کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔ فقہی اصطلاح میں توبہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے اوامر ''ارشادی'' ہیں 'مولوی' نہیں جس طرح اس آیت میں حکم ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ[۲]

''یعنی اگر کوئی نماز ادا نہ کرے تو ایک سزا ہوگی اور یہ سزا ترک نماز کی ہے اور ہرگز ''اطیعوا اللہ'' کی آیت میں ذکر کی گئی اطاعت خدا کے ترک کرنے پر نئی سزا نہیں ہوگی۔

[۱] نہج البلاغہ: کلمات قصار نمبر ۱۵۰

[۲] سورہ النسا آیت ۵۹

بالفاظ دیگر مثلاً ظہر کے وقت اللہ تعالیٰ دو حکم کے ذریعے سے ہم سے مخاطب ہوتا ہے:

ا۔ "صل"، نماز ادا کرو۔ ۲۔ "اطیعوا اللہ"، کی ادائیگی کے ذریعے خدا کی اطاعت کرو۔ اگر ہم اپنے فریضے کو انجام دے دیں تو ایک جزا ہوگی اور اگر مخالفت کریں تو ایک سے زیادہ سزا نہیں ہوگی اور دوسرے حکم کا نصیحت کے علاوہ اور کوئی اثر (سزا یا جزا) نہیں ہوگا۔

٦۔ کیا ہر گناہ پر توبہ ضروری ہے؟

توبہ کا ہدف انسان کے دل پر سے گناہوں کی تاریکیوں کو دور کرنا ہے۔ اب اگر گناہ کی حقیقت ایسی ہو کہ کسی اور عمل یا عامل کے باعث خود بخود پاک ہو جائے تو اس صورت میں توبہ ضروری اور واجب نہیں ہوگی۔ مثلاً صغیرہ گناہوں کے بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ گناہانِ کبیرہ کا ترک کرنا صغیرہ گناہوں کی بخشش کا موجب ہے۔

جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (نسا:۳۱)

''اگر تم کبیرہ گناہوں جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے، کو ترک کر دو گے تو اللہ تمہارے صغیرہ گناہوں کو معاف کر دے گا۔''

اب اگر کسی نے ایک صغیرہ کا ارتکاب کیا ہے لیکن گناہ کبیرہ انجام نہیں دیا تو اس صورت میں ایسے گناہ کی بخشش کا سامان اس کے ہمراہ ہے۔ اس حالت میں عقل توبہ کا حکم نہیں دیتی کیونکہ توبہ کا عنوان ہی نہیں رہا۔ ہاں توبہ عرفاء اور آگاہ انسانوں کی نظر میں ہر حال میں اور ہر گناہ پر شائستہ اور لازم ہے، لیکن یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے جس کا توبہ کے فقہی اور کلامی پہلو سے کوئی ربط نہیں۔

۷۔ کیا قبولِ توبہ خدا پر واجب ہے؟

کیا جب بھی کوئی بندہ توبہ کا راستہ اختیار کرے اللہ تعالیٰ پر اس کی توبہ قبول کرنا لازم ہے؟ شاعرہ کا گمان یہ ہے کہ اس قسم کی تعبیرات (توبہ قبول کرنا خدا پر واجب ہے) صحیح نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہرگز کوئی شخص خدا کو حکم نہیں دے سکتا یا کسی چیز کو اس پر واجب قرار نہیں دے سکتا، لیکن وہ اس قسم کے ایجاب کی ماہیت سے غافل ہیں۔ اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ناچیز بندہ کسی کام کو خدا پر واجب کرے اور خدا کو مکلف قرار دے۔ بلکہ اس کا مقصد، قطع نظر اس سے کہ کوئی خدا کو حکم دے یا کوئی چیز واجب کرے، اس حقیقت کا کشف کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی ''حکمت بالغہ'' کو مدنظر رکھتے ہوئے کون سا کام اس کے مقام سے مناسبت رکھتا ہے اور کون سا کام اس کی ذاتِ اقدس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ مثلاً اللہ کو ظلم کی احتیاج نہیں ہے اور وہ اس کی قباحت سے آگاہ ہے۔ اس کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ظلم نہ کرے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا پر ظلم سے اجتناب واجب ہے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ اس کے کمالاتِ وجودی کے پیش نظر ایسی ضرورت یہاں پر موجود ہے اور اس ضرورت کی کاشف عقل ہے۔

توبہ کے حوالے سے ہدف یہ ہے کہ کیا اس کا عدل و انصاف اور جود و کرم توبہ کے قبول کرنے کا تقاضا کرتا ہے یا نہیں کرتا؟ اس مورد

میں بغداد کے معتزلہ نے توبہ کی قبولیت کو اس کے جود و کرم کا لازمہ قرار دیا ہے جبکہ بصرہ کے معتزلہ اس کو عدل و انصاف کا لازمہ جانتے ہیں۔

شاید یہاں پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر دلیل سمعی جس کو قرآن نے توبہ کی قبولیت کے بارے میں ذکر کیا ہے، سے صرف نظر کریں تو ہمارے پاس گناہگار بندے کی توبہ قبول ہونے پر اور کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی ندامت کو قبول نہ کرے تو یہ عدل و انصاف کے خلاف نہیں کیونکہ اس نے پہلے اس پر اتمام حجت کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کی قبولیت کے سلسلے میں آیات اور روایات بہت ہیں۔ دوسرے الفاظ میں قبولیت توبہ نقلی دلائل کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا ایک قطعی وعدہ شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ وعدہ کی خلاف ورزی خداوند حکیم کے لیے قبیح اور نامناسب ہے اس لیے عقل توبہ کی قبولیت لزوم کا قطعی حکم دیتی ہے۔

اور اب اس بارے میں آیات اور روایات سے چند مثالیں:

۱۔ بعض آیات میں "تواب"[1]، یعنی زیادہ توبہ قبول کرنے والا اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کی گئی ہے، لہٰذا فرمایا گیا ہے: وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾[2]۔

۲۔ بعض آیات میں خدا کو توبہ قبول کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ[3]

''وہ خدا ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے گناہوں سے درگزر کرتا ہے۔''[4]

بعید نہیں ہے کہ وہ متکلمین جو توبہ کی قبولیت کو عدلِ الٰہی کا لازمہ سمجھتے ہیں، انہوں نے اپنا نظریہ ذیل میں ذکر کی گئی آیت سے لیا ہو۔

مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾

[5]

''جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل انجام دیا ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ذرہ برابر بھی ان پر

---

[1] اس بارے میں سورۂ بقرہ کی آیات ۳۷، ۵۴، ۱۲۸، سورۂ نسا کی ۱۶، ۶۴، ۱۰۴، سورہ توبہ کی ۱۱۸، سورہ نور کی ۱۰، سورہ حجرات کی ۱۲ اور سورۂ نصر کی ۳ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] سورہ بقرہ آیت ۱۶۰

[3] سوہ توبہ آیت ۱۰۴

[4] سورۂ توبہ ۱۰۴ اور سورۂ مومن آیت ۲ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[5] سورہ مریم آیت ۶۰

ظلم نہیں ہوگا۔"

اگر ہم اس آیت سے یہ مراد لیں کہ جملہ یظلمون، میں ظلم کا مطلب عدل کے مقابلے میں ہے اور توبہ کے بعد ان کو پوری جزا ملے گی اور ان پر کوئی ستم نہیں ہوگا تو گویا اس صورت کے علاوہ جزا کی قسم ظلم۔ستم شمار ہوگی، جب کہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت سے مراد جزا کا کم ہونا ہے کیونکہ عربی غلت میں ظلم کا معنی نقص اور کمی ہے۔اس صورت میں عین ممکن ہے آیت توبہ کرنے والوں کی پوری جزا اور ثواب کی خبر دے رہی ہو اور یہ بتا رہی ہو کہ پوری جزا انہیں توبہ کے بعد دی جائے گی بغیر اس کے کہ آیت کے پیش نظر ظلم وعدل کا مسئلہ ہو۔

روایات میں توبہ کی قبولیت

اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کا قبول کرنا روایات میں بھی بیان ہوا ہے۔حضرت علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں کہ جس کسی کو چار چیزیں اگر حاصل ہوجائیں تو وہ چار چیزوں سے ہرگز محروم نہیں ہوگا:

۱۔ جس کسی کو دعا کی توفیق حاصل ہوجائے تو وہ اس کی اجابت سے محروم نہیں ہوگا۔

۲۔ جس کسی نے توبہ کی توفیق حاصل کرلی تو وہ اس کی قبولیت سے محروم نہیں ہوگا۔

۳۔ جس کسی نے طلب مغفرت واستغفار کی توفیق حاصل کرلی تو وہ گناہوں کی بخشش سے محروم نہیں ہوگا۔

۴۔ جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا تو وہ ان کے زیادہ ہونے سے محروم نہیں ہوگا۔[۱]

۸۔کیا توبہ ایک عمومی فریضہ ہے؟

قرآن مجید تمام ایماندار افراد کو توبہ کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ ...... [۲]

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ توبہ ایک عمومی فریضہ اور تمام بنی نوع انسان، پیغمبروں اور اولیاء خدا سے لے کر معمولی افراد تک سب مکلف ہیں اور سب پر لازم ہے کہ وہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر توبہ کا مقصد روح کی فضا کو گناہوں کی آلودگیوں سے پاک کرنا ہے تو پھر انبیاء علیہم السلام اور اولیاء الٰہی، جو گناہوں سے پاک ہیں، کی توبہ کا کیا مقصد ہے؟

اصولی طور پر یہ اخلاق وکلام کی کتابوں سے مربوط سوال ہے کہ امت کے معصوم معلم شدید گریہ وزاری اور توبہ واستغفار کے ساتھ

---

[۱] نہج البلاغہ: کلمات قصار، ۱۳۵۔اسی قسم کی گفتگو ۴۳۵ میں بھی ہوئی ہے۔

[۲] سورہ نور آیت ۳۱

ایسے جملے اپنی زبانوں پر جاری کرتے ہیں کہ جو صرف گناہگار انسان کے حسب حال ہیں؟

اس سلسلے میں جوابات دیے جاچکے ہیں جن میں سے بعض کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) انبیاء و اولیاء الٰہی اپنے گفتار و کردار کے لحاظ سے امت کے لیے نمونہ عمل تھے۔ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اپنی عظیم مناجات اور زبردست و محکم استغفار کے ذریعے انہوں نے گناہ گار امت کو توبہ و استغفار کے طریقے کی تعلیم دی ہے۔ وہ اس طریق کار کو اپنائے رکھنے کے لیے مدد کرتے ہیں۔[1]

(۲) اس سلسلے میں ایک اور تجزیہ بھی کیا گیا ہے جس کا تذکرہ بہت مناسب ہے، وہ یہ کہ تمام اجتماعی، اخلاقی، علمی، تربیتی اور دینی امور میں مختلف افراد سے ایک جیسی توقعات نہیں ہوتیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، تاہم ہم فقط نمونہ ذکر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

چند افراد ایک سماجی خدمت کے طور پر ضرورت مندوں کے لیے ایک ہسپتال بنانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ایک عام مزدور جس کی آمدنی خود اپنی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں، اگر وہ اس کام میں تھوڑی سی رقم امداد کے طور پر دے تو بہت قابل قدر ہوتی ہے، لیکن اگر اتنی ہی مقدار ایک بہت دولت منداور سرمایہ دار شخص دے تو نہ فقط قابل قدر نہیں ہوتی بلکہ اس سے الٹا ایک طرح کی نفرت اور ناپسندیدگی پیدا ہوتی ہے۔

یعنی وہی چیز جو ایک شخص کے حوالے سے قابل تحسین خدمت قرار پاتی ہے دوسرے شخص کے حوالے سے ناپسندیدہ کام شمار ہوتی ہے جبکہ قانونی نقطۂ نظر سے یہ شخص کسی جرم اور قانون شکنی کا مرتکب نہیں ہوتا۔

جیسا کہ سطور بالا میں توجہ دلائی گئی ہے، اس امر کی دلیل یہ ہے کہ ہر شخص سے اس کے امکان کے مطابق توقعات ہوتی ہیں۔ کسی کی عقل، علم، ایمان اور طاقت کو دیکھتے ہوئے اس سے امید رکھی جاتی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ ایک کام ایک شخص انجام دے تو وہ ادب، خدمت، محبت اور عبادت شمار ہو جبکہ دوسرا انجام دے تو بالکل بے ادبی، خیانت، تقاضائے محبت کے خلاف اور عبادت و اطاعت میں کوتاہی شمار ہو۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب ہم انبیاؑ اور آئمہؑ کی حیثیت کو ملحوظ نظر رکھتے ہیں اور ان کاموں کو اس غیر معمولی عظیم حیثیت کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں۔

ان کا خالق کائنات کے ساتھ بلاواسطہ DIRECT رابطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم وحکمت کی شعاعوں سے اُن کے دل منور ہیں۔ بہت سے حقائق جو دوسروں سے پوشیدہ ہیں ان پر واضح اور آشکار ہیں۔ وہ علم و تقویٰ اور ایمان کے اعلیٰ ترین درجوں پر فائز ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اتنے قریب ہیں کہ ایک لحظہ بھی اگر اس کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ جائے تو ان کے لیے لغزش شمار ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے اعمال جو دوسروں کے لیے مباح یا مکروہ شمار ہوں، انبیاء و آئمہ کے لیے شاید وہی اعمال گناہ

---

[1] جامع السادات، ج ۳ ص ۸۱ کی طرف رجوع کیجیے۔

متصور ہوں۔

آیات اور دینی پیشواؤں کے کلام میں جن گناہوں کی نسبت ان کی طرف دی گئی ہے یا وہ خود ان گناہوں سے طلب مغفرت و بخشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ سب اسی قسم سے ہیں۔یعنی ان کا معنوی مقام و منزلت، ان کا علم و دانش اور ایمان اس قدر بلند ہے کہ ان کو چاہیے کہ ہمیشہ اپنے خدا کی طرف خاص توجہ رکھیں، ان کی معمولی سے کام میں چھوٹی سی غفلت گناہ سمجھی جاتی ہے اور یہ معروف جملہ "حسنات الابرار سیئات المقربین" (نیک لوگوں کی خوبیاں خدا کے مقرب بندوں کے گناہ شمار ہوتے ہیں) بھی اسی حقیقت کو بیان کر رہا ہے۔[۱]

بلند پایہ شیعہ فلسفی خواجہ نصیر الدین طوسی مرحوم نے اپنی ایک کتاب میں مذکورہ مطلب کی یوں وضاحت کی ہے۔

جب بھی کوئی شخص حرام کام کا مرتکب ہو یا واجب حکم کو ترک کرے وہ گناہگار ہے اور اس کو چاہیے کہ وہ توبہ کرے۔گناہ کی یہ قسم معمولی اور عام افراد سے مربوط ہے۔

لیکن جب کوئی شخص مستحب عمل کو ترک کر دے یا کسی مکروہ کو انجام دے یہ بھی گناہ کی ایک قسم ہے اور اس کو توبہ کرنی چاہیے۔گناہ اور توبہ کی یہ قسم ان افراد سے مربوط ہے جو قسم اول کے گناہوں سے پاک ہیں۔

قرآن مجید اور روایات میں وہ گناہ جن کو انبیاء علیہم السلام مثلاً حضرت آدمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یونسؑ......کی طرف نسبت دی گئی ہے، دوسری قسم کے ہیں نہ کہ پہلی قسم کے اور جب بھی کوئی شخص غیر خدا کی طرف ملتفت ہو، دنیا کے امور میں مشغول ہو کر لمحے بھر کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے توجہ ہٹالے، تو اہل حقیقت کے نزدیک یہ بھی ایک طرح کا گناہ ہے۔اس سے توبہ کرنی چاہیے اور خدا سے مغفرت طلب کرنی چاہیے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہمارے ائمہ علیہم السلام نے اپنی دعاؤں میں جن گناہوں کا اقرار کیا ہے اور خدا سے مغفرت و بخشش طلب کی ہے ان کے گناہ اس تیسری قسم سے ہیں، نہ پہلی اور نہ ہی دوسری قسم سے۔[۲]

اس جواب کی تکمیل کے لیے بہت بڑے دانشور اور بزرگوار، علی بن عیسی اربلی، مرحوم نے اپنی نفیس کتاب "کشف الغمہ فی معرفتہ الائمہ" کی تیسری جلد میں حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کی تاریخ زندگی بیان کرتے ہوئے ضمناً اس امر کا ذکر کیا ہے اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ "امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک دعا سجدۂ شکر میں پڑھتے تھے اور اس میں مختلف قسم کے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے تھے۔"[۳] میں نے جب اس دعا پر غور و خوض کیا تو اپنے آپ سے کہا: جس شخص کے بارے میں شیعہ عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں ایسے گناہوں کے اقرار پر مبنی جملات اس سے کیسے صادر ہو سکتے ہیں! میں نے اس بارے میں بہت سوچا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ

---

[۱] رہبرانِ بزرگ ص ۲۳۲۔۲۳۸

[۲] اوصاف الاشراف ص ۱۷

[۳] اصل دعا سے واقفیت کے لیے کشف الغمۃ ج ۳ ص ۴۳ کی طرف رجوع کیا جائے۔

سکا۔ ایک روز ایک موقعہ میسر آ گیا کہ میں اور رضی الدین ابی الحسن ابن طاؤس ایک جگہ پر اکٹھے ہو گئے۔ اس مسئلہ کو میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: ''وزیر موید الدین علقمی نے کچھ عرصہ پہلے یہی سوال مجھ سے کیا تھا۔ میں نے اس کا جواب دیا ہے کہ اس قسم کی دعائیں لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے تھیں۔''

اس جواب کے بعد میں نے کچھ غور کیا اور اپنے آپ سے کہا اس دعا کو حضرت امام موسیٰ ابن جعفر علیہما السلام آدھی رات کے وقت سجدوں میں پڑھتے تھے اور اس وقت ان کے قریب کوئی نہیں ہوتا تھا کہ جس کی تربیت مقصود ہو۔ اس واقعہ کو کافی عرصہ گزرنے کے بعد ایک دن وزیر موید الدین محمد بن علقمی نے وہی سوال مجھ سے کیا۔ میں نے وہی جواب دیا اور ساتھ ہی اپنا اعتراض بھی بیان کر دیا۔ پھر میں نے اضافہ کیا کہ شاید اس دعا کا مقصود حقیقی صرف حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہما السلام کی پروردگار کے سامنے تواضع اور انکساری ہو۔

اگرچہ 'ابن طاؤس' کے جواب سے میں مطمئن نہیں ہوا اور یہ اعتراض میرے دل میں موجود رہا۔ اسی دوران ابن طاؤس اس جہان فانی کو الوداع کہہ گئے۔ ان کی وفات کے کافی دن بعد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی عنایات کی وجہ سے میری یہ مشکل حل ہو گئی۔ اس کا صحیح جواب آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

پیغمبران اور ائمہ علیہم السلام ہر وقت ذکر خدا میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے دل دوسرے جہان سے وابستہ تھے۔ وہ ہمیشہ جیسا کہ معصوم علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ''خدا کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہ دیکھ سکو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔'' اس حقیقت کی طرف متوجہ تھے۔

وہ ہمیشہ اس ذاتِ اقدس کی طرف متوجہ ہیں اور پورے معنوں میں اس کی طرف رخ کیے ہوئے ہیں کہ جب بھی لحہ بھر کے لیے اس حالت سے غافل ہوئے صرف مباح کام، مثلاً کھانا پینا ان کی اس حالت میں رکاوٹ ہیں۔ وہ تو غفلت کی اس مقدار کو بھی اپنے لیے گناہ اور خطا سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان: "انه لیران علی قلبی وانی استغفر بالنهار سبعین مرة" اور مشہور جملہ "حسنات الابرار سیئات المقربین" اور اس قسم کی دوسری مثالیں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کی ہم نے ابھی وضاحت کی ہے۔[1]

۹۔ کیا مشرک کی توبہ قبول ہوگی؟

قرآن کی نظر میں مشرک وہ ہے جو توحید کے مراحل سے کسی ایک میں خدا کے شریک اور ہمسر کا قائل ہو۔ قرآن مجید دو مقامات پر یاد دلاتا ہے کہ خدا شرک کے سوا تمام گناہوں کو معاف کر دے گا، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] کشف الغمہ ج ۳ ص ۴۲۔ ۴۴

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ [۱]

''بے شک اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرتا اس کے علاوہ جسے چاہے معاف کر دے جس کسی نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا پس اس نے بہت بڑا جھوٹ اور افتراء باندھا ہے۔''

ان دو آیتوں کے حکم سے ممکن ہے یہ تصور جنم لے کہ گناہ شرک ہرگز بخشا نہیں جائے گا ہر چند کہ اس سے توبہ کر لی جائے جبکہ مقصود کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ بعض گناہ خدا کی وسیع رحمت کے اثر سے توبہ کیے بغیر بخشے جاتے ہیں، لیکن شرک ایسی رحمت کے قلمرو میں بھی نہیں آتا کیونکہ مشرک نزولِ رحمت کی ہرگز لیاقت نہیں رکھتا۔ البتہ توبہ کے ذریعے اس کی بخشش واضح ہے۔ صدرِ اسلام میں جو افراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جذب ہو گئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو قبول کر لیا تھا، وہ مشرک تھے۔ توبہ کی آیات اپنی مضبوط عمومیت کی وجہ سے شرک کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ [۲]

''وہ وہ ہے کہ جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے، ان کی برائیوں سے درگزر کرتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو وہ اس سے آگاہ ہے۔''

یہ اور دیگر آیات توبہ کے سائے میں گناہِ شرک کی بخشش کو بھی بیان کرتی ہیں۔

۱۰۔ ایمان کے بعد کفر پر اصرار

بعض آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایمان کے بعد کفر اختیار کرتے ہیں اور کفر میں زیادہ بڑھ جاتے ہیں (عناد کے باعث اس پر اصرار کرتے ہیں)۔ ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ

---

[۱] سورہ النسا آیت ۴۸ یہ آیت سورۂ نسا آیت ۱۱۶ میں بھی ان الفاظ میں آئی ھے ''وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾''

[۲] سورہ شوریٰ آیت ۲۵

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ۝۹۰ [1]

''وہ لوگ جنھوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا، پھر اپنے کفر میں اور بڑھ گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ یہی لوگ گمراہ ہیں۔''

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی توبہ کیوں قبول نہیں ہوگی؟

جواب

مندرجہ بالا آیت کی وضاحت کے لیے پہلے اور بعد والی آیات میں زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلی آیت میں اس کی توبہ کی قبولیت اعلان کیا گیا ہے جس نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ.......... خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ.......... اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ" [2]

''اللہ ان لوگوں کی جنھوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا کیسے ہدایت کرے؟ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے اور ان کے عذاب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی .....مگر وہ جو اس کے بعد توبہ کرلیں۔''

اور اس کے بعد والی آیت میں موت کے وقت توبہ کی عدم قبولیت کا اعلان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ [3]

''وہ جنھوں نے کفر اختیار کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے، ان سے عذاب سے چھٹکارے کے لیے کوئی چیز بھی قابل قبول نہیں ہے اگرچہ وہ زمین کی وسعت جتنا سونا ادا کریں۔''

طبرسی مرحوم کی نظر میں یہ آیت موت کے وقت خیرات و صدقے سے متعلق ہے۔ مسلما فدیہ اس صورت میں انجام پاتا ہے جب انسان اپنے گذشتہ کاموں سے پشیمان ہو جائے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موت کے وقت توبہ قابل قبول نہیں ہے۔

اب زیر بحث آیت سے پہلے والی آیت ایمان کے بعد کفر پر توبہ کی قبولیت کو بیان کر رہی ہے اور بعد والی آیت موت کے وقت توبہ کی

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۹۰

[2] سورہ آل عمران آیت ۸۶ تا ۸۹

[3] سورہ آل عمران آیت ۹۱

عدم قبولیت کا ذکر کر رہی ہے۔ یہاں پر کفر میں افزائش اور موت سے قبل توبہ کی عدم قبولیت سے مراد بے روح توبہ ہو سکتی ہے۔ اگر اس گروہ کی توبہ حقیقی توبہ ہوتی تو جس طرح ان سے پہلے لوگ عفو و بخشش کے مستحق ٹھہرے ہیں اسی طرح کفر میں افزائش کو بھی اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت گھیر لیتی۔ لیکن چونکہ توبہ خالص نہیں تھی اس لیے قبول کی گئی۔ اس کے علاوہ آیت میں مذکورہ جملہ ''اولٰئک ھم اضالون'' اس بات پر گواہ ہے کہ ان کی توبہ نے اُن کی روحانی فضا کو پاک وصاف نہیں کیا اور ابھی تک وہ لوگ گمراہ اور سرگردان ہیں۔

۱۱۔ تبعیض توبہ

توبہ سے مربوط مباحث میں سے ایک مسئلہ تبعیض پذیری ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ بعض خاص گناہوں سے توبہ اور ان پر ندامت کا اظہار کیا جائے جبکہ بعض دوسرے گناہوں کی اعتنا نہ کی جائے یا ان پر باقی رہنے کا ارادہ ہو؟ اس مسئلے نے اسلامی متکلمین کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۱۔ بعض معتزلہ نے توبہ کی تبعیض پذیری کی نفی کی ہے۔ ابو ہاشم ابن ابوعلی جبائی (متوفی ۳۲۱ ہجری) اس نظریہ کا علمبردار تھا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ:

صرف بعض گناہوں سے ندامت قابل قبول نہیں ہے۔ اگر انسان ایک گناہ پر واقعاً نادم اور پشیمان ہو تو اصولی طور پر اسے سب گناہوں پر نادم اور پشیمان ہونا چاہیے۔ اگر کچھ گناہوں پر وہ نادم نہ ہو تو دیگر گناہوں پر بھی وہ نادم اور شرمندہ نہیں ہو سکتا۔ گویا تمام گناہ زنجیر کے حلقوں کی طرح آپس میں اس طرح پیوستہ ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سب کو خیر باد کہہ دے یا سب کو اپنا لے اور ان سے چمٹا رہے۔

وہ کہتا ہے کہ انسان اگر ایک گناہ کو اس کی برائی اور ناپسندیدگی کی وجہ سے ترک کرتا ہے، اب جبکہ یہی بات تمام گناہوں میں موجود ہے تو پھر اسے باقی گناہوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہیے، یعنی سب کو ترک کرنے کا مصمم ارادہ کرنا چاہیے اور سب پر ندامت و شرمندگی کا احساس کرنا چاہیے۔ اگر وہ بعض گناہوں کے ترک کرنے کا پختہ ارادہ نہ کرے، جبکہ وہ گناہ بھی قبح اور برائی کے لحاظ سے باقی گناہوں کی طرح ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس میں کسی بھی گناہ کے بارے میں احساس ندامت پیدا ہی نہیں ہو، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ بعض گناہوں سے تو وہ دوری اختیار کرے اور بعض کو اپنائے رکھے۔ [1]

صرف ابو ہاشم ہی اس نظریہ (توبہ کی تعبیض ناپذیری) پر اصرار نہیں کرتا بلکہ قاضی عبدالجبار نے بھی یہی روش اپنائی ہے۔ اس نے ایک مثال سے اپنے استدلال کو جدید رنگ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''اگر انسان ایک ایسے راستے پر نہیں جاتا جس پر درندہ موجود ہے تو کیا وہ اس جیسے دوسرے راستے پر جس پر درندے کا وجود یقینی ہو، جا سکتا ہے؟ یا مثلاً ایک کھانے کو زہریلا ہونے کی بنا پر چھوڑ دے تو کیا اس جیسا دوسرا کھانا کھا سکتا ہے؟''

۲۔ ابو ہاشم توبہ کی تبعیض ناپذیری کا قائل ہے جبکہ اس کا باپ ابوعلی جبائی (متوفی ۳۰۳ھ) توبہ کو مکمل طور پر تبعیض پذیر سمجھتے ہوئے اس پر

---

[1] شرح اصول خمسہ ص ۷۹۴

یوں استدلال کرتا ہے:

''آپ فرض کریں کہ ایک کافر مختلف قسم کے گناہ (کفر کے علاوہ) میں ملوث ہے، لیکن اس کو سعادت نصیب ہوئی اور وہ دین توحید کی آغوش میں آنا چاہتا ہے اور ایک گناہ مثلاً جھوٹ کے علاوہ تمام گناہوں اور برائیوں کو خیر باد کہنا چاہتا ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے اس کا جواب 'ہاں' ہے، حالانکہ جس چیز کو ابو ہاشم محال اور ممتنع سمجھتا ہے اس نے اس مثال میں عملی شکل اختیار کر لی ہے، کیونکہ وہ کفر اور دیگر گناہوں کو قبح اور برائی کی وجہ سے ترک کر رہا ہے جبکہ وہی قباحت اور برائی جھوٹ میں موجود ہے، لیکن وہ اس کو نفسیاتی و روحانی یا مادی و دنیوی عوامل کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتا۔ اگر ابو ہاشم کی بات کو صحیح اور سچا تسلیم کر لیا جائے تو کہنا چاہیے کہ ایسا کافر مسلمان نہیں ہوا بلکہ اپنے کفر پر باقی ہے حالانکہ ایک بھی فقیہی ایسے انسان کو کافر نہیں کہہ سکتا۔''

البتہ یہاں پر ہر دو طرف بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ان کو نقل کرنے سے بات لمبی ہو جائے گی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس اشکال کا کسی اور لحاظ سے جواب دینا چاہیے کیونکہ مثالوں کو زیادہ کرنے سے اور وہ بھی ایک دوسرے کی نقیض مثالوں سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہاں پر حق وہی ہے جو محقق طبرسی علیہ الرحمہ نے تجرید میں کہا ہے۔ نفسیات کے حوالے سے یہ بات بہت ہی عمدہ اور مفید ہے اور وہ یہ ہے:

اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ سب گناہ برے (ناپسندیدہ) اور قبیح ہیں۔ لیکن یہاں پر یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ گناہوں کے برائی و ناپسندیدگی کے لحاظ سے درجات اور مراتب ہیں۔ دوسروں کے مال میں سے تھوڑی سی مقدار بھی کھانا برا اور گناہ ہے اور مسجد و مقدس مقامات میں حرام کی ملاوٹ بھی حرام اور ناروا ہے۔ اگر کوئی دوسرے گناہ کے بڑے ہونے کی وجہ سے توبہ اور ندامت کا اظہار کرے تو اس دلیل پر کہ دونوں قباحت اور برائی میں شریک ہیں اسے پہلے گناہ پر نادم اور شرمندہ شمار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ایک بہت بڑا گناہ جس کا انجام بہت ہی تلخ اور ناگوار ہے، جس کی سزا نہایت سخت ہے، اس سے ندامت اور شرمندگی انسان کی ایک چھوٹے گناہ جس کی سزا بھی کم ہے، سے بھی ندامت اور پشیمانی کا سبب نہیں بنتی۔

اصولی طور پر علم نفسیات کی نظر میں بیرونی عوامل انسان کے ارادہ میں 'موثر' ہیں۔ شاید کبھی انسان اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے ایک گناہ کو ترک کر دے، گناہ کی برائی اور اس کا قبح مذکورہ عامل کے اضافے کے ساتھ انسان کے ہمیشہ کے لیے گناہ چھوڑنے کا باعث ہے، جبکہ دوسرے گناہ میں ممکن ہے وہ عامل موجود نہ ہو۔ اس لحاظ سے صرف گناہ کی برائی سے آگاہ ہونا، توبہ کا سبب نہیں بنتا۔

ہم ایسے بہت اشخاص کو پہچانتے ہیں جو بعض گناہوں سے پاک ہیں، مثلاً کسی قیمت پر بھی بے گناہ انسان کو قتل نہیں کرتے، یا مسجد کو تباہ و برباد نہیں کرتے، یا ذرہ برابر بھی حرام کی ملاوٹ نہیں کرتے۔ لیکن یہی افراد بعض دوسرے گناہوں سے نہ صرف مبرا نہیں ہیں بلکہ سر سے لے کر پاؤں تک ان میں غرق ہیں۔

لہٰذا جیسا کہ ابتداء میں گناہ کے انجام پانے میں تبعیض امکان پذیر ہے اور انسان ایک گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جبکہ دوسرے گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اسی طرح زندگی کے کچھ حصے میں جب وہ عاقل تر اور آگاہ تر ہو جائے تو اس کے ترک گناہ میں بھی تبعیض امکان پذیر ہے۔ یہ سوچ اور فکر کہ تمام انسان آن واحد (ایک لحظہ) میں ایسے نیک اور پرہیزگار بن جائیں کہ ایک ہی دفعہ ہر قسم کے گناہوں سے اپنا رشتہ و ناطہ توڑ لیں،

ایک خام خیالی ہے جس کو واقعات اور تجربات شدت کے ساتھ جھٹلاتے ہیں۔

یہاں پر توبہ کی تبعیض پذیری کے بارے میں بعض آیات و روایات سے مدد لی جاسکتی ہے۔قرآن مجید توبہ کے بارے میں یوں فرماتا ہے:

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ [۱]

''تمہارے پروردگار نے اپنے آپ پر رحمت کرنا لکھ لیا ہے اگر تم میں سے کوئی نادانی و جہالت کی وجہ سے برا کام انجام دے، پھر اس سے توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرلے، پس خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

گفتگو کلمہ ''سوئ'' کے بارے میں ہے جو آیت میں نکرہ کی صورت میں آیا ہے، ظاہری طور پر یہ بتا رہا ہے کہ اگر کسی نے ایک برے کام سے توبہ کی اس کی توبہ قابل قبول ہوگی اگرچہ یہ کیفیت دوسری برائیوں کے بارے میں پیدا نہ ہو۔ ہر برائی کا فیصلہ جدگانہ ہے۔ ندامت و پشیمانی کے لحاظ سے سب بدیوں و برائیوں کا انجام ایک دوسری سے مربوط نہیں ہے۔

بعض روایات میں یوں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب فرمایا:

''اگر میرا مومن بندہ کوئی گناہ کرے پھر اس سے توب کرے اور جب بھی گناہ کی یاد آئے احساس شرمندگی اس پر چھا جائے تو اس کو معاف کردوں گا اور اعمال کے محافظوں کو نظرانداز کرنے کا حکم دوں گا اور اس کو نیک عمل میں تبدیل کردوں گا اور اس کام کی اعتناء نہیں کروں گا (کیونکہ) میں ارحم الراحمین ہوں۔'' [۲]

اس حدیث میں محور و مرکز صرف ایک گناہ ہے۔ اگر اس سے توبہ کی جائے تو بخشا جائے گا۔ یہ ہرگز نہیں کہا کہ اس سے توبہ باقی گناہوں سے توبہ کی صورت میں قبول ہوگی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے اس کی وسیع رحمت اور بخشش کا تقاضا یہ ہے کہ گناہوں کے بارے توبہ میں امتیاز دربارِ الٰہی میں لازماً مورد قبول ہو۔

ہاں بعض روایات میں جہاں توبہ کی قبولیت کے لیے شرائط بیان کی گئی ہیں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ ایک گناہ سے توبہ دیگر گناہوں کے ترک کرنے اور بعض فرائض کی انجام دہی پر موقوف ہے۔

یہ روایات توبہ کے کامل درجہ کی نشاندہی کرتی ہیں کہ واقعاً کمال توبہ کے لیے اس کے علاوہ چارۂ کار نہیں ہے۔ یہاں پر ہم امیر المومنین علی علیہ السلام کے کلمات ذکر کرتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرد نے آپؑ کی موجودگی میں استغفار کیا۔امام علیہ السلام اس کے لفظی اور زبانی استغفار سے ناراض ہوئے

---

[۱] سورہ انعام آیت نمبر ۵۴

[۲] بحار الانوار ج ۶ باب ۲۰ حدیث ۳۰ ص ۲۸

اور فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو استغفار کیا ہے؟ بلند مرتبہ لوگوں کا درجہ ہے۔ اس کا وقوع چھ قسم کے اعمال پر منحصر ہے:

۱۔ گذشتہ اعمال پر نادم اور شرمندہ ہو۔

۲۔ مستقبل میں ترک کرنے کا پختہ ارادہ کرے۔

۳۔ لوگوں کے حقوق اس طرح ادا کرے کہ اس کا نامہ اعمال بالکل پاک و پاکیزہ ہو جائے اور اس کے ذمے کوئی چیز باقی نہ رہے۔

۴۔ ایسے فرائض جن کو ماضی میں ترک کیا تھا ان کی قضا بجالائے۔

۵۔ حرام طریقے سے بدن کا جو گوشت بنا ہے غم واندوہ کے ذریعے اس کو یوں پگھلائے کہ جلد جسم کی ہڈیوں سے جا ملے اور نئے سرے سے گوشت ان میں پیدا ہو۔

۶۔ حکم کے انجام دینے کی تکلیف کا مزہ خود کو چکھائے جس طرح گناہوں کی لذت چکھی ہے۔ ان شرائط میں اس کا حق بنتا ہے کہ "استغفر الله" کہے۔''[۱]

یہ بات مسلم ہے کہ امام المتقین علی علیہ السلام نے اس روایت میں توبہ کی جو شرائط بیان فرمائی ہیں یہ ان توبہ کرنے والوں کے بارے میں ہیں جو صدیقین و علیین کے مقام پر فائز ہیں ورنہ عام انسانوں کی قبولیت توبہ کے لیے اس میں سے بعض شرائط، مثلاً گوشت حرام کو گھلانا' قطعاً ضروری نہیں ہیں۔

۱۲۔ جاہلانہ کردار سے توبہ

قرآن کی بعض آیات میں جہالت و نادانی کے باعث انسان سے سرزد ہونے والے گناہوں کو قابل توبہ بیان کیا گیا ہے۔ آیئے اس امر سے مربوط آیات کی طرف نگاہ کرتے ہیں۔

۱۔ اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓٮِٕكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝۱۷ [۲]

''ان لوگوں کی قبولیت توبہ اللہ کے ذمے ہے جنہوں نے جہالت کی وجہ سے برے کام انجام دیے ہیں پھر وہ فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف اللہ رحم و کرم کے ساتھ دیکھتا ہے۔ خدا دانا اور حکیم ہے۔''

۲۔ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ‌ ۙ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ

---

[۱] نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر شمار ۴۱۷

[۲] سورہ نساء آیت ۱۷

تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ [۱]

''تمہارے پروردگار نے اپنے آپ پر بندوں پر رحمت کرنا لکھ لیا ہے، جس کسی نے بھی نادانی کی وجہ سے برا کام انجام دیا پھر اس سے توبہ کی اور اپنی اصلاح کی، تو وہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔''

۳۔ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ [۲]

''بیشک تمہارا رب ان کے لیے ہے جنہوں نے جہالت کی وجہ سے بدی کو انجام دیا ہے۔ پھر انہوں نے توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی۔ بیشک تمہارا پروردگار ایسے جاہلانہ عمل کے بعد توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔''

جیسا کہ آپ نے ان تین آیات میں ملاحظہ فرمایا جہالت کی وجہ سے انجام دیے گئے عمل کی توبہ قابل قبول ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جہالت کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ جہالت 'جہل' سے مشتق ہے جس کا متضاد 'علم' ہے۔ لیکن 'جہل' و 'جہالت' بلکہ 'جاہل' دو معنوں میں استعمال ہوتے ہیں:

کبھی جہل نہ جاننے کے معنی میں اور جاہل 'جو نہیں جانتا' کے معنی میں آتا ہے۔ اس صورت میں جاہل عالم اور آگاہ کے مقابلے میں ہے۔

قرآن میں جاہل اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ [۳]

''نا آگاہ افراد تہی دستوں کو ان کی عفت کی وجہ سے غنی اور بے نیاز خیال کرتے ہیں۔''

لیکن زیادہ تر کلمہ جاہل، جہالت اور جاہلیت وہاں استعمال ہوتا ہے کہ انسان آگاہ اور دانا ہے، لیکن کام کی برائی سے آگاہی اس پر اثر نہیں کرتی بلکہ برائی سے نا آگاہ کی طرح برے کاموں کو انجام دیتا ہے۔ گویا بنیادی طور پر یہ شخص اپنے کردار کی برائی سے آگاہ ہی نہیں بلکہ اس کو خوبصورت اور پسندیدہ خیال کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں برائی کا ادراک اور آگاہی اس کی اندرونی خواہشات سے مغلوب اور سرکش میلانات اس پر چھا چکے ہیں۔

---

[۱] سورہ انعام آیت ۵۴

[۲] سورہ نحل آیت ۱۱۹

[۳] سورہ بقرہ آیت ۲۷۳

شہوت، غضب اور ہوا و ہوس اس کی زندگی پر حاوی ہیں۔

ایسے افراد کو قرآن میں اور عوام الناس کی زبان میں جاہل اور نادان کہا گیا ہے (اگر چہ وہ صاحبانِ عقل و خرد اور صاحبانِ علم و دانش ہی کیوں نہ ہوں) اور ان کے عمل کو جاہلانہ عمل کہا گیا ہے۔ چونکہ ان کا عمل ایک طرح کی نادانی کی وجہ سے سرزد ہوا ہے۔ چنانچہ خواہشات کا غلام جو ان، جس کی عقل و ہوش پر اس کے جذبات غالب آ چکے ہیں، کو جاہل اور نادان کہتے ہیں اگر چہ وہ اپنے رویے اور اس کی برائی سے آگاہ ہو۔

قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بھائیوں سے یوں فرمایا:

هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَاَخِيهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿٨٩﴾[1]

''کیا تمہیں وہ ظلم یاد ہے جو تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی پر کیا جبکہ تم جاہل و نادان تھے۔''

ان کی جہالت اور نادانی ظلم و ستم کی برائی سے ناآگاہی کے معنوں میں نہ تھی بلکہ اس کی قباحت کو جانتے تھے اور اسی وجہ سے باپ کے سامنے اپنے آپ کو بے قصور ظاہر کیا۔ لیکن چونکہ یہ علم ان کو اس کام سے باز رکھنے میں موثر ثابت نہ ہوا اور خود غرضی ان کے اور ان کے برے عمل کے مابین ایک ضخیم پردہ بن کر حائل ہو گئی، اس طرح سے کہ گویا وہ اپنے عمل کی برائی سے بالکل آگاہ ہی نہ تھے۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ گناہگار سے سرزد ہونے والے برے اعمال دو قسم کے ہیں۔

۱۔ برے عمل کو اگر انسان ہوا و ہوس اور حیوانی جبلت کے تحت انجام دیتا ہے تو ایسا عمل جاہلانہ عمل ہے اور چونکہ یہ عمل نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے سرزد نہیں ہوا، لہٰذا جبلی تسکین، غضب و شہوت کی آگ کے خاموش ہونے اور جہالت کے پردے ہٹ جانے سے وہ فوراً پشیمان ہوتا ہے اور اپنی ندامت اور شرمندگی کا اظہار کرتا ہے۔ بلاشبہ ایسے انسان کی توبہ قابل قبول ہے اور رحمت الٰہی اس کے شامل حال ہوگی۔

۲۔ برا عمل اگر انسان کے نافرمانی و عناد کی وجہ سے سرزد ہو نہ کہ ہوا و ہوس کی زیادتی اور نہ جبلت کی سرکشی کی وجہ سے، بلکہ اس کی اندرونی خباثت، نافرمانی اور اس کے غرور تکبر نے اسے اس نامناسب اور بدعمل پر ابھارا ہو۔ اکثر ایسی حالت زندگی کے ختم ہونے تک باقی رہتی ہے اور یہ ایام جوانی کی خواہشات اور ہوا و ہوس کی خاموشی کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ایسا عمل توبہ کی وسعتوں سے خارج ہے اور خدا کی رحمت بیکراں اس کے شامل حال نہیں ہوگی۔

عام طور پر ایسے افراد زندگی کے آخری لمحات میں جب ہر چیز سے اپنے آپ کو مجبور و بے بس دیکھتے ہیں تو ندامت کا اظہار کرتے ہوئے توبہ کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ اپنے برے کاموں سے پشیمان نہیں ہوتے اور اگر انہیں موقع مل جائے تو وہ دوبارہ انہی کاموں کو انجام دیں گے۔ یہی گروہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ

[1] سورہ یوسف آیت ۸۹

وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ۝۲۸ [1]

''جو کچھ انہوں نے پہلے چھپا رکھا تھا وہ ان کے لیے ظاہر ہو گیا اور اگر وہ دنیا میں واپس چلے جائیں تو جس سے ان کو منع کیا گیا اس سے ہرگز اجتناب نہیں کریں گے اور وہ جھوٹے ہیں۔''

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہٹ دھرم انسان اپنی نافرمانی اور ہٹ دھرمی سے ہاتھ اٹھا لے یا ایک مغرور اور متکبر انسان اپنے تکبر اور غرور سے باز آ کر اطاعت و بندگی کا راستہ اختیار کر لے تو ایسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ ایسے فرد کی نافرمانی جہالت کی وجہ سے تھی نہ کہ اس کی اندرونی رذالت اور خباثت کی وجہ سے۔ نتیجے کے طور پر خدا کی رحمت اس کے شامل حال ہوگی، نیز اس کی توبہ بھی قبول ہوگی اور اس کا شمار توبہ کرنے والوں میں سے ہوگا۔

گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ توبہ نافرمانوں اور ہٹ دھرموں اور مغروروں کے لیے سبز چراغ نہیں کہ اس کی امید پر وہ خدا کے بندوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیں اور کسی بھی برے اور گھٹیا کام سے گریز نہ کریں۔ بلکہ توبہ تو ان افراد کے لیے امید کی کرن ہے جو اپنی حیوانی خواہشات سے مغلوب ہو گئے اور نفسانی قوتیں ان کو گناہ اور نافرمانی کی طرف کھینچ لائیں۔ ایسے افراد کی توبہ قبول ہے اور وہ خاص شرائط کے تحت خدا کے لطف و کرم سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں جہالت سے مربوط آیات کے متعلق یوں نقل کیا گیا ہے: ''جہالت سے مراد ایسا گناہ ہے جس کو خدا کا بندہ انجام دیتا ہے اگرچہ اس کے حکم سے آگاہ ہوتا ہے، لیکن جب وہ نافرمانی کا ارادہ کرتا ہے تو دراصل وہ جاہل ہے۔'' پھر آپؑ نے حضرت یوسفؑ سے متعلق مذکورہ آیت (۸۹) سے جاہل کے معنی پر استدلال کیا ہے۔ [2]

۱۳۔ وقت قبولیت توبہ

قرآن توبہ کے لیے ایک خاص وقت کا قائل ہے۔ کبھی اس کے بارے میں فرماتا ہے:

ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ [3]

پھر فرماتا ہے:

ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ [4]

---

[1] سورہ انعام آیت ۲۸

[2] بحار الانوار ج ۶ ص ۳۲

[3] سورہ نساء یت ۱۷

[4] سورہ انعام آیت ۵۴

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلمہ ''من قریب'' اور ''من بعدہ'' سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مراد ہے کہ گناہ کے فوراً بعد بغیر کسی وقفے کے یا بہت جلدی توبہ کرے؟ یا توبہ کا وقت بہت وسیع ہے؟ صرف ایک وقت ایسا ہے جس میں توبہ قبول نہیں ہوتی اور وہ وقت ہے جب موت اپنے پنجے انسان کے جسم میں گاڑ دے اور روح سینہ تک پہنچ جائے اور انسان موت کا مشاہدہ کرے۔

ان دو جملوں (من قریب اور من بعدہ) کے ابہام کو دوسری آیات کے ذریعے سے برطرف کیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن کریم ایک باریک تقسیم کے ذریعے توبہ کرنے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے اور واضح طور پر فرماتا ہے کہ ایک گروہ کی توبہ قبول ہوگی اور دوسرے گروہ کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔

جن افراد کی توبہ قبول ہوگی ان سے مربوط وہی آیت ہے جس میں کلمہ ''من قریب'' آیا ہے۔ لیکن جن افراد کی توبہ قبول نہیں ہوگی سے مربوط آیت درج ذیل ہے:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَھُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ١٨ [1]

''وہ لوگ جنہوں نے برے کام انجام دیے ہیں اور ایسے لحات میں جب موت آن پہنچتی ہے تو توبہ کرتے ہیں نیز وہ افراد جو کافر مرتے ہیں، کے لیے توبہ نہیں ہے (یعنی توبہ قبول نہیں ہے) ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

ان دو آیتوں کا آپس میں موازنہ کرنے سے کلمہ ''من قریب'' کا ابہام دور کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ اس سے مراد دوسری آیت میں مذکورہ جملے ''اذا حضر احدھم الموت'' کا نقطہ مقابل ہے۔ ان دو آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موت کی گھڑی سے پہلے توبہ قبول ہوگی اور موت کے وقت توبہ قابل قبول نہیں ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ توبہ اس وقت خدا کی رحمت کا موجب بن سکتی ہے جب انسان اپنی روح کی فضا کو پوری حریت اور آزادی کے ساتھ پاک کرے تاکہ رحمت الٰہی کے نازل ہونے کے قابل ہو جائے۔ لیکن انسان کی برے عمل سے دم مرگ توبہ ایک طرح سے بادلِ ناخواستہ پشیمانی ہے اور ایسا اس نے عذاب کو مشاہدہ کرنے کے باعث کیا ہے اور یہ کوئی ایسا جذبہ اور ایسی آواز نہیں کہ جو انسان اپنے اندر سے سنتا ہے، بلکہ ایک ایسی فکر ہے جو باہر سے اس پر مسلط ہوتی ہے اس کو ہرگز نفس کی طہارت اور روح کی پاکیزگی کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے قطع نظر کلمہ ''من قریب'' ایک طرح سے جلدی توبہ کرنے کی دعوت ہے اور عقل و فکر کا بھی یہی حکم ہے اور یہ مناسب نہیں کہ انسان لمبی عمر کی امید میں اظہارِ ندامت میں تاخیر کرے۔

---

[1] سورہ نساء آیت ۱۸

موت کی گھڑی آن پہنچنے اور عالم آخرت کا مشاہدہ کرنے کے بعد توبہ کا کوئی راستہ نہیں اور وہ قابل قبول نہیں۔ روایات میں بھی اس امر پر تاکید کی گئی ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"من تاب قبل ان یعاین قبل الله توبته"[۱]

''جو کوئی بھی موت کا نظارہ کرنے سے پہلے توبہ کرلے اس کی توبہ خدا قبول کرتا ہے۔''

شیخ صدوقؒ کہتے ہیں کہ امام صادق علیہ السلام سے اس آیت "ولیست التوبة للذین......" کے مفہوم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: "ذالك اذا عاین امر الاخرة۔"[۲] یہ محرومیت اس لمحے سے مربوط ہے جب پردہ اٹھ جائے اور دوسرے جہان کا نظارہ کیا جائے۔

لہٰذا بعض ایسی روایات جو توبہ کی آخر وقت میں قبولیت کی حکایت کرتی ہیں ان کی مذکورہ روش کے مطابق توجیہ کی جانی چاہیے یعنی انسان موت اور دوسرے جہان کے مشاہدے کے مرحلے تک نہ پہنچ چکا ہو کیونکہ اس صورت میں اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔[۳]

قرآن فرعون اور اس کی ہلاکت کے یقینی ہونے کے بعد توبہ کے بارے میں فرماتا ہے:

حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰[۴]

''جب دریا کی موجوں نے اس کو گھیر لیا تو اس نے کہا میں اس خدا پر ایمان لایا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمین میں سے ہوں۔''

لیکن خدا کے قہر آمیز جواب کے علاوہ اسے کچھ سنائی نہ دیا۔ اس موقعہ پر اس سے کہا گیا:

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۹۱[۵]

''کیا اب توبہ کرتا ہے جبکہ اس سے پہلے تو گناہ کرتا رہا اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا؟''

---

[۱] وسائل الشیعہ ج۱۱ باب ۹۳ از ابواب جہاد نفس حدیث ۳،۷ ص ۳۷۰

[۲] وسائل الشیعہ ج۱۱ باب ۹۳ از ابواب جہاد نفس حدیث ۳،۴ ص ۳۷۰

[۳] یہ احادیث ۱، ۲، ۵، ۶، ۱۱ ذکر کیے ابواب سے رجوع کریں۔

[۴] سورہ یونس آیت ۹۰

[۵] سورہ یونس آیت ۹۱

۱۴۔توبہ نصوح سے کیا مراد ہے؟

قرآن با ایمان افراد کو توبہ نصوح کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ [1]

''اے ایمان والوں خدا کے حضور توبہ کرو، توبہ نصوح (خالص) شاید تمہارا پروردگار تمہاری بدیوں کو چھپا دے (بخش دے)۔''

"نصح" عربی لغت میں خالص کے معنی میں ہے جیسے موم سے خالص شہد کو ''عسل نصوح'' کہتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ توبہ خالص سے کیا مراد ہے؟

شاید اس سے مراد یہ ہو کہ عقل وفطرت اور شرع کی نظر سے برے عمل کی برائی سے آگاہی کی وجہ سے توبہ کرو۔ دوسرے الفاظ میں توبہ کا محرک عبودیت اور بندگی کا احساس ہو نہ کہ لوگوں کی مذمت اور سرزنش کا خوف اور نہ آخرت کے عذاب کا ڈر۔ اس صورت میں توبہ کامل درجے کی ہوگی۔ اگرچہ عذاب خدا کے ڈر سے بھی توبہ نجات بخش ہے، لیکن ان دو توبہ کے درمیان اصلاح کے حوالے سے بہت فرق ہے۔

یہاں پر ایک اور احتمال بھی ذکر ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"نصح" عربی لغت میں سیراب کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "نصح الغيث البلد" بارش نے علاقے کو سیراب کر دیا۔'' اس صورت میں توبہ نصوح سے مراد ایسی توبہ ہو سکتی ہے جس سے گناہوں کی وجہ سے مردہ دلوں میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ جائے اور دل گناہ کی تاریکیوں سے پاک ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے مراد حقیقی توبہ ہے۔

بعض نے کہا ہے ''نصوح'' سے مراد ''سچی توبہ'' ہے۔

جذری اپنی کتاب ''نہایہ'' میں جو اس نے حدیث کی لغات کے بارے میں لکھی ہے، کہتا ہے: ''ابی بن کعب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ توبہ نصوح سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایسی توبہ جو سچی ہو یعنی پھر وہ دوبارہ گناہ کی طرف نہ جائے۔''

بہرحال محرکات اور ندامت کے مختلف درجوں کے لحاظ سے توبہ کے مختلف مراتب ہیں۔

۱۵۔توبہ کی قسمیں

توبہ کی حقیقت اس حالت میں خدا کی طرف بازگشت ہے جب ندامت اور پشیمانی روح کی فضا کو گھیر لے۔ لیکن ایسی حالت کے

---

[1] سورۂ تحریم آیت ۸

وقوع پذیر ہونے اور دائم وقائم رہنے کی علامت یہ ہے کہ اپنے معاملات کو ماضی کی طرح گناہ آلودنہ کرے اور اپنے عزم وارادہ پر قائم رہے۔ لیکن اسلام روح توبہ کی پرورش کے لیے ندامت کے علاوہ بھی کئی دوسرے امور کو انجام دینا ضروری سمجھتا ہے۔ درحقیقت ان امور کو بجالانا توبہ کی حقیقت کا جزو نہیں بلکہ توبہ کی قبولیت اور گذشتہ اعمال پر ندامت کی شرائط ہیں۔ اس کے باوجود بعض مواقع پر صرف ندامت اور پشیمانی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے توبہ کی کیفیت گناہوں کی نسبت مختلف اور متفاوت ہوگی۔ ان تمام موارد میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ ندامت اور پشیمانی کے بعد توبہ کرنے والے کی ذمہ داری واضح ہو جائے۔ اس بحث کو کلامی اور اخلاقی کتب میں کبھی ''اقسام توبہ'' اور کبھی ''توبہ کے راستوں'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اب ہم اس کے مختلف نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ ایسے حرام کام جو صرف قانون شکنی اور قانونِ الٰہی کے حدود سے تجاوز کے دائرے میں آتے ہیں اور حقوق العباد بیچ میں نہیں آتے ان پر صرف ندامت اور پشیمانی کافی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ پھر ان کو انجام نہ دینے کا پختہ ارادہ کرے۔ مثال کے طور پر جھوٹ بولنا، ایسی عورت سے زنا کرنا جس کا خاوند نہیں وغیرہ۔ ایسے مواد میں صرف ندامت اور دوبارہ انجام نہ دینے کا ارادہ ہی کافی ہے۔

۲۔ واجبات دینی مثلاً نماز، روزہ، حج کا ترک کرنا جو کہ خود گناہِ کبیرہ میں شمار ہوتا ہے۔ ان امور میں ندامت کے علاوہ ان کی قضا بھی ہے اور حج جیسے امور جن میں تاخیر ڈالنا حرام ہے۔ پہلے ممکن موقعہ پر ان کو انجام دینا چاہیے۔ ان مقامات پر جہاں عمل خاص وقت میں مطلوب ہے اور اس کے علاوہ مطلوب نہیں مثلاً عید فطر اور قربان کی نماز۔ وہاں صرف ندامت کافی ہے اور قضا لازم نہیں۔

۳۔ وہ گناہ جن میں حقوق العباد سے تجاوز کیا جائے خواہ کسی انسان کا مال تلف کیا جائے یا کسی کی جان کو ضرر پہنچایا جائے یا کسی کی آبرو کو داغدار کیا جائے۔ ان امور میں ندامت کے علاوہ مذکورہ حق تلفی کا ازالہ بھی کرنا چاہیے۔ مثلاً ممکن ہو تو اصل مال لوگوں کو لوٹا دیا جائے یا اگر اصل مال نہیں تو اس جیسا یا اس کے برابر قیمت ادا کر دی جائے۔ اگر کسی کی جان کو ضرر پہنچایا ہے تو اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کرنا چاہیے یا دوسرے فریق کے راضی ہونے کی صورت میں شرعی دیت ادا کرنی چاہیے۔ دیت کے مرتبہ کے متعین کرنے میں مثلاً دیت نفس یا دیت عضو اور وہ بھی عمد یا خطا کے ذریعے، اس صورت میں فقہی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اگر کسی کی عزت وآبرو کو نقصان پہنچایا ہے تو اس سے معافی طلب کرنا اور اس کا کسی طریقہ سے ازالہ کرنا چاہیے۔ اگر عام لوگوں کے سامنے کسی پر برے فعل کی تہمت لگائی ہے تو انہی لوگوں کے سامنے اپنی بات کو جھٹلایا جائے اور اگر اس طرح سے معاف کرانا ممکن نہ ہو یا خرابی کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے مغفرت طلب کرنی چاہیے اور خدا سے دعا کرنی چاہیے کہ قیامت والے دن وہ مجھ سے راضی ہو جائے۔

وہ مقام اور ہیں جہاں پر توبہ کا وقوع مشکل ہے۔

۴۔ اگر کسی نے دوسرے کی ناموس پر ہاتھ ڈالا ہو اس مورد میں شوہر سے واقعہ کا بیان کرنا جس عظیم خرابی کا حامل ہے وہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں اگرچہ شوہر ہی کے حق میں تجاوز ہوا ہے۔ یہاں پر خدا کے دربار میں بہت زیادہ توبہ اور تضرع وزاری کے علاوہ اس کے ساتھ بھلائی ونیکی کے ذریعے، اس کی مناسب خدمت کے ذریعے اس کی مہر ومحبت کو حاصل کرنا چاہیے۔ شاید اس

دینوی محبت (اس کی سچی خدمات کی وجہ سے) کے باعث قیامت کے دن وہ اسے معاف کر دے۔ جب اس دن تمام پردے ایک طرف ہٹ جائیں گے اور باطن ظاہر ہو جائیں گے اگر اس دن اس کی رضا کو حاصل نہ کر سکے تو قصاص الٰہی حتماً اس کی کمین میں ہے۔

۵۔ ان سب سے بالاتر یہ کہ لوگوں کے دین اور عقیدے کو نقصان پہنچائے یعنی بعض لوگوں کو گمراہ کرے اور ان کو حق وحقیقت سے باطل وضلالت کی طرف کھینچ لائے۔ اس عمل کی توبہ ندامت کے ساتھ ساتھ گمراہ افراد کی ہدایت اور ان کی رہنمائی میں کوشش سے مشروط ہے۔

یہاں پر ان اہل بدعت، جو بسا صدیوں تک لوگوں کی گمراہی کا سبب بنے ہیں، کے بارے میں ذرا فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ کبھی بھی حقیقی توبہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے اگر چہ وہ مرنے سے پہلے دست توبہ خدا کے حضور دراز کریں اور ندامت سے اپنے ہاتھ کاٹیں، کیونکہ ان کی یہ حالت لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی نہیں اور ان کی کج فکری کی وجہ سے جو ہزاروں انسان ضلالت وگمراہی کی گھاٹی میں جا پڑے، جب تک وہ ان کی ہدایت میں کامیاب نہ ہو سکیں (اور وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوں گے)، ان کے اس نادم ہونے اور پشیمان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۱۶۔ تائب سے برتاؤ

گناہوں سے آلودہ افراد خدا کی طرف بازگشت اور توبہ کے ذریعے اپنی روح کی فضا کو پاک کر لیتے ہیں۔ وہ خدا کی بارگاہ میں ایک خاص قسم کی محبوبیت پیدا کر لیتے ہیں۔ قرآن اس حقیقت کی طرف ذیل میں ذکر کی گئی آیت کے ذریعے سے اشارہ کرتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ [۱]

''بیشک اللہ تائب اور پاکیزہ افراد سے محبت کرتا ہے۔''

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ:

''خدا کے نزدیک تائب مرد اور عورت سے بڑھ کر محبوب اور عزیز کوئی چیز نہیں۔'' [۲]

جب تائب انسان سے خدا کو محبت ہے تو باایمان معاشرے کو بھی محبت بھری آغوش سے اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے گناہگار بھی گناہوں سے کنارہ کش ہو جائیں گے اور پاک دل اُمت کی گرم آغوش میں لوٹ آئیں گے۔ اس سے متعلق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث مروی ہے۔ اس کے متن کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

---

[۱] سورہ بقرہ آیت ۲۲۲

[۲] بحار الانوار ج ۶ باب ۲۰ روایت ۱۵

"یلزم الحق لامتی فی اربع: یحبون التائب ویرحمون الضعیف و یعینون المحسن و یستغفرون للمذنب"[1]

''میری امت پر لازم ہے کہ چار قسم کے حقوق کی رعایت کریں۔ توبہ کرنے والے سے محبت کریں، ضعیفوں پر رحم کھائیں، نیک افراد کی مدد کریں اور گناہگاروں کے لیے مغفرت طلب کریں۔''

واقعاً یہ انداز کتنا سعادت بخش ہے کہ جس سے معاشرے کے مختلف اعضاء آپس میں یکجا ہو جاتے ہیں۔ اب گناہگار شخص توبہ کرنے کے بعد، اس لیے کہ اس نے کل گناہ کیا تھا، نفرت اور بے توجہی کا مستحق قرار نہ پائے بلکہ گناہگار کے بارے میں دعا کرنا فرض ہے تاکہ وہ نجات اور ہدایت کو پالے اور یہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ کار ہے کہ تمام حالات میں حتیٰ کہ جب ان کے دندان مبارک اور پیشانی مبارک زخمی تھی، آپؐ نے خدا کی طرف رخ کیا اور کہا:

"اللھم اھد قومی فانھم لایعلمون"

''میرے خدا میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ یہ جاہل اور نادان ہیں۔''

۱۷۔ توبہ کی اہمیت اور تائبین کا مقام

آخر میں ہم توبہ کی اہمیت اور توبہ کرنے والوں کے مقام و منزلت کے بارے میں روایات کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔

پہلا نکتہ وہ ہے کہ جس کی طرف حضرت امیر المومنینؑ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت کی توجہ دلائی۔

''روئے زمین پر لوگوں کے لیے عذاب سے امان کے دو وسیلے تھے جن میں سے ایک واپس لے لیا گیا ہے جب کہ دوسرا باقی ہے۔ اے لوگو! اس کو تھام لو۔ وہ امان جو واپس لے لی گئی ہے وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود تھا۔ لیکن وہ امان جو ہمیشہ کے لیے باقی ہے وہ استغفار اور طلبِ مغفرت ہے۔ لوگ اپنے گناہوں سے استغفار کریں تاکہ عذاب الٰہی نازل نہ ہو'' اس کے بعد امام علیہ السلام ذیل میں ذکر کی گئی آیت کو تلاوت فرماتے ہیں جو اسی لطیف نکتے کو بیان کرتی ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۝۳۳[2]

''خدا ہرگز ان کو عذاب نہیں دے گا جب تک کہ اے رسولؐ! تو ان کے درمیان موجود ہے اور خدا ہرگز ان کو

[1] بحارالانوار ج۶ باب ۲۰ روایت ۱۰

[2] سورہ انفال آیت نمبر ۳۳۔ نہج البلاغہ شرح فیض الاسلام، حکمت ۸۸ ص ۱۱۲۵

عذاب نہیں دے گا جبکہ وہ طلبِ مغفرت کرتے ہیں۔‘‘

اس مسئلے میں بعض روایات کی طرف توجہ کرنا کافی ہے جو توبہ کو توبہ کرنے والے کے لیے گناہ کی آلودگی سے پاک کرنے والا بیان کرتی ہیں، ہلاکت وگمراہی کی گہرائیوں سے نجات بخشنے والا عامل اور شیطان کے مقابلے میں انسانی حربے کے طور پر متعارف کراتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ان روایات کی عبارتوں سے آشنا ہوا جائے۔

۱۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

"لا شفيع انجح من التوبة"[۱]

’’خدا کی بارگاہ میں توبہ سے زیادہ کامیاب کوئی واسطہ نہیں۔‘‘

۲۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

التوبة مطهرة من دنس الخطيئة و منقذة من شفا الهلكة"[۲]

’’توبہ روح کو گناہوں کی آلودگیوں سے پاک کرنے والی ہے اور ہلاکت وتباہی سے نجات کا وسیلہ ہے۔‘‘

۳۔ حضرت امام باقر علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی خدا سے مناجات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خدا نے آدمؑ سے یوں فرمایا: ’’میں نے تیرے اور تیری اولاد کے لیے عہد کیا کہ اگر برا کام انجام دیں اور پھر مغفرت طلب کریں تو بخشش دوں گا۔‘‘[۳]

توبہ کرنے والوں کی خدا کے دربار میں شان ومنزلت کے لیے اتنا کافی ہے کہ قرآن کریم توبہ کرنے والوں کو ان لوگوں کے زمرے میں شامل کرتا ہے جن سے خدا محبت کرتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾[۴]

’’بے شک خدا توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ افراد سے محبت کرتا ہے۔‘‘

---

[۱] نہج البلاغہ: کلمات قصار شمارہ ۳۷۱

[۲] بحار الانوار ج ۶ باب ۲۰ روایت ۴۵

[۳] بحار الانوار ج ۶ باب ۲۰ روایت ۲، ۴۴

[۴] سورہ بقرہ آیت ۲۲۲

جب ہم اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ مذکورہ تعبیر (ان اللہ یحب) متقیوں[1]، صابروں[2]، نیکوں[3]، مجاہدوں[4] اور خدا کے راستے میں جدو جہد کرنے والوں کے بارے میں بھی استعمال ہوئی ہے تو تائبین کی مذکورہ قدر و منزلت ان کو سچے عابدوں، امر بہ معروف اور نہی از منکر کرنے والوں اور خدا کی حدود کی حفاظت کرنے والوں کے ہم پلہ قرار دیتی ہے اور ان کو تعریف و ستائش کا مستحق قرار دیتی ہے۔'[5]'

روایات میں بھی تائبین کی بہت زیادہ تعریف اور ستائش کی گئی ہے۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کی توبہ کرنے والے انسان سے خوشی انسان کی اس خوشی سے کہیں زیادہ سے ہے جو اسے اندھیری رات میں گمشدہ زادِراہ اور سواری کے مل جانے پر ہوتی ہے۔[6]

امیر المومنین علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں کہ دنیا میں دو افراد کے علاوہ خیر و سعادت کو کوئی نہیں پا سکتا۔ ایک وہ جو توبہ کے ذریعے اپنے گناہوں کا تدراک اور ازالہ کرتا ہے اور دوسرا وہ جو نیکی کو انجام دینے میں جلدی کرتا ہے۔[7]

اس بارے میں بہت سی حدیثیں روایت ہوئی ہیں جن کا یہاں نقل کرنا مناسب نہیں۔ صرف مذکورہ چند مثالوں پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔[8]

احباط و تکفیر

لفظ "حبط" عربی لغت میں عمل کے باطل اور بے اثر ہونے کے معنی میں ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ "الحبط اللہ عمل الکافر" خدا

---

[1] فَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧٦﴾ (سورۂ آل عمران آیت ۷۶)

[2] وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٦﴾ (سورۂ آل عمران آیت ۱۴۶)

[3] وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٤٨﴾ (سورۂ آل عمران آیت ۱۴۸)

[4] اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا (سورہ صف آیت ۴)

[5] اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٢﴾ (سورۂ توبہ آیت ۱۱۲)

[6] ان اللہ تعالیٰ اشد فرحا بتوبة عبدہ من رجل اضل وراده فی لیلة ظلماء۔ بحار الانوار جلد ۶ باب ۲۰ روایت ۷۳

[7] ولا خیر فی الدنیا الا لرجلین رجل اذنب ونوباً فھو یتدا رکھا بالتوبة، ورجل یسارع فی الخیرات (نہج البلاغہ، کلماتِ قصار جز ۹۴)

[8] بحار الانوار ج ۶، باب ۳۰، روایات ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۶۲، ۶۴، ۶۷، ۷۰، ۷۵، ۷۸ کی طرف رجوع کریں۔

نے کافر کے عمل کو بے اثر کر دیا۔

لفظ ''تکفیر'' کفر سے ہے اور چھپانے کے معنی میں ہے۔ کسان کو اس نظر سے کہ دانے کو زمین کے اندر چھپاتا ہے، کافر کہتے ہیں۔

قرآن کریم فرماتا ہے:

كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ [1]

''بارش کی طرح جو پودوں کو اگا کر کسانوں کی خوشی کا باعث ہوتی ہے۔''

''حبط'' کی بحث کفر و گناہ سے مربوط ہے کہ جو انسان کے ایمان اور نیک عمل کو باطل اور ضائع کر دیتا ہے جبکہ 'تکفیر' کی بحث کا محور و مرکز حبط کا نقطہ مقابل ہے یعنی انسان کا ایمان اور نیک اعمال کفر اور برے اعمال پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

خدا اور اس کے قوانین کے حوالے سے مکلف انسان تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

۱۔ جنہوں نے ساری زندگی کفر و گناہ میں گزاری ہو۔

۲۔ جنہوں نے ساری زندگی ایمان اور اطاعت میں بسر کی ہو۔

۳۔ جنہوں نے اپنی عمر کا کچھ حصہ ایمان یا کفر کی حالت میں گزارا ہو اور کچھ حصہ اس کے برخلاف یا کچھ زندگی میں ایمان کے علاوہ خدا کے فرمان کی اطاعت کی ہو، یا ایمان کے ساتھ نافرمانی اور گناہ بھی کیا ہو۔

احباط اور تکفیر کا پہلی دو صورتوں سے تعلق نہیں۔ صرف تیسری صورت سے تعلق ہو سکتا ہے، ان معنوں میں کفر و گناہ ایمان اور اطاعت کو باطل اور ضائع کرتے ہیں یا ایمان اور اطاعت سابقہ کفر و نافرمانی کو چھپا دیتے ہیں۔

اب جبکہ مسئلہ ''احباط و تکفیر'' کا محورِ گفتگو واضح ہو چکا ہے اس بارے میں مختلف اقوال اور متکلمین کے نظریات نقل کرتے ہیں۔

احباط کے بارے میں اختلافِ آراء

احباط و تکفیر کا مسئلہ کلام اور تفسیر کی کتابوں میں بیان ہوا ہے۔ ہم پہلے احباط کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ اس کی حیثیت واضح ہونے سے مسئلہ تکفیر بھی واضح ہو جائے گا۔ احباط کے ماننے اور نہ ماننے والوں کے مقصود سے آگاہی کیونکہ فہم مطلب اور آیات کی صحیح شناخت میں مدد کرتی ہے۔ لہٰذا پہلے ہم انہی کے مقصود کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن اور روایات میں ایمان اور نیک اعمال کی جزا مقرر کی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی مسلم ہے کہ مرتد اور کافر یا مومنین جو بعض برے کام انجام دیتے ہیں، اس جزا سے محروم رہیں گے۔ ان دو باتوں میں بحث نہیں۔ بحث کسی اور مسئلے میں ہے۔ اور وہ یہ کہ کیا کفر اور برے اعمال ثابت جزا کو مٹا سکتے ہیں؟ یا یہ کہ اصلاً جزا ثابت تھی ہی نہیں کہ بعد کے برے اعمال اسے نابود کرتے۔

---

[1] حدید ۲۰

اس کی وضاحت یہ کہ ایمان اور عمل صالح کی جزا مشروط طور پر ہونے کے حوالے سے دو نظریے ہیں۔

۱۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ روزِ اول ہی سے انسان ایمان اور صالح عمل کی جزا کا مستحق تھا یعنی کسی انسان کا ایمان اور نیک عمل اس وقت جزا کا موجب بن سکتے ہیں جب مستقبل میں وہ کفر اختیار نہ کرے یا گناہِ کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے، اس طرح کہ اگر یہ شرط فاقد ہو جائے یعنی کفر اختیار کرے یا گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو تو واضح ہو جائے گا کہ یہ شخص پہلے ہی دن سے جزا کا مستحق نہیں تھا کیونکہ خداوند قدیر نے اپنی جزا کو مشروط اور مقید کر دیا تھا۔ اس شخص نے چونکہ شرط پوری نہیں کی لہٰذا جزا کا مستحق نہیں بن سکا۔[1]

اگر ایسے موقعے پر کلمہ 'احباط' استعمال ہو تو وہ مجازی معنی میں ہوگا کیونکہ جزا و سزا کی راہ ہموار تھی، بعد کے کفر یا گناہ نے اسے خراب کر دیا ہے۔

لہٰذا خود ثواب ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے حصول کی راہ خراب ہو گئی۔

۲۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ایماندار شخص روزِ اول سے اپنے ایمان اور صالح اعمال پر ثواب کا مستحق تھا۔ اس کے نامۂ اعمال میں جزاء ایک قطعی حکم کی صورت میں لکھی گئی تھی، لیکن برے اعمال (چاہے کفر کی صورت میں ہوں یا گناہ کبیرہ کی) آگ کی مانند ایمان اور صالح عمل کے خرمن کو جلا دیتے ہیں۔ اس صورت میں احباط اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ درحقیقت ایک عمل دوسرے عمل کو باطل کر دیتا ہے اور جو چیز نابود ہوتی ہے وہ ثواب ہے نہ کہ اس کے حصول کا راستہ۔

ان دو نظریوں کو علمی اصطلاح کے قالب میں ڈھالنا چاہیں تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ پہلے نظریے کے مطابق جزاء کی علت تام موجود ہی نہ تھی۔ لہٰذا وہ معلول (جزاء) بھی وقوع پذیر نہیں ہوا، سوائے ایک بنیاد اور ثواب کے لیے زمین ہموار ہونے کے کچھ بھی نہ تھا۔

جبکہ دوسرے نظریے کے مطابق جزا کی علت تام موجود تھی اور جزاء انسان کے نامۂ اعمال میں مقرر شدہ تھی، لیکن بعد کے اعمال معلول اور اس کی علت کو شکست دیتے ہوئے اس کے آثار کو محو کر دیتے ہیں۔

پہلے نظریے کے حامی ''منکرین احباط'' کے نام سے پہچانے جاتے ہیں جب کہ دوسرے نظریے کے حامی مثبتین احباط کے نام سے مشہور ہیں۔

اب جبکہ منکرین اور مثبتین کا اصل مقصد واضح ہو گیا مناسب ہے کہ مذکورہ دو نظریوں کے حامی متکلمین کا تعارف کرایا جائے۔

۱۔ متکلمین امامیہ، اشاعرہ اور بعض معتزلہ۔

۲۔ متکلمین معتزلہ کی اکثریت۔

پہلے گروہ نے مذکورہ دو مطالب (۱۔ ایمان اور اطاعت کے لیے جزا مقرر شدہ ہے۔ ۲۔ کفر اور بعض گناہ جزا کے حصول میں رکاوٹ بنتے ہیں) میں سے پہلے راستے کو انتخاب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر بعد کے کفر اور گناہِ کبیرہ کی وجہ سے انسان کو اس کی جزا نہ ملے تو

---

[1] البیان ج ۲ ص ۲۰۸، مجمع البیان، طصیدا ج ۱ ص ۳۱۳ و ج ۳ ص ۲۰۷ و ص ۱۶۳ و ص ۴۲۴

اس لیے نہیں کہ جزا موجود تھی اور یہ دو عامل (کفر اور گناہِ کبیرہ) انسان اور اس کی جزا کے درمیان حائل ہو گئے بلکہ اول سے ہی جزا موجود نہیں تھی۔ جو کچھ مقرر تھا وہ آغاز ہی سے مشروط تھا۔ چونکہ شرط پوری نہیں ہوئی تو معلوم ہوا کہ کوئی چیز درحقیقت موجود ہی نہ تھی۔

معتزلی متکلمین کی اکثریت نے دوسرے نظریہ کو منتخب کیا ہے، البتہ ابوعلی اور ابو ہاشم جبائی اس نظریے کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اختلاف کا اصلی نکتہ درج ذیل مطلب کی طرف لوٹتا ہے:

پہلا شخص ابو ہاشم کا باپ ہے جو کہتا ہے کہ بعد کا عمل آگ کی طرح پہلے عمل کھلیان کو خاکستر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس سے انسان کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اس کے جرم کے پلڑے سے بھی کوئی چیز کم نہیں ہوتی۔ اگر انسان دس درجے کا ایمان اور عمل رکھتا ہو پھر بیس درجے کے جرم کا مرتکب ہو، پہلے والا ایمان اور عمل صالح اس کی سزا میں اور عذاب کے موازنہ کے موقعہ پر کمی نہیں کرتا، جبکہ بیٹا اصل مطلب میں باپ کے ساتھ ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جزاء واقع ہوئی ہے، لیکن برے اعمال اس جزا کو نابود کر دیتے ہیں۔ لیکن حساب اور میزان کے موقعہ پر انسان کا جرم اس جزا، جس کا وہ مستحق تھا، کے برابر کم ہو جاتا ہے۔ لازماً مذکورہ مثال میں گناہگار شخص دس درجے کی سزا پائے گا اور دس درجے اس سے کم ہو جائیں گے۔

منکرین احباط کی دلیل

احباب کی نفی کرنے والے پہلے نظریے کے حامی ہیں۔ وہ دو دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں۔

۱۔ دلیل عقلی

۲۔ دلیلِ شرعی و نقلی

پہلی دلیل: وہ کہتے ہیں کہ عقل واضح طور پر فیصلہ کرتی ہے کہ اگر خدا نے جزا کو مطلق اور غیر مشروط طور پر مقرر کیا ہے ہوا اور اس جزا کے ثبوت کے لیے کوئی قید و شرط نہ ہو تو اس قسم کی جزا کو بعد کے برے عمل کے ذریعے خدا کا نابود کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ درحقیقت ایک قسم کی وعدہ خلافی ہے جو ایک طرح کا ظلم ہے۔

ایک متفنن جو کہتا ہے کہ اگر اس عمل ک بغیر قید و شرط کے انجام دو گے تو جزا کے مستحق ہو گے، اب اگر کوئی شخص اس عمل کو انجام دے تو قانون دان اس سے سرزد ہونے والے نامناسب عمل کی وجہ سے اپنے سابقہ حکم کو منسوخ کرنے کا حق نہیں رکھتا، مگر اس صورت میں کہ پہلے دن سے اپنے وعدے کو مشروط اور مقید قرار دے۔ چونکہ بعض آیات اور روایات میں ایسی عبارتیں آئی ہیں جو ظاہراً سابقہ ثواب کے ابطال پر حکایت کرتی ہیں اس لیے مجبوراً ان کی مذکورہ بیان کے مطابق تاویل کرنا پڑے گی۔

دوسری دلیل: ایسی آیات جو واضح طور پر گواہی دیتی ہیں کہ ہر انسان اپنے نیک عمل کی جزا پائے گا یا کامل صورت میں اس کو جزا دی جائے گی اس احباط کی نفی کرتی ہیں کہ جو معتزلہ کے مورد نظر ہے۔ اس حوالے سے قرآن ایک مقام پر فرماتا ہے:

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ۝۷ [۱]

''جو بھی ذرہ برابر نیک عمل انجام دے گا اس کو پائے گا۔''

ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

وَاَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی ۝۴۰ ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ۝۴۱ [۲]

''بے شک بہت جلدی اس کی سعی و کوشش دیکھی جائے گی پھر اس کو پوری جزا دی جائے گی۔''

اس موضوع پر اسی مضمون کی حامل مزید آیات سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔[۳] یہاں تک احباط کی نفی کرنے والوں کے دلائل سے آگاہ ہوئے۔ اب ہم مثبتینِ احباط کی دلیل بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد بحث کے آخر میں اپنا نظریہ بیان کریں گے۔

مثبتینِ احباط کی دلیل

ان کا تصور یہ ہے کہ حکم عقل کا تقاضا احباط ہی ہے۔ معتزلہ جو سب سے زیادہ عقل کو اہمیت دیتے ہیں، محقق طوسی کے فیصلے کے برخلاف خیال کرتے ہیں۔ ان کی عقلی دلیل کی اساس یہ ہے کہ کافر اور گناہِ کبیرہ کا مرتکب شخص ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا۔ یعنی اگر کسی شخص کے لیے ایک سزا معین ہو جائے تو یہ مسلسل اور دائمی ہوگی اور وہ ہمیشہ آگ میں جلتا رہے گا۔ ان کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب توبہ کے بغیر مر جائے تو ہمیشہ آگ میں رہے گا۔

اس مطلب کی روشنی میں ایک انسان جو اپنی عمر کے کچھ حصے میں مومن تھا، پھر اس نے کفر اختیار کیا، یا ایک حصے میں نیک اعمال انجام دیے اور اس نے دوسرے حصے میں گناہ کا ارتکاب کیا تو یہ انسان ثواب و عذاب کے لحاظ سے چار حالتوں سے خالی نہیں:

۱۔ فقط جزا کا مستحق قرار پائے۔

۲۔ فقط سزا کا مستحق قرار پائے۔

۳۔ کسی ایک کا بھی مستحق قرار نہ پائے۔

۴۔ دونوں کا مستحق قرار پائے۔

پہلا اور دوسرا احتمال درست نہیں ہے کیونکہ اولاً ایسے شخص سے قرآن و سنت میں وعدۂ جزا بھی کیا گیا ہے اور وعدہ سزا بھی۔ اس کے علاوہ جزا و سزا کا مسئلہ ایک عقلی مسئلہ ہے۔ اگر شریعت نے اس کو بیان نہ بھی کیا ہوتا تب بھی نیک انسان جزا اور بدکار انسان سزا کا مستحق ہوتا۔ اس

---

[۱] سورہ زلزلہ ۷

[۲] سورہ نجم ۴۱

[۳]

صورت میں کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ صرف ایک چیز کا مستحق ہے اور دوسری کا نہیں؟

تیسرا احتمال دونوں گروہوں کے نظریوں کے خلاف ہے۔ لازمی طور پر چوتھی صورت ہی رہ جاتی ہے۔ یعنی یہ شخص ہر دو کا استحقاق رکھتا ہے، لیکن اس جہت سے کے سزا ہر شخص کے بارے میں دائمی صورت رکھتی ہے، ممکن نہیں کہ ایک شخص ایک ہی زمانے میں دائمی جزا اور دائمی سزا کے زیر سایہ قرار پائے۔

اس صورت میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ہم کہیں کہ جزا اور سزا میں جو سنگین تر ہوگی وہ دوسری کو نابود کر دے گی، جو زیادہ ہوگی وہ کم تر پر اثر انداز ہوگی اور یہی احباط ہے کہ جس پر معتزلہ کی اکثریت عقیدہ رکھتی ہے اور اس پر ان کا اتفاق ہے۔[1]

بیشتر کی کم تر پر تاثیر دو طرح سے متصور ہے:

الف) بیشتر کم تر کو نابود کر دے اور خود اسے کسی قسم کا نقصان نہ ہو۔

ب) بیشتر کم تر کے ذریعے نفی ہو جائے لیکن خود بیشتر میں کم تر جتنی مقدار کم ہو جائے۔

پہلی صورت کو ''ابو علی جبائی'' نے قبول کیا ہے اور دوسری صورت کو اس کے بیٹے ''ابو ہاشم'' اور قاضی عبد الجبار نے قبول کیا ہے۔

قاضی کہتا ہے: ''اگر ہم ابو ہاشم کے نظریہ کو انتخاب کریں اور کہیں کہ اکثر اقل کو نابود کرنے کے ساتھ اقل کی طرف سے نقصان بھی اٹھاتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ آیت ''فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره'' اس نظریے سے موافق ہے اور آخر کار نیک شخص ایک قسم کی جزا پائے گا جو اگرچہ کم ہو چکی ہوگی۔[2]

دلیل معتزلہ کی تحلیل

معتزلہ کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ آیات اور روایات ایک طرف تو ایمان اور نیک اعمال کی جزا اور ثواب کے وجود اور فعلیت کی حکایت کرتی ہیں، دوسری طرف ان کا تقاضا یہ ہے کہ کافر اور گناہِ کبیرہ کا مرتکب اگر توبہ کے بغیر مر جائے تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

پس اس صورت میں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ برے اعمال گذشتہ یادداشتوں کو مٹا دیتے ہیں کہ جو عملاً موجود تھیں، نہ تقدیراً اور مشروط طور پر۔

دوسرے الفاظ میں معتزلہ کی دلیل کی اساس درست نہیں ہے اور وہ یہ کہ اگر گناہِ کبیرہ کا مرتکب توبہ کے بغیر مر جائے تو اس کے لیے دائمی عذاب ہے۔ اس اساس پر انہوں نے شفاعت کی کسی اور طرح سے تفسیر کی ہے اور کہا ہے: ''شفاعت صالحین کے لیے ہے۔ اس کا نتیجہ درجات کی بلندی ہے، نہ عذاب کا خاتمہ۔ اصولاً اس قسم کے نظریے کے قائل مجبور ہیں کہ چوتھے فرض (جزا کا مستحق بھی اور عذاب کا بھی) کے بارے میں کہیں کہ ایک انسان کا برا عمل عذاب کے دائمی حکم کے سبب پہلے والے ثواب کو باطل اور فنا کر دیتا ہے۔

---

[1] شرح الاصول الخمسہ ص ۶۲۵

[2] شرح الاصول الخمسہ ص ۶۲۸-۶۲۹

اس دلیل کے بارے میں ہم دو باتیں بیان کرتے ہیں:

۱۔ ہمیں کہاں سے معلوم ہوا کہ تمام الٰہی جزائیں عملی پہلو رکھتی ہیں اور اگر کوئی ایک کام انجام دے تو اس کے نامہ اعمال میں بطور مطلق اس کی جزا لکھی جاتی ہے، کیونکہ جس طرح جزائیں عملی ہوسکتی ہیں اسی طرح جزائیں تقدیری اور مشروط بھی ہوسکتی ہیں۔

۲۔ اگر ہم اس نظریہ کو قبول کریں تو یہ صرف ایک موقعے پر نتیجہ بخش ہوسکتاہ، جب جزا اور سزا باہم جمع ہونے کے قابل نہ ہوں، مثلاً کافر کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا۔ یہاں پر جزا کی جگہ باقی نہیں رہتی (جزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا) اور جزا کو عملی طور پر قبول کرنے کی صورت میں احباط کو قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔لیکن گناہِ کبیرہ کا مرتکب کہ جو ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا، اس کے لیے احباط کا یہ مفہوم نتیجہ بخش نہیں ہے اور اگر بعد کا عمل گناہِ کبیرہ ہو، اس بنیاد پر کہ مومن دائمی طور پر آگ میں نہیں رہے گا، سزا کی مدت گزارنے کے بعد اس سے نجات پا کر بہشت میں داخل ہوجائے گا۔

دوسرے الفاظ میں اگر اعتراض کا محور عذاب کا دوام ہے تو مومن کے لیے ہرگز عذاب دائمی نہیں ہے۔ اور اگر اعتراض کا محور یہ ہو کہ ایک وقت میں جزا اور سزا جمع نہیں ہوسکتیں تو اس کا حل آسان ہے، وہ یہ کہ پہلے سزا دی جائے گی پھر وہ اپنی جزا پائے گا۔

یہاں پر مناسب ہے کہ علامہ مجلسی کی مثبتین اور منکرین کے نظریہ کے بارے میں گفتگو کو نقل کریں۔ یہ عالم بزرگوار کہتے ہیں:

''دونوں گروہوں نے احباط کے نتیجہ کو قبول کیا ہے کیونکہ وہ مانتے ہیں کہ کفر اور بعض کبیرہ گناہ نیک اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان دو کے موجود ہونے کی وجہ سے وہ جزا جس کی انسان کو نوید دی گئی ہے اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ ایک نکتہ یہ ہے کہ احباط کے منکرین کہتے ہیں کہ جزا روزِ اول سے عملی طور پر موجود نہیں تھی بلکہ فرضی اور مشروط وجود کے سوا کچھ نہیں۔ یہ مسئلہ اس کلیہ کے تحت آتا ہے کہ جب شرط پوری نہ ہو تو مشروط بھی نہیں ہوتا۔ لیکن احباط کے مثبتین کہتے ہیں کہ جزا روزِ اول سے وجودِ فعلی اور تحققِ واقعی رکھتی تھی۔ یہ تو انسان کے برے اعمال ہیں جو اسے باطل کردیتے ہیں۔ آخر کار خواہ پہلی صورت جیسا معاملہ ہو یا دوسری صورت جیسا، کافر یا گناہِ کبیرہ کا مرتکب شخص قیامت کے دن خالی ہاتھ ہوگا۔''[1]

درحقیقت احباط کے عوامل جو کچھ قرآن اور حدیث میں نقل ہوئے ہیں احباط کے منکرین کی نظر میں محدود ہیں جبکہ مثبتین کی نظر میں اس کے عوامل بہت زیادہ ہیں اور ہر قسم کا برا عمل جس پر گناہِ کبیرہ کا عنوان صادق آئے احباط کا موجب ہے۔ اس کی وجہ ہر طرح کے کسی بھی گناہِ کبیرہ کے مرتکب شخص کا عذاب میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہ بات جزا کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں۔

یہاں تک ہر دو طرف کے عقلی دلائل سے ہم آگاہ ہوئے اور معتزلہ کی عقلی دلیل کا نادرست ہونا بھی واضح ہوگیا۔

---

[1] بحار الانوار ج ۷۱ ص ۱۹۹

مسئلہ کی عقلی تحلیل

بحث کے آغاز میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ مسئلہ احباط کا دو زاویوں سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے، ایک عقل کی نظر سے اور دوسرا نقل کی نظر سے۔
حبط اعمال کے مثبتین کی عقلی دلیل کی نادرستی واضح ہو چکی ہے کیونکہ سزا کے دوام کے بارے میں ان کی اساس فکر بڑی متزلزل ہے۔
یہاں یہ منکرین کی عقلی دلیل اہمیت کی حامل ہے کہ جو احباط کو ایک قسم کا ظلم سمجھتے ہیں۔
اب عقل کی نظر اور ظواہر آیات کے درمیان ہم آہنگی کی جستجو کرتے ہیں۔ اس ہم آہنگی کا لازمہ یہ ہے کہ جزا و سزا کے بارے میں دو معروف نظریوں کا ذکر کیا جائے، اس کے بعد ان دو نظریوں کی بنیاد پر دلیل عقلی اور ظاہر آیات کو باہم جمع کیا جائے۔
عقاب و ثواب کے بارے میں دو نظریے مشہور ہیں:

الف) آخرت کی تمام جزائیں اور سزائیں دنیاوی جزاؤں کی طرح اعتباری اور قراردادی ہیں یعنی جس طرح چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے اور نیک کام کی جزا اس کے مقام کو بلند کرنا ہے، اسی طرح بدکار انسان کی سزا دوزخ اور نیک انسان کی جزا بہشت ہے اور یہ سب ایک قسم کا فرض اور قرارداد الٰہی ہے کہ جو اس طریقے سے اپنے بندوں کی ہدایت کرتا ہے۔

ب) جزائیں اور سزائیں خود نفس کی پیدا کردہ یعنی ہر انسان اپنے نیک اور بد اعمال کے اثرات کی وجہ سے کچھ ملکات حاصل کرتا ہے اور یہ ملکات نفس ہی کی صورت اور فعلیت شمار ہوتے ہیں۔ دوسرے جہان میں ہر نفس اپنی صورت و فعلیت کے مطابق فعالیت اور خلاقیت رکھتا ہے۔ وہ نفوس جن کی فعلیت اطاعت کی راہ سے ظہور میں آئی ہے نیک جزاؤں اور خوبصورت صورتوں کے خلاق ہیں، لیکن وہ نفوس جن کی فعلیت ان کے بد اور برے اعمال کی معمول ہے وہ اپنی فعلیت کے مطابق بری صورتوں کو خلق کرتے ہیں جو ہمیشہ نفس کو تکلیف اور اذیت دیتی ہیں۔

اس نظریے کے مطابق جزائیں قراردادی نہیں ہیں کہ جو وضع اور قرارداد کے ذریعے وجود میں آئیں اور ان کے ختم ہونے سے ختم ہو جائیں بلکہ خود نفس کی پیدا کردہ ہیں جو بدونِ اختیار اس قسم کی صورتوں اور فعلیتوں کا مبداء قرار پاتا ہے۔
یہاں پر اس مسئلے کو ایک اور طرح سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یوں کہ ہمارے اعمال اور افعال دوسرے عالم میں ایک اور وجود میں تجسم پیدا کرتے ہیں اور درحقیقت انسان کی نماز اس جہان میں نور کی صورت میں اور جزا کے عنوان سے ظاہر ہوگی اور اسی طرح برے اعمال بھی ہیں۔ اس بیان اور پہلے والے بیان کا فرق واضح ہے۔
اب ثواب اور عذاب کے باب میں ان دو نظریوں کے پیش نظر عقلی دلیل اور ظاہر آیات کے درمیان جمع کی کوشش کرنا چاہیے۔

ا۔ جب بھی جزا اور سزا کے مسئلے کو ایک اعتباری اور قراردادی مسئلہ قرار دیں عقل کی نظر کو محفوظ رکھتے ہوئے حبط اعمال سے مربوط آیات کی مندرجہ ذیل طریقے کے ذریعے تفسیر کی جا سکتی ہے۔
حبط سے مربوط آیات کا معنی یہ نہیں کہ تحقیق پذیر جزا کو باطل کر دیں بلکہ آغاز ہی سے جزا کا استحقاق دو صورتوں میں سے ایک صورت میں تھا۔

الف) اصل استحقاق بعد میں مخالفت نہ کرنے سے مشروط تھا، اس طرح کہ اگر اس سے مخالف کام سرزد ہوا تو اس کا کوئی استحقاق نہیں رہے گا۔

ب) جزا کا استحقاق کسی شرط سے مشروط نہیں تھا، لیکن اس کا مستقبل میں دوام اور استمرار آئندہ مخالف کام نہ کرنے سے مشروط ہے۔ ظاہر ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر استحقاق کا دوام باقی نہیں رہے گا۔

یہاں پر عقل کا حکم بھی لاگو ہوا ہے اور ظواہر آیات کا لحاظ بھی رکھا گیا ہے۔ عقل کا حکم اس طرح سے کہ جزا اصلاً موجود ہی نہ تھی کہ اس کے باطل ہونے سے ظلم یا وعدہ خلافی لازم آئے۔

آیات کے لحاظ سے یوں کہ حبط انجام پایا ہے کیونکہ یا استحقاق باطل ہوا ہے یا اس کا دوام۔ اور باطل ہونے سے مراد یہ ہے کہ گناہگار شخص نے شرط کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو جزا سے محروم کر دیا ہے۔

ہم آپ کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ جمع اسی صورت میں درست ہے کہ جب جزا اور سزا کو قراردادی اور اعتباری سمجھا جائے

۲۔ اگر ان دو (سزا و جزا) کو گناہگار اور نیک انسان کے وجود کا لازمہ سمجھیں تو اس صورت میں ایک اور بیان کی ضرورت ہے کہ جس سے عقل کا حکم بھی قائم رہے اور آیاتِ احباط کی بھی کسی طرح سے تفسیر ہو جائے، اور وہ یہ ہے کہ نفس کی مختلف صورتیں طہارت اور خباثت کے لحاظ سے اس سے سرزد ہونے والے افعال سے وابستہ ہیں۔ جب بھی اس سے کوئی نیکی صادر ہو تو نفس کے اندر ایک خاص صورت اور معنوی کمال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہی صورت اور نفس کا معنوی کمال اس کی جزا شمار ہوتا ہے اور اگر اس سے کوئی گناہ سرزد ہو تو کمال کی مخالف صورت نفس میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہی اس کی سزا شمار ہوتی ہے۔ دراصل یہ کمال اور مخالف کمال کی صورتیں ہیں جو نفس کے لیے جزا اور سزا شمار ہوتی ہیں۔

اس بنیاد پر نفس جہانِ مادہ کے اندر ہمیشہ اعمال کے اختلاف، گناہوں اور اطاعتوں کے زیر اثر تبدیلی کی حالت میں ہے۔ اگر اطاعت اس میں کمال کی صورت ایجاد کرتی ہے تو معصیت دوسری صورت پیدا کرتی ہے۔ اس صورت میں نفس تغیر پذیر ہے اور اطاعت وعصیان کے اثرات کی وجہ سے موت کے لحظہ تک مختلف صورتیں بدلتا رہتا ہے۔ اس وقت جب موت آن پہنچتی ہے اور روح (نفس) بدن سے جدا ہو کر کمال یا زوال کی طرف حرکت رک جاتی ہے (کمال اور زوال سے یہاں مراد اخلاقی پہلو سے ہے نہ کہ فلسفی پہلو سے، کیونکہ فلسفی نظر سے کمال قوت سے فعل کی طرف خروج کے معنی میں ہے اور زوال و نقصان کو اس پہلو سے فرض ہی نہیں کیا جا سکتا)۔ اس لحاظ سے نفسانی صورتوں میں مزید تغیر و تبدل پیدا نہیں ہوتا مگر دو عوامل کے ذریعے کہ ایک غفران اور عفو الٰہی ہے اور دوسرا شافعین کی شفاعت ہے اور یہ دونوں نفس میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔

اس نظریے کی بناء پر جہان میں جب تک انسان کو موت نہیں آتی احباط ممکن ہے اور یہ کسی قسم کا ظلم ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں قراردادی کی بات ہی نہیں کہ اس کی خلاف ورزی عقلی حکم کی مخالفت شمار کی جائے۔ بلکہ یہ انسان ہی ہے کہ اپنے افعال کے ذریعے مختلف صورتیں پیدا کرتا ہے اور یہ صورتیں خوبصورت یا بدصورت آثار اور نتائج اپنے ہمراہ لاتی ہیں۔

لہٰذا یہاں حکم عقلی لاگو ہی نہیں ہوتا اور آیاتِ احباط نیز حقیقی معنی میں منطبق ہوتی ہیں۔ البتہ موت کے بعد کسی قسم کا احباط نہیں ہے

کیونکہ بر اعمل ہی نہیں ہے جو نفس کی صورتِ کمال کو تبدیل کرے اور ان صورتوں کے سعادت آفرین آثار کو مٹائے۔[۱]

قرآن میں احباط کے عوامل

قرآن میں احباط کے عوامل درج ذیل ہیں:

۱۔ ایمان کے بعد ارتداد:

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾[۲]

''تم میں سے جن لوگوں نے ایمان کے بعد ارتداد کی راہ اختیار کی اور اسی حالت میں مر گئے ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں باطل ہو جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔''

۲۔ شرک نیک عمل کے ساتھ:

مشرکوں کے بعض گروہ خیال کرتے تھے کہ جزا کا محور نیک عمل ہے چاہے جس سے بھی انجام پائے۔ اسی لیے وہ ''مسجد الحرام'' کی تعمیر کے وقت جزا کی توقع رکھتے تھے۔ ان کے جواب میں قرآن یاد دلاتا ہے کہ جزا کے مسئلے میں عمل کے اچھے ہونے کے علاوہ خدا پر ایمان بھی شرط ہے۔ درحقیقت عمل کی اچھائی کے علاوہ جزا کے حصول کی شرط فاعل کی روحی اور فکری حالت بھی ہے۔ اس لحاظ سے مشرکوں کا مسجد بنانا ان کے شرک کی وجہ سے بے فائدہ ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾[۳]

''مشرکین کے لیے ہرگز روا نہیں کہ وہ خدا کی مسجدوں کو تعمیر کریں اس حالت میں کہ اپنے کفر پر گواہی دیتے ہیں۔ ان کے اعمال باطل ہیں اور وہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔''

اس بنا پر اس قسم کی آیات کے مفہوم سے واضح ہوتا ہے کہ اگر با ایمان شخص بعد میں شرک اختیار کرے تو اس کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے:

---

[۱] المیزان ج ۲ ص ۱۷۸۔۱۷۹

[۲] سورہ بقرہ ۲۱۷

[۳] سورہ توبہ آیت ۱۷

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۸۸﴾[۱]

''اگر وہ شرک اختیار کریں تو جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے سب باطل اور بے اثر ہو جائے گا۔''

ایک دوسری آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے دوسروں کو سمجھانے کے لیے اسی مطلب کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے:

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴿۶۵﴾[۲]

''اگر تم شرک کرو گے تو تمہارا عمل باطل ہو جائے گا اور تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔''

اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی دو آیتوں میں جس شرک کا ذکر ہے وہ ایمان کے بعد کا ہے۔ لہٰذا اسے ارتداد کی یہ ایک قسم سمجھا جائے گا کہ جو پہلے عامل کے طور پر ذکر ہوا ہے۔

۳۔ کفر نیک عمل کے ساتھ:

اگر نیک عمل کے ہمراہ شرک اس کے باطل ہونے کا سبب ہے تو نیک عمل کے ساتھ کفر بھی مایہ بطلان ہے اگر چہ وہ کفر شرک کی صورت میں نہ ہو۔

اگر شرک ہمراہ نیک عمل کے باطل ہونے اور حبط کا موجب ہے کفر ہمراہ نیک عمل (اگر چہ شرک کی صورت میں نہ ہو) نیز حبط عمل کا موجب ہے جیسے کوئی قیامت کا منکر نیک عمل انجام دے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴿۱۰۵﴾[۳]

''وہ ایسے ہیں جنھوں نے خدا کی آیات اور روز قیامت سے کفر اختیار کیا ہے۔ پس ان کے نیک اعمال باطل ہو گئے اور قیامت کے دن ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔''

۴۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین:

بعض آیات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین احباط کے عوامل میں شمار کی گئی ہے۔ اس توہین کے مظاہر میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتگو سے بلند گفتگو کرنا اور ان سے اونچی آواز میں بات کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں گفتگو کرتے وقت آداب کی

---

[۱] سورہ انعام آیت ۸۸

[۲] سورہ زمر آیت ۶۵

[۳] سورہ کہف آیت ۱۰۵ اور اسی مضمون کی حامل سورہ اعراف کی آیت ۱۴۷ ہے۔

رعایت نہ کرنا یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جیسے دوسروں سے بات کرتے ہیں ویسے بات کرنا۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝۲ [۱]

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو پیغمبرؐ کی آواز سے بلند نہ کرو اور انہیں یوں بلند آواز سے نہ پکارو جیسے تم میں سے بعض ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال باطل ہو جائیں اور تمہیں خبر تک نہ ہو۔''

بعض افراد نے یہ سمجھا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اونچی آواز سے بات کرنا اور ان کو بلند آواز سے پکارنا اس لحاظ سے احباط کا موجب ہے چونکہ یہ کفر اور بے ایمانی کو کشف کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ خود ایک جدا عامل نہیں ہوگا۔ لیکن اس امر کی طرف توجہ کرنے سے کہ آیت میں خطاب مومنین سے ہے۔ یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی اور اصولی طور پر اس بات میں کوئی مانع نہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین انسان کے صالح اعمال کو باطل کرنے والے گناہوں میں سے شمار ہو۔

آیت کی شانِ نزول کی طرف توجہ کرنے سے ممکن ہے ہم کہیں کہ جب بھی پیغمبرؐ سے اونچی آواز سے بات کرنا آپؐ کی توہین اور بے حرمتی کا باعث ہو اور عام نظروں میں ایک قسم کی تحقیر شمار ہوتی ہو، خود اعمال کے حبط کا موجب ہے جیسا کہ کہا گیا کہ بعض افراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے سامنے کھڑے ہاتھ اور پاؤں سے گھر کے دروازے پر ٹھوکریں مارتے ہوئے پکار رہے تھے کہ ''اخرج یا محمد، اُخرج یا محمدؐ'' (اے محمدؐ گھر سے باہر آؤ) [۲]

لہٰذا ممکن ہے کہ ہم کہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بلند آواز سے بولنا بذاتِ خود عاملِ حبط نہیں لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم اسے کفر کا مظاہر سمجھیں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہتک اور توہین کے باعث حبط اعمال کا موجب ہو جاتا ہے۔

۵۔ ایمان کے متقاضی عمل کا نہ ہونا:

قرآن کی نظر میں احباط کے عوامل میں سے دو نمونے، ایک کفر نیک عمل کے ساتھ اور دوسرا ایمان کے بعد کفر کی بحث گزر چکی ہے اور اب کفر کی ایک اور قسم عامل حبط کے طور پر ذکر کی جا رہی ہے اور وہ ایمان سے کفر کرنے سے عبارت ہے۔ دسرے الفاظ میں کفر سے مربوط پہلے دو نمونے اعتقادی تھے، لیکن جس کے بارے میں اب بحث کریں گے وہ عملی کفر ہے۔ قرآن کریم اس بارے میں فرماتا ہے:

---

[۱] سورہ حجرات آیت ۲

[۲] مجمع البیان ج ۵ ص ۱۲۹ طبع صیدا

وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُہٗ ۫ وَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۵﴾[1]

''جس کسی نے ایمان کے ساتھ کفر اختیار کیا اس کا عمل باطل ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔''

آیت کے مفہوم کی وضاحت کے لیے تین مطلب ذکر کرتے ہیں:

(الف) کفر لغت میں 'پردہ' اور 'حجاب' کے معنی میں ہے جو کسی چیز کو چھپا دیتا ہے۔

(ب) آیت میں کفر کا تعلق ایمان سے ہے نہ کہ اللہ، الاخرۃ، الرسول وغیرہ جیسے الفاظ سے جبکہ دیگر آیات میں کفران کے حوالے سے ذکر کیا گیا۔

(ج) معنی کفر (پردہ، حجاب) کا وقوع پذیر ہونا اس کے متعلق کے ثابت اور قائم رہنے سے مشروط ہے کیونکہ ایمان ہو تبھی کفر پردے اور حجاب کی صورت میں اس کا چہرہ چھپا سکتا ہے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر اب آیت کے ظاہری مفہوم کو واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ آیت ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جو خدا اور اس کی وحی پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا یہ اعتقاد ایک ثابت اور استوار حقیقت کے طور پر ان کے اندر موجب ہے۔ لیکن کفر پردے نے اس کے چہرے کو چھپا رکھا ہے چونکہ یہ رکاوٹ اور مانع آثار عملی کے اظہار میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ بدونِ شک اس صورت میں مذکورہ معنی میں کفر تحقق پائے گا، لیکن اگر خدا اور نبوت پر ایمان رکھنے والا انسان ہمیشہ اور دائماً ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل انجام دے، صرف بعض موقعوں پر غلطی سے گناہ کا ارتکاب کرے، اگر چہ اس مورد میں فسق صادق آتا ہے لیکن کفر صادق نہیں آتا۔

جو چیز وضاحت کے ساتھ اس مطلب پر گواہی دیتی ہے وہ آیت کے آغاز میں بیان کیے گئے مطالب ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر اہل کتاب کی غذا کھانا اور ان کی پاکدامن خواتین سے رشتہ ازدواج قائم کرنا جائز تھا۔ پھر آخر میں ایمان کے ساتھ کفر اختیار کرنے کا ذکر کرتے ہوئے اس کو حبط اعمال کا عامل شمار کیا گیا ہے[2]۔

آیت کے آغاز میں بیان شدہ نکات کے پیش نظر کرنے سے آخری جملہ ''ومن یکفر بالایمان'' درحقیقت مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے کہ مبادا خداوند تعالیٰ کی طرف سے دی گئی اس آزادی کا غلط فائدہ اٹھائیں (تا کہ اہل کتاب سے ایک قسم کی معاشرت اور میل جول رکھیں اور زندگی گزارنا ان کے لیے دشوار نہ ہو جائے اور ان سے رشتے ناطے جوڑ کر ان کے اندر اسلامی تعلیمات کی ترویج کریں) کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ظاہری تعلق سے بڑھ کر صمیم قلب سے ان سے اظہار دوستی کرنے لگیں، یا یہ کہ ان کے شیطانی مکر و فریب کے جال میں پھنس جائیں اور اسلامی

---

[1] سورہ مائدہ آیت ۵

[2] اَلۡیَوۡمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمۡ ۪ وَطَعَامُکُمۡ حِلٌّ لَّہُمۡ ۫ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ اِذَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ مُحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ وَلَا مُتَّخِذِیۡۤ اَخۡدَانٍ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالۡاِیۡمَانِ فَقَدۡ حَبِطَ عَمَلُہٗ ۫ وَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۵﴾ (سورہ مائدہ آیت ۵)

تعلیمات پر عمل کرنے سے گریز کریں (اور یوں ایمان سے کفر برتنے لگیں) کیونکہ اس صورت میں ان کے اعمال باطل ہو جائیں گے اور دوسرے جہان میں انہیں اپنی کوششوں کا کوئی ثمرہ نہیں مل سکے گا۔[1]

۶۔ نفاق اور دورُخی

قرآن کریم کی نظر سے نفاق اور دورخی احباط کے جملہ عوامل میں سے ہے۔ جب بھی افراد دنیاوی فوائد کی خاطر اپنے آپ کو خدا اور قوانین اسلام کا ایماندار ظاہر کریں، لیکن دراصل وہ ایماندار نہ ہوں بلکہ دلی طور پر انکار کرتے ہوں تو کبھی جو نیک کام کو انجام دیتے ہیں حبط اور باطل ہیں اور روزِ قیامت حساب و کتاب کے وقت کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔

قرآن کریم سورہ احزاب[2] میں منافقین کے چہرے کو آشکار کرتے ہوئے دشمن سے جنگ کے وقت ان کی بہانہ سازیوں اور عذر تراشیوں کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح ان میں سے بعض افراد کی اس کج روی کو بھی بیان کرتا ہے کہ جو نہ صرف خود جنگ پر نہیں جاتے بلکہ دوسروں کو بھی اپنے غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈے سے روکتے ہیں۔ ان آیات کے آخر میں قرآن فرماتا ہے:

اُولٰٓىِٕكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۹[3]

''وہ درحقیقت خدا اور اسلام پر ایمان نہیں لائے پس اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو حبط اور باطل کر دیا ہے اور یہ کام اللہ کے لیے آسان ہے۔''

قرآن سورہ توبہ میں بھی پہلے تو ان کو کفاروں کے ہم پلہ قرار دیتا ہے اور ان کو اہل جہنم، خدا کی رحمت سے محروم اور راندۂ درگاہِ الٰہی قرار دیتا ہے۔ پھر گذشتہ امتوں کے سرکش اور نافرمان افراد کے انجام کا ذکر کرتا ہے کہ وہ منافق اور کافر طاقتور، اولاد و مال کے لحاظ سے قوی تھے، لیکن آخر کار مادی لذتوں میں غرق ہونے کی وجہ سے حق کی اطاعت سے انحراف کیا جس کی وجہ سے ان کے سب اعمال حبط ہو گئے۔ قرآن فرماتا ہے کہ منافقین بھی اگر نفاق کی راہ کو ترک نہ کریں تو اسی قسم کی سرنوشت کے حق دار ہوں گے اور ان کے نیک کام دنیا اور آخرت

---

[1] المیزان ج ۵ ص ۲۲۰۔۲۲۲

[2] سورۂ احزاب آیت ۱۲۔۱۹

[3] سورہ احزاب آیت ۱۹

میں حبط ہو جائیں گے۔[1]

۷۔ شک سے آمیختہ ایمان:

قرآن حکیم میں مخلص مومنین کے مقابلے میں تین گروہوں کا ذکر آیا ہے۔[2]

(i) کافر

(ii) منافق

(iii) بیمار دل افراد

یہاں تک کافروں اور منافقوں کے اعمال کے احباط کی بحث ہو چکی ہے۔

اب تیسرے گروہ کے بارے میں قرآن کی نظر (رائے) کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ افراد جو حقیقت میں خدا پر ایمان رکھتے ہیں، کافروں اور منافقوں کی طرح نہیں (کہ وہ خدا پر ایمان نہیں رکھتے) اس فرق کے ساتھ کہ کافر اپنے باطنی افکار کا اظہار بھی کرتے ہیں جبکہ منافق اس کا اظہار نہیں کرتے۔

یہ گروہ (تیسرا) خدا پر ایمان رکھتا ہے لیکن ان کا ایمان متزلزل ہے اور ایک طرح کا شک ان کے ایمان کے ساتھ ہوتا ہے کہ قرآن کریم اس کو "فی قلوبهم مرض"[3] کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔ قرآن پہلے تو یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے سے منع کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ ؕ[4]

''مسلمانوں میں سے جو کوئی ان کو دوست رکھے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔''

اس کے بعد اس گروہ کے بارے میں جس نے خدا کے اس فرمان کی مخالفت کی اور بعض دنیاوی مفادات کی خاطر ان سے دوستی کے

---

[1] وَعَدَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ هِىَ حَسۡبُهُمۡ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ ۙ﴿۶۸﴾ كَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ كَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡكُمۡ قُوَّةً وَّاَكۡثَرَ اَمۡوَالًا وَّاَوۡلَادًا ؕ فَاسۡتَمۡتَعُوۡا بِخَلَاقِهِمۡ فَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِخَلَاقِكُمۡ كَمَا اسۡتَمۡتَعَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ بِخَلَاقِهِمۡ وَخُضۡتُمۡ كَالَّذِىۡ خَاضُوۡا ؕ اُولٰۤـئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۶۹﴾ (سورہ توبہ آیت نمبر ۶۸)

[2] مخلص مومنین کے مخالف گروہوں سے مراد عقیدہ کے لحاظ سے مخالفت ہے جبکہ عمل کے لحاظ سے خود مومنین بھی گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ مثلاً عادل، فاسق وغیرہ کہ اس وقت ہمارے مورد نظر نہیں ہیں۔

[3] سورۂ بقرہ آیت ۱۰

[4] سورہ مائدہ آیت ۵۱

رشتے قائم کیے، یوں فرماتا ہے:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ [1]

''بیمار دل مسلمان جن کو تم دیکھو گے کہ ان سے دوستی کے رشتے بہت تیزی سے استوار کرتے ہیں۔''

پھر ان کے ذلت آمیز اور برے انجام سے دوسری آیت میں قرآن یوں خبر دیتا ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ [2]

''مخلص مومنین (بیمار دل مومنین سے) کہتے ہیں کہ کیا یہ گروہ (اہل کتاب) وہی نہیں جس نے تمہارے ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی تھیں (اور جنہوں نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا تھا۔ پس اب جبکہ تم ذلت وخواری میں مبتلا ہو تو کیوں تمہاری مدد نہیں کرتے؟) ان کے اعمال باطل ہو گئے اور وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گئے۔''

بیمار دل کون ہیں؟

قرآن میں بیمار دل انسانوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں دو نظریے ہیں:

۱۔ منافق ہیں۔

۲۔ کوئی اور گروہ ہے۔

بعض کے نزدیک قرآن میں بیمار دل افراد سے مراد منافقین ہی ہیں لیکن دوسروں کے نزدیک منافقین کے بجائے اور گروہ ہے۔ اس مسئلے میں فیصلہ کرنا خاصا دشوار ہے، کیونکہ اس بارے میں دو قسم کی آیات ہیں۔

(الف) بعض آیات سے پہلے والا نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ بہت ساری آیات کہ جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے احکام کے مقابل ان کے موقف کا ذکر آیا ہے۔ دونوں گروہوں کی روش یکساں ہے۔ سورۂ بقرہ میں منافقوں کو بھی بیمار دل قرار دیا گیا، چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ [3]

---

[1] سورہ مائدہ ۵۲

[2] سورہ مائدہ آیت ۵۳

[3] سورہ بقرہ آیت ۱۰

(ب) لیکن بعض آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ یہ دو گروہ ہیں کیونکہ منافقین کے ذکر کے بعد بیمار دل انسانوں کا ذکر آیا ہے۔[۱]
ہم فی الحال اس مطلب کی تحقیق میں نہیں پڑتے صرف اتنا کہتے ہیں کہ دوسرے نظریے کو قبول کرنے کی صورت میں ہم ''بیمار دلی'' کو احباط کا خاص عامل شمار کر سکتے ہیں۔[۲]

۸۔ قیامت اور آیاتِ الٰہی کی تکذیب

قرآن کریم کی بعض آیات میں قیامت اور آیات الٰہی کو جھٹلانا حبط اعمال کا ایک عامل بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾[۳]

''جنہوں نے آیاتِ الٰہی اور لقاء قیامت کو جھٹلایا ان کے اعمال حبط ہو گئے، کیا جو کچھ انہوں نے انجام دیا ہے کے علاوہ جزا پائیں گے؟''

یہاں پر دو احتمال ہیں۔ ایک احتمال یہ ہے کہ قیامت کا انکار اور اس کا جھٹلانا ذاتی طور پر حبط عمل کا عامل نہیں ہے کیونکہ جن آیات میں قیامت کے جھٹلانے اور اس سے کفر اختیار کرنے کو حبط عمل کا عامل قرار دیا گیا ہے ان میں آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور ان سے کفر اختیار کرنے کا ذکر بھی ساتھ آیا ہے۔ آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی بازگشت دراصل توحید اور نبوت کی تکذیب اور کفر کی طرف ہے۔

لیکن دوسرا احتمال یہ ہے کہ قیامت کی تکذیب جداگانہ طور پر حبط عمل کا عامل ہے اور اس کا آیات الٰہی کی تکذیب اور انکار کے ساتھ ذکر کرنا اس کے احباط کے جداگانہ عامل ہونے کے نافی نہیں ہے۔

---

[۱] سورہ احزاب کی آیت ۱۲، سورہ انفال کی آیت ۴۹ اور سورہ حج کی آیت ۵۳ وغیرہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] علامہ طباطبائی نے دوسرے نظریے کو قبول کیا ہے۔ المیزان کی ج ۵ ص ۴۱۲ تا ۴۱۵ کی طرف رجوع کریں۔

[۳] سورہ اعراف آیت ۱۴۷، سورہ کہف کی آیت ۱۰۳، ۱۰۵ اسی مضمون کی حامل ہیں۔
قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ (کہہ دو کیا تمہیں عمل کے لحاظ سے خسارہ اٹھانے والے افراد کے بارے میں بتاؤں؟ وہ ایسے افراد ہیں جن کی دنیاوی زندگی کی کوششیں ضائع ہو گئیں جبکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ نیک کام انجام دیے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے روزِ قیامت اور آیاتِ الٰہی سے کفر اختیار کیا ہے۔ پس ان کے اعمال حبط ہو گئے اور وہ روزِ قیامت بھاری عمل نہیں رکھتے ہوں گے۔ (کہف ۱۰۳ تا ۱۰۵)

۹۔ دنیا ہی کو مقصد سمجھنا

بعض آیاتِ قرآنی میں دنیا کو اپنا یگانہ مقصد وہدف قرار دینے کو نیک اعمال کے عامل حبط گردانا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَهُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ۝۱۵ اُولٰٓٮِٕكَ الَّذِيۡنَ لَيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ۝۱۶ (سورہ ھود ۱۶،۱۵)

''جنہوں نے فقط دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کو چاہا ہے اور انہی سے دل باندھ لیا ہے انہیں ان کے اعمال کا سارا بدلہ اسی دنیا میں دے دیں گے اور قیامت کے دن ان کے لیے دوزخ کی آگ کے علاوہ کچھ نہ ہوگا اور اُن کے تمام اعمال باطل اور حبط ہو جائیں گے۔''

اگرچہ بعض افراد کچھ نیک کام انجام دینے کے لیے قدم اٹھاتے ہیں لیکن ان اعمال سے ان کا مقصد خدا کی رضا کا حصول اور دینی فریضہ کی ادائیگی یا ثواب اخروی کو حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس ذریعے سے اپنی اجتماعی اور معاشرتی حیثیت کو مستحکم کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں یا دوسرے دنیاوی اغراض ان کے مقصودِ نظر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اعمال سے دوسرے جہان میں ذرہ برابر فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور انجام دیے گئے گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

ہم یاددہانی کرادیں کہ اسے ایک جدگانہ عامل نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ جو لوگ دنیاوی مقاصد کے لیے نیک کام انجام دیتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں:

۱۔ کفار اور مشرکین ۲۔ مومنین

اس نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مومنین ہمیشہ عذاب میں نہیں رہیں گے بلکہ اپنے برے اعمال کی سزا پانے کے بعد عذاب سے نجات پائیں گے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مومن جنہوں نے نیک کام دنیاوی مقاصد کے لیے انجام دیے دوزخ کے علاوہ اور جزا نہیں پائیں گے اور ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ لہٰذا آیت میں مذکورہ گروہ سے مراد کفار اور مشرکین ہیں۔

آیات کا سیاق بھی اسی مطلب کی گواہی دیتا ہے کیونکہ اس سے پہلی آیات میں نبوت کے منکروں سے گفتگو کی گئی ہے۔ اُن سے کہا گیا ہے کہ اگر تم کہتے ہو کہ قرآن خدا کی طرف سے نہیں (یعنی نبوت کی تکذیب کرتے ہو) تو اس جیسی دس سورتیں لے آؤ اور اگر ایسا نہیں کر سکتے اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو جان لو کہ قرآن علم الٰہی سے نازل ہوا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی یکتا خدا نہیں۔''

اس کے بعد زیر بحث آیات کو بیان کیا گیا ہے اور یہ خود اس بات کا قرینہ اور منہ بولتا ثبوت ہے کہ مذکورہ گروہ سے مراد وہی نبوت اور توحید کے منکر ہی ہیں کہ جن کے بارے میں پہلے والی آیات میں گفتگو ہو چکی ہے۔

۱۰۔ چند دیگر عوامل

قرآن کی بعض آیات میں کفر کے ساتھ کچھ اور عوامل بھی بیان ہوئے ہیں۔ کفر کے ساتھ ذکر ہونے کی وجہ سے ہم ان عوامل کو اکٹھا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ آیاتِ قرآن سے ناخوش

۲۔ خدا کی راہ سے روکنا

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جھگڑا

۴۔ انبیاء الٰہی کا قتل

۵۔ معروف کا حکم دینے والوں اور عدالت کے داعیوں کا قتل

یہاں پر دو احتمال موجود ہیں۔ ایک یہ کہ حقیقی عامل کفر ہے اور ان عوامل کی کوئی جداگانہ حیثیت نہیں بلکہ یہ کفر ہی کے آثار عملی ہیں جبکہ یہ احتمال بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک الگ سے ایک عامل ہے۔ مثلاً جب بھی کوئی اسلام پر ایمان کے ساتھ اپنے دنیاوی مفادات کی خاطر قرآن کی آیات مثلاً ربا کی آیت سے ناخوش ہو یا مال کے طمع کی خاطر انبیاء اور عدالت کے داعیوں کو قتل کرے تو اس کے بھی صالح اعمال حبط ہو جائیں گے۔ اب اس سے متعلق آیات ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۸﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۹﴾[۱]

''جنہوں نے کفر اختیار کیا موت آئے انہیں۔ ان کے اعمال نابود ہو گئے۔ یہ نفرین اور لعنت اس لیے ہے کیونکہ جو کچھ خدا نے شریعت کی صورت میں اُن کی طرف نازل کیا ان کو اچھا نہیں لگا۔ نتیجے کے طور پر اُن کے اعمال باطل ہو گئے۔''

۲۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾[۲]

''بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا اور دوسروں کو راہِ خدا سے روکا اور ہدایت کی علامتوں کے واضح ہونے کے

---

[۱] سورہ محمد آیات ۸، ۹

[۲] سورہ محمد آیت ۳۲

بعد رسول سے جھگڑا کیا، وہ خدا کو نقصان نہیں پہنچاتے اور وہ بہت جلد ان کے اعمال باطل کر دے گا۔''

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾[1]

''جو لوگ آیاتِ الٰہی سے کفر اختیار کرتے ہیں اور انبیاء اور قسط و عدل کی طرف دعوت دینے والوں کو ناحق قتل کرتے ہیں ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں نابود ہو گئے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں۔''

یہاں تک ہم احباط کی حقیقت، اس کے بارے میں آرائ، نظریات اور اقوال سے قرآن کی نظر سے آگاہ ہوئے ہیں۔ اب مسئلہ تکفیر اور اس کے عوامل پر بحث و تحقیق کرتے ہیں۔

قرآن میں تکفیر کے عوامل

کلام اور تفسیر کی بحث میں ''تکفیر'' سے مراد خداوند تعالیٰ کی جانب سے چند عوامل کی وجہ سے گناہوں کی بخشش ہے جن کا ہم ذکر کریں گے۔ احباط کی بحث کی طرح مسئلہ تکفیر میں خصوصی کلامی بحث کی ضرورت نہیں، کیونکہ کلامی نظر سے دونوں مسئلوں کی حقیقت ایک ہے اور یہ کہ ایک عمل دوسرے عمل کے موثر ہونے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ یہ حقیقت کبھی اس جہت (سے بیان ہوتی ہے کہ) برے کام نیک کاموں کے اثرات کے وقوع پذیر ہونے میں رکاوٹ ہیں۔ اس صورت میں احباط ہے اور کبھی اس کے برعکس صورتِ حال ہوتی ہے جسے تکفیر کہتے ہیں۔

مسئلہ تکفیر عقلی اور کلامی لحاظ سے ہرگز مشکل نہیں کیونکہ اس مسئلے میں گفتگو کا محور اللہ تعالیٰ کی طرف سے گناہوں کی بخشش ہے اور عقلی لحاظ سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ اللہ تعالیٰ مجرم کے عقاب سے درگزر کر دے اور جہاں پر دوسرے کا حق درمیان میں ہو اسے جزا وغیرہ دے کر راضی کر دے۔

لہٰذا جو چیز یہاں بیان کرنا ضروری ہے وہ قرآن کی نظر میں تکفیر کے عوامل ہیں۔ اب ہم ان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

ا۔ خدا پر ایمان

اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ کفر اور شرک کے بعد ایمان ان دونوں کے اثرات کو زائل کر دیتا ہے اور ایسے انسان کا گذشتہ اعمال کی وجہ سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ آیات اور روایات واضح طور پر اس بات پر گواہ ہیں۔

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۲۱۔۲۲

قرآن کریم فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲ [۱]

''جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیے اور اس پر جو اُن کے رب کی طرف سے حق محمدؐ پر نازل کیا گیا، ایمان لائے، اللہ نے ان کے گناہوں کی پردہ پوشی کی اور ان کے حال کو (دنیا اور آخرت میں) بہتر بنا دیا۔'' [۲]

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ کافروں میں سے کچھ لوگ ایمان لانے کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: ''کیا زمانہ جاہلیت میں انجام دیے گئے کاموں پر ہمارا مواخذہ ہوگا؟''

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے بھی حقیقی ایمان اختیار کیا اللہ تعالیٰ اس کو دورِ جاہلیت کے گناہوں پر عقاب (عذاب) نہیں کرے گا، لیکن اگر کوئی حقیقی ایمان نہ لایا اور فقط ظاہری طور پر اپنے آپ کو مسلمان بنایا اس کو گذشتہ گناہوں پر بھی اور اسلام کے بعد گناہوں پر بھی سزا دے گا۔'' [۳]

---

[۱] سورہ محمد آیت ۲

[۲] سورۂ مائدہ کی آیت ۶۵ میں بھی ایمان اور پاکدامنی کو گناہوں کا کفارہ اور بہشت جانے کا سرمایہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۶۵

[۳] اصول کافی ج ۲ ص ۴۶۱ کتاب الایمان والکفر

۲۔ ہجرت، جہاد اور راہِ خدا میں شہادت

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ [۱]

''جنہوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی اور (ستمگروں کی طرف سے) اپنے علاقے سے باہر نکال دیے گئے اور میری راہ میں ان کو اذیت و آزار پہنچائی گئی اور انہوں نے خدا کے دشمنوں سے جہاد کیا اور شہادت پائی، ہم ان کے گناہوں پر پردہ ڈال دیں گے اور انہیں ایسے باغوں میں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، داخل کریں گے۔ یہ جزا اور انعام خدا کی طرف سے ہے اور خدا کے پاس اچھی جزا ہے۔''

اس آیت میں عوامل تکفیر کے طور پر ذکر ہونے والے اچھے اور شائستہ اعمال درج ذیل ہیں:

(الف) خدا کی راہ میں ہجرت (ھاجروا...)

(ب) ظالموں کے ظلم و ستم کے باعث اپنے وطن اور آبائی علاقے سے دوری (واخرجوا...)

(ج) خدا کی راہ میں مشکلات اور تکلیفوں کا برداشت کرنا (واوذوا...)

(د) خدا کی راہ میں جہاد (وقاتلوا)

(ر) شہادت کے بلند درجے پر فائز ہونا (وقتلوا) [۲]

مندرجہ بالا امور کلمہ ''واؤ'' کے ذریعے ایک دوسرے پر عطف ہوئے ہیں۔ اس صورت میں دو احتمال ہو سکتے ہیں:

۱۔ واو کے ذریعے سے عطف مذکورہ امور کو باہم جمع کرنے کے لیے ہے۔ نتیجے کے طور پر ان تمام کی بازگشت ایک عامل کی طرف ہوگی اور وہ عامل خدا کی راہ میں شہادت ہے اور اس کے مصداق وہ مہاجرین ہیں جنہوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں شہادت پائی، کیونکہ ان میں آیت میں مذکورہ تمام صفات موجود تھیں۔

۲۔ ممکن ہے واؤ کے ذریعے عطف سے مراد یہ ہو کہ ذکر کیے گئے شائستہ کاموں کی بارگاہِ الٰہی میں اتنی اہمیت ہے کہ ان میں ہر ایک گناہوں کی بخشش اور کفارے کا موجب ہے اور اصطلاح کے مطابق 'واؤ' جمع کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مطلب کی شرح اور تفصیل کے معنی میں ہے۔

کلمہ 'واؤ' کیونکہ مذکورہ ہر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے ان دو میں سے ایک کا تعین قرینے کا محتاج ہے۔

---

[۱] سورہ آل عمران آیت ۱۹۵

[۲] اس امر پر کہ خدا کی راہ میں شہادت گناہوں کا کفارہ ہے، سورۂ محمد کی آیت ۴ اور ۵ کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہاں پر قرینہ دوسرے مطلب پر گواہ ہے۔قرینہ یہ ہے کہ یہ آیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کا اس درخواست کا جواب ہے جو چھ مومن بندوں کی طرف سے تھی جن کو "اولی الالباب" سے تعبیر کیا گیا ہے۔انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے عفو و بخشش کی درخواست کی۔ان کی یہ درخواست قبول ہوئی اور مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی درخواست کا جواب دیا ہے۔اس بنا پر آیت کا ان مہاجرین، جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں شہادت پائی، میں منحصر ہونا ان آیات کے ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ قرآن مجید سورہ آل عمران کی آیات ۱۹۰ سے لے کر ۱۹۵ تک خردمند افراد کو 'اولی الالباب' قرار دیتا ہے اور ان کے بارے میں فرماتا ہے:

الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا"

''وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے یاد کرتے ہیں۔''

"ربنا انك من تدخل النار فقد اخزیته"

''ہمارے پروردگار! بے شک جس کو تو نے آگ میں ڈالا اسے تو نے ذلیل وخوار کیا۔''

"ربنا و اتنا ما وعدتنا علی رسلك......"

''ہمارے پروردگار! جو کچھ تو نے انبیاء کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما۔''

اس بنا پر ان آیات میں مذکور صفات ایک خاص زمانے سے مربوط نہیں اور زیر بحث آیت میں بھی اس (اولی الالباب) گروہ کی درخواست پر اللہ تعالیٰ کا جواب ہے۔اسی طرح زیر بحث آیت میں جن مطالب کا ذکر کیا گیا وہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے یا راہِ خدا کے مجاہدوں کے کسی خاص طبقے سے مخصوص نہیں بلکہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو آپؐ کے زمانے میں یا آپؐ کے بعد کے زمانے میں شہادت نہیں پا سکے لیکن وہ مومنین راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں میں سے تھے۔

۳۔کبیرہ گناہوں سے اجتناب

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ﴿۳۱﴾ [1]

''اگر تم لوگ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو تو ہم تمہارے صغیرہ گناہوں کو چھپا دیں گے اور تمہیں بہترین جگہ میں

[1] سورہ نساء آیت ۳۱

داخل کریں گے۔‘‘[1]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جس نے بھی ایسے گناہوں سے دوری اختیار کی جن پر جہنم کی آگ کی وعید کی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دوسرے گناہوں کو بھی بخش دے گا اور اس کو بہترین جگہ میں داخل کرے گا۔ پھر فرمایا کہ آگ میں ڈالے جانے کا سبب یہ گناہ ہیں۔

۱۔ نفس محترم (وبے گناہ) کا قتل

۲۔ عاق والدین

۳۔ سود کھانا

۴۔ ہجرت کے بعد بادیہ نشینی (العترب بعد الھجرۃ) اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان دور دراز کے پسماندہ علاقوں سے جہاں پر اسلام اور اس کے پروگرام کی کوئی خبر نہ ہو، اس سرزمین کی طرف ہجرت کرے جہاں الٰہی تعلیمات مروج ہوں لیکن پھر وہ اسی پسماندہ علاقے میں چلا جائے اور نتیجے کے طور پر اپنے دینی فرائض کو مکمل طور پر انجام نہ دے سکے۔

۵۔ پاکدامن خواتین پر گناہ کی تہمت لگانا۔

۶۔ یتیم کا مال کھانا

۷۔ میدانِ جنگ سے فرار[2]

۴۔ گناہ سے ندامت اور توبہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ[3]

’’اے ایمان والو! سچے دل سے خدا کے حضور توبہ کرو (گناہ کی طرف نہ لوٹنے اور پھر دوبارہ گناہ نہ کرنے کا پختہ

---

[1] اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ گناہوں کا دو نظر سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

(i) اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کہ جس نے اُن سے منع فرمایا ہے۔ اس صورت میں سارے گناہ کبیرہ ہیں اور کوئی گناہ صغیرہ نہیں۔

(ii) گناہوں کے باہمی موازنے کے اعتبار سے۔ اس صورت میں وہ صغیرہ اور کبیرہ میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اس بارے میں مفصل اور تشریح کے ساتھ تفاسیر کی کتب میں بحثیں موجود ہیں کہ کناسب موقع پر ہم ان پر گفتگو کریں گے۔ اس کے خواہش مند افراد مجمع البیان کی جلد ۲ ص ۳۹ اور المیزان ج ۴ ص ۳۴۴-۳۵۶ کی طرف رجوع کریں۔

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۱ باب ۴۶ جہاد النفس حدیث ۳۲

[3] سورہ تحریم آیت ۸

عزم کرو) شاید تمہارا پروردگار تمہارے گناہوں کو چھپادے اور تمہیں ایسے باغوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، داخل کردے۔"

امام صادق علیہ السلام نے توبہ نصوح کے بارے میں فرمایا ہے:

"اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کا باطن اس کے ظاہر جیسا ہو بلکہ اس سے بہتر ہو۔"[۱]

۵۔مخفی صدقہ

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ‌ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ﴿۲۷۱﴾[۲]

"اگر راہ خدا میں آشکارا صدقہ دوتو یہ اچھا عمل ہے اور اگر مخفی طور پر صدقہ دوتو (نہ صرف جزا و ثواب کا موجب ہ بلکہ) وہ تمہارے بعض گناہوں کو چھپادے گا اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے آگاہ اور جاننے والا ہے۔"

حضرت امیر المومنین علیہ السلام بھی فرماتے ہیں کہ:

"مخفی صدقہ گناہوں کا کفارہ ہے اور آشکارا صدقہ بری موت کو روکتا ہے۔"[۳]

۶۔تقویٰ اور پارسائی

تقویٰ ایک ایسا عامل ہے جو سعادت میں غیر معمولی موثر شمار ہوتا ہے اور اسے پھلدار درخت کی مانند ہے کہ جو انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی میں میٹھے اور شیریں پھل لاتا ہے۔اس پھلدار درخت کے مجموعی نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ بعض گناہوں اور لغزشوں کو چھپادیتا ہے اور اصلاح میں اسے کفارہ کہتے ہیں۔اس بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجۡعَلْ لَّـكُمۡ فُرۡقَانًا وَّيُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ﴿۲۹﴾[۴]

---

[۱] "التوبة النصوح ان يكون باطن الرجل كظاهره و افضل" (معانی الاخبار ص ۱۷۴)

[۲] سورہ بقرہ آیت ۲۷۱

[۳] وصدقة السر فانها تكفر الخطيئة و صدقة العلانية فانها تدفع ميتة السوء (نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۱۰۰)

[۴] سورہ انفال آیت ۲۹

''اے ایمان والو! اگر تقویٰ الٰہی اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے لیے حق کو باطل سے ممیز کرنے والا نور قرار دے گا اور تمہارے گناہوں کو چھپاتے ہوئے بخش دے گا اور خدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔''[۱]

۷۔ راہ خدا میں قرض اور چند دیگر عامل

سورۂ مائدہ کی آیت ۱۲ میں درج ذیل امور تکفیر کے عوامل اور اسباب کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں:

۱۔ انبیاء الٰہی پر ایمان اور اُن کی مدد کرنا

۲۔ نماز قائم کرنا

۳۔ زکوٰۃ ادا کرنا

۴۔ راہ خدا میں قرض دینا (قرض الحسنہ)

چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ....[۲]

''باتحقیق ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں بارہ نقیب (رہبر اور سرپرست) معبوث کیے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ، ان کا ساتھ دو اور خدا کو قرض حسنہ دو (یعنی دوسروں کو صرف خدا کی رضا کے حصول کے لیے قرض دو) پھر میں یقینا تمہارے گناہوں کی پردہ پوشی کروں گا اور تمہیں ایسے باغوں میں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، داخل کروں گا۔''

آخری عامل (قرض حسنہ) کے بارے میں دوسری آیت میں یوں فرمایا گیا ہے:

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ

---

[۱] اس بارے میں سورۂ زمر کی آیت ۳۵، سورہ طلاق کی آیت ۵، سورہ حدید کی آیت ۲۸ اور سورہ نوح کی آیات ۱۳ اور ۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] سورۂ مائدہ آیت ۱۲

حَلِيْمٌ ﴿١٧﴾ [١]

''اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو تو وہ تمہارے لیے اس کو بڑھا دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ شکور اور حلیم ہے۔''

۸۔عمل صالح اور ایمان

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٩﴾ [٢]

''جو خدا پر ایمان لایا اور اس نے عمل صالح انجام دیے خدا اس کے گناہوں کو چھپا دے گا اور اس کو ہمیشہ کے لیے ایسے باغوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

۹۔دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢﴾ [٣]

''اور تم میں سے صاحبِ ثروت و فضل افراد کو اپنے رشتہ داروں، مسکینوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (ان کی لغزشوں کی وجہ سے) کچھ دینے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے بلکہ انہیں چاہیے کہ ان کو معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت میں خدا کی مغفرت اس بات سے مشروط کی گئی ہے کہ انسان دوسروں کی خطاؤں سے درگزر کرے۔ لہٰذا دوسروں کو معاف کرنا اور بخش دینا بھی گناہوں کی بخشش اور تکفیر کے عوامل میں سے ہے۔

---

[١] سورہ تغابن آیت ۱۷

[٢] سورہ تغابن آیت ۹

[٣] سورہ نور آیت ۲۲

۱۰۔ راہِ خدا میں خطرات مول لینا

فرعون کے حکم پر بڑے بڑے جادوگروں کو جمع کیا گیا تا کہ بزعم خویش وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو مغلوب کریں۔ جادوگر حضرت موسیٰؑ کے معجزے کی حقیقت سے بے خبر تھے اور اسے جادو ہی کی ایک قسم خیال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا جادو شروع کیا اور مغرور ہو کر کہنے لگے کہ ہم غالب اور فتح مند ہوں گے لیکن جب حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا اور اس نے جو کچھ انہوں نے بنایا تھا سب کو نگل لیا تو جادوگروں کی فطرت بیدار ہوگئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ موسیٰؑ کا کام جادو نہیں ہے بلکہ الٰہی معجزہ ہے جو انہیں عطا کیا گیا ہے۔ پس وہ سب سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے کہ "ہم عالمین کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔"

فرعون اس منظر کو دیکھ کر سخت پریشان ہوا اور اس خوف سے کہ کہیں دوسرے لوگ اس کی فرمانبرداری سے ہاتھ نہ اٹھا لیں، اس نے جادوگروں پر الزام لگایا کہ موسیٰؑ دراصل تمہارا بڑا استاد ہے اور یہ تمہاری میرے خلاف سازش تھی۔ پھر انہیں سخت سزا دینے کی دھمکی دی اور کہا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں ایک دوسرے کی الٹی طرف کاٹ کر تمہیں پھانسی پر لٹکا دوں گا۔ جادوگروں نے جواب دیا تمہارا اذیت دینا اور قتل کرنا ہمارے لیے نقصان کا باعث نہیں۔ ہمیں امید ہے چونکہ ہم پہلے افراد میں جنہوں نے خطرے کو گلے لگایا اور موسیٰ پر ایمان لے آئے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ہمارے سابقہ گناہوں کو بخش دے [۱] گا۔

مذکورہ عوامل کے علاوہ قرآن کی آیات اور اسلامی روایات میں گناہوں کی تکفیر کے اور عوامل بھی ذکر ہوئے ہیں۔ ان سب کے بیان کرنے سے گفتگو طول پکڑ جائے گا۔ لہٰذا اس بحث کو ہم یہیں پر ختم کرتے ہیں۔

---

[۱] فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾ .... فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ رَبِّ
مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬
لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۡ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ
اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

(سورہ شعراء آیت ۳۸ سے لے کر ۵۱ تک)

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

ٹیکنالوجی کی گرم بازاری

اس مقدمے میں مندرجہ ذیل امور پر اظہارِ خیال کیا جائے گا:

۱۔ مغربی تمدن کے منفی پہلو۔

۲۔ مابعدالطبیعات METAPHYSICS سے مربوط مسائل میں مادہ پرستی کا اثر۔

۳۔ کج فکر افراد سے ہمیں سروکار نہیں۔

۴۔ مقام ولایت سے مربوط مسائل کے تجزیہ اور تحلیل کا طریقہ۔

۵۔ قرآن کا ہمارے لیے نمونے کے طور پر اولیاء خدا میں سے ایک کا تعارف۔

رینے سانس RENAISSANCE کا زمانہ مغربی دنیا کے لیے علمی حیات کی تجدید اور پرانے نظامِ تمدن کے خاتمے کا دور تھا کہ آج اسے مشینی تمدن اور ٹیکنالوجی کا ''دورِ حکومت'' کہتے ہیں۔

اس سائنسی انقلاب (تبدیلی) میں تمام علمی اور فلسفی مسائل میں بحث کا طریقہ کار تجربہ گاہوں میں تجربہ وآزمائش کی بنیاد پر استوار کیا گیا، چنانچہ بعض چیزیں جن کی پہلے لوگ تعظیم وتقدیس کرتے تھے، لیکن تجربہ گاہ میں اُن کے آثار کا مشاہدہ نہ ہو سکنے کی بناء پر انہیں مجمل ومہمل اور بعض اوقات شک وتردید اور انکار کی وادی میں دھکیل دیا گیا۔

مغربی دنیا نے اگرچہ اس علمی روش کو بروئے کار لاتے ہوئے سائنسی علوم کی کئی گتھیاں سلجھائیں اور کئی قلعے فتح کیے، طبیعت اور اس کے رازوں سے انسان کا فاصلہ کم کر دیا اور مادے پر انسانی تسلط کو آسان بنا دیا لیکن اس طرح کے مادی تصور کائنات نے اپنی مثبت باتوں کے ساتھ منفی باتوں کا ایک مجموعہ اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا ہے۔ اس نے مغربی انسان کی ''میٹا فزکس'' اور عالم ماوراء طبیعت سے دوری اور بیگانگی میں اضافہ کیا اور کلیسا اور پوپ کو بہت مشکلات سے دوچار کر دیا۔

ماضی میں آئین مسیح کہ جو اپنی جنم دھرتی (مشرق) میں خوب نہ پہچانا گیا، ارمغانِ شرق کے عنوان سے مغرب میں منتقل ہوا۔ بالآخر مغربی انسان نے مشرقی دین کی پیروی کی، اس دین کی اپنی دھرتی سے دوری کی وجہ سے اس کی پیچیدگیوں اور ابہاموں میں اضافہ ہوا، یوں خدا کا سچا دین ایک عالمی افسانے کی صورت اختیار کر گیا اور اپنے اسی خیالی وافسانوی وجود کے ساتھ صدیوں تک انسانی فکروں اور عقلوں پر حکومت

کرتا رہا۔لیکن حالیہ سائنسی تحولات اور جدید نظاموں کی پیدائش نے اس کے فروغ میں کمی کر دی اور کلیسائی فکروں کو علم و دانش کے میدان سے باہر نکال دیا۔ عالم مشرق کا یگانہ افتخار یہ ہے کہ وہ اسلام کے سچے دین کی پیروی کرتا ہے کہ جس کے تمام اصول، معارف اور تعلیمات عقل وفکر کی بنیاد پر استوار ہیں اور جدید علوم ہمیشہ اس کی تعلیمات کی تائید کرتے رہے ہیں۔لیکن وہ مغربی تمدن کے منفی اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا اور بعض طبقوں کے درمیان ماوراء طبیعت کے مسائل شک وتردد اور کبھی نفی اور انکار کا شکار ہو گئے ہیں۔

ان طبقوں میں مغربی تمدن کے منفی اثرات میں خاص قسم کی شدت اور کمزوری نظر آتی ہے۔

جو طبقہ شروع ہی سے مذہبی معارف اور اعتقادی اصولوں کے بارے میں صحیح معلومات نہیں رکھتا تھا وہ الحاد اور انکار کی سرحد تک پہنچ گیا۔ مذکورہ طبقے نے آخر کار میٹریلزم اور اصالت مادہ کی حکومت کو میٹا فزکس کی حکومت پر ترجیح دی اور مادہ پرستی کی طرف مائل ہو گیا۔

ان منفی باتوں کے اثرات اس طبقے پر اور طرح کے ہیں جس نے مذہبی گھرانوں میں پرورش پائی اور کچھ نہ کچھ اسلامی اصولوں اور معارف سے آگاہ تھا۔ان منفی باتوں نے اس طبقے کو اسلامی شخصیات کے امتیازات کے بارے میں شک و شبہ میں ڈال دیا اور معجزہ، تیسری آگاہی اور ولایت تکوینی جیسے مسائل سے انکار پر اکسایا۔

انبیاء اور ہادیانِ برحق کے امتیازات کے بارے میں اس گروہ کے تزلزل کی علت مغربی نظام کے علم کی حکومت اور مختلف پہلوؤں میں مادہ پرستی کے سوا کچھ نہیں۔اگر چہ یہ گروہ اپنے انکار کی اور علت تراشتا ہے اور اپنے خیال کے مطابق حقیقت پرستی کے حوالے سے بات کرتا ہے،لیکن اگر وہ ایک ماہرِ نفسیات کا سامنا کریں اور ان کے شک و انکار کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے انکار کا محرک اس کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات اس گروہ کے بارے میں صحیح ہے جو صاف اور پاک روح اور ذہن کے ساتھ معنوی مسائل کو دیکھتا ہے لیکن ضدی، مغرور، خودغرض اور ہٹ دھرم افراد کے ان معارف سے انکار کی محرک کوئی اور چیز ہے کہ جس کے بارے میں ہم فی الحال گفتگو نہیں کرتے۔

الٰہی شخصیات اور ولایت کے مقام والا کے حامل افراد سے مربوط چند دیرینہ مسائل کہ جو زبانوں پر عام ہیں اور دینی و مذہبی محافل و مجالس میں اور بعض اوقات سائنسی مراکز میں بھی زیر بحث لائے جاتے ہیں اور ہر کوئی ان کے بارے میں اپنے طور پر اظہار نظر کرتا ہے، یہاں ہم ان سوالوں میں سے چند ایک کا نمونے کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

کیا یہ صحیح ہے کہ مقام ولایت پر فائز انسان پردہ غیب کی خبریں دے سکتا ہے اور آگاہی سوم (معرفت) رکھتا ہے؟ کیا یہ درست ہے کہ ایک انسان عبودیت اور بندگی کے راستے کو طے کرنے سے ایسی قوی روح اور نفس کا حامل بن جاتا ہے کہ طبیعت سے ماوراء اپنے تعلق کو ثابت کرنے کے لیے اس عالم کے ایک حصے میں تصرف کر سکتا ہے؟

کیا یہ درست ہے کہ ایک کامل انسان افراد کے ضمیروں اور دلوں سے آگاہ ہو جاتا ہے، ان کے اعمال اور افکار سے مطلع ہو جاتا ہے اور قیامت کے دن اعمال کا گواہ بن جاتا ہے؟

کیا یہ صحیح ہے کہ فیض الٰہی (یعنی مغفرت اور بخشش) اس جہان کے مقابلے میں قیامت کے دن خاص اسباب کے ذریعے اپنے لائق اور شائستہ بندوں تک پہنچے گا، گناہگار اس دن بلند شخصیتوں کی شفاعت کے ذریعے بخشے جائیں گے اور حق تعالیٰ کی مغفرت ان کے شامل حال ہو

جائے گی؟

اس قسم کے سوالات دینی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے درمیان زیادہ زیر بحث آتے ہیں اور ان کے جوابات بھی دیے جاتے ہیں۔

اس قسم کے مسائل کے تجزیہ وتحلیل کے لیے دو سے زیادہ طریقے موجود نہیں ہیں۔

(الف) آسمانی کتاب اور معصوم پیشواؤں (علیہم السلام) کے کلام کی طرف رجوع کرنے سے اس قسم کے سوالات کا جواب دیا جاسکتا ہے اور گذشتہ ادوار میں مسلمان علماء کا یہی شیوہ رہا ہے۔ خاص طور پر ان سوالوں کا قرآنی وحدیثی پلڑا ان کے عقلی، استدلالی اور فلسفی پہلوؤں پر بھاری ہے۔

عقائد اور مذاہب کے علماء نے ولایت الٰہی سے مربوط کو قرآن، سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ائمہ ہدیٰ کے اقوال کی روشنی میں اپنی کتب میں تجزیہ وتحلیل کر کے اپنے نظریات بیان کیے ہیں اور مذکورہ مسائل کو ''علم غیب''، ''ولایت بر تصرف''، ''ضمائر سے آگاہ'' اور ''اعمال کے شاہد'' کے عنادین کے تحت ذکر کیا ہے اور ان پر بحث کی ہے۔

(ب) ایسے سوالوں کے جواب کے لیے ایک اور راستہ یہ ہے کہ کتاب وسنت سے راہنمائی حاصل کرنے کے علاوہ مسائل کے علمی، فلسفی پہلوؤں کو جس حد تک عقل انسانی نے ترقی کی ہے اور علوم طبیعی نے بھی انہیں ثابت کیا ہے، واضح کیا جائے تاکہ مشتاق نوجوانوں کی پیاس اس حد تک بجھ سکے کہ وہ خود غرضوں، مقلدوں اور ایجنٹوں کے ہاتھوں سے اپنے پاک عقائد کو محفوظ رکھ سکیں۔

راقم نے اپنے احساس ذمہ داری کی بنا پر ایسے سوالات کے بارے میں متعدد رسالے تحریر کیے ہیں جو چھپ چکے ہیں، جوابات کو منظم کرتے وقت دوسرے راستے کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور عقلی ونقلی دلائل کو ایک ساتھ قرار دے کہ قاری کو مقصد تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔

کتاب کے اس حصے میں جس کا موضوع علم غیب اور آگاہی سوم ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی فلاسفہ کے بلند افکار اور سائنسدانوں کے تجربات سے مدد لی جائے اور اس موضوع کا مختلف دریچوں اور پہلوؤں سے مطالعہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں مختصر طور پر اس کتاب میں جن مطالب پر ہم روشنی ڈالیں گے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حقیقت غیب سے آشنائی

۲۔ انسان اور غیب سے آگاہی کا امکان

۳۔ ہمارے رہبروں کا علم غیب خدا کی طرف سے ہے

۴۔ دانشوروں کی رسولؐ اور امامؑ کے علم غیب کے بارے میں گفتگو

۵۔ ائمہؑ کے علم غیب پر تحریر کی جانے والی کتب

۶۔ قرآن اور مسئلہ آگاہی سوم

۷۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیب کی خبریں

۸۔ نہج البلاغہ اور حضرت علی علیہ السلام کی غیب کی خبریں

۹۔ دیگر پیشواؤں (ائمہ علیہم السلام) کی غیب کی خبریں

۱۰۔ معرفت (آگاہی سوم) کے بارے میں دس سوالوں کے جواب

۱۱۔ اگر ائمہ آگاہ ہیں تو پھر کیوں مصیبتوں کا نشانہ بنے ہیں؟

۱۲۔ امام اپنی عام زندگی میں علم غیب سے استفادہ نہیں کرتا

ولی متصرف اور عالم غیب

قرآن مجید سورۂ کہف کی آیات ۶۴ سے لے کر ۸۲ تک میں مسلمانوں کو اولیاء الٰہی میں سے ایک ولی کا تعارف کراتا ہے جو بلند ترین مقام ولایت پر فائز تھا۔ اس یاددہانی کا مقصد یہ ہے کہ اس کے حالات اور مقامات کے جاننے سے دوسرے اولیاء خدا کے مقامات کو پہچان سکیں۔

یہ ولی خدا جس کی صفات قرآن میں ذکر ہوئی ہیں لیکن اس کا نام نہیں آیا، اس نے عبودیت اور بندگی کے راستے کو طے کرنے کے بعد ایسے مقام کو پالیا تھا کہ حضرت موسیٰؑ بن عمران جیسی عظیم شخصیت کا استاد اور معلم بن گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس ولی کی صحبت میں ایسے امور کا مشاہدہ کیا کہ جو اُن کے لیے حیرت انگیز حیرانی کا باعث تھے۔

اس نے اپنے مقام ولایت کی وجہ سے تین عمل ایسے تعجب آور انجام دیے کہ جو عادی اور عام پیمانوں پر قابل تفسیر نہیں ہیں۔

۱۔ ایک غریبوں کی کشتی تھی۔ دوسری طرف بادشاہ دریا میں کشیوں کو چھین رہا تھا۔ اس نے کشتی میں سوراخ کر دیا تاکہ ظالم اور لٹیرے بادشاہ کے لیے طمع کا باعث نہ بنے۔

۲۔ ایک بچے کو قتل کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ بچہ بڑا ہو جائے گا تو اپنے پاکیزہ اور صالح ماں باپ کے لیے باعث رسوائی ہوگا۔

۳۔ ایک گرتی ہوئی دیوار کو پھر تعمیر کر دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس دیوار کے نیچے دو یتیموں کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ یہ کام اس نے انجام دیا تاکہ خزانہ ایک مدت تک اس دیوار کے نیچے مخفی رہے اور جب یہ دو یتیم بالغ ہو جائیں تو خود خزانے کو نکال لیں۔

اس ولی خدا کا ذکر قرآن میں دیگر اولیاء خدا کے مقام و مرتبہ، ان کے طرزِ عمل اور تصرفات کو واضح کرتا ہے۔

آپ اس ولی کے حیران کن علمی کاموں سے مندرجہ ذیل باتیں اخذ کر سکتے ہیں کہ جو بہت سے سوالات کا جواب ہو سکتی ہیں:

۱۔ انسانی معاشرے میں اولیاء پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ مخفی اور پنہاں زندگی گزارتے ہیں۔ عام نظریں انہیں نہیں پہچان سکتیں۔ زمانے کے پیغمبر حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام بھی خدا کے تعارف کے بغیر انہیں نہیں پہچان سکتے۔

۲۔ یہ خدا کا ولی آیت وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا[1] کے حکم کے مطابق مسلسل اپنے ہدایت کے فریضے میں مشغول تھا۔

---

[1] سورۂ انبیاء آیت ۷۳

بات یہ ہے کہ اس نے یہ اجتماع سازی کے بجائے فرد سازی کا کام کیا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ کبھی ولی زمان دعوتِ عمومی دیتا ہے اور کبھی دعوتِ خصوصی۔ کبھی معاشرہ سازی اور عوام کی ہدایت کر کے اپنا فریضہ انجام دیتا ہے اور کبھی فرد سازی کے راستے اور فرد فرد کی ہدایت کر کے اپنے عظیم فریضہ کو پورا کرتا ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ خدا کے اولیاء ہمیشہ آشکارا (اعلانیہ) ہدایت عمومی میں مشغول رہیں، بلکہ ہدایت کے امر میں حکم خدا کے تابع ہوتے ہیں اور رہبری کے طریقۂ کار میں اسی سے ہدایت لیتے ہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

"یھدون بامرنا" (وہ ہمارے امر سے ہدایت دیتے ہیں)

۳۔ خدا کے اولیاء دلوں اور ضمیروں سے آگاہ ہوتے ہیں جیسا کہ یہ خدا کا ولی بادشاہ کے ارادے سے آگاہ ہوا اور وہ بھی اس لمحے جب کشتی کا ملاح اور اس میں سوار مسافر اس سے بے خبر تھے۔

۴۔ خدا کے اولیاء خدا کے حکم سے زمان و مکان کی حدوں کو توڑتے ہوئے دل کی آنکھوں سے آنے والے واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں جیسا کہ یہ ولی بچے اور اس کے ماں باپ کے مستقبل سے آگاہ ہوا۔

۵۔ اولیاء خدا لوگوں کے اموال اور نفوس میں تصرفات انجام دیتے ہیں لیکن عام نظریں ان کے عمل کا مشاہدہ نہیں کرتیں۔ جس طرح اس ولی نے ملاح کے سامنے کشتی میں سوراخ کیا، بچے کو لوگوں کی نظروں کے سامنے قتل کیا جبکہ لوگوں نے اس کے عمل کو نہیں دیکھا، صرف اس کے عمل کے اثرات کا مشاہدہ کیا۔

۶۔ اولیاء خدا روی زمین پر افراد کے مصالح کے مطابق تصرفات کرتے ہیں اور ایسا نہیں کہ ان کی امامت اور رہبری لوگوں کے لیے سود مند نہ ہو بلکہ ہر غائب امام اور ولی اس راستے سے امت کو فیض پہنچاتے ہیں۔

اس مختصر بیان سے ولایت کے بلند مقام کو جانا جا سکتا ہے اور جو قرآن کی منطق کو قبول کرتے ہیں وہ بہترین انداز میں مذہب سے وابستہ افراد کے بچگانہ اعتراضات اور سوالات کا جواب دے سکتے ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیشہ اپنا بیکراں لطف ہمارے شامل حال فرمائے اور اپنے اولیاء سے ہمارے معنوی رشتے کو محکم تر فرمائے۔

جعفر سبحانی
موسسہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام
قم

آ گاہی سوم کی حقیقت

لفظ 'غیب' کے استعمال کے مقامات (موارد) کی تحقیق سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ 'غیب' سے مراد انسانی حس سے پوشیدہ اور مخفی امور ہیں، یعنی ایسے امور جو عام آ گاہی اور علم کے عام ذرائع کی دسترس میں نہیں۔ مثلاً انسان کی نظروں سے سورج چھپ جاتا ہے تو کہتے ہیں ''غابت الشّمس''، یعنی سورج چھپ گیا۔ قرآن انسانی حس کی قلمرو سے خارج اشیاء کو 'غائبہ'' کہتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۝۷۵ [۱]

''زمین اور آسمان میں کوئی بھی امر (چیز) پوشیدہ نہیں مگر یہ کہ وہ ''کتاب مبین'' میں موجود ہے۔''

قرآن متعدد آیات میں خدا کی توصیف "عالم الغیب و الشهادته" کی صفت سے کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اس کا علم ان چیزوں پر حاوی اور مسلط ہے جو انسانی حواس کے دائرے سے خارج ہیں یا اس کے خواص کی قلمرو کے اندر ہیں اور ان چیزوں سے وہ آ گاہ ہے جو تم سے غائب ہیں یا تمہارے لیے محسوس ہیں۔

اس بیان سے نتیجہ کے طور پر دو نکتے اخذ کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ عربی زبان میں 'غیب' کا متضاد لفظ شہادت ہے اور اسی جہت سے قرآن خدا کی تعریف ''عالم الغیب والشہادۃ'' کے ذریعے کرتا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خم غدیر کے مقام پر اپنے تاریخی پیغام کے بعد فرمایا "الا فلیبلغن الشاهد الغائب" [۲]

''کہ حاضرین غائبین کو اطلاع دیں۔''

امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے اصحاب میں سے کچھ افراد کی مذمت کرتے ہوئے یوں فرمایا:

"مالی ارا کم اشباحا بلا ارواح...... وایقاظا نوما و شهودا غیبا۔" [۳]

''میں کیوں تم کو جسم مگر بغیر روحوں کے، بدار مگر سوئے ہوؤں کی طرح اور حاضر مگر غائبوں کی طرح دیکھتا ہوں؟''

۲۔ اشیاء کو غائب و حاضر میں تقسیم کرنے کا معیار انسان کا محدود علم ہے اس لحاظ سے کہ بعض اشیاء اس کے حواس اور علم کے احاطہ میں ہیں اور بعض دیگر چیزیں اس کے حواس اور باہر سے مربوط آلات کی دسترس میں نہیں ہیں۔ اس کی نظر میں اشیاء اور واقعات کی دو قسمیں ہیں، بعض حاضرین اور کچھ غائب۔ لہٰذا اس کا علم و آ گاہی بھی اسی تقسیم کے تابع ہے اور وہ بھی دو نوع میں تقسیم ہوتا ہے، غیب کا علم اور

---

[۱] سورہ نمل آیت ۷۵

[۲] الفضول المہمہ تالیف ابن صباغ مالکی ص ۲۴ وغیرہ

[۳] نہج البلاغہ عبدہ خطبہ

موجود شہادت کا علم۔ان تمام تقسیمات کا محور و مرکز انسان کا محدود علم اور اس کے ادراک کی نارسا قوتیں ہیں۔

اگر اس جہت کو مدنظر نہ رکھیں اور تمام موجودات کو خدا کے محیط علم سے موازنہ کریں، وہ علم کہ جو اس جہان کے تمام موجودات، چھوٹے بڑے، آسمانی زمینی سب کے سب اس کے سامنے موجود ہیں تو ایسے علم کے لیے اس طرح کی تقسیم کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ ہمارے پاس ایسا موجود ہی نہیں ہوگا جو اس کی قلمرو علم سے خارج ہو اور نہ ایسا علم ہے کہ جس کا نام ہم علم غیب رکھیں، بلکہ جہان کے تمام ذرات اس کے بیکراں علم میں ہیں اور اس کا علم و آگاہی شہود مطلق ہے۔امیر المومنین علیہ السلام خدا کی ''عالم السرائر والضمائر'' کی صفات سے تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قد علم السرائر و خبر الضمائر له الاحاطة بكل شيئ والغلبة بكل شيئ"[۱]

''خدا انسان کے باطنی اسرار اور افکار سے آگاہ ہے۔اس کا علم تمام اشیاء پر محیط ہے اور ہر چیز پر وہ غالب اور مسلط ہے۔''

ان سب کا معیار انسان کا محدود علم اور اس کا نقطہ نظر ہے۔اگر تقسیم کا معیار علم الٰہی ہو تو تمام چیزیں اس کے لیے ظاہر اور آشکار ہیں۔اس جہت سے امام علیہ السلام اپنے ایک خطبے میں خدا کی یوں توصیف کرتے ہیں:

"كل سر عندك علانية، وكل غيب عندك شهادة"[۲]

''تیرے سامنے ہر راز آشکار ہے اور ہر غائب تیرے سامنے شہود ہے۔''

غیب کی اقسام

غیب کو تین اقسام میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ غیب کی پہلی قسم ایسے موجودات ہیں جو انسانی حس کی توان سے باہر ہیں اور کبھی بھی اس کے دائرہ کار میں نہیں آئیں گے جیسے اللہ تعالیٰ کی مقدس ذات، اس کے اسماء اور صفات کی حقیقت، خدا کے غیبی لشکر یعنی فرشتے اور ان کا طریقہ کار مثلاً عالم خلقت کی تدبیر، اسی طرح عالم ارواح و جنات، عالم برزخ اور اس کی مختلف گھاٹیاں، عالم محشر اور اس کے مختلف مرحلے وغیرہ۔

ان موجودات کے حقائق، ان کی خصوصیات اور کیفیات انسانی حس اور ادراک کی پہنچ سے بالاتر ہیں اور کبھی بھی انسان ان کی کمی اور کیفی خصوصیات اور حقیقت سے آگاہ نہیں ہوسکے گا۔ان پر ایمان لانے کے سوا انسان کا کوئی اور فریضہ نہیں ہے۔اگر قرآن پرہیزگار افراد کی صفات میں سے ایک صفت 'غیب پر ایمان' بیان کرتا ہے تو اس سے مقصود اس طرح کے غیبوں پر ایمان ہے، چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۸۲، چھاپ عبدہ

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۵ چھاپ عبدہ

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ [1]

''وہ لوگ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔''

البتہ صرف ایک صورت میں انسان بعض غیبی اشیاء کی حقیقت سے آگاہ ہوسکتا ہے اور فرشتوں، برزخ کے مقامات، محشر کی گھڑیوں، بہشت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذابوں کو نزدیک سے مشاہدہ کرسکتا ہے اور ایسا اس وقت جب اس کی زندگی کا جام بھر جائے اور عالم غیب میں انسان قدم رکھے اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس کی بصارت بہت تیز ہو جائے۔ [2]

۲۔ غیب کی دوسری قسم انسان کی سائنسی دریافتیں ہیں خواہ ایسے قوانین کشف کیے جائیں جو عالم طبیعت پر حاکم ہوں یا ایسے موجودات سے پردہ اٹھایا جائے جو صدیوں سے انسانی حس کی دسترس سے دور تھے۔ جو بھی ہو سب غیب کی آگاہی کی قسمیں ہیں۔

مثلاً ایک زمانہ تھا کہ انسان مرکز کی طرف کشش اور اس سے گریز کے قوانین [3] سے آگاہ نہیں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ بغیر ستون کے منظومہ شمسی، سب کہکشائیں اور تمام ستارے ان دو قوانین پر استوار ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دو اور دیگر قوانین جن کو انسان نے بعد میں کشف کیا ہے، تمام غیب کی اقسام ہیں۔

قرآن نے اس قسم کے قوانین کی خبر دی ہے اور فرمایا ہے:

اللّٰہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونها۔ [4]

''وہ خدا ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ اس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے اٹھایا ہے۔''

یہ غیب سے خبر کی ایک قسم ہے اور اس زمانے کے افراد سے پوشیدہ ایسی خبریں خود ایک جہت سے قرآن کا معجزہ شمار ہوتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب انسان کو جراثیموں، خلیوں، سالموں اور ایٹموں کا علم نہ تھا۔ اسی طرح اس کے حواس سے بہت دور مثلاً کہکشاؤں، بادلوں اور ان کی کیفیات سے بھی وہ آگاہ نہیں تھا۔ اگر قرآن اور معصومین علیہم السلام کے کلام میں اس قسم کے مسائل کے بارے میں نکات پائے جاتے ہیں تو یہ سب ایک طرح سے غیب کی خبر دینا شمار ہوگا۔ لیکن جب انسان نے تجربات کیے اور مائیکروسکوپ اور ٹیلی سکوپ کو ایجاد کیا اور ان کے ذریعے سے انسانی حواس کی پہنچ سے دور قوانین اور موجودات کو کشف کر لیا تو اب یہ سب چیزیں عالم غیب میں شمار نہیں ہوتیں، بلکہ انسان کے علم و دانش کے دائرے میں اور انسانی حواس کی دسترس میں ہیں۔ جن چیزوں کو ابھی تک انسان نے کشف نہیں کیا یا جن قوانین سے ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا پایا یا ایسے موجودات جن کو جدید ترین آلات سے لیس آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا۔ جب تک انسان اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان سے

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۳

[2] فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾ (سورہ ق آیت ۲۲)

[3] LAWS OF ATTARCTION AND REPULSION

[4]

پردہ اٹھانے کے قابل نہیں ہو جاتا یہ سب اسی طرح غیبی موجودات ہی شمار ہوں گی۔

۳۔ ماضی یا مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے غیبی واقعات:

آپ فرض کریں کہ کسی کے گھر میں ایک واقعہ رونما ہوا۔ اس کے بارے میں صاحبِ خانہ کا علم حسی ہے اور غیب کا علم نہیں اور جب یہی شخص اس واقعہ کو دوسرے افراد، جو اس مقام پر موجود نہیں تھے، سے بیان کرے تو اس نے کوئی غیب کی خبر نہیں دی۔

لیکن اگر کسی نے اس واقعہ کو نہ تو خود دیکھا ہو نہ ہی کسی سے سنا ہو، نہ کسی کتاب و رسالہ میں، نہ کسی اخبار میں اس نے پڑھا ہو، نہ ہی اجتماعی روابط کے ذریعے اس سے آگاہ ہوا ہو اور نہ ہی قرائن نے اس واقعے سے آگاہ ہونے میں اس کی مدد کی ہو، اب اگر اچانک وہ شخص ہمیں اس واقعہ سے یقین کے ساتھ مطلع کرے تو یہ غیب کی خبر ہو گی۔ لہٰذا قرآن کی گذشتہ امتوں کے بارے میں ایسے رسول کے ذریعے خبریں دینا جس نے نہ تو کسی سے پڑھا ہے اور نہ ہی ان مطالب کو کسی سے سنا ہے، غیب کی خبر ہو گا۔ یقیناً ایسی خبریں وحی قرآن کے راستے سے آپ ؐ تک پہنچتی ہیں۔ تاہم ممکن ہے کہ رسول ؐ گذشتہ امتوں کے بعض واقعات سے قرآنی وحی کے ذریعے آگاہ ہوں اور انہیں امت سے بیان کریں اور سنت و روایات میں گذشتہ امتوں سے مربوط۔

جو کچھ بیان ہوا ہے وہ انہی غیبی واقعات سے مربوط ہے۔ مستقبل کے بارے میں ایسی غیبی خبریں ماضی سے متعلق خبروں کی طرح غیب کا علم ہیں۔

پیشگوئی اور علم غیب میں فرق

مستقبل کے بارے میں خبر دینے کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے قرائن موجود نہ ہوں جن سے مدد لی جا سکتی ہو ورنہ ایسی خبر غیبی نہیں ہو گی بلکہ انسان کی فکر اور اس کی سوچ بچار کا بلاواسطہ نتیجہ ہو گی۔

بعض لوگ حکومتوں اور ملتوں کے حالات سے خاص معلومات کے ذریعے دنیا کے مستقبل کے بارے میں جنگ و جدل یا صلح و آشتی کے حوالے سے پیشگوئیاں کرتے ہیں اور ایسی خبروں کو شائع کرتے ہیں۔

مختلف قرائن، معلومات اور ڈپلومیٹک روابط کے ذریعے حاصل کی جانے والی خبریں ہرگز غیب کی خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی تمام اطلاعات ایک لحاظ سے عالمی حالات سے نتیجہ اخذ کرنا اور آگاہ کرنا ہے۔

اگر ان معلومات کو ان سے لے لیا جائے تو دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں اور سفارت کاروں میں اور ایک عام شخص میں کوئی فرق نہیں رہے گا چونکہ ایسی آگاہی سابقہ حالات سے نتیجہ اخذ کرنا ہے نہ کہ عالم بالا کی طرف سے القاء اور الہام ہے۔ اسی لیے کبھی کبھار ان کے تجزیات اور اقوال غلط اور جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔

اقتصادی، مالیات اور زراعت کے ماہرین اپنے اپنے مخصوص شعبے میں سابقہ طولانی تجربات اور دقیق معلومات کی بناء پر مستقبل کی پیشگوئیاں کرتے ہیں اور جو وقت گزرنے کے ساتھ سچی اور درست ثابت ہو جاتی ہیں جبکہ ان میں سے کسی ایک کو بھی تیسری آگاہی یا علم غیب نہیں

کہا جاتا کیونکہ ان تمام خبروں کی بنیاد سوچ وبچار اور محسوسات پر ہے اور جو شخص بھی اس راستے کو اختیار کرے وہ اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے۔

غیب کا علم ان تمام قرائن اور بنیادی اصولوں سے بالاتر ہونا چاہیے اور عام اسباب اور مروجہ علمی طریقوں سے حاصل نہیں ہونا چاہیے۔

مثال کے طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآنی وحی کے ذریعے رومیوں کی ایرانیوں پر تھوڑی مدت کے بعد دوبارہ فتح کی یقینی اور قطعی طور پر خبر دی تھی اور فرمایا تھا:

وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ [1]

''ان کو شکست کے بعد بہت کم مدت ۳ سے ۹ سال میں دوبارہ فتح دے گا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر کی سند وحی الٰہی کے سوا کوئی اور نہ تھی اور آپؐ نے اس علم کو عام اسباب اور طریقوں سے حاصل نہیں کیا تھا، مثلاً دونوں قوموں کی فوجی طاقت کا موازنہ، ان کے فوجیوں اور افسروں کے جذبات اور حوصلے کا جائزہ وغیرہ۔ آپؐ نے یہ خبر حجاز کے ایسے ماحول میں لوگوں کو سنائی جو بیرونی دنیا سے کٹا ہوا تھا، رابطے کے وسائل سے محروم تھا اور جہاں پر فوجی اور سیاسی معلومات کا تبادلہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ایسی غیبی خبریں زندہ وجاوید قرآن کے اعجاز کا ایک پہلو شمار کی جاتی ہیں۔

لٰہذا نجومیوں اور مختلف ممالک کے محکمہ موسمیات کی پیشگوئیاں یہ سب کی سب ہماری گفتگو کے دائرے سے خارج ہیں کیونکہ انہوں نے یہ سب نتائج اور معلومات خاص علمی تجربات، معلومات اور نظریات کے تبادلے کے ذریعے حاصل کیے ہیں اور یہ دروازہ ہر کسی کے لیے کھلا ہے جو بھی اس میں داخل ہونا چاہے۔

علم غیب کی علل

علم غیب جس کو تیسری معرفت یا آگاہی سوم کا نام دینا چاہیے بغیر کسی علت کے نہیں ہے۔ ایسی آگاہی علت ومعلول کے قانون سے ہرگز مستثنیٰ نہیں ہے اور نہ ہی اس فکر کو ذہن میں لانا چاہیے کیونکہ علت ومعلول کے قانون سے کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہوسکتی ہے۔

جو چیز سمجھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس علم کی عام اور طبیعی علت نہیں ہے بلکہ غیر معمولی اور غیر طبعی علتوں کے ذریعے سے شخص آگاہ کے ذہن میں داخل ہوتا ہے۔ اب ہم اس علم وآگاہی کی بعض غیر طبعی علتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ وحی کے ذریعے سے: کبھی نبی کے علم کا سرچشمہ وحی الٰہی اس معنی میں ہوتا ہے کہ لفظ اور معنی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو دیے گئے ہیں۔ قرآن کی تمام غیبی خبروں کا مجموعہ اسی قسم سے ہے خواہ وہ ماضی یا مستقبل کے واقعات ہوں یا اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات ہوں یا عالم برزخ اور قیامت کے حالات ہوں۔ یعنی یہ تمام ایسا غیب ہیں کہ جس کے الفاظ ومعانی ہردو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ یہ مطلب اس صورت میں بہت واضح اور روشن ہو جاتا ہے جب ہم وحی کو مطلقاً ایک ایسا غائب سمجھیں کہ جو صرف انبیاء کو عطا کیا جاتا

[1] سورہ روم آیت ۳۔۴

ہے لیکن اگر وحی سے تمام وحی کی گئی چیزیں مراد لیا جائے تو اس وقت خود یہ قسم وحی، عام علوم اور طبیعی طریقوں کی قلمرو سے خارج ہو جائے گی بلکہ ان معنوں میں غیب موکد ہوگا۔ ریاضی دانوں کی اصطلاح میں غیب دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک لحاظ سے وحی اور فرشتے کی آواز سننا غیب سے آگاہی کی ایک قسم ہے جو کہ ہمارے حواس کی دسترس سے باہر ہے جبکہ دوسرے لحاظ سے وحی کیے گئے مطالب حواس سے پوشیدہ رازوں سے آگاہی ہیں۔ پہلے غیب اور دوسرے غیب میں فرق کو سمجھنے کے لیے درج ذیل مثال کو ملاحظہ فرمائیں۔ قرآن مجید ایک مقام پر فرماتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِؕ‏ ۝١ اَلَمۡ يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍۙ‏ ۝٢ [1]

''کیا تم نے دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا، کیا ان کی تمام تدبیریں غلط نہیں کردیں۔''

ایسی آیات اس نظر سے غائب ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے الفاظ اور معانی کو عام وسائل کے بغیر مقام ربوبیت سے اصل کیا۔ لیکن اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ ہرگز غیب کی خبر نہیں اور نہ ہی اس میں کسی پوشیدہ راز سے پردہ اٹھایا گیا ہے، کیونکہ حجاز کے لوگ ہاتھی والوں کے لشکر کے واقعہ سے آگاہ تھے بلکہ آیات کے نزول کے وقت کچھ لوگ ایسے بھی موجود تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے ہاتھی والوں کو تباہ ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن روم کی دوبارہ فتح سے مربوط آیت میں دوسرا غیب بھی کارفرما ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے لوگوں سے پوشیدہ راز سے پردہ اٹھایا ہے اور مستقبل میں رونما ہونے والے ایک واقعہ سے ان کو آگاہ کیا ہے۔

۲۔ فرشتے کے ذریعے: کبھی ایک فرشتہ انسانی شکل بدل کر انبیاء اور اولیاء الٰہی کو حواس سے پوشیدہ امور سے آگاہ کرتا ہے۔ مثلاً:

(الف) حضرت مریمؑ ایک فرشتے (جو انسانی شکل میں ان کے پاس آیا تھا) سے گفتگو کے نتیجے میں اس بات سے آگاہ ہوئیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں خاص صفات کا حامل ایک بیٹا عطا فرمائے گا۔ [2]

(ب) جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو تباہ کرنے کے لیے بھیجے گئے دو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس ٹھہرے تو حضرت ابراہیمؑ اور ان کی بیوی ان سے گفتگو کے ذریعے آگاہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس بڑھاپے اور پیری کی حالت میں فرزند عطا فرمائے گا۔ [3]

(ج) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان نے انسانی صورت میں مجسم ہو کر آنے والے فرشتوں کے ذریعے یہ جانا کہ اس دن آدھی رات کو قوم لوط نابود ہو جائے گی اور یہ بھی کہ حضرت لوطؑ کی بیوی بھی انہی نابود ہونے والوں میں سے ہوگی۔ [4]

---

[1] سورہ فیل آیت ۱، ۲

[2] سورہ مریم آیت ۱۹، ۲۰

[3] سورہ ہود آیت ۷۱، ۷۲

[4] سورہ ہود آیت ۷۴ تا ۷۶

یہ چند مثالیں نمونے کے طور پر بیان کی گئی ہیں ورنہ قرآن میں ایسی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔اس طرح کا علم و آگاہی جو فرشتوں کے مجسم ہونے کے ذریعے اولیاء الٰہی کو عطا کیا جاتا ہے غیب کے علم کا ایک نمونہ ہے کہ جس سے عام افراد محروم ہیں۔

۳۔ سچے خواب غیب سے آگاہی کے دیگر ذرائع میں سے ایک ہیں۔ان کی مثالیں آپ آئندہ ملاحظہ کریں گے۔

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب کے ذریعے آگاہ ہوئے کہ خدا کی طرف سے ان کو اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ان کو اپنے خواب پر اس قدر ایمان تھا کہ اس کے تمام مقدمات فراہم کر دیے۔[1]

حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام تعبیر خواب کے علم کے ذریعے سے واقعات کی پیشگوئیاں کرتے تھے اور جس سے پوشیدہ امور کی خبریں دیتے تھے۔اس کی شرح آئندہ آئے گی۔اسلامی محققین پیغمبروں کے سچے خوابوں کو وحی کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔

۴۔ القاء روح: کبھی حواس سے پنہاں چند حقائق روح پر الہام ہوتے ہیں۔اچانک روح کی فضا ایسی روشن ہو جاتی ہے کہ انسان یقین پیدا کر لیتا ہے کہ جس چیز کو اس نے پایا ہے وہ صحیح اور درست ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی والدہ اپنے بیٹے کے لیے سخت بے چین تھیں کہ اچانک ان کو الہام ہوا کہ اپنے بیٹے کو ایک صندوق میں ڈال کر دریائے نیل کے سپرد کر دیں اور ان کے انجام کے بارے میں فکر نہ کریں۔کیونکہ:

اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝[2]

ترجمہ: ''یقیناً ہم اسے تیری طرف پلٹا دیں گے اور اسے رسولوں میں سے قرار دیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے جن کی روحیں پاک اور صاف ہیں، ہر قسم کی مادی آلودگیوں سے دور اور تقویٰ و پرہیزگاری سے معمور ہیں، خدا کا یہ لطف وعنایت اُن کے شامل حال ہوتا ہے اور ہم نے خود اپنی زندگی کے دوران میں ایسے افراد کو دیکھا ہے اور اُن سے ایسی چیزیں سنی ہیں جو انسان خدا کے بندوں کے مقام کی معرفت رکھتا ہے وہ اس قسم کے الطاف اور رحمت پر شک نہیں کرتا۔

پیغمبروں، آئمہ معصومین، پرہیزگار اور متقی بندوں کو حواس سے مخفی رازوں سے آگاہ کرنے کے لیے یہ مختلف راستے اور طریقے ہیں۔ ان میں سے بعض راستے پیغمبروں اور وحی کے حامل افراد سے مخصوص ہیں اور بعض دوسرے ایک طرح کی نسبی عمومیت رکھتے ہیں۔[3]

آخر میں ہم ایک نکتہ کی طرف آپ کی توجہ دلاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ:

ہماری بحث کا موضوع یہ نہیں کہ انبیاء کے علم کی بنیاد پہلا راستہ ہے یعنی ہم یہ ثابت کرنا نہیں چاہتے کہ انبیاء کو وحی ہوتی تھی جو کہ خود غیب کے علم کی ایک قسم ہے۔ہم یہ بھی نہیں کہنا چاہتے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مثلاً وحی قرآنی کے ذریعے غیب کے کچھ رازوں سے

---

[1] سورہ صافات آیت ۱۰۲

[2] سورہ قصص آیت ۷ ترجمہ: ''یقیناً ہم اسے تیری طرف پلٹا دیں گے اور اسے رسولوں میں سے قرار دیں گے۔''

[3] اصول کافی ج ۱ ص ۱۷۶ میں اس راستے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

آ گاہی کی ہے جیسا کہ قرآنی وحی کے راستے رومیوں کی دوبارہ فتح و کامیابی سے آ گاہ ہوئے کیونکہ غیب سے اس قسم کی آ گاہی کا اہل مذہب میں سے کوئی بھی منکر نہیں کہ ہم اس پر بحث اور گفتگو کریں۔

ہماری بحث کا موضوع یہ ہے کہ انبیاء اور اولیائے خدا ان طریقوں سے جن کے اصولوں کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، جس سے کچھ امور سے آ گاہ ہوتے ہیں اور امت کے سامنے بیان کرتے ہیں اور اس ذریعے سے عالم غیب سے اپنے رابطہ کو ثابت کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص پیغمبرؐ اسلام کی جانشینی کا دعویٰ کرے اور اس کے ساتھ ایسی غیب کی خبریں بھی دے تو یہ غیبی خبریں اس کے دعویٰ کی حقانیت پر موثر و مددگار ہوسکتی ہیں اسی لیے اسلام کے علماء، دانشوروں اور محققین کا ایک گروہ امام کی غیب سے آ گاہی کو اس کی فضیلت اور برتری کی علامت سمجھتا ہے اور اس کے دعویٰ خلافت کی حقانیت پر شاہد تسلیم کرتا ہے۔

''انسان اور علم غیب''

آج کل لفظ سپر برسرِ زبان عام ہے اور سپر طاقت اور سپر مین جیسے الفاظ اخبارات و رسائل میں دیکھے بلکہ روزانہ لوگوں کی گفتگو میں سنے جاتے ہیں۔ اسی مناسبت سے ہم نے حواس سے بالاتر آ گاہی کے لیے ''سپر آ گاہی'' کے الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔

ہر انسان کی زندگی کا آغاز آ گاہی سے ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ آ گاہی کے محیط میں داخل ہوتا ہے اور بتدریج ذہنی دنیا سے بیرون دریچہ پیدا کرتا ہے۔

انسان سب سے پہلے ظاہری حواس کے ذریعے حقائق کا ادراک کرتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کی عقل اور فکر تکامل کے مرحلے پر پہنچ جاتی ہے تو پھر انسان آہستہ آہستہ حس اور لمس کے دائرے سے باہر کے حقائق سے آشنا ہوتا ہے اور نتیجے کے طور پر وہ عقل و استدلال سے کام لینے لگتا ہے اور کچھ کلی حقائق اور علمی قوانین سے آ گاہ ہوجاتا ہے۔

بعض اوقات انسانوں کے درمیان سپر آ گاہی رکھنے والے افراد مل جاتے ہیں کہ جو الہام کے ذریعے کچھ ایسے مطالب سے آ گاہ ہو جاتے ہیں کہ ان کو دلیل و برہان کے طریقے سے کشف نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا دانشوروں نے انسان کے ادراک کو ان تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ عام لوگوں کا ادراک ۲۔ عقلمند اور مفکر افراد کا ادراک

۳۔ اہل بصیرت اور عرفاء کا ادراک

تو گویا عام لوگ حواس کی مدد سے، مفکر افراد دلیل و برہان کے ذریعے اور عرفاء الہام اور اس جہان سے بالاتر روشنی کی مدد سے حقائق کو کشف کرتے ہیں۔

نوابغ دنیا، فلاسفہ اور دانشور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی بیشتر ایجادات اور افکار اُن الہام بخش اور نورانی تجلیوں کے باعث ہیں جو ان کے ذہنوں میں اتریں۔ اس کے بعد انہوں نے تجربات یا دلیل و برہان کے ذریعے ان کی تکمیل اور تحقیق میں قدم

آگے بڑھائے۔

معرفت کے تین راستے (طریقے)

اس بات سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے سامنے اپنے مقصود تک پہنچنے کے لیے تین راستے ہیں۔ عام لوگوں کی اکثریت پہلے راستے، کچھ لوگ دوسرے راستے اور لوگوں کی ایک قلیل تعداد جس کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے اپنے روحانی کمال کے باعث تیسرے راستے سے استفادہ کرتے ہیں۔

ا۔ تجربے اور حواس کا راستہ

اس قسم سے مراد وہ ادراکات اور معلومات ہیں جو بیرونی حواس کے ذریعے سے ذہن کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً جانے والی، سنی جانے والی، سونگھی جانے والی اور چکھی جانے والی چیزیں خاص اعضاء کے ذریعے ہمارے ذخیرہ معلومات میں قرار پاتی ہیں۔ اس دور میں ٹیلی سکوپ، مائیکروسکوپ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجادات نے انسانی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے اور اس کو دور و نزدیک کے فاصلوں پر مسلط کر دیا ہے۔

۲۔ عقل اور برہان

مفکرین عالم اپنی فکر و عقل کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف علوم میں بدیہی، مسلم اور واضح مقدمات کے ذریعے سے حواس سے بالاتر کچھ کلی قواعد اور قوانین کشف کرتے ہیں اور معرفت و کمال کی چوٹیوں کو تسخیر کرتے ہیں۔ تمام علمی قوانین کلی حیثیت سے خدا کی صفات اور افعال سے مربوط علمی اور فلسفی مسائل اور عقائد و مذہبی علوم میں زیر بحث آنے والے مسائل، یہ سب عقلی صلاحیتوں کی پیداوار ہیں اور انسان کی عقلی قوتوں کو بروئے کار لانے کا نتیجہ ہیں۔

۳۔ الہام و اشراق کا راستہ

حقیقت شناسی کی یہ تیسری راہ حس و تعقل کی قوتوں سے ماوراء ہے۔ یہ ایسی حقیقت شناسی ہے جس کا علم و دانش کی نظر سے امکان نا قابل انکار البتہ محدود مادی تصور کائنات ایسے غیر حسی اور غیر عقلی ادراک کو قبول نہیں کر سکتا، لیکن سائنسی اصولوں کی بنیاد پر اس سے انکار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

ایک ماہر نفسیات کے کہنے کے مطابق قابل تجربہ اشیاء حواس کے ذریعے پہچانی جا سکتی ہیں۔ عقلی پہلو رکھنے والی چیزیں منطق اور ریاضی کے اصولوں کے ذریعے ادراک کے مرحلہ کو پہنچتی ہیں اور آخر کار انسان اشراق و الہام کے وسیلہ سے اور ماوراء حس و استدلال تجلیوں کی مدد سے اور برق آسا نورانی بصیرت کے سبب مقام روایت تک جا پہنچتا ہے۔ ان نورانی تجلیوں کا حامل ایک نابغہ انسان کا ذہن حساس ہوتا ہے۔

مشہور ماہر نفسیات پروفیسر سوزکین SOZOCANE ان افراد میں سے ایک ہے جس نے حقیقت شناسی کے تین راستوں کی تصدیق کی ہے اور وہ عرفانی ادراک یعنی الہام کے لیے خصوصی مقام ومنزلت کا قائل ہے۔ وہ صریحاً یہ کہتا ہے: ''اس راہ کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کی تحقیر نہیں کی جا سکتی۔ کیا بڑے ادیان کی وسیع تعلیمات کو مادی نظام کی کم عقلوں کی تقلید کرتے ہوئے ناچیز اور خالی از حکمت خیال کیا جا سکتا ہے اور کیا ان کی اہمیت کا انکار کیا جا سکتا ہے؟''

اس بناء پر تین طرح سے معرفت کو نام دیے جا سکتے ہیں:

۱۔ راہِ حس یا آگاہی حس

۲۔ راہِ عقل یا آگاہی عقل

۳۔ راہِ الہام یا آگاہی دل

اس دور میں علم نفسیات نے الہام کو ایک نفسی حقیقت کے طور پر قبول کیا ہے اور اس کی یوں تعریف کی ہے: ''ناگہانی ادراک، اچانک اور بدونِ مقدمہ کی آگاہی وبصیرت کہ جو بجلی کی طرح صفحۂ ذہن پر چمکتا ہے کہ اس طرح سے اکثر اس سے پہلے اس کے بارے میں ہرگز سوچا تک نہیں ہوتا۔''

الہام کی سائنسی ایجادات میں اہمیت اور تاثیر کی سائنسدانوں نے تائید کی ہے۔

البرٹ آئن سٹائن ELEBERT EINSTEIN ۱۸۷۹ء میں اس دنیا میں آیا اور ۱۹۵۵ء میں انتقال کیا۔ وہ بہت سے فلاسفہ اور عرفاء سے ہم آہنگ بعض علمائے اسلام کی طرح الہام کو علوم ومعارف کی کلید سمجھتا ہے۔ وہ الہام کو سائنسی ایجادات میں ایک اہم عامل سمجھتا ہے۔

۱۹۳۱ء میں کیمسٹری کے دو امریکی سائنسدانوں یلات YELLAT پیکر PACKER نے الہام کی سائنسی مشکلات کے حل اور کشف میں اہمیت کے بارے میں تحقیق کے لیے ایک سوالنامہ کیمسٹری کے کچھ سائنسدانوں کے درمیان تقسیم کیا اور اس سے نہایت قیمتی نتائج حاصل کیے۔

ایک سائنسدان نے اس سوال کا یوں جواب دیا: ''میں نے ایک مسئلے کے حل کے لیے بہت محنت اور فکر کی، لیکن اس کی بہت زیادہ مشکلات اور ابہامات کی وجہ سے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب مکمل طور پر اس سے مربوط کام اور افکار کو چھوڑ دوں۔ دوسرے دن جب ایک اور کام میں سخت مصروف تھا تو اچانک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک بات آئی اور یہ اس مسئلے کا حل تھا جس نے مجھے بالکل مایوس کر دیا تھا۔''

اسی قسم کی بات فرانسیسی ریاضی دان ہنری پوانکارہ (۱۸۵۴ـ۱۹۱۲ء) اور بہت سے ریاضی اور فزکس کے سائنسدانوں سے نقل ہوئی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بہت سے سائنسی الہامات جو کہ اہم حقائق کے کشف کا سبب بنے ہیں نہ صرف سائنسدانوں کی مصروفیت اور تمرکز فکری کے زمانے سے مربوط نہیں تھے، بلکہ ان کے مخصوص شعبہ مہارت سے بھی ان کا نزدیکی رابطہ نہیں تھا۔ اس کا منہ بولتا ثبوت لوئی پاسچر (۱۸۲۲ـ۱۸۹۵ئ) کا مائیکروب کشف کرنا ہے باوجود اس کے کہ وہ کیمسٹری میں مہارت رکھتا تھا۔

الہام اور الکسیس کارل

عصر حاضر کے دانش وروں میں الکسیس کارل، الہام کی خاص اہمیت کا قائل ہے۔ اس کا اس پر اعتقاد ہے کہ اہل بصیرت اپنے حواس کی مدد کے بغیر دوسروں کے افکار کو جان لیتے ہیں اور مکان و زمان کے لحاظ سے دور واقعات کو کم بیش دیکھتے ہیں۔ وہ اس کو ایک استثنائی نعمت قرار دیتا ہے کہ چند افراد کے علاوہ باقی اس کے متحمل نہیں ہیں۔ اس نامور دانشور نے اس بحث میں سائنسی اور یقینی مطالب کو غیر یقینی مسائل و مطالب سے الگ کرنے کی کوشش کی ہے اور انسان کو ایک ایسے مطالعات اور تجربات کے مجموعے کی مانند دیکھنے کی سعی ہے جو تمام ادوار میں اور تمام ملکوں میں زیر نظر رہا ہے اور جو کچھ اس نے لکھا ہے یا دیکھا ہے یا اپنے ساتھی دانشوروں سے حاصل کیا ہے اس بنا پر وہ انسان کی فعالیت کی بہت سی شکلوں کا مطالعہ کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

یہاں پر ہم اس دانشور کے نظریۂ الہام سے قارئین کی بیشتر آگاہی کے لیے اس کی گفتگو کا خلاصہ نقل کرتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ: ''یقیناً سائنسی انکشافات صرف انسانی فکر کا اثر اور حاصل نہیں ہیں۔ نابغہ افراد واقعات کے ادراک اور مشاہدہ کی قوت کے علاوہ دوسری خصوصیات مثلاً اشراق کے حامل بھی ہیں۔ وہ اشراق کے ذریعے دوسروں سے پوشیدہ رازوں کو پا لیتے ہیں۔ وہ ایسے واقعات، جو ظاہراً آپس میں مربوط نہیں، کے درمیان مجہول روابط کو دیکھ لیتے ہیں اور پوشیدہ خزانوں کو اپنی فہم و فراست سے دریافت کر لیتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے انسان اشراق کی نعمت سے بہرہ مند ہیں اور جس چیز کا جاننا ضروری ہو وہ بدونِ دلیل و تحلیل اس کو جان لیتے ہیں مثلاً ایک حقیقی منتظم اپنے ملازموں کے انتخاب کے لیے خفیہ رپورٹوں اور ذہنی آزمائش کے وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح ایک بہترین قاضی مقدمے اور قانون کے جزئیات کی طرف توجہ کیے بغیر بلکہ بعض اوقات، کاردوزو، (ایک فلسفی کا نام) کے بقول غلط رپورٹ کے باوجود صحیح فیصلہ کر سکتا ہے۔ ایک بڑا سائنسدان خود بخود جدید دریافت کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے الہام کہا جاتا ہے۔

علماء اور دانشور دو قسم کے ہو سکتے ہیں، ایک قسم منطقی اور دوسری قسم اشراقی۔ علوم کی ترقی ان دونوں کی مرہون منت ہے۔ علوم ریاضی جن کی اساس و بنیاد مکمل طور پر منطقی ہے، اس میں اشراق کا بھی ایک حصہ ہے۔ ریاضی دانوں میں اشراقی اور منطقی دونوں پائے جاتے ہیں۔ ''ہرمیٹ'' اور ''ایرسٹراس'' اشراقی تھے جب کہ ''برٹران'' اور ''ریمان'' منطقی تھے۔

روشن ضمیر افراد اپنے حواس کی مدد کے بغیر دوسروں کے افکار کو جان لیتے ہیں اور زمان و مکان کے لحاظ سے دور واقعات کو کم و بیش دیکھ لیتے ہیں اور بعض واقعات اور اشیاء کے بارے میں حواس کے ذریعے سے حاصل شدہ معلومات سے زیادہ اطمینان بخش معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ایک روشن ضمیر فرد کے لیے دوسرے شخص کے افکار کو پڑھنا اس کے چہرے کی توصیف کی طرح آسان ہے۔ لیکن جو کچھ ان کے شعور میں ہوتا ہے اسے ''دیکھنے'' اور ''حس کرنے'' کے الفاظ سے پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جہاں وہ کوشش نہیں کرتا وہاں دیکھتا نہیں بلکہ فقط جانتا ہے۔ بہت سے ایسے مواقع کہ جہاں پر انسان کو موت یا کوئی بہت بڑا خطرہ درپیش ہوتا ہے، اس کے اور دوسرے فرد کے مابین ایک طرح کا ارتباط قائم ہو جاتا ہے اور جو بستر مرگ پر پڑا ہوتا ہے یا حادثے کا شکار ہو جاتا ہے، لحظہ بھر کے لیے اپنی عام شکل میں اپنے قریبی دوستوں میں

سے وہ شخص کسی کو دکھائی دیتا ہے۔ زیادہ تر یہ خیالی تصور خاموش رہتا ہے اور کبھی بات بھی کرتا ہے اور اپنی موت کی خبر دیتا ہے۔ نیز کبھی ایک صاحب بصیرت شخص بہت دور سے ایک شخص یا ایک منظر یا ایک واقعہ کو دیکھ سکتا ہے اور اس کو بالکل صحیح طور پر مجسم کر کے بیان کر سکتا ہے۔ ایسے افراد بہت ہیں جو اپنی عام زندگی میں روشن ضمیر نہیں ہیں لیکن پوری زندگی میں ایک یا دو بار اس قسم کے رابطوں کا تجربہ کر چکے ہیں۔

اس ترتیب سے باہر کی دنیا سے آگاہی کبھی حواس کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی میسر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دور دراز کے فاصلے پر موجود دو انسانوں کی فکر آپس میں بلاواسطہ مربوط کر سکتی ہے۔ ایسے مسائل کا مطالعہ جدید ماوراء الطبیعات کے ذمے ہے۔ اس کو جیسا ہے ویسا قبول کرنا چاہیے کیونکہ یہ حقائق کا حامل ہے اور انسان کے ایسے بہت سے پہلوؤں سے آگاہ کراتا ہے جو ابھی تک خوب اچھی طرح نہیں پہچانے گئے اور شاید یہ بہت سے افراد کو فوق العادہ روشن ضمیر کی علت کو ہمارے لیے روشن کر دے۔[1]

لہٰذا حسی اور عقلی ادراک دو وسیلے ہیں کہ جن کے ذریعے سے روح انسانی کے لیے جہان خارج کے ایک حصے پر تسلط ممکن ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کی روح کے لیے ایک اور نا قابل تعریف وسیلہ بھی ہے جو جہانِ خارج سے اس کے ارتباط کو برقرار رکھتا ہے اور ان سب امور کا نتیجہ مندرجہ ذیل ہے جس کی سب علماء اور سائنسدان تصدیق کرتے ہیں:

۱۔ سائنسی تحقیقات صرف انسانی فکر کا نتیجہ اور ماحصل نہیں۔ نابغہ افراد واقعات کے ادراک اور مشاہدے کی قوت کے علاوہ الہام کی قوت سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

۲۔ اہل بصیرت افراد اپنے حسی اعضاء کے توسط کے بغیر دوسروں کے افکار کو اس حد تک جان لیتے ہیں کہ ان کے لیے دوسرے شخص کے افکار کو جاننا اس کے چہرے کے اوصاف کو بیان کرنے کی طرح آسان ہے۔

۳۔ موت یا خطرے کے وقت دو افراد کے درمیان ایک رابطہ برقرار ہو جاتا ہے اور بستر مرگ پر پڑا ہوا شخص اپنی حامل شکل میں ایک لمحے کے لیے اپنے کسی دوست کو دکھائی دیتا ہے۔

۴۔ اہل بصیرت شخص دور دراز کے فاصلے سے ایک منظر یا شخص یا واقعہ کو دیکھ سکتا ہے اور اس کو بالکل صحیح طریقے سے بیان کر سکتا ہے۔

شہود اور برگسن کا فلسفہ

مغربی دانشور میں سے 'برگسن' (۱۸۵۹-۱۹۴۱) نے دوسرے افراد سے زیادہ شہود کی اہمیت دی ہے، اس حد تک کہ اس کے نظریے کے مخالفوں نے اس کو عقل و استدلال کی ضد کا مظہر قرار دیا ہے اور کچھ افراد نے اس کو آئیڈیالسٹ (Idealist[2]) کہا ہے۔ اس طرح کی حق کشی علم کی

---

[1] کتاب ''انسان موجود ناشاختہ'' ص ۱۳۵-۱۳۷

[2] آئیڈیلیزم (Idealism) کے حامیوں کو کہتے ہیں۔ یہ ایک فلسفی عقیدہ ہے اور کچھ حقائق کا انکار کرتا ہے، یعنی خیال پرستی۔ اس کے مقابلے میں (Raalism) یعنی حقیقت پرستی اور حقیقت جوئی ہے۔ (مترجم)

تاریخ میں فروان ہے۔اس نے دوسرے دانشوروں کی طرح شہود کو حس اور عقل کے ساتھ ساتھ شناخت اور حصول علم کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔

بے جا غرور

علم غیب اور الہام سے انکار کا سب بے جا غرور ہے کہ جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مادہ پرستوں کو دامنگیر ہوا۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے اور عالم ہستی میں اب کوئی چیز ان کے لیے مجہول باقی نہیں رہی، اس جہان کی تمام پیچیدگیوں کو انہوں نے حل کر لیا ہے، انہوں نے تمام طبیعی موجودات کی علتوں کو کشف کر لیا ہے اور دریافت کیا ہے کہ ہر واقعے کی مادی علت ہے۔

اس قسم کے علمی غرور کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہر چیز سے بے اعتنائی کی اور جو کچھ پہلے والے لوگوں نے یادگار کے طور پر چھوڑا تھا اس کو شک وشبہ بلکہ کبھی تو انکار کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

بیسویں صدی میں یہ غرور ٹوٹ گیا یا اس کی شدت میں کمی آ گئی۔ آہستہ آہستہ انسان آگاہ ہوا کہ ابھی تک بہت سے موزِ خلقت جہالت کے پس پردہ باقی ہیں اور ابھی تک عالم خلقت کے تعجب انگیز رازوں کی بہت بڑی تعداد انسان پر فاش نہیں ہوئی۔

نمایاں علمی شخصیات اور محققین نے علم و دانش کے میدان میں ان جزئی کامیابیوں سے فریب نہیں کھایا اور نہ ہی اس چیز سے جرأت اور جسارت سے انکار کیا ہے جس کی درستی یا نادرستی ثابت نہ ہوئی ہو اور وہ علوم کے دائرے میں نہ آئی ہو۔

اسرار آمیز عالم غیب

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر لطف ورحمت کی بنا پر عالم غیب کے کچھ دریچوں کو کھلا رکھا ہے تاکہ سب سمجھ لیں کہ غیب سے آگاہی محال اور غیر ممکن نہیں، بلکہ انسان کا غیب پر تسلط ایک ایسا امر ہے جو سو فیصد ممکن ہے اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ مثلاً:

ا۔ حیوانات پر وحی

حیوانات کے حیرت انگیز افعال جن کے بارے میں علم حیوانات ZOOLOGY کی کتب میں تفصیل کے کے ساتھ بحث کی گئی ہے، حیوانوں میں الہام کے موجود ہونے کی واضح مثال ہے۔

حیوانوں کے حیران کن کاموں کی عقل وفکر کے ذریعے تو جیہہ نہیں کی جا سکتی، مثلاً ان کی تقسیم کار، ذمہ داری کا انتخاب، فاقد عضو کو بنانا اور زندگی کی تمام ضروریات سے آگاہی وغیرہ۔ کیونکہ یہ بات بدیہی ہے کہ حیوان عقل وفکر کی قوت سے محروم ہیں۔ اسی طرح ان کے اندرونی نظام اور بیرونی اعضا کو ان کے کاموں کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ایک چیز کی طبیعی اور کیمیائی خواص کی ترکیب جدید اور نئے امور کی انجام دہی کے لیے کفایت نہیں کرتی ہے، مثال کے طور پر تقسیم کار، ذمہ داری کا انتخاب، ضائع ہونے والے اعضاء کو دوبارہ بنانا اور ماحول سے مطابقت وغیرہ۔

ممکن ہے ایک کیلکو لیٹر CALCULATOR اتنا جدید اور منظم بنایا گیا ہو کہ جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم کے امور کو سو فیصد صحیح انجام

دے، لیکن یہ کیلکو لیٹر ہرگز ریاضی کا ایک نیا اور جدید قاعدہ نہیں بنا سکتا۔ ایک مشین ممکن ہے کسی شخص کی تقریر یا تحریر کا بالکل صحیح ترجمہ کر سکتی ہو، لیکن اس مشین کا جدید نظام کبھی بھی اس شخص کی غلطیوں کو صحیح نہیں کر سکتا۔

چونکہ حیوانات کی زندگی میں نئے اور تخلیقی کام دیکھے جاتے ہیں ان کاموں کا سبب عالم بالا سے الہام کے علاوہ کسی اور چیز کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن مجید نے ایسی ہدایت کو ''وحی'' کہا ہے۔[1]

۲۔ ٹیلی پیتھی اور اشراق

دانشور کہتے ہیں کہ انسان کی خلقت میں ایسی مزبور استعداد موجود ہے جس کی مدد سے وہ دوسروں کے افکار کا مطالعہ کر سکتا ہے اور دنیا کے دور دراز علاقوں میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے مافوق حس کی قوت سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ دور دراز سے افکار اور احساسات کا مخصوص حس کے ذریعے سے تبادلہ بالکل عملی ہے اگرچہ افکار کا یہ تبادلہ جدید ترین فنی وسائل مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، ٹیلی گراف وغیرہ کے ذریعے ہی کیوں نہ انجام پائے۔ لیکن علم ایسے تبادلے کے لیے ایک اور راہِ اشراق یا ٹیلی پیتھی کا قائل ہے۔

ٹیلی پیتھی کا اشراق سے فرق یہ ہے کہ اشراق زمان و مکان کے فاصلوں سے دور، حسی وسائل کے بغیر اتفاق ادراک کی قوت ہے، لیکن ٹیلی پیتھی ایسی کیفیت ہے جس کے ذریعے سے افکار، جذبات اور احساسات کو ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں بغیر حسی وسیلے کے منتقل کیا جاتا ہے۔ درحقیقت ٹیلی پیتھی اور اشراق ایک سکے کے دو رُخ ہیں اور یہ دونوں انسان کی خواب یا بیداری کی حالت میں اس کی 'نظر دوم' SECOND VISION کے لیے مناسب نام ہیں۔ اس بارے میں آج 'یوگ ازم' زیادہ وسعت نظری کا قائل ہے۔ وہ زندگی کو ایک موج سمجھتا ہے اور اس کے لیے وصول کی جانے والی اور بھیجی جانے والی امواج WAVES کو تسلیم کرتا ہے جیسا کہ امواج کو تاروں کے ذریعے قابو کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فکر کے ذریعے سے بھی قابو کیا جا سکتا ہے۔ وہ فکر کو ایسی موج خیال کرتا ہے جس میں وجود میں آنے کے بعد ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور کوئی حاصل کرنے والا ہو تو ایسا ممکن ہے۔

۳۔ ارواح سے ارتباط

ارواح سے رابطہ مختلف صورتوں میں انجام پاتا ہے۔ اس کی قابل اعتماد اور واضح صورت یہ ہے کہ اس فن کا ماہر استاد ایسے شخص کو جو اس کام کے لیے آمادگی رکھتا ہے، نگاہ اور تلقین کے ذریعے سلا دیتا ہے اور اس کی روح استاد کے سوالات کا جواب دیتی ہے۔ کبھی اس رابطہ سے پوشیدہ اسرار سے پردہ بھی اٹھایا جاتا ہے۔

سائنسی صورت میں ارواح سے رابطے کا مختلف جہات سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر مشرقی اور مغربی دانشوروں نے بہت زیادہ کتب اور رسالے تالیف کیے ہیں۔ بعض سائنسی دائرۃ المعارف کے بہت سے صفحات اس موضوع سے مختص ہیں۔

---

[1] سورہ نحل ۶۸۔ اس بحث کی تشریح آپ مصنف کی تالیف 'راہِ خداشناسی' ص ۲۴۵-۲۶۲ میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس فن کے دانشوروں اور وہ افراد جنہوں نے سالہا سال اس میدان میں کوشش کی ہے، اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ مسلسل ریاضتوں اور بہت زیادہ آزمائشوں کے باوجود عالم ارواح، جو کہ اسرار و رموز سے پر ہے، کے کسی گوشے سے بھی پردہ نہیں اٹھا سکے اور ارواح کے وسیلے سے انجام پانے والے حیرت انگیز اور خارقِ عادت امور کا نزدیک سے مشاہدہ نہیں کر سکے۔ بیسویں صدی کے دائرۃ المعارف کا مصنف اپنی کتاب کی چوتھی جلد میں ایک جدول میں 'روح' کے بارے میں ایسے مشہور دانشوروں کے ناموں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے اس علم کی حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ اس جدول میں اس نے فرانس، اٹلی، برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کے بڑے بڑے دانشوروں میں سے سینتالیس (۴۷) کے نام بیان کیے ہیں۔

البتہ یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ارواح سے رابطہ اجمالی طور پر ایک حقیقی امر ہے۔ لیکن اس بارے میں ہر مدعی کی بات ہرگز قبول نہیں کرنی چاہیے بلکہ علامات اور قرائن کے ذریعے سے سچے اور جھوٹے افراد میں فرق کرنا چاہیے۔

۴۔ الہام

اس بات کا بھی امکان ہے کہ کبھی ایک مطلب دل میں القاء ہو جائے اور انسان اپنے آپ کو اس مطلب سے آگاہ پائے۔ اصطلاح میں ایسے القاء کو الہام کہتے ہیں۔ ایسے الہامات ہر زمان و مکان میں اس قدر فراواں ہیں کہ ان کو عام واقعات کا ہم پلہ قرار دینا چاہیے، اس حد تک کہ بہت سی سائنسی ایجادات، انکشافات، تخلیقات اور بلند پایہ شعری مضامین کا سرچشمہ یہی الہام ہے۔

قرآن مجید اس مورد کے بارے میں ایک نمونہ ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ -------- [1]

''ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے۔''

۵۔ سچے خواب

خوابوں کی مختلف اقسام ہیں۔ ہمارا زیر بحث موضوع اس کی ایک قسم ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض خواب عقل وفکر سے بالاتر مضبوط و محکم حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ یہ قسم وہ الٰہی خواب ہیں کہ جو ہمیں ہماری دنیا سے باہر جہان دیگر سے مربوط کرتے ہیں اور یہ ایسے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں جو عقل وفکر کی طاقت سے باہر ہیں۔ اس قسم کے خواب اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔

امام صادق علیہ السلام نے خوابوں کی اس قسم کے بارے میں فرمایا ہے:

---

[1] سورہ قصص ۷

"ان الرویا الصادقة جزء من سبعین جزء من النبوة"[1]

''رویائے صادقہ نبوت کے ستر اجزا میں سے ایک جزو ہیں۔''

علم غیب اور اسلامی فلاسفہ

۱۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا اپنی کتاب ''اشارات'' کی باب ہشتم میں کہتے ہیں:

''اگر ایک عارف غیب کی خبر دے اور مستقبل اس کا درست ہونا ثابت کر دے تو اس کی تصدیق کرا اور اس پر ایمان لے آ کیونکہ ایسا علم خاص طبیعی اسباب کا حامل ہے۔'' نیز اسی باب کی تنبیہات میں اس مطلب کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''جب روح کی حسی مصروفیات کم ہو جائیں تو انسان کی ورح کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ طبعی قویٰ کے ہاتھوں سے نجات پالے اور قدس کی طرف پرواز کرے اور وہاں مختلف صورتوں کا مشاہدہ کرے۔ یہ حالت کبھی کبھار خواب یا بیماری میں عام انسانوں پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔''

نیز وہ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

''اگر تمہیں کہیں کہ فلاں عارف ایسا کام کر سکتا ہے یا ایک جسم میں حرکت پیدا کرتا ہے یا خود ایسا حرکت کرتا ہے جو دوسروں کی توانائی سے باہر ہے، تو تم اس بات کا انکار نہ کرو کیونکہ ایسے امر کے لیے خاص اسباب موجود ہیں۔ اگر تم بھی اس راستے سے وارد ہو تو اس مقصد تک پہنچ جاؤ گے۔''

وہ پھر کہتے ہیں:

''تجربے اور آزمائش نے اس بات کو واضح طور پر ثابت کیا ہے کہ انسان نیند کے وقت دنیا سے بالاتر جہان سے ارتباط قائم کر سکتا ہے اور معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ اب اس میں کیا رکاوٹ ہے کہ انسان بیداری کی حالت میں ایسی قدرت کا حامل ہو جائے جبکہ تجربے اور آزمائش نے بھی اس حقیقت کو ثابت کیا ہے۔''[2]

۲۔ شیخ شہاب الدین سہروردی جو کہ فلسفہ الٰہی اور نفسانی و علمی ریاضیات کے بارے میں کم نظیر تھے، انسان کے علم غیب کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

''جب بھی ظاہری حواس کے مشغولیت کم ہو جائے تو روحِ انسان طبیعی قوتوں سے رہائی پا کر چند غیبی امور پر تسلط پیدا کر لیتی ہے۔''

پھر کہتے ہیں:

---

[1] بحارالانوار ج ۵۸، ص ۱۶۷ خوابوں کی یہ قسم بلاواسطہ مستقبل سے سروکار رکھتی ہے نہ ماضی سے، اس کی علت مادی نہیں ہو سکتی اور ایسے خوابوں کے لیے انسانی زندگی میں کوئی گذشتہ ریکارڈ نہیں ہوتا۔ ہم نے اپنی کتاب ''رازِ بزرگ رسالت میں ایسے خوابوں کے موضوع پر ایک طرح سے گفتگو کی ہے۔

[2] اشارات، ج ۳ ص ۳۱۴، ۳۹۷، ۳۹۹، ۴۰۷

''اگر انبیاء اور اولیاء کی طرح کے کامل انسان غیب کی خبریں دیں تو وہ ایسی تحریریں ہیں جن کو وہ دیکھتے ہیں یا ایسی ہولناک اور حیرت انگیز صدائیں اور امواج ہیں جنہیں وہ سنتے ہیں یا ایسی صورتیں ہیں جن کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں اور ان سے گفتگو کرتے ہیں۔ پھر وہ غیب کی خبر دیتے ہیں۔''[1]

۳۔ صدرالمتالہین ''حکمت اشراق'' پر اپنے حاشیہ میں علم غیب کے امکان کو واضح طور پر زیر بحث قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''انسان کا نفس عالم مثال (عالم صورِ اشیا) یا عالم عقل سے متصل ہونے پر روشن ہو جاتا ہے۔''

ان کلمات کو نقل کرنے کا ہدف یہ واضح کرنا ہے کہ انسانی علوم کے دانشور اور بانی شخصیتیں انسان کے ماضی اور حال کے غیب سے علم و آگاہی کو ایک امکان پذیر بلکہ وقوع پذیر امر شمار کرتے ہیں۔ جب ایک عام انسان کے لیے غیب کا علم ممکن بلکہ وقوع پذیر ہے تو انبیاء اور ائمہ معصومینؑ کے علم غیب کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔

اس بحث کے آخر میں ایک نکتے کی یاد دہانی کرانا ضروری سمجھتے ہیں:

کل اور آج کے دانشوروں کے اقوال کو نقل کرنے کا ہدف یہ ہے کہ ہم جان لیں کہ انسانی علوم علم غیب کو ایک ممکن بلکہ تحقیق یافتہ امر شمار کرتے ہیں۔ ایسی تصدیق اور تائید کے بعد اس کے امکان میں شک وشبہ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس نکتے کی طرف توجہ دینی چاہیے انبیاء اور آئمہ معصومینؑ کا علم غیب عام طریقوں سے ہٹ کر ہے، نتیجہ کا اشتراک اتحادِ طریق پر دلالت نہیں کرتا۔

نیز اگر ہم نے اس حصے میں کشف وشہود، اشراق، یا ارواح سے ارتباط کے بارے میں گفتگو اور استدلال کیا ہے تو اس کا یہ معنی نہیں کہ ہم کشف و اشراق کے ہر مدعی کی بات کو قبول کرلیں یا ارواح سے رابطے کے ہر مدعی کی تصدیق کر دیں بلکہ ہمارا مقصد اجمالی تصدیق تھا۔ اب اس کی حدود اور خصوصیات کیا ہیں، فی الحال یہ ہماری بحث کے دائرے سے خارج ہے۔

---

[1] حکمت اشراق، مقالہ پنجم

انبیاء اور آئمہ کا علم غیب...... من جانب اللہ

انبیاؑء اور آئمہ معصومینؑ کا علم دو طرح سے متصور ہے:

۱۔ من جانب اللہ نہ ہو۔

۲۔ من جانب اللہ ہو۔ نیز آئمہ میں سے ہر امام نے اپنے سے پہلے امام سے حاصل کیا ہو اور آخر کار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھا ہو یا پھر اللہ تعالیٰ نے دوسرے راستے سے ان کو تعلیم دیا ہو۔

تمام شیعہ علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ نبی اور امام کا علم غیب من جانب اللہ ہے اور ذاتی نہیں ہے بلکہ تعلیم الٰہی سے ہے۔ جو لوگ آئمہ علیہم السلام کے علم کو ذاتی اور بدونِ تعلیم الٰہی سمجھتے ہیں اور ان کے علم کو علم الٰہی کی طرح جانتے ہیں وہ غلاۃ[1] شمار ہوتے ہیں۔ اصولاً اس عقیدہ کا لازمہ شرک ہے۔

یہاں پر قارئین کی توجہ کے لیے اس کتاب کی آئندہ بحثوں میں بھی جو مطالب سودمند ہیں ان کا ذکر کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں:

روایات اور بزرگ علماء کے کلمات کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے زمانے میں نیز ان کے بعد کے ادوار میں کبھی بھی لفظ 'علم غیب' سے علم ذاتی اور بدونِ تعلیم الٰہی سمجھا گیا ہے۔ اس لیے آیات اور روایات میں نیز بزرگ علماء کے کلمات میں بار بار وضاحت کی گئی ہے کہ نبی اور امام کی غیب سے آگاہی ذاتی نہیں ہے بلکہ تعلیم الٰہی اور وحی وغیرہ کے ذریعے سے ہے یا اپنے سے پہلے کے نبی یا امام سے حاصل کی گئی ہے۔

اب بعض روااتِ اور علمائے کی گفتگو کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ جنگ جمل کے اختتام پر حضرت علی علیہ السلام نے بصرہ میں ایک خطبہ دیتے ہوئے آئندہ پیش آنے والے بعض واقعات کی خبر دی۔ آپؑ کے اصحاب میں ایک نے نہایت تعجب کے ساتھ آپؑ سے کہا: "لقد اعطیت یا امیر المومنین علم الغیب" "کیا آپؑ علم غیب رکھتے ہیں؟" یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم غیب خدا سے مخصوص ہے کیونکہ صرف خدا ہے جو سب چیزوں سے ذاتاً آگاہ ہے۔

آپؑ نے اس کے جواب میں مسکرائے اور فرمایا:

"لیس ھو بعلم الغیب و انما ھو تعلم من ذی علم"

"یہ کہ میں جو آئندہ پیش آنے والے واقعات کی خبر دے رہا ہوں یہ ذاتی علم غیب اور الٰہی تعلیم کے بغیر نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ

---

[1] غلاۃ وہ لوگ ہیں جو ائمہ علیہم السلام کو دائرہ بشریت سے خارج سمجھتے ہیں اور بعض ایسی صفات جو صرف اللہ تعالیٰ سے مختص ہیں ان صفات کو ائمہ کے لیے ثابت کرتے ہیں۔

وسلم کے ذریعے مجھے تعلیم دیا گیا ہے............''۔[1]

۲۔ یحییٰ بن عبداللہ بن حسن نے ساتواں امام علیہ السلام سے کہا: ''میں آپؑ پر قربان جاؤں کچھ لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپؑ علم غیب رکھتے ہیں۔''

حضرتؑ نے اس کے جواب میں فرمایا: ''نہ! خدا کی قسم جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے ہم تک پہنچا ہے اور ہم نے آپؐ سے سیکھا ہے۔''

''لا واللہ ما ھی الا وراثۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔''[2]

۔ شیخ بزرگوار محمد بن محمد بن نعمان مفید (متوفی ۴۱۳ھ) لکھتے ہیں:

''اس شخص کو بطور مطلق 'عالم غیب' کی صفت کا حامل سمجھا جاسکتا ہے جس کا علم ذاتی ہو اور اس نے کسی سے نہ سیکھا ہو اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا بھی علم ذاتی نہیں ہے۔ اس سناء پر شیعوں کا اعتقاد ہے کہ ائمہؑ کے بارے میں بطور مطلق 'عالم غیب' نہیں کہا جا سکتا بلکہ وضاحت کرنی چاہیے کہ ان کا علم سابقہ امامؑ سے اور پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آخر کار تعلیم الٰہی سے ہے۔''[3]

۴۔ بلند پایہ شیعہ مفسر شیخ طبرسی مرحوم (متوفی ۵۴۸ھ) لکھتے ہیں:

''شیعہ عقیدے کے مطابق اس شخص کی بطور مطلق 'عالم غیب' سے تعریف کی جاسکتی ہے جس کا علم ذاتی ہو اور وہ سب چیزوں کا علم رکھتا ہو اور خدا کی ذات کے علاوہ ایسا کوئی بھی نہیں ہے۔ البتہ وہ غیبی خبریں جو بہت بڑی تعداد میں شیعہ اور سنی علماء نے حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے آئمہؑ سے نقل کی ہیں سب کی سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے ان تک پہنچی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اللہ تعالیٰ سے سیکھا ہے۔''[4]

۵۔ رشید الدین محمد بن شہر آشوب مازندرانی (متوفی ۵۸۸ھ) لکھتے ہیں:

''نبیؐ اور امامؑ علم غیب رکھتے ہیں لیکن اس معنی میں نہیں کہ اُن کا علم ذاتی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے علم غیب کا ایک حصہ ان کو تعلیم دیا ہے۔ اس

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۴، شرح نہج البلاغہ ابن میثم ج ۱ ص ۸۳۔۸۵ و ج ۳ ص ۱۳۸۔۱۴۱

[2] امالی شیخ مفید، ص ۱۴ طبع نجف۔ نیز ایک اور روایت کے ذیل میں کہ جسے آپ دسویں حصے کے آٹھویں سوال میں پڑھیں گے، اس مطلب کی تائید کی گئی ہے "نحن نعلم انك تعلم علماً کثیراً ولا ننسبك الی علم الغیب"۔ حضرت امام صادق علیہ السلام کے چند اصحاب آپؑ سے کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ آپؑ بہت وسیع علم رکھتے ہیں، اس کے باوجود ہم عالم الغیب کی نسبت آپؑ کی طرف نہیں دیتے یعنی آپ کو عالم الغیب نہیں کہتے۔ اصول کافی، ج ۱ ص ۲۵۷

[3] اوائل المقالات، ص ۲۸، بحار الانوار ج ۲۶ ص ۱۰۶، شیخ مفید کی کتاب ''المسائل'' کے حوالے سے۔

[4] مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۶۱ و ج ۵ ص ۲۰۵

عقیدے سے کہ ان کا علم ذاتی ہے اور خدا کے علم سے کوئی فرق نہیں رکھتا، شرک لازم آتا ہے۔'' [۱]

۶۔ کمال الدین ابن میثم بحرانی (متوفی ۶۷۹ھ) لکھتا ہے:

''علم غیب کہ جو خدا کے پاس ہے، سے مراد ایسا علم غیب ہے کہ جو تعلیم اور سیکھنے کے بغیر ہے۔ بغیر تعلیم کے علم غیب صرف خدا سے مختص ہے اور خدا کے علاوہ جو کوئی بھی علم غیب حاصل کرے وہ تعلیم الٰہی کے وسیلے سے ہے۔'' [۲]

۷۔ ابن ابی الحدید معتزلی (متوفی ۶۵۵ھ) لکھتے ہیں:

''ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ انسانوں کے درمیان ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو غیب کی خبر دے سکتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ ان کا علم غیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے علم کا ذریعہ غیب سے فراہم کرتا ہے۔'' [۳]

۸۔ فضل بن روز بہان نویں اور دویں صدی کے سنی عالم ہیں۔ وہ اپنے تمام تر تعصب کے ساتھ کتاب ''ابطال نہج الباطل'' میں لکھتے ہیں:

''جائز نہیں کہ کسی کے لیے کہا جائے کہ وہ علم غیب رکھتا ہے۔ ہاں تعلیم الٰہی کی وجہ سے غیب کی خبر دینا درست ہے اور اس تعلیم کا راستہ وحی یا الہام ہے، البتہ یہ اس کے نزدیک ہے جو الہام کو غیب سے آگاہی کا ایک راستہ سمجھتا ہے۔'' [۴]

۹۔ علامہ شیخ محمد حسین مظفر مرحوم لکھتے ہیں:

''خدا کا علم ذاتی ہے اور ائمہ علیہم السلام کا علم تعلیم الٰہی سے ہے، کسی کو بھی یہ تو ہم نہیں کرنا چاہیے کہ ائمہ علیہم السلام کا علم خدا کے علم جیسا ہے۔ پس اس بات کے کہنے میں کوئی ہرج نہیں کہ ائمہ ذاتاً علم غیب نہیں رکھتے، البتہ تعلیم الٰہی کے ذریعے سے علم غیب رکھتے ہیں۔'' [۵]

۱۰۔ علامہ طباطبائی مرحوم تفسیر ''المیزان'' میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ ذاتاً غیب سے آگاہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی غیب سے آگاہ ہو اسی کی تعلیم کی وجہ سے ہے اور جہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے علم غیب سے انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میں علم غیب نہیں رکھتا اس کا معنی یہ ہے کہ مستقلاً اور ذاتاً عالم الغیب نہیں ہوں اور جو کچھ بھی جانتا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے عطا کیا گیا ہے۔ [۶]

---

[۱] متشابہات القرآن، ص ۲۱۱ پر یہ عبارت نقل کی گئی ہے۔

[۲] شرح نہج البلاغہ ابن میثم ج ۱ ص ۸۴ و جلد ۳ ص ۱۴۰

[۳] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۴۲۷ (جو چار جلدوں میں چھپی ہے)۔

[۴] دلائل الصدق مظفر، ج ۲ ص ۳۴۳ طبع قم

[۵] علم امام ص ۷ و ۴۷

[۶] المیزان ج ۲۰ ص ۱۳۱۔۱۳۲

علمائے اسلام اور معرفتِ سوم

۱۔ شیخ مفید (متوفی ۴۱۳ھ) لکھتے ہیں:

''ائمہ علیہم السلام بعض لوگوں کے بواطن سے آگاہ تھے اور آئندہ پیش آنے والے واقعات وحوادث سے (اُن کے وقوع سے پہلے) علم رکھتے تھے۔''[۱]

۲۔ وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''حضرت علی علیہ السلام کی امامت کی ایک دلیل ان کی غیب کی خبریں ہیں۔ انہوں نے آئندہ پیش آنیوالے بہت سے واقعات و حوادث کے وقوع پذیر ہونے کی خبریں دیں اور کچھ مدت بعد ان خبروں کی صداقت اور درستی ثابت ہوگی۔''[۲]

۳۔ وہ ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

''اگر امام علیہ السلام کسی کے باطن سے آگاہ ہو جائیں تو یہ آگاہی تعلیم الٰہی کی وجہ سے ہے اور امام کی تعلیم الٰہی چند ذرائع سے دی جا سکتی ہے۔ ان ذرائع میں سے دو ذریعے اپنے سے پہلے کے امام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور خواب ہیں۔''[۳]

لہٰذا اگر کوئی مصنف شیخ مفیدؒ کی طرف اس بات کی نسبت دے کہ وہ بزرگوار ائمہ علیہم السلام کے علم غیب سے انکار کرتے ہیں تو اس کی یہ بات دلیل بغیر علم یا خودغرضی ہوگی۔

۴۔ عالم بزرگ و عالی قدر ابوالفتح محمد بن علی کراجکی (متوفی ۴۴۹ھ) رسالہ اعتقادات میں لکھتے ہیں:

''شیعہ عقائد میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام اور ان کے گیارہ معصوم فرزند امام ہیں اور ان کی امامت کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی امامت کے ثبوت کے لیے ان کے ہاتھوں پر معجزات کو ظاہر کیا ہے اور ان کو بہت سے غائبات اور آئندہ رونما ہونے والے حوادث وواقعات سے آگاہ کیا ہے۔''[۴]

۵۔ امین الاسلام طبرسی لکھتے ہیں:

جیسا کہ حضرت مسیحؑ کے معجزات میں سے ایک یہ تھا کہ وہ غیب کی خبر دیتے تھے اور کہتے تھے:

---

[۱] اوائل المقالات ص ۳۸، بحارالانوار ج ۲۶ ص ۱۰۴ اور ج ۴۲ ص ۲۵۸

[۲] ارشاد شیخ مفید ص ۱۴۸ (اخوندی طبع)

[۳] الفصول المختارہ ص ۸۰ طبع سوم

[۴] کنزالفوائد کراجکی، ج ۱ ص ۲۴۵

وَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ ؕ [۱]

''میں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، کی خبر دوں گا۔''

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں سے ان کی غیبی خبریں تھیں۔ اسی طرح حضرت علیؑ کی امامت کے معجزات اور دلیلیں ان کی غیب کی خبریں ہیں کہ جو سب کی سب واقع کے مطابق ثابت ہوئیں۔ [۲]

۶۔ محمد بن شہر آشوب مازندرانی اپنی بلند پایہ کتب ''متشابہات القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''ممکن ہے پیغمبر اور امام تعلیم الٰہی سے غائب اشیا کے ایک حصے اور بعض گذشتہ و آئندہ واقعات سے آگاہی رکھتے ہوں۔'' [۳]

۷۔ نیز کتاب ''مناقب'' میں انہوں نے امیر المومنین علی علیہ السلام کی بعض غیب کی خبروں کو تقریباً بیس صفحوں پر نقل کیا ہے، پھر وہ لکھتے ہیں:

''یہ سب غیب کی خبریں ایسی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو مخفی طور پر ان سے آگاہ کیا۔'' [۴]

۸۔ مفسر بزرگ مرحوم شیخ ابوالفتوح رازی (جو چھٹی صدی ہجری میں گزرے ہیں) لکھتے ہیں:

''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جملہ معجزات میں سے اخبارِ غیب تھیں جو 'باعلام اللہ تعالیٰ آیاہ'' تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعے سے خبر دی تاکہ وہ آپؐ کی نبوت کی دلیل اور علامت قرار پائے۔'' [۵]

۹۔ کمال الدین ابن میثم بحرانی (متوفی ۶۷۹ھ) نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں چند جگہوں پر اس بات کی تصریح کی ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام کی غیب سے آگاہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلیم کی وجہ سے تھی۔ اس نے تعلیم و تعلم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کی کیفیت اور معانی کی بھی وضاحتیں کی ہیں۔ [۶]

۱۰۔ ابن ابی الحدید معتزلی (متوفی ۶۵۵ھ) نہج البلاغہ کی شرح میں لکھتے ہیں:

''یہ کہ حضرت علی علیہ اسلام فرماتے ہیں: آئندہ واقعات کے بارے میں جو بھی مجھ سے پوچھو اس کی خبر دوں گا۔ یہ نہ تو خدائی دعویٰ ہے اور نہ نبوت کا، بلکہ حضرت کی امراد یہ ہے کہ میں نے غیب کا یہ علم رسول اکرمؐ سے حاصل کیا ہے۔''

---

[۱] آل عمران آیت ۴۹

[۲] اعلام الوریٰ ص ۲۷۱ طبع اسلامیہ

[۳] متشابہات القرآن ص ۲۱۱

[۴] مناقب، ج ۲ ص ۱۱۲، طبع نجف

[۵] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۳ ص ۲۶۸ (جو بارہ جلدوں میں چھپی ہے)

[۶] شرح نہج البلاغہ ابن میثم ج ۱ ص ۸۵۔۸۲ و ج ۲ ص ۳۹۰ و ج ۳ ص ۱۴۱۔۱۳۹

پھر وہ لکھتے ہیں:

''ہم نے حضرت علی علیہ السلام کا ان سے صادر ہونے والی غیب کی خبروں میں امتحان لیا ہے اور ان کی تمام غیب کی خبروں کو واقعے کے مطابق پایا ہے۔ ان کی غیب کی خبروں کا وقوع پذیر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جو جملہ انہوں نے ارشاد فرمایا ہے وہ سچا اور صحیح ہے۔''

''فوالذی نفسی بیدہ لاتسالونی عن شیی فیما بینکم و بین الساعۃ...... الاانبأ کم...''

''خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے (میں آئندہ کے حوادث سے خبر رکھتا ہوں) اور جو بھی تم پوچھو گے تمہیں آگاہ کروں گا۔''[1]

۱۱۔ علامہ حلی (متوفی ۷۲۶ھ) نے اصول عقائد کے موضوع پر اپنی کتب میں حضرت علی علیہ السلام کی امامت کے اثبات کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ آپؑ کی غیب کی خبروں کو قرار دیا ہے۔[2]

۱۲۔ بزرگ شیعہ عالم فاضل مقداد مرحوم (متوفی ۸۲۶ھ) نے اپنی کتاب ''ارشاد الطالبین'' میں حضرت علی علیہ السلام کی غیب کی کچھ خبروں کو نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آنحضرتؑ کی غیب کی خبریں شمار نہیں کی جاسکتیں۔ ان کا یہ علم غیب دوسروں پر ان کی فضیلت اور ان کی امامت کے دلائل میں سے ایک ہے۔''[3]

۱۳۔ محدث عالی قدر شیخ حر عاملی (متوفی ۱۱۰۴ھ) لکھتے ہیں:

''ایسی احادیث متواتر ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کو گذشتہ اور آئندہ کا علم تعلیم دیا ہے۔''[4]

۱۴۔ وہ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''امام تمام زبانوں سے آگاہ ہے۔''[5]

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۱۷۵ (جو چار جلدوں میں چھپی ہے)

[2] شرح تجرید ص ۲۱۹ طبع اصفہان نہج المسترشدین ص ۷۰ طبع جدید، کشف الیقین ص ۲۴ طبع نجف، منہاج الکرامہ ص ۸۰ طبع سنگی

[3] ارشاد الطالبین ص ۱۸۰ طبع بمبئی

[4] وسائل الشیعہ ج ۱۳ ص ۹۲

[5] وسائل الشیعہ ج ۱۲ ص ۳۸۵

۱۵۔ وہ پھر لکھتے ہیں:

''پیغمبرؐ اور ائمہ تعلیم الٰہی سے بہت غیوب کا علم رکھتے ہیں اور جب بھی کسی چیز کے جاننے کا ارادہ کرتے ہیں تو جان لیتے ہیں۔ (اور خدا کی طرف سے ان کو تعلیم دی جاتی ہے) [1]

۱۶۔ عالم بزرگوار سید علی قزوینی (متوفی ۱۲۹۸ھ) کتاب ''قوانین الاصول'' کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''مستفیض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام کا گذشتہ، حال اور آئندہ کا علم اس کی امامت کی علامت ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات مذہب شیعہ کے عقائد اور ضروریات میں سے ہے۔'' [2]

۱۷۔ علامہ بزرگوار حاج میرزا محمد حسن آشتیانی (متوفی ۱۳۱۹ھ) لکھتے ہیں:

''حق یہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام ماضی، حال اور آئندہ کا علم رکھتے ہیں اور جس چیز کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے مختص ہے، کے سوا کوئی بھی چیز ان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ [3]

۱۸۔ رسالہ ''علم الساعۃ'' کے مصنف (متوفی ۱۳۱۲ھ) اپنے رسالے میں لکھتے ہیں:

''پس ما حصل مطلب کہ جو حق مذہب یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو آئندہ ہوگا، سب کا علم رکھتے ہیں۔'' [4]

۱۹۔ علامہ مرحوم شیخ محمد حسین مظفر لکھتے ہیں:

''ہم یہ جو کہتے ہیں کہ آئمہ علیہم السلام غیب سے آگاہ ہیں اس سے مراد ایسا علم ہے جو اللہ تعالیٰ ان کو الہام کے ذریعے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ یا دیگر راستوں سے عطا کرتا ہے۔'' [5]

۲۰۔ علامہ طباطبائی رسالہ ''علم الامام'' میں لکھتے ہیں:

''سورل اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ہدیٰ سے پہنچنے والی بہت سی روایات سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''علم ما کان ومایکون وما هو كائن'' یعنی جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہوگا اور جو کچھ موجود ہے سب کا علم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ

---

[1] اثبات الہداۃ ج ۷ ص ۴۴۱ و فصول المہمہ ص ۴۸ طبع سنگی

[2] حاشیہ قوانین ص ۴۸۱، البتہ مرحوم قزوینی کی امام کے ماضی، حال اور آئندہ کے علم سے مراد گذشتہ، حال اور آئندہ کے بعض واقعات اور موضوعات کا علم ہے۔ ان کی اصل عبارت کی طرف رجوع کریں۔

[3] بحر الفوائد ج ۲ ص ۶۰

[4] رسالہ ''علم الساعۃ'' ص ۱۳۰ طبع سنگی

[5] علم الامام ص ۶

وسلم کو عطا کیا ہے اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کو وہ علم آنحضرتؐ سے ورثہ میں ملا ہے۔'' [1]

معرفتِ سوم کے موضوع پر کتب

نبی امام کے کے علم غیب کے اثبات میں لکھی گئی اور بحث کرنے والی کتب اور رسائل کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ علم غیب پر جدگانہ تصنیف کی جانے والی کتب اور رسائل۔

۲۔ ایسی کتب جو علم غیب کے بارے میں جداگانہ طور پر تحریر نہیں کی گئیں، لیکن اس مسئلے پر ان میں وسیع بحث کی گئی ہے یا علم غیب کے بارے میں روایات کو جمع کیا گیا ہے۔

۳۔ ایسی کتب جن میں علم غیب کے بارے میں مختصر اور مجمل بحث کی گئی ہے۔

یہاں پر ہم پہلی اور دوسری قسم کی کتب کی فہرست نقل کرتے ہیں تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ علماء کی نظر میں یہ مسئلہ کس قدر اہمیت کا حامل رہا ہے کیونکہ جس مسئلے پر بہت زیادہ بحث کی جائے اور کتابیں لکھی جائیں یہ امر اس کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔

۱۔ کتاب ''بصائر الدرجات'' مصنف محمد بن حسن صفار (متوفی ۲۹۰ھ)

اس کتاب میں علم امام سے مربوط روایات بہت وسیع انداز میں جمع کی گئی ہیں۔

۲۔ کتاب شریف ''کافی'' مصنف شیخ کلینی (متوفی ۳۲۸ھ)

اس کتاب میں علم امام سے مربوط بہت زیادہ احادیث ذکر کی گئی ہیں۔ تقریباً تیس ابواب میں ان کی جمع آوری کی گئی ہے۔

۳۔ کتاب ''وافی'' مصنف ملا محسن فیض کاشانی (۱۰۹۱ھ)

اس کتاب کی پہلی جلد میں علم امام سے مربوط احادیث نقل کی گئی ہیں اور ان پر تحقیق کی گئی ہے۔

۴۔ ''اثبات الہداۃ بالنصوص والمعجزات'' مصنف شیخ حر عاملی (متوفی ۱۱۰۴ھ)

اس کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ ہدیٰ کی غیب کی خبروں کے سینکڑوں موارد ذکر کیے گئے ہیں۔

۵۔ کتاب ''مدینۃ المعاجز'' مصنف سید ہاشم بحرانی (متوفی ۱۱۰۷ھ یا ۱۱۰۹ھ)

اس کتاب میں عصر حاضر کے دانشور کے قول کے مطابق آئمہ معصومین علیہم السلام کی غیب کی خبروں کے چھ سو پچاس موارد نقل ہوئے ہیں۔

۶۔ کتاب ''ینابیع المعجزات'' اس کے مصنف بھی سید ہاشم بحرانی ہیں اور یہ کچھ عرصہ پہلے چھپ چکی ہے

[1] رسالہ علم الامام کے عربی نسخہ خطی کا صفحہ ۳، ان دو حصوں میں چند علماء اسلام کی گفتگو نمونہ کے طور پر نقل کی گئی ہے۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کی مراد اور مضمون کو ان کی عبارت میں بیان کریں۔ اگر چہ ان کے لفظی ترجمے سے تھوڑا دور ہو جائیں۔

اس کتاب میں بھی علم امام سے مربوط کچھ احادیث جمع کی گئی ہیں۔

۷۔ بحارالانوار مصنف علامہ مجلسی (متوفی ۱۱۱۰ھ)

اس کتاب کی جدید اشاعت کی چھبیسویں جلد علم امام کی احادیث سے مربوط ہے۔

۸۔ آئمہ علیہم السلام کے علم کے موضوع پر رسالہ 'النور، مصنف شیخ الاسلام رشتی (متوفی بعداز سال ۱۲۷۰ھ)

اس رسالے کا خطی نسخہ قم میں آیت اللہ نجفی مرعشی کی لائبریری میں موجود ہے۔

۹۔ رسالہ ''معارف السلمانی بمراتب الخلفاء الرحمان'' تحریر کردہ سید عبدالحسین شیرازی مرحوم (متوفی ۱۳۴۲ھ) ی رسالہ ۱۳۱۲ ہجری قمری میں طبع ہوا۔

۱۰۔ رسالہ ''علم الساعۃ'' مصنف حجۃ الاسلام تبریزی (متوفی ۱۳۱۲ھ)

یہ رسالہ سن ۱۲۸۶ ہجری میں طبع ہوا۔

۱۱۔ ''مفاتیح الغیب'' مصنف حجۃ الاسلام تبریزی

مندرجہ بالا کتاب اپنی شرح کے ساتھ تبریز میں طبع ہوئی ہے۔

۱۳۔ ''الہام فی علم الامام'' تالیف عالم معاصر جناب شیخ محمد علی حائری سنقری۔

یہ کتاب نجف میں چھپی ہے۔

۱۴۔ اخبار غیبیۃ علی علیہ السلام

اس کتاب میں جسے عالم معاصر نے تحریر کیا ہے حضرت علی علیہ السلام کی غیب کی خبروں کے پچھتر موارد نہج البلاغہ اور دوسری کتب سے جمع کیے گئے ہیں۔

۱۵۔ رسالہ ''علم غیب'' تحریر عالم معاصر جناب حاج شیخ علی غازی شاہرودی کو جو مشہد میں چھپا ہے۔

۱۶۔ فارسی میں علم امام کے بارے میں علامہ طباطبائی کا رسالہ۔

۱۷۔ عربی میں علم امام کے بارے میں علامہ طباطبائی کا ایک اور رسالہ جس کا خطی نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔

۱۸۔ ''وجیزۃ فی علم النبی'' تحریر عالم معاصر جناب امیری فیروز کوہی۔

یہ رسالہ تہران کے ایک ہفت روزہ میں چھپ چکا ہے۔

۱۹۔ ''مفاہیم القرآن'' جلد اول تالیف مصنف کتاب ہذا۔

اس کتاب میں وسیع انداز میں اور تقریباً تمام پہلوؤں سے انبیاء اور آئمہؑ کے علم کے بارے میں قرآن مجید کی نظر سے بحث کی گئی ہے۔

انبیاؑء کا علم غیب اور قرآن

قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جو واضح طور پر انبیاء علیہم السلام اور بعض خاص بندگانِ الٰہی کے حواس سے پوشیدہ امور سے علم کی تصدیق کرتی ہیں اور کوئی بھی مسلمان فرد جو قرآن کو وحی آسمانی سمجھتا ہے ان آیات کے مفاہیم پر غور وفکر کے بعد اس مسئلے میں شک نہیں کرسکتا۔

ان آیات کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایسی آیات جو کلی طور پر انبیاؑء علیہم السلام کے علم غیب کی تصدیق کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو پوشیدہ امور سے آگاہ کرتا ہے۔

۲۔ ایسی آیات جو صراحت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی مخصوص موارد میں غیب خبروں پر شاہد ہیں یا غیر از انبیاء خدا کے بعض بندوں کی اخبارِ غیب کے بارے میں ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں عالم غیب سے ارتباط پیدا کرتے ہوئے امورِ غیب سے آگاہ ہوئیں۔

درحقیقت آیات کی پہلی قسم میں جو نوید سنائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو غیب سے آگاہ کرتا ہے، اس نے آیات کی دوسری قسم میں عملی شکل اختیار کررکھی ہے۔ ان کے مطابق انہوں نے غیبی امور کی خبر دی ہے یا وہ غیب سے آگاہ ہوئے ہیں۔

آیات کی پہلی قسم

۱۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

(سورہ آل عمران آیت ۱۷۹)

''اللہ تمہیں غیب سے مطلع نہیں کرتا لیکن اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے منتخب کرتا ہے۔ پس خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ۔ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہارے لیے اجر عظیم ہے۔''

اس سے واضح تر کون سی تعبیر ہوسکتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عام بندوں کو غیب کا علم نہیں دیتا بلکہ یہ فضیلت صرف خدا کے برگزیدہ بندگان انبیاء علیہم السلام کے لیے ہے۔[۱]

۲۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

---

[۱] تفسیر تبیان، ج ۳ ص ۶۳، تفسیر مجمع البیان ج ۲ ص ۵۴۵، تفسیر ابو الفتوح رازی ج ۳ ص ۶۸ اور تفسیر المیزان ج ۴ ص ۷۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ﴿٢٧﴾[1]

''اللہ عالم غیب ہے پس وہ کسی کو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر ایسے بندے جن سے وہ راضی ہے اور وہ اس کے رسولوں میں سے ہیں اور خدا اپنے رسولوں کے سامنے اور پس پشت نگہبان قرار دیتا ہے۔''

اس آیت کا مفہوم نہایت روشن ہے اور یہ بہترین انداز سے سمجھاتی ہے کہ علم غیب خدا کی طرف سے ہے اور وہ اپنے رسولوں کو غیب سے آگاہ کرتا ہے۔[2]

۳۔ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿٢٤﴾[3]

''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیوانے نہیں ہیں اور بیشک انہوں نے فرشتے کو آسمان کے کھلے شرقی کنارے پر دیکھا ہے اور اس پر غیب بخیل نہیں ہے (یعنی جو علم غیب اس پر القاء ہوتا ہے اگر اس میں مصلحت ہو تو تمہیں بتا تا ہے اور بخل نہیں کرتا اور تم سے مخفی نہیں رکھتا۔)

اس بناء پر اس آیت سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرشتہ وحی کے ذریعے غیب سے آگاہ کرتا ہے۔[4] یہ آیات کی پہلی قسم تھی جو کلی طور پر انبیاء و رسل اور خدا کے برگزیدہ بندوں کے علم غیب کی تصدیق کرتی ہیں۔ غور وفکر کرنے کی صورت میں ان آیات کی مذکورہ مطلب پر دلالت میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا۔

البتہ بعض علماء نے کچھ دیگر آیات کو بھی ان کا ہم پلہ قرار دیا ہے تاہم چونکہ ان میں سے کچھ کی دلالت ہماری نظر میں بے اشکال نہیں تھی۔ اور کچھ کے لیے وضاحت اور تشریح کی ضرورت تھی اس لیے ان آیات اور ان سے متعلق بحث کے ذکر کرنے سے ہم نے گریز کیا ہے۔

آیات کی دوسری قسم

اس حصے میں ایسی آیات ذکر کی جائیں گی جو واضح طور پر اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ انبیاء اور خدا کے کچھ بندوں نے بعض خاص

---

[1] سورہ جن آیات ۲۶ و ۲۷

[2] تفسیر تبیان ج ۱۰ ص ۱۵۸، تفسیر مجمع البیان ج ۱۰ ص ۳۷۴، تفسیر ابوالفتوح رازی ج ۱۱ ص ۲۹۳ اور تفسیر المیزان ج ۲۰، ص ۱۲۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[3] سورہ تکویر آیات ۲۲ تا ۲۴

[4] تفسیر تبیان ج ۱۰، ص ۲۸۷، تفسیر مجمع البیان ج ۱۰ ص ۴۴۶، تفسیر ابوالفتوح رازی ج ۱۲ ص ۱۰ اور تفسیر المیزان ج ۲۰ ص ۳۲۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

مواقع پر غیب کی خبر دی ہے اور وہ خفیہ امور سے آگاہ ہوئے ہیں اور وہ نوید جو پہلی قسم کی آیات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو غیب سے آگاہ کرتا ہے، اس نے ان آیات میں عملی شکل اختیار کی ہے اور وہ ''امکان'' سے ''فعلیت اور تحقیق'' کے مرحلے پر پہنچ گیا ہے۔

آیات

۱۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۳۱ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝۳۲ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۝۳۳ [1]

''اللہ تعالیٰ نے تمام اسماء (موجودات کے حقائق) آدم کو سکھائے۔ پھر ان (حقائق) کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا: ''ان اسماء کے حقائق سے مجھے آگاہ کرو اگر تم سچے ہو۔'' انہوں نے کہا: ''ہم تیری تسبیح کرتے ہیں۔ ہم کسی چیز سے آگاہ نہیں مگر اس سے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، تو دانا اور حکیم ہے۔'' اللہ نے کہا: ''اے آدم! ان اسماء کے حقائق فرشتوں کو بتاؤ۔'' جب آدم نے فرشتوں کو ان اسماء سے آگاہ کیا تو خدا نے فرشتوں سے خطاب کر کے کہا: ''میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب سے آگاہ ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور چھپاتے ہو میں اس کو جانتا ہوں''

ان تین آیتوں میں غور وفکر کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند حقائق جو فرشتوں سے مخفی تھے وہ حضرت آدمؑ کو سکھائے اور پھر حضرت آدمؑ نے خدا کے حکم پر فرشتوں کو اس غیب سے آگاہ کیا۔

توضیح

''اسماء''، اسم کی جمع ہے جس کا معنی نام ہے، لیکن یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ فقط آسمانی اور زمینی مخلوق کے نام ان کو تعلیم دیے کیونکہ حقیقت اسماء کی شناخت کے بغیر فقط ان کا یاد کرنا حضرت آدم علیہ السلام کے لیے کوئی امتیاز نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو موجودات کے حقائق سے آگاہ فرمایا۔ اس بات کی گواہ آیت کریمہ ''ثم عرضهم على الملائكة'' میں ضمیر جمع عاقل ''هم''

---

[1] سورہ بقرہ آیات ۳۱ تا ۳۳

ہے کیونکہ اگر فقط اسماء مقصود ہوتے تو "عرضها" کہنا چاہیے تھا اس لیے کہ جمع غیر عاقل کے ضمیر مفرد مونث "ها" لائی جاتی ہے۔[۱]

۲۔ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾[۲]

''اور نوحؑ نے کہا: ''اے پروردگار ان کافروں میں سے کسی کو بھی روئے زمین پر باقی نہ رکھ کیونکہ یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے ہیں اور یہ فاجر و کافر کے سوا نہیں جنتے (پیدا کرتے)۔''

اس عالی قدر پیغمبر نے اس آیت میں دو مخفی اور پوشیدہ باتوں کی خبر دی ہے۔

۱۔ اس کے بعد کوئی بھی کافران پر ایمان نہیں لائے کیونکہ ان تمام کی نابودی کے لیے آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے۔

۲۔ اگر یہ کافر باقی رہے تو ان کی نسلوں میں صرف بدکار اور کافر ہی متولد ہوں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی اس غیب کی خبر کی دو طریقوں سے توجیہہ کی جاسکتی ہے:

الف) حضرت نوح علیہ السلام ان لوگوں کے ساتھ معاشرت سے ان کے باطنی میلانات اور رجانات سے آگاہ ہو چکے تھے اور ان کو اپنے اندازے سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اب ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور اپنی قوم کے مستقبل کے بارے میں ان کا علم تجربے اور ان سے میل جول کی بنیاد پر تھا۔

یہ توجیہ حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت اور نبوت و رسالت کے مقام کے لیے مناسب نہیں ہے کیونکہ اس توجیہ کا معنی یہ ہے کہ حضرت نوح نے اپنے ذاتی تجربے، استنباط اور اندازے پر تکیہ کیا ہے اور ایسے اندازے کی بنیاد پر اتنی بڑی آبادی کی نابودی اور ان پر عذاب کی درخواست کی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ صرف اندازے، گمان اور شخصی استنباط کی بنا پر ایک پوری آبادی کے لیے عذاب طلب نہیں کیا جاسکتا۔

ب) دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس بات کا علم انہوں نے خدا سے حاصل کیا تھا اور خدا نے انہیں یہ خبر دی تھی کہ ان کی قوم اب اس کے بعد ایمان نہیں لائے گی اور اگر وہ باقی رہے تو اس سے صرف اور صرف بدکار اور کافر متولد ہوں گے۔ قرآن مجید سے اس دوسری توجیہ کے لیے استفادہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ قرآن فرماتا ہے:

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾[۳]

---

[۱] تفسیر المیزان ج ۱ ص ۱۱۵-۱۲۲ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] سورہ نوح آیات ۲۶-۲۷

[۳] سورہ ہود آیت ۳۶

''نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے ان افراد کے علاوہ جو پہلے ایمان لا چکے ہیں اور کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا۔ پس ان کے افعال سے محزون اور غمگین نہ ہو۔''

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی اپنی قوم کے مستقبل سے آگاہی وحی الٰہی کے ذریعے تھی اور وحی علم غیب کا ایک ذریعہ ہے۔[۱]

۳۔ اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ رَاَیۡتُهُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ۴ قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡیَاکَ عَلٰۤی اِخۡوَتِكَ فَیَکِیۡدُوۡا لَكَ کَیۡدًا ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ۵ وَکَذٰلِكَ یَجۡتَبِیۡكَ رَبُّكَ وَیُعَلِّمُكَ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ وَیُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَیۡكَ وَعَلٰۤی اٰلِ یَعۡقُوۡبَ کَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤی اَبَوَیۡكَ مِنۡ قَبۡلُ اِبۡرٰهِیۡمَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ۶[۲]

''جب یوسفؑ نے اپنے باپ یعقوبؑ سے کہا: ''اے بابا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔'' یعقوبؑ نے کہا: ''اے بیٹے! اپنے خواب کو اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا کہ وہ تمہارے خلاف سازش کریں گے۔ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور (جو کچھ تم نے دیکھا ہے) ایسا ہی ہوگا کہ تمہارا پروردگار تم کو برگزیدہ کرے گا اور تمہیں خوابوں کی تعبیر سکھائے گا اور اپنی نعمت کو تم پر اور خاندانِ یعقوبؑ پر کامل کرے گا جس طرح وہ پہلے تمہارے دادا پر دادا ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر اپنی نعمتیں پوری کر چکا ہے۔ بیشک تمہارا پروردگار بڑا دانا و حکیم ہے۔''

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے فرزند کے خواب کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے اور سمجھ گئے کہ وہ مستقبل میں بلند مقام و منزلت پر فائز ہوں گے۔[۳]

واضح رہے کہ خواب کی تعبیر و تاویل، حقیقت سے آگاہی ایک قسم کی غیب کی آگاہی ہے اور اللہ تعالیٰ مخصوص افراد کو اس لطف میں

---

[۱] تفسیر المیزان، ج ۲۰ ص ۱۱۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] سورہ یوسف آیات ۴ تا ۶

[۳] تفسیر مجمع البیان ج ۵ ص ۲۱۰ رجوع کیا جائے۔

شامل حال کرتا ہے۔

۴۔ اِذۡهَبُوۡا بِقَمِيۡصِىۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰى وَجۡهِ اَبِىۡ يَاۡتِ بَصِيۡرًا‌ ۚ وَاۡتُوۡنِىۡ بِاَهۡلِكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ۝۹۳ وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّىۡ لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ‌ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ۝۹۴ [۱]

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے آخری ملاقات میں اپنا تعارف کروایا اور اپنی قمیص ان کو دی اور فرمایا: ''یہ میری قمیص لے جاؤ اور اس کو ابا کے چہرے پر ڈال دینا، وہ پھر بینا ہو جائیں گے اور پھر تم سب گھر والوں کو لے کر میرے پاس چلے آنا۔'' جونہی قافلہ مصر سے چلا تو کنعان میں جو مصر سے بہت فاصلے پر ہے، یعقوبؑ نے کہا: ''اگر مجھے سٹھایا ہوا نہ کہو تو (ایک بات کہوں کہ) مجھے یوسفؑ کی خوشبو آ رہی ہے۔''

ظاہری نظروں سے دیکھا جائے تو حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی اور نہ ہی وہ یہ جانتے تھے کہ انہوں نے مصر میں اپنے بھائیوں کو اپنا تعارف کروایا ہے اور ان کے بھائی یہ پر مسرت خبر لے کر کنعان کی طرف رواں دواں ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''مجھے یوسفؑ کی خوشبو آ رہی ہے۔'' یہ علم غیب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس خاص موقع پر حضرت یعقوبؑ کو عنایت فرمایا۔

۵۔ رَبِّ قَدۡ اٰتَيۡتَنِىۡ مِنَ الۡمُلۡكِ وَعَلَّمۡتَنِىۡ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ‌ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَنۡتَ وَلِىّٖ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ ۚ تَوَفَّنِىۡ مُسۡلِمًا وَّاَلۡحِقۡنِىۡ بِالصّٰلِحِيۡنَ۝۱۰۱ [۲]

''حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''اے پروردگار! تو نے مجھے سلطنت اور فرماں روائی عطا کی اور احادیث کی تاویل اور خوابوں کی تعبیر سکھائی، تو آسمانوں اور زمین کا آفریدگار ہے، تو دنیا اور آخرت میں میرا ولی ہے۔ مجھے اس دنیا سے مسلمان اٹھا اور مجھے اپنے صالح بندوں سے ملحق کر۔''

اس آیت میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خوابوں کی تاویل اور تعبیر سکھائی اور یہ علم غیب کا ایک شعبہ ہے۔

---

[۱] سورہ یوسف آیات ۹۳ تا ۹۴

[۲] سورہ یوسف آیت ۱۰۱

۶۔ وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾...... يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ.........[۱]

''جب یوسفؑ کو قید میں ڈالا گیا تو ان کے ساتھ دو جوان بھی قید میں ڈالے گئے۔ ایک دن ان میں سے ایک نے یوسفؑ سے کہا: ''میں نے خواب دیکھا ہے کہ انگور نچوڑ رہا ہوں'' دوسرے نے کہا: ''میں سر پر روٹیاں اٹھائے ہوں اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔'' دونوں نے (حضرت) یوسف سے اپنے خوابوں کی تعبیر چاہی اور کہا کہ ہم تمہیں نیکوکاروں میں سے سمجھتے ہیں...... یوسفؑ نے پہلے جوان کے خواب کی تعبیر میں بتایا: ''تم بادشاہ کے ساقی بنو گے۔'' اور دوسرے جوان سے کہا: ''تجھے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا اور پرندے تیرا سر نوچیں گے......''

قرآن نے وضاحت کی ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ ان میں سے ایک نے نجات پائی اور بادشاہ کا ساقی بن گیا اور دوسرا سولی پر چڑھ گیا۔ واضح ہے کہ یہ خواب کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام کی غیب کی خبروں میں شمار ہوگی۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ......... يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ......... قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ [۲]

''مصر کے فرمانروا نے ایک خواب دیکھا کہ سات دبلی پتلی گائیں سات موٹی تازی گاؤں کو کھائے جاتی ہیں۔

---

[۱] سورہ یوسف ۳۶ تا ۴۱

[۲] سورہ یوسف آیات ۴۳ تا ۴۹

اس نے سات تازہ سبز بالیوں کے ساتھ ساتھ سوکھی بالیاں دیکھیں۔ وہ خواب سے بیدار ہوا اور اپنے درباریوں سے خواب کی تعبیر معلوم کرنا چاہی۔ آخر کار یوسفؑ سے اس کی تعبیر پوچھی گئی۔ یوسفؑ نے خواب کی تعبیر یوں بتائی ''تم لوگ متواتر سات برس کاشت کاری کرتے رہو گے اور جو (فصل) تم کاٹو تھوڑی سی مقدار جو تم کھاتے ہو اس کے علاوہ باقی کو بالیوں میں رہنے دینا۔ اس کے بعد بڑے سخت سات برس آئیں گے اور جو کچھ تم لوگوں نے ان سات سالوں کے واسطے پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا سب کھا جاؤ گے، مگر قدر قلیل جو تم بچا رکھو گے۔ بس پھر اس کے بعد اور سال آئے گا جس میں خوب مینہ برسے گا اور لوگ قحط سے نجات پائیں گے۔''

اس داستان میں حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے تین مخفی امور سے پردہ اٹھایا ہے اور ان کی خبر دی ہے:

الف) سات برس تک نعمت فراواں ہوگی اور زراعت کی حالت بہت اچھی ہوگی۔

ب) اس کے بعد سات برس قحط و خشک سالی کے آئیں گے۔ ان میں رحمت کے دروازے لوگوں پر بند ہوں گے۔

ج) پندرہویں سال دوبارہ خدا کی رحمت سب پر سایہ فگن ہوگی اور لوگ خدا کی عظیم نعمتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔

۸۔ وَيٰقَوۡمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَـكُمۡ اٰيَةً فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِىۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ عَذَابٌ قَرِيۡبٌ‏ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوۡهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوۡا فِىۡ دَارِكُمۡ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ‌ ؕ ذٰلِكَ وَعۡدٌ غَيۡرُ مَكۡذُوۡبٍ‏ ﴿۶۵﴾ [1]

حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کو خدا پرستی کی دعوت دینے کے لیے مبعوث ہوئے۔ وہ معجزے کے طور پر ایک اونٹنی لے کر آئے اور فرمایا: ''اے میری قوم! یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لیے معجزہ ہے۔ اسے آزاد رہنے دو کہ خدا کی زمین میں کھائے اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ فوراً عذاب خدا تمہیں آ لے گا۔'' مگر انہوں نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔ تب صالح نے کہا: ''اچھا تم تین دن تک اپنے گھروں میں عیش اڑا لو اور جان لو کہ خدا کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔''

لیکن ان لوگوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی باتوں پر کان نہ دھرا، اس اونٹنی کو قتل کر دیا اور اپنے آپ کو عذاب الٰہی کا موجب قرار دے لیا۔ اس موقع پر حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو خبردار کیا کہ تین دن کے بعد عذاب خدا ان کو گھیر لے گا۔ قرآن مجید کے مطابق ایسا ہی ہوا، یعنی تین روز کے بعد عذابِ الٰہی ان پر نازل ہوا۔ اس سے بڑھ کر کون سی غیب کی خبر ہوگی کہ پیغمبر معجزہ الٰہی کا احترام نہ کرنے والے افراد کے

---

[1] سورہ ہود آیات ۶۴، ۶۵

انجام کی خبر دے اور کہے کہ تم تین دن سے زیادہ دنیا میں نہیں رہو گے اور عذاب خدا تمہیں نابود کر دے گا۔

۹۔ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ [1]

''سلیمانؑ داؤدؑ کا وارث بنا اور اس نے کہا: ''اے لوگو! خدا نے مجھے پرندوں کی زبان سکھائی ہے اور دنیا کا سب کچھ مجھے عطا کیا ہے۔ یہ میرے لیے صریح فضیلت و برتری ہے۔''

کیا حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمانؑ کا پرندوں کی زبان جاننا اور ان کے مقصود سے آگاہ ہونا علم غیب کے علاوہ کوئی چیز ہے؟

۱۰۔ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا [2]

''جب سلیمانؑ کا لشکر چیونٹیوں کی وادی میں پہنچا تو ایک چیونٹی نے کہا: ''اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کا لشکر غفلت کی حالت میں تمہیں روند ڈالے۔'' سلیمانؑ اس کی اس بات پر مسکرائے اور ہنس پڑے۔''

کیا چیونٹیوں کی زبان سے آگاہ ہونا انسان کے عام حواس کی قلمرو سے باہر نہیں ہے اور علم غیب کی ایک قسم شمار نہیں ہوتا؟

۱۱۔ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿۲۰﴾ .... فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾ [3]

''سلیمانؑ نے کہا: ''کیا بات ہے میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا؟ کیا وہ غائب ہے؟''............ تھوڑی دیر کے بعد ہدہد آ گیا اور سلیمانؑ سے کہا: ''میں نے وہ چیز دیکھی ہے جو آپؑ نے بھی نہیں دیکھی اور میں آپؑ کے لیے ''سبا'' سے ایک یقینی اور درست خبر لایا ہوں۔''

---

[1] سورہ نمل آیت ۱۶

[2] سورہ نمل آیت ۱۸، ۱۹

[3] سورہ نمل آیات ۲۰ تا ۲۲

۱۲۔ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ .... [۱]

جو کچھ تم کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو اس کی خبر دیتا ہوں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی غیب سے آگاہی کو اپنے دوسرے معجزات کے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "میرا معجزہ یہ ہے کہ اندھوں اور کوڑھیوں کو باذن اللہ شفا دیتا ہوں اور مردوں کو خدا کے اذن سے زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو یا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو اس کی خبر دیتا ہوں۔"

۱۳۔ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ .... [۲]

"(حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں): "اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور موسیٰ کی تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور تمہیں اپنے بعد کے رسول جس کا نام احمدؐ ہے، کے آنے کی بشارت اور خوشخبری دیتا ہوں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کی خبر دینا جبکہ ان کا آپس میں فاصلہ تقریباً چھ سو سال کا ہے کیا یہ غیب کی خبر نہیں ہے؟

۱۴۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝ [۳]

"نبی اکرمؐ نے ایک راز اپنی ازواج میں سے ایک سے کہا (اور اسے تاکید کی کہ وہ اس راز کو فاش نہ کرے) لیکن اس نے رسولؐ کا راز دوسری کو بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا اور آپؐ کو اطلاع دی کہ آپؐ کی بیوی نے آپؐ کا راز دوسری سے کہہ دیا ہے باوجودیکہ رسولِ گرامیؐ کو معلوم ہو گیا کہ آپؐ کی بیوی نے تمام راز دوسری کو بتا دیا ہے لیکن آپؐ نے اس کے ایک حصے کی طرف اشارہ فرمایا اور

---

[۱] سورہ آل عمران آیت ۴۹

[۲] سورہ صف آیت ۶

[۳] سورہ تحریم آیت ۳

دوسرے حصے کی طرف اشارہ نہ فرمایا یعنی اپنی بیوی سے فرمایا کہ جو راز میں نے تمہارے سپرد کیا تھا اس کو تو نے فاش کر دیا ہے۔ آپؐ کی زوجہ نے اس کی تصدیق کی اور پوچھا کہ یہ خبر آپؐ کو کس نے دی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"نبانی العلیم الخبیر" "دانا اور آگاہ خدا نے مجھے باخبر کیا ہے۔"

تمام آیت بالخصوص "نبانی العلیم الخبیر" پر غور وفکر کرنے سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی قرآنی کے علاوہ اور پنہاں راستے سے غیب سے آگاہ فرمایا۔ یہاں تک نقل کی جانے والی آیات بخوبی دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء الٰہی مثلاً آدمؑ، نوحؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، صالحؑ، داوٗدؑ، سلیمانؑ، عیسیٰؑ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیب کی خبریں دی ہیں۔

اب ایسی آیات نقل کی جاتی ہیں جو انبیاء کے علاوہ افراد کے علم غیب پر دلالت کرتی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ علم غیب فقط انبیاء الٰہی سے اختصاص نہیں رکھتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے یہ عنایت فرماتا ہے اور اس کو اس جہان کے غیب سے آگاہ فرماتا ہے۔

۱۵۔ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنۡهُ ۖۗ اسۡمُهُ الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ وَجِيۡهًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ۝٤٥ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝٤٦ [1]

"جب فرشتوں نے مریمؑ سے کہا: "اے مریمؑ! اللہ تمہیں ایک بیٹے کی بشارت دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح ہے۔ عیسیٰ بن مریمؑ دنیا و آخرت میں آبرومند اور درگاہِ الٰہی کے مقربین میں سے ہے اور گہوارے میں لوگوں سے گفتگو کرے گا۔"

حضرت مریم علیہا السلام کا شوہر نہیں تھا۔ ان کے لیے یہ خبر کہ اللہ تعالیٰ ان خصوصیات اور اس نام کے ساتھ انہیں ایک فرزند عطا فرمائے گا، کیا علم غیب نہیں؟ کیا علم غیب کا معنی لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ امور سے آگاہی نہیں؟

۱۶۔ وَلَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَآ اِبۡرٰهِيۡمَ بِالۡبُشۡرٰى قَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ .... وَامۡرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتۡ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَمِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ يَعۡقُوۡبَ ۝٧١ قَالَتۡ يٰوَيۡلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوۡزٌ وَّهٰذَا بَعۡلِىۡ شَيۡخًا ؕ اِنَّ هٰذَا

---

[1] آل عمران آیات ۴۵، ۴۶

لَشَیۡءٌ عَجِیۡبٌ﴿۷۲﴾ قَالُوۡۤا اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ﴿۷۳﴾[۱]

''ہمارے بھیجے ہوئے (یعنی فرشتے) بشارت کے ساتھ ابراہیمؑ کے پاس گئے اور کہا: ''تم پر سلام......'' اس کی زوجہ جو کھڑی تھی ہنس پڑی۔ اسے ہم نے اسحق اور اسحق کے بعد یعقوبؑ کی بشارت دی۔ وہ کہنے لگی: ''ایں!! اب جب کہ میں خود بوڑھی ہوں اور میرا خاوند بھی بوڑھا ہے، کس طرح بچہ جنوں گی اور یہ تو بڑی تعجب خیز بات ہے۔'' فرشتوں نے اس سے کہا: ''کیا تم خدا کی قدرت پر تعجب کرتی ہو؟ اے اہل بیت نبوت تم پر خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔ بیشک وہ عظیم حمد وثنا کے قابل ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ کا اس بات سے آگاہ ہونا کہ بڑھاپے میں خدا انہیں ایک فرزند عطا کرے گا کیا علم غیب نہیں ہے؟ ان اور ایسے واقعات سے ایسے افراد کا جو پیغمبر نہیں ہیں فرشتوں کے ذریعے آگاہ ہونا کیا علم غیب اور غیب کی آگاہی کے سوا کوئی اور چیز ہے؟

۱۷۔ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡہُ اِلَیۡکِ وَ جَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ﴿۷﴾[۲]

''ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ موسیٰؑ کو دودھ پلائے اور جب تمہیں اس کے بارے میں خوف لاحق ہو تو اسے دریا میں ڈال دو اور خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو۔ ہم اسے تمہاری طرف پلٹا دیں گے اور اسے مرسلین میں سے قرار دیں گے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ حضرت موسیٰؑ کے مستقبل سے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا اور انہیں ماں کی طرف پلٹا دے گا، سے آگاہ تھیں۔ کیا یہ علم غیب نہیں ہے؟

مذکورہ بیس آیتوں میں غور وفکر کرنے سے اس مسئلے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انبیاء اور خدا کے بعض دیگر بندوں کے علم غیب کا امکان بلکہ اس کا وقوع اور تحقیق قرآن مجید کے مسلم مسائل میں سے ہے۔

(ایسی آیات جو پہلی نظر میں علم غیب کو فقط خدا سے مختص کرتی ہیں اور غیر خدا کے لیے اس کی نفی کرتی ہیں، سوالوں کے جوابات کے حصے میں ان کی وضاحت کی جائے گی۔)

لہٰذا جو بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے وہ انسان کے لیے علم غیب کا انکار نہیں کرسکتا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ علم غیب خدا سے مخصوص ہے اور

---

[۱] سورہ ہود ۶۹ تا ۷۳

[۲] سورہ قصص آیت ۷

اپنی اس غلط بات کے ثبوت کے لیے ایسی آیات جو ظاہراً علمِ غیب کو خدا سے مختص کرتی ہیں، سے استدلال نہیں کر سکتا۔[1]

معرفت سوم و احادیث نبویؐ

۱۔ کسریٰ کے خزانوں میں تصرف

عدی بن حاتم کہتا ہے کہ میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے نیازمندی کا اظہار کیا۔ کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے راستے کے غیر محفوظ ہونے کی شکایت کی۔ اب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا: ''کیا تم نے 'حیرہ'[2] دیکھا ہے'' میں نے کہا: ''اس کے بارے میں سنا ہے لیکن اسے دیکھا نہیں۔'' آپؐ نے فرمایا: ''تھوڑی مدت کے بعد پورے علاقے میں امن وامان ہوگا۔ کاروان خانہ خدا کی زیارت کے لیے 'حیرہ' سے حرکت کرے گا اور اس راستے میں سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرے گا۔'' پھر آپؐ نے اضافہ فرمایا: ''اگر تمہاری عمر نے وفا کی تو تم اس گروہ میں سے ہوگے جو کسریٰ کے خزانوں کو فتح کرے گا۔''

عدی کہتا ہے میں زندہ رہا اور میں نے دیکھا کہ حیرہ سے خانہ خدا کی زیارت کے لیے قافلے نے حرکت کی اور پورے علاقے میں امن وامان کی حکومت تھی اور میں ان افراد میں سے تھا جنھوں نے کسریٰ کے خزانوں کو فتح کیا۔[3]

۲۔ یہ شخص خوارجِ نہروان[4] کا سردار ہوگا

بنی تمیم کا ایک شخص (جنگی غنائم کی تقسیم کے موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرتے ہوئے آپؐ سے کہتا ہے:

---

[1] ایسی آیات جو انسان کے علمِ غیب کی واقعیت کی حکایت کرتی ہیں ان بیس آیات میں منحصر نہیں ہیں بلکہ اور آیات بھی موجود ہیں کہ جن کے ذکر سے اختصار کی خاطر گریز کیا گیا ہے، مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے ہم سفر سے مکالمہ کہ جو سورہ کہف کی آیات ۶۰ سے ۸۲ تک میں بیان کیا گیا ہے۔

[2] شاید حیرہ سے مراد ملوک عرب کا پایہ تخت ہے جو اس وقت ایرانی حکومت کے زیر تسلط تھا۔

[3] لئن طالت بك حياة لتفتحن كنوز كسرىٰ...... التاج، ج ۳ ص ۲۸۷ از بخاری و نیز از صحیح بخاری ج ۴ ص ۲۳۹، ۲۴۶، ۲۴۷ و صحیح مسلم ج ۸ ص ۱۸۷ و مسند احمد ج ۱ ص ۲۱۰ و ج ۴ ص ۲۵۷ و ج ۵ ص ۸۹، ۱۰۳، ۱۰۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[4] خوارج نہروان وہی گروہ تھا جو ظاہراً اہل عبادت اور مقدس تھے لیکن اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی کی وجہ سے حضرت علی علیہ السلام سے دشمنی رکھتے تھے، ان کی اطاعت سے خارج ہوگئے تھے اور انہوں نے جنگ نہروان برپا کی تھی۔

''عدالت کو ترک نہ کرو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں عدالت کی رعایت نہیں کروں گا تو پھر کون کرے گا؟ اگر عدالت پیشہ نہ بنوں تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گا۔''

ایک صحابی نے کہا: ''آپؐ اجازت دیں کہ اس جسارت کے بدلے جو اس نے آپؐ سے کی ہے اسے قتل کر دیں۔'' رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے اتفاق نہ کیا اور فرمایا: ''یہ شخص ایک ایسے گروہ کا سردار ہوگا کہ اگر ان کی نمازوں اور روزوں کو دیکھو گے تو اپنی نمازوں اور روزوں کو بہت ہی ناچیز شمار کرو گے، لیکن وہ اس صفت کے باوجود دین سے اس طرح خارج ہو جائیں گے جس طرح تیر کمان سے خارج ہوتا ہے۔''[1]

یہ شخص ذوی الخویصرۃ خوارج نہروان کا سردار تھا۔ تاریخ میں اس کے انجام کا ذکر موجود ہے۔

۳۔ حضرت علیؑ کا ماہِ رمضان میں حالت نماز میں شہید ہونا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ماہ رمضان سے پہلے اس ماہ کی فضیلتوں کے بارے میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ خطبے کے اختتام پر حضرت علیؑ نے کھڑے ہو کر سوال کیا: ''اے رسولؐ خدا! اس ماہ میں افضل ترین عمل کونسا ہے؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''محرمات اور گناہوں سے پرہیز۔'' آپؐ نے یہ جملہ فرمایا اور گریہ کرنے لگے۔ حضرت علی علیہ اسلام نے عرض کیا: ''آپؐ کیوں گریہ فرما رہے ہیں؟'' آپؐ نے فرمایا: ''اس کے لیے جو اس ماہ میں تمہارے ساتھ پیش آئے گا۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم حالت نماز میں ہو اور صالح کی اونٹنی کے قاتل کی طرح شقی ترین شخص تمہاری ریش کو تمہارے سر کے خون سے رنگین کر رہا ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام نے عرض کیا: کیا جب میں قتل ہوں گا تو میرا دین سلامت ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں دین کی سلامتی کے ساتھ قتل ہو گے۔''[2] (اس سوال سے میری مراد یہ تھی کہ اگر میرا دین محفوظ ہو اور قتل ہو جاؤں تو غمگین نہیں ہوں کیونکہ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے

---

[1] التاج، ج ۵ ص ۳۱۳، صحیح بخاری ج ۴ ص ۲۴۳ و ج ۶ ص ۲۴۴ و ج ۹ ص ۲۱ و صحیح مسلم ج ۳، ص ۱۹۰ و ۱۱۰ و مسند احمد ج ۳ ص ۳۳، ر ۳، ۵۶، ۶۰، ۶۵ ور ۲۴۴ اور سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۵۹ ۔ ۶۲ کی طرف رجوع کیا جائے۔ حدیث کی عبارت یہ ہے:

"ان له اصحابا يحقر احد كم صلاته مع صلوتهم و صيامه مع صايمهم يقرون القران لايجاوز تراقيهم يموقون من الاسلام كما يمرق اسهم من الرمية......")

[2] كانى بك و انت تصلى لربك و قدانبعث اشقى الاولين والاخرين شقيق عاقر ثمود فضربك ضربة على فرنك فخضب منها الحيتك...... عیون اخبار الرضا، ج ۱ ص ۲۹۵ ۔ ۲۹۷، امالی صدوق ص ۵۷ ۔ ۵۸ اور بحار الانوار کی ج ۹۶، ص ۳۵۸ پر فضائل الاشہر الثلاثہ سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نہیں چھپی۔

کہ انسان بے دین اور بے ایمان اس دنیا سے چلا جائے۔)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس گفتگو میں حضرت علی علیہ السلام کے ماہ رمضان میں اور حالت نماز میں قتل ہونے کی خبر دی تھی اور ان میں سے ہر ایک جدگانہ غیب کی خبر شمار ہوتی ہے۔

۴۔ ابوذرؓ کی موتِ تنہائی

جنگ تبوک میں حضرت ابوذرؓ کا اونٹ جواب دے گیا اور حضرت ابوذرؓ لشکر اسلام سے پیچھے رہ گئے۔ کچھ دیر تو انہوں نے اونٹ کے بہتر ہونے کا انتظار کیا مگر دیکھا کہ اگر اس سے زیادہ رکتا ہوں تو لشکر سے بہت پیچھے رہ جاؤں گا، لہٰذا انہوں نے اونٹ کو وہیں چھوڑا، سامان سفر اٹھایا اور پیدل چل پڑے تاکہ اپنے آپ کو لشکر تک پہنچا سکیں۔ لشکر ایک مقام پر آرام کر رہا تھا کہ اچانک دور سے ایک شخص تنہا پیدل آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک مسلمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: ''حضورؐ دیکھیں ایک شخص دور سے پیدل اور تنہا چلا آ رہا ہے۔'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اُمید ہے ابوذرؓ ہوگا۔''

جب اچھی طرح دیکھا تو ابوذرؓ ہی تھے۔ انہوں نے بہت زیادہ خوش ہو کر کہا: ''یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا کی قسم! ابوذرؓ ہے۔'' رسولؐ خدا نے فرمایا: ''خدا ابوذرؓ پر رحمت فرمائے کہ تنہا چلتا ہے، تنہا مرے گا اور تنہا ہی اٹھایا جائے گا۔''

بہت عرصہ گزر گیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لیے بہت سے ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا جس کے سب مسلمان گواہ ہیں کہ جب ابوذرؓ کو حضرت عثمانؓ کے حکم سے شہر و آبادی سے دور ربذہ، کے صحرا کی طرف جلاوطن کر دیا گیا اور انہوں نے اسی مقام پر نہایت ناگفتہ بہ اور کسمپرسی کی حالت میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

ایک قافلہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ وہ لوگ ابوذرؓ کی موت سے باخبر ہوئے۔ ان میں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی حضرت عبداللہؓ بن مسعود بھی تھے۔ جب انہوں نے یہ منظر دیکھا تو روتے ہوئے کہا:

"صدق رسول الله (صلی الله علیه وآله وسلم) تمشي وحدك و تموت وحدك و تبعث وحدك"

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا کہ اے ابوذرؓ! تم تنہا چلو گے، تنہا مرو گے اور تنہا اٹھائے جاؤ گے۔''

آخر کار اسی قافلے نے حضرت ابوذرؓ کو ربذہ کے بیابان میں سپرد خاک کیا۔[1]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۵۲۳۔۵۲۴

۵۔حضرت عائشہ کی علی علیہ السلام سے جنگ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زوجہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

''گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم علیؑ سے جنگ کرنے کے لیے ''حواب''[۱] سے عبور کر رہی ہو اور وہاں کے کتے تم پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور تم علیؑ سے اس حالت میں جنگ کر رہی ہو۔تم اس جنگ میں ظالم ہو۔اے عائشہؓ! کہیں ایسا نہ کرنا۔''[۲]

۶۔حضرت علیؑ کی تین گروہوں سے جنگ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کے تاریک مستقبل سے آگاہ تھے۔پیمان شکن (ظالم و باغی ستمگر) اور مرتد فرقوں کے پیدا ہونے کے بارے میں آپؐ نے خبر دی اور حضرت علی علیہ السلام کو بتایا کہ تم ان تین گروہوں سے جنگ کرو گے۔

یا علی: "تقاتل الناکثین والقاسطین والمارقین"

''تم پیمان شکن، (ظالم، باغی و ستمگر) اور مرتد گروہوں سے جنگ کرو گے۔''[۳]

۷۔عمار یاسرؓ کو باغی گروہ قتل کرے گا

اسلام کے طاقتور جوان عمار یاسرؓ مسجد بنانے کے لیے مسلمانوں کی مدد کرتے ہوئے اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ان کی سادگی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ افراد نے ان پر قوت برداشت سے زیادہ بوجھ رکھ دیا۔عمار یاسر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: ''یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انہوں نے مجھے مار ڈالا ہے۔میری توانائی سے زیادہ مجھ پر بوجھ لاد دیا ہے۔''

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے عمارؓ کی پشت سے گرد کو صاف کیا اور اس طرح ان سے اظہار محبت فرمایا۔اس کے بعد فرمایا: ''یہ تمہیں قتل نہیں کریں گے، تمہیں باغی گروہ قتل کرے گا۔''

---

[۱] 'حوأب' بصرہ کے راستے میں ایک جگہ کا نام ہے۔مراصد الاطلاع ج ۱ ص ۴۳۳

[۲] "یا حمیراء کانی بك تنجك کلاب الحوأب تقاتلین علیا وانت ظالمة یا حمیراء ایاك ان تکونی انت۔" مستدرک حاکم نیشاپوری ج ۳ ص ۱۲۰۔مسند احمد ج ۵۶ ص ۵۲، ۹۷، عقد الفرید ج ۲ ص ۲۸۳

[۳] مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۴۰، تاریخ بغداد ج ۸ ص ۳۴۰ میں یہ عبارت نقل ہوئی ہے۔قال علی (علیه السلام) امرنی رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم بقتال الناکثین والمارقین والقاسطین۔

"انما تقتلك الفئة الباغية" [1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیب کی یہ خبر جنگ صفین میں ظاہر ہوئی اور جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی تھی حضرت عمارؓ امیر المومنین علی علیہ السلام کے ہمرکاب تھے اور معاویہ کے حامیوں، کہ جو باغی گروہ تھا، کے ہاتھوں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت عمارؓ کے قتل ہوجانے کے بعد معاویہ کے لشکر میں عجیب ہلچل مچ گئی کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس خبر کو سب نے سن رکھا تھا۔ معاویہ اور اس کی فوج کے ہاتھوں حضرت عمارؓ کے شہید ہونے سے یہ واضح ہوگیا کہ معاویہ اور اس کا لشکر وہی گروہ ہے جسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باغی گروہ کے عنوان سے یاد فرمایا ہے۔ نیز یہ بھی روشن ہوگیا کہ حضرت علی علیہ اسلام اور ان کے اصحاب حق پر ہیں اور یہ واقعہ اس بات کا سبب بنا کہ وہ افراد جو اس جنگ میں حضرت علی علیہ اسلام کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں تھے وہ شک وشبہ کی کیفیت سے نکل آئے اور آپؑ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

۸۔ شیرویہ نے خسرو پرویز کو قتل کیا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف ممالک کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام کے لیے خط لکھے۔ ایک خط خسرو پرویز کو لکھا اور اسے کہا کہ اسلام لے آئے اور دین "تقدیس" اور آگ کے احترام کو ترک کردے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کے انداز تحریر سے سخت ناراض ہوا۔ اس نے یمن کے گورنر 'باذان' کو لکھا کہ وہ بہادر اور دلیر افراد کے ذریعے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گرفتار کر کے ایران کی طرف روانہ کرے۔

'باذان' کے بھیجے گئے افراد مدینہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے تمام روداد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی۔ آپؐ نے ان کو کل آنے کو کہا۔ جب دوسرے دن وہ آئے تو آپؐ نے ان سے فرمایا: "یمن واپس چلے جاؤ اور باذان سے جا کر کہو کہ خداوند تعالیٰ نے خسرو پرویز کے بیٹے شیرویہ کو اس پر مسلط کر دیا ہے اور اس نے باپ کو قتل کر دیا ہے، میرا دین واقتدار ایران کی سرزمین تک حتما پہنچے گا اور تمام جہان پر چھا جائے گا۔" [2]

اس طرح آنحضرتؐ ایران میں رونما ہونے والے واقعے سے آگاہ تھے جبکہ اس کی کسی کو بھی خبر نہیں تھی۔ آپؐ نے انہیں خبر دی نیز

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ا ص ۴۹۶، ۴۹۷، اسد الغابہ ج ۴ ص ۴۶، ۴۷، صحیح بخاری ج ا ص ۱۲۲، صحیح مسلم ج ۸ ص ۱۸۶، سنن ترمذی ج ۵، ص ۳۳۳ اور مسند احمد ج ۲، ص ۱۶۱، ۱۶۴، ۲۰۶ و ج ۳ ص ۵، ۲۲، ۲۸، ۹۱، ج ۴ ص ۱۹۷، ۱۹۹، ۳۰۶، ۳۰۷، ج ۶ ص ۲۸۹ و ۳۰۰، ۳۱۱، ۳۱۵ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] تاریخ طبری، ج ۳، ص ۱۵۷۳ اور سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۷۸۔

اور حدیث کا کچھ حصہ یوں ہے: "ديني وسلطاني سيبلغ ملك كسرىٰ"

اسلام کے مستقبل کے بارے میں بھی آ گاہ کیا کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے گا۔

۹۔زبیر کی علی علیہ السلام سے جنگ

جنگ جمل میں حضرت علی علیہ السلام نے زبیر سے کہا:

''کیا تجھے یاد ہے کہ ایک دن تو اور میں گروہ انصار کے سقیفہ میں موجود تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے فرمایا تھا:''کیا تم علیؑ کو دوست رکھتے ہو؟''

تم نے جواب دیا:''علیؑ سے دوستی میں کیا چیز رکاوٹ ہو سکتی ہے؟''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:''تم جلد ہی اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہو گے اور اس سے جنگ کرو گے جبکہ تم ظالم اور ستمگر ہو گے۔''

زبیر نے حضرت علی علیہ السلام کی بات کی تصدیق کی......۔[۱]

۱۰۔بنی امیہ کا مسلمانوں کی جان،مال اور دین پر مسلط ہونا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی معاشرے کے تاریک مستقبل اور بنی امیہ کے لوگوں پر تسلط کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اذا کملت بنو امیة ثلاثین رجلاً اتخذوا بلاد اللہ دولا وعباد اللہ خولا ودین اللہ وغلا"

''جب بنی امیہ کی تعداد تیس مردوں تک پہنچ جائے گی تو یہ شہروں کو آپس میں تقسیم کرلیں گے اور حکومت ان کے ہاتھوں میں گردش کرے گی۔ وہ خدا کے بندوں کو اپنے بندے خیال کریں گے اور دین الٰہی کو خراب کریں گے۔''[۲]

جب حضرت ابوذر غفاریؓ نے یہ خبر حضرت عثمانؓ کو سنائی تو وہ لرز گئے اور انہوں نے اس خبر کی صحت وصداقت سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے کسی کو علی علیہ السلام کے پاس بھیجا۔حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عثمانؓ کی مجلس میں حضرت ابوذرؓ کی تصدیق کی اور فرمایا اس خبر کو میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے۔''

---

[۱] مستدرک حاکم ج ۳،ص ۳۶۶ "ستقاتله وانت له ظالم"

[۲] تاریخ یعقوبی، ج ۲ ص ۱۷۲ طبع لبنان اور مسند احمد ج ۳،ص ۸۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بات نے حضرت عثمان اور اس کے بعد معاویہ اور یزید اور دوسرے حکمرانوں کے ادوار میں واضح طور پر عملی صورت اختیار کی اور اموی حکومت نے مختلف ادوار میں خواہ وہ حضرت عثمان کا دور رہو یا معاویہ کا دور، خواہ وہ آل مروان کا دور ہو، انسانیت اور تاریخ اسلام کے چہرے کو سیاہ کیا ہے۔

معاویہ کے گورنروں اور حکمرانوں نے بیت المال اور عوامی اموال کو غارت کر کے بڑے بڑے محل تعمیر کیے۔ وسیع وعریض زمینوں کے مالک تھے اور حیرت انگیز حد تک مال ودولت ان کے پاس تھی۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کرتے تھے۔

یہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دس غیب کی خبریں تھیں کہ جو احادیث اور تاریخ کی کتب میں نقل کی گئی ہیں۔ ہم نے ان چند خبروں کو بطور نمونہ ذکر کیا ہے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیب کی خبروں پر مشتمل ایک جداگانہ کتاب تالیف کرنے کی ضرورت ہے۔

نہج البلاغہ اور غیب کی خبریں

۱۔ بصرہ شہر غرق ہوگا

جنگ جمل کے اختتام پر اور بصرہ فتح ہونے کے بعد حضرت علی علیہ اسلام نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس کا کچھ حصہ آپؑ کی غیب کی خبریں شمار ہوتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

"وایم اللہ لتغرقن بلدتکم کانی بمسجد کم کجو جو سفینۃ..."

''خدا کی قسم تمہارا شہر غرق ہوگا اور تمہاری مسجد کشتی کے سینے (اگلا حصہ کہ کشتی کا سارا جسم پانی کے اندر چلا جاتا ہے صرف اس کا سینہ پانی پر ظاہر ہوتا ہے) کی طرح دکھائی دے گی۔ اللہ اوپر اور نیچے سے اس شہر پر عذاب نازل کرے گا۔''[۱]

ابن ابی الحدید اس کلام کی شرح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اب تک بصرہ دو دفعہ پانی میں غرق ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ ''القادر اللہ'' کے دور میں اور دوسری دفعہ ''القائم بامر اللہ'' کے دور میں۔ خلیج فارس کے پانی کی طغیانی نے اس شہر کو ڈبو دیا۔ شہر کی تمام عمارتیں صرف جامع مسجد کے کچھ حصے کے علاوہ بالکل اس طرح جیسا علی علیہ السلام نے فرمایا تھا پانی کے اندر غرق ہو گئیں۔ ان دونوں حادثوں میں تمام عمارتیں اور گھر تباہ ہو گئے اور لوگوں کی بہت زیادہ تعداد غرق ہو گئی۔[۲]

۲۔ معاویہ کا سرزمین عراق پر مسلط ہونا

امیر المومنین علی علیہ السلام خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ معاویہ سے پہلے اس دنیا سے چلے جائیں گے اور ان کے بعد معاویہ عراق پر مسلط ہو جائے گا۔ پھر مزید فرماتے ہیں:

'انہ یامرکم بسبی والبرائۃ منی..."

''وہ تم سے چاہے گا کہ مجھ گالی دو اور مجھ سے بیزاری اختیار کرو۔''[۳]

جیسا کہ حضرت علی علیہ اسلام نے فرمایا تھا آپؑ کے بعد معاویہ عراق پر مسلط ہو گیا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ وہ آپؑ پر سب کریں

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳

[۲] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ا ص ۲۵۳ (جو بیس جلدوں میں چھپی ہے)

[۳] نہج البلاغہ خطہ ۵۷

اور آپؑ سے بیزاری اختیار کریں۔ حضرت علی علیہ السلام پر سب کرنے کی افسوسناک رسم کہ جو نمازِ جمعہ کے خطبوں تک میں معاویہ کے زمانے میں اس کے حکم سے شروع ہوئی تاریخ کے اوراق میں ثبت ہو چکی ہے۔[1]

۳۔ تم میں سے دس مریں گے نہیں اور ان میں سے دس سلامت نہیں بچیں گے

نہروان کے کنارے حضرت علی علیہ السلام اور خوارج کے درمیان لڑی جانے والی جنگ میں امام علیہ السلام نے اتمام حجت اور ان میں سے بعض افراد کے امام علیہ السلام کی صفوں میں پلٹ آنے کے بعد اپنے اصحاب کی طرح رخ کر کے فرمایا:

"مصارعهم دون النطفة والله لايفلت منهم عشرة ولايهلك منكم عشرة"[2]

''ان کی قتل گاہ نہروان کے پانی کا کنارہ ہے۔ خدا کی قسم ان میں سے دس افراد بھی جان سلامت نہیں پائیں گے اور تم میں سے دس افراد بھی نہیں مریں گے۔''

ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ یہ غیب کی خبر حضرت علی علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک ہے جو تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ سب لوگ گواہ ہیں کہ جنگ نہروان جو حضرت علی علیہ السلام اور خوارج کے درمیان لڑی گئی ہیں فقط نو افراد خوارج میں سے جان بچا سکے جبکہ آپؑ کے اصحاب میں سے صرف آٹھ افراد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[3]

۴۔ مروان بن حکم کی کم مدت حکومت

جنگ جمل میں مروان بن حکم قید ہو گیا۔ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام نے اپنے والد بزرگوار سے اس کے لیے معافی طلب کی۔ آنحضرتؑ نے اس کو آزاد کر دیا اور پھر فرمایا:

"اما ان له امرة كلعقة الكلب انفه وهو ابو الاكبش الاربعة وستلقى الامة منه و من ولده يوماً احمر"[4]

''آگاہ رہو کہ مروان کے لیے تھوڑی مدت کی حکومت ہے جتنا کتا اپنی ناک کو چاٹتا ہے (یہ تعبیر کم مدت کی

---

[1] شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۵۵۔۱۲۸ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۵۸

[3] شرح نہج البلاغہ ج ۵ ص ۳۔۱۳ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[4] نہج البلاغہ خطبہ ۷۲

حکومت کے لیے کنایہ ہے)۔ یہ چار حکمرانوں کا باپ ہے اور امت اسلامی اس کے اور اس کے بیٹوں کے دورِ حکومت میں خونیں ایام دیکھے گی۔"

جیسا کہ آنحضرتؑ نے خبر دی تھی مروان کو حکومت ملی مگر صرف نو ماہ کے لیے اور اس کے چار بیٹے عبدالملک، عبدالعزیز، بشر اور محمد حکومت تک پہنچے۔ عبدالملک خلیفہ بنا اور باقی تین مصر، عراق اور جزیرہ کے والی بنے۔

امت اسلامی نے مروان اور اس کے بیٹوں کے ہاتھوں خونیں دن دیکھے اس کی واضح ترین مثال وہ ظلم و ستم اور خونریزی ہے جو حجاج بن یوسف جیسے خونخوار کے ہاتھوں انجام پائی۔ یہ خونخوار عبدالملک بن مروان کی طرف سے عراق کا گورنر اور والی تھا۔[۱]

۵۔ ثقیفی جوان کا مسلط ہونا

"اما واللہ یسلط علیکم غلام ثقیف الذیال المیال یأکل خضرتکم و یذیب شحمتکم......"[۲]

"آگاہ رہو! خدا کی قسم! طائفہ ثقیف کا ایک متکبر اور ظالم شخص تم پر مسلط ہوگا۔ وہ تمہاری زرخیزی کو کھا جائے گا اور تمہاری چربی کو پانی میں تبدیل کر دے گا (یہ اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ وہ تمہاری جان و مال پر رحم نہیں کھائے گا اور سب کچھ اپنا سمجھے گا)۔"

یہ ثقیفی جوان وہی خونخوار اور ظالم شخص ہے جو حجاج بن یوسف کے نام سے معروف ہے۔ اُس نے اپنے دورِ حکومت میں عوام کی جان و مال کو غارت کیا اور ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتارا۔[۳]

٦۔ امام مہدی علیہ السلام کا پروگرام۔ قرآن و ہدایت کی پیروی

"یعطف الھوی علی الھدی اذا عطفوا الھدی علی الھوی و یعطف الرأی علی القران اذا عطفوا القران علی الرأی"[۴]

"جب عوام ہدایت کو اپنی نفسانی ہوا و ہوس کا پیروکار بنا دیں اس وقت مہدی موعود (علیہ السلام) آئیں گے اور

[۱] شرح نہج البلاغہ ج٦، ص ۱۴۲-۱۴۸ کی طرف رجوع کیا جائے۔
[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۵
[۳] شرح نہج البلاغہ ج۷، ص ۲۷٦-۲۷۱
[۴] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۸

نفسانی ہواو ہوس پر ہدایت کو غالب کر دیں گے۔ نیز جب لوگ قرآن کو اپنے ذاتی نظریات و آراء اور میلانات پر منطبق کریں گے تو مہدی موعودؑ آراء و نظریات کو قرآن کا تابع بنائیں گے۔ ان کا پروگرام قرآن و ہدایت کی حاکمیت ہے۔[1]

۷۔لوگوں کی تمام خصوصیات کی خبر دینا

"واللہ لوشئت ان اخبر کل رجل منکم بمخرجه و مولجه و جمیع شانه لفعلت و لکن أخاف ان تکفروا فی برسول الله صلی الله علیه وآله وسلم ..."[2]

''خدا کی قسم! اگر میں چاہوں تو تم میں سے ہر ایک کی تمام خصوصیات بتا سکتا ہوں کہ کہاں سے، کیسے اور کیا مقصد لے کر آئے ہو اور کیا کرنا چاہتے ہو؟ اور اسی طرح دوسری خصوصیات کی خبر دے سکتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ تم میرے بارے میں غلو کرنے لگو اور مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برتر سمجھنے لگو یا مجھے خدا سمجھنے لگو اور یہ عقیدہ تمہارے کفر کا موجب بن جائے۔''

ابن ابی الحدید اس کلام کے ذیل میں لکھتا ہے کہ علی علیہ السلام کا یہ کلام حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام کی طرح ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرے معجزات میں سے یہ ہے کہ:

وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ[3]

''میں تمہیں اس چیز کے بارے میں خبر دیتا ہوں جو تم گھروں میں کھاتے ہو اور ذخیرہ کرتے ہو۔''[4]

۸۔جب فقط اسلام کا نام باقی رہ جائے گا

"یاتی علی الناس زمان لا یبقی فیهم من القران الا رسمه و من الاسلام

---

[1] شرح نہج البلاغہ ج۹ ص۱۳۸
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۶
[3] سورہ آل عمران آیت ۴۹
[4] شرح نہج البلاغہ ج۱۰ ص۱۰۔۱۵

الا اسمه مساجد هم یومئذ عامرة من البناء خراب من الهدی......"[۱]

''ایسے دن آئیں گے کہ لوگوں کے درمیان قرآن صرف پڑھنے اور قراءت کی حد تک اور اسلام صرف نام کا باقی رہ جائے گا۔ اس زمانے میں مساجد عمارتوں اور بناوٹ سجاوٹ کے لحاظ سے آباد اور پر ہوں گی لیکن معنویت اور ہدایت کے لحاظ سے برباد ہوں گی۔ (مسلمان صرف اسلام وقرآن کے نام پر اکتفا کریں گے اور مسجدوں میں جانا خود ایک قسم کی نمائش بن جائے گا جبکہ اسلام اور قرآن ان کی زندگی پر حاوی اور ان کے دلوں پر حاکم ہونا چاہیے۔)''

۹۔ خوارج کی خواری وذلت

خورارج سے فرمایا:

"اما انکم ستلقون بعدی ذلا شاملا و سیفا قاطعا واثرة یتخذها الظالمون فیکم سنة"[۲]

''یادرکھو! میرے بعد تمہیں ہر طرف سے ننگی تلواروں، ظلم وستم اور ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تمہارے اموال اور حقوق کو ظالمین چھین لیں گے اور یہ کام تمہارے لیے ہمیشہ کے لیے رسم اور معمول بن جائے گا۔''

جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا خوارج ہمیشہ حکومتوں کی طرف سے ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہے ہیں اور ہمیشہ ظالموں کی طرف سے ان کے اموال غارت ہوتے رہے ہیں۔[۳]

۱۰۔ جو پوچھو بتاؤں گا

"فاسألونی قبل ان تفقدونی، فوالذی نفسی بیده لاتسألونی عن شیئ فیما بینکم وبین الساعة...... الا انبأتکم......"[۴]

---

[۱] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۳۶۹

[۲] نہج البلاغہ خطبہ ۵۷

[۳] شرح نہج البلاغہ خطبہ ۵۷ کے ذیل میں۔

[۴] نہج البلاغہ خطبہ ۸۹

''اس خطبے میں امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے علم غیب کی حدود کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''قیامت تک کے حالات کے بارے میں جو کچھ پوچھنا چاہو پوچھو، تمہیں جواب دوں گا اور ہر جنگ اور لڑائی کے بارے میں جو پیش آئے گی اور اس کی خصوصیات کے بارے میں، اس میں مرنے والوں یا قتل ہونے والوں کی تعداد، یا یہ کہ کہاں قتل ہوں گے اور کہاں دفن ہوں گے۔ میں ان سب کا علم رکھتا ہوں۔''[1]

یہ تھیں امیر المومنین علیہ السلام کی غیب کی خبریں جو نہج البلاغہ میں ذکر ہوئی ہیں۔

البتہ آنحضرتؑ کی غیب کی کل خبریں جو نہج البلاغہ اور دوسری تاریخ اور حدیث کی کتب میں ذکر ہوئی ہیں، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ موجودہ دور کے ایک عالم نے ان میں سے پچھتر موارد پر مشتمل ایک کتاب ''امیر المومنینؑ کی اخبار غیب'' کے نام سے تالیف کر کے چھپوائی ہے، لیکن ہم اختصار کی وجہ سے صرف انہی مذکورہ موارد پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ج ۷ ص ۵۷ کی طرف رجوع کیا جائے۔

احادیث آئمہؑ اور معرفتِ سوم

جیسا کہ اس کتاب کے پانچویں حصے میں ذکر کیا گیا ہے کہ جن کتب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومینؑ کی غیب کی خبریں جمع کی گئی ہیں ان میں سے ایک محدث عالیقدر شیخ حر عاملی (متوفی ۱۱۰۴ ہجری) کی قابل قدر کتاب ''اثبات الہداۃ بالنصوص و المعجزات'' ہے۔

راقم نے بہت زیادہ تحقیق کے ساتھ نہیں بلکہ سرسری طور پر اس کتاب میں موجود غیب کی خبروں کو شمار کیا ہے اور ان کو فہرست وار عزیز قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ چونکہ گذشتہ دو بابوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام کی غیب کی خبریں ذکر ہو چکی ہیں لہٰذا اس باب میں حضرت امام حسن علیہ السلام تا امام مہدی آخری الزمان کی غیب کی خبریں ذکر کی جائیں گی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی غیب کی خبریں دس احادیث سے زیادہ ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی غیب کی خبریں دس احادیث ہیں۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام کی غیب کی خبریں تقریباً بیس حدیثیں ہیں۔

حضرت امام باقر علیہ السلام کی غیب کی خبریں پچاس احادیث کے قریب ہیں۔

حضرت امام صادق علیہ السلام کی غیب کی خبریں ایک سو پچاس احادیث ہیں۔

حضرت امام کاظم علیہ السلام کی غیب کی خبریں اسی احادیث کے قریبی ہیں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کی غیب کی خبریں ایک سو تیس احادیث ہیں۔

حضرت امام جواد علیہ السلام کی غیب کی خبریں تیس احادیث سے زیادہ ہیں۔

حضرت امام ہادی علیہ السلام کی غیب کی خبریں تقریباً پچاس احادیث ہیں۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام علیہ السلام کی غیب کی خبریں اسی سے زیادہ احادیث ہیں۔

حضرت امام زمان علیہ السلام کی غیب کی خبریں ایک سو سے زیادہ احادیث ہیں۔

البتہ ان میں سے بعض احادیث تکرار ہوئی ہے۔ اگر تکرار کی گئی احادیث کو شمار نہ بھی کیا جائے پھر بھی ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہر مصنف مزاج قاری کے لیے اطمینان بخش ہیں۔

یہاں پر ہم نمونے کے طور پر امام علیہ السلام سے ایک ایک غیب کی خبر کتاب ''اثبات الہداۃ'' ہی سے نقل کرتے ہیں۔

۱۔ امام مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنی بیوی ''جعدہ'' کے ہاتھوں اپنے مسموم ہونے کی خبر دی۔ نیز امام حسن علیہ السلام سے فرمایا:

''امت اسلام ہونے کا دعویٰ کرنے والوں میں سے تیس ہزار افراد تمہارے قتل کرنے کے لیے اور تمہارے گھر والوں اور بچوں کو

اسیر بنانے کے لیے جمع ہوں گے۔''[1]

۲۔ عمر بن سعد نے امام حسین علیہ السلام سے کہا: ''یا ابا عبداللہ! ہماری جانب کے کچھ بے عقل لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں آپؑ کو قتل کروں گا۔'' حضرت نے فرمایا: ''وہ بے عقل نہیں بلکہ عقل مند لوگ ہیں۔ البتہ میں یہ بات بخوبی جانتا ہوں کہ تم میرے بعد عراق کی تھوڑی سی گندم ہی کھا سکو گے۔''[2]

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ داستانِ کربلا کے بعد وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا، عراق سے باہر نہیں جا سکے گا اور ری کی حکومت تک نہیں پہنچ سکے گا۔

۳۔ امام سجاد علیہ السلام نے اپنے فرزند امام باقر علیہ السلام سے فرمایا:

''میرے بعد تمہارا بھائی عبداللہ امامت کا دعویٰ کرے گا اور لوگوں کو اپنی طرف دعوت دے گا لیکن اس کی عمر کم ہے اور بہت جلدی دنیا سے چلا جائے گا۔''

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے والد کی رحلت کے بعد میرے بھائی عبداللہ نے امامت اور باپ کی جانشینی کا دعویٰ کیا لیکن کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ جس طرح والد بزرگوار نے خبر دی تھی ویسا ہی ہوا اور وہ دنیا سے چل بسا۔[3]

۴۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک جوان کو مسجد میں دیکھا جو ہنس رہا تھا آپؑ نے فرمایا:

''خانۂ خدا میں تم ہنس رہے ہو جبکہ تم تین دن کے بعد مر جاؤ گے۔''

وہ جوان تین دن کے بعد دنیا سے چل بسا۔

نیز آپؑ نے ابوبصیر سے فرمایا:

''جب تم کوفہ واپس جاؤ گے تو خدا تمہیں دو بیٹے عطا فرمائے گا۔ ایک کا نام عیسیٰ اور دوسرے کا نام محمد رکھو گے اور وہ دونوں ہمارے شیعوں میں سے ہوں گے۔''

ابوبصیر کہتا ہے جیسا امامؑ نے فرمایا تھا اسی طرح ہوا۔[4]

۵۔ ایک شامی شخص اور ہشام آپس میں امامت کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ اس واقعے میں شامی نے ہشام سے پوچھا: ''ہمارے زمانے میں امام کون ہے؟'' ہشام نے امام صادق علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''اس وقت ہمارے امام یہ شخص

---

[1] اثبات الہداۃ ج ۵، ص ۱۴۷ و ۱۵۰ 'امالی' صدوق اور خرائج راوندی سے نقل کیا ہے۔
[2] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۱۹۹ 'ارشاد' شیخ مفید سے نقل کیا ہے۔
[3] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۲۴۵، ۲۴۶ کشف الغمہ اربلی سے منقول ہے۔
[4] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۳۰۵ مشارق الانوار سے منقول ہے۔

ہیں جو یہاں بیٹھے ہیں اور لوگ وشہ وکنار سے ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ آپؑ ہمیں زمین وآسمان کی خبریں دیتے ہیں۔ ان کو یہ علم وحکمت اپنے باپ دادا سے ملا ہے اور انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ورثے میں پایا ہے۔''

شامی نے کہا: ''میں کیسے تمہاری بات قبول کروں اور کہاں سے اس کی تصدیق کروں۔''

ہشام نے کہا: ''ابھی اسی وقت جو چاہو ان سے پوچھو۔''

امام صادق علیہ السلام نے اس کی طرف رخ کیا اور فرمایا: ''کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے سفر کی تمام جزئیات کے بارے میں تمہیں بتاؤں؟'' جب آپؑ نے تمام جزئیات اسے بتا دیں تو اس شامی نے آپؑ کی امامت کی تصدق کی اور آپؑ کی امامت پر ایمان لے آیا۔[1]

۶۔ سلیمان بن حفص کہتا ہے:

میں امام ہفتم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ ان سے دریافت کروں کہ آپؑ کے بعد امام کون ہیں۔ قبل اس کے کہ میں سوال کرتا حضرتؑ نے فرمایا: ''اے سلیمان! میرے بعد میرا فرزند علیؑ میرا وصی وجانشین اور لوگوں پر حجت خدا ہے۔''[2]

۷۔ حمزہ بن جعفر کہتا ہے:

ایک سال حضرت رضا علیہ السلام اور ہارون الرشید دونوں حج پر آئے ہوئے تھے۔ ایک دن ہم مسجد الحرام میں تھے کہ ہارون ایک دروازے سے نکلا اور امام رضا علیہ السلام دوسرے دروازے سے۔ میں آپؑ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپؑ نے ہارون کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

''اس کا گھر کتنا دور ہے اور ملاقات نزدیک۔'' پھر فرمایا: ''طوس، طوس، اے طوس تو جلدی ہارون اور مجھے جمع کرے گا۔''[3]

اس طرح آپؑ نے اپنے اور ہارون کے خراسان میں دفن ہونے کی خبر دی۔

۸۔ حضرت عبدالعظیم حسنی جو ''ری'' میں مدفون ہیں، کہتے ہیں:

میں امام جواد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا قائم آلِ محمدؑ ہی مہدی موعود ہیں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہیں؟

میرے سوال کرنے سے پہلے آپؑ نے فرمایا: ''اے عبدالعظیم! قائم آل محمدؑ ہی مہدی ہیں۔''[4]

---

[1] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۳۳۶ کافی، ارشاد مفید، اعلام الوری طبرسی اور احتجاج طبرسی سے نقل کیا ہے۔

[2] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۵۰۸ عیون اخبار الرضا سے نقل کیا ہے۔

[3] اثبات الہداۃ ج ۶ ص ۷۷ عیون اخبار الرضا سے نقل کیا ہے۔

[4] اثبات الہداۃ ج ۶ ص ۱۸۱۔ اکمال الدین صدوق سے منقول ہے۔

۹۔ احمد بن عیسی کہتا ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میں نے خواب میں دیکھا کہ انہوں نے مجھے ایک مٹھی کھجوریں مرحمت فرمائیں۔ میں نے کھجوروں کو شمار کیا تو وہ پچیس تھیں۔ اس کے بعد حضرت امام ہادی علیہ السلام کی خدمت میں مشرف ہوا تو انہوں نے ایک مٹھی کھجوریں مجھے عنایت فرمائیں اور فرمایا کہ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے زیادہ تمہیں دی ہوتیں تو میں بھی تمہیں زیادہ دیتا۔

احمد بن عیسیٰ کہتا ہے کہ میں نے جب کھجوریں گنیں تو وہ اسی طرح پوری پچیس تھیں۔ [۱]

۱۰۔ حجاج عبدی کہتا ہے:

جب میں بصرہ سے چلا تو میرا بیٹا بیمار تھا۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سامرہ میں تھے۔ میں نے انہیں لکھا کہ اس کے حق میں دعا فرمائیں۔

آپؑ نے میرے جواب میں لکھا: ''اللہ تعالیٰ تیرے بیٹے پر رحمت کرے کہ وہ باایمان تھا۔''

کچھ مدت کے بعد مجھ تک بصرہ سے بیٹے کے فوت ہونے کی خبر پہنچی تو معلوم ہوا کہ جس دن حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے خط لکھا تھا اسی دن وہ فوت ہوا۔ [۲]

یہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین علیہ السلام اور آئمہ علیہم السلام کی غیب کی خبروں کے چند نمونے تھے جو ان تین ابواب میں ذکر کیے گئے۔ اب اگر محترم قاری اس سے زیادہ مقدار میں مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو وہ اثبات الہداۃ کی طرف رجوع کرسکتا ہے جو فارسی ترجمے کے ساتھ سات جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

معرفتِ سوم اور دس سوال

گذشتہ بحثوں میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انبیاء اور ائمہ کی غیب سے آگاہی کے امکان پذیر ہونے میں قرآن مجید، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ائمہ معصومین اور جدید علوم کی روشنی میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ نیز ان کی غیب کی خبروں سے جو قرآن اور روایاتِ متواترہ سے نقل ہوئی ہیں اس بات پر کسی کو بھی شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ وہ غیب کا علم رکھتے تھے۔ یعنی امکان عمل کے مرحلے پر پہنچ چکا ہے۔

اب ہم ایسی آیات اور روایات پر تحقیق کرتے ہیں جن کے بارے میں بعض افراد کا خیال ہے کہ وہ بطور کلی انبیاء اور ائمہؑ کے علم غیب کی نفی کرتی ہیں۔ نیز علم غیب پر ہونے والے اعتراضات کا جواب بھی دیتے ہیں۔ چونکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس باب کے مطالب کی زیادہ

[۱] اثبات الہداۃ ج ۶ ص ۲۶۶ الصراط المستقیم علی بن یونس بیاضی عاملی سے منقول۔

[۲] اثبات الہداۃ ج ۶ ص ۳۲۳ خرائج راوندی سے منقول۔

وضاحت کی جائے۔اس لیے ہم مطالب کو سوال و جواب کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔

سوال اول:

اگر انبیاء اور ائمہ غیب کا علم رکھتے ہیں تو پھر کیوں قرآن مجید بہت سی آیات میں علم غیب کو اللہ تعالیٰ سے مختص قرار دیتا ہے؟

جواب:

جواب دینے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم ایسی تمام آیات کو بیان کریں جو امکان طور پر علم غیب کے ذاتِ خدا سے اختصاص پر دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ .... [1]

جب فرشتوں نے ''اسما'' [2] سے اپنی عدم آگاہی کا اعتراف کیا اور حضرت آدم علیہ السلام نے خدا کے حکم سے ان کو ''اسماء'' سے آگاہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں (کہ جنہوں نے زمین پر آدمؑ کی خلافت پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ آدمی مفسد اور خونریز ہیں زمین پر خلیفہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے) سے فرمایا:

''کیا میں نے تمہیں نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو میں جانتا ہوں کہ آدمؑ اس دانش وحکمت کو حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے حتیٰ کہ وہ فرشتوں سے آگے بڑھ سکتا ہے اور تم آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم نہیں رکھتے۔''

۲۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝ [3]

اس آیت میں اور سورہ توبہ کی آیت ۹۴ اور ۱۰۵، رعد کی آیت ۹، مومنوں کی آیت ۹۲، سجدہ کی آیت ۶، زمر کی آیت ۴۶، حشر کی آیت ۲۲، جمعہ کی ۸ اور سوہ تغابن کی آیت ۱۸ میں "عالم الغیب و الشهادة" کا جملہ خدا کے ناموں اور صفات میں سے ایک نام اور صفت کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔اسی طرح سورہ سباء کی آیت ۳ میں "عالم الغیب" اور سورۃ مائدہ کی آیت ۱۰۹ اور ۱۱۶ میں، سورۃ توبہ کی آیت ۷۸ میں اور سورہ سباء کی آیت ۴۸ میں "علام الغیوب" خدا کی صفات اور اسماء کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔

مذکورہ آیات میں بعض سے واضح طور پر استفادہ ہوتا ہے کہ یہ نام اور صفت ذاتِ اقدس الٰہی سے مختص ہے۔مثلاً:

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۳۳

[2] اسماء سے مراد موجوداتِ جہان کے حقائق ہیں۔

[3] سورہ انعام ۷۳

قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ [۱]

جس دن خدا تمام پیغمبروں کو جمع کرے گا اور کہے گا: ''لوگوں نے تمہاری دعوت کو کس طرح قبول کیا؟'' وہ کہیں گے: ''ہم علم نہیں رکھتے فقط تو علام الغیوب اور اسرار کا جاننے والا ہے۔''

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾ [۲]

وہ کہتے ہیں کیوں وہ معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل نہیں ہوتا۔ کہو: فقط اللہ غیب جانتا ہے۔ پس تم منتظر رہو اور میں بھی منتظر رہوں گا۔

۱۸۔ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [۳]

آسمانوں اور زین کا غیب اللہ کے لیے ہے۔

۱۹۔ نیز یہی جملہ سورہ نحل کی آیت ۷۷ میں آیا ہے۔

۲۰۔ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ .... [۴]

آسمانوں اور زمین کا غیب اسی کے لیے ہے۔

۲۱۔ اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ [۵]

اللہ آسمانوں اور زمین کے غیب کا عالم ہے۔

۲۲۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ [۶]

بیشک اللہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے۔

---

[۱] سورہ مائدہ ۱۰۹

[۲] سورہ یونس ۲۰

[۳] سورہ ہود ۱۲۳

[۴] سورہ کہف ۲۶

[۵] سورہ فاطر ۳۸

[۶] سورہ حجرات ۱۸

یہ وہ آیاتِ مبارکہ تھیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ علم غیب کے خدا سے اختصاص پر دلالت کرتی ہیں۔ اب سوال دہراتے ہیں:
کیا انبیاء اور ائمہؑ کا علم غیب مذکورہ بائیس آیات کے منافی نہیں؟

جواب

فرض کیا کہ ان تمام آیات کی علم غیب کے اللہ تعالیٰ سے اختصاص پر دلالت صحیح ہو اور ان میں سے کسی ایک کی دلالت پر شک نہ بھی ہو پھر بھی آئمہ اور انبیاء کا علم غیب اس بات کے ذرہ برابر بھی منافی نہیں کیونکہ جیسا کہ قرآن مجید اور روایات سے استفادہ ہوتا ہے انبیاء اور آئمہ کا علم تعلیم الٰہی کی بنا پر ہے اور اس امر میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ علم غیب ذاتاً اللہ تعالیٰ سے مختص ہو اور اللہ تعالیٰ اس میں سے کچھ اپنے برگزیدہ بندوں کو عطا کر دے۔ اس آیت کی طرف توجہ کریں۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝٢٦ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ....... [1]

فقط خدا غیب کا عالم ہے اور کسی کو بھی غیب پر مسلط نہیں کرتا مگر ان بندں کو جن سے وہ راضی ہے رسولوں میں سے۔

یقیناً آپ متوجہ ہوئے ہوں گے کہ اس آیت کا آغاز مذکورہ بائیس آیات جیسا ہے جو کہ سوال میں ذکر ہوا ہے یعنی علم غیب خدا سے مختص ہے، لیکن اس کے باوجود آیت اپنے ذیل میں فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم غیب کو اپنے ان برگزیدہ بندوں کو عطا کرتا ہے کہ جو رسول ہیں۔ [2]

اسی بنا پر علم غیب کا خداوند تعالیٰ سے اختصاص اس کی تعلیم سے اس کے بندوں میں سے اس کا حامل ہونے کے منافی نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ انبیاء اور آئمہ کا علم غیب ذاتی اور تعلیم الٰہی کے بغیر ہے تو یہ بات ان آیات کے مفہوم سے منافی ہوگی، لیکن کسی بھی اسلامی عالم نے ایسی بات نہیں کہی بلکہ سب نے صریحاً یہ کہا ہے کہ انبیاء اور آئمہ کا علم غیب تعلیم الٰہی سے ہے۔

سوال دوم

قرآن مجید میں ایسی آیات ذکر ہوئی ہیں جو نہ صرف علم غیب کو اللہ تعالیٰ سے مختص قرار دیتی ہیں بلکہ دوسروں سے اس کی نفی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ آیات:

١۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ.......... [3]

---

[1] سورہ جن ٢٦، ٢٧

[2] ایسی آیات جو انبیاء علیہم السلام کے علم غیب پر دلالت کرتی ہیں اس کتاب کے چھٹے حصے میں ذکر کی گئی ہیں۔

[3] سورہ انعام ٥٩

علم غیب کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی بھی ان سے آگاہ نہیں۔

۲۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ط [۱]

کہہ دے! آسمانوں اور زمین میں خدا کے علاوہ کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔

کیا یہ آیات انبیاء اور آئمہؑ کے علم غیب کی نفی نہیں کرتیں۔

جواب

جب ان آیات کو ان آیات کے ساتھ ملا کر دیکھیں جن کا مطلب یہ ہے:

''ہم اپنے برگزیدہ بندوں کو علم غیب عطا کرتے ہیں۔'' جیسا کہ اس آیت میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ص
[۲]

اللہ غیب سے تمہیں مطلع نہیں کرتا، لیکن اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے (اور اس علم غیب سے مطلع کرتا ہے)۔

ان دو قسم کی آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی بھی اپنے طور پر غیب کا عالم نہیں ہے اور اللہ تعالٰی جو ذاتاً [۳] عالم غیب ہے اور وہ اپنے انبیاء اور برگزیدہ بندوں کو غیب سے آگاہ کرتا ہے۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ ہم ایک قسم کی آیات کو دیکھیں اور دوسری قسم کی آیات جو پہلی قسم کی آیات کے معانی کے واضح اور روشن ہونے میں پوری طرح دخیل ہیں، ان کو نظر انداز کر دیں۔

سوال سوم

قرآن مجید میں ایسی آیات آئی ہیں جو واضح طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم غیب کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ط اِنْ

---

[۱] سورہ نمل ۶۵

[۲] آل عمران ۱۷۹

[۳] اس جیسی آیات چھٹے حصے میں ذکر کی گئی ہیں۔

اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٩﴾ [1]

کہہ دو! میرا کردار رسولوں میں بدعت اور نئی چیز نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا اور میں صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں اور ایک واضح ڈرانے والے سے زیادہ نہیں ہوں۔

۲۔ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٥٠﴾ [2]

ہمارے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ اللہ کے خزانے میرے پاس ہیں اور میں غیب نہیں جانتا اور میں تم سے نہیں کہوں گا کہ میں فرشتہ ہوں، جو کچھ میری طرف وحی ہوتا ہے میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں۔ کہہ دو کیا اندھا اور بینا برابر ہیں، کیوں تم تفکر نہیں کرتے؟

۳۔ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ .... [3]

اور میں تم سے نہیں کہوں گا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں غیب نہیں جانتا۔

۴۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٨﴾ [4]

کہہ دو میں اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو خدا چاہے۔ اگر میں علم غیب رکھتا تو اپنے لیے فراواں خیر اکٹھی کر لیتا اور ذرا بھی بدی و شر مجھ تک نہ پہنچتا۔ میں مومنین کے لیے ڈرانے والے اور بشارت دینے والے سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔

۵۔ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى

---

[1] سورہ احقاف آیت ۹

[2] سورہ انعام آیت ۵۰

[3] سورہ ہود آیت ۳۱

[4] سورہ اعراف ۱۸۸

النِّفَاقِ ۚ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ﴿١٠١﴾ [1]

تمہارے اطراف کے گنوار دیہاتیوں میں سے بعض منافق ہیں اور خود مدینہ کے رہنے والوں میں سے بھی بعض منافق ہیں جو نفاق میں غرق ہیں۔ تم ان کو نہیں جانتے ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم عنقریب ان کو دو بار سزا دیں گے۔ پھر یہ لوگ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

۶۔ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنتُكُمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۖ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ ﴿١٠٩﴾ [2]

اگر وہ پھر جائیں تو تم کہہ دو کہ میں نے تمہیں یکساں خبر دی ہے اور میں نہیں جانتا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ نزدیک ہے یا دور۔

۷۔ يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ ۖ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿١٠٩﴾ [3]

جس دن اللہ اپنے رسولوں کو جمع کرے گا پس کہے گا: لوگوں نے تمہیں کیا جواب دیا؟ وہ کہیں گے ہم نہیں جانتے (ہمیں اس کا علم نہیں) تو غیب کا عالم ہے۔

۸۔ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٦٩﴾ إِن يُوحَىٰ إِلَيَّ إِلَّا أَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٧٠﴾ [4]

عالم بالا کے رہنے والوں (فرشتوں) کے باہم بحث و مباحثہ کی مجھے خبر نہیں تھی اور جو مجھے وحی کی گئی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

اب پھر ہم سوال دہراتے ہیں:

---

[1] سورہ توبہ ۱۰۱

[2] سورہ انبیاء ۱۰۹

[3] سورہ مائدہ ۱۰۹

[4] سورہ ص ۶۹، ۷۰

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم غیب جو آیات قرآن اور متواتر روایات سے ثابت ہوتا ہے کی ان آٹھ آیتوں کی روشنی میں کس طرح توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جو آپؐ کے علم غیب کی نفی کرتی ہیں؟

جواب

کبھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض مصنفین نے ان آیات سے چشم پوشی کی ہے جو انبیاء اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم غیب پر دلالت کرتی ہیں اور مندرجہ بالا آیات سے یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی طرح بھی غیب سے آگاہ نہیں تھے۔

ان آیات سے استدلال کرنے والوں نے چونکہ ان کے مفہوم اور ہدف میں ضروری غور وفکر نہیں کیا اس لیے انہوں نے خود قرآن مجید کے خلاف نتیجہ اخذ کیا ہے۔لیکن اگر وہ تعصب کے پردے سے ہٹ کر پہلے والی اور بعد والی آیات کو مدنظر رکھتے، نیز دوسری آیات جو اس نفی اور سلب کے سبب کی واضح کرسکتی ہیں، کی طرف توجہ کرتے تو وہ ایسا نتیجہ ہرگز اخذ نہ کرتے۔

مذکورہ آیت آیات کے معنی کو واضح کرنے کے لیے ہم ہر ایک کے بارے میں جدگانہ بحث کرتے ہیں۔

پہلی آیت

یہ آیت چار جملوں پر مشتمل ہے۔اس کے مفہوم سے آگاہی کے لیے ان چار جملوں میں سے ہر ایک پر کافی غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ ما کنت بدعا من الرسل

میری رفتار اور گفتار بدعت اور کوئی نئی چیز نہیں۔

۲۔ وما ادری ما یفعل بی ولا بکم

میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔

۳۔ ان اتبع الا ما یوحی الی

میں فقط وحی کی پیروی کرتا ہوں۔

۴۔ وما انا الا نذیر مبین

میں صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

پہلے جملے کے بارے میں اجمالاً یہ بات ہے کہ مشرکین یہ خیال کرتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشری ضروریات مثلاً کھانا، سونا اور چلنا وغیرہ سے مبرا ہونا چاہیے۔وہ کہتے تھے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیغمبر ہیں تو پھر وہ کھاتے کیوں ہیں اور گلی کوچوں میں کیوں چلتے ہیں؟ انہیں تو اس قسم کے بشری آثار سے منزہ اور مبرا ہونا چاہیے۔اپنے اس اعتراض کو وہ مندرجہ ذیل جملے اور اس قسم کے جملوں میں بیان کرتے تھے:

مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ [1]

قرآن مجید سورۂ فرقان اور زیر بحث آیت کے آغاز میں اس اعتراض کا جواب دیتا ہے کہ یہ پیغمبرؐ سابقہ پیغمبروں سے اس جہت سے یکساں ہے کیونکہ وہ بھی کھاتے تھے، لوگوں سے میل جول رکھتے تھے۔ اس صورت میں اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کام نئے اور جدید نہیں ہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

ما کنت بدعا من الرسل

میں ان امور میں سابقہ انبیاء کی روش کے برخلاف نہیں ہوں۔

اور سورہ فرقان میں فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ [2]

تم سے پہلے جو رسول ہم نے بھیجے ہیں وہ سب تیری طرح کھاتے تھے اور بازار میں آتے جاتے تھے۔

زیر بحث آیت کے پہلے جملے اور سورۂ فرقان کی اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشرکین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مافوق البشر خیال کرتے تھے، ان معنوں میں کہ وہ کھانا، پینا اور بازار میں آنا جانا مقام نبوت کے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے۔

وہ اس توقع کے ساتھ ساتھ اور بھی توقعات رکھتے تھے مثلاً یہ کہ پیغمبر اکرمؐ کو مافوق البشر طاقت اور قدرت کا حامل ہونا چاہیے، آپؐ کو ذاتاً اور تعلیم الٰہی کے بغیر غیب کا عالم ہونا چاہیے اور آپ کو غیب کی خبریں دینا چاہئیں یا علم غیب آپؐ کو تفویض کیا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ اس بے بنیاد خیال کو رد کرتے ہوئے اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے:

''ان سے کہہ دو کہ میں ایک بشر سے زیادہ کچھ نہیں اور کوئی بھی بشر الٰہی تعلیم کے بغیر اپنے اور دوسروں کے انجام اور مستقبل سے آگاہ نہیں کر سکتا۔''

وما ادری ما یفعل بی ولا بکم

میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟

اس بنا پر آیت کریمہ میں علم غیب کی وہ قسم مراد ہے جو بدونِ تعلیم الٰہی اور تفویض کی صورت میں ہو۔ علم غیب کی اس صورت کی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکمل صراحت کے ساتھ نفی کی گئی ہے۔ لیکن اس علم غیب کی نفی (ذاتی معنوں میں اور بدونِ تعلیم الٰہی اور تفویض کی

---

[1] سورہ فرقان آیت ۷

[2] سورہ فرقان آیت ۲۰

صورت میں) آنحضرتؐ کے وحی اور تعلیم الٰہی کے ذریعے غیب سے آگاہ ہونے کے ذرہ برابر منافی نہیں۔

اس کا شاہد تیسرا جملہ ہے:

"ان اتباع الا مایوحی الی" (میں وحی کے تابع ہوں)

کیونکہ وحی غیب سے آگاہی ہی کا ایک راستہ ہے۔ پروردگار اس کے ذریعے اپنے پیغمبروں کو پنہائی مطالب اور حواس سے غائب امور کی ایک قسم سے آگاہ اور مطلع کرتا ہے۔

اگر واقعاً آیت کا مطلب یہ تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی لحاظ سے بھی غیب سے آگاہ نہیں (حتیٰ کہ تعلیم الٰہی سے بھی) تو دوسرے اور تیسرے جملوں کے درمیان ایک قسم کا تناقض اور تضاد پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ یہ بات ہرگز صحیح نہیں کہ کوئی ہر قسم کے علم غیب کو بطور مطلق اپنے آپ سے نفی کرے اور پھر بلا فاصلہ اس کی ایک قسم کو اپنے لیے اثبات کرے۔

اگر بعد والا جملہ استثناء کی صورت میں بیان ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ استثنائی حکم رکھتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ استثناء کی صورت میں بیان نہیں ہوا۔ پس واضح ہوا کہ پہلے جملے سے مراد علم غیب کی ایک قسم کی نفی ہے (جو تعلیم الٰہی کے بغیر علم غیب ہے) اور بعد والے جملے کا مقصد علم غیب کی ایک اور قسم کا اثبات کرنا ہے کہ وہ آگاہی وحی اور تعلیم الٰہی کے طریق سے ہے۔

اس آیت کا مقصود علم ذاتی اور تعلیم الٰہی کے بغیر کی نفی ہے۔ اس بات کا ایک اور گواہ آیت کا چوتھا جملہ ہے۔ "وما انا الا نذیر مبین" (میں ایک ڈرانے والے سے زیادہ کچھ نہیں)

یعنی تمہاری توقعات بیجا ہیں جو تم کہتے ہو کہ مجھے ذاتی طور پر غیب کا عالم ہونا چاہیے۔ میں تو صرف پیغمبرؐ ہوں۔ جو کچھ میرے اختیار میں دیا جائے اس کو جانتا ہوں اور اپنے طور پر اور بدونِ تعلیم الٰہی کچھ نہیں جانتا۔

دوسری آیت

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ ------------ [1]

پیغمبروں کے بارے میں مشرکین کے باطل افکار کو مدنظر رکھتے ہوئے اور پہلی آیت کے ذیل میں دی گئی توضیح کو سامنے رکھتے ہوئے اس آیت کا ہدف بھی واضح ہو جائے گا۔ وہ پیغمبرؐ خدا کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ اسے اپنے طور پر عالم غیب ہونا چاہیے اور یہ آیت ان کے اس خیال کو رد کرتے ہوئے فرماتی ہیں: "تعلیم الٰہی کے بغیر میں غیب سے آگاہ نہیں ہوں۔"

اس بات کی بعد والا جملہ تائید کرتا ہے:

---

[1] سورہ انعام ۵۰

"ان اتباع الا مایوحی الی" (میں وحی کے تابع ہوں۔)

یعنی میں وحی اور تعلیم الٰہی کے بغیر علم غیب نہیں رکھتا البتہ وحی کے وسیلے سے آگاہ ہوتا ہوں۔ پہلی آیت کے بارے میں وضاحت پر توجہ کرنے سے اس آیت کا مفہوم بھی واضح تر ہوجاتا ہے۔

تیسری آیت

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ....... [1]

یہ اور دوسری آیت ایک جیسی ہیں۔ لہٰذا زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

چوتھی آیت

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٨﴾ [2]

پہلی آیت کے ضمن میں دی جانے والی توضیح کو سامنے رکھنے سے اس آیت کا مفہوم بھی روشن ہوجاتا ہے کیونکہ اس آیت کا مقصد بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مشرکین کے نظریے کو باطل کرنا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ پیغمبرؐ کے پاس مختلف جہات سے ایک وسیع قدرت ہونی چاہیے جو ذاتی ہو اور مقام ربوبیت سے کسب و حاصل نہ کی گئی ہو اور پیغمبرؐ اس قدرت کی وجہ سے ہر قسم کے فائدے اور سود کو اپنے لیے حاصل کر سکے اور ہر قسم کے نقصان اور ضرر کو اپنے سے دفع کر سکے اور غیب کی خبر دے۔

خدا اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان کی اس غلط اور شرک آمیز فکر کے خاتمے کے لیے ہر ایسی طاقت وقدرت اور علم، جو خدا کی طرف سے نہ ہو، کی اپنے آپ سے نفی کرو۔ کہہ دو کہ میں قدرتِ الٰہی سے ہٹ کر کسی قسم کے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں مگر یہ کہ پروردگار کی طرف سے مجھے طاقت عطا کی گئی ہو اور یہ جملہ

"الا ماشاء الله" (مگر جو خدا چاہے)

گواہی دیتا ہے کہ ہر قسم کی طاقت وقدرت کی نفی مقصود نہیں بلکہ اس قدرت کی نفی ہے جو خدا کی طرف سے نہ ہو۔

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کی جانب سے علم اور قدرت کی اپنے آپ سے نفی نہیں کی

---

[1] سورہ ہود ۳۱

[2] سورہ اعراف ۱۸۸

بلکہ "الا ماشاء الله" کے جملے سے اسے اثبات کیا ہے۔ اس سے آیت کے دوسرے جملے "لو کنت العلم الغیب..." کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے۔

یعنی میں اگر اپنے طور پر اور خدا کی تعلیم کے بغیر غیب کا عالم ہوتا تو اپنے لیے بہت زیادہ خیر جمع کر لیتا اور ذرہ برابر بدی مجھ تک نہ پہنچتی۔ لیکن چونکہ میرا علم غیب ذاتی نہیں بلکہ تعلیم الٰہی سے ہے، جہاں خدا چاہے گا میں غیب سے آگاہ ہوں گا جس طرح جہاں خدا چاہے گا میں خاص قدرت وتوانائی کا حامل ہوں گا۔

پانچویں آیت

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۱۰۱ [1]

اہل مدینہ میں سے کچھ لوگ نفاق میں مہارت رکھتے ہیں تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔ ان کو دوبار عذاب دیا جائے گا وہ عظیم عذاب کی طرف لوٹیں گے۔

اس آیت میں جملے "لا تعلمھم" سے استدلال کیا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نص قرآن کے مطابق منافقین کو نہیں پہچانتے اور اس قسم کی عدم آگاہی علم غیب سے مطابقت نہیں رکھتی۔

جواب

پہلی بات یہ ہے کہ یہ آیت اس سے زیادہ مطلب ثابت نہیں کرتی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول قرآن کے وقت کچھ لوگوں کے نفاق میں غرق ہونے سے آگاہ نہیں تھے۔ لیکن اس خاص وقت میں آپؐ کی عدم آگاہی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپؐ آخر عمر تک ان سے آگاہ نہیں تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت کی بنا پر بعض واقعات کو ان کے وقوع کے وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوشیدہ رکھا اور آپؐ کو ان پر مسلط نہ کیا۔ خصوصاً منافقین کی افسوسناک صورتحال جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح کے لیے صدمے کا باعث بنتی، لیکن اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم کہیں کہ یہ اخفاء دائمی اور ہمیشہ کے لیے تھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عمر کے آخر تک اس سے بے خبر تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہی قرآن جو اس آیت میں پیغمبرؐ سے کہتا ہے "لا تعلمھم" سورہ محمدؐ میں پیغمبرؐ سے یوں خطاب کرتا ہے:

---

[1] سورہ توبہ ۱۰۱

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ [۱]

اگر ہم چاہتے تو ان کی تمہیں پہچان کروا دیتے اور تم انہیں چہروں سے پہچانتے اور تم انہیں ان کے اندازِ گفتگو سے پہچانتے ہو۔ اللہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ ان کی پہچان کا راستہ ان کا اندازِ گفتگو ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کھلا تھا اور آخرکار آپ نے ان کے نفاق کا پتہ لگا لیا۔

تیسری بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی ہر واقعے سے آگاہی ایک فعلی اور جبری علم نہیں ہے بلکہ یہ علم مشیتی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو آگاہ ہو جاتے ہیں، اگر نہ چاہیں تو آگاہ نہیں ہوتے۔ احادیث میں بھی اس نکتے کی تصریح کی گئی ہے۔

فرض کریں آپ کے پاس ایک خط ہے اور اس میں چند پوشیدہ اور مخفی امور کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو خط کے متن کی طرف رجوع کر کے ان اسرار و رموز سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

حدیث [۲] کی روشنی میں پیغمبر اور امام کا علم مشیتی ہے نہ کہ فعلی اور جبری اور یہ اس خط والے شخص کے خط کے مفاہیم کی طرح ہے جو اس کے چاہنے کے بغیر فعلیت اختیار نہیں کرتا۔ شرائط پوری ہونے کی صورت میں صرف چاہنے سے اس سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ معصوم پیشواؤں کی زندگیوں میں ایسے واقعات موجود ہیں جو ان مطالب پر گواہ ہیں۔ یہاں ہم ان تمام واقعات کو بیان نہیں کر سکتے۔ [۳]

چوتھی بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے منافقین ایسے نہ تھے کہ آخر میں پہچانے نہ جاتے۔ قرآن مجید نے ان کا تعارف مختلف عنوانات کے ذریعے سے کروایا ہے۔ مثلاً:

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾ [۴]

جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کی شکل و صورت پر تم تعجب کرو گے اور اگر وہ بات کریں (حق کی صورت میں آکر جو

---

[۱] سورہ محمد آیت ۳۰

[۲] اصول کافی، ج ۱ ص ۲۵۸

[۳] سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۵۲۳

[۴] سورہ منافقوں آیت ۴

وہ اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں) تو ان کی باتیں تمہیں اپنی طرف کھینچ لیں اور تم ان کی باتیں سننے لگو۔ گویا وہ ایسی لکڑیاں ہیں جو دیوار کا سہارا لیے ہر آواز کو اپنے خلاف خیال کرتی ہیں۔ وہ حقیقی دشمن ہیں ان سے دوری اختیار کرو۔ خدا انہیں مارے وہ کس طرح حقیقت سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے منافقین کی درج ذیل صفات بیان کی ہیں:

۱۔ اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کی شکل وصورت والے ہیں۔

۲۔ خوش گفتار ہیں اور پشت پناہ رکھنے والے ہیں۔

۳۔ ایسی لکڑیاں ہیں جو دیوار کا سہارا لیے ہوئے ہیں۔[۱]

اسی سورۂ منافقوں میں منافقین کے تعارف کے لیے آیات نازل ہوئی ہیں جو اہل تحقیق کے لیے واضح ہیں۔[۲] اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ میں سب پردے ہٹا دیے ہیں اور منافقین کی بہت واضح شناخت کروائی ہے۔ اس سورہ کی آیات کے مطالعے سے حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ آیت:

وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾[۳]

''وہ نماز کو سستی کے ساتھ بجالاتے ہیں اور کراہت کے ساتھ انفاق کرتے ہیں۔''

اسی طرح اس سورہ کی اور بہت سی آیات ہیں۔

شناخت کے بغیر ذمہ داری ممکن نہیں

اللہ تعالیٰ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ کافروں اور منافقوں سے جنگ کرو اور ان کی گفتار ورائے کی پیروی نہ کرو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ[۴]

''اے رسولؐ! کفار اور منافقین سے جنگ کرو اور ان سے سختی سے پیش آؤ۔''

---

[۱] مراد یہ ہے کہ وہ خشک لکڑیوں کی طرح ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ اور قرآن کی حکیمانہ اور منطقی گفتگو اور بیانات سن کر ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ گویا وہ جسم میں روح نہیں رکھتے۔

[۲] سورہ منافقوں کی آیات ۵، ۷، ۸ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۳] سورہ توبہ آیت ۵۴ اور سورہ نساء کی آیات ۱۴۲ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۴] سورہ توبہ ۷۳

۲۔ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ [1]

"کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کرو اور ان کی ایذا رسانی کا خیال چھوڑ دو اور خدا پر بھروسہ کرو۔"

کیا ایسا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے اور ان سے جنگ کا حکم دے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں نہ پہچانتے ہوں ایک طرف یہ حکم دے کہ ان کی پیروی نہ کرو، دوسری طرف ساری زندگی آپؐ سے ان کو مخفی اور پوشیدہ رکھے۔

یہاں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض منافقین کے نفاق کو وقتی طور پر آپؐ سے چھپایا گیا نہ کہ دائمی طور پر۔

قرآن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ منافقوں پر نماز نہ پڑھو اور ان کی قبروں کے نزدیک توقف نہ کرو۔ چنانچہ فرماتا ہے:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ [2]

"اگر وہ مر جائیں تو ان پر نماز نہ پڑھو اور ان کی قبور کے نزدیک توقف نہ کرو۔ انہوں نے خدا اور اس کے پیغمبرؐ سے کفر اختیار کیا ہے۔"

یہ اور دیگر آیات اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ آخر کار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کو پہچانتے تھے۔ نہ صرف پہچانتے

[1] سورہ احزاب ۴۸

[2] سورہ توبہ ۸۴

تھے بلکہ ان کے نام اور خصوصیات بھی آپؐ نے حضرت حذیفہؓ [1] سے بیان کی تھیں۔ اس لیے خلیفہ دوم کو جس شخص کے بارے میں نفاق کا احتمال ہوتا تھا اس پر نماز نہیں پڑھتے تھے مگر یہ کہ حضرت حذیفہؓ اس کی تصدیق کرتے اور یہ حقیقت سیرت النبیؐ اور صحابہ وخلفاء کی تاریخ میں مذکور ہے۔

چھٹی آیت

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُكُمۡ عَلٰى سَوَآءٍ‌ ؕ وَاِنۡ اَدۡرِىۡۤ اَقَرِيۡبٌ اَمۡ بَعِيۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾ [2]

''اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دو کہ میں نے سب کو یکساں آگاہ کیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ نزدیک ہے یا دور۔''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غیب سے آگاہ نہ ہونے پر اس آیت سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ الٰہی وعدوں کی دوری یا نزدیکی سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عدم آگاہی کا اظہار کرتے ہیں اور یہ بات علم غیب سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

جواب

ہماری بحث (جیسا کہ کتاب کے شروع میں ہم نے ذکر کیا) پیغمبرؐ اور ائمہ معصومینؑ کے علم کی کمیت اور مقدار کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ہماری بحث دراصل پردۂ غیب میں پوشیدہ امور سے ان کے علم سے متعلق ہے۔ یعنی کیا ایسا ممکن ہو تو کیا وقوع پذیر ہوا ہے یا نہیں؟ اگر نبی اکرم

---

[1] اسد الغابہ کی جلد ۱ ص ۳۹۱ اور احوال صحابہ سے مربوط دیگر کتب کی طرف رجوع کیا جائیگ۔ اسد الغابہ کی عبارت کا متن یوں ہے: "وحذيفة صاحب رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فى المنافقين لم يعلمهم احدا الا حذيفة اعلمه بهم رسول الله وساله عمرا فى عمالى احد من المنافقين قال نعم احد. قال من هو قال لا اذكره قال حذيفة فعزله كانما دل عليه كان عمر اذامات ميت يسال عن حذيفة فان حضرا الصلوة عليه وان لم يحضر حذيفة الصلاة عليه لم يحضر عمر"۔ (حذیفہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز دار تھے اور منافقین کو پہچانتے تھے اور پیغمبرؐ خدا نے حذیفہؓ کو ان کے بارے میں بتایا تھا۔ ایک دن دوسرے خلیفہ نے ان سے پوچھا: ''کیا ہمارے آدمیوں (دفتری عملہ) میں بھی کوئی منافق ہے؟'' حذیفہ نے کہا ''ہاں'' خلیفہ کے ایک آدمی نے پوچھا ''وہ کون ہے'' حذیفہؓ نے یہ بتانے سے انکار کیا۔ آخر کار خلیفہ نے اس کو پہچان لیا اور اسے نوکری سے علیحدہ کر دیا۔ حضرت عمرؓ کا نماز جنازہ کے لیے یہ طریقہ کار تھا کہ اگر حضرت حذیفہؓ نماز جنازہ میں حاضر ہوتے تو وہ اس پر نماز پڑھتے۔ اگر وہ حاضر نہ ہوتے تو حضرت عمرؓ اس کی نماز جنازہ پڑھانے سے گریز کرتے۔

[2] سورہ انبیاء ۱۰۹

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چیز سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے تو یہ تیسری آگاہی کے اصول کے ہرگز منافی نہ ہوگا۔

اس آیت میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے موضوع سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے جس کا علم مقام ربوبیت سے مختص ہے اور وہ موضوع یوم جزا ہے کہ جب خدا کے وعدے اور وعیدیں عملی شکل اختیار کریں گی اور قیامت کے وقت سے آگاہی ایسے مسائل میں سے ہے کہ خدا نے بندوں میں سے کسی کو بھی اس کے بارے میں مطلع نہیں کیا۔ قرآن کی آیات اس مسئلے میں اس قدر واضح ہیں کہ اس کے خلاف احتمال نہیں ہوسکتا۔ اس بات میں کوئی ہرج نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو گذشتہ اور آئندہ کے حالات و واقعات سے آگاہ کر دے لیکن روزِ جزا کے وقت کو صرف اپنی ذات سے مخصوص کرے۔

اب اس حقیقت کہ قیامت کے وقت سے آگاہی ذات اقدس الٰہی سے مخصوص ہے، کو واضح طور پر ثابت کرنے والی آیات ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۭ ....[۱]

"قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب برپا ہوگی۔ کہہ دو اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے، اس کے علاوہ کسی اور کو علم نہیں ہے............"

۲۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝۱۵ [۲]

بیشک قیامت آنے والی ہے اسے ہم نے مخفی رکھا ہے تا کہ ہر انسان اپنی کوشش کے بدلے میں جزا دیکھ سکے۔

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ ....[۳]

قیامت کے وقت کا علم خدا کے پاس ہے۔

۴۔ يَسْـَٔــلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ۝۶۳ [۴]

"قیامت کے بارے میں لوگ تم سے سوال کرتے ہیں کہہ دو اس (کے برپا ہونے) کا علم خدا کے پاس ہے اور

---

[۱] سورہ اعراف ۱۸۷

[۲] سورہ طہ ۱۵

[۳] سورہ لقمان ۳۴

[۴] احزاب ۶۳

تمھیں کیا معلوم شاید اس کا وقت قریب ہو۔"

۵۔ اِلَيۡهِ يُرَدُّ عِلۡمُ السَّاعَةِ ؕ .... [1]

قیامت کے وقت کا علم اسی کی طرف لوٹتا ہے۔

۶۔ وَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۵﴾ [2]

وقت قیامت کا علم اس کے پاس ہے اور اسی کی طرف لوٹتا ہے۔

یہ آیات واضح طور پر گواہی دیتی ہیں کہ قیامت کے وقت کا علم خدا سے مخصوص ہے۔ خدا نے مصلحت کی بناء پر اس سے کسی بھی بندے کو آگاہ نہیں کیا۔ ہماری زیر بحث آیت بھی قیامت سے مربوط ہے۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعدۂ الٰہی کے وقت سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں تو اس سے مراد قیامت کے وقت سے لاعلمی ہے اور قیامت کے وقت سے لاعلم ہونا دوسرے موارد سے لاعلمی پر گواہ نہیں بن سکتا۔ آخر میں ایک اور نکتے کا ذکر کرنا ناگزیر ہے اور وہ یہ کہ اس آیت کا مفہوم سورہ جن کی ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷ آیات میں بھی بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

حَتّٰۤی اِذَا رَاَوۡا مَا یُوۡعَدُوۡنَ فَسَیَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَضۡعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلۡ اِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ اَمۡ یَجۡعَلُ لَهٗ رَبِّیۡۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡهِرُ عَلٰی غَیۡبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ [3]

"جب وہ عذاب الٰہی کو دیکھیں گے تو اس وقت آگاہ ہوں گے کہ کون مددگار کے لحاظ سے ناتواں اور تعداد کے لحاظ سے کم ہے۔ تم کہہ دو! میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے قریب ہے یا اس کے لیے خدا ایک مدت مقرر کرے گا۔ غیب کا عالم وہی ہے اور وہ کسی کو غیب پر مسلط نہیں کرتا مگر اپنے رسولوں میں سے جن کو چاہے چن لے۔"

ان آیات کا مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

ان آیات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے وقت سے آگاہی کی اپنے آپ سے نفی کرتے ہیں اور قرآن کی آیات کے مطابق اس کے وقت کا علم ذاتِ اقدس الٰہی سے مخصوص ہے۔

---

[1] سورہ حم سجدہ ۴۷

[2] سورہ زخرف ۸۵

[3] سورہ جن ۲۴ تا ۲۷

ساتویں آیت

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۝۱۰۹ [1]

اس آیت سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سے ہر قسم کے علم غیب کی نفی کرتے ہوئے خدا کی تعریف "علام الغیوب" کی صفت کے ساتھ کی ہے۔

جواب

اس میں شک نہیں کہ حرف "لا"، لا رجل فی الدار، لا علم لنا، لا خیر فیهم جیسی ترکیب میں جنس اور حقیقت کی نفی کے لیے ہے۔علماء ادب ایسی 'لا' کو نفی جنس کہتے ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ نفی جنس دو صورتوں میں انجام پاتی ہے۔

۱۔ حقیقی اور واقعی نفی جنس، جس میں کسی قسم کے مجاز کا شائبہ نہ ہو۔ مثلاً لا اله الا الله، لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین، یا مثلاً جب گھر میں کوئی بھی مرد خواہ وہ بوڑھا ہو، جوان ہو، مریض ہو یا سالم موجود نہ ہو تو اس وقت کہا جاتا ہے لا رجل فی الدار۔

۲۔ مجازی نفی جنس، یعنی حقیقی صورت میں نہیں، اس طرح کہ اگر گھر میں ایک فرد موجود ہو لیکن اسے کسی وجہ سے نظر انداز کرتے ہوئے نفی جنس کی جائے۔ مثلاً کوئی گھر کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اگرچہ گھر میں بیمار بوڑھا موجود ہے جس میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں، اسے جواب دیا جائے گھر میں کوئی بھی نہیں۔ یہ نفی حقیقی نہیں، بلکہ بطور مجاز ہے، اس لیے کہ گھر میں موجود شخص دستک دینے والے کے کام نہیں آ سکتا۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام اپنے بزدل ساتھیوں اور بہانہ جو اصحاب، جو کبھی گرمیوں کے بہانے اور کبھی سردیوں کے بہانے معاویہ سے جنگ سے گریز کرتے تھے، سے کہتے ہیں:

"یا اشباه الرجال ولا رجال" [2]

"اے مردوں جیسے کہ مرد نہیں ہو۔"

اس قسم کی حقیقت سے نفی مختلف عوامل کی وجہ سے عربی زبان اور اسلامی احادیث میں فراواں ہے، مثلاً:

---

[1] سورہ مائدہ ۱۰۹

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۲۷

"لا صلاۃ لجار المسجد الا فی المسجد"[1]

زیر بحث آیت میں ایسا ہی معاملہ ہے۔ انبیاء اپنے محدود علم و آ گاہی کا خداوند تعالیٰ کے لامحدود علم و آ گاہی سے موازنہ کرتے ہیں اور نیز یہ دیکھتے ہیں کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اسی کی جانب سے ہے۔ خدا ہی ہے جس نے یہ علم و آ گاہی انہیں عطا کی ہے اور وہ از خود کچھ بھی نہیں رکھتے۔ جب وہ اس حالت کو ملاحظہ کرتے ہیں تو بے اختیار اس کے ذاتی، نامحدود اور اصل علم کے سامنے خضوع کرتے ہوئے ہر قسم کے علم و آ گاہی کی اپنے آپ سے نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم علم نہیں رکھتے تو حق سے آ گاہ اور اس کا عالم ہے۔

اسلامی فلسفے میں کسی چیز سے آ گاہی کی حقیقت کے بارے میں ایک مطلب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "کسی چیز سے مکمل آ گاہی اور حقیقی علم یہ ہے کہ اس کے وقوع پذیر ہونے میں پوری مدت جو اسباب و علل وخیل تھے اور واقعات جو اس وقت اس کے ہم عصر اور شانہ بشانہ تھے، سے آ گاہ ہو جائیں اور ایسا علم بشر کے بس کی بات نہیں ہے۔

ان جہتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے صحیح ہے کہ انبیاء الٰہی علم کے سامنے سر تسلیم خم کر لیں اور کہیں "لا علم لنا" خصوصاً اس وقت جب اگر وہ علم رکھتے ہیں تو خود ان سے مربوط نہیں بلکہ اس کے لامحدود علم و نور کا پرتو ہے۔

اللہ تعالیٰ بشر کے علم کے بارے میں یوں فرماتا ہے:

وَمَآ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۵﴾[2]

دوسری بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے افراد کی گواہی سے مربوط آیات نہایت صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ یہ لوگ قیامت کے دن گواہی کے لیے بلائے جائیں گے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَوُضِعَ الۡکِتٰبُ وَجِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّہَدَآءِ..........[3]

کیا یہ ممکن ہے کہ عدالت الٰہی کے گواہ ایک چیز سے ناآ گاہ ہوتے ہوئے اس کی شہادت دیں یا کسی چیز پر گواہ بن جائیں۔ اس صورت میں خصوصاً ذیل کی آیات ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ جملہ "لا علم لنا" کا معنی کی گئی تفسیر کے مطابق کیا جائے۔

۱۔ وَّجِئۡنَا بِکَ عَلٰی ہٰۤؤُلَآءِ شَہِیۡدًا ﴿ؕ۴۱﴾[4]

"اور تجھے (اے پیغمبرؐ!) ہم ان پر گواہ لائیں گے۔"

---

[1] وسائل الشیعہ ۲۴۰ ص ۴۷۸

[2] سورہ بنی اسرائیل ۸۵

[3] سورہ زمر ۶۹

[4] سورہ نساء ۴۱

۲۔ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ [1]

''اور وہ دن جب گواہ گواہی دینے کے لیے اٹھیں گے۔''

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء اپنی امتوں کی حالت سے تھوڑی سی آ گاہی بھی نہیں رکھتے جبکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محشر میں اور انبیاء کے جمع ہونے کے دن الٰہی عدالت میں یوں کہیں گے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ [2]

''وہ دن جب پیغمبر کہیں گے: یا پروردگار! میری امت نے قرآن کو ترک کر دیا۔''

یا آیت کے سیاق کو خصوصاً ماقبل آیت

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ [3]

''اور جس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے چبائیں گے۔''

کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت والے دن اس آیت کے مفہوم کے مطابق امت کے حال کی خبر دیں گے۔

چوتھا نکتہ یہ ہے کہ یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ایسے دن انبیاء تھوڑا سا علم بھی نہیں رکھتے ہوں گے جبکہ ''اعراف'' میں نیک اور بدکار لوگوں کو ان کے چہروں سے پہچانیں گے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ .... [4]

''اعراف میں ایسے مرد ہیں جو سب کو چہروں سے پہچانتے ہیں۔''

کیا ایسا نبی جس نے مقام ربوبیت سے ابولہب کے بارے میں آیات حاصل کی ہیں یا ولید بن مغیرہ کے بارے میں اس پر وحی الٰہی نازل ہوئی ہے [5] اور اسی طرح اور واقعات............اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ قیامت کے دن حقیقی طور پر اور دوسری جہات کی رعایت کیے بغیر کہے کہ ''لا علم لنا''۔

---

[1] سورہ مومن ۵۱

[2] سورۂ فرقان ۳۰

[3] سورہ فرقان ۲۷

[4] سورہ اعراف ۴۶

[5] سورہ ''ن'' کی آیات ۱۰-۱۵ اور سورۂ مدثر کی آیات ۱۱-۲۶ کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہ تمام قرائن ہمیں مراد الٰہی کے قریب کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہر قسم کے علم کی نفی کرنا از لحاظ ادب ہے اور یہ ایک قسم کا عقلی اور صحیح خضوع ہے خصوصاً جب یہ کہا گیا کہ انبیاء جو بھی علم رکھتے ہیں از جانب پروردگار ہے اور خود ان کی ذات سے مربوط نہیں۔

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید فرماتا ہے پیغمبروں اور امتوں سے جدا جدا سوال کیا جائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ ۙ﴿۶﴾ [۱]

ان لوگوں سے سوال کریں گے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔

بہت سی آیات سے یہ مطلب حاصل ہوتا ہے کہ مجرم اور گناہگار افراد اپنی حالت سے آگاہ ہوں گے اور ''لیت'' یا ''لعل'' (ہائے افسوس، اے کاش) کے الفاظ بہت استعمال کریں گے اور کہیں گے:

یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا ﴿۲۷﴾ [۲]

کاش میں پیغمبرؐ کے راستے پر چلتا۔

یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا ﴿۲۸﴾ [۳]

کاش میں فلاں کو اپنا دوست قرار نہ دیتا۔

فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ [۴]

ہمیں لوٹا دے ہم صالح عمل بجا لائیں گے اور ہم حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں۔

کیا یہ درست ہے کہ امت تو اپنے حالات سے آگاہ ہو اور سر نیچے کیے کچھ آرزوئیں کرے لیکن پیغمبر جنہوں نے ایک مدت تک اپنی امتوں کے ساتھ زندگی گزاری ہو اپنے آپ سے ہر قسم کی آگاہی کی حقیقی طور پر نفی کریں؟

ان تمام نکات سے اس آیت کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ آیت انبیاء کے علم غیب سے مربوط آیات سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی۔

---

[۱] سورہ اعراف ۶

[۲] سورہ فرقان ۲۷

[۳] سورہ فرقان ۲۸

[۴] سورہ سجدہ ۱۲

آٹھویں آیت

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۶۹﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۰﴾ [۱]

''میں ہرگز عالم بالا کے بزرگوں کے مذاکرے سے جب وہ مجادلہ کررہے تھے آگاہ نہیں تھا۔ مجھ پر وحی نہیں ہوتی مگر یہ کہ میں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔''

یہاں انسان کی خلقت کے بارے میں فرشتوں کا مجادلہ اور مذاکرہ مراد ہے جو سورۂ بقرہ میں واضح طور پر بیان ہوا ہے۔ مذاکرے کا خلاصہ یہ تھا کہ کیا تم زمین پر خلیفہ بنا رہے ہو کہ جو فساد کرے گا اور ہم تمہاری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں؟...... [۲]

زیر بحث آیت کے بعد دو آیتوں کے فاصلے کے بعد جو آیات ذکر ہوئی ہیں وہ اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ان آیات میں خلقت آدم، فرشتوں کے سجدے اور شیطان کے انکار کی داستان بیان ہوئی ہے۔[۳] اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ فرشتوں کے مذاکرے اور قرآن کی تعبیر میں مجادلے اور مخاصمے سے مراد خلقت آدم کے بارے میں ہے۔[۴] یہاں پر مجادلے کے بارے ایک اور احتمال بھی موجود ہے جسے طبرسی مرحوم نے بیان کیا ہے۔ خواہشمند حضرات تفسیر ''مجمع البیان'' کی طرف رجوع کرسکتے ہیں۔[۵]

بہر حال قرین میں ''ما کان'' کے طریقہ استعمال سے آیت کا معنی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند موارد کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ [۶]

یہ خدا کی شان نہیں کہ وہ تمہارے ایمان کی جزا ضائع کرے۔ اللہ لوگوں پر مہربان اور رحیم ہے۔

۲۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ

---

[۱] سورہ ص ۶۹-۷۰

[۲] سورہ بقرہ آیت ۳۰-۳۱

[۳] سورہ ص آیت ۷۱-۸۵

[۴] مفاتیح الغیب ج ۷ ص ۲۰۹ طبع ۱۳۰۸

[۵] مجمع البیان ج ۴ ص ۴۸۵ طبع صیدا

[۶] سورہ بقرہ ۱۴۳

كُونُوا عِبَادًا لِّي .... [۱]

خدا کے لیے شائستہ نہیں کہ وہ بشر کو کتاب، حکمت اور نبوت دے پھر وہ (انسان) لوگوں سے کہے کہ میری عبادت کرو۔

۳۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ [۲]

کسی نفس کے لیے بھی موت نہیں مگر اللہ کے اذن سے۔

۴۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ .... [۳]

نبی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ قیدی بنائے مگر یہ کہ زمین پر خون بہے۔

۵۔ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ [۴]

مشرکین کوئی حق نہیں رکھتے کہ وہ کفر کی حالت میں اللہ کے گھر کی تعمیر کریں۔

۶۔ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ [۵]

قرآن کی شان نہیں مگر یہ کہ اس کو خدا سے نسبت دی جائے۔

۷۔ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ [۶]

کسی بھی پیغمبر کے لیے روا نہیں کہ وہ معجزہ لے آئے مگر پروردگار کے اذن سے۔

ایسی آیات قرآن میں بہت زیادہ ہیں۔ ان تمام آیات میں ہدف ذاتی اقتضاء کی نفی کرنا ہے، یعنی موضوع بذاتِ خود ایسا تقاضا نہیں رکھتا تاہم ایسی نفی دو قسم کی ہے:

۱۔ کبھی نفی دائمی اور ابدی ہے یعنی کسی طرح بھی اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً

---

[۱] سورہ آل عمران ۷۹

[۲] سورہ آل عمران ۱۴۵

[۳] سورہ انفال ۶۷

[۴] سورہ توبہ ۱۷

[۵] سورہ یونس ۳۷

[۶] سورہ رعد ۳۸

"وما کان اللہ لیضیع ایمانکم"

''اللہ کی شان یہ نہیں کہ تمہارے ایمان کی جزا ضائع کرے۔''

کیونکہ جزا ضائع کرنا ایک طرح کا ظلم اور وعدہ خلافی ہے اور خدا کی ذات ان دونوں سے منزہ ہے۔

۲۔ لیکن کبھی یہی نفی دیگر عنوانات کے تحت تبدیل ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی آیت:

"وما کان لرسول ان یاتی بایۃ الا باذن اللہ"

''کسی بھی رسول کی یہ شان نہیں کہ وہ اپنے طور پر قدرت الٰہی کے بغیر معجزے لائے مگر خدا کے حکم سے۔''

اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ کوئی بھی پیغمبر بذات خود ایسی قدرت نہیں رکھتا، لیکن ایسی قدرت نہ رکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بطور مطلق معجزہ نہیں لاسکتا، بلکہ قدرتِ الٰہی کے پرتو میں وہ ایسا کرسکتا ہے۔

اس وضاحت کی بناء پر زیر بحث آیت کا ہدف بھی روشن ہوجاتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ میں اپنے طور پر عالم بالا کے بزرگان کے مجادلہ سے آگاہ نہیں تھا اور ایسا ذاتی علم بشر کے اختیار میں نہیں لیکن اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل حتی کہ وحی کے پرتو میں بھی آگاہ نہیں تھے یا آگاہ نہیں ہوں گے۔

اس مطلب پر اور واضح گواہ اسی آیت کا یہ جملہ ہے: ''مجھ پر اس کے علاوہ وحی نہیں ہوئی کہ میں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے ذاتی علم کی مجھ سے توقع رکھنا بیجا ہے۔ میرا کام ڈرانے کے علاوہ اور کچھ نہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی مجھے اس کے علاوہ وحی نہیں کی اور جو صرف ڈرانے والا ہو اس کے اندر سے ایسا علم نہیں پھوٹتا اور جب تک مقام ربوبیت سے مجھے کوئی چیز القاء نہ کی جائے میں غیب کے پس پردہ ایسے امور سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتاً عدم آگاہی اکتساب کے طریقے سے ان کی آگاہی میں مانع نہیں ہے اور یہ کہ اس کی شان ڈرانے والے سے بیشتر نہیں۔ یہ اس بات میں رکاوٹ نہیں کہ اسی ہدف اور دلوں میں خوف پیدا کرنے کے لیے خدا کی جانب سے وہ کچھ غیبی امور سے آگاہ ہوں اور دوسروں کو ان سے مطلع کریں۔

اس کا شاہد یہ ہے کہ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجادلہ سے لاعلمی کا اظہار کررہے ہیں جبکہ دیگر آیات میں اسی مباحثے کو بیان فرمایا ہے۔ کیا یہ نفی و اثبات اس پر دلالت نہیں کرتا کہ آیت میں ذاتی آگاہی سے نفی مراد ہے نہ کہ اکتسابی آگاہی کی نفی مقصود ہے؟

جس کسی نے بھی اس آیت اور اس کی مانند دیگر آیات کو اپنی دستاویز قرار دیا ہے وہ غیر جانبدار بن کر آیات کے مفاہیم میں غور کرے یا اہل فن کے ساتھ بحث و مذاکرہ کرے تو آیت کی حقیقت اور مفہوم اس پر پوشیدہ نہیں رہے گا۔

سوال چہارم

جن آیات سے انبیاء کے علم غیب پر استدلال کیا جاتا ہے، مثلاً یہ آیت:

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ [۱]

ان سے اس سے زیادہ استفادہ نہیں ہوسکتا کہ ان کا علم غیب تعلیم الٰہی سے ممکن ہے، لیکن کیا اس امکان نے فعلیت اختیار کی ہے اور تحقیق پذیر ہوا ہے یا نہیں، یہ معلوم نہیں ہے۔

جواب

اس کتاب کے چھٹے حصے میں جن آیات کو ذکر کیا گیا ہے اسی سوال اور اعتراض کے جواب کے لیے انہیں ہم نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ وہ آیات جو انبیاء کی غیب سے آگاہی کے ممکن ہونے کو ثابت کرتی ہیں (تین آیات)

۲۔ وہ آیات جو علم غیب کے وقوع پذیر اور موجود ہونے کو سمجھاتی ہیں۔(سترہ آیات)

لہٰذا اس حصے کی طرف رجوع کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسا اعتراض اور سوال بے جا ہے۔

سوال پنجم

کیا انبیاء اور آئمہ کے عالم غیب ہونے کا نظریہ اس بات کا لازمہ نہیں بنتا کہ ہم خدا کے ''عالم غیب'' ہونے کی صفت میں اس کا شریک قرار دیں؟

جواب

گذشتہ بحثوں میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ انبیاء آئمہ اور خدا کے خاص بندوں کا علم غیب تعلیم الٰہی سے ہے۔ نہ کہ ذاتی طور پر اور ان کے عالم غیب ہونے کا اعتقاد اس نظریے کے ساتھ کہ یہ اللہ کی جانب سے ان کو عطا کیا گیا ہے، اس معنی میں ہے کہ خدا کا علم ذاتی ہے اور ان کا علم تعلیمی ہے۔ یعنی وہ عالم ہونے کے لیے خدا کے نیاز مند ہیں اور یہ عین ان کی بندگی اور نیازمندی کا اعتقاد ہے۔

"این التراب و رب الارباب"

''بندۂ محتاج کہاں اور بے نیاز خدا کہاں۔'' [۲]

---

[۱] سورہ جن آیت ۲۶-۲۷

[۲] بعض غالی تھے جو آئمہ علیہم السلام کو علم میں خدا کا شریک جانتے تھے، یعنی ان کے علم کو ذاتی خیال کرتے تھے۔ لیکن روایات میں ان کا یہ عقیدہ مردود جانا گیا ہے اور ان سے بیزاری اختیار کی گئی ہے۔

سوال ششم

یہ صحیح ہے کہ خدا کا علم ذاتی ہے اور دوسروں حتیٰ کہ انبیاء اور آئمہ کا علم اکتسابی اور تعلیمی ہے اور خدا کی طرف سے ان کو عطا ہوا ہے۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم ان آیات کو جو علم غیب کے خدا سے اختصاص پر دلالت کرتی ہیں [1] اور وہ آیات جو علم غیب کو خدا کے لیے اثبات کرتی ہیں اور اس کے غیر سے نفی کرتی ہی [2] ں اور وہ آیات جو علم غیب کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نفی کرتی ہ [3] یں تینوں قسم کی آیات کو علم ذاتی اور غیر اکتسابی پر موقوف کریں کیونکہ "نفی علم غیب" کا ظاہری مفہوم مطلق علم غیب کی نفی ہے خواہ وہ ذاتی ہو یا تعلیمی و اکتسابی ہو۔

جواب

اس بحث کے تیسرے حصے میں اور دیگر موارد پر بھی یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے اور ان کے بعد چند صدیوں تک کبھی کلمہ "علم غیب" "ذاتی علم غیب" کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے، حتیٰ کہ بعض بزرگ علماء شیعہ [4] نے فرمایا ہے: "اگرچہ نبی اور امام غیب کا علم رکھتے ہیں پھر بھی کلمہ عالم غیب سے ان کی توصیف نہیں کرنی چاہیے کیونکہ "عالم غیب" فقط خدا کے لیے کہا جاتا ہے اور جس کا علم تعلیم الٰہی سے ہے اس پر اس کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے۔"

اس مطلب کا واضح ثبوت وہ کلام ہے جو حضرت علی علیہ السلام سے نہج البلاغہ میں نقل ہوا ہے:

جب حضرت علی علیہ السلام نے بصرہ میں آئندہ کے واقعات کی خبر دی تو آپؑ کے اصحاب میں سے ایک نے کہا: "کیا آپ علم غیب رکھتے ہیں؟" آپؑ مسکرائے اور فرمایا "یہ علم غیب نہیں یعنی ذاتی علم غیب اور تعلیم الٰہی کے بغیر نہیں، **انما هو تعلم من ذی علم**، بلکہ غیب سے یہ آگاہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تعلیم کی ہے۔" [5]

اس بنا پر نزولِ قرآن اور صدرِ احادیث کے زمانے میں "علم غیب" ذاتی علم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اس بات میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ علم غیب کو انبیاء کے لیے ثابت کرنے والی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے نفی کرنے والی آیات سے ذاتی علم غیب اور تعلیم الٰہی کے بغیر مراد لیا جائے۔ خوش قسمتی سے یہی توجیہ روایات میں بھی آئی ہے، مثلاً مذکورہ نہج البلاغہ کا کلام۔

نیز امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ایک روایت جو تیسرے حصے میں نقل ہو چکی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "یہ آگاہی جو ہم رکھتے ہیں علم

---

[1] مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۷۳: عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

[2] مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۵۹: وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ

[3] مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۵۰: قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ

[4] اس بارے میں آٹھ بزرگ علماء کی گفتگو تیسرے حصے میں نقل کی جا چکی ہے۔

[5] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۴

غیب نہیں ہے (یعنی ذاتی علم غیب اور تعلیم الٰہی کے بغیر) بلکہ یہ علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمیں ورثے میں ملا ہے اور جو کچھ ہم جانتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو سکھایا گیا ہے۔"[۱]

نیز دوسری روایت میں آیات ہے کہ امام رضا علیہ السلام سے پوچھا گیا: "کیا امام اپنی موت کے وقت سے آگاہ ہے یا نہیں؟"

حضرت نے جواب میں فرمایا: "نعم یعلم بالتعلیم......"[۲]

"ہاں آگاہ ہے لیکن اس کی آگاہی تعلیم الٰہی کی وجہ سے ہے۔"

نیز ایک اور روایت میں امام صادق علیہ السلام کے ایک صحابی ہشام نے آپؑ کے سامنے آپؑ کا یوں تعارف کروایا:

"یخبرنا باخبار السماء وراثة عن اب عن جد......"[۳]

"یہ ہمیں آسمان کی غیب کی خبروں سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ علم ان کو اپنے اجداد سے ورثے میں ملا ہے۔"

یعنی ان کا علم ذاتی نہیں ہے بلکہ تعلیم الٰہی کے ذریعے سے ہے کہ جو باپ دادا کے وسیلے سے انہیں عطا ہوا ہے۔

سوال ہفتم

قرآن مجید کی وہ آیات جن پر اس کتاب کے چھٹے حصے میں بحث ہو چکی ہے، سے فقط انبیاء کا علم غیب ثابت ہوتا ہے۔ پس ائمہ کے علم غیب کے اثبات کے بارے میں کیا دلیل ہے؟

جواب

اس بارے میں بہت زیادہ دلیلیں ہیں:

۱۔ نہج البلاغہ کی غیب کی خبریں جن میں سے دس نمونے کے طور پر کتاب کے آٹھویں حصے میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ امام کے علم غیب پر دلیل قطعی ہو سکتی ہیں۔

۲۔ سینکڑوں غیب کی خبریں جو حضرت علی علیہ السلام سے نہج البلاغہ میں اور دیگر ائمہ علیہم السلام سے نقل ہوئی ہیں۔ ان کی تعداد اور نمونے اس کتاب کے نویں حصے میں ذکر ہو چکے ہیں۔ یہ خبریں بھی ان کے علم غیب پر قطعی اور محکم دلیل بن سکتی ہیں۔

---

[۱] امالی مفید ص ۱۴

[۲] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۵۲۸ (بصائر الدرجات کے حوالے سے)

[۳] اثبات الہداتہ ج ۵ ص ۳۳۶ (کافی کلینی، احتجاج طبرسی، اعلام الوریٰ طبرسی اور ارشاد مفید کے حوالے سے)

۳۔ وہ روایات جو صحیح السند اور قطعی ہیں اور وہ ائمہ کا تعارف علوم انبیاء کے وارث، بالخصوص سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کے وارث کے طور پر کرواتی ہیں، بھی ائمہ کے علم غیب پر ایک قطعی دلیل ہیں۔ یہاں پر نمونے کے طور پر ان میں سے دس حدیثیں نقل کی جاتی ہیں:

الف) کلینی نے کافی میں صحیح سند کے ساتھ امام صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:
''حضرت داؤد علیہ السلام کو علم اپنے سے پہلے پیغمبروں سے ورثے میں ملا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو حضرت داؤد علیہ السلام سے ورثے میں ملا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ علم سلیمان علیہ السلام سے ورثے میں پایا اور ہم اہل بیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علوم کے وارث ہیں۔ [۱]

ب) کتاب کافی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:
''وہ علم جو حضرت آدم علیہ السلام کے ہمراہ زمین پر آیا تھا زمین سے اوپر نہیں اٹھایا گیا بلکہ دوسروں تک میراث کی صورت میں پہنچا ہے۔علی علیہ السلام اس امت کے عالم تھے (کہ آدم علیہ السلام کا علم ان کے پاس تھا) اور ہم میں سے کوئی بھی عالم نہیں مرتا مگر یہ کہ اپنے اہل بیت میں سے اپنا جانشین رکھتا ہے کہ جو اس کے علم کا وارث بنتا ہے............'' [۲]

ج) کافی میں صحیح سند کے ساتھ امام باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:
''ہمارے پاس ہر وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور پیغمبروں کو سکھایا ہے۔'' [۳]

د) کافی میں موثق سند کے ساتھ امام باقر علیہ السلام روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے ایک حدیث کے ضمن میں فرمایا:
''خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی علم نہیں سکھایا مگر یہ کہ آنحضرتؐ نے وہ علم حضرت علی علیہ السلام کو سکھایا ہے اور پھر وہ حضرت علی علیہ السلام کا علم ہمیں ورثے میں ملا ہے۔'' [۴]

ھ) کافی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت امام باقر علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:
''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا:''یا علیؑ! نبوت میں تمہارا حصہ نہیں لیکن علم میں تم میرے ساتھ شریک ہو۔'' [۵]

---

[۱] کافی، ج ۱ ص ۲۲۵، مرات العقول، ج ۱ ص ۱۶۹
[۲] کافی، ج ۱ ص ۲۲۲، مرات العقول، ج ۱ ص ۱۶۸
[۳] کافی، ج ۱ ص ۲۵۶، مرات العقول، ج ۱ ص ۱۸۶
[۴] کافی، ج ۱ ص ۲۶۳، مرات العقول، ج ۱ ص ۱۹۰
[۵] کافی، ج ۱ ص ۲۶۳، مرات العقول، ج ۱ ص ۱۹۰

و) کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے:

''خداوند تعالیٰ نے تمام پیغمبروں کے علوم رسولِ اکرمؐ کو دیے اور آپؐ نے وہ تمام علوم حضرت علی علیہ السلام کو عطا کیے۔''[۱]

ز) کافی میں صحیح سند کے ساتھ امام رضا علیہ السلام سے روایت کیا گیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

''استودعنا علمهم ... ورثة اولی العزم من الرسل''[۲]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انبیاء کے علوم کو ہمارے لیے ودیعت کیا اور ہم اہل بیت اولوا العزم پیغمبروں کے وارث ہیں۔''

ح) بصائر الدرجات میں امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

''پروردگار عالم نے اولوا العزم پیغمبروں کو علم کے ذریعے فضیلت اور برتری عطا فرمائی اور ان کی فضیلت اور برتری ہم نے ورثے میں حاصل کی ہے۔''[۳]

ط) اسی کتاب میں نقل کیا گیا ہے کہ امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

''نحن ورثة اولو العزم من الرسل''

''ہم اہل بیت الوالعزم پیغمبروں کے (علوم کے) وارث ہیں۔''[۴]

ی) اسی کتاب میں حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں نقل ہوا ہے:

''خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو بھی علم دیا آپؐ نے اس سے مجھ آگاہ فرمایا۔''[۵]

نیز امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے:

''الیس الله یقول: عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه احداً الا من ارتضی من رسول فرسول الله عندالله مرتضی و نحن ورثة ذلك الرسول الذی

---

[۱] کافی ج ۱ ص ۲۲۴ مرات العقول ج ۱ ص ۱۶۸

[۲] کافی ج ۱ ص ۲۲۲

[۳] بصائر الدرجات ص ۲۲۸ طبع جدید

[۴] بصائر الدرجات ص ۱۲۰

[۵] بصائر الدرجات دوم جز باب ۲۱

اطلعه الله علی ما یشاء من غیبه..."[1]

"کیا خدا نے نہیں فرمایا، وہ (خدا) غیب کا عالم ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا مگر اس شخص کو جس کو وہ چن لے رسول۔ پس پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے برگزیدہ ہیں اور ہم اس پیغمبر کے (علوم کے) وارث ہیں اور اس نے آپؐ کو جس حد تک چاہا ہے غیب پر مسلط کیا ہے؟"

نیز اس کتاب کے تیسرے حصے میں دو روایتیں ذکر کی جا چکی ہیں جن میں سے ایک نہج البلاغہ سے ہے اور دوسری امالی شیخ مفید سے وہ دونوں اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ آئمہ علیہم السلام کا علم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کو ورثے میں ملا ہے۔

نیز چھٹے سوال کے جواب میں کتاب "اثبات الہداۃ" سے دو روایتیں نقل کی گئی تھیں، ان کی طرف رجوع کیا جائے۔

سوال ہشتم

اگر آئمہ علیہم السلام غیب کا علم رکھتے تھے تو پھر کیوں انہوں نے بہت سے مقامات پر اپنے علم غیب سے انکار کیا ہے مثلاً اس حدیث میں:

"امام صادق علیہ السلام کی مجلس میں چار اصحاب موجود تھے۔ آپؑ غصے میں ان کے پاس آئے اور فرمایا:

"مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم غیب جانتے ہیں جبکہ غیب کا عالم صرف خدا ہے میں چاہتا تھا کہ اپنی کنیز کو تنبیہ کروں لیکن وہ بھاگ کر چھپ گئی ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ گھر کون سے کمرے میں ہے۔"[2]

پہلا جواب

اس قسم کی روایات ان لوگوں کے اعتقاد کو رد کرنے کے لیے ہیں جو آئمہ کے علم غیب کو ذاتی اور بدون تعلیم الٰہی جانتے ہیں۔ امام علیہ السلام اس بیان کے ذریعے ایسے لوگوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ اگر خدا انہیں غیب سے آگاہ نہ کرے، تو وہ بذاتِ خود آگاہ نہیں ہیں جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے:

"ان عالمنا لا یعلم الغیب ولو کل الله عالمنا الی نفسه کان کبعضکم ولکن یحدث الیه ساعة بعد ساعة......"

"ہم اہل بیت کا عالم (ذاتی) علم غیب نہیں رکھتا مگر یہ کہ خدا اسے اس کی تعلیم دے اور اگر خدا اسے اس کی ذات

[1] اثبات الہداۃ ج ۶ ص ۱۳۰

[2] کافی جلد ۱ ص ۲۵۷

پر چھوڑ دے اور کوئی چیز اسے نہ بتائے تو وہ بھی عام لوگوں کی طرح ہوگا، لیکن خدا ہمیشہ اسے علم عطا کرتا رہتا ہے۔"[1]

نیز ایک اور روایت میں امام زمان علیہ السلام سے نقل ہوا ہے:

"میں ان افراد سے بیزار ہوں جو یہ کہیں کہ ہم اہل بیت علم غیب رکھتے ہیں یا ملک وقدرت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔ ہم خدا کی علم وقدرت میں شریک نہیں ہیں۔"[2]

واضح رہے کہ یہ روایت ان لوگوں کے اعتقاد کے رد کے طور پر ہے جو امام علیہ السلام کو خدا کی مانند ذاتاً عالم غیب سمجھتے ہیں ورنہ جو شخص امام علیہ السلام کو تعلیم الٰہی کے ذریعے غیب کا عالم جانتا ہے اس نے آپؑ کو خدا کے علم میں شریک قرار نہیں دیا۔

اس مطلب پر واضح گواہ سوال میں مذکورہ روایت کا باقی حصہ ہے، کیونکہ راوی اس روایت میں کہتا ہے:

"مجلس کے ختم ہونے کے بعد امام صادق علیہ السلام اپنے گھر چلے گئے۔ ہم دو دوسرے افراد کے ساتھ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے کہا: "قربان جائیں آپؑ پر، ہم نے آپؑ کی گفتگو سنی ہے جب آپؑ کنیز کو تلاش کر رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ کون سے کمرے میں ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ آپؑ بہت وسیع علم کے مالک ہیں، لیکن ہم آپ کی عالم غیب سے توصیف نہیں کریں گے۔"

امام علیہ السلام نے ان کے جواب میں اس بارے میں کہ "علم الکتاب" آئمہؑ کے پاس ہے، تشریح فرمائی اور دراصل ان کی بات کی تصدیق فرمائی۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام صادق علیہ السلام اس سے ناراض ہوتے تھے کہ "عالم غیب" کا جملہ ان کے بارے میں کہا جائے جیسا کہ تیسرے حصے میں کہا گیا ہے کہ آپؑ کے زمانے میں علم غیب ذاتی اور تعلیم الٰہی کے بغیر علم غیب کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام صادق علیہ السلام کے اصحاب کہتے تھے کہ ہم آپؑ کو عالم غیب کی نسبت نہیں دیں گے۔

دوسرا جواب

ان روایات کے مطابق جو خود آئمہ علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں ان کا علم غیب حاصل کرنا خود ان کی خواہش پر ہے۔ یعنی جب وہ کسی چیز کو جاننا چاہیں تو ان کو علم دے دیا جاتا ہے اور وہ جان جاتے ہیں اور جب وہ کسی چیز کو نہ جاننا چاہیں تو اس کے بارے میں بے اطلاع رہتے ہیں۔ اب اس بارے میں متن روایات نقل کیا جاتا ہے:

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"ان الامام اذا شاء ان یعلم علم"

---

[1] بصائر الدرجات ص ۹۴ طبع سنگی

[2] احتجاج طبرسی، ص ۲۶۵ طبع سنگی نجف

''امام جب کسی چیز کو جاننا چاہتا ہے تو اس کو تعلیم دے دی جاتی ہے۔''[۱]

نیز امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

"اذا ارادہ الامام ان یعلم شیئا اعلمه الله عزوجل ذالك"

''جب امام کسی چیز کو جاننے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ جل شانہ اسے اس چیز سے آگاہ کر دیتا ہے۔''[۲]

نیز اسی مضمون پر مشتمل تین اور روایتیں امام صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ہیں۔[۳]

تیسرا جواب

ایسی روایات جن میں آئمہ علیہم السلام نے علم غیب کو اپنے آپ سے نفی کیا ہے، ممکن ہے انہوں نے تقیہ کیا ہو، کیونکہ عباسی خلفاء اس سے سخت پریشان اور ناراض تھے کہ لوگ آئمہ اطہار کے بارے میں فضیلت اور بلند مرتبے کے قائل ہیں اور آپؑ کو خدا کے برگزیدہ افراد سمجھتے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے بعض آئمہؑ پر اعلانیہ طور پر اعتراض کیا کہ آپؑ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ہم غیب سے آگاہ ہیں؟

مثلاً منصور دوانیقی نے امام صادق علی السلام سے کہا:

"انت تزعم للناس یا اباعبدالله انك تعلم الغیب"

''تم لوگوں کے سامنے غیب کے علم کا دعویٰ کرتے ہو۔''[۴]

لہٰذا اس بات کا بہت مکان ہے کہ ایسی مجلس جس میں آپؑ کے چار اصحاب اور شاید دوسرے افراد بھی حاضر ہو، امام علیہ السلام ایسی بات کہیں، یعنی علم غیب کی اپنے آپ سے نفی کریں تا کہ لوگوں کے درمیان مشہور ہو جائے اور نتیجہ کے طور پر کسی حد تک خلفاء کی آزار و اذیت سے محفوظ رہ سکیں۔

سوال نہم

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء کا علم غیب صرف وحی میں منحصر ہے؟

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ

---

[۱] کافی ج ۱ ص ۲۵۸، بصائر الدرجات ۳۱۵ (طبع جدید)

[۲] کافی ج ۱ ص ۲۵۸، بصائر الدرجات ۳۱۵

[۳] کافی ج ۱ ص ۲۵۸، بصائر الدرجات ۳۱۵

[۴] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۴۷۷ ۱۳ امالی شیخ طوسی کے حوالے سے

رَّسُوْلٍ......... [1]

اور اس آیت کا بھی اس طرح معنی کیا جانا چاہیے:

"خدا اپنے پسندیدہ بندوں کے علاوہ کسی کو وحی نہیں کرتا یعنی نبوت صرف خدا کے خاص بندوں سے مخصوص ہے۔"

جواب

جن افراد کے لیے انبیاء اور آئمہؑ کے علم غیب کو قبول کرنا تلخ ہے ان میں سے ایک نے ایک کتابچہ تحریر کرکے کوشش کی ہے کہ ان کے علم غیب سے انکار کیا جائے اور اس نے مندرجہ بالا آیت کے بارے میں بہت ہاتھ پاؤں مارے ہیں کہ آیت میں غیب کا معنی وحی کرے تاکہ نتیجے کے طور پر انبیاء کے علم غیب کو وحی میں منحصر کردے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم غیب کو قرآن میں محصر قرار دے دے اور اسی کے ضمن میں ائمہ علیہم السلام کے علم غیب سے انکار کردے۔ وہ اپنی بات پر یوں استدلال پیش کرتا ہے کہ قرآن سورۂ آل عمران میں حضرت عمران کی بیوی اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی داستان بیان کرنے کے بعد یوں فرماتا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ......... [2]

اور اسی طرح سورہ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام، ان کی اپنی قوم کو دعوت اور پھر کشتی بنانے کی ذمہ داری کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ........... [3]

نیز سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ......... [4]

اس صورت میں ان آیات کے قرینے سے اس آیت

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ﴿۲۶﴾ [5]

---

[1] سورہ جن آیات ۲۶، ۲۷

[2] سورہ آل عمران ۴۴

[3] سورہ ہود ۴۹

[4] سورہ یوسف ۱۰۲

[5] سورہ جن ۲۶

میں غیب سے مراد وحی الٰہی ہے۔ یہ تھا اس کی گفتگو کا خلاصہ۔

یہ گفتگو مختلف جہات سے مردود ہے۔

پہلی بات

عربی لغت میں غیب حس سے پوشیدہ امر کے معنی میں ہے اور یہ شہود کے مقابلے میں ہے جس کا معنی حواس سے محسوس شدہ امر ہے اگر اس لحاظ سے کہ وحی ہمارے حواس سے پوشیدہ اور غیب ہے۔ اسی طرح ایسے واقعات جو آسمانوں اور زمین میں وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ بھی ہمارے حواس سے پوشیدہ امور ہیں۔ اس صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ ایسا لفظ جو وسیع معنی رکھتا ہے اسے صرف وحی سے مختص کرتے ہوئے کہیں کہ مراد بالخصوص وحی ہے۔ قرآن مجید پرہیز گاروں کی علامات میں سے ایک غیب پر ایمان ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ [1]

کیا اعتراض کرنے والا اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر صرف اور صرف وحی کی جائے جبکہ اس آیت میں غیب ایک وسیع وعریض معنی رکھتا ہے اور آخرت اور دوسری زندگانی، محشر، بہشت اور دوزخ پر ایمان اس کے مصادیق میں سے ہیں، مومنین جن کے موجود ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اگر چہ وہ اس جہان میں ان کو اپنی نظروں اور دیگر حواس سے محسوس نہ کریں۔

دوسری بات

عربی لغت میں غیب حس سے پنہاں امر کے معنی میں ہے جس کے مقابلے میں لفظ شہادت ہے۔ قرآن مجید مکرر خداوند قدوس کی یوں توصیف کرتا ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ط [2]

اور ہرگز عربی زبان میں لفظ غیب وحی کے لیے نہیں آیا اور اگر کبھی وحی پر غیب کا اطلاق ہوا بھی ہے تو اس لحاظ سے نہیں کہ غیب کا مستقیم معنی وحی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وحی لوگوں کے حواس سے پوشیدہ ہے، غیب کے مصدایق میں سے ہے۔ یہ اشتباہ علماء کی اصطلاح میں مفہوم سے مصادیق کا اشتباہ ہے۔ یعنی یہ تصور کیا گیا ہے کہ غیب وحی کے معنی میں ہے جبکہ وحی غیب کے مصادیق میں سے ایک ہے نہ یہ کہ غیب کا معنی ہی وحی ہے۔

نہ صرف اس آیت (سورہ جن آیہ ۲۶ و ۲۷) میں غیب حواس سے مخفی و پوشیدہ امور کے معنی میں ہے بلکہ قرآن مجید میں چون (۵۴) مقامات پر جہاں بھی غیب کا لفظ استعمال ہوا ہے انہی معنوں میں آیا ہے، یہاں تک کہ ان تین آیات جن سے معترض نے استدلال کیا ہے (آل

---

[1] سورہ بقرہ ۳

[2] سورہ انعام ۷۳، توبہ ۹۴، رعد ۹

عمران ۴۴، ہود ۴۹، یوسف ۱۰۲) میں بھی لفظ غیب حواس سے مخفی امور کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان تین آیات کا مقصود نوحؑ، یوسفؑ اور مریمؑ کی داستان ہے کہ لوگ ان قصوں سے صحیح اور مکمل طور پر اطلاع نہیں رکھتے تھے اور یہ ان سے مخفی تھے اور وحی کے وسیلے سے یہ داستانیں لوگوں پر عیاں ہوئیں۔ درحقیقت وحی غیب کے پہنچنے کا وسیلہ ہے نہ یہ کہ غیب کا معنی وحی ہے۔

آپ قرآن میں ایک بھی ایسی جگہ پیش نہیں کر سکتے کہ جہاں غیب وحی کے معنی میں آیا ہو۔ اب اس کے چند نمونے آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کرتے ہیں:

۱۔ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ [۱]

بیشک میں آسمانوں اور زمین کے غائبات کو جانتا ہوں۔

۲۔ وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَیۡبِ [۲]

اور خدا کے پاس غیب کی چابیاں ہیں۔

۳۔ اَنۡ لَّوۡ كَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ الۡغَیۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِی الۡعَذَابِ الۡمُهِیۡنِ ﴿۱۴﴾ [۳]

اگر پریاں اور جن غیب کی خبر رکھتے تو اس ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔ [۴]

تیسری آیات

کلمہ ''عالم الغیب'' کا مقصود حس سے پوشیدہ مطلق امور ہیں، صرف وحی الٰہی نہیں مثلاً قرآن میں زیر بحث آیت سے قبل قیامت کے وقت سے آگاہی کا ذکر ہے۔ [۵] پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے اپنی لاعلمی کا اظہار فرمایا ہے اور اگر ایسی نفی کے بعد یہ کہا جائے کہ ''عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احداً'' تو حتماً قیامت کا عنوان اس آیت میں داخل ہوگا اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر میں قیامت کے وقت کا علم نہیں رکھتا تو یہ اس لیے ہے کہ غیب کا علم خدا کی جانب سے ہے، اسے اس کا عالم ہونا چاہیے نہ کہ مجھے۔ اس بات کو ملاحظہ کرنے کے بعد

---

[۱] سورہ بقرہ ۳۳

[۲] سورہ انعام ۵۹

[۳] سورہ سبا ۱۴

[۴] باقی آیات کے لیے جن میں غیب کا لفظ ذکر ہوا ہے المعجم المفہرس ملاحظہ کریں۔

[۵] چنانچہ فرماتا ہے:

حَتّٰۤی اِذَا رَاَوۡا مَا یُوۡعَدُوۡنَ فَسَیَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَضۡعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلۡ اِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ اَمۡ یَجۡعَلُ لَهٗ رَبِّیۡۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡهِرُ .... (سورہ جن ۲۴ تا ۲۶)

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آیت میں غیب سے مراد صرف وحی ہے کیونکہ آیت کے سیاق و سباق کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیامت کا وقت ''عالم الغیب'' کے عنوان سے خارج ہے۔

اگر قیامت کا وقت آیت کے موضوع میں داخل ہو تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے غیب کے موضوعات آیت سے خارج ہوں۔

اس صورت میں آیت کا معنی یوں کیا جائے گا:

''خدا غیب کا عالم ہے (حواس سے پوشیدہ اور مخفی امور کا، خواہ وہ وحی ہوں یا وحی کے علاوہ ہوں) اور وہ کسی کو غیب پر مسلط نہیں کرتا مگر جس کو وہ رسول کی حیثیت سے چن لے۔''

اس مطلب کو مدنظر رکھنے سے یہ آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غیب اور حواس سے پوشیدہ امور پر علم کی واضح گواہ بن جائے گی، خواہ یہ وحی کے ذریعے ہو یا کسی اور ذریعے سے۔

چوتھی بات

جہاں تک ہم نے دیکھا ہے تمام اسلامی مفسرین اور کتاب آسمانی کی فہم کے ماہرین یک زبان ہو کر اس کے بارے میں کہتے ہیں:

''زیر بحث آیت (سورہ جن) میں علم غیب سے مراد انبیاء کی پوشیدہ امور سے آگاہی ہے۔'' بعض افراد مثلاً طبرسی، قرطبی اور تفسیر روح البیان کے مولف ان کے علم غیب کی یوں توجیہ کرتے ہیں: ''پوشیدہ امور پر ان کا علم، رسالت کا معجزہ اور علامت ہے اور اس کی رسالت کی تکمیل کرنے والا ہے، کیونکہ ایسے افراد کا مخفی امور سے خبردار ہونا لوگوں کے اعتماد کا سرمایہ اور عالم بالا سے ان کے ارتباط کا گواہ بن سکتا ہے۔'' یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان سب مفسرین نے اشتباہ کیا ہے اور صرف معترض نے درست سمجھا ہے۔ ہم نے مندرجہ ذیل تفاسیر کی طرف رجوع کیا ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سب نے علم غیب کی تفسیر پوشیدہ امور سے مطلق آگاہی کی ہے اور کسی ایک نے بھی غیب کا معنی صرف وحی نہیں کیا ہے:

۱۔ تفسیر تبیان، شیخ طوسی ج ۱۰ ص ۱۵۸
۲۔ تفسیر مجمع البیان، شیخ طبرسی ج ۱۰ ص ۳۷۴
۳۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۴۳۳
۴۔ تفسیر قاضی بیاضوی ص ۴۴۵
۵۔ تفسیر جوامع الجامع طبرسی، ص ۵۱۴
۶۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۱۱ ص ۲۹۳
۷۔ تفسیر کشاف، ج ۴ ص ۶۳۳
۸۔ تفسیر زاد المسیر، تالیف ابن جوزی ج ۸ ص ۳۸۵
۹۔ تفسیر قرطبی، ج ۱۰ ص ۶۸۱۹
۱۰۔ تفسیر جلالین، ص ۷۶۶
۱۱۔ تفسیر طنطاوی، ج ۲۴، ص ۲۸۱
۱۲۔ تفسیر مراغی، ج ۲۹ ص ۱۰۶
۱۳۔ تفسیر گازر، ج ۱۰ ص ۱۹۱
۱۴۔ تفسیر فی ظلال القرآن، ج ۲۹ ص ۱۶۲
۱۵۔ تفسیر علی بن ابراہیم قمی، ص ۷۰۰
۱۶۔ تفسیر صافی، ج ۲ ص ۷۵۳
۱۷۔ تفسیر سید عبداللہ شیر، ص ۱۱۶۴
۱۸۔ تفسیر مقتنیات الدرر، ج ۱۱ ص ۲۷۳

۱۹۔ تفسیر منہج الصادقین، ج۱۰ص ۴۰ ۲۰۔ تفسیر روح البیان، ج۱۰ص ۲۰۱

سوال دہم

ممکن ہے کہا جائے کہ:

"وما كان الله ليطلعكم على الغيب و لكن الله يجتبى من رسله من يشاء......"

کی آیت میں کلمہ ''الغیب'' سے مراد اصطلاحی وحی ہے جو انبیاء پر نازل ہوتی ہے اور وحی کے وسیلے سے انبیاء کی غیب سے آگاہی معرض انکار قرار نہیں پائی۔ جس چیز کا انکار کیا گیا ہے وہ انبیاء اور ائمہ کا وحی کے علاوہ کسی ذریعے سے غیب کا عالم ہونا ہے۔

جواب

پہلی بات تو یہ ہے کہ نویں سوال کے جواب سے اس سوال کا جواب بھی خوب واضح ہو جاتا ہے۔ ازراہِ کرم دوبارہ اس کا مطالعہ فرمائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس آیت کے آغاز کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں غیب وحی کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ اب آیت کے تمام متن کو ترجمے کے ساتھ یہاں پر ذکر کرتے ہیں۔

آیت دو حصوں پر مشتمل ہے:

۱۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ [۱]

''اللہ مومنین کو اس حال پر جس پر تم ہو، نہیں چھوڑتا تا کہ پلید کو پاک سے جدا کرے۔''

۲۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ص [۲]

''اللہ تمہیں غیب سے مطلع نہیں کرتا مگر اپنے رسولوں میں سے جس کو چن لے۔''

---

[۱] سورہ آل عمران ۱۷۹

[۲] سورہ آل عمران ۱۷۹

آیت کے سیاق کو مدنظر رکھتے ہوئے کلمہ ''خبیث'' سے مراد ظاہری مسلمان منافق ہی ہیں جیسا کہ ''طیب'' سے مراد حقیقی مومن ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے پہلے حصے میں مسلمان معاشرے کو خبر دار کیا ہے کہ خدا تمہارے معاشرے کو اس حالت میں (کہ منافق اور مسلمان آپس میں ملے جلے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے ان کی پہچان نہیں ہو سکتی) نہیں چھوڑے گا بلکہ اللہ تعالیٰ مومن اور منافق کو جدا جدا کرے گا اور مومن کو منافق سے جدا کرنے کے لیے خود آیت میں دو راستے ذکر کیے گئے ہیں۔

پہلا راستہ

انہیں آزمائش اور امتحان میں مبتلا کرے گا اور اس طریقے سے ان دو گروہوں کو آپس میں جدا کر دے گا۔

دوسرا راستہ

اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم غیب کے ذریعے سے مومن اور منافق میں امتیاز کی قوت عطا کرے گا۔ یہ راستے لوگوں میں سے کچھ افراد یعنی انبیاء سے مخصوص ہیں، وہ بھی سب انبیاء نہیں بلکہ ان میں سے انتخاب کیے گئے۔ اس حقیقت کی طرف جملہ "ما کان الله......" کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں غیب سے مراد اصطلاحی وحی نہیں بلکہ خارجی موضوعات سے آگاہی مراد ہے مثلاً مومن کا منافق سے امتیاز۔ کیونکہ اگر مراد اصطلاحی وحی ہوتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ اسے بعض رسولوں سے اختصاص دیا جائے جبکہ تمام پیغمبر اس فیض سے بہرہ مند ہیں۔ اس کے علاوہ انبیاء کو غیب سے آگاہ کرنے کا مقصد آیات کے سیاق کی شہادت کی بنا پر مومن کی منافق سے تشخیص ہے اور یہ کام ان میں سے ہر ایک فرد کی شناخت اور پہچان سے انجام پاتا ہے اور قرآن میں ہرگز منافق افراد کا مشخص طور پر تعارف نہیں کروایا گیا، اگرچہ ان کی چند صفات کو کلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس بات کا گواہ کہ ان میں سے ہر ایک فرد کی پہچان مقصود ہے یہ ہے کہ جنگ تبوک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام منافق افراد کی ان تمام خصوصیات کے ساتھ شناخت کر لی تھی اور حضرت حذیفہؓ کو ان کی پہچان کروائی تھی۔ درحقیقت آیت "حتی یمیز الخبیث من الطیب" کا مفہوم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شناسائی سے انجام پایا ہے اور جملے "ولکن الله یجتبی من رسله" کے مضمون نے عملی جامہ پہنا ہے۔ اگر کوئی شخص آیت کے مفہوم پر ذرا سا غور و فکر کرے تو وہ اعتراف کرے گا کہ مقصود آسمانی وحی نہیں بلکہ خبیث (منافق) کی طیب (حقیقی مسلمان) سے جدا شناخت ہے اور ایسی شناخت کہ انبیاء منافقین پر انگلی رکھیں صرف کلی بات کہنے سے ممکن نہیں ہے بلکہ کسی اور طریقے سے پیغمبر پر الہام ہونا چاہیے تاکہ وہ ان اشخاص کو پہچان لے اور پہچان کروائے۔

معرفت سوم۔ ائمہؑ کی مصیبتیں

گذشتہ آیات و روایات سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انبیاء اور آئمہ معصومینؑ دلالت الٰہی کے پرتو میں ایک قسم کی

آگاہی سوم رکھتے ہیں۔ یہ وہی ولایت ہے جو انہیں گذشتہ و آئندہ کی خبریں دینے کی قوت و توانائی بخشتی ہے، اس سے وہ واقعات کو وقوع سے قبل جان سکتے ہیں اور لوگوں کو بتا سکتے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ولایت الٰہی کا اثر یہ ہے کہ وہ الٰہی نگاہوں سے واقعات کو درک کر سکتے ہیں تو وہ ہمیشہ خطروں اور مصیبتوں سے محفوظ رہتے، کبھی بھی اپنے دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر زہر کا پیالہ نہ پیتے، محراب عبادت میں شہید نہ ہوتے، میدان جنگ میں دشمنوں کے حملوں کا نشانہ نہ بنتے اور ان کے زہریلے تیروں کا ہدف قرار نہ پاتے۔ لیکن وہ ایسے ناگوار حوادث کی زد میں آئے ہیں، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات اور حوادث کا علم نہیں رکھتے تھے اور اگر علم رکھتے تو اپنی جان اور مال کو معرض خطر میں قرار نہ دیتے۔ یہ سوال جو حالیہ دور میں زبان زدِ عام ہے ماضی میں بھی کسی طرح سے موجود تھا۔ اس سوال نے کچھ لوگوں کو ایسی آگاہی کے بارے میں شک و تردد میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس بارے میں استاد بزرگوار حضرت علامہ طباطبائی قدس سرہ نے جو جواب دیا ہے اسے تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جواب

امام کی حوادث اور وقائع سے آگاہی نقلی دلائل اور عقلی براہین کی روشنی میں دو قسم کی ہے اور دو طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔

علم امام کی پہلی قسم

امام (علیہ السلام) عالم ہستی کے حقائق سے ہر قسم کی شرائط کی موجودگی میں خدا کے اذن سے واقف ہے خواہ وہ حس کے تحت واقع ہوں یا حس کے دائرے سے باہر ہوں، مثلاً آسمانی موجودات، گذشتہ کے حالات اور آئندہ کے واقعات۔ اس بات کی دلیل:

راہِ اثباتِ علم

روایاتِ متواترہ کے ذریعے سے جو شیعہ جوامع حدیث مثلاً کتاب کافی، بصائر، کتب صدوق، کتاب بحار اور ان کے علاوہ کتب میں نقل ہوئی ہیں۔

یہ روایات کہ جنہیں شمار نہیں کیا جا سکتا، ان کے مطابق امام علیہ السلام الٰہی بخشش و عطا کے ذریعے، نہ کہ اکتساب کے ذریعے، تمام اشیاء سے واقف اور آگاہ ہے اور جس چیز کو بھی چاہے باذن الٰہی تھوڑی سی توجہ کے ساتھ جان لیتا ہے۔

البتہ قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جو علم غیب کی ذات باری تعالیٰ سے مختص قرار دیتی ہیں اور اسے اس کے احاطہ قدرت میں منحصر کرتی ہیں۔ لیکن ایک استثناء جو اس آیت "عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ"[1] میں موجود ہے، بتاتا ہے کہ علم غیب کا ذات باری تعالیٰ سے اختصاص کا معنی یہ ہے کہ غیب کو مستقل طور پر اور بذاتِ خود خداوند تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا،

---

[1] سورہ جن آیات ۲۶۔۲۷

لیکن پسندیدہ پیغمبروں کا تعلیم الٰہی کے ذریعے غیب سے آگاہ ہونا ممکن ہے۔اسی طرح دیگر پسندیدہ افراد کا بھی پیغمبروں کی تعلیم کے ذریعے غیب سے آگاہ ہونا ممکن ہے۔جیسا کہ بہت سی روایات میں آیا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہر امام اپنی زندگی کے آخری لحات میں علم امامت اپنے سے بعد والے امام کے سپرد کیا کرتے تھے۔

عقل کے ذریعے اثبات

ایسے دلائل موجود ہیں جن کی بدولت امام علیہ السلام حامل مقام نورانی، اپنے دور میں کامل ترین انسان، خدا کے اسماء اور صفات کا مظہر تام ہونے کے لحاظ سے جہان کی ہر چیز کا بالفعل عالم اور ہر انفرادی واقعے سے آشنا ہے اور اپنے وجودِ عنصری کے لحاظ سے جس طرف بھی وہ توجہ کرے اس کے لیے حقائق آشکار ہو جاتے ہیں۔(ان دلائل کا ثبوت عقلی مسائل کے ایک پیچیدہ سلسلے پر موقوف ہے اور اس کی سطح اس مقالے سے بالاتر ہے اس لیے ان کو ان کے خاص مقام کے لیے چھوڑتے ہیں)۔

اس علم کا عمل پر اثر اور تکلیف [1] سے ارتباط

ایک نکتہ جس کی طرف توجہ دینی چاہیے یہ ہے کہ اس قسم کا وہبی علم اس کو ثابت کرنے والے عقلی اور نقلی دلائل کی بنا پر کسی قسم کے انحراف کے قابل نہیں ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور اس میں بال برابر بھی غلطی اور خطا کا امکان نہیں پایا جاتا۔اصطلاحی لحاظ سے یہ ایسا علم ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے اور اس چیز سے آگاہی ہے جس سے حتمی تقدیر الٰہی وابستہ ہے۔

اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی تکلیف کا ایسے علم (اس لحاظ سے کہ ایسے علم سے متعلق ہے اور حتمی الوقوع ہے) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اسی طرح انسان سے کچھ طلب کرنا اس سے مربوط نہیں ہوتا کیونکہ تکلیف ہمیشہ امکان کے راستے سے فعل یا ترک (کوئی کام بجالانے یا بجانہ لانے کے لیے کہا) جائے گا، لیکن حتمی الوقوع اور حتمی قضاء الٰہی سے متعلق ہونے کے لحاظ سے محال ہے کہ مورد تکلیف قرار پایا جائے۔

مثلاً یہ درست ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندے سے فرمائے کہ فلاں کام جس کا انجام دینا اور ترک کرنا تمہارے لیے ممکن ہے اور تمہارے اختیار میں ہے، اسے انجام دو۔لیکن یہ محال ہے کہ خدا فرمائے کہ فلاں کام کو جو میری مشیت تکوینی اور حتمی قضا کے باعث ضرور تحقق پائے گا اسے انجام دو یا ترک کرو کیونکہ ایسا امر و نہی لغو اور بے اثر ہوتا ہے۔اسی طرح ایک ایسا امر جس کے ہونے اور نہ ہونے کا امکان موجود ہو انسان اس کا ارادہ کرتے ہوئے اپنا ہدف و مقصد قرار دے سکتا ہے اور اس کے حصول اور وقوع پذیر ہونے کے لیے جدوجہد و کوشش کر سکتا ہے۔لیکن وہ کبھی بھی ایک ایسے امر کا ارادہ نہیں کر سکتا اور اسے اپنا ہدف و مقصد قرار دیتے ہوئے اس کے لیے کوشش نہیں کر سکتا جس کا ہونا یقینی اور حتمی ہو کیونکہ انسان کا ارادہ و عدم ارادہ ایسے امر میں ذرہ برابر بھی اثر نہیں رکھتا۔مثلاً کسی کو یہ علم ہو جائے کہ اگر فلاں دن فلاں وقت شہر کی فلاں سڑک کی مخصوص جگہ پر ہو تو حتماً بس کے نیچے آ کر کچلا جائے گا (یہ ایک مشروط اور مقید علم ہے) البتہ جہاں تک اس کے لیے ممکن ہے وہ مفروض وقت پر فرض شدہ جگہ پر حاضر نہیں ہوگا

[1] تکلیف سے یہاں مراد شرعی ذمہ داری اور اوامر حکم شرعی ہے جس کے مطابق مکلف کو کچھ بجالانا یا کچھ ترک کرنا ہوتا ہے۔(مترجم)

اوراس طرح اپنی جان کی حفاظت کرے گا۔ واضح ہے کہ خطرے والی مخصوص جگہ پر اس کا نہ جانا علم کے باعث ہے۔

اور اگر کوئی یہ علم حاصل کرلے کہ ٹھیک فلاں وقت، فلاں روز، فلاں جگہ کی فلاں شہراہ پر وہ بس کے نیچے کچلا جائے گا اور اس علم میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوگا اور کوئی بھی کوشش اس خطرہ کو نہیں ٹال سکتی (یعنی حتمی قضا کا علم ہو تو بدیہی ہے کہ یہ شخص اس کے باوجود خطرہ کا علم رکھتا ہے، خطرے سے بچنے کے لیے وہ ذرہ برابر کوشش نہیں کرے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور بات وہی ہے جو کہی جا چکی ہے کہ ''حتمی قضا کا علم انسان کی عملی زندگی میں کوئی اثر نہیں رکھتا اور انسان کے کاندھوں پر کسی قسم کی ذمہ داری نہیں ڈالتا۔''

یہ شخص خطرے کے علم کے باوجود اپنی معمول کی زندگی کو جاری رکھے گا اگرچہ اس کا انجام خطرے پر ہی ہوگا۔ اور یہ بات اس آیہ کریمہ:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ (سورہ بقرہ ۱۹۵)

میں شامل نہیں ہوتی، کیونکہ وہ شخص ہلاکت میں واقع ہوا ہے نہ یہ کہ اس نے خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ اس پہلے شخص کے بخلاف چونکہ وہ مکلف ہے کہ اپنے آپ کو ممکنہ حد تک خطرے سے بچانے کے لیے چارۂ کار سوچے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔

اس گفتگو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ:

۱۔ امام علیہ السلام کا یہ موہبتی علم اس کے اعمال میں موثر نہیں ہے اور اس کی خاص تکالیف سے مربوط نہیں ہے اور اصولاً ہر مفروض امر اس جہت سے کہ قضا حتمی سے متعلق اور حتمی الوقوع ہے امر یا نہی یا انسان کے ارادہ اور قصد سے متعلق نہیں ہوتا۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ حتمی قضا اور حق تعالیٰ کی مشیت قاطعہ سے متعلق امور در رضا بقضاء کے مقام پر ہیں جیسا کہ سید الشہداء علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری لحات میں خاک وخون میں غلطاں ہو کر فرمایا تھا:

''رضا بقضاءك وتسليما لامرك لا معبود سواك''

اسی طرح آپؑ نے مکہ سے باہر آتے وقت جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں آپؑ نے فرمایا:

''رضا الله رضانا اهل بيت''

۲۔ شاید کوئی یہ خیال کرے کہ قطعی حوادث اور واقعات قطعی اور غیر قابل تغییر علم کا لازمہ جبر ہے۔ مثلاً اگر فرض کریں کہ امامؑ کو یہ علم تھا کہ فلاں شخص، فلاں مقام پر فلاں وقت معین شرائط کے تحت مجھے قتل کرے گا اور یہ واقعہ قابل تغیر نہیں ہے تو اس فرض کا لازمہ یہ بنتا ہے کہ قتل کا ترک کرنا قاتل کے بس میں نہیں تھا (اس کے اختیار میں نہیں تھا) اور وہ یہ قتل کرنے پر مجبور تھا اور بافرض مجبوری، مجبور شخص کے لیے کوئی تکلیف نہیں ہے۔

۱۔ پہلے تو یہ اعتراض درحقیقت قضاء الٰہی کے انسان کے اختیاری افعال سے تعلق سے متعلق ہے (نہ کہ امام کے علم سے) اس اعتراض کے مطابق سینوں کا گروہ معتزلہ کہتا ہے: تقدیر الٰہی انسان کے اختیاری فعل سے متعلق نہیں ہوسکتی اور انسان مستقل طور پر اپنے افعال کا خالق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق ہے اور خدا باقی اشیاء کا خالق ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی صریح نص اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ

ہدی علیہم السلام کی متواتر احادیث کے مطابق تمام موجودات اور جہان کے تمام واقعات بلا استثناء ذات اقدس الٰہی کی قضاء وقدر سے متعلق ہیں۔

عقلی بحث کے ذریعے سے بھی مطلب بہت واضح اور روشن ہے اگر چہ اس کی بحث کی وسعت کے پیش نظر اس مختصر کتاب میں اسے سمویا نہیں جا سکتا۔ جو چیز اجمالی طور پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جہان ہستی جو آفرینش پروردگار ہے میں کوئی بھی چیز اس کی مشیت اور اذن کے بغیر وجود میں نہیں آتی اور انسان کے اختیاری افعال سے مشیت الٰہی نے ارادے اور اختیار کے ذریعے سے تعلق پیدا کیا ہے۔ مثلاً ذات باری تعالیٰ نے چاہا ہے کہ انسان فلاں اختیاری فعل اپنے ارادہ اور اختیار سے انجام دے۔ البتہ یہ بات بدیہی ہے کہ اس وصف کے ساتھ فعل لازم التحقیق ہوگا پھر بھی اختیاری ہے کیونکہ اگر اختیاری نہ ہو تو خداوند تعالیٰ کا ارادہ اس کی مراد و مقصود سے مختلف ہوگا۔

وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۹﴾ [۱]

۲۔ اگر ہم قضاء وقدر کے انسان کے اختیاری فعل سے تعلق سے صرف نظر کریں تو قرآن کی صریح نص اور متواتر احادیث کی رو سے اللہ تعالیٰ نے ایک لوح محفوظ خلق فرمائی ہے اور اس میں دنیا کے گذشتہ اور آئندہ پیش آنے والے تمام واقعات وحوادث کو ثبت فرمایا ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا اور خود اس کی ذات مقدس جو کچھ اس میں ہے اسے جانتی ہے۔ کیا یہ مذاق نہیں ہوگا کہ ہم یہ کہیں کہ لوحِ محفوظ میں ناقابل تغیر واقعات وحوادث کا ثبت کرنا اور ان کا خدا کو علم ہونا انسان کے افعال کو جبری نہیں بناتا، لیکن اگر امام ان میں سے بعض یا تمام کا علم حاصل کرلے تو انسان کے اختیاری افعال بالخصوص قاتل امام کا فعل جبری ہو جائے گا؟

۳۔ یہ کہ امام علیہ السلام کے اعمال کا ظاہر ظاہری علل واسباب سے قابل تطبیق ہے اور اس وہبی علم کی دلیل اور شاہد نہ ہونے کی بنا پر اسے واقعہ سے جہالت نہیں سمجھنا چاہیے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ

اگر سید الشہداء علیہ السلام کو واقعہ کا علم تھا تو حضرت مسلم کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ کیوں بھیجا؟ کیوں صیداوی کے ذریعے سے اہل کوفہ کو خط لکھا؟ کیوں خود مکہ سے کوفہ کی راہ لی؟ کیوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛ [۲]

کیوں اور کیوں؟

ان تمام سوالات کا جواب اس نکتے سے واضح ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ امام علیہ السلام نے ان اور ان جیسے تمام موارد پر ایسے علم پر عمل فرمایا جو عام ذرائع سے اور شواہد وقرائن سے حاصل ہوا اور حقیقی خطرہ، جسے وہ جانتے تھے کو دور کرنے کے لیے کوئی بھی اقدام نہ فرمایا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کوشش بے سود ہے اور قضاء حتمی اور تغیر ناپذیر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں سورہ آل عمران میں ان افراد کے جواب میں فرمایا جنہوں نے جنگ احد کے موقع پر کہا تھا کہ جو ساتھی مارے گئے ہیں اگر ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔

---

[۱] سورہ تکویر آیت ۲۹

[۲] سورہ بقرہ آیت ۱۹۵

قُلۡ لَّوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ لَبَرَزَ الَّذِيۡنَ كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمۡ‌ۚ [1]

''کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کا قتل ہونا لکھا گیا تھا وہ ضرور اپنے گھروں سے نکل نکل کر قتل گاہوں میں آتے۔''

علم امام کی دوسری قسم ''عام علم''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور (ان کی پاک عزت سے) امام قرآن کریم کی نص کی رو سے باقی انسانوں کی طرح بشر ہیں اور وہ اپنی زندگی میں جو اعمال انجام دیتے ہیں وہ بھی باقی افراد کے اعمال کی مانند اختیاری طور پر اور عام علم پر مبنی ہوتے ہیں۔ امام بھی دوسروں کی طرح خیر وشر اور کاموں کے نفع ونقصان کو عام علم کے ذریعے سے پہچانتا ہے اور جس کام کو مناسب سمجھتا ہے اسی کا ارادہ کرتے ہوئے اسے انجام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں پر خارجی علل عوامل اور اوضاع و احوال مواقف ہوں، ہدف کو پالیتا ہے اور جہاں پر اسباب وشرائط نامساعد ہوں، وہاں آگے نہیں بڑھتا۔

(اور یہ کہ امام خدا کے اذن سے تمام واقعات کی جزئیات جیسے ہوئے اور جیسے ہوں گے، سے واقف ہے، اس کا اس کے اختیاری اعمال میں کوئی عمل دخل نہیں، جیسا کہ گذر چکا ہے) امام دوسرے افراد کی طرح خدا کا بندہ ہے اور دینی احکام اور تکالیف کو انجام دینا اس پر فرض ہے۔ اس سرپرستی اور پیشوائی کے مطابق جو اسے پروردگار کی جانب سے حاصل ہے اسے انسان کے معمول کے معیارات کے مطابق انجام دینا چاہیے اور کلمہ حق کے احیاء اور دین وآئین کی سربلندی کے لیے اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ یہاں تک استاد علامہ طباطبائی کا جواب ان کے اپنے انداز بیان میں ذکر کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ استاد کے علمی مقام اور ان کے علمی اور محکم جواب کے بعد کوئی اور جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن شاید اس جواب کا بعض لوگوں کے لیے سمجھنا مشکل ہو۔ اس لیے اس سوال کا جواب ہم ایک اور طریقے سے دیتے ہیں۔

دوسرا جواب

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ امام اپنی عام زندگی میں علم غیب سے مدد نہیں لیتا۔

توضیح

نبی اور امام الٰہی شخصیت اور روح ولایت رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی زندگی میں اور اپنے ساتھ پیش آنیوالے واقعات اور

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۱۵۴

حالات میں، نیز عدالت اور قضاوت میں اپنے عام علم کے مطابق عمل کرتے ہیں (البتہ ان کی شخصیت کا ایک حصہ الٰہی نعمات کا مرہون منت ہے اور دوسرا حصہ خدا کی عبادت و بندگی کے راستے میں ان کی کوشش اور جدوجہد کا ثمر ہے)۔یعنی اس کے باوجود کہ روحِ ولایت کے پرتو میں افق بالا سے پیش آنے والے واقعات کو دیکھ لیتے تھے اور ماوراءطبیعت علل واسباب سے علم وآگاہی کے سبب واقعات اور حالات سے باخبر اور آگاہ تھے لیکن مصلحتوں کے پیش نظر اپنی انفرادی زندگی میں، بلکہ اجتماعی امور مثلاً قضاوت وعدالت میں بھی اس علم سے استفادہ نہیں کرتے تھے۔

دوسے الفاظ میں نبی اور امام اپنی زندگی کی مشکلات کو اس غیبی ہتھیار سے برطرف نہیں کرتے اور ناگوار حوادث کے علل واسباب کو اس علم سے ناکارہ نہیں بناتے اور نہ ہی افراد کی پس میں دشمنی اور اختلاف کی گرہ کو اس علم کے ذریعے سے کھولتے ہیں۔

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تھے۔آپؐ کو خبر دی گئی کہ آپؐ کے بیٹے ابراہیمؑ کی حالت بہت خراب ہے۔آپؐ گھر میں تشریف لائے، اپنے بیٹے کو آغوش میں لیا اور آپؐ کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔اس حالت میں آپؐ نے یوں فرمایا: ''پیارے ابراہیم! میں تیرے کام نہیں آسکتا۔نیز تقدیر الٰہی واپس نہیں ہوتی۔تیرے باپ کی آنکھیں تیری موت پر اشکبار اور اس کا دل غمگین اور افسردہ ہے، لیکن میں ہرگز ایسے الفاظ زبان پر نہیں لاؤں گا جو خدا کی ناراضی کا موجب بنیں۔اگر خدا کا یہ سچا اور پکا وعدہ نہ ہوتا کہ ہم بھی تیرے پیچھے آئیں گے تو تیرے فراق اور جدائی میں اس سے کہیں زیادہ آنسو بہاتا اور غمگین ہوتا۔[1] رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دورانِ رسالت میں تین تیز ترین غیبی ہتھیار رکھتے تھے۔ان میں سے ہر ایک اس قابل تھا کہ حساس ترین لمحات میں اور ناگوار حالات کے پیش آنے پر صورتِ حال کو تبدیل کردے، لیکن تقریباً انہوں نے ان تین ہتھیاروں سے استفادہ نہیں کیا۔یہ تین عبارتیں ہیں:

۱۔اعجاز ۲۔دعائے مستجاب ۳۔علم غیب

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معجزے کی طاقت اور عالم طبیعت میں تصرف کی ولایت حاصل تھی (یہ ولایت کی وہی قسم ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو حاصل تھی۔وہ بھی عالم طبیعت پر تصرف کر سکتے تھے۔اسے وہ مردوں کو زندہ کرنے اور مریضوں کو شفا دینے کے لیے بطور علاج استعمال کرتے تھے)۔[2] ان ذریعوں سے آپؐ اپنے بیٹے کی صحت وسلامتی عطا کر سکتے تھے۔

نیز آپ کو دعا کے مستجاب ہونے کی برکت عطا کی گئی تھی۔اس کے ذریعے آپؐ جب بھی دعا کرتے مستجاب ہوتی۔اس سے آپؐ اپنے بیٹے کی حالت تبدیل کر کے اسے موت کے منہ سے بچا سکتے تھے۔

اسی طرح اپنے علم غیب کے سبب اپنے بیٹے کی بیماری کے عوامل کا بیمار ہونے سے پہلے تدارک کر سکتے تھے تا کہ آپؐ کا بیٹا ایسی بیماری میں مبتلا ہی نہ ہوتا یا اس کی صحت یابی کے لیے وہ دوا استعمال کرتے جو قطعاً مفید اور سودمند ثابت ہوتی۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مقام پر اور دیگر مواقع پر زیادہ تر ان تین ہتھیاروں کو استعمال نہیں فرمایا اور عام وطبیعی

---

[1] سیرۃ حلبی، ج ۳، ص ۳۴۴۔بحار الانوار، ج ۲۲ ص ۱۵۷

[2] سورہ آل عمران کی آیت ۴۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

راستوں اور طریقوں سے اقدام کیا، کیونکہ یہ ہتھیار اور غیب کے اسباب کسی اور مقصد کے لیے آپؐ کو دیے گئے تھے اور آپؐ کو بھی ان ہتھیاروں کو اپنی الٰہی نبوت اور ولایت کے ثبوت کے لیے ضرورت کے مطابق استعمال کرنا چاہیے تھا۔

ان ہتھیاروں سے آپ اس مقام پر استفادہ کر سکتے تھے جہاں پر خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو اذن اور اجازت دی تھی اور اذنِ الٰہی زیادہ تر اس مقام پر ہے جہاں ان کے ذریعے نبوت اور مقام ربوبیت سے اپنے معنوی تعلق کو ثابت کرنا اور اس پر دلیل قائم کرنا مقصود ہو۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام علیہ السلام کو مشکلات اور مصائب کو برطرف کرنے کے لیے ان ذرائع اور مواہب سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے۔ شاید اس کی ایک علت (نہ تمام علل) یہ ہو کہ ان وسائل سے فائدہ اٹھانے کی وجہ سے ان کی عملی تبلیغ اپنا اثر کھو دیتی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیشواؤں کی زندگی، مصائب میں ان کا صبر اور بردباری، میدانِ جہاد میں ان کی استقامت اور جانبازی ان کے پیروکاروں کے لیے نقش قدم ہوتے ہیں۔ اگر فرض یہ ہو کہ نبی یا امام آنے والے حوادث میں اپنے آپ کو معجزے یا مستجاب دعا یا ماورائے طبیعت کے علم کی بدولت مصائب اور مشکلات کی قلمرو سے نکل آئیں اور بلاؤں، بیماریوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں، مثلاً اپنے فرزند کو معجزے کے ذریعے شفا بخش دیں یا اس کی صحت مستجاب دعا سے حاصل کرلیں یا علم غیب سے استفادہ کریں تو اس صورت میں وہ کبھی بھی دوسروں کو مصائب اور مشکلات میں صبر و بردباری، تسلیم اور شکیبائی کا مظاہرہ کرنے کی تلقین نہیں کر سکتے۔ اگر میدانِ جہاد میں، راہِ خدا میں شہادت کے راستے میں ان وسائل کو استعمال کرتے اور ہر قسم کی بلاؤں کے تیروں کو ہدف پر نہ لگنے دیتے اور ہمیشہ اپنے آپ کو اور اپنے سے مربوط اشیاء کو آفتوں کی زد سے محفوظ رکھتے تو پھر لوگوں کو سختیوں اور مشکلات کو برداشت کرنے کی دعوت نہیں دے سکتے تھے کیونکہ فوراً اعتراض کی ایک لہر ان کی طرف اٹھتی اور سب ان سے کہتے کہ اس قسم کی اخلاقی اور خودسازی کے پروگرام کی طرف ہمیں وہ شخص دعوت دے سکتا ہے جو ان بہترین انسانی صفات کا خود نمونہ ہو۔ وہ شخص جس کے لیے درد اور ناراحتی کوئی مفہوم نہیں رکھتے جس نے پوری زندگی میں مصائب اور بلاؤں کو مس نہیں کیا، وہ انسانوں کی زندگی کے لیے نمونہ عمل اور نمونہ اخلاق نہیں بن سکتا۔ اس لحاظ سے (دوسری جہات سے بھی کہ فی الحال ان کے بیان کرنے کا موقع نہیں) کہ الٰہی شخصیتیں مشکلات و مصائب کے دوران بھی ناگوار اور تلخ حوادث میں دوسرے افراد کی مانند کوشش کرتی ہیں اور انہیں دور کرنے کے لیے عام اور مروج اسباب و وسائل سے استفادہ کرتی ہیں اور چہ بسا اسباب کی نارسائی کی وجہ سے ان کی سعی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتی۔

اگر ہم معصومین علیہم السلام کی زندگی کے طور طریقے اور رہن سہن کا مشاہدہ کریں تو ان کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان چنداں تفاوت نہیں ہے۔ یعنی وہ بھی دیگر افراد کی طرح مریض ہوتے تھے اور اس زمانے کی دوا و دارو استعمال کرتے تھے، اجتماعی مسائل اور جنگ و جہاد میں طبعی اور مروجہ علوم سے استفادہ کرتے تھے، مثلاً کچھ لوگوں کو خبریں پہنچانے کے لیے مقرر کرتے تھے............ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ ان غیبی اسباب سے استفادہ خاص موارد کے علاوہ جائز نہیں تھا اور اس میں مصلحت نہیں تھی۔

احادیث کی شہادت

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا کاتب عبید اللہ بن ابی رافع کہتا ہے:

جب امام علیہ السلام نے ابوموسیٰ اشعری کو جنگ صفین کے واقعے میں حکمیت کے لیے "دومتہ الجندل" کی طرف بھیجا تو اس سے یوں فرمایا:

"احکم بکتاب الله و لا تجاوزه فلما ادبر قال علی علیه السلام: و کانی به وقد خدع۔"

"خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا، اس کے حکم سے تجاوز نہ کرنا۔"

جب ابوموسیٰ راہ چل پڑا تو امام علیہ السلام نے فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ فریب کھائے گا۔"

امامؑ کا کاتب کہتا ہے کہ میں نے امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا:

"فلم توجهه وانت تعلم انه مخدوع۔"

"آپؑ کیوں اس کو مامور کر رہے ہیں جبکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ دھوکا کھائے گا؟"

امامؑ نے اس کے جواب میں یوں فرمایا:

"یا بنی لو عمل الله فی خلقه بعلمه ما احتج علیهم بالرسل۔"[1]

"اگر اس پر بناء ہوتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں اپنے علم کے مطابق عمل کرتا تو کبھی بھی انبیاء کو مبعوث کر کے ان پر حجت تمام نہ کرتا۔ (کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جن کے لیے رسولوں کا بھیجنا اور نہ بھیجنا برابر ہے، خواہ ان کے لیے نبی آئے یا نہ آئے وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر بھی اس نے اتنے زیادہ پیغمبر بھیجے ہیں۔)

امیر المومنین علی علیہ السلام اس جواب میں خدا کے خطا ناپذیر علم و آگاہی کا ذکر کرتے ہوئے یاد دلاتے ہیں کہ میری ذمہ داری ہے کہ میں اپنی عام و معمول کی زندگی میں عام اسباب اور ذرائع سے کام لوں اور غیب سے آگاہی میرے عمل کا معیار نہیں ہے۔

نیز روایات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے پیشوا اس بات کی تاکید فرماتے ہیں کہ ہمارے فیصلے کا معیار گواہ اور قسمیں ہیں نہ کہ تیسری آگاہی اور علم، جیسا کہ امام صادق علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"انما اقضی بینکم بالبینت والایمان۔"[2]

"میں تمہارے درمیان گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔"

بعض احادیث کا مفہوم یوں ہے کہ امامؑ اپنی قضاوت اور فیصلے میں حدود کے اجراء کے موقع پر اپنے علم پر عمل کر سکتا ہے۔ پھر بھی

---

[1] مناقب ج ۲ ص ۲۶۱ طبع قم

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۱۶۰ (کافی اور تہذیب کے حوالے سے)

اس سے مراد وہی علم ہے جو عام طریقوں اور ظاہری اسباب سے حاصل ہوتا ہے، مثال کے طور پر اپنی آنکھوں سے کسی کو شراب پیتے دیکھے۔ مندرجہ ذیل روایت پر توجہ کریں:

"الواجب علی الامام اذا نظر الی رجل یزنی او یشرب خمراً ان یقیم علیه الحد ولا یحتاج الی بینته مع نظره لانه امین الله فی خلقه......"[1]

''جب بھی امام کسی کو زنا کرتا ہوا یا کسی کو شراب پیتا ہوا دیکھے تو اس صورت میں اس کو الٰہی حد جاری کرنی چاہیے اور وہ گواہوں کا محتاج نہیں ہے کیونکہ وہ لوگوں کے درمیان امین اللہ ہے۔''

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس موقع پر امام اپنے جس علم پر عمل کرتا ہے اس سے مراد عام اور طبیعی علم ہے جیسا کہ لفظ ''نظر'' اس پر دلالت کرتا ہے۔ نیز جب بھی حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے فیصلوں پر غور و فکر کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جائے گی کہ آپؑ اپنے فیصلہ جات میں خاص کوشش اور خصوصی لطافت و ظرافت کے ساتھ ایسے حالات پیدا کرتے تھے کہ خود طرفین (مدعی و منکر) حقیقت کا اعتراف کر لیتے تھے اور آپ مطلب کو واضح کر دیتے تھے۔ ان کے اعتراف کے بغیر آپ اپنے علم پر تکیہ کرتے ہوئے فیصلہ نہیں فرماتے تھے۔

بزرگ فقیہ سید محمد کاظم طباطبائی مرحوم اپنی کتاب ''ملحقات عروۃ الوثقیٰ'' میں لکھتے ہیں:

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ جھگڑوں اور اختلاف کو حل کرنے کے لیے قاضی اپنے ذاتی علم پر عمل کر سکتا ہے اس سے مراد وہ علم ہے جو عام طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو نہ کہ رمل اور جفر وغیرہ سے۔[2]

حضرت امام مہدی علیہ السلام اور ان کے فیصلے

احادیث میں ملتا ہے کہ صرف حضرت مہدی علیہ السلام اپنے فیصلوں میں اپنے علم پر عمل کریں گے اور یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت کی طرح ہوگا۔ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اذا قام قائم ال محمد حکم بحکم دائود (علیه السلام) لا یسأل عن بینته"

''جس وقت قائم آل محمدؑ ظہور اور قیام کریں گے تو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح فیصلے کریں گے اور مدعی و مدعا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۳۴۴۔ حدیث سے یہ مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ امام صرف حقوق اللہ میں اپنے علم پر عمل کر سکتا ہے اور گناہ کے مرتکب پر حد جاری کر سکتا ہے لیکن حقوق الناس میں ایسا نہیں کر سکتا مثلاً کسی کو چوری کرتا ہوا دیکھے۔

[2] ملحقات عروہ ج ۲ ص ۳۱

علیہ سے گواہ اور قسم نہیں مانگیں گے۔"[1]

ایک اور جواب

ان احادیث میں جن میں علم امام کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ایک اور جواب کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ اس جواب کی اساس علم امام کا اختیاری اور مشیتی ہونا ہے۔

اس قسم کی روایات پس پردہ واقعات وحالات سے امام کے علم کو فعلی اور محقق نہیں سمجھتیں۔[2]

یہ جو کہا جاتا ہے کہ فعلی نہیں جانتے اس کا یہ معنی نہیں کہ ان کے وجود کے اندر ایسا علم نہیں ہے بلکہ اس کا یہ معنی ہے کہ اس علم سے فائدہ اٹھانا ان کی توجہ اور ارادہ پر موقوف ہے یا روایات کی تعبیر میں ان کی مشیت کا محتاج ہے۔ ہر موقع پر جہاں چاہیں غیب کے پس پردہ امور کا علم فعلاً حاصل کر سکتے ہیں۔ ثقۃ الاسلام کلینی مرحوم نے اپنی کتاب اصول کافی میں اس عنوان پر ایک باب قائم کیا ہے:

"ان الائمۃ اذا شاء وا ان یعلموا علموا"[3]

"آئمہ جب بھی جاننا چاہیں تو جان جاتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ باب کے عنوان کے تحت تین روائتیں نقل کرتے ہیں کہ یہاں پر ان میں ایک کا ذکر کرنا کافی ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"ان الامام اذا شاء ان یعلم علم"

"جب بھی امام جاننا چاہے جان لیتا ہے۔"

اس لحاظ سے نبی اور امام کا علم اس شخص کی طرح ہے جس کے پاس ایک خط ہو، جب بھی وہ خط کے مندرجات سے آگاہ ہونا چاہے خط کو کھول سکتا ہے اور اس کے مندرجات پڑھ سکتا ہے۔ ان مقامات پر جہاں نبی اور امام مصائب اور ناگوار حادثات کا نشانہ بنتے تھے وہاں پر

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۸ ص ۱۶۸ نیز مستدرک وسائل کی جلد ۳ ص ۱۹۸ میں بصائر الدرجات اور دعوات راوندی سے اس مضمون پر مشتمل روایت نقل کی گئی ہے۔

[2] کبھی کبھار یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض علماء علم امام کے (فعلی ہوونے) کے معنی کو سمجھانے کے لیے لفظ "حضوری" استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا اس مقام پر استعمال کرنا، علم حضوری، سے اشتباہ کا موجب بنتا ہے۔ علم حضوری کو اسلامی فلاسفہ نے خدا کی اپنی ذات سے اور اپنی مخلوقات سے علم کے لیے اور انسان کے اپنی ذات کے علم کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ یہاں پر اس لفظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے اور لفظ حضوری کے بجائے لفظ فعلی استعمال کیا جائے۔

[3] اصول کافی، ج ا ص ۲۵۸

مصلحت کی خاطر اپنے اندر موجود علم کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ الٰہی مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان موارد میں اپنے اختیار سے استفادہ نہ کریں۔[۱] اس سوال کا ایک اور انداز سے بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔ الٰہی شخصیتوں کے علم کے بارے میں آنے والی احادیث کی طرف رجوع کرنے سے اسکے جوابات دینا بہت سہل اور آسان ہے۔[۲]

راقم یہاں پر اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے خداوند تعالٰی سے محترم قارئین کے لیے اور اپنے لیے الٰہی شخصیات اور پیشواؤں کے مقام و منزلت سے صحیح اور زیادہ آشنائی کی دعا کرتا ہے۔

[۱] یہ جواب خصوصاً ان موقعوں کے لیے ہے جہاں پر امام کے فعلی علم پر قطعی دلیل موجود نہ ہو۔ اس لحاظ سے امام حسین علیہ السلام کی تحریک اور قیام کا موضوع اس جواب کے دائرے سے خارج ہے کیونکہ آپؑ نے کامل آگاہی کے ساتھ شہادت کو گلے لگایا تھا۔

[۲] کتاب مفاہیم القرآن کے ص ۳۳۷ پر بعض جوابات اس طرح بیان ہوئے ہیں۔